امریکہ کی عوامی تاریخ
ہاورڈ زِن

امریکہ کی عوامی تاریخ

A PEOPLE'S HISTORY
OF THE UNITED STATES
1492-2010

مصنف: ہاورڈ زِن

مترجم: اعجاز احمد رانا

جمہوری پبلیکیشنز

انتساب!

امریکہ کے گمشدہ باشندوں
کے نام

Independent & Progressive Books

• نام کتاب ۔ امریکہ کی عوامی تاریخ • مصنف: ہاورڈ زن
• ترجمہ: اعجاز احمد رانا • اشاعت ۔ جولائی 2011ء
• سرورق: مصباح سرفراز • ناشر ۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-8455-73-6

قیمت ۔/600 روپے

اہتمام:
فرخ سہیل گوئندی

www.jumhoori.webs.com

Jumhoori Publications facebook Fan Page

JUMHOORI PUBLICATIONS
2-Aiwan-e-Tijarat Road Lahore, Pakistan
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail:jumhoori@yahoo.com

فہرست

امریکہ کی تلاش 7
عرض مترجم 9
کولمبس، انڈینز اور انسانی ترقی 11
رنگ کی بنا پر امتیاز 27
گھٹیا لوگ اور شرمناک صورتحال 37
استبداد آخر استبداد ہے 50
انقلاب کی ایک قسم 63
دوستانہ استبداد 82
جب تک گھاس اگتی ہے یا پانی بہتا ہے 98
خدا کا شکر ہے۔۔۔ہم نے کوئی چیز مال غنیمت میں نہیں لوٹی 114
بلا تسلیم غلامی، بے نجات آزادی 128
خانہ جنگی کی ایک دوسری صورت 159
لٹیرے نواب اور باغی 184
سلطنت اور عوام 214
سوشلسٹ پیکج 230
جنگ ریاست کی صحت ہے 256

مشکل وقت میں اپنی مدد آپ 269
ایک عوامی جنگ 290
کیا یہ اچانک پھٹ پڑتا ہے؟ 316
ویت نام ایک نامکمل فتح 335
بوالعجیاں 359
ستر کا عشرہ۔ اعتماد کا فقدان 382
کارٹر ریگن، بش، دو حزبی اتفاقِ رائے 396
غیر مشتہر مزاحمت 423
محافظوں کی آمد و بغاوت 448
کلنٹن کا دورِ صدارت 460

امریکہ کی تلاش

ہاورڈ زن (24 اگست 1922ء۔ 27 جنوری 2010ء) بروکلین، نیویارک کے ایک غریب یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایڈی زن، آسٹریا۔ ہنگری اور والدہ جینی زن، سائبیریا سے ہجرت کر کے امریکہ میں آباد ہوئے۔ والد اور والدہ دونوں ایک فیکٹری میں مزدور کے طور پر کام کرتے تھے اور ان کے مالی حالات اتنے کشیدہ تھے کہ وہ کتابیں اور رسالے خریدنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ تنگ دستی کے باوجود ایڈی زن نے مطالعے کے لیے قلیل رقم مختص کی تا کہ اپنے علم و شعور کے سفر کو جاری رکھا جا سکے اور یہی وہ علمی جنون تھا، جس نے ان کے بیٹے ہاورڈ زن کو دنیا کا نامور مورخ اور دانشور بننے کی جلا بخشی۔

جنگ عظیم دوئم میں ہاورڈ زن فاشزم کے خلاف جنگ لڑنے پر مائل ہوئے، اس کے لیے انہوں نے امریکہ کی مسلح افواج کے ہوائی شعبے میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس دوران انہوں نے برلن، چیکوسلواکیہ، ہنگری اور جنوب مغربی فرانس کے شہر Bordeaux پر حملوں میں حصہ لیا، بعد میں تحقیق کرنے پر ہاورڈ زن کو یہ علم ہوا کہ جنوبی فرانس میں جن جنگی کارروائیوں میں انہوں نے حصہ لیا، ان میں ایک ہزار سے زائد بے گناہ شہری اور صرف چند جرمن سپاہی مارے گئے تھے. اس تحقیق نے اُن کی زندگی کو بدل ڈالا اور انہوں نے یہ حقیقت بے نقاب کی کہ جنگوں میں حقائق کو کیسے مسخ کیا جاتا ہے اور اس طرح ان کی کتاب "The Politics of History" منظرِ عام پر آئی:

ہاورڈ زن 1956ء سے 1963ء تک اٹلانٹا میں Spelman College کے شعبہ تاریخ کے سربراہ تھے۔ اس دوران انہوں نے امریکہ میں سیاہ فام امریکیوں کے حقوق کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا تو اُن کو وہاں سے فارغ کر دیا گیا۔ جب 15 مئی 2005ء کو وہ اسی شعبہ تاریخ میں مہمانِ خصوصی کے طور پر بلائے گئے تو انہوں نے اپنی تقریر میں تاریخ کے سبق کے حوالے سے لاجواب تجزیہ پیش کیا کہ

''تاریخ کا سبق یہ ہے کہ اگر آپ کا مؤقف درست ہے تو آپ کبھی منظر سے غائب نہ ہوں۔ آپ اپنے مؤقف پر سختی سے کاربند رہیں، آپ کا مؤقف حالات کو بدل دیتا ہے، حکومت آپ

کے بارے لوگوں میں غلط فہمیاں پیدا کرے گی بلکہ اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا بھی حکومت کی آواز میں آواز ملائے گا لیکن سچ اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ چونکہ سچائی کی طاقت، جھوٹ کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے لیے آپ کو عملی اقدامات اٹھانے ہوں گے۔ ملازمت، شادی بیاہ، بچے، خاندان اور خوشحالی، آپ کو لگے گا کہ آپ نے وہ منزل پالی جسے معاشرہ ایک کامیابی قرار دے گا مگر یہ سب کچھ ایک شاندار زندگی کے لیے کافی نہیں ہے۔"

ہاورڈ زن، تاریخ اور سیاسیات کے استاد تھے اور انہوں نے بیس سے زائد کتابیں لکھیں، جس میں تاریخ کے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں دنیا میں اپنی مثال آپ ثابت ہوئیں۔ ہاورڈ زن نے تاریخ کی مارکسی تشریح کے مطابق ثابت کیا کہ دنیا کی تاریخ نچلے طبقات سے عبارت ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے امریکہ اور دوسرے استعماری ممالک کے حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ وہ ایک طرف انسانی ترقی کے "مالک" بنے بیٹھے ہیں تو دوسری طرف تاریخ کو مسخ کرنے میں مصروف ہیں۔ ہاورڈ زن کی زیرِ نظر کتاب امریکہ کی مقبول ترین کتاب ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے ہر امریکی شہری کو پڑھنا چاہیے، تاکہ وہ ان حقیقتوں سے آگاہ ہو، جن کو چھپانے کے لیے امریکہ کے حکمران طبقات مسلسل کوششیں کر رہے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ حقائق عام امریکی شہریوں تک پہنچ جائیں تو امریکہ میں ایک عظیم پُرامن عوامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور اس کا استعماری کردار بھی محدود ہو سکتا ہے۔

'امریکہ کی عوامی تاریخ' امریکی تاریخ کے پوشیدہ ابواب کو بے نقاب کرتی ہے اور جتنی اہمیت اس کی عام امریکی شہریوں کے لیے ہے اتنی ہی اہمیت پاکستان جیسے ممالک کے عوام کے لیے بھی ہے۔ اس کتاب کی اردو اشاعت بلاشک وشبہ پاکستان میں جہاں امریکہ کی عوامی تاریخ کو روشناس کروائے گی، وہیں پر پاکستان کی عوامی تاریخ مرتب کرنے کی ترغیب بھی دے گی کہ ہمارے مورخین، حکمرانوں، مغل درباروں اور اشرافیہ کی تاریخ کی بجائے، اس خطے کی عوامی تاریخ لکھنے کا آغاز کریں۔ اس لحاظ سے اردو زبان میں پاکستان میں شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے، جو امریکی تاریخ کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع دے گی اور تاریخ کے حقیقی کرداروں کو تلاش کرنے کی رہنمائی بھی کرے گی اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب کے بعد پاکستان کے اردو قارئین ایک نئے امریکہ کو تلاش کریں گے تو غلط نہ ہوگا۔

فرخ سہیل گوئندی

جون 2011ء

عرض مترجم

"امریکہ کی عوامی تاریخ" عصرِ حاضر کے معروف امریکی تاریخ دان، بائیں بازو کے ایک متحرک دانشور "ہاورڈ زن" کی تہلکہ خیز کتاب "A People's History of the United States of America" کا اردو ترجمہ ہے۔ فاضل مصنف نے روائتی تاریخ نویسی سے ہٹ کر سیاسی اور دولتمند اشرافیہ کے بجائے عوام الناس کی تاریخ رقم کی ہے، کرسٹوفر کولمبس سے لے کر کلنٹن کے دورِ صدارت تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات اور تحریکوں کو امریکی خواتین، فیکٹری مزدوروں، سیاہ فام غلاموں، مقامی ریڈ انڈینز، غریب، محنت کشوں اور نقلِ مکانی کر کے آنے والے مزدوروں کے نقطۂ نظر سے اور ان کے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اگرچہ یہ ایک ایسے معاشرے کی تاریخ ہے جو ہم سے ہزاروں میل کی دوری پر ہے، جس کی اقدار اور طرزِ بود و باش ہم سے مکمل طور پر مختلف ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ایسے بے شمار واقعات اور انسانی فطرت کے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں جو پوری دنیا کے عوام کی مشترکہ میراث ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ طاقت اور اختیارات کے سرچشموں پر قابض سیاسی، کاروباری اور عسکری قوت کے حامل طبقہ اشرافیہ کے نزدیک عوام کی حیثیت بار برداری کے جانوروں اور شطرنج کے پیادوں سے بڑھ کر ہرگز نہیں، جنہیں ضرورت پڑنے پر بادشاہ یا ملکہ کو بچانے کی خاطر بلا دریغ قربان کر دیا جاتا ہے۔ عوام پر اپنا اقتدار مضبوط رکھنے کے لیے خوبصورت لفاظی اور مادی علامات کا سہارا لیا جاتا ہے، قومی پرچم، حب الوطنی، جمہوریت، قومی مفاد، قومی تحفظ جیسی اصطلاحات سے پرچایا جاتا ہے، اور ان کی محنت اور خون پسینے پر زندگیاں بسر کرنے والے نام نہاد نظام کے رکھوالوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے خوبصورت اور دل آویز نعروں سے کام لیا جاتا ہے۔

اس کتاب کا انتخاب جمہوری پبلیکیشنز کے سربراہ فرخ سہیل گوئندی نے کیا ہے، جن کا نصب العین، کاروبار اور منافع کے چکر سے بلند ہمیشہ سے علم و دانش کا فروغ رہا ہے۔ ان کے اسی نیک جذبے

کے نتیجے میں جمہوری پبلیکیشنز کے زیرِ اہتمام آج تک سینکڑوں نہ سہی بیسیوں ایسی کتب شائع کی جا چکی ہیں جو انگلش نہ جاننے والے تشنگانِ علم و دانش کی پیاس بجھا رہی ہیں۔ اس کے ترجمے کی ذمہ داری خاکسار کو سونپی گئی تھی جسے میں نے اپنی استعداد کے مطابق کماحقہٗ پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگوں کے نام بھی ہیں، جن کے تلفظ کو حتی المقدور درست ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم اگر کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

اعجاز احمد رانا

کولمبس، انڈینز اور انسانی ترقی

سینکڑوں ایراواک مرد اور عورتیں دیہاتوں سے نکل کر جزیرے کے ساحل پر جمع ہو گئے، ان کی رنگت گندمی تھی اور تمام کے تمام ننگے تھے۔ ان میں کچھ تیر کر جہاز کے قریب پہنچ گئے، اور اپنی حیران آنکھوں سے اس عجیب و غریب اور بہت بڑی کشتی کو دیکھ رہے تھے۔ جب کولمبس اور اس کے ملاح اپنی تلواریں اٹھائے ہوئے ساحل پر پہنچے تو ایراواک بھاگ کر ان کے استقبال کو آگے آئے اور کھانے کی اشیاء، پانی اور تحائف پیش کئے۔ کولمبس اپنی لاگ بک میں لکھتا ہے:

"وہ ہمارے لیے طوطے، روئی کے گولے اور نیزے اور بہت سی اشیاء لائے جو انہوں نے شیشے کے منکوں اور گھنٹیوں کے بدلے میں پیش کیں۔ وہ بڑی خوشی سے اپنے پاس موجود ہر چیز کا سودا کرنے کو تیار تھے۔ ان کے جسم مضبوط اور خوبصورت تھے اور نقوش دلکش تھے.... ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھے اور نہ ہی وہ ان سے آشنا تھے۔ میں نے انہیں ایک تلوار دکھائی انہوں نے اسے پھل کی جانب سے پکڑ لیا اور ناسمجھی میں اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ ان کے پاس لوہا نہیں تھا۔ ان کے نیزے بید کے بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت تابع فرمان ملازم تھے، صرف پچاس آدمیوں کی مدد سے ہم نے ان سب کو غلام بنا لیا تھا اور جو چاہتے تھے ان سے کروا سکتے تھے۔"

بہاما جزائر پر بسنے والے یہ ایراواک بہت حد تک براعظم پر بسنے والے انڈینز کی طرح تھے جن کی غیر معمولی مہمان نوازی اور مل بانٹ کر رہنے کی صفات کا یورپی مبصروں نے بار بار ذکر کیا ہے۔ یہ صفات نشاۃ الثانیہ کے یورپ میں کہیں نظر نہ آتی تھیں، جہاں یورپ کے مذہب، شاہی حکومتوں اور دولت کے جنون نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے، جو کہ پوری یورپی تہذیب اور امریکہ پہنچنے والے اس پہلے یورپی ایلچی کرسٹوفر کولمبس کی نمایاں پہچان تھی۔

کولمبس لکھتا ہے:

"جیسے ہی میں انڈیز میں پہنچا پہلے ہی جزیرے پر سے، جو میں نے دریافت کیا، چند مقامی باشندوں کو اس خیال سے زبردستی قابو کر لیا کہ یہاں جو کچھ مل سکتا ہے یہ اس کے بارے میں جانتے ہوں گے اور مجھے بھی معلومات مہیا کر سکیں گے۔

کولمبس جو معلومات چاہتا تھا، وہ تھی "سونا کہاں ہے؟" کولمبس نے سپین کے بادشاہ اور ملکہ کو اس لالچ پر اپنی مہم کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار کیا تھا کہ وہ بحر اوقیانوس کے پار انڈیز اور ایشیا کی سرزمین سے سونا اور مصالحہ جات لے کر آئے گا۔ اس دور کے دوسرے باعلم افراد کی طرح وہ جانتا تھا کہ زمین گول ہے اور مشرق بعید پہنچنے کے لیے وہ مغرب کی جانب سفر کر سکتا ہے۔

سپین ابھی حال ہی میں فرانس، انگلینڈ، اور پرتگال کی طرح ایک جدید قومی ریاست کے طور پر متحد ہوا تھا۔ سپین کی آبادی زیادہ تر غریب کاشتکاروں پر مشتمل تھی اور طبقہ امراء کے لیے کام کرتی تھی، جو کہ کل آبادی کا 2 فیصد تھے اور 95 فی فیصد زمین پر قابض تھے۔ سپین نے اپنے آپ کو کیتھولک چرچ سے وابستہ کر رکھا تھا اور یہودیوں اور مورس (مسلمانوں) کو دھکیل باہر کیا تھا۔ جدید دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح سپین سونے کا متلاشی تھا، جو کہ مال و دولت کی نئی پہچان بنتا جا رہا تھا، یہ زمین سے زیادہ مفید تھا کیونکہ اس سے دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی تھی۔

اس وقت عام خیال پایا جاتا تھا کہ ایشیا میں بے شمار سونا موجود ہے اور ریشم اور مصالحہ جات تو یقیناً تھے کیونکہ صدیوں پہلے اپنی زمینی مہمات کے ذریعے مارکو پولو اور دوسرے مہم جو وہاں سے حیرت انگیز اشیاء لے کر آئے تھے، اب جب کہ ترکوں نے قسطنطنیہ اور مشرقی بحیرۂ روم کا خطہ فتح کر لیا تھا اور ایشیا کی جانب جانے والے زمینی راستوں پر قابض تھے، ایک سمندری راستے کی ضرورت تھی، پرتگیزی ملاح افریقہ کے جنوبی سرے سے چکر کاٹ کر وہاں پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ سپین نے ایک نامعلوم سمندر کے پار ایک لمبے بحری سفر کے جوئے کا انتخاب کیا۔

سونا اور مصالحہ جات لانے کے بدلے میں فرڈیننڈ اور ازابیلا نے کولمبس سے 10 فیصد منافع اور تلاش کئے گئے علاقوں کی گورنرشپ اور سمندروں کے "امیر البحر" کے نئے خطاب کے ذریعے دوامی شہرت کا وعدہ کیا۔ وہ اٹلی کے شہر جنوا سے تعلق رکھتا تھا، ایک بیوپاری کے پاس کلرک کے طور پر کام کرتا تھا، ایک تجربہ کار جولاہے کا بیٹا ہونے کے ناطے جز وقتی طور پر کپڑا بننے کا کام بھی کرتا تھا، اس کے علاوہ ایک تجربہ کار ملاح بھی تھا، وہ تین بحری جہازوں کے ساتھ روانہ ہوا، جن میں سب سے بڑا جہاز "سانتا ماریا" تقریباً ایک سو فٹ لمبا تھا اور اس کا عملہ 39 ارکان پر مشتمل تھا۔

کولمبس کبھی بھی ایشیا تک نہیں پہنچ سکتا تھا جو کہ اس کے تخمینے سے جو اس نے دنیا کو بہت چھوٹا تصور کرتے ہوئے لگایا تھا، ہزار میل آگے تھا۔ وہ یقیناً سمندر کی بے پناہ وسعتوں میں غرق ہو جاتا، لیکن

خوش قسمتی سے وہ ایشیا سے محض ایک چوتھائی فاصلے پر ایک ان دیکھی اور نامعلوم زمین پر جا اترا، یہ شمالی اور جنوبی امریکہ تھے، جو یورپ اور ایشیا کے درمیان واقع تھے، کینری جزائر سے روانگی کے 33 دن بعد اس نے اور اس کے عملے نے پانی میں درختوں کی شاخیں اور لکڑیاں تیرتی ہوئی دیکھیں، انہیں پرندوں کے ڈار بھی نظر آئے، یہ سب خشکی کی علامات تھیں، پھر 12 اکتوبر کو سحری کے وقت ایک ملاح روڈ ریگو نے سفید ریتوں پر صبح کے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا اور وہ خوشی سے چلا اٹھا، یہ بحیرہ کیریبین میں واقع بہاما جزائر میں سے ایک جزیرہ تھا، سب سے پہلے زمین دیکھنے والے شخص کے لیے تا عمر دس ہزار "مارا ویدس" سالانہ کی پنشن کا وعدہ تھا لیکن روڈ ریگو کو یہ کبھی بھی نہ مل سکی، کولمبس نے دعویٰ کیا کہ اس نے اس سے پہلے شام کو ہی روشنی دیکھ لی تھی، یہ انعام اسے مل گیا۔

ساحل پر پہنچتے ہوئے ان کی ملاقات ایراواک انڈینز سے ہوئی جو کہ ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیر کر جہاز تک پہنچ گئے تھے۔ ایراواک دیہاتی کمیون میں رہتے تھے اور مکئی، یام اور کساوا کاشت کرتے تھے۔ وہ کاتنے اور بننے کے فن سے آگاہ تھے لیکن ان کے پاس گھوڑے یا کام کرنے والے جانور نہیں تھے۔ ان کے پاس لوہا نہیں تھا۔ انہوں نے کانوں میں سونے کے چھوٹے چھوٹے زیور پہن رکھے تھے۔

یہ بات گہرے نتائج کی حامل ثابت ہوئی، کولمبس کچھ لوگوں کو بطور قیدی جہاز پر لے گیا۔ اس کا اصرار تھا کہ یہ لوگ سونے کے ذخائر تک اس کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ پھر وہ اس جگہ پہنچا جسے اب "کیوبا" کہا جاتا ہے اور پھر ہسپانیولا پہنچا (جزائر جو آج کل ہیٹی اور ڈومینیکن ریپبلک پر مشتمل ہیں) اور یہاں دریاؤں میں نظر آنے والے سونے کے ذرات اور ایک مقامی انڈین سردار کی طرف سے کولمبس کو پیش کئے جانے والے سونے کے نقاب نے کولمبس میں سونے کی کانوں کی تلاش کا ایک بے تاب جذبہ پیدا کر دیا۔

ہسپانیولا میں کولمبس نے سانتا ماریا (بحری جہاز) سے حاصل ہونے والی لکڑی سے جسے زمین بوس کر دیا گیا تھا، ایک قلعہ تعمیر کیا، یہ مغربی نصف کرے میں، پہلا یورپی فوجی اڈا تھا، اس نے اس کا نام "نیویداڈ" (کرسمس) رکھا۔ اور عملہ کے 39 ارکان کو سونا تلاش کرنے اور ذخیرہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ یہاں چھوڑا۔

اس نے مزید انڈینز قیدی پکڑے اور باقی ماندہ دو جہازوں پر لاد لیا، جزیرے کے ایک حصے میں اس کی انڈینز سے ایک جھڑپ ہوگئی، جنہوں نے اتنے زیادہ کمان اور تیر دینے سے انکار کر دیا تھا، جتنے اسے اور اس کے آدمیوں کو چاہیے تھے، دو ایراواک باشندوں کو تلواریں گھونپ کر قتل کر دیا گیا، پھر "نینا" اور "پنٹا" ازورس اور سپین کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب موسم سرد ہوا تو انڈین قیدی مرنا

شروع ہو گئے۔

میڈرڈ کے شاہی دربار میں کولمبس کی رپورٹ مبالغہ آمیز تھی۔ وہ مصر تھا کہ وہ ایشیا (جو کہ کیوبا تھا) اور چین کی ساحل کے ساتھ ایک جزیرے (ہسپانیولا) تک پہنچ گیا تھا، اس کی داستان کچھ حقیقت تھی اور کچھ محض افسانہ:

ہسپانیولا ایک حیرت انگیز جگہ ہے اس کے پہاڑ میدان اور چراگاہیں تمام کی تمام بہت زرخیز اور خوبصورت ہیں، بندرگاہیں ناقابل یقین حد تک اچھی ہیں، وہاں بہت سے دریا بہہ رہے ہیں جو بہت چوڑے ہیں اور اکثر میں سونا پایا جاتا ہے.....وہاں بہت سے مصالحہ جات سونے اور دوسری دھاتوں کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔"

کولمبس نے بتایا کہ "انڈینز اس قدر سادہ اور بھولے اور اپنی ملکیتوں سے اس قدر بے نیاز ہیں کہ جن لوگوں نے انہیں دیکھا نہیں وہ یقین نہیں کریں گے۔ اور جب ان سے کوئی چیز مانگتے ہیں جو ان کے پاس ہو کبھی انکار نہیں کرتے، وہ ہر کسی کے ساتھ مل بانٹنے کو تیار ہوتے ہیں....." اپنی رپورٹ کے اختتام پر اس نے بادشاہ اور ملکہ سے درخواست کی اس کی تھوڑی سی مدد کی جائے، جس کے بدلے میں وہ اپنے اگلے سفر میں ان کے لیے "اتنا زیادہ سونا لائے گا جتنا انہیں چاہیے اور اتنے زیادہ غلام لائے گا جتنے وہ کہیں گے"۔ اس کی گفتگو مکمل مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی: "اس طرح ازلی و ابدی خدا، ہمارا مالک ان لوگوں کو فتح سے نوازتا ہے، جو ظاہری مشکلات کے باوجود اس کی راہ پر چلتے ہیں"۔

کولمبس کی مبالغہ آمیز رپورٹ اور اس کے وعدوں کے پیش نظر اس کی دوسری مہم کے لیے سترہ بحری جہاز اور بارہ سو سے زیادہ کا عملہ دیا گیا۔ مقصد واضح تھا سونا اور غلام۔ وہ کیریبین کے ایک ایک جزیرے پر گئے اور انڈینز کو قیدی بناتے رہے لیکن جیسے جیسے یورپیوں کے ارادوں کے بارے میں خبر پھیلتی چلی گئی انہیں دیہاتوں کے دیہات خالی ملنے لگے۔ نیویداد کے قلعے میں پہنچ کر انہیں علم ہوا کہ یہاں چھوڑے گئے تمام کے تمام یورپیوں کو انڈینز نے مار ڈالا تھا جب کہ وہ سونے کی تلاش میں جزیرے پر ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے اور عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر جنسی تسکین اور کام کی خاطر قیدی بنا رہے تھے۔

اب ہیٹی میں اپنے مستقر سے کولمبس نے اندرونی علاقوں کی جانب مہم کے بعد مہم بھیجنی شروع کی، انہیں کہیں بھی سونے کی کانیں نہ ملیں لیکن سپین واپس جانے والے جہازوں کو کسی نہ کسی قسم کے منافع سے تو ہر حال میں بھرنا تھا۔ 1495ء میں انہوں نے غلام پکڑنے کے لیے ایک بڑا حملہ کیا اور پندرہ سو ایراواک مردوں، عورتوں، اور بچوں کو گھیر لیا، ان کو باڑوں میں قید کر لیا جن کی حفاظت ہسپانوی اور کتے کر رہے تھے، ان میں سے جہازوں پر سوار کرنے کے لیے پانچ سو بہترین افراد کا انتخاب کیا گیا۔ ان پانچ سو میں سے دو سو راستے میں ہی مر گئے۔ باقی زندہ سلامت سپین پہنچ گئے اور ان کو شہر کے آرچ ڈیکن (پادری) کے ذریعے

فروخت کے لیے پیش کر دیا گیا۔ جس نے بتایا کہ اگرچہ تمام غلام مکمل ننگے تھے، انہوں نے جانوروں سے زیادہ پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ کولمبس نے بعد میں لکھا: "آیئے تثلیث کے مقدس نام ان تمام غلاموں کو بیچتے چلے جائیں جن کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔"

لیکن بہت زیادہ غلام قید کے دوران مر گئے۔ کولمبس ان لوگوں کو منافع دینے کے لیے جنہوں نے سرمایہ کاری کر رکھی تھی کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے اسے جہازوں کو سونے سے بھرنا تھا۔ ہیٹی کے صوبہ سیکاؤ میں جہاں اس کے آدمیوں کے خیال کے مطابق سونے کی بڑی کانیں ہو سکتی تھیں، انہوں نے چودہ سال اور اس سے بڑی عمر کے تمام لوگوں کو ہر تین ماہ بعد سونے کی ایک خاص مقدار جمع کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ اسے لے کر آتے تو انہیں گلے میں لٹکانے کے لیے تانبے کا ایک ٹوکن دیا جاتا۔ وہ انڈینز جو ٹوکن کے بغیر پائے جاتے ان کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے اور وہ خون بہہ جانے کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتے۔

انڈینز کو ایک ناممکن کام سونپا گیا تھا، اس علاقے میں سونا صرف ذرات کی شکل میں پایا جاتا تھا، جسے ندی نالوں سے اکٹھا کیا جاتا تھا۔ لہٰذا وہ بھاگ جاتے تھے، اور اس طرح بھاگ جانے والوں کو کتوں کے ذریعے گھیر کر جان سے مار دیا جاتا تھا۔

جب ایراواک باشندوں نے مل جل کر مزاحمت کی کوشش کی تو ان کا سامنا ایسے ہسپانویوں سے ہوا جن کے پاس زرہ بکتریں، بندوقیں اور گھوڑے تھے۔ جن ایراواک کو ہسپانوی زندہ گرفتار کر لیتے انہیں یا پھانسی دی جاتی یا زندہ آگ میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ایراواک میں زہر کے ذریعے وسیع پیمانے پر خودکشیاں شروع ہو گئیں، شیر خوار بچوں کو ہسپانویوں سے بچانے کے لیے مار دیا جاتا تھا، دو سالوں کے اندر قتل، ہاتھ پاؤں کاٹنے یا خودکشیوں کے نتیجے میں ہیٹی میں بسنے والے ڈھائی لاکھ انڈینز کی تعداد آدھی رہ گئی۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی سونا باقی نہیں بچا تو وسیع جاگیروں پر انڈینز سے بطور غلام مزدوری لینا شروع کر دی گئی۔ ان سے سفاکانہ انداز میں کام لیا جاتا جس کے نتیجے میں ہزاروں انڈینز اپنی جانیں ہار بیٹھے۔ 1515ء تک ان کی تعداد پچاس ہزار کے قریب رہ گئی تھی۔ 1550ء تک ان کی تعداد محض پانچ سو تھی۔ 1650ء کی ایک رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ اصل ایراواک اور ان کی نسل مکمل طور پر معدوم ہو چکی تھی۔

کولمبس کی آمد کے بعد ہیٹی کے جزائر پر کیا گزری، اس بارے میں معلومات کا بڑا ذریعہ، اور کئی ایک معاملات میں واحد ذریعہ، "بارٹولومے ڈی لاس کیساس" ہے۔ جس نے ایک نوجوان پادری کے طور پر کیوبا کی فتح میں حصہ لیا تھا۔ ایک وقت میں اس کے پاس ایک بڑا زرعی فارم تھا جس پر انڈین

غلام کام کرتے تھے، لیکن اس نے فارم چھوڑ دیا اور ہسپانوی مظالم پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس نے کولمبس کے روزنامچے کی نقل تیار کی، اور اپنی عمر کی چھٹی دہائی میں کئی جلدوں پر مشتمل انڈینز کی تاریخ لکھنا شروع کی۔ وہ لکھتا ہے، انڈین معاشرے میں عورتوں کے ساتھ اس قدر اچھا سلوک کیا جاتا تھا کہ ہسپانوی لوگ اسے دیکھ کر گھبرا گئے:

"شادی کے قوانین یا ضابطے موجود نہیں ہیں، مرد اور خواتین برابری کی سطح پر اپنے ساتھیوں کا انتخاب کرتے ہیں اور بغیر کسی جھگڑے، حسد یا ناراضگی کے جب چاہیں علیحدہ ہو جاتے ہیں، یہ بہت زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں، حاملہ خواتین آخری لمحے تک کام کرتی ہیں، اور تقریباً بغیر کسی تکلیف یا درد کے بچے جنتی ہیں، دوسرے دن دریا میں غسل کرتی ہیں، اور ایسی ہی پاک صاف اور صحت مند ہو جاتی ہیں، جیسی بچہ جننے سے پہلے تھیں، اگر وہ اپنے مردوں سے اکتا جائیں تو اپنے شرم والے حصے کو پتوں یا سوتی کپڑے سے ڈھانپتے ہوئے اپنے حمل ایسی جڑی بوٹیوں کے استعمال سے ساقط کر لیتی ہیں جن کے نتیجے میں مردہ بچے پیدا ہوں، اگرچہ مجموعی طور پر انڈین مرد اور خواتین مکمل برہنگی کو ایسی ہی عامیانہ نگاہوں سے دیکھتی ہیں جیسے ہم آدمی کے سر یا اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں۔"

لاس کیساس بتاتا ہے کہ "انڈینز سونے اور دوسری قیمتی اشیا کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ تجارت کے طور طریقوں، خریدنے اور بیچنے کے عمل سے بالکل نابلد ہیں، اور گزر بسر کے لیے مکمل طور پر اپنے قدرتی ماحول پر انحصار کرتے ہیں، وہ اپنی ملکیتوں کے بارے میں بہت زیادہ فیاض ہوتے ہیں، اور اپنے دوستوں کی ملکیتوں کے بارے میں بھی ایسی ہی فیاضی کی توقع رکھتے ہیں"۔

لاس کیساس انڈینز کے ساتھ ہسپانویوں کے سلوک کے بارے میں مزید لکھتا ہے:

بے شمار شہادتیں مقامی باشندوں کے دھیمے اور ٹھنڈے مزاج کو ثابت کرتی ہیں لیکن ہمارا کام اشتعال انگیز، تباہ کن، ہلاکت خیز اور نچوڑ لینے والا تھا، لہٰذا اگر وہ گاہے بگاہے ہم میں سے کسی ایک کو مارنے کی کوشش کرتے تھے تو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا، یہ حقیقت ہے کہ ایڈمرل اتنا ہی اندھا تھا، جتنے اس کے بعد آنے والے دوسرے لوگ اور وہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اتنا بے تاب تھا کہ اس نے انڈینز کے خلاف ناقابل تلافی جرائم کا ارتکاب کیا۔

مکمل غلبہ مکمل ظلم کا باعث بنتا ہے۔ ہسپانوی دس بیس انڈینز کو خنجر زنی کے گھاٹ اتارتے ہوئے ذرا بھر بھی تردد محسوس نہیں کرتے تھے اور اپنے خنجروں کی دھار کو پرکھنے کے لیے ان کے جسموں کو ٹکڑوں میں کاٹ دیتے تھے، لاس کیساس مزید لکھتا ہے: "دو نام نہاد مسیحیوں نے ایک مرتبہ دو انڈینز

بچوں کو جاتے دیکھا ہر بچے کے پاس ایک ایک طوطا تھا، انہوں نے ان سے طوطے چھین لیے اور محض تفنن طبع کے لیے دونوں بچوں کی گردنیں اڑا دیں۔"

جب مقامی مردوں کو کئی میل دور کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا تو ان کی بیویوں کو کھیتوں میں کام کرنے کے لیے رکھ لیا جاتا تھا، ان کو زمین کھودنے اور کساوا کے پودوں کے لیے ہزاروں پہاڑیاں بنانے جیسے سخت محنت طلب کام پر جوت دیا جاتا:

اس طرح خاوندوں اور بیویوں کو آٹھ دس ماہ میں صرف ایک مرتبہ باہم ملنے کا موقع دیا جاتا اور جب وہ ملتے تو اس قدر تھکے ماندے اور مایوسی کا شکار ہوتے کہ عملی طور پر ان میں نسل کشی کا عمل رک چکا تھا اور جو تھوڑے بہت بچے پیدا ہوتے وہ جلد مر جاتے کیونکہ کام کی زیادتی اور فاقوں کی وجہ سے ان کی ماؤں کی چھاتیوں میں انہیں پالنے کے لیے دودھ نہیں ہوتا تھا، جب میں کیوبا میں تھا کہ اسی وجہ سے 7000 بچے تین ماہ کے اندر لقمہ اجل بن گئے، کچھ مائیں محض مایوسی کے عالم میں اپنے بچوں کو خود پانی میں ڈبو کر مار دیتیں.....اس طرح خاوند کانوں میں کام کرتے ہوئے مر جاتے، بیویاں کھیتوں میں بیگار کرتے موت کے منہ میں چلی جاتیں اور بچے دودھ کے لیے بلک بلک کر جانیں دے دیتے....اور بہت کم مدت میں وہ سرزمین جو طاقت ور اور انتہائی زرخیز تھی دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں سے خالی ہو گئی، میری آنکھوں نے انسانی فطرت کے خلاف ایسے ہولناک مناظر دیکھے ہیں کہ اب میں نہیں بلکہ لکھتے ہوئے کانپ جاتا ہوں۔"

جب لاس کیساس 1508ء میں ہسپانیولا میں پہنچا، وہ لکھتا ہے: "وہاں اس جزیرے پر بشمول انڈینز کے 60,000 لوگ بس رہے تھے، اس کا مطلب ہے کہ 30 لاکھ سے زائد لوگ جنگ، غلامی اور کانوں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ مستقبل کی نسلوں میں سے کون ان باتوں پر یقین کرے گا۔"

یہ ہے تاریخ کا اصل چہرہ، فتوحات، غلامی اور موت کی تاریخ، جس کی ابتدا آج سے پانچ سو سال پہلے امریکہ میں انڈینز آبادیوں پر یورپیوں کے حملوں کی ابتدا سے ہوئی لیکن تاریخ کی کتابوں میں جو امریکہ میں بچوں کو نسل در نسل پڑھائی جا رہی ہیں، یہ تاریخ جرأتمندانہ مہمات سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں کوئی خون خرابہ نہیں، اور "کولمبس ڈے" ایک تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ صرف حالیہ سالوں میں ہمیں اس میں کچھ تبدیلیوں کے آثار نظر آئے ہیں۔

ایلیمنٹری اور ہائی سکول کے بعد ہمیں شاذ شاذ کہیں دوسری باتوں کے اشارے ملتے ہیں، سموئیل ایلیٹ موریسن ہارورڈ کا تاریخ دان، کولمبس پر لکھنے والا ایک ممتاز مصنف ہے۔ اس نے کئی جلدوں پر مشتمل سوانح عمری تحریر کی ہے، اور وہ خود بھی ایک ملاح تھا، جس نے بحراوقیانوس میں کولمبس کے

راستے پر دوبارہ سفر کیا تھا، 1954ء میں لکھی گئی اپنی مقبول عام کتاب "کرسٹوفر کولمبس جہاز ران" میں وہ غلام سازی اور قتل و غارت کے حوالے لکھتا ہے: "ظالمانہ پالیسی جس کا آغاز کولمبس نے کیا تھا اور بعد میں اس کے جانشینوں نے اس پر عمل جاری رکھا مکمل نسل کشی پر منتج ہوئی۔"

یہ محض ایک صفحے پر ہے جو کہ شاندار رومانس کی داستانوں کے درمیان دبا پڑا ہے۔ کتاب کے آخری پیراگراف میں موریسن کولمبس کے بارے میں اپنا نقطہ نظر یوں بیان کرتا ہے:

> "اس میں اپنے نقائص اور خامیاں تھیں لیکن یہ بڑی حد تک اوصاف کی خامیاں تھیں، جنہوں نے اسے عظیم بنا دیا تھا....اس کا ناقابل شکست ارادہ، اس کا خدا کی ذات اور سمندروں کے اس پار زمینوں پر عیسیٰ کے ایلچی کے طور پر اپنے مشن پر پختہ ایمان، بے توجہی، غربت اور حوصلہ شکنی کے باوجود اس کی ہار نہ ماننے والی ثابت قدمی، لیکن اس کی تمام صفات میں سے نمایاں اور ناگزیر صفت "جہاز رانی" میں کوئی نقص یا تاریک پہلو نہ تھا۔"

کوئی بھی شخص ماضی کے بارے میں صاف جھوٹ بول سکتا ہے۔ یا کوئی شخص ان حقائق کے ذکر سے قطع نظر کر سکتا ہے، جو ناقابل قبول نتائج کی طرف لے جاتے ہوں۔ موریسن نے دونوں کام نہیں کیے۔ وہ کولمبس کے بارے میں جھوٹ بولنے سے انکار کرتا ہے۔ اس نے بہت بڑی تعداد میں قتل و غارت کی داستانوں کے ذکر سے اجتناب نہیں کیا، بلکہ اس نے ان کے ذکر کے لیے "نسل کشی" کا سخت ترین لفظ استعمال کیا ہے۔

لیکن اس نے ایک اور کام دکھایا ہے۔ وہ تیزی سے سچائی کو بیان کرتے ہوئے ان دوسرے معاملات کی طرف چلا جاتا ہے، جو اس کے نزدیک زیادہ اہم ہیں۔ صاف جھوٹ اور کھلم کھلا اجتناب کے پکڑے جانے کا خدشہ ہوتا ہے اور جب یہ پکڑا جاتا ہے تو قاری کے دل میں مصنف کے خلاف ایک بغاوت جنم لیتی ہے۔ تاہم حقائق کو بیان کرنا اور پھر اسے دوسری معلومات کے انبار تلے دبا دینا قاری کو یہ اطمینان دلانے کے مترادف ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر قتل و غارت ضرور ہوئی، لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ تاریخ دان بعض حقائق پر خاص زور دینے اور بعض دوسرے حقائق کے محض سرسری ذکر سے اجتناب نہیں کر سکتے۔ یہ ان کے لیے اتنی ہی فطری بات ہے جتنا کہ ایک نقشہ نویس عملی مقاصد کے لیے ایک قابل استعمال نقشہ تیار کرنے کے لیے پہلے زمین کی شکل کو ہموار کرتا اور توڑ پھوڑ دیتا ہے اور پھر الجھاؤ میں ڈال دینے والی جغرافیائی معلومات کے انبار سے صرف ان اشیاء کا انتخاب کرتا ہے جو کہ اس مخصوص نقشے کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہیں۔

میری دلیل اس انتخاب، تسہیل یا تاکید کے خلاف نہیں ہے، جو کہ ایک نقشہ نویس اور ایک تاریخ دان دونوں کے لیے ضروری ہے لیکن نقشہ نویس کا بگاڑ یا توڑ موڑ اس نقشہ کو استعمال کرنے والے

تمام لوگوں کے ایک مشترکہ مقصد کے لیے تکنیکی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ دان کا توڑ موڑ تکنیکی سے زیادہ نظریاتی ہوتا ہے۔ جہاں کسی منتخب پہلو پر زور (خواہ تاریخ دان کا یہ مقصد ہو یا نہ ہو) کسی نہ کسی قسم کے مفاد کو تقویت دیتا ہے، یہ مفاد معاشی یا سیاسی یا نسلی یا قومی یا جنسی کوئی ہو سکتا ہے۔

مزید برآں نظریاتی مفاد کا اظہار کھلم کھلا نہیں کیا جاتا جیسا کہ نقشہ نویس کا تکنیکی مفاد واضح ہوتا ہے۔ (یہ مرکیٹر پروجیکشن ہے جو کہ لمبے فاصلے کی جہاز رانی کے لیے ہے۔ چھوٹے فاصلے کی جہاز رانی کے لیے مختلف پروجیکشن کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے") بلکہ اس کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا تاریخ کا مطالعہ کرنے والے مشترکہ مفاد کے حامل ہیں، جسے تاریخ دان اپنی اعلیٰ ترین صلاحیت کے مطابق پورا کر رہے ہیں۔

جہاز ران دریافت کنندگان کے طور پر کولمبس اور اس کے جانشینوں کی جرأت اور دلیری پر زور دینا اور ان کی نسل کشی کا سرسری ساذکر کرنا تکنیکی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک نظریاتی انتخاب ہے۔ یہ جو کچھ کیا گیا تھا اس کا جواز مہیا کرتا ہے۔

میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تاریخ بیان کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم کولمبس پر الزام لگائیں، اسے کٹہرے میں کھڑا کریں۔ اس کام کے لیے اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اخلاقی طور پر یہ بیکار عالمانہ مشق ہو گی لیکن ظلم و سفاکی کو افسوسناک لیکن انسانی فلاح و بہبود کے لیے ادا کی جانے والی ایک ضروری قیمت خیال کرتے ہوئے قبول کر لینا آج بھی ہمارے ساتھ ہے۔ (مغربی تہذیب و تمدن کو بچانے کے لیے ہیروشیما اور ویتنام: سوشلزم کو بچانے کے لیے ہنگری اور ہم سب کو بچانے کے لیے ایٹمی اسلحے کا پھیلاؤ۔) ظلم اور سفاکی آج تک ہم میں موجود ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اسے دوسرے حقائق کے انبار میں دفن کر دیتے ہیں، جیسا کہ تابکاری فضلہ جات کو ڈبوں میں بند کر کے زمین میں دفنا دیا جاتا ہے۔

ہیروز (کولمبس) اور ان کے ستم رسیدگان (ایراواک) سے ہمارا برتاؤ، ترقی کے نام پر فتوحات اور قتل عام کی خاموش قبولیت، تاریخ کے ایک مخصوص فہم کا محض ایک پہلو ہے۔ جس میں ماضی کو حکومتوں، فاتحین، سفارت کاران اور لیڈران کے نقطہ نگاہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے، کولمبس کی طرح، وہ عالمی قبولیت کے استحقاق رکھتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ (قوم کے بانی باپ جیکسن، لنکن، ولسن، روزویلٹ، کینیڈی، کانگریس کے سرکردہ ممبران، سپریم کورٹ کے مشہور جسٹس صاحبان) قوم کی مجموعی نمائندگی کرتے ہیں، کہا یہ جاتا ہے کہ "ریاست ہائے متحدہ" حقیقت میں "متحدہ ریاستیں" ہیں جہاں تھوڑی بہت کھینچا تانی اور لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ ایسے لوگوں کی کمیونٹی ہے جن کے مفادات مشترک ہیں، بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ملک کا آئین علاقائی پھیلاؤ، کانگریس کے منظور کردہ قوانین، عدالتوں کے فیصلے، سرمایہ داری کا فروغ، تعلیمی ثقافت اور ذرائع

ابلاغ حقیقتاً ''قومی مفاد'' کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ہنری کیسنجر نے اپنی پہلی کتاب ''A World Restored'' میں لکھا ہے کہ ''تاریخ ریاستوں کی یادداشت ہوتی ہے'' جس میں اس نے انیسویں صدی کے یورپ کی تاریخ آسٹریلیا اور انگلینڈ کے راہنماؤں کے نقطہ نظر سے بیان کی ہے جبکہ ان لاکھوں افراد کو نظر انداز کر دیا ہے جنہیں ان سیاستدانوں کی پالیسیوں کے نتیجے میں مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نقطہ نگاہ کے مطابق فرانس انقلاب سے پہلے یورپ میں جو ''امن'' پایا جاتا تھا اسے چند قومی راہنماؤں کی ڈپلومیسی نے دوبارہ ''بحال'' کیا لیکن سوائے معاشرے کے اونچے طبقات کے انگلینڈ میں فیکٹری کارکنوں، فرانس میں کسانوں، ایشیا اور افریقہ کی رنگدار نسلوں اور ہر جگہ موجود خواتین اور بچوں کے لیے یہ فتوحات ''تشدد'' بھوک اور استحصال کی دنیا تھی، ایک بحال شدہ نہیں بلکہ انتشار زدہ دنیا تھی۔

ریاستہائے متحدہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے میرا نقطۂ نظر مختلف ہے، یعنی ہمیں ریاستوں کی یادداشت کو اپنی یادداشت کے طور پر کبھی قبول نہیں کرنا چاہیے۔ کسی بھی ملک کی تاریخ جسے ایک خاندان کی تاریخ کے طور پر پیش کیا گیا ہو، منتوحین، آقاؤں اور غلاموں، سرمایہ داروں اور کارکنوں، نسل اور جنس میں غالب طبقوں اور مغلوب طبقوں کے درمیان پائی جانے والی شدید مخاصموں (جو کبھی کبھار واضح نظر آتی ہیں، لیکن اکثر اوقات دبا دی گئی ہوتی ہیں) کو چھپا دیتی ہے اور ایسی مخاصمت بھری دنیا میں ایک شکار بننے والوں اور شکار کرنے والوں کی دنیا ہوتی ہے۔ یہ صاحب رائے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ البرٹ کیمس (ALBERT CAMUS) کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شکار کرنے والوں کی طرف داری نہ کریں۔

جیسا کہ تاریخ بیان کرتے ہوئے واقعات کے انتخاب اور ان کے مختلف پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے جانب داری کا شکار ہو جانا ایک ناگزیر عمل ہے، میں ترجیحاً کوشش کروں گا کہ امریکہ کی دریافت کی داستان ایراواک باشندوں کے نقطہ نظر سے، آئین کی داستان غلاموں کے نقطہ نظر سے، اینڈرو جیکسن کا قصہ چیروکیز کی نگاہ سے، خانہ جنگی کو نیویارک کے آئرش باشندوں کی نظروں سے، صنعتی نظام کو جس طرح لوئل (Lowell) ٹیکسٹائل ملز میں کام کرنے والی نوجوان خواتین دیکھتی ہیں، ہسپانوی امریکی جنگ کو کیوبا کے باشندوں کی نگاہ سے، فلپائن جزائر کی فتح کو لوزون کے سیاہ فام سپاہی کی نظروں سے، گلڈڈ ایج کو جنوبی کسانوں کی نگاہوں سے، پہلی عالمی جنگ کو سوشلسٹوں کے نقطہ نظر سے، دوسری عالمی جنگ کو امن پسندوں کے نقطۂ نظر سے، نیو ڈیل کو ہارلم کے سیاہ فاموں کی نگاہ سے، جنگ کے بعد کی امریکی ایمپائر کو لاطینی امریکہ کے قرضے تلے دبے غلاموں کی حیثیت سے کام کرنے والے کارکنوں کے نقطہ نظر سے، اس محدود حد تک بیان کر سکوں جتنا کہ کوئی ایک شخص دوسروں کے نقطہ نظر سے تاریخ کو دیکھ سکتا ہے۔

میرا مقصد ظلم کا شکار ہونے والوں کے لیے غم کا اظہار کرنا اور ظلم کرنے والوں کو برا بھلا کہنا نہیں۔ ماضی کے واقعات پر آنسو بہانا یا غصے کا اظہار کرنا حال کے لیے ہماری اخلاقی قوت کو کمزور کر دیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان حد بندی بھی ہمیشہ واضح نہیں ہوتی۔ طویل مدت میں یعنی انجام کار ظلم کرنے والا مظلوم بھی ہوتا ہے۔ قلیل مدت میں (اور اب تک، انسانی تاریخ صرف قلیل مدتوں پر ہی مشتمل ہے) ظلم کا شکار ہونے والے مایوسی کے عالم میں سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اس کلچر سے جس نے انہیں دبایا ہوتا ہے، داغدار ہو کر اکثر دوسروں کو اپنا شکار بنانے لگتے ہیں۔

تاہم پیچیدگیوں کو سمجھتے ہوئے یہ کتاب سیاست اور کلچر کے ذریعے عام لوگوں کو مشترکہ مفاد کا جھانسا دیتے ہوئے قومیت کے عظیم جال میں پھانسنے کی حکومتی کوششوں اور خود حکومتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھے گی۔ میں ان مظالم کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کروں گا، جو مظلوم لوگ ایک دوسرے پر ڈھاتے ہیں جب انہیں نظام کے تنگ باڑوں میں اکٹھا ٹھونس دیا جاتا ہے۔ میں ان کو رومانوی رنگ نہیں دینا چاہتا، لیکن مجھے ایک بات ابھی تک یاد ہے، جو میں نے ایک دفعہ کہیں پڑھی تھی: ''غریب کی چیخ و پکار ہمیشہ درست نہیں ہوتی، لیکن اگر آپ اس پر کان نہیں دھرتے آپ کو کبھی علم نہیں ہو سکے گا، کہ انصاف کیا ہے۔''

میں لوگوں کے لیے کامیابیاں یا فتوحات تلاش نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ خیال کرنا کہ تاریخ نویسی کا مقصد محض ان ناکامیوں کے اہم نکات کو دہرانا ہے، جو ماضی میں غالب رہی ہیں، تاریخ دانوں کو ناکامی یا شکست کے کبھی نہ ختم ہونے والے چکر میں شریک کار بنانے کے مترادف ہے۔ لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ماضی سے آنکھیں چرائے بغیر ممکنہ مستقبل کے بارے میں پیش بینی کرنے میں تاریخ کوئی تخلیقی کردار ادا کرے، تو میں سمجھتا ہوں ماضی کے نظروں سے اوجھل ان ضمنی واقعات کو بیان کرتے ہوئے جب خواہ مختصر سے عرصوں کے لیے سہی، لوگوں نے باہم متحد ہو کر اپنی مزاحمت کی اہلیت کا مظاہرہ کیا اور بعض اوقات کامیاب بھی رہے، نئے امکانات پر زور دینا چاہیے۔ میرا یہ خیال ہے یا شاید محض امید ہے، کہ ہم اپنا مستقبل ماضی کی صدیوں پر محیط جنگوں کے بجائے رحم اور عفو کے بھولے بسرے لمحات میں تلاش کر سکتے ہیں۔

لہٰذا امریکہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے میں نے ممکنہ حد تک منہ پھٹ اور صاف گو ہونے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے پہلے میں یہ بات قارئین کو بتا دینا چاہتا ہوں۔

کولمبس نے بہاما کے ''ایراواک''، کورٹس نے میکسیکو کے ایزٹک، پیزارو نے پیرو کے انکا، اور ورجینیا اور میساچوسٹس کے پوہٹان اور پیکوٹ کے ساتھ کیا کیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یورپ کی ابتدائی سرمایہ دارانہ ریاستوں میں سونے غلاموں اور زرعی پیداوار کے لیے ایک جنون پایا جاتا تھا۔ جو انہیں مہمات کے لیے سرمایہ فراہم کرنے والوں اور حصہ داروں

کواداٸیگیاں کرنے، مغربی یورپ میں فروغ پاتی ہوئی شاہی بیوروکریسیوں کے اخراجات سے نمٹنے کے لیے جاگیرداری کی کوکھ سے جنم لیتی والی زرعی معیشت کے فروغ کو مہمیز لگانے کے لیے اور اس عمل میں شریک ہونے کے لیے جسے بعد میں کارل مارکس نے ”سرمائے کا ابتدائی ارتکاز“ قرار دیا، کے لیے درکار تھا۔ یہ ٹیکنالوجی، کاروبار، سیاست اور کلچر کے ایک پیچیدہ نظام کی تیز و تند شروعات تھیں، جو دنیا پر اگلی صدیوں تک غلبہ جمائے رکھے گا۔

ورجینیا میں جیمز ٹاؤن پہلی مستقل انگلش نوآبادی تھی جو کہ ایک نیم وفاقی انڈین ریاست میں قائم کی گئی جس کا سربراہ پوہٹان نام کا ایک سردار تھا۔ پوہٹان انگریزوں کو سرد مہری کے ساتھ اپنی سرزمین پر آباد ہوتے دیکھتا رہا، لیکن اس نے حملہ نہ کیا۔ جب 1610ء کی سردیوں میں انگریزوں کو خوراک کی کمی کا سامنا ہوا اور نوبت فاقہ کشی تک جا پہنچی تو کچھ انگریز بھاگ کر انڈینز کے پاس آ گئے جہاں انہیں کم از کم یہ امید تھی کہ انہیں کھانے کو ملتا رہے گا۔ جب گرمیاں آئیں تو آبادی کے گورنر نے پوہٹان کے پاس اپنا ایلچی بھیجا کہ وہ بھگوڑے انگریز واپس بھیج دے۔ انگریزوں کے بیان کے مطابق جس کا جواب پوہٹان نے بڑے تکبر اور نخوت کے ساتھ دیا، اس لیے کچھ سپاہیوں کو بدلہ لینے کے لیے وہاں بھیجا گیا۔ وہ ایک انڈین آبادی پر حملہ آور ہوئے۔ چودہ یا سولہ انڈینز کو مار ڈالا، گھروں کو جلا دیا، گاؤں کے گرد کاشت کی گئی مکئی کی فصل کاٹ لی، قبیلے کی ملکہ اور اس کے بچوں کو کشتیوں میں لاد لیا، اور پھر بچوں کو پانی میں پھینک دیا اور فائرنگ کر کے ان کے بھیجے اڑا دیے۔ بعد میں ملکہ کو کشتی سے اتار کر ڈنڈوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بارہ سال بعد جیسے جیسے انگریز آبادکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا انڈینز کے اندیشوں میں بھی اضافہ ہو گیا، اور انہوں نے اپنے طور پر انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ دیوانوں کی طرح نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے 347 مردوں، عورتوں، اور بچوں کو قتل کر دیا۔ پھر اس کے بعد مکمل جنگ کا آغاز ہو گیا۔

انگریزوں نے محسوس کیا کہ وہ انڈینز کو غلام نہیں بنا سکتے اور نہ ہی ان کے ساتھ مل جل کر رہ سکتے ہیں، لہٰذا انہوں نے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ تاریخ دان ایڈمنڈ مورگن کے مطابق قتل عام کے دو تین سالوں کے اندر، انگریزوں نے :س دن کی اموات کا کئی گنا زیادہ انتقام لے لیا تھا۔

1607ء میں سفید فاموں کے ورجینیا میں پہلے سال میں پوہٹان نے جان سمتھ سے ایک درخواست کی، جو کہ ایک درست پیشگوئی ثابت ہوئی۔ اس کے مستند ہونے میں اگرچہ کچھ شک کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بہت سے انڈینز بیانات سے اس قدر مطابقت رکھتی ہے کہ اگر اس کو رسمی الفاظ کے طور پر نہ بھی

لیا جائے تو یہ اصل روح کی عکاسی ضرور کرتی ہے:

”میں نے اپنے عوام کی دو نسلوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں جنگ اور امن میں فرق کو اپنے ملک میں موجود کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر طور پر سمجھتا ہوں۔ تم وہ چیز بزور لینے پر کیوں تلے ہوئے ہو، جو تم سکون کے ساتھ محبت سے لے سکتے ہو؟ تم ہمیں کیوں برباد کرنا چاہتے ہو جو تمہیں کھانے پینے کو مہیا کرتے ہیں؟ تم جنگ سے کیا حاصل کر سکتے ہو؟ تم ہم سے کیوں حسد کرتے ہو؟ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں اور تم جو کچھ مانگتے ہو دینے کے لیے تیار ہیں، اگر تم دوستانہ طریقے سے آؤ۔ ہم اتنے سادہ نہیں ہیں کہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ اچھا گوشت کھانا، سکون سے سونا، سکون سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، انگریزوں کے ساتھ ہنسی خوشی گزر بسر کرنا اور ان کے تانبے اور کلہاڑیوں کے بدلے تجارت کرنا بہت بہتر ہے، بجائے اس کے کہ ان سے بھاگ کر جنگلوں میں جا کر ٹھنڈ میں لیٹے رہیں اور ایکورنز (اخروٹ کی طرح کا ایک جنگلی پھل)، پودوں کی جڑیں اور اس جیسی بیکار چیزیں کھائیں، اور ہمارا اس طرح پیچھا کیا جا رہا ہو کہ نہ تو کھا سکیں اور نہ سو سکیں؟“

جب اولین امریکی آبادکار نیو انگلینڈ میں آئے تو وہ بھی کسی بے آباد علاقے میں نہیں آ رہے تھے بلکہ یہ ایک ایسا علاقہ تھا کہ جہاں انڈین قبائل آباد تھے۔

وہ علاقہ جو آج جنوبی کونیکٹیکٹ اور رہوڈ جزائر کے نام سے جانا جاتا ہے وہاں پیکوٹ انڈینز کا قبضہ تھا۔ پیورٹین (سخت گیر پروٹسٹنٹ عیسائی) ان کی زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لہٰذا پیکوٹس کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں اطراف سے قتل عام کیا گیا۔ انگریزوں نے اس جنگی چال کو مزید بہتر رنگ میں استعمال کیا، جو ان سے پہلے کورٹس نے اور بعد میں بیسویں صدی میں زیادہ منظم طور پر استعمال کی گئی، یعنی دشمن کو دہشت زدہ کرنے کے لیے دانستہ طور پر جنگ نہ کرنے والی پرامن آبادیوں پر حملے کرنا۔

لہٰذا انگریزوں نے دیہاتیوں کے جھونپڑوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ ولیم براڈ فورڈ اپنی کتاب ”ہسٹری آف پلائی ماؤتھ پلانٹیشن“ میں جو کہ اس وقت لکھی گئی تھی، ایک پیکوٹ گاؤں پر جان میسن کے حملے کو یوں بیان کرتا ہے:

وہ جو آگ سے بچ کر بھاگے، انہیں تلواروں سے قتل کر دیا گیا، کچھ کو ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا اور کچھ کو تلواریں گھونپ کر ختم کر دیا گیا، اس طرح انہیں فوری طور پر انجام کو پہنچا دیا گیا، اور بہت کم فرار ہو سکے، خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس موقع پر تقریباً چار سو مرد، خواتین اور بچوں کو قتل کیا۔ ان کو آگ میں بھسم ہوتے دیکھنا ایک خوفناک منظر تھا۔“

ورجل ووگل کی کتاب ”This Land Was Ours“ میں ایک فٹ نوٹ میں لکھا ہوا

ہے: ''اس وقت کونیکٹیکٹ میں پیکوٹس کی سرکاری تعداد اکیس افراد تک مشتمل ہے۔''

کچھ عرصہ کے لیے انگریزوں نے قدرے نرم حکمت عملی اپنائے رکھی لیکن آخرکار وہ مکمل طور پر نیست و نابود کرنے پر اتر آئے۔ ایک کروڑ انڈین جو کہ کولمبس کی آمد کے وقت شمالی میکسیکو میں رہتے تھے آخر کار دس لاکھ سے بھی کم رہ گئے۔ انڈینز کی ایک بہت بڑی تعداد سفید فاموں کی متعارف کی گئی بیماریوں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن گئی۔

شمالی امریکہ پر انگریزوں کے حملے، انڈینز کے قتل عام، انگریزوں کی دھوکے بازی اور ان کی درندگی کے پس پشت وہ مخصوص طاقتور جذبہ تھا، جس نے نجی ملکیت پر مبنی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اخلاقی طور پر یہ ایک ذو معنی جذبہ تھا، رہنے کی جگہ اور کاشت کے لیے زمین کی ضرورت ایک حقیقی انسانی ضرورت ہے لیکن قلت کے حالات میں، مقابلے کی فضاء میں جنم لینے والے تاریخ کے وحشیانہ دور میں، اس انسانی ضرورت نے تمام عوام الناس کے قتل کی صورت اختیار کر لی۔

کیا کولمبس سے لے کر کورٹس، پیزارو اور پیوریٹن تک ہونے والی یہ ساری خونریزی اور دھوکا بازی، نسل انسانی کے وحشی پن سے تہذیب کی جانب سفر کے لیے ضروری تھی؟

اگر انسانوں کے لیے قربانیاں ضروری ہیں تو کیا اس اصول پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے کہ جن کی قربانی دی جا رہی ہے وہ یہ فیصلہ خود کریں؟ ہم سب اپنی کسی چیز سے دستبردار ہونے کا فیصلہ تو کر سکتے ہیں، لیکن کیا ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ اس ترقی کے لیے جس کا وجود بیماری یا صحت، زندگی یا موت کی طرح واضح نظر نہیں آتا، دوسروں کے بچوں یا پھر اپنے ہی بچوں کو آگ میں جھونک دیں؟

اور پھر ہم کیسے یقین سے کہہ سکتے ہیں، کہ جو کچھ ہم نے تباہ کیا ہے وہ گھٹیا تھا۔ وہ کون لوگ تھے جو ساحل پر آئے اور سمندر میں تیر کر کولمبس اور اس کے عملے کے لیے تحائف لے کر آئے تھے، جنہوں نے کورٹس اور پیزارو کو اپنے دیہاتی علاقوں میں گھوڑوں پر سوار گھومتے ہوئے دیکھا، جنہوں نے ورجینیا اور میساچوسٹس میں اولین سفید فام آبادکاروں کو جنگلوں میں سے جھانک کر دیکھا تھا؟

کولمبس نے انہیں انڈینز کا نام دیا کیونکہ اس نے زمین کی جسامت کا غلط اندازہ لگایا تھا، اس کتاب میں ہم بھی انہیں قدرے بے دلی کے ساتھ انڈینز ہی کہہ رہے ہیں، کیونکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ لوگوں پر وہی نام لاد دیئے جاتے ہیں، جو ان کے فاتحین انہیں عطا کرتے ہیں۔

کولمبس کی آمد کے وقت شمالی و جنوبی امریکہ کے وسیع عریض قطعۂ زمین پر دور دراز تک پھیلے ہوئے ان مقامی باشندوں کی تعداد ساڑھے سات کروڑ کے لگ بھگ تھی، غالباً ڈھائی کروڑ شمالی امریکہ میں تھے، اور مختلف زمینی اور موسمی حالات کے مطابق انہوں نے سینکڑوں مختلف قبائلی تہذیبوں اور دو ہزار مختلف زبانوں کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے فن زراعت میں کمال حاصل کیا اور مکئی کو کاشت کرنے کا

طریقہ تلاش کیا جو خود بخود نہیں اگ سکتی تھی اور اسے بونا، اگانا، کھاد ڈالنا، اور سٹے سے دانے الگ کرنا پڑتے تھے۔ انہوں نے بڑی ذہانت سے کئی قسم کی سبزیاں اور پھل تیار کیے، مونگ پھلی اور چاکلیٹ اور تمباکو اور ربڑ کی کاشت ان کے علاوہ تھی۔

انڈینز اپنے بل بوتے پر عظیم زرعی انقلاب لانے میں مصروف تھے، جس میں سے تقریباً اسی دور میں ایشیا، یورپ اور افریقہ گزر رہے تھے۔

جبکہ بہت سے قبائل ابھی تک مساوات پر مبنی معاشروں کی صورت میں خانہ بدوش شکاری اور جنگلی خوراک اکٹھی کرنے والے تھے، دوسرے کئی قبائل ایک جگہ مقیم معاشروں میں پروان چڑھ چکے تھے، جہاں خوراک کی بہتات تھی، آبادیاں بڑی تھیں، مختلف طبقوں اور مردوں اور خواتین میں تقسیم کار زیادہ واضح تھی، کھانے پینے کی اشیاء کی پیداوار اتنی وافر تھی کہ حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کی کفالت کی جا سکتی تھی، اور ان کے پاس فنی اور سماجی کاموں اور عمارات تعمیر کرنے کے لیے فرصت کے اوقات بھی تھے۔

ایڈی ران ڈیکس سے لے کر ''گریٹ لیکس'' تک جو کہ اب پینسلوانیا اور نیو یارک کا بالائی حصہ ہیں، سب سے طاقتور شمال مشرقی قبائل ''لیگ آف ایروکوئس'' آباد تھے۔ ایروکوئس کے دیہاتوں میں زمین مشترکہ ملکیت تھی اور تمام لوگ مل جل کر کام کرتے تھے۔ شکار بھی مل جل کر کیا جاتا تھا، اور گاؤں کے افراد میں برابر بانٹ دیا جاتا تھا۔

ایروکوئس معاشرے میں خواتین اہمیت اور عزت و توقیر کی حامل تھیں، وہ فصلوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور گاؤں کے معاملات کی عمومی ذمہ داری سنبھالتی تھیں، جبکہ مرد ہمیشہ شکار اور ماہی گیری میں مصروف رہتے تھے۔ جیسا کہ گیری بی ناش نے اپنی کتاب ''ریڈ، وائٹ اینڈ بلیک'' جو کہ ابتدائی امریکہ کا ایک دلچسپ مطالعہ ہے، میں لکھا ہے ''مردوں اور خواتین کے درمیان اختیارات کو تقسیم کیا گیا ہوا تھا، اور تمام معاملات میں مردوں کی بالادستی اور خواتین کی ماتحتی والا یورپی نظریہ ایروکوئس معاشرہ میں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ ایروکوئس معاشرے میں بچوں کو جہاں تہذیبی ورثے اور قبیلے کے ساتھ اتحاد اور یک جہتی کا سبق دیا جاتا تھا، انہیں آزادی اور اپنی مرضی کا تابع کرنے والی قوتوں کے سامنے سرنگوں نہ ہونے کا سبق بھی دیا جاتا تھا۔

یہ سب کچھ ان اقدار کے بالکل برعکس تھا جو اولین یورپی آبادکار اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، یعنی غریب اور امیر پر مشتمل معاشرہ جس پر مذہبی پیشواؤں اور حکمرانوں کا تسلط تھا اور خاندانوں کی سربراہی مردوں کے ہاتھوں میں تھی، گیری ناش ایروکوئس کی تہذیب کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''یورپیوں کی آمد سے قبل شمال مشرقی جنگلات میں بسنے والے قبائل میں کوئی قانون یا فرمان، تھانیدار، سپاہی، جج یا جیوریاں، عدالتیں یا جیلیں نہیں تھیں جو کہ یورپی معاشروں میں اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بنیادی ہتھیار تھے۔ اس کے باوجود قابل قبول

رویے کی حدودسختی سے قائم تھیں، اپنی انفرادی خود مختاری پر فخر کے ساتھ ساتھ ایروکوئس باشندے درست اور غلط کا ایک گہرا فہم اور معیار قائم رکھتے تھے۔ وہ شخص جو دوسرے کی خوراک چوری کرتا یا جنگ میں بزدلی کا مظاہرہ کرتا اسے اس کے قبیلے کے لوگ ''شرم'' دلاتے اور اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے اس فعل پر ندامت کا اظہار کرتا اور اس کی تلافی کرتا اور قبیلے کے افراد کو مکمل طور پر مطمئن کرتا کہ اس نے اخلاقی طور پر اپنے آپ کو پاک اور صاف کر لیا ہے۔

نہ صرف ایروکوئس بلکہ دوسرے انڈینز قبائل بھی ایسے رویے کے حامل تھے۔ لہٰذا کولمبس اور اس کے جانشین خالی بیابانوں میں نہیں آ رہے تھے بلکہ ایک ایسی دنیا میں آئے تھے جہاں بعض مقامات یورپ جتنے گنجان آباد تھے، جہاں تہذیب و تمدن بہت پیچیدہ تھا، جہاں انسانی تعلقات یورپ کی نسبت زیادہ برابری کی سطح پر تھے، جہاں مردوں، خواتین، بچوں اور قدرت کے درمیان تعلقات کو شاید دنیا میں کسی بھی دوسری جگہ کی نسبت زیادہ حسن اور خوبصورتی کے ساتھ تشکیل دیا گیا تھا۔

یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس کوئی تحریری زبان نہ تھی لیکن ان کے قوانین، ان کی شاعری، ان کی تاریخ یادداشتوں میں محفوظ تھی جو اگلی نسلوں کو منتقل کر دی جاتی تھی۔ گیتوں، رقصوں اور تقریباتی ناٹکوں کے ساتھ ساتھ ان کا زبانی ذخیرہ الفاظ یورپ کی نسبت زیادہ مرکب او پیچیدہ تھا۔ وہ شخصیت کی تعمیر، ارادے کی مضبوطی، آزادی اور لچک، جذبے اور طاقت، ایک دوسرے کے اور قدرت کے ساتھ سانجھ کاری پر ہوشمندی کے ساتھ توجہ دیتے تھے۔

ایک امریکی مفکر جان کولیئر جو کہ 1920ء اور 1930ء کے عشروں میں امریکہ کے جنوب مغرب میں آباد انڈینز کے ساتھ رہا ان کے انداز و اطوار کے بارے میں لکھتا ہے: ''اگر ہم ان کو اپنا سکیں تو اس زمین کے وسائل کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور ہمیشہ کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا امن قائم ہو سکتا ہے۔''

شاید اس میں کچھ رومانوی اساطیری رنگ بھی شامل ہو گیا ہو، لیکن اس اساطیری ادھورے پن اور نا تمامی کو شامل کرتے ہوئے بھی یہاں بہت کچھ موجود ہے جو اس دور اور ہمارے دور کے بارے میں، نام نہاد ترقی کے نام پر نسلوں کو نیست و نابود کرنے اور تاریخ کو فاتحین اور مغربی تہذیب کے راہنماؤں کے نقطۂ نظر سے بیان کرنے پر ہمیں سوال کرنے پر اکساتا ہے۔

رنگ کی بناپر امتیاز

دنیا کا کوئی بھی ملک ایسا نہیں جہاں نسل پرستی ایک لمبے عرصے تک اس قدر اہم رہی ہو جتنی کہ امریکہ میں ہے اور رنگ کی بنا پر امتیاز جیسا کہ ڈبلیو۔ ای۔ بی۔ ڈوبوئس نے کہا کہ اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ یہ ایک خالصتاً تاریخی سوال ہے: ''اس کی ابتداء کیسے ہوئی؟'' اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ ''اس کا خاتمہ کیسے ہوگا؟'' یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سفید فام اور سیاہ فام بغیر کسی نفرت کے مل جل کر زندگی بسر کر سکیں؟

اگر تاریخ ان سوالوں کا کوئی جواب دے سکتی ہے تو پھر شمالی امریکہ میں غلامی کی ابتداء (ایک برِ اعظم جہاں ہم پہلے سفید فام اور پہلے سیاہ فام کی آمد کی شہادت تلاش کر سکتے ہیں) سے اس کا تھوڑا بہت سراغ مل سکتا ہے۔ انگلش نوآبادیوں میں غلامی نے تیزی سے ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر لی، جو سیاہ فاموں کا سفید فاموں کے ساتھ ایک معمول کا محنت اور مشقت کے تعلق پر مبنی تھا۔ اس کے ساتھ ہی مخصوص نسلی احساس نے جنم لیا (خواہ یہ نفرت یا مقاومت یا رحم، یا سرپرستانہ تھا) جس نے امریکہ میں سیاہ فاموں کے لیے اگلے 350 سال تک گھٹیا سماجی حیثیت پر مہر لگا دی، جب یہ کمتر حیثیت اور اہانت آمیز خیال یکجا ہوتے ہیں تو ہم اسے نسل پرستی کا نام دیتے ہیں۔

اولین سفید فاموں کو یہاں جس قسم کے تجربات سے گزرنا پڑا وہ سب کے سب سیاہ فاموں کی غلامی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کافی تھے۔

1619ء میں ورجینیا میں بسنے والے آبادکار زندہ رہنے کے لیے کافی خوراک پیدا کرنے کے لیے مزدوروں کی تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے۔ ان میں 10-1609ء کی فاقہ زدگی کے سالوں میں زندہ بچ رہنے والے افراد بھی شامل تھے، جو جنگلوں میں جوز اور بیریز اکٹھی کرنے کے لیے خاک چھانتے رہتے تھے، اور لاشوں کو کھانے کے لیے قبریں کھودتے رہے تھے، اور بھوک سے سسک سسک کر مرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ پانچ سو آبادکاروں میں سے صرف ساٹھ باقی بچے تھے۔

انہیں زندہ رہنے کے لیے مکئی اور برآمد کرنے کے لیے تمباکو کی کاشت کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے حال ہی میں انڈینز سے تمباکو کی کاشت کا طریقہ سیکھا تھا اور 1917ء میں تمباکو سے لدا پہلا بحری جہاز انگلینڈ بھیجا تھا۔ وہ یہ جان چکے تھے کہ تمام نشاط انگیز منشیات کی طرح جنہیں اخلاقی طور پر نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے یہ ایک منفعت بخش اور نقد آور فصل تھی۔ اس کی کاشت کرنے والے اپنی تمام تر خداترسی اور مذہبی گفتگو کے ایسی نفع بخش فصل پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔

وہ کولمبس کی طرح انڈینز کو اپنے لیے کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی اور جب اپنے برتر آتشیں اسلحہ سے وہ انڈینز کا قتل عام کر سکتے تھے انہیں بھی بدلے میں قتل عام کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ انہیں پکڑ نہیں سکتے تھے اور انہیں غلام نہیں بنا سکتے تھے، وہ سخت جان، باتدبیر، سرکش اوران جنگلوں سے مانوس تھے، جبکہ باہر سے آکر بسنے والے انگریزوں کو یہ سہولت میسر نہیں تھی۔

شاید یہ ان کا اپنی نااہلی اور نالائقی اور انڈینز کی برتری اور کامیابی پر غیظ و غضب تھا جس نے ورجینیا کے باشندوں کو فوری طور پر غلاموں کی تلاش میں سرگرداں کر دیا۔ ایڈمنڈ مورگن ان کی اس ذہنی کیفیت کو اپنی کتاب "امریکی غلامی، امریکی آزادی" میں بڑی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے:

"اگر آپ آباد کار ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ آپ کی ٹیکنالوجی انڈینز سے برتر ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ مہذب اور تہذیب یافتہ ہیں اور وہ جنگلی اور وحشی ہیں، لیکن آپ کی برتر ٹیکنالوجی کچھ حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ انڈینز اپنے طور طریقوں سے رہتے ہوئے آپ کے برتر طریقوں کا تمسخر اڑاتے ہیں اور زمین پر آپ کی نسبت کم محنت کر کے وافر فوائد حاصل کرتے ہیں۔"

....اور جب آپ کے اپنے لوگ بھاگ کر ان سے جا ملیں تو یہ آخری حد ہو گی۔ لہٰذا آپ انڈینز کو قتل کریں گے، اذیتیں دیں گے، ان کے دیہات نذر آتش کریں گے، ان کے کھیت جلائیں گے۔ یہ آپ کی ناکامی کے باوجود آپ کی برتری ثابت کر دے گی اور آپ اپنے لوگوں سے بھی یہی سلوک کرتے ہیں، جو ان کی جنگلی طرز زندگی کی حمایت کرتے ہیں، ان سے جا ملتے ہیں لیکن اس سب کچھ کے باوجود آپ زیادہ مکئی کاشت نہیں کر سکتے۔

اس ساری صورتحال کا جواب سیاہ فام غلام تھے۔ لہٰذا درآمد شدہ سیاہ فاموں کو غلام تصور کر لینا ایک فطری تقاضا تھا، اگرچہ غلامی کے ادارے نے کئی عشروں تک ایک باقاعدہ اور قانونی شکل اختیار نہیں کی تھی کیونکہ 1619ء تک افریقہ سے دس لاکھ سیاہ فام پہلے ہی جنوبی امریکہ اور کیریبین میں پرتگیزی اور ہسپانوی نوآبادیوں میں غلام کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے لائے جا چکے تھے۔ کولمبس سے پچاس سال پہلے پرتگیزی دس افریقی سیاہ فاموں کو لزبن لے کر آئے تھے۔ یہ غلاموں کی تجارت کا ایک باقاعدہ

آغاز ثابت ہوا۔ لہٰذا یہ حیرانی کی بات ہو گی اگر ان بیس سیاہ فاموں کو جن کو زبردستی جیمز ٹاؤن لایا گیا اور آباد کاروں کے ہاتھ جو مستقبل کے مزدوروں کے بے تابی کے ساتھ متلاشی تھے بیچ دیا گیا، غلاموں کے علاوہ کچھ خیال کیا جائے۔

ان کی بے بسی نے غلامی کو آسان کر دیا تھا۔ انڈینز اپنی ذاتی سرزمین پر تھے۔ سفید فام اپنی یورپی تہذیب کے اندر تھے۔ سیاہ فاموں کو ان کی سرزمین اور تہذیب سے اکھاڑ لیا گیا تھا اور زبردستی ایک ایسے ماحول میں دھکیل دیا گیا تھا جہاں ان کی زبان، لباس، رسم و رواج اور خاندانی رشتہ داریوں کا ورثہ آہستہ آہستہ نیست و نابود ہو گیا تھا۔ سوائے ان چند باقیات کے جن کو سیاہ فام محض اپنی غیر معمولی ثابت قدمی سے قائم رکھے ہوئے تھے۔

کیا ان کی تہذیب کمتر تھی، اس لیے آسانی سے بربادی کا شکار ہو گئی؟ افریقی تہذیب اپنے طور پر اتنی ترقی یافتہ تھی جتنی یورپ کی۔ اس کے بعض پہلو زیادہ قابل تعریف تھے، لیکن اس میں ستم شعاری، نظام مراتب کی مراعات اور انسانی زندگیوں کو مذہب یا منافع کی بھینٹ چڑھا دینے جیسے پہلو بھی موجود تھے۔ یہ دس کروڑ افراد پر مشتمل ایک تہذیب تھی، جہاں لوگ لوہے کے آلات استعمال کرتے تھے اور زراعت میں مہارت رکھتے تھے۔ یہاں بڑے بڑے شہری مراکز تھے، جن میں کپڑا بننے، سرامکس (چینی کے برتن) اور مجسمہ سازی کے بہترین کاریگر موجود تھے۔

سولہویں صدی کے یورپی سیاح افریقہ میں موجود ٹمبکٹو اور مالی کی سلطنتوں سے بہت متاثر تھے، جو کہ اس وقت بھی مستحکم اور منظم تھیں جب یورپ کی ریاستوں نے جدید اقوام کی حیثیت سے ترقی پانے کا ابھی آغاز ہی کیا تھا۔

یورپ کی طرح افریقہ میں زراعت پر مبنی ایک قسم کی جاگیرداری موجود تھی، جس میں نوابی اور منصبداری والا ایک نظام مراتب قائم تھا لیکن افریقہ کی جاگیرداری نے یورپ کی طرح یونان اور روم کے غلام معاشروں سے جنم نہیں لیا تھا، جس نے قدیم قبائلی زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ افریقہ کی قبائلی زندگی ابھی تک اپنے کچھ اچھے پہلوؤں (برادری کی روح، قانون اور سزا میں رحم دلی کا عنصر) کے ساتھ معاشرے میں مضبوط جڑیں رکھتی تھی اور کیونکہ افریقی نوابوں کے پاس یورپی نوابوں کی طرح اسلحے کی طاقت نہیں تھی، لہٰذا ان کے لیے اپنی فرمانروائی قائم کرنا آسان نہ تھا۔

انگلینڈ میں 1740ء تک ایک بچے کو سوتی کپڑے کا ایک چیتھڑا چرانے پر پھانسی دی جا سکتی تھی لیکن کانگو میں اجتماعی معاشرتی زندگی قائم تھی، نجی ملکیت کا تصور موجود نہ تھا، اور چوری کی سزا جرمانے یا مختلف درجے کی مشقت تک محدود تھی۔ کانگو کے ایک سردار کو جب پرتگیزی ضابطۂ قوانین کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے ایک پرتگیزی سے طنزاً پوچھا: "پرتگیز میں اُس شخص کے لیے کیا سزا ہے جو زمین پر پاؤں رکھتا ہے؟"

افریقہ کے ممالک میں غلامی پائی جاتی تھی اور اس کو یورپی بعض اوقات اپنی غلاموں کی تجارت کے جواز کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ باسل ڈیوڈسن اپنی کتاب "افریقی غلاموں کی تجارت" میں وضاحت کرتا ہے یہ افریقہ کے غلام یورپ کے زرعی غلاموں جیسے تھے دوسرے الفاظ میں وہ یورپ کے زیادہ تر لوگوں جیسے ہی تھے۔ اگرچہ یہ بھی ایک غلامانہ مشقت تھی لیکن ان کے کچھ حقوق تھے جو امریکہ لائے گئے غلاموں کو حاصل نہ تھے، اور یہ غلاموں کے جہازوں پر لدے انسانی مویشیوں اور امریکی زرعی فارموں پر کام کرنے والے غلاموں سے یکسر مختلف تھے۔

افریقی غلامی میں وہ دو عناصر موجود نہیں تھے جنہوں نے امریکہ میں غلامی کو دنیا کی انتہائی ظالمانہ غلامی کی شکل دی۔ ایک لامحدود منافع حاصل کرنے کا جنون تھا جس نے سرمایہ دارانہ زراعت کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ دوسرا نسلی تعصب اور نفرت کی بناء پر غلاموں کو انسانوں کے درجے سے گرا کر ڈھور ڈنگروں کی طرح خیال کرنا، یعنی رنگ و نسل کی بے رحمانہ بنیادیں قائم کرنا، جہاں سفید فام آقا اور سیاہ فام غلام تصور کیے جاتے تھے۔

دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاہ فام افریقیوں کو ان کی دھرتی سے اکھاڑ لیا گیا تھا۔ جہاں ان کی ایک اپنی تہذیب، قبائلی رواج اور خاندانی بندھن، سماجی زندگی اور روایتی رسوم تھیں جن سے محروم ہو کر وہ بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ انہیں افریقہ کے اندرونی علاقوں سے پکڑا جاتا تھا۔ (پکڑنے والے اکثر وہ سیاہ فام ہی ہوتے تھے جن کو خود بھی غلاموں کی تجارت میں پکڑا گیا تھا) اور ساحلوں پر لا کر بیچ دیا جاتا تھا۔ پھر ان کو جانوروں کی طرح باڑوں میں دھکیل دیا جاتا تھا جہاں اکثر مختلف زبانیں بولنے والے دوسرے قبائل کے سیاہ فام ہوتے تھے۔

پکڑے گئے سیاہ فام افریقی کو جن حالات سے گزرنا پڑتا تھا، اس کے نتیجے میں وہ شدید بے بسی کے عالم میں اپنے آپ کو مکمل طور پر پکڑنے والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا تھا۔ ان کی گردنوں میں پٹے اور زنجیریں ڈال کر کوڑوں اور بندوقوں کے سائے میں ساحلوں پر بعض اوقات ہزاروں میل تک پیدل چلایا جاتا تھا۔ جس کے نتیجے میں ہر پانچ میں سے دو سیاہ فام مر جاتے تھے۔ پھر ساحل پر انہیں فروخت ہونے تک پنجروں میں رکھا جاتا تھا۔

خریدار انہیں غلاموں کے جہازوں پر لاد دیتے، جہاں ان کے لیے قبر سے زیادہ جگہ نہیں ہوتی تھی۔ وہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں جکڑے ہوئے جہاز کے تہ خانوں میں سیلن اور کیچڑ میں اپنے ہی فضلات کی بدبو میں بمشکل سانس لے رہے ہوتے تھے۔

ایک موقع پر تہ خانے سے جہاں غلام لادے ہوتے تھے شدید شور شرابے کی آوازیں آنے پر ملاحوں نے جب کنڈی کھول کر نیچے جھانکا تو انہوں نے غلاموں کو دم گھٹنے کے مختلف مراحل میں پایا، بہت

سے مر چکے تھے اور بعض کو دوسرے غلاموں نے سانس لینے کی دیوانہ وار کوشش میں قتل کر دیا ہوا تھا۔ اکثر غلام اس مسلسل معصیت سے نجات پانے کے لیے سمندر میں کود کر ڈوب جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس منظر کے ایک شاہد نے لکھا ہے کہ جہاز کا عرشہ خون اور بلغم سے اس قدر لتھڑا ہوا تھا کہ کسی مذبحہ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

ان حالات میں سمندری سفر کرنے والے ہر تین سیاہ فاموں میں سے ایک راستے میں ہی دم توڑ جاتا تھا لیکن اس کاروبار میں منافع (اکثر لاگت کا دوگنا) اس قدر زیادہ تھا کہ غلاموں کے تاجر اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور غلاموں کو مچھلیوں کی طرح جہازوں میں بھر دیا جاتا تھا۔

غلاموں کی تجارت میں پہلے ڈچ (ہالینڈ کے باشندے) اور پھر انگریز چھائے رہے۔ (1795ء میں لیور پول میں 100 سے زیادہ بحری جہاز تھے جو غلاموں کو لے کر جاتے تھے، اور پورے یورپ کی غلاموں کی تجارت کا نصف یہاں تھا۔) نیو انگلینڈ کے کچھ امریکی بھی اس کاروبار میں داخل ہو گئے اور 1637ء میں پہلا امریکی غلاموں کا جہاز "ڈیزائر" (Desire) ماربل ہیڈ، میساچوسٹس سے روانہ ہوا، اس کے گوداموں کو دو فٹ اور چھ فٹ کے خانوں میں تقسیم کر دیا گیا جن میں ٹانگوں کو ڈالنے کے لیے لوہے کی پٹیاں اور سلاخیں نصب کی گئی تھیں۔

1800ء تک ایک کروڑ سے ڈیڑھ کروڑ سیاہ فام غلاموں کے طور پر شمالی اور جنوبی امریکہ میں پہنچا دیے گئے تھے، جو کہ حقیقت میں پکڑے گئے افریقیوں کا غالباً ایک تہائی تھا۔ ایک موٹے اندازے کے مطابق ان صدیوں میں جنہیں ہم جدید مغربی تہذیب کی شروعات گردانتے ہیں، مغربی یورپ اور امریکہ کے ممالک سے جن کو دنیا کے جدید ترین ممالک تصور کیا جاتا ہے، تعلق رکھنے والے غلاموں کے تاجروں اور زرعی فارموں کے مالکوں کے ہاتھوں افریقہ کے تقریباً پانچ کروڑ باشندے غلامی اور موت کی بھینٹ چڑھے۔

اس تمام صورتحال میں، جب کہ جیمز ٹاؤن کے آبادکار مزدوروں کی تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے، مقامی انڈینز سے کام لینا ناممکن تھا، سفید فاموں کو استعمال کرنا مشکل تھا۔ منافع کے متلاشی تاجروں نے زیادہ سے زیادہ سیاہ فام منڈیوں میں فروخت کے لیے پیش کیے، کیونکہ ان سے کام لینا آسان تھا وہ ایسے ظلم و ستم سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے کہ جس سے اگر ان کی جان بچ جاتی تھی تو وہ نفسیاتی اور جسمانی بے بسی کا ایک بھیانک نمونہ ہوتے تھے۔ کیا اس میں کوئی شک رہ جاتا ہے کہ ایسے سیاہ فام غلامی کے لیے موزوں ترین کیوں خیال کیے جاتے تھے؟

اور اگر ان حالات میں کچھ سیاہ فاموں کو ملازموں کی حیثیت بھی حاصل تھی تو کیا ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا تھا جو سفید فام ملازموں کے ساتھ رکھا جاتا تھا؟

نو آبادیاتی ورجینیا کے عدالتی ریکارڈ کی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1630ء میں ایک سفید فام باشندے ہیوگ ڈیوس کو محض اس وجہ سے کوڑوں کی سزا دی گئی کہ اس نے ایک سیاہ فام کے ساتھ لیٹتے ہوئے اپنا جسم ناپاک کر لیا تھا۔ دس سال بعد مسٹر رینالڈز کے چھ ملازم جن میں ایک نیگرو بھی شامل تھا، بھاگ گئے۔ جب کہ سفید فام ملازمین کو ہلکی سزائیں دی گئیں، ایمانوئیل نیگرو کو تیس کوڑے مارے گئے اور اس کے رخسار پر گرم لوہے سے ''آر'' کا لفظ داغا گیا اور ایک سال تک یا اس کے مالک کی مرضی کے مطابق اس سے بھی زیادہ عرصہ تک بیڑیاں پہن کر کام کرنے کو کہا گیا۔

یہ غیر مساوی سلوک، توہین آمیز رویہ، ظلم و استبداد جسے ہم نسل پرستی کا نام دیتے ہیں، کیا یہ سفید فاموں کی سیاہ فاموں کے لیے ایک فطری نفرت اور کراہت کا نتیجہ بھی تھا؟ اگر نسل پرستی ایک فطری جذبہ نہیں ہے تو پھر یہ مخصوص حالات کا نتیجہ ہے اور ہمیں ان حالات کے خاتمے کا سوچنا ہوگا۔

سترہویں صدی کے امریکہ میں سیاہ فاموں اور سفید فاموں کے لیے تمام حالات بڑی شدت کے ساتھ دشمنی اور بدسلوکی کی طرف مرتکز تھے۔ ایسے حالات میں نسلوں کے درمیان معمولی سا انسانیت کا مظاہرہ بھی بنیادی انسانی جبلت کی شہادت تصور کیا جا سکتا تھا۔

سیاہ پن کے بارے میں پہلے سے قائم رائے کے باوجود جو کہ انگلش زبان میں ''منحوس، غلیظ'' (آکسفرڈ انگلش ڈکشنری) کے معنی رکھتا ہے، سترہویں صدی کے امریکہ میں سیاہ فاموں کی مخصوص اطاعت گزاری کے باوجود ایسی شہادتیں ملتی ہیں کہ جب سفید فاموں اور سیاہ فاموں کو مشترکہ مسائل، مشترکہ اور مشترکہ دشمن کا سامنا ہوتا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا سلوک کرتے تھے۔

زرعی فارموں پر غلامی کے فروغ کی وجوہات فطری نسلی نفرت کے علاوہ بھی آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں پہنچنے والے سفید فاموں کی تعداد خواہ وہ آزادانہ حیثیت سے آئے یا ملازمت کے معاہدے کے تحت (چار سے سات سال کے معاہدے کے تحت) آئے ضرورت کے مطابق کافی نہیں تھی۔ 1700ء تک ورجینیا میں غلاموں کی تعداد 6,000 تھی جو کہ کل آبادی کا بارہواں حصہ تھی۔ جبکہ 1763ء تک ان کی تعداد 170,000 ہو چکی تھی جو کہ آبادی کے نصف کے قریب تھی۔

ابتداء ہی سے درآمد کئے گئے سیاہ فام مردوں اور عورتوں نے انتہائی مشکل حالات میں، موت اور ہاتھ پاؤں کاٹے جانے کا سامنا کرتے ہوئے اپنی غلامی کے خلاف مزاحمت جاری رکھی لیکن منظم بغاوت شاذ ہی دیکھنے میں آئی۔ اکثر اوقات انہوں نے اپنی مزاحمت کو بھاگ جانے تک ہی محدود رکھا۔ اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی مزاحمت کے طریقے اپنائے گئے مثلاً توڑ پھوڑ، کام میں سست روی وغیرہ، جس کا مقصد کم از کم ان کی اپنی اور اپنے بہن بھائیوں کی انسانی قدر و منزلت کو بحال کروانا ہوتا تھا۔

ورجینیا کے 1669ء کے تحریری قانون میں ''ان کی ہٹ دھرمیوں'' کے بارے میں بھی شقیں

شامل تھیں۔ اور 1680ء میں اسمبلی نے دعوتوں اور جھگڑوں کے بہانے سیاہ فاموں کے اجتماعات پر خاص توجہ دی جن کو وہ خطرناک نتائج کے حامل خیال کرتی تھی۔ 1668ء میں نو آبادی کے شمالی کونے میں ایک منصوبے کا انکشاف ہوا جس میں سیاہ فام غلاموں نے تمام سفید فاموں کو مار ڈالنے کا پلان تیار کر رکھا تھا اور ان کے اجتماعی جنازوں کے دوران بھاگ نکلنے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔

وہ غلام جو افریقہ سے حال ہی میں وہاں پہنچے تھے اور ابھی تک اپنے قبائلی معاشرے کے ورثے کو نہیں بھولے تھے گروہوں کی صورت میں بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے اور انہوں نے نو آبادی کی سرحدوں پر جنگلوں میں بھگوڑوں کے دیہات بسانے کی کوششیں بھی کیں۔ اس کے برعکس وہ غلام امریکہ ہی میں پیدا ہوئے تھے زیادہ تر اکیلے ہی فرار ہوتے اور جو ہنر انہوں نے زرعی فارموں میں سیکھا ہوتا اس کے بل پر آزاد انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرتے۔

انگلینڈ میں نو آبادیاتی دستاویزات میں گورنر ورجینیا کی برطانوی تجارتی بورڈ کے نام 1729ء میں بھیجی گئی۔ ایک رپورٹ ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ پندرہ کے قریب نیگروز نے اپنے مالکوں سے فرار اور نزدیکی پہاڑوں میں محفوظ مقامات پر پناہ لینے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ انہیں ایسے ذرائع بھی میسر آ گئے جن کی مدد سے انہوں نے اسلحہ اور گولا بارود بھی حاصل کر لیا، اور وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا کچھ سامان کپڑے اور بستر اور کاشت کاری کے آلات بھی لے گئے۔ اگرچہ اس کوشش کو آسانی کے ساتھ ناکام بنا دیا گیا، لیکن یہ واقعہ کسی موثر کارروائی کے لیے ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔''

1710ء میں ورجینیا کی اسمبلی کو متنبہ کرتے ہوئے گورنر الگزینڈر سپاٹ ووڈ نے کہا:

''آزادی نے ایک ایسا لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے جو بولے بغیر ان تمام لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیتا ہے جو غلامی کے طوق سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی کوئی بھی بغاوت اگر اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے بہت خوفناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں لہٰذا ہمیں اس کے خلاف فوری اقدامات اٹھانے ہوں گے۔ ہمیں اپنے لیے زیادہ بہتر دفاعی انتظامات کرنا ہوں گے، اور ساتھ ہی ایسے قوانین وضع کرنا ہوں گے جو نیگروز کو باہمی صلاح مشوروں سے روک کر رکھیں۔''

فرار یا فرار ہونے کی کوششوں پر سخت ترین سزاؤں کے باوجود اتنے زیادہ سیاہ فام غلاموں کا فرار ہونا یا فراری کی کوشش کرنا ایک شدید بغاوت کی علامت تھا۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی میں ورجینیا میں غلامی کے ضابطۂ قانون کے مطابق:

''اگر ایک غلام فرار ہوتا ہوا پکڑا جاتا ہے تو ملکی عدالت ایسے ناقابل اصلاح غلام کی بحالی کے لیے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی یا کوئی بھی دوسری سزا تجویز کر سکتی ہے جو دوسرے

غلاموں کو ایسا قدم اٹھانے سے دہشت زدہ کر دے۔"

غلاموں کی بغاوت کا خوف زرعی فارموں پر ایک مستقل حقیقت بن چکا تھا۔ ولیم بائرڈ ورجینیا کا ایک دولتمند شخص جس کے پاس بہت زیادہ غلام تھے، 1736ء میں لکھتا ہے:

"ہمارے پاس ہام نسل کے کم از کم 10,000 آدمی ہیں جو ہتھیار اٹھانے کے لیے موزوں ترین ہیں۔ اور ان کی تعداد میں زیادہ بچوں کی پیدائش اور غلاموں کی درآمد کے ذریعے اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی آزادی کے جذبے سے سرشار آدمی اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو غلامی کے خلاف ایک ایسی جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے جو ہمارے ان چوڑے دریاؤں کو بھی سرخ کر دے گی۔"

غلاموں کے سفید فام آقاؤں نے اپنے زرعی فارموں پر مزدوروں کی رسد اور اپنے طرز زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک پیچیدہ اور طاقتور نظام تشکیل دیا۔ اس کی تشکیل میں وہ ہر حربہ استعمال کیا گیا تھا جو معاشرے میں ذی رتبہ لوگ طاقت اور دولت کو قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

یہ نظام بیک وقت نفسیاتی اور جسمانی تھا۔ غلاموں کو نظم و ضبط سکھایا جاتا تھا، بار بار انہیں ان کی کمتری کا احساس دلایا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے مقام کو یاد رکھیں اور سیاہ فامی کو ماتحتی کی ایک علامت کے طور پر دیکھیں۔ آقا کی طاقت کی ان دھاک جمائی جاتی۔ اپنی ذاتی ضروریات کی پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے آقا کے فائدے میں اپنا فائدہ خیال کرنے کا سبق دیا جاتا۔ ان سب مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ان میں کھیتوں میں شدید جسمانی مشقت، غلام خاندان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا، مذہب کے تسکین بخش اثرات کا استعمال، غلاموں میں عدم مساوات پیدا کرنا (جس کے لیے انہیں کھیت غلاموں اور مراعات یافتہ گھریلو غلاموں میں تقسیم کر دیا گیا) وغیرہ شامل تھے پھر اس سب پر مستزاد قانون کی طاقت اور نگران کے اختیارات تھے، جو ان پر کوڑے برسانے، جلانے، ہاتھ پاؤں کاٹنے اور جان سے مار دینے کا اختیار رکھتے تھے۔

اس کے باوجود بغاوت کے واقعات رونما ہوتے رہتے تھے جو اگرچہ زیادہ نہیں تھے لیکن سفید فام کاشتکاروں کو مسلسل خوف میں مبتلا رکھنے کے لیے کافی تھے۔

یہاں 1720ء میں کیلیفورنیا سے لندن لکھے گئے ایک خط کا اقتباس دیا جا رہا ہے:

حال ہی میں نیگروز کی ایک انتہائی بھیانک اور وحشیانہ سازش کا انکشاف ہوا ہے۔ انہوں نے بغاوت کی ایک سازش تیار کی جس کے مطابق تمام سفید فاموں کو قتل کر کے چارلس ٹاؤن پر مکمل قبضہ کر لینے کا مذموم منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ محض خدا کی رحمت کی وجہ سے بروقت اطلاع مل جانے پر یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ بہت سے سیاہ فاموں کو قید کر لیا گیا، کچھ کو

جلا دیا گیا، کچھ کو پھانسی دے دی گئی اور کچھ کو دور دراز کے علاقوں میں شہر بدر کر دیا گیا۔

ہربرٹ اپتھیکر، جس نے اپنی کتاب "امریکی نیگروز کی بغاوتیں" کے لیے شمالی امریکہ میں غلاموں کی مزاحمت پر تفصیلی تحقیق کی تقریباً 250 واقعات کی نشاندہی کرتا ہے جن میں کم از کم دس غلاموں نے مل کر بغاوت یا مالکوں کے خلاف سازش تیار کرنے کی کوشش کی۔ گاہے بگاہے غلاموں کی مزاحمت میں سفید فام بھی ملوث رہے۔ 1663ء میں گلاسٹر کاؤنٹی، ورجینیا میں معاہدے کے تحت کام کرنے والے سفید فام ملازمین اور سیاہ فام غلاموں نے مل کر آزادی حاصل کرنے کے لیے بغاوت کی سازش تیار کی، بروقت اطلاع پر ان کا منصوبہ ناکام رہا اور ان کو پھانسیاں دے دی گئیں۔

1741ء میں نیویارک میں دس ہزار سفید فام اور دو ہزار سیاہ فام غلام تھے۔ یہ ایک شدید ترین موسم سرما تھا اور غریب طبقہ جن میں سیاہ فام غلام اور سفید فام ملازمین دونوں شامل تھے، بہت زیادہ تکالیف اور پریشانیوں کا نشانہ بنے۔ جب پراسرار آگ نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو سیاہ فاموں اور سفید فاموں پر ملی بھگت اور سازش کا الزام لگایا گیا۔ ملزموں کے خلاف ایک اجتماعی غیظ و غضب بھڑک اٹھا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اطلاع کنندگان کے بھیانک الزامات اور تشدد کے ذریعے کروائے گئے اقرار کے بعد دو سفید فام مردوں اور دو سفید فام خواتین کو موت کی سزا دی گئی۔ اٹھارہ غلاموں کو پھانسی دی گئی او تیرہ غلاموں کو زندہ جلا دیا گیا۔

امریکہ کی ان نوآبادیوں میں صرف ایک خوف ایسا تھا جو سیاہ فاموں کی بغاوت سے بھی بڑھ کر تھا، اور وہ یہ تھا کہ غیر مطمئن سفید فام باشندے سیاہ فام غلاموں کے ساتھ مل کر موجودہ نظام کو تلپٹ نہ کر دیں۔ غلامی کے ابتدائی سالوں میں خاص طور پر نسل پرستی کے جذبے کو عوام کے ذہنوں میں پوری طرح راسخ کرنے سے پہلے، جبکہ معاہدے کے تحت کام کرنے والے سفید فاموں سے بھی اکثر سیاہ فام غلاموں جیسا ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا، اور اس بات کا امکان تھا کہ دونوں کسی وقت بھی متحد ہو سکتے ہیں لہٰذا اس خطرے سے نمٹنے کے لیے بھی اقدامات اٹھائے گئے۔ تقریباً اس وقت جب ورجینیا اسمبلی نے غلامی کے قوانین وضع کیے جن میں ضوابط اور سزائیں تجویز کی گئی تھیں، ایڈمنڈ مورگن لکھتا ہے:

"ورجینیا کے حکمران طبقے نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کہ تمام سفید فام سیاہ فاموں سے برتر ہیں، سماجی طور پر کمتر (لیکن سفید فام) لوگوں کو بہت سی مراعات اور سہولیات دینے کا آغاز کیا۔ 1750ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے سفید فام ملازمین کو جن کے معاہدے کی مدت ختم ہو چکی تھی، ان کے مالکوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ مرد ملازمین کو 10 بشل (تقریباً 92 سیر کے برابر) غلہ اور 30 شلنگ اور ایک بندوق دیں گے۔ جبکہ خواتین کو 15 بشل غلہ اور 40 شلنگ ادا کریں گے اور نئے آزاد ہونے والے ملازمین کو

150 ایکڑ زمین بھی دیے جانے کا حکم دیا گیا"۔

مورگن کا کہنا تھا کہ "ایک دفعہ جب چھوٹا کاشتکار محسوس کرے گا کہ اس کا محصولات کے ذریعے استحصال نہیں کیا جا رہا اور وہ خوشحال ہونا شروع ہو جائے گا تو وہ کم شورش پسند، کم خطرناک اور ایک باعزت شخص بن جائے گا۔ وہ اپنے بڑے ہمسائے کو لٹیرا نہیں بلکہ اپنے مشترکہ مفادات کا طاقتور محافظ خیال کرے گا۔"

اب ہمیں آسانی کے ساتھ تاریخ کے دھاگوں سے بنا ہوا وہ پیچیدہ جال دیکھ سکتے ہیں جو سیاہ فاموں کو امریکہ میں غلامی کے لیے پکڑنے کے لیے تیار ہوا تھا۔ افریقی غلاموں کی تجارت کے ان تاریخی تانوں بانوں میں بھوک سے مرتے ہوئے آبادکاروں کی مایوسانہ مہم جوئی، اپنی دھرتی سے جدا کیے ہوئے بے بس افریقی غلاموں کے تاجروں اور کاشتکاروں کے لیے منافع کی طاقتور تحریص، غریب سفید فاموں کے لیے برتر رتبے کی ترغیب، فرار اور بغاوت کے خلاف وضع کردہ اقدامات، کالوں اور گوروں کے اشتراک کے خلاف قانونی اور سماجی سزاؤں جیسے عناصر شامل تھے۔

اصل بحث یہ ہے کہ اس جال کے عناصر تاریخی ہیں "فطری" نہیں ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سے آسانی سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے یا ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب محض یہ ہے کہ ایسے تاریخی حالات کے تحت جن کو ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنایا گیا کسی اور بات کا امکان موجود ہے۔ ان حالات میں ایک ایسے طبقاتی استحصال کا خاتمہ ہو سکتا ہے، جس نے غریب سفید فاموں کو رتبے کے معمولی تحائف کا حریص بنا دیا ہے اور سیاہ فاموں اور سفید فاموں کے اس اتحاد کے امکان کو ختم کر دیا جو مشترکہ بغاوت اور تعمیر نو کے لیے ضروری تھا۔

1700ء کے لگ بھگ ورجینیا ہاؤس آف برجیسس (نوآبادیاتی ورجینیا کے نمائندگان کی اسمبلی) نے اعلان کیا:

> "اس ملک میں عیسائی ملازمین زیادہ تر یورپ کے بدترقسم کے لوگ ہیں اور جبکہ اتنی زیادہ تعداد میں یہاں آئرش اور دوسری اقوام کے لوگ یہاں لائے جا چکے ہیں، جن میں سے ایک بڑی تعداد سابقہ جنگوں کے سپاہیوں کی ہے، ان کو ہم اپنے موجودہ حالات کے تحت بمشکل ہی قابو رکھ سکتے ہیں۔ اگر ان کو ہتھیار مہیا کر دیے جاتے اور فوجیوں کے ساتھ انہیں ملنے دیا جاتا تو ہمارا یہ خوف بے جا نہ ہوتا کہ ہم پر ہی چڑھائی کر سکتے ہیں۔

یہ ایک قسم کا ایک طبقاتی شعور اور طبقاتی خوف تھا اور اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے ابتدائی ورجینیا اور دوسری نوآبادیوں میں واقعات رونما ہو رہے تھے۔

گھٹیا لوگ اور شرمناک صورتحال

ورجینیا کی آبادکاری کے ستر سال بعد اور انقلاب امریکہ کے لیے ورجینیا کے لیڈرشپ مہیا کرنے سے سو سال پہلے اس نوآبادی کو سرحدی علاقوں میں آباد سفید فاموں کی ایک بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، جس میں غلام اور ملازم برابر کے شریک تھے۔ یہ بغاوت اس قدر شدید تھی کہ گورنر کو آگ میں جلتے ہوئے دارالحکومت جیمز ٹاؤن کو چھوڑ کر فرار ہونا پڑا، اور انگلینڈ نے چالیس ہزار آبادکاروں کے تحفظ کے لیے ایک ہزار فوجی بحراوقیانوس کے پار بھیجنے کا فیصلہ کیا، تاریخ میں اسے بیکن کی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ بغاوت کو کچلنے کے بعد اس کا لیڈر نیتھنیل بیکن پہلے ہی مر چکا تھا، اس کے ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ رائل کمیشن رپورٹ میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

> "اس نے گنوار اور انتہائی جاہل عوام (ہر ملک میں دو تہائی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں) کو اس قدر بہکایا کہ انہوں نے دل و جان سے اپنی تمام امیدیں بیکن سے باندھ لیں، پھر اس نے گورنر کو ایک غافل اور بداعمال، دھوکے باز اور نااہل شخص، قوانین اور ٹیکسوں کو غیر منصفانہ اور استبدادانہ کہتے ہوئے اور ان کی تلافی کو انتہائی ضروری قرار دیا۔"

بیکن کی بغاوت کی ابتداء اس جھگڑے سے ہوئی کہ ان انڈینز سے کیسے نمٹا جائے جو مغربی سرحد کے بالکل قریب تھے اور ایک مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ وہ سفید فام جن کو جیمز ٹاؤن کے اردگرد وسیع و عریض زمینوں کے تحائف دیتے وقت نظرانداز کر دیا گیا تھا، زمینوں کی تلاش میں مغرب کی جانب گئے اور وہاں ان کا انڈینز سے سامنا ہوا۔ سرحدوں پر بسنے والے ورجینیا کے باشندے اس بات پر ناراض تھے کہ سیاستدانوں اور جاگیردار اشرافیہ نے، جن کا جیمز ٹاؤن میں نوآبادیاتی حکومت پر کنٹرول ہے، پہلے انہیں مغرب کی جانب انڈین علاقے میں دھکیلا اور اب انڈینز سے لڑنے میں تذبذب کا شکار تھے۔

یہ بات ان کی بغاوت کی نوعیت کو واضح کرتی ہے، جسے ہم آسانی سے نہ تو اشرافیہ کے خلاف

اور نہ ہی انڈینز کے خلاف کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں پہلوؤں کی حامل تھی۔

گورنر ولیم برکلے اور اس کے جیمز ٹاؤن کے باشندے اب جیسا کہ مشرقی زمینوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر چکے تھے۔ سرحد پر آباد سفید فاموں کو بفر کے طور پر استعمال کر سکتے تھے اور امن کے خواہاں تھے۔ کیا وہ انڈینز کے ساتھ صلح جویانہ رویے کے حامی تھے؟ (انہوں نے ان میں سے کچھ کو اپنے جاسوس اور اتحادی بنا لیا تھا۔) بغاوت کو ہر قیمت پر کچلنے کی حکومت کی کوشش کے دوہرے مقاصد تھے۔ ایک طرف وہ انڈینز کے لیے ایسی حکمت عملی وضع کر رہے تھے جو ان کے اندر پھوٹ ڈال دے، تاکہ ان پر قابو پانا آسان ہو جائے، اور دوسری طرف ورجینیا کے غریب سفید فام باشندوں کو طاقت کے مظاہرے، انگلینڈ سے فوج کی طلبی اور بڑے پیمانے پر پھانسیوں کے ذریعے یہ باور کروانا چاہتے تھے کہ بغاوت سے وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔

1976 کا دور بہت سخت تھا، "ول کومب واش برن"، جس نے برطانیہ کے نوآبادیاتی ریکارڈ کو استعمال کرتے ہوئے بیکن کی بغاوت کا بڑی جانفشانی سے مطالعہ کیا ہے۔ لکھتا ہے "اس وقت حقیقتاً معاشرے پر رنج والم اور غربت کے بادل چھا رہے تھے، تمام ہم عصر ذرائع گواہی دیتے ہیں کہ لوگ شدید معاشی بدحالی میں زندگیاں بسر کر رہے تھے۔" بیکن خود بھی اچھی خاصی زمین کا مالک تھا اور غالباً غریبوں کی مشکلات کی تلافی سے زیادہ انڈینز کو قتل کرنے میں پرجوش تھا۔ لیکن وہ ورجینیا کے حکمران طبقہ کے خلاف عوامی ناراضگی کی ایک علامت بن گیا، اور 1676ء کی بہار میں ہاؤس آف برجیسیس کے لیے منتخب ہو گیا لیکن جب اس نے انڈینز سے لڑنے کے لیے مسلح دستے تشکیل دینے پر زور دیا تو برکلے نے اسے باغی قرار دے دیا اور اسے گرفتار کر لیا، جس پر ورجینیا کے دو ہزار باشندوں نے اس کی حمایت میں جیمز ٹاؤن پر ہلہ بول دیا۔ برکلے نے معافی طلب کرنے پر بیکن کو آزاد کر دیا لیکن بیکن نے اپنی فوج بھرتی کر لی اور انڈینز پر حملے کرنے شروع کر دیے۔

بیکن کے 1676ء کے "عوامی منشور" میں امراء کے خلاف عوامی خفگی اور سرحدی باشندوں کی انڈینز دشمنی نظر آتی ہے۔ اس نے برکلے انتظامیہ پر غیر منصفانہ ٹیکسوں، اپنے چہیتوں کی اعلیٰ رتبوں پر تعیناتی، سنجاب کی تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے اور مغربی کسانوں کو انڈینز کے خلاف تحفظ فراہم نہ کرنے کے الزامات لگائے گئے۔ لیکن موسم خزاں میں انتیس سال کی عمر میں وہ بیمار پڑا اور مر گیا۔

اس کے بعد بغاوت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی، ایک بحری جہاز جس پر تیس توپیں نصب تھیں دریائے یارک میں تیرتا ہوا نظم و ضبط بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے کیپٹن گرین تھم نے آخری باغی قوتوں کو غیر مسلح کرنے کے لیے طاقت اور دھوکا بازی کا استعمال کیا۔ وہ باغیوں کے ایک بڑے فوجی جتھے پر جا پہنچا جس میں چار سو کے قریب آزاد افراد، ملازم اور غلام شامل تھے۔ اس نے تمام لوگوں سے معافی کا وعدہ کیا اور غلاموں اور ملازموں کو آزادی کی نوید سنائی، لیکن جب یہ سب جہاز پر سوار ہو گئے تو اس نے اپنی بندوقوں کا رخ ان کی طرف کر لیا، انہیں غیر مسلح کیا اور آخرکار غلاموں اور ملازموں کو ان کے مالکوں کے حوالے کر دیا۔ باقی ماندہ باغی دستوں پر ایک ایک کر کے قابو پا لیا گیا۔ تیس باغی لیڈروں کو پھانسی دے دی گئی۔

ورجینیا میں استبداد کا ایک پیچیدہ سلسلہ قائم تھا۔ انڈینز سرحدی باشندوں کی لوٹ مار کا شکار تھے جن پر جیمز ٹاؤن کی اشرافیہ نے ٹیکس اور تسلط قائم کر رکھا تھا اور انگلینڈ پوری نوآبادی کا استحصال کر رہا تھا جو آبادکاروں سے اپنی مقرر کردہ قیمت پر تمباکو خریدتا اور بادشاہ کے خزانے میں ہر سال ایک لاکھ پونڈ کا اضافہ کر رہا تھا۔

خود گورنر کے ایک تصدیقی بیان کے مطابق، اس کے خلاف بغاوت کو ورجینیا کے باشندوں کی ایک بڑی اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ گورنر کی کونسل کے ایک ممبر کے مطابق یہ "عوامی انحراف" تھا اور چند بدقماش طالع آزماؤں کا کیا دھرا تھا جو ملک کو مکمل طور پر بادشاہ کے تسلط سے آزاد کروا کر اپنی فرمانروائی قائم کرنے کی لاحاصل اور بیکار امیدیں باندھے ہوئے تھے۔ گورنر کی کیبنٹ کے ایک اور ممبر کے خیال میں بیکن کی بغاوت کا آغاز انڈین پالیسی پر اختلافات کی وجہ سے ہوا لیکن بیکن کو جو پرجوش عوامی حمایت حاصل ہوئی اس کی وجہ مساوات پر قائم معاشی نظام کے قیام کی خواہش تھی۔

انقلاب امریکہ سے ڈیڑھ صدی پہلے تمام انگلش نوآبادیوں میں غریب سفید فاموں کی دولت مندوں کے خلاف بے شمار کارروائیوں کے پس پردہ دولت کی مساوی تقسیم کا یہی محرک کارفرما تھا۔

بیکن کی بغاوت میں شامل ہونے والے ملازمین جو یورپ کے شہروں سے آنکھوں میں بہتر مستقبل کے خواب سجائے امریکہ آئے تھے، غربت میں پسے ہوئے اس اکثریتی طبقے سے تھے جن سے ان کی حکومتیں بھی جان چھڑوانا چاہتی تھیں۔ انگلینڈ میں سولہویں اور سترہویں صدی میں تجارت اور سرمایہ داری کے پروان چڑھنے اور زمینوں کو اُون کی پیداوار کے لیے مختص کرنے کے نتیجے میں شہر بے گھر اور آوارہ غریبوں سے بھر گئے تھے۔ الزبتھ کے دور حکومت کے بعد سے ان کو سزائیں دینے، مشقت کدوں میں قید کرنے یا شہر بدر کرنے کے قوانین پاس کیے گئے تھے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں زبردستی ملک بدری، بہلاوے اور ورغلاوے، سنہرے مستقبل کے وعدوں، جھوٹ اور فریب، اپنے آبائی وطنوں میں کمتر معیار زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش، نئی دنیا میں مال و دولت کے قصے کہانیوں سے متاثر غریب لوگوں میں امریکہ پہنچنے کے لیے پائی جانے والی بیتابی کے نتیجے میں یہ لوگ تاجروں، بحری جہازوں کے کپتانوں اور امریکہ میں ان کے آقاؤں کے لیے ایک منفعت بخش تجارتی شے کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد، جس کے تحت نقل مکانی کرنے والا اس بات پر راضی ہوتا تھا کہ وہ سفری اخراجات کی ادائیگی کے لیے امریکہ میں اپنے نئے مالک کے لیے پانچ سے سات سال تک کام کرے گا، ان لوگوں کو اکثر جہاز کی روانگی تک قید کرلیا جاتا تھا تاکہ کہیں یہ بھاگ نہ جائیں۔ 1619ء میں ورجینیا ہاؤس آف برجیسیس، جو اسی سال امریکہ کی پہلی نمائندہ اسمبلی کے طور پر وجود میں آئی تھی (یہ سیاہ فام غلاموں کی امریکہ میں درآمد کا بھی پہلا سال تھا) نے مالک اور ملازم کے درمیان ہونے والے معاہدے کے ریکارڈ اور اس پر عملدرآمد کے لیے قوانین وضوابط وضع کئے۔ اگرچہ کاغذات کی حد تک معاہدہ کرنے والے دونوں فریقین کو برابری کا درجہ دیا جاتا تھا لیکن معاہدے پر عملدرآمد کروانا ملازمین کی نسبت مالکوں کے لیے زیادہ آسان ہوتا تھا کیونکہ فریقین حقیقت میں مساوی اختیارات کے حامل نہیں تھے۔

امریکہ کی جانب بحری سفر آٹھ، دس یا بارہ ہفتوں پر مشتمل تھا اور ان ملازمین کو جہازوں پر منافع کے جنون میں اسی طرح ٹھونسا جاتا تھا جیسے غلاموں کو لے جانے والے جہازوں میں ہوتا تھا۔ اگر موسم خراب ہوتا اور سفر کا دورانیہ طویل ہوجاتا تو جہاز پر خوراک کا ذخیرہ ختم ہوجاتا تھا۔ ایک موسیقار "گاٹ لب مٹل برگر" نے جو 1750ء میں جرمنی سے امریکہ گیا اپنے اس بحری سفر کے بارے میں لکھا ہے:

> "سفر کے دوران جہاز پر جگہ جگہ انسانی مصائب وآلام کی علامات نظر آرہی تھیں، بدبو، تعفن، خوف، الٹیاں، مختلف قسم کی سمندری بیماریاں، بخار، اسہال، سردرد، حرارت، قبض، چھالے، سکروی، کینسر، منہ کے زخم اور ایسی ہی دوسری بیماریوں نے مسافروں کو گھیر رکھا تھا۔ ان سب کی وجہ تیز نمک والی باسی غذائیں، خاص طور پر گوشت اور غلیظ پانی تھا۔ اس پر مستزاد خوراک اور پانی کی شدید کمی، بھوک، پیاس، گرمی، سیلن، پریشانی، بے یقینی اور دیگر مصائب تھے۔ جہاز پر جس دن ہمیں ایک شدید طوفان نے گھیر رکھا تھا، ایک عورت بچے کو جنم دینے کی کوشش کررہی تھی۔ ان حالات میں جب یہ ممکن نہ ہوسکا تو اسے جہاز کے پہلو سے سمندر میں دھکیل دیا گیا۔"

معاہدے کے تحت لائے گئے ملازمین کو سیاہ فاموں کی طرح بیچا اور خریدا جاتا تھا۔ 28 مارچ 1771ء کے "ورجینیا گزٹ" میں ایک اشتہار شائع ہوا:

> "لیڈز ٹاؤن میں ابھی ابھی ایک جہاز "جسٹیشیا" پہنچا ہے جس پر تقریباً ایک سو صحت مند مرد، خواتین اور لڑکے موجود ہیں۔ ان ملازمین کی فروخت 2 اپریل بروز منگل شروع ہوگی۔"

امریکہ کے بر اعظموں کے بارے میں جہاں بہتر معیار زندگی کے دلکش اور پرکشش قصے اور

کہانیاں یورپ میں سنائی دیتی تھیں، وہیں اس کے برعکس بیانات اور اطلاعات بھی گردش کرتی رہتی تھیں۔ جیسا کہ امریکہ نقل مکانی کر کے جانے والے ایک شخص کے خط سے پتا چلتا ہے۔ "جو شخص بھی یورپ میں باعزت روزی کمارہا ہے بہتر ہے کہ وہ وہیں رہے۔ یہاں بھی ویسی ہی غربت اور مصیبتیں ہیں جیسی کہ دنیا کی کسی بھی جگہ پر ہیں۔ بعض مخصوص اشخاص کے لیے یا مخصوص حالات میں یہ مصائب وآلام یورپ سے کئی گنا زیادہ ہیں۔"

زدوکوب کرنا اور کوڑے مارنا عام تھا۔ ملازم خواتین کی عزت لوٹ لی جاتی تھی۔ 1660ء کے عشرے میں ورجینیا میں ایک مالک پر دو ملازم خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کا الزام لگا، اس کے بارے میں اپنی بیوی اور بچوں کو بھی مارنے کا چرچا عام تھا۔ اس نے ایک دوسرے ملازم کو کوڑے مارے اور زنجیروں میں جکڑ دیا حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ مالک کی عدالت نے سرزنش کی لیکن واضح شہادت کے باوجود اسے زنا بالجبر کے الزام سے بری قرار دے دیا گیا۔

مالک ملازمین کی جنسی زندگی پر مکمل کنٹرول رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ خواتین ملازماؤں کو شادی اور جنسی تعلقات سے باز رکھنا اس کے معاشی مفاد میں تھا کیونکہ ان کا حاملہ ہونا اور بچہ پیدا کرنا کام میں رکاوٹ کا باعث ہوتا تھا۔ بنجمن فرینکلن جو 1736ء میں "پوئر رچرڈ" کے نام سے لکھتا تھا اپنے قارئین کو مشورہ دیتا ہے کہ اپنی خواتین ملازماؤں کو باوقار، صحت مند اور آسائش میں رکھیں۔

بعض اوقات ملازمین نے بھی بغاوتیں منظم کیں لیکن براعظم پر ہمیں کسی ایسی بڑی سازشوں کی شہادت نہیں ملتی جیسا کہ آس پاس کے جزائر مثلاً ویسٹ انڈیز کے مقام "بارباڈوس" میں ہوا۔

بغاوتوں کے واقعات شاذ شاذ ہونے کے باوجود خطرہ ہر وقت محسوس کیا جاتا تھا اور مالک خوفزدہ رہتے تھے۔ بیکن کی بغاوت کے بعد انگریز فوجیوں کی دو کمپنیاں مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لیے ورجینیا میں مستقل قیام پذیر تھیں۔ ان کی موجودگی کا دفاع "لارڈز آف ٹریڈ اینڈ پلانٹیشن" کو پیش کی گئی ایک رپورٹ میں ان الفاظ میں کیا گیا تھا: "ورجینیا فی الحال ایک غریب اور ہمیشہ کی نسبت زیادہ آباد علاقہ ہے۔ یہاں ملازمین کی بغاوت کا بہت زیادہ خطرہ ہے کیونکہ وہ زیادہ تر ضروریات زندگی اور کپڑوں سے محروم ہیں۔ وہ کسی وقت بھی گوداموں اور تجارتی بحری جہازوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹ سکتے ہیں۔"

بغاوت کی نسبت فرار زیادہ آسان تھا۔ "جنوبی نو آبادیوں میں سفید فام ملازمین کے اجتماعی فرار کے بے شمار واقعات پیش آئے۔ رچرڈ مورس نے سترہویں صدی کے نو آبادیاتی اخبارات سے حاصل کی گئی معلومات کی بنیاد پر اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔ سترہویں صدی کے ورجینیا میں ملازمین کے اجتماعی فرار کے منصوبے اور افواہیں جگہ جگہ سننے کو ملتی تھیں۔

ان پر قابو پانے کا طریقہ کار بہت موثر تھا۔ اجنبیوں کو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ آزاد

انسان ہیں پاسپورٹ اور اسناد دکھانا پڑتی تھیں۔ نوآبادیوں کے درمیان پناہ گزین ملازمین کی حوالگی کے باقاعدہ معاہدات تھے۔ (یہ معاہدات بعد میں امریکی آئین کی ایک شق بنا دیے گئے۔ "کسی ایک ریاست میں ملازمت یا مزدوری کے لیے رکھے گئے افراد.... اگر فرار ہو کر دوسری ریاست میں جاتے ہیں۔... انہیں واپس بھیج دیا جائے گا...."

بعض اوقات ملازم ہڑتال کر دیتے تھے۔ میری لینڈ کے ایک مالک نے 1663ء میں پروونشل کورٹ میں شکایت کی کہ اس کے ملازمین نے قطعی اور واضح طور پر اپنا معمول کا کام انجام دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ملازمین نے جواب دیا کہ انہیں صرف پھلیاں اور روٹی دی جاتی ہے، وہ بہت کمزور ہو چکے ہیں "ہم وہ مشقت طلب کام نہیں کر سکتے جو یہ ہم سے کروانا چاہتا ہے۔" انہیں عدالت نے تیس تیس کوڑوں کی سزا سنائی۔

نوآبادیاتی دور میں شمالی امریکہ کے ساحلوں پر اترنے والے آبادکاروں میں سے آدھے سے زیادہ ملازمین کے طور پر یہاں آئے تھے۔ سترہویں صدی میں آنے والے آبادکاروں میں زیادہ تر انگلش لوگ تھے اور اٹھارہویں صدی میں آنے والے آبادکاروں میں آئرش اور جرمن لوگ شامل تھے۔ پھر جیسے جیسے یہ فرار ہوتے گئے۔ یا معاہدے کے مطابق اپنی مدت پوری کرتے چلے گئے سیاہ فام غلام زیادہ سے زیادہ ان کی جگہ لیتے چلے گئے۔ تاہم 1755ء تک بھی میری لینڈ میں سفید فام ملازمین کل آبادی کا 10 فی صد تھے۔

یہ ملازم جب آزاد ہو گئے تو ان کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ خوش کن داستانوں کا ایک باب ہے۔ جس میں ملازم خوشحالی کی سیڑھیاں چڑھتے گئے، خود زمینوں کے مالک بن گئے اور معاشرے کے اہم افراد میں شمار کیے جانے لگے لیکن ایبٹ سمتھ بہت محتاط مطالعہ کرنے کے بعد اپنی کتاب آبادکار معاہداتی غلامی میں (Colonialists in Bondage) لکھتا ہے کہ نوآبادیاتی معاشرہ "جمہوری نہیں تھا اور یقیناً برابری کا حامل بھی نہیں تھا۔ اس میں ان لوگوں کا غلبہ تھا جن کے پاس دوسروں کو اپنے لیے کام پر لگانے کے لیے کافی دولت موجود تھی" اور "ان میں سے شاید ہی کوئی لوگ ہوں گے جو معاہداتی ملازمین کی نسل سے ہوں، عملی طور پر ان میں سے بھی کوئی شخص اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔"

یہ بات بڑی واضح طور پر نظر آتی ہے کہ نوآبادیاتی دور میں طبقاتی حد بندیاں بڑی شدید تھیں، غریب اور امیر میں امتیاز بڑا واضح ہو گیا تھا۔ 1700ء میں ورجینیا میں پچاس دولتمند خاندان تھے، جن کی مجموعی دولت پچاس ہزار پونڈ کے برابر تھی (اس دور میں یہ ایک خطیر رقم تھی)، جو سیاہ فام غلاموں اور سفید فام ملازمین کی محنت پر زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ یہ خاندان زرعی فارموں کے مالک تھے، گورنر کونسل میں بیٹھتے اور مقامی مجسٹریٹوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ میری لینڈ میں آبادکاروں پر ایک

"پروپرائیٹر" حکومت کرتا تھا، جس کو نوآبادی پر اختیار کلی انگلینڈ کا بادشاہ عطا کرتا تھا۔ 1650ء سے 1689ء کے درمیان "پروپرائیٹرز" کے خلاف پانچ بغاوتیں ہوئیں۔

"کال بریڈن بو" کی کتاب "CITIES IN WILDERNES" سے، جس میں اس نے نوآبادیاتی شہروں کا مطالعہ پیش کیا ہے، ایک بڑے واضح طبقاتی نظام کا پتہ چلتا ہے۔ "ابتدائی بوسٹن کے لیڈر بہت زیادہ دولتمند اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ پادریوں کے ساتھ مل کر بڑی شدت کے ساتھ امریکہ میں بھی اپنے آبائی وطن جیسا سماجی بندوبست رائج کرنے کے خواہاں تھے۔"

1630ء میں "میساچوسٹس کالونی" کے بالکل ابتدائی دنوں میں گورنر جان ون تھراپ نے حکمرانوں کے فلسفے کو ان الفاظ میں بیان کیا "تمام ادوار میں کچھ لوگ امیر ہوتے ہیں کچھ غریب، کچھ لوگ طاقت اور وقار کے حوالے سے اعلیٰ اور نمایاں ہوتے ہیں اور کچھ دوسرے رذیل اور محکوم ہوتے ہیں۔"

دولتمند تاجروں نے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کیں۔ اعلیٰ مرتبہ کے لوگ بگھیوں اور پالکیوں میں سفر کرتے تھے۔ مصوروں نے اپنی قلمی تصاویر بنواتے، پیری وگز (سترہویں صدی میں پہنے جانے والی مخصوص وگز) پہنتے اور اعلیٰ درجے کی خوراک سے پیٹ بھرتے اور میڈیرا (ایک اعلیٰ درجے کی شراب) پیتے تھے۔ 1678ء میں "ڈیرفیلڈ" کے قصبے سے میساچوسٹس جنرل کورٹ میں ایک پٹیشن داخل کی گئی۔ "آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ بڑی اہم اور بہترین زمین جو کہ اپنی مٹی کی زرخیزی کی وجہ سے بہترین ہے، اپنے محل وقوع کی وجہ سے بہترین ہے، جیسا کہ یہ شہر کے مرکز میں واقع ہے اس زمین کے آدھے حصے کے مالک آٹھ یا نو افراد ہیں۔"

نوآبادیاتی دور میں نیویارک میں جاگیرداروں کی بادشاہی تھی۔ ڈچ لوگوں نے دریائے ہڈسن کے ساتھ ساتھ "پٹرن شپ نظام" قائم کر رکھا تھا۔ جو کہ بہت بڑی بڑی جاگیروں پر مشتمل تھا۔ اور یہاں نوابوں (barons) کو مزارعین پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ 1689ء میں جیکب لیسلر اور اس کے گروہ کی بغاوت میں غریب طبقے کی مشکلات اور مصائب نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا لیسلر کو پھانسی دے دی گئی اور بڑی بڑی جاگیروں کی تقسیم حسب معمول جاری رہی۔ گورنر بنجمن فلیچر کی گورنری میں نیویارک کی تین چوتھائی زمین تقریباً تین افراد کی ملکیت تھی۔ اس نے اپنے ایک دوست کو 5 لاکھ ایکڑ زمین تیس شلنگ کی سالانہ ٹوکن ادائیگی کے عوض دے دی تھی۔

1700ء میں نیویارک سٹی چرچ نے کامن کونسل سے فنڈز کے لیے کہا، کیونکہ غریب اور بے کس لوگوں کی نجات کے لیے چیخ و پکار انتہائی سنجیدہ صورت اختیار کر چکی تھی۔ 1730ء میں گلیوں میں پھرنے والے بھکاریوں کے لیے ادارے قائم کرنے کی ضرورت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

1737ء میں پیٹرز نگر "نیویارک جرنل" میں شائع ہونے والے ایک خط میں نیویارک کی گلیوں

میں آوارہ پھرنے والے بچوں کی حالت زار کچھ یوں بیان کی گئی۔" سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے نیم فاقہ زدہ یہ بچے کہنیوں سے پھٹی ہوئی قمیضوں اور پتلونوں سے جھانکتے ہوئے گھٹنوں اور میل سے چکٹ کھڑے بالوں کے ساتھ گلیوں میں گھومتے پھرتے ہیں....چار سال سے چودہ سال کی عمر تک یہ سارا دن گلیوں میں بسر کرتے ہیں....اس کے بعد چار پانچ یا چھ سال کے لیے نا آموز کی حیثیت سے کام پر لگا دیئے جاتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے دوران نوآبادیوں میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ انگریزوں کے ساتھ سکاٹ، آئرش اور جرمن آبادکار بھی شامل ہو گئے۔ سیاہ فام غلام تیزی سے لائے جا رہے تھے۔ 1700ء میں نوآبادیوں کی آبادی 2,50,000 تھی جو کہ 1760ء تک 1,60,00,000 تک جا پہنچی۔ زراعت پھیل رہی تھی، بڑے شہر، بوسٹن، نیویارک، فلاڈلفیا اور چارلسٹن حجم میں دوگنا اور تین گنا ہو رہے تھے۔

اس تمام ترقی سے صرف طبقہ بالا ہی سب سے زیادہ فیض یاب ہو رہا تھا، اور سیاسی طاقت پر بلاشرکت غیرے قابض تھا۔ 1770ء میں بوسٹن میں بڑی جائدادوں کے مالک ایک فی صد لوگ 44 فی صد دولت کے مالک تھے۔

ہر جگہ غریب لوگ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھے، وہ محض سرد موسم میں اپنے آپ کو منجمد ہونے سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہر شہر میں محتاج خانے تعمیر کئے گئے تھے جو محض بوڑھے لوگوں، بیواؤں، اپاہجوں اور یتیموں کے لیے ہی نہیں بلکہ بے روزگاروں، جنگی سپاہیوں اور نئے آنے والے آبادکاروں کے لیے بھی تھے۔ صدی کے وسط میں نیویارک میں 100 افراد کے لیے تعمیر کئے گئے محتاج خانے میں 400 سے زیادہ افراد کو جگہ دینا پڑی۔ 1748ء میں فلاڈیلفیا کا ایک شہری لکھتا ہے: "ان سردیوں میں شہر میں بھکاریوں کی تعداد میں جو اضافہ دیکھنے میں آیا ہے، وہ حقیقتاً حیران کن ہے۔" 1757ء میں بوسٹن شہر کا ایک سرکاری اہلکار یوں رقمطراز ہے، غریب اور نادار لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ جو ہر روز اپنے لیے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے بمشکل نان ونفقہ کا بندوبست کرتے ہیں۔"

یہ نوآبادیاں جیسا کہ نظر آتا ہے، آپس میں برسرپیکار طبقات پر مشتمل تھیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو روایتی تاریخ نویسی میں انگلینڈ کے خلاف بیرونی جدوجہد انقلاب میں نوآبادکاروں کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے پس پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ ملک آزاد لوگوں کا ملک ہرگز نہ تھا، بلکہ یہ غلاموں اور آزاد ملازموں اور آقاؤں، پادریوں اور زمینداروں، غریبوں اور امیروں کا ملک تھا۔ اس کے نتیجے میں سیاسی ارباب اختیار کی مخالفتیں بار بار سر اٹھاتی تھیں۔ جو بعض اوقات تند و تیز تقاریر اور احتجاج پر مبنی ہوتیں اور بعض اوقات پُرتشدد ہنگاموں کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ "گرے ناش" کے مطابق: "سترہویں صدی کے آخری ربع میں بار بار پُرتشدد ہنگامے جنم لیتے رہے جنھوں نے میساچوسٹس، نیو

یارک، میری لینڈ، ورجینیا اور نارتھ کیرولینا کی مستحکم حکومتوں کو گرا دیا۔"

آزاد سفید فام محنت کش، غلاموں اور معاہدے کے تحت کام کرنے والے ملازمین کی نسبت بہت بہتر تھے لیکن وہ بھی دولتمند طبقے کی جانب سے ہونے والے ناروا سلوک پر ہمیشہ نالاں رہتے تھے۔ 1713ء میں شہروں کے منتخب نمائندوں نے جنرل اسمبلی میساچوسٹس کو شدید غذائی قلت کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے کہا" اشیائے خورد و نوش کی قلت کے خطرے سے اشیائے ضروریہ کی قیمتیں اس قدر بڑھ جائیں گی کہ آنے والی سردیوں میں غریب لوگ اپنی ضروریات زندگی کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" اینڈریو بلیچر ایک دولتمند تاجر غلہ کیریبین برآمد کر رہا تھا کیونکہ وہاں منافع بہت زیادہ تھا۔ 19 مئی کو دو سو لوگوں نے بوسٹن کامن میں ہنگامہ کیا۔ انہوں نے بلیچر کے بحری جہازوں پر حملہ کیا اور غلے کی تلاش میں گوداموں کو توڑ کر ان میں گھس گئے اور جب لیفٹیننٹ گورنر نے مداخلت کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی۔

1730ء کے عشرے میں بوسٹن کے لوگوں نے تاجروں کی مقرر کردہ بلند قیمتوں پر احتجاج کرتے ہوئے ڈاک سکوائر میں ایک پبلک مارکیٹ کو تباہ کر دیا (جیسا کہ ایک قدامت پرست مصنف نے شکایت کی)" وہ حکومت اور امرا کے خلاف بدزبانی کر رہے تھے۔ کسی کو بھی گرفتار نہ کیا گیا کیونکہ مظاہرین نے خبردار کیا تھا کہ گرفتاری کے نتیجے میں" سامین لیگ اور کونوٹ کے 500 آدمی" آ جائیں گے اور دولتمند تاجروں کے فائدے کے لیے قائم کی گئی مارکیٹوں کو تباہ کر دیں گے۔

بوسٹن کے لوگوں کے یہ ہنگامے فوج میں زبردستی بھرتی کے خلاف بھی تھے جس کے تحت مردوں کو بحری فوج میں خدمات کے لیے بھرتی کیا جاتا تھا۔ انہوں نے گورنر کے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ شیرف کی پٹائی کی اور ڈپٹی شیرف کو اس کے کمرے میں بند کر دیا، اور ٹاؤن ہاؤس پر بھی حملہ کر دیا جہاں جنرل کورٹ (عام عدالت) بیٹھتی تھی۔ جب ان کو قابو کرنے کے لیے ملیشیا کو بلایا گیا، تو اس نے کارروائی سے انکار کر دیا اور گورنر فرار ہو گیا۔ تاجروں نے ان کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے انہیں "غیر ملکی ملاحوں پر مشتمل بلوائی اور نیگروز اور کمتر درجے کے کمینے لوگوں کا جتھا" قرار دیا۔

نیوجرسی میں 1740ء اور 1750ء کے عشروں میں چھوٹے کسانوں نے جو زمین کے ایسے ٹکڑوں پر قابض تھے جن پر وہ اور جاگیردار اکٹھے حق ملکیت کا دعویٰ رکھتے تھے اس وقت بغاوت اور ہنگامے شروع کر دیئے۔ جب ان سے زمین کا لگان طلب کیا گیا۔ 1745ء میں سیموئیل بالڈون کو جو کہ بہت عرصے سے اپنی زمینوں پر رہ رہا تھا اور جس کے پاس ان زمینوں کا انڈین حق ملکیت بھی موجود تھا، کو لگان ادا نہ کرنے پر گرفتار کر لیا گیا اور نیویارک جیل بھجوا دیا گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا ایک ہمعصر لکھتا ہے: "لوگوں نے عمومی سطح پر محسوس کیا کہ مالکان ان کو تباہ کرنے کی سازش کر رہے ہیں....وہ جیل کی طرف گئے، گیٹ کھولا اور بالڈون کو باہر نکال لیا۔"

اس عرصہ کے دوران انگلینڈ جنگوں کے ایک سلسلے سے گزر رہا تھا (18ویں صدی کے اوائل میں ملکہ این کی جنگ 1730ء کے عشرے میں کنگ جارج کی جنگ)۔ کچھ تاجروں نے ان جنگوں سے بہت دولت بنائی لیکن زیادہ تر لوگوں کے لیے ان کے نتائج بلند شرح ٹیکس، بے روزگاری اور غربت کی صورت میں سامنے آئے۔ میساچوسٹس میں شائع ہونے والے ایک گمنام پمفلٹ کے مصنف نے کنگ جارج کی جنگ کے خلاف لکھتے ہوئے جنگ کے بعد کی صورتحال کو یوں بیان کیا گیا "ہر چہرے پر غربت اور بے اطمینانی جھلک رہی ہے۔ (سوائے امراء کے چہروں کے) اور ہر زبان سے یہی آہ و پکار سنائی دے رہی ہے۔" جنہوں نے اس جنگ میں بے شمار دولت سمیٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ ایسے لوگ، بحری جہاز، خوبصورت مکان تعمیر کر سکتے ہیں، زرعی فارم خرید سکتے ہیں، سفر کے لیے خوبصورت کوچز اور بگھیاں بنوا سکتے ہیں۔ شاہانہ زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے لیے شہرت اور قابل احترام عہدے خرید سکتے ہیں۔" وہ ان کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ جہاں کہیں بھی رو رہے ہیں سفاک شکاری پرندے۔۔۔ تمام معاشروں کے دشمن ہیں۔"

بحری جہازوں پر زبردستی کام کروانے پر 1747ء میں بوسٹن میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ پھر یہ بے قابو ہجوم ایک دولتمند تاجر اور نوآبادیاتی عہدے دار "تھامس ہچن سن" کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا جس نے ان ہنگاموں کو فرو کرنے میں حکومت کی مدد کی تھی، اور جس نے میساچوسٹس کا کرنسی پلان، تیار کیا تھا جو غریبوں کے خلاف خاص امتیازی اہمیت کا حامل تھا۔ ہچن سن کے گھر کو پراسرار طور پر آگ لگ گئی اور گلی میں اکٹھا ہونے والا ہجوم ہچن سن پر لعنت ملامت کرتے ہوئے اسے زندہ جل جانے دو کے نعرے لگا رہا تھا۔

1760ء کے عشرہ کے انقلابی بحران کے سالوں تک دولتمند اشرافیہ جو امریکہ میں برطانوی نوآبادیوں پر حکومت کر رہی تھی اسے 150 سال کا تجربہ ہو چکا تھا اور وہ حکومتی رموز سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ انہیں بہت سے خدشات دامن گیر تھے لیکن انہوں نے ان خدشات سے نمٹنے کے لیے حکمت عملیاں بھی تشکیل دے لی تھیں۔

انڈین دشمنی اور غلاموں کی بغاوت کے خوف کے زیر اثر، نوآبادیاتی اشرافیہ نے، غریب سفید فاموں کی جانب توجہ دینی شروع کی جن میں ملازمین، ہاری، شہروں میں بسنے والے غریب اور جائداد سے محروم لوگ، ٹیکس ادا کرنے والے، سپاہی اور ملاح شامل تھے۔ نوآبادیوں نے جب اپنے سو سال پورے کر لیے اور 18ویں صدی کے وسط میں پہنچیں تو غریبوں اور امراء کے درمیان خلا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ معاشرے میں دنگوں اور فسادات کے خدشات میں اضافہ ہو گیا اور کنٹرول کا مسئلہ سنجیدہ صورتحال اختیار کر گیا۔

نچلے درجے کے گھٹیا لوگوں کے یہ مختلف گروہ، انڈین، سیاہ فام غلام اور سفید فام غریب اگر مل

جائیں تو کیا ہوگا؟ سترہویں صدی تک پہلے ہی سیاہ فام غلاموں کی اتنی تعداد یہاں پہنچ چکی تھی کہ بقول ایبٹ سمتھ: "اس بات کا پورا خطرہ موجود ہے کہ سفید فام ملازمین سیاہ فام غلاموں اور انڈینز سے مل کر آقاؤں کی تھوڑی سی اقلیت پر غلبہ حاصل کر لیں۔"

بیکن بغاوت نے یہ سبق سکھا دیا تھا۔ کہ سرحدوں پر آباد سفید فاموں کو گٹھ جوڑ پر برانگیختہ کرنے کی قیمت پر، معدوم ہوتے بچے کھچے ریڈ انڈینز کے ساتھ مصالحتی رویہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ انڈینز کے خلاف جنگ کی جائے تاکہ سفید فام لوگوں کی حمایت حاصل کی جا سکے اور اشرافیہ کے تحفظ کے لیے، غریب سفید فاموں کی جانب سے کسی بھی ممکنہ طبقاتی کش مکش کا رخ انڈینز کے خلاف موڑ دیا جائے۔

ایک خدشہ موجود تھا کہ سیاہ فام غلام انڈینز کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ کیرولینا (نارتھ اور ساؤتھ کیرولینا) میں سے سیاہ فام غلاموں اور قریب بسنے والے انڈینز قبائل کے مقابلے میں سفید فام باشندوں کی تعداد بہت کم تھی۔ 1750ء کے عشرہ میں 25 ہزار سفید فاموں کو 40 ہزار سیاہ فام غلاموں اور 60 ہزار کریک، چیروکی، چکنا، اور چیکا سا کا سامنا تھا جو علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔

کیرولینا (نارتھ اور ساؤتھ کیرولینا) کے حکمران اس بارے میں کوئی پالیسی وضع کرنے کے بارے میں پوری طرح متفکر تھے جیسا کہ ان میں سے ایک نے زور دیتے ہو کہا: "نیگروز اور انڈینز کے میل جول پر پابندی لگانا ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی بہت بڑی تعداد کے پیش نظر ہم ان میں سے کسی ایک کے ہاتھوں کچلے جائیں۔" لہٰذا آزاد سیاہ فاموں کے لیے انڈینز علاقے میں گھومنے پھرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ انڈینز قبائل کے ساتھ کئے گئے معاہدوں میں پناہ لینے والے غلاموں کی واپسی کے شقیں شامل تھیں۔ ساؤتھ کیرولینا کے لٹل ٹاؤن کا گورنر 1738ء میں لکھتا ہے: "اس حکومت کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ انڈینز کے دلوں میں نیگروز کے لیے نفرت پیدا کی جائے۔"

سیاہ فام انڈینز دیہاتوں میں بھاگ جاتے تھے اور کریک اور چیروکیز قبائل ان بھگوڑے سیاہ فاموں کو پناہ دیتے تھے سینکڑوں کی تعداد میں سیاہ فام غلام یہاں پناہ گزین تھے اور ان میں سے اکثر انڈینز قبائل میں مکمل مل گئے تھے انہوں نے وہاں شادیاں کر لی تھیں اور بچے بھی پیدا کر لیے تھے لیکن غلاموں کے بارے میں سخت قوانین اور سیاہ فام باغیوں کو کچلنے کے لیے انڈینز کو پیش کی جانے والی رشوتوں نے معاملات کو قابو میں رکھا۔

دراصل غریب سفید فاموں اور سیاہ فاموں کے درمیان ایسے عناصر کی موجودگی جو ان کے ممکنہ اتحاد کا باعث بن سکتے تھے، دولتمند سفید فام جاگیرداروں میں پائے جانے والے خوف اور خدشات کا باعث تھے کچھ نظریہ سازوں کا خیال تھا کہ شدید فطری منافرت کو بروئے کار لاتے ہوئے ان پر قابو پانا

آسان ہو گا۔ لیکن نسلوں کے درمیان جنسی کشش ایک طاقتور عنصر تھا۔ 1743ء میں چارلسٹن، ساؤتھ کیرولینا کی بڑی عدالت نے، نیگرو اور دوسری صحت مند اور دلکش نوجوان غلام ملازماؤں کے ساتھ مجرمانہ میل جول جس کا عام رواج تھا، سخت مذمت کی۔

بیکن کی بغاوت میں جس چیز نے ورجینیا کے حکمرانوں کو خاص طور پر خوفزدہ کر دیا تھا وہ کالے غلاموں اور سفید فام ملازمین کے مشترکہ جنگجو جتھے تھے۔ ان تمام ابتدائی سالوں کے درمیان سیاہ فام غلام اور سفید فام ملازمین مل کر فرار ہوتے رہے، جس کی تصدیق ان قوانین سے جو اس عمل کو روکنے کے لیے نافذ کیے گئے اور عدالتوں کی دستاویزات سے ہوتی ہے۔ جنوبی نوآبادیوں سے 1682ء میں بھیجے گئے ایک خط میں شکایت کی گئی، "ہمارے نیگروز کی نگرانی کرنے کے لیے یا نیگروز کی بغاوت دبانے کے لیے کوئی سفید فام موجود نہیں ہیں۔" 1721ء میں سرکار انگریزیہ کو بھیجی گئی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے: "ساؤتھ کیرولینا میں سیاہ فام غلاموں نے حال ہی میں کوشش کی اور نئے انقلاب میں کامیاب ہونے کے تقریباً قریب پہنچ گئے تھے۔ لہٰذا اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ..... مستقبل میں زیادہ سے زیادہ سفید فام ملازمین رکھنے کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی نیا قانون وضع کیا جائے۔"

1717ء میں پارلیمنٹ کا نئی دنیا میں غلاموں کی درآمد کو قابل سزا جرم قرار دینے کے پس پشت بھی یہی خوف کارفرما تھا۔ اس کے بعد ہزاروں مجرموں کو ورجینیا، میری لینڈ اور دوسری نوآبادیوں میں بھیجا جا سکا۔

نسل پرستی زیادہ سے زیادہ عملی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ایڈمنڈ مورگن ورجینیا میں غلامی کا ایک محتاط جائزہ لینے کے بعد لکھتا ہے، نسل پرستی، سیاہ و سفید میں پائے جانے والے امتیاز پر مبنی کوئی فطری امر نہیں تھا بلکہ طبقاتی نفرت اور غلاموں اور ہاریوں کو قابو میں رکھنے کی ایک شعوری حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ اگر ناامیدیوں کے شکار آزاد لوگ ان غلاموں کے ساتھ جنہیں کوئی امید بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مشترکہ مقصد کی خاطر گٹھ جوڑ کر لیتے تو یقیناً بیکن کی بغاوت سے بھی زیادہ برے نتائج سامنے آ سکتے تھے، اس مسئلے کا حل نسل پرستی تھا۔ اور حکمران بتدریج اس بات کو سمجھ گئے تھے کہ خطرناک آزاد سفید فاموں سے خطرناک سیاہ فام غلاموں کو علیحدہ رکھنے میں صرف نسلی نفرت کی دیوار ہی کام دے سکتی تھی۔

ان پر قابو پانے کا ایک اور ذریعہ بھی تھا۔ جو کہ نوآبادیوں کے حجم میں اضافے کے ساتھ بہت مفید ثابت ہوا، اور جس نے پوری امریکی تاریخ میں اشرافیہ کے مسلسل اقتدار کے لیے اہم اثرات مرتب کیے۔ بہت زیادہ دولتمند اور بہت زیادہ غریب طبقات کے ساتھ ساتھ چھوٹے کاشتکاروں آزاد کسانوں، شہری دستکاروں، پر مشتمل سفید فاموں کا ایک متوسط طبقہ وجود میں آیا۔ جن کو تھوڑی بہت مراعات دے کر تاجروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ملا کر سیاہ فام غلاموں، سرحدی انڈینز اور غریب سفید فاموں کے خلاف

ایک موثر ڈھال کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

جبکہ بوسٹن پر حکومت کرنے والا طبقہ امرا پر مشتمل تھا، اوبرے لینڈ نے میری لینڈ میں چھوٹے کاشتکاروں کا طبقہ بھی موجود پایا جو کہ اگرچہ اس کاشتکار معاشرے سے اس قدر مستفیض تو نہیں ہو پا رہا تھا، جس قدر امراء کا طبقہ فوائد سمیٹ رہا تھا۔ البتہ انہیں 'کاشتکار' کہلانے کا امتیاز حاصل تھا اور معزز شہری تصور کیے جاتے تھے۔

1756ء کے ایک 'پنسلوانین جرنل' کے مطابق اس علاقے کے اکثر لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد محنتی کسانوں، دستکاروں، یا تاجروں کی ہے۔ جب ان کو "اکثر لوگ" کہا گیا، تو سیاہ فام غلاموں سفید فام ملازموں اور اپنے علاقوں سے نکالے گئے انڈینز کو خارج کر دیا گیا تھا، اور متوسط طبقے کی اصطلاح میں وہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے جو اس ملک کے لیے عرصہ دراز سے درست خیال کی جاتی تھی۔ جیسا کہ رچرڈ ہافسٹڈر نے کہا ہے "یہ متوسط طبقے پر مشتمل معاشرہ تھا جس پر زیادہ تر اعلیٰ طبقہ حکومت کرتا رہا۔"

اعلیٰ طبقے کو اپنی حکومت اور اقتدار قائم رکھنے کے لیے متوسط طبقے کو کچھ مراعات دینا پڑتی تھیں، لیکن وہ یہ مراعات دیتے ہوئے اپنی دولت اور اقتدار میں کسی قسم کی کمی کیے بغیر یہ سب کچھ غلاموں، انڈینز اور غریب سفید فاموں کے سر سے اتارتے تھے۔ اس نے وفاداری کے جذبے کو پیدا کیا اور اس وفاداری کو مادی فوائد سے بھی زیادہ زبردست جذبے کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے 1760ء اور 1770ء میں حکمران طبقے کے ہاتھ ایک بہت زیادہ موثر تدبیر ہاتھ لگ گئی۔ یہ تدبیر آزادی اور مساوات کی زبان تھی جو کہ غلامی یا عدم مساوات کو ختم کیے بغیر انگلینڈ کے خلاف انقلابی جدوجہد کے لیے کافی زیادہ سفید فاموں کو متحد کر سکتی تھی۔

استبداد آخر استبداد ہے

1776ء کے لگ بھگ انگلش نوآبادیوں کے بعض اہم افراد کو ایک ایسی بات سمجھ میں آ گئی جو آئندہ دو سو سالوں کے لیے بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوئی۔ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ یونائٹڈ سٹیٹس (ریاست ہائے متحدہ) کے نام سے ایک قانونی اتحاد قائم کر کے اور ایک نئی قوم تشکیل دے کر وہ ان زمینوں، تجارتی منافعوں اور سیاسی اقتدار پر قابض ہو سکتے ہیں، جن پر سلطنتِ برطانیہ کے منظورِ نظر افراد نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اس طریقے سے وہ نہ صرف یہ کہ بہت سی آئندہ متوقع بغاوتوں کی روک تھام کر سکیں گے بلکہ اپنی نئی مراعات یافتہ لیڈرشپ کے لیے رائے عامہ کی حمایت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

جب ہم انقلاب امریکہ کو اس انداز سے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے بانیان کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے، اور وہ حقیقتاً اس خراج تحسین کے حق دار ٹھہرتے ہیں جو قوم صدیوں سے انہیں پیش کر رہی ہے۔ انہوں نے قومی اقتدار کا ایک موثر نظام تخلیق کیا اور مستقبل کے لیڈروں کو بھی یہ راستہ دکھا دیا کہ عوام الناس کو اقتدار سے دور رکھتے ہوئے، محض ان کی ضروریات کو پورا اور جان و مال کا تحفظ فراہم کرتے ہوئے موثر انداز میں حکومت کی جا سکتی ہے۔

1760ء کی ورجینیا میں بیکن کی بغاوت سے لے کر اٹھارہ بغاوتیں ہو چکی تھیں جن کا مقصد نوآبادیاتی حکومت کو گرانا تھا۔ اس کے علاوہ ساؤتھ کیرولینا سے نیویارک تک سیاہ فاموں کی بھی چھ بغاوتیں اور مختلف نوعیت کے چالیس ہنگامے ہو چکے تھے۔

اس وقت تک، جیک گرینی کے مطابق ایک مستحکم، متحد، موثر اور تسلیم شدہ مقامی سیاسی اور معاشرتی اشرافیہ کا طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ 1760ء کے عشرے تک اس مقامی لیڈرشپ نے باغی قوتوں کا رخ انگلینڈ اور اس کے حکام کی طرف موڑنے کے امکان کو بھانپ لیا تھا۔ یہ کوئی شعوری سازش نہیں تھی بلکہ یہ اب تک اختیار کی گئی تدبیروں کا نتیجہ تھی۔

1763ء کے بعد فرانس کو شمالی امریکہ سے باہر دھکیلتے ہوئے انگلینڈ کی سات سالہ جنگ (جسے

امریکہ میں فرانسیسی اور انڈینز جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے) میں کامیابی کے بعد نوآبادیاتی لیڈروں کو فرانسیسیوں سے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا تھا۔ اب ان کے صرف دو حریف انگریز اور انڈینز رہ گئے تھے۔ برطانیہ نے انڈینز سے دوستی کرتے ہوئے سلسلہ کوہ اپلاشین سے پار کے علاقے کو انڈینز سرزمین اور سفید فاموں کے لیے ممنوعہ قرار دے دیا (1763ء کا سرکاری اعلان)۔ شاید ایک مرتبہ برطانویوں کو راستے سے ہٹانے کے بعد انڈینز سے نمٹا جا سکتا تھا۔ ایک دفعہ دوبارہ یہ نوآبادیاتی اشرافیہ کی کوئی شعوری اور سوچی سمجھی حکمت عملی نہیں تھی بلکہ واقعات جیسے جیسے صورت اختیار کرتے گئے، یہ ایک بڑھتا ہوا شعور تھا۔

فرانسیسیوں کو شکست دینے کے بعد اب برطانوی حکومت نوآبادیوں پر اپنے اختیارات کو مضبوط کر سکتی تھی۔ اسے جنگی اخراجات کی ادائیگی کے لیے رقوم کی ضرورت تھی، اور اس کے لیے اس کی نگاہیں نوآبادیوں پر تھیں۔ نوآدباتی تجارت بھی برطانوی معیشت کے لیے زیادہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکی تھی اور بہت زیادہ نفع بخش بن چکی تھی جو کہ 1700ء میں 5,00,000 پونڈ سے بڑھ کر 1770 تک 28,00,000 پونڈ تک پہنچ چکی تھی۔

اس طرح امریکی لیڈرشپ برطانوی حکومت کی زیادہ متمنی نہیں رہ گئی تھی۔ جبکہ برطانیہ کو نوآبادیوں کی دولت کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی، آپس میں لڑائی جھگڑے کے تمام عناصر موجود تھے۔

فرانس کے ساتھ جنگ جرنیلوں کے لیے عزت و وقار، سپاہیوں کے لیے موت، تاجروں کے لیے دولت اور غربا کے لیے بے روزگاری لے کر آئی تھی۔ جب جنگ ختم ہوئی اس وقت نیویارک میں پچیس ہزار لوگ رہ رہے تھے (1720ء میں یہ سات ہزار تھے)۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر نے شہر کی گلیوں میں بھکاریوں اور آوارہ غریبوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر اپنے اداریے میں تشویش کا اظہار کیا۔ اخبارات کو لکھے گئے خطوط میں تقسیم دولت پر سوالات کیے جانے لگے۔ ہمارے بازار فروخت کے لیے آٹے کی ہزاروں بوریوں سے لدے ہوتے ہیں۔ جب کہ ہمارے قریبی ہمسائے اپنی بھوک مٹانے کے لیے ایک روٹی کا آٹا بھی بمشکل حاصل کر پاتے ہیں۔

گیری ناش کے مطابق شہر کی ٹیکس کی فہرستوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1770ء کے عشرے کے اوائل میں چوٹی کے پانچ فی صد ٹیکس ادا کرنے والے بوسٹن کے 49 فی صد اثاثوں کے مالک تھے۔ فلاڈلفیا اور نیویارک میں بھی دولت کا ارتکاز بہت زیادہ تھا۔ وصیتوں کی عدالتی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ 1750ء میں ان شہروں کے امیر ترین افرد بیس ہزار پونڈ تک کے ترکے چھوڑ رہے تھے (آج کے تقریباً 2.5 ملین کے برابر)۔

بوسٹن میں نچلے طبقے کے لوگوں نے اپنی رنجیدگیوں کا غبار نکالنے کے لیے ٹاؤن میٹنگز کا آغاز شروع کر دیا۔ میساچوسٹس کا گورنر لکھتا ہے کہ ان ٹاؤن میٹنگز میں انتہائی گھٹیا درجے کے لوگ اپنی

مسلسل حاضری کے ذریعے عام طور پر اکثریت میں ہوتے ہیں اور شرفا شہر، تاجروں اور باحیثیت کاروباری لوگوں اور اعلیٰ درجے کے شہریوں کی رائے عامہ کو بے اثر کر دیتے ہیں۔"

بوسٹن میں جو کچھ ہوا جیسا کہ ہمیں نظر آتا ہے، وہ یہ تھا کہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے بعض وکلا، ایڈیٹروں اور تاجروں نے جو کہ مقامی سلطنت برطانیہ کے منظور نظر حکمران طبقے سے باہر تھے، مثلاً جیمز اوٹس اور سموئیل ایڈمز جیسے افراد نے "بوسٹن کاؤکس" کو منظم کیا اور اپنی تقریروں اور تحریروں سے محنت کش طبقے کی رائے کو ڈھالا، عوام کو عمل پر آمادہ کیا اور ان کے رویوں کو تشکیل دیا۔ یہ گیری ناش کا اوٹس کے بارے میں تعارف ہے، جو کہ بقول اس کے "عام شہری لوگوں کی زوال پذیر تقدیر پر آزردگی سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اور وہ عوامی رائے کی عکاسی کرنے ساتھ ساتھ اسے تشکیل بھی دے رہا تھا۔"

ہمیں یہاں امریکی سیاست کی طویل تاریخ کا سراغ بھی ملتا ہے جو کہ نچلے طبقے کی قوتوں کو اعلیٰ طبقے کے سیاستدانوں کا اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر مبنی ہے۔ یہ مکمل طور پر دھوکا دہی والا معاملہ بھی نہیں تھا۔ اس میں کسی حد تک نچلے طبقے کی تکالیف کا حقیقی اعتراف شامل تھا۔ جس کی وجہ سے یہ حکمت عملی صدیوں سے کارگر ثابت ہو رہی ہے۔

1762ء میں میساچوسٹس کالونی کے کنزرویٹو حکمرانوں، جن کی نمائندگی تھامس ہچن سن کر رہا تھا، کے خلاف شہر کے کاریگروں اور دست کاروں کو متحرک کرنے کے لیے اوٹس کی ایک تقریر کا اقتباس دیا جا رہا ہے۔ جس میں اس نے اپنی وکیلوں والی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کیا ہے۔

"میں بھی آپ جیسے بہت سے لوگوں کی طرح ایک وقت کی روٹی کی خاطر دن رات اپنا خون اور پسینہ بہاتا ہوں، اور پھر روٹی کے چند نوالے عطا کرنے کے لیے وہ لوگ میری کارکردگی کے اچھے یا برے معیار پر مہر ثبت کرتے ہیں، جن کو مجھ پر حکمرانی کرنے کا کوئی مقدس یا آسمانی حق حاصل نہیں، جبکہ ان لوگوں کی ساری شان و شوکت، جاہ و وقار ہم غریب لوگوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔"

ان دنوں میں بوسٹن غیظ و غضب سے چھلک رہا تھا۔ 1763ء میں "بوسٹن گزٹ" میں کسی نے لکھا کہ "اقتدار میں موجود چند لوگ عوام کو اپنا مطیع اور فرماں بردار رکھنے کے لیے انہیں مسلسل غربت میں رکھنے کے لیے سیاسی منصوبوں کو فروغ دے رہے ہیں۔"

بوسٹن میں امراء کے خلاف غریبوں کے شکوے شکایات کا یہ ابھار آخر کار سٹیمپ ایکٹ 1756ء کے بعد ایک آتش فشاں کی صورت میں پھٹ پڑا۔ اس ایکٹ کے تحت برطانیہ اس فرانسیسی جنگ پر اٹھنے والے اخراجات کی وصولی کے لیے آباد کاروں پر ٹیکس لگانا چاہتا تھا، جس میں آباد کاروں نے سلطنت برطانیہ کی وسعت کے لیے بہت مصائب جھیلے تھے۔ ان گرمیوں میں ایبنیزر میکن ٹوش نامی ایک

موچی نے ایک ہجوم کی راہنمائی کرتے ہوئے بوسٹن کے ایک دولتمند تاجر اینڈریو الیور کے مکان کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ دو ہفتے بعد یہ ہجوم طبقہ اشرافیہ کی علامت "تھامس ہچن سن" کی رہائش گاہ پر ٹوٹ پڑا جو کہ نو آبادیوں پر انگلینڈ کے نام سے حکومت کر رہا تھا۔ انہوں نے کلہاڑیوں سے اس کا گھر تباہ کر دیا۔ اس کے تہہ خانے سے شراب کے ڈرم نکال کر پی گئے اور اس کے گھر سے فرنیچر اور قیمتی اشیاء لوٹ لیں۔ انگلینڈ میں نوآبادتی حکام کو بھیجی جانے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ یہ ایک بڑے منصوبے کا حصہ تھا جس میں پندرہ دولتمند افراد کے گھربار کو تباہ و برباد کر دینا شامل تھا۔ "لوٹ مار کی ایک ایسی جنگ جس میں معاشرے میں عمومی ہمواری پیدا کر کے غریب اور امیر کے امتیاز کو ختم کرنا مقصود تھا۔"

یہ وہ لمحات تھے جن میں امراء کے خلاف غیظ و غضب ان حدود سے آگے نکل گیا جو اوٹس جیسے لیڈران چاہتے تھے۔ کیا طبقاتی نفرت کا رخ قوم پرست اشرافیہ کو بچاتے ہوئے برطانیہ نواز اشرافیہ کی جانب پھیرا جا سکتا تھا؟

نیو یارک میں کسی شخص نے، اسی سال جب بوسٹن میں گھروں پر حملے ہوئے "نیو یارک گزٹ" کو لکھا "کیا یہ بات منصفانہ ہے کہ 99 یا 999 لوگ ایک شخص کی فضول خرچیوں اور اللوں تللوں کے لیے مصائب جھیلیں۔ جب کہ یہ بات لوگوں کے ذہن میں ہو کہ لوگوں کے پاس اکثر اوقات دولت اپنے ہمسائے کی غربت کے نتیجے میں آتی ہے؟" انقلاب کے لیڈران اس قسم کے جذبات کو حدود میں رکھنے کے لیے پریشان تھے۔

ہنر مند لوگ نو آبادیاتی شہروں میں سیاسی جمہوریت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یعنی نمائندہ اسمبلیوں کے کھلے اجلاس، قانون ساز اسمبلیوں میں عوام کے لیے گیلریاں، اور رول کال ووٹوں کی اشاعت تاکہ رائے دہندگان اپنے نمائندوں پر نگرانی رکھ سکیں۔ وہ کھلے اجلاس چاہتے تھے۔ جہاں پالیسیاں وضع کرنے میں منصفانہ ٹیکسوں، قیمتوں کے تعین میں، اور حکومتی ملازمتوں میں مکینکس اور عام لوگوں کا انتخاب کیا جا سکے۔

1776ء میں پنسلوانیا کے لیے آئین تشکیل دینے کے لیے کنونشن کے انتخابات میں ایک نجی کمیٹی نے ووٹروں کو بہت زیادہ دولتمند لوگوں کو منتخب نہ کرنے کی تاکید کی "معاشرے میں امتیازات قائم رکھنا ان کی سرشت میں داخل ہے۔" اس نجی کمیٹی نے ایک کنونشن کے لیے ایک حقوق کا بل پاس کیا جس میں خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ "چند لوگوں کے ہاتھ میں بڑی بڑی جائدادیں عام لوگوں کے حقوق اور خوشحالی کے لیے تباہ کن ہیں، اس لیے ہر آزاد ریاست کا حق ہے کہ وہ اپنے قوانین کے ذریعے ایسی جائداد کی ملکیت کی حوصلہ شکنی کرے۔"

دیہاتی علاقوں میں جہاں لوگوں کی اکثریت رہتی تھی۔ وہاں بھی اسی طرح کی امیروں اور

غریبوں کے درمیان مخاصمت پائی جاتی تھی۔ جسے سیاسی لیڈروں نے باقی غربا کو چند مراعات دیتے ہوئے اورزیادہ تر اپنے فوائد کو سمیٹتے ہوئے عوام کو برطانیہ کے خلاف متحرک کرنے میں استعمال کیا۔

1740ء کے عشرے میں نیو جرسی کے مزارعین کی بغاوتیں اور شمال مشرقی نیو یارک کی بغاوت جس کے نتیجے میں نیو یارک کی ریاست سے ''ورمونٹ'' کی ریاست نے جنم لیا محض گاہے بگاہے ہونے والے معمول کے ہنگامے نہیں تھے۔ یہ دوررس معاشرتی تحریکیں تھیں اور اس قدر منظم تھیں کہ متبادل حکومتیں تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

1766ء اور 1771ء کے دوران شمالی کیلیفورنیا میں دولتمند اور بدعنوان سرکاری حکام کے خلاف سفید فام کسانوں کی ایک ''ریگولیٹری موومنٹ'' منظم کی گئی یہ بالکل وہی عرصہ ہے جب شمال مشرق کے شہروں میں برطانویوں کے خلاف ہنگامے فروغ پا رہے تھے۔ ''ریگولیٹرز'' اپنے آپ کو ''غریب محنتی کسان'' مزدور' اور دولتمند'' اور طاقتور...... عیار اور چالاک عفریتوں کے پنجہ استبداد میں جکڑے ہوئے عوام کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ٹیکس کے اس نظام سے جو خاص طور پر غریبوں پر بوجھ تھا، اور تاجروں اور ان وکلاء کے گٹھ جوڑ سے جو عدالتوں میں خوفزدہ کسانوں سے قرضے وصول کرنے کا کام کرتے تھے سخت نالاں اور پریشان تھے۔ ''ریگولیٹرز'' ملازمین اور غلاموں کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ وہ چھوٹے مالکوں، قابضین اور مزارعوں کی بات کرتے تھے۔

1760ء کے عشرے میں نارتھ کیرولینا کی اورنج کاؤنٹی میں ''ریگولیٹرز'' ٹیکسوں کی وصولی اور ٹیکس ادا نہ کرنے والوں کی جائداد کی ضبطی کے خلاف منظم ہوئے۔ حکام کا کہنا تھا کہ ''اورنج کاؤنٹی'' میں مکمل بغاوت کا ایک خطرناک رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ اور انہوں نے اسے دبانے کے لیے فوجی منصوبے بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ ایک موقع پر سات سو مسلح کسانوں نے دو گرفتار شدہ ''ریگولیٹرز'' لیڈروں کو زبردستی رہا کروالیا۔ ایک دوسری کاؤنٹی میں ایک ملیشیا کے ایک کرنل ''این سن'' نے شکایت کرتے ہوئے کہا: ''ایسی بغاوتوں، مسلح مزاحمتوں اور پُرتشدد ہنگاموں نے جن کی پہلے مثال نہیں ملتی کاؤنٹی کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔'' ایک اور موقع پر سو آدمیوں نے عدالت کی کارروائی کو معطل کر دیا۔

ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسمبلی نے کچھ معمولی اصلاحات کے لیے قانون سازی کی، لیکن اس کے ساتھ ہی ''ہنگاموں اور بغاوتوں'' کا ایک ایکٹ بھی پاس کر دیا، اور گورنر ان کو فوجی طاقت سے کچلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مئی 1771ء میں ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں کئی ہزار ''ریگولیٹرز'' کو توپ سے لیس باقاعدہ تربیت یافتہ فوج کے ذریعے شکست دے دی گئی' اور چھ ''ریگولیٹرز'' کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ریگولیٹری کاؤنٹیوں میں سے بہت کم عوام نے محب الوطنوں کے طور پر عملی حصہ لیا، ان میں سے زیادہ تر غالباً غیر جانبدار رہے۔

خوش قسمتی سے انقلابی تحریک کے لیے کلیدی جنگیں شمال میں لڑی گئیں۔ اور یہاں شہروں میں نو آبادیاتی لیڈروں کے پاس تقسیم شدہ سفید فام آبادی تھی۔ وہ مکینکوں کو اپنے ساتھ ملا سکتے تھے، جو کہ ایک قسم کا متوسط طبقہ تھا۔ اور انگلینڈ کے خلاف جنگ میں ان کے ذاتی مفادات بھی وابستہ تھے، کیونکہ ان کو انگلینڈ کے صنعکاروں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

مسئلہ جائداد سے محروم لوگوں کو قابو کرنا تھا کہ جو فرانسیسی جنگ کے بعد پیدا ہونے والے بحران کے نتیجے میں بے روزگار اور فاقوں کا شکار تھے۔

بوسٹن میں انتہائی نچلے طبقے کے معاشی مصائب برطانیہ کے خلاف نفرت اور غصے کے ساتھ شامل ہو کر بڑے پیمانے پر عوامی تشدد کی صورت میں پھٹ پڑے، تحریک آزادی کے لیڈر اس عوامی طاقت کو انگلینڈ کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اسے حدود کے اندر بھی رکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ ان سے بہت زیادہ کا مطالبہ نہ شروع کریں۔

بوسٹن میں ایک سیاسی گروپ، ''لائل نائن'' نے جو کہ تاجروں، شراب کشید کرنے والوں، اور دستکاروں پر مشتمل تھا اور ''سٹیمپ ایکٹ'' کے مخالف تھا، 1765ء میں اس ایکٹ کے خلاف ایک جلوس نکالا۔ انہوں نے پچاس ماہر دستکاروں کو آگے رکھا، لیکن انہیں شمالی حصے سے بحری جہازوں پر کام کرنے والوں اور جنوبی سمت سے میکینکوں اور ان کے شاگردوں کو بھی متحرک کرنے کی ضرورت تھی۔ اس جلوس میں دو سے تین ہزار تک افراد شامل تھے۔ نیگروز کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں نے ''سٹیمپ ماسٹر'' کے گھر تک مارچ کی اور اس کا پتلا جلایا۔ لیکن جب جلوس کو منظم کرنے والے چلے گئے تو ہجوم بے قابو ہو گیا اور اس نے ''سٹیمپ ماسٹر'' کی کچھ جائداد بھی تباہ و برباد کر دی۔

اب ایک ٹاؤن میٹنگ بلائی گئی، اور ان ہی لیڈروں نے جنہوں نے اس مظاہرے کا منصوبہ بنایا تھا، تشدد کی مذمت کی اور ہجوم کے اس عمل سے لاتعلقی کا اعلان کیا۔ اور جب شدید مزاحمت کی وجہ سے ''سٹیمپ ایکٹ'' واپس لے لیا گیا تو کنزرویٹر لیڈروں نے بلوائیوں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ انہوں نے پہلے سٹیمپ ایکٹ مخالف مظاہروں کا سالانہ جشن منایا۔ جس میں انہوں نے ''ڈرک ہیورڈز'' کے بقول اس میں بجائے بلوائیوں کے ''زیادہ تر اعلیٰ اور درمیانے طبقے کے بوسٹین کو مدعو کیا، جو شاندار دعوتوں کے لیے ''روکس بری'' اور ''ڈوچیسٹر'' میں کوچوں اور بگھیوں پر سوار ہو کر آئے۔

برطانوی پارلیمنٹ نے جب دوسری مرتبہ نو آبادیوں پر ٹیکس لگانے کی کوشش کی، اس دفعہ ٹیکسوں کا ایک مجموعہ تیار کیا گیا تھا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس کی زیادہ مخالفت نہیں ہو گی۔ تو نو آبادیاتی لیڈروں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ لیکن انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ''کوئی جلوس یا ہنگامہ نہیں ہو گا۔ اپنے انتہائی سخت دشمنوں کی جانیں اور جائدادیں محفوظ رہنے دیں۔'' سیموئیل ایڈمز نے

ہدایت کی۔ جیمز اوٹس نے کہا" کوئی جلوس کوئی افراتفری کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ کسی بھی قسم کے حالات خواہ انتہائی ظالمانہ اور استبدادانہ ہی کیوں نہ ہوں۔ عوامی غنڈہ گردی اور ہنگاموں کا جواز مہیا نہیں کرتے....."

برطانیہ کا فوجیوں کو رہائش مہیا کرنا ملاحوں اور دوسرے مزدور طبقے کے لیے براہ راست نقصان دہ تھا۔ 1768ء کے بعد دو ہزار فوجیوں کو بوسٹن میں رہائش مہیا کی گئی، اور عوام اور فوجیوں کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ فوجی عام کارکنوں کی ملازمتوں پر قابض ہونا شروع ہوگئے، جبکہ ملازمتیں پہلے ہی بہت کم تھیں۔ اور 5 مارچ 1770 ٔمیں رسے بنانے والوں کی برطانوی فوجیوں، جو ان کی ملازمتوں پر قابض ہورہے تھے، کے خلاف شکایات نے لڑائی کی صورت اختیار کرلی۔

کسٹم ہاؤس کے سامنے ایک ہجوم جمع ہوگیا اور فوجیوں کو اشتعال دلانے لگا جنہوں نے گولیاں چلا کر پہلے ایک ملاٹو (ایسے فرد کے لیے ایک تحقیر آمیز اصطلاح جس کے ماں باپ میں سے ایک گورا اور ایک کالا ہو) کارکن "کرپس اٹیکس" کو مار ڈالا پھر دوسروں کو مار دیا۔ اسے بوسٹن کے قتل عام کے نام سے جانا جاتا تھا۔ چھ برطانوی فوجیوں کو بری کردینے پر برطانیہ کے خلاف جذبات بہت تیزی سے بھڑک اٹھے (دو کو انگوٹھوں پر نشان لگانے کے بعد فوج سے برخاست کرنے کی سزا دی گئی)۔ برطانوی فوجیوں کے وکیل صفائی نے قتل عام کی جگہ پر موجود لوگوں کو "مختلف النسل کے گستاخ لونڈے، نیگروز اور ملاٹوز (دوغلے) اور غیر ملکی ملاح" قرار دیا۔ قتل عام میں مرنے والے لوگوں کے جنازے میں تقریباً دس ہزار افراد نے شرکت کی، جبکہ بوسٹن کی کل آبادی سولہ ہزار تھی۔ اس پر انگلینڈ نے بوسٹن سے فوجیوں کو ہٹا کر صورت حال کو معمول پر لانے کی کوشش کی۔

اس قتل عام کا پس منظر زبردستی فوج میں بھرتی تھا۔ 1760ء کے عشرے میں نیو یارک اور رھوڈز آئی لینڈ کے قصبے نیو پورٹ میں زبردستی بھرتی کے خلاف جہاں چھ سو ملاحوں اور نیگروز نے شدید ہنگامے کیے، بوسٹن کے قتل عام سے چھ ہفتے پہلے نیو یارک میں برطانوی فوجیوں کے ساتھ ملاحوں کی جھڑپ ہوئی جو ان کی ملازمتوں پر قابض ہورہے تھے، اور ایک ملاح ہلاک ہوگیا۔

دسمبر 1773ء میں بوسٹن ٹی پارٹی میں بحری جہازوں سے آنے والی چائے کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا۔ ڈرک ہیورڈ کا کہنا ہے کہ ایک سال پہلے برطانیہ مخالف تحریکوں کو منظم کرنے کے لیے "دی بوسٹن کمیٹی آف کارسپونڈنس" تشکیل دی گئی تھی جو کہ "ابتداء سے ہی چائے کے خلاف ہر قسم کے اقدامات کو کنٹرول کرتی تھی"۔ ٹی پارٹی کے بعد پارلیمنٹ نے جابرانہ دفعات (Coercive Acts) لاگو کردیں۔ جو دراصل میساچوسٹس میں مارشل لا کا نفاذ تھا۔ نوآبادیاتی حکومت ختم کردی گئی، بوسٹن میں بندرگاہ بند کردی گئی اور فوج بھیج دی گئی۔ اس کی مخالفت میں عوامی اجلاس منعقد کیے گئے۔

پاؤلین میئر نے اپنی کتاب "مزاحمت سے انقلاب تک" میں 1776ء سے پہلے عشروں میں

برطانیہ کی مخالفت کا جائزہ لیتے ہوئے لیڈر شپ کی اعتدال پسندی، اور مزاحمت کے کی خواہش کے باوجود نظم وضبط اور قانون کی پابندی کے جذبے پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ "سنز آف لبرٹی" کے آفیسر اور کمیٹی ممبران، نوآبادیاتی معاشرے کے متوسط اور اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔" تاہم ان کی کوشش تھی کہ اپنی تنظیم کو وسعت دیتے ہوئے، دیہاڑی دار مزدوروں اور کارکنوں کی عوامی بنیادیں مہیا کرسکیں۔

ورجینیا میں تعلیم یافتہ اشرافیہ کو پورا شعور تھا کہ نچلے طبقے کو انقلابی جدوجہد میں شامل کرنے اور ان کے غیظ وغضب کو انگلینڈ کی طرف موڑنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔

یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا پیٹرک ہنری کا فصاحت وبلاغت پر مبنی فن تقریر ایک شاندار حل تھا۔ اس نے ایسی پر اثر تقاریر کیں جنہوں نے معاشرے کے تمام طبقات کو جوش اور ولولے سے بھر دیا۔ اس نے عوامی تکالیف اور مصائب کو اس طرح بیان کیا کہ لوگ برطانیہ کے خلاف غیظ وغضب سے بھر گئے، وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا تھا جو باغیوں میں طبقاتی مخاصمت پیدا نہ ہونے دیں، اور اس کے حسن بیان اور زور خطابت میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ سامعین کو حب الوطنی کے جذبات سے سرشار کردے جس کی مزاحمتی تحریک کے لیے ضرورت تھی۔

پین کے "کامن سینس" نے، جو 1776ء کے اوائل میں منظر عام پر آیا، اور امریکی نوآبادیوں میں سب سے زیادہ مقبول کتابچے کی حیثیت اختیار کرگیا، یہ کام کر دکھایا۔ اس میں آزادی کے حق میں پہلی مرتبہ جراتمندانہ دلیل دی گئی جسے کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ "ہر ریاست میں معاشرتی رسوم ورواج ایک رحمت ہوتے ہیں، لیکن حکومت اپنی بہترین صورت میں بھی ایک ناگزیر بدی ہے۔"

پین نے برطانوی ملوکیت کی کراہت آمیز تاریخ کی مدد سے بادشاہیوں کے خدائی حق کی شدید مخالفت کی، اس نے ابتداء 1066ء کی "نورمن" فتح سے کی جب فاتح ولیم برطانوی تخت پر قابض ہونے کے لیے فرانس سے یہاں پہنچا: "ایک فرانسیسی حرامی اپنے مسلح رہزنوں کے ساتھ مقامی لوگوں کی رضا کے خلاف انگلینڈ کے تخت پر قابض ہونے کے لیے اس سرزمین پر اترا، سادہ الفاظ میں یہ ایک بدمعاشی تھی جسے کسی قسم کا تقدس حاصل نہ تھا۔"

پین نے انگلینڈ کے ساتھ چمٹے رہنے یا اس سے علیحدگی کے عملی فوائد پر کھل کر بحث کی:

"میں مصالحت کی حمایت کرنے والے انتہائی سرگرم افراد کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مجھے انگلینڈ کے ساتھ تعلق قائم رکھنے کا ایک واحد فائدہ گنوادیں، میں دوبارہ چیلنج کرتا ہوں کہ ہم اس سے کوئی ایک فائدہ بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمارے غلے یورپ کی کسی بھی مارکیٹ سے اپنی قیمت وصول کرسکتے ہیں۔ اور درآمدات کے لیے ہم جہاں بھی جائیں گے ادائگی بہرحال کرنا ہوگی...."

جہاں تک انگلینڈ کے ساتھ تعلقات کے بداثرات کا تعلق تھا، پین نے آبادکاروں کی اپیل کی کہ وہ ان تمام جنگوں کو یاد کریں جن میں انگلینڈ نے انہیں پھنسائے رکھا، بے شمار جانیں اور رقوم ان جنگوں کی نذر ہو گئیں۔ اس نے بتدریج جذبات کو ابھارتے ہوئے لکھا۔ "ہر قابل فہم اور عقل پر مبنی پہلو علیحدگی کا تقاضا کر رہا ہے۔ جنگوں میں قتل ہونے والوں کا خون، قدرت کی آہ و پکار کرتی ہوئی صدائیں سب کہہ رہی ہیں" یہ علیحدگی کا وقت ہے۔"

1776ء میں "کامن سینس" کے پچیس ایڈیشن شائع ہوئے اور اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں۔ تقریباً ہر پڑھے لکھے آبادکار نے اسے پڑھا تھا یا اس کے مندرجات سے آگاہ تھا۔ اس وقت انگلینڈ کے ساتھ تعلقات کے بارے میں بحث مباحثے پر مبنی بے شمار کتابچے شائع ہوئے۔ 1750ء سے 1776ء تک تقریباً چار سو کتابچے شائع ہوئے جن میں سٹیمپ ایکٹ یا بوسٹن کے قتل عام یا ٹی پارٹی یا قانون کی نافرمانی، حکومت سے وفاداری، حقوق اور فرائض کے بارے میں مختلف آرا پیش کی گئی تھیں۔

پین کے کتابچے نے انگلینڈ سے ناراض آبادکاروں کی ایک بڑی تعداد کی آراء کو متاثر کیا۔ لیکن جان ایڈیمز جیسے اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے افراد میں کسی حد تک تشویش کی لہر بھی پیدا کر دی جو اگرچہ محب الوطن لوگوں کے حامی تو تھے، لیکن ساتھ ہی چاہتے تھے کہ وہ جمہوریت کی جانب زیادہ دور تک نہ چلے جائیں۔ ایڈیمز کا خیال تھا کہ عوامی اجتماعات کو لگام ڈالنی چاہیے۔ کیونکہ کہ یہ جلد بازی کے اور نامعقول فیصلوں کا موجب بنتے تھے۔

پین کا اپنا تعلق بھی انگلینڈ کے نچلے طبقے سے تھا۔ اس نے تیرہ سال کی عمر میں اپنے والد کے لیے کام کرنا شروع کیا تھا۔ اور پھر مختلف الانواع ملازمتیں کرتا رہا تھا۔ لیکن جب انقلاب کی ابتدا ہو گئی تو پین نے واضح طور پر اعلان کیا کہ وہ 1779ء میں جیمز ولسن کے گھر پر ملیشیا کے حملے جیسے نچلے طبقے کے لوگوں کی اجتماعی کارروائیوں کا حامی نہیں ہے۔ ولسن ایک انقلابی لیڈر تھا جس نے قیمتوں کے کنٹرول کی مخالفت کی تھی۔ اور اس سے زیادہ کنزرویٹو حکومت چاہتا تھا جو کہ پینسیلوانیا کونسٹی ٹیوشن 1776ء میں پیش کی گئی تھی۔ پین پینسیلوانیا کے ایک امیر ترین شخص رابرٹ مورس کا ساتھی اور اس کی تخلیق "بنک آف نارتھ امریکہ" کا حمایتی بن گیا۔

بعد میں جب آئین اپنانے پر اختلافات پیدا ہو گئے تو پین ایک مرتبہ پھر شہر کے دستکاروں کا نمائندہ بن گیا۔ جو مضبوط مرکزی حکومت کی حمایت میں تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی حکومت کچھ بڑے عمومی مفادات کی نمائندگی کر سکے گی۔ اس مفہوم میں وہ انقلاب کے بارے میں اس باطل خیال کے سحر میں گرفتار تھا کہ "یہ متحدہ عوام کی جانب سے ہے۔"

منشور آزادی نے اس باطل خیال کو مزید ہوا دی۔ برطانوی کنٹرول کو بحال کرنے کے لیے

سخت ترین اقدامات، جیسے 1763ء کا حکومتی اعلان، جس میں آبادکاروں کو کوہ اپلاشینز سے پار آباد ہونے سے منع کیا گیا تھا۔ سٹیمپ ٹیکس، ٹاؤنز ہینڈ ٹیکس، جن میں سے ایک چائے پر ٹیکس تھا۔ فوجیوں کا قیام اور بوسٹن قتل عام، بوسٹن کی بندرگاہ کی بندش اور میساچوسٹس مقننہ کی تحلیل نے نوآبادیاتی بغاوت کو مہمیز لگا کر انقلاب تک پہنچا دیا۔ آبادکاروں نے اس کا جواب سٹیمپ ایکٹ کانگرس، سنز آف لبرٹی، کمیٹی آف کار سپانڈس، بوسٹن ٹی پارٹی اور آخر میں 1774ء میں "کونٹیننٹل کانگرس" جو کہ ایک غیر قانونی تنظیم اور مستقبل کی آزاد حکومت کی پیش خیمہ تھی، کی صورت میں دیا۔

اپریل 1775ء میں لگزنگٹن اور کونکورڈ میں نوآبادیاتی "منٹ مین" اور برطانوی فوجیوں کے درمیان فوجی جھڑپوں کے بعد کونٹیننٹل کانگریس نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے "اعلان آزادی" تیار کرنے کے لیے ایک مختصر سی کمیٹی تشکیل دی، اور اعلان آزادی تھامس جیفرسن نے تحریر کیا۔ اسے 2 جولائی کو کانگریس نے منظور کر لیا اور سرکاری طور پر 4 جولائی 1776ء کو اعلان کیا گیا۔

اس وقت وہاں پہلے ہی آزادی کے لیے جوش اور ولولہ اپنے عروج پر تھا۔ 1776 میں جو "منشور آزادی" کیرولینا نے اپنایا اور "کونٹی نینٹل کانگرس" کو بھیجا اس میں برطانیہ سے آزادی کا اعلان، تمام برطانوی قوانین کی منسوخی اور فوجی تیاریوں کے لیے کہا گیا تھا۔ تقریباً اسی وقت میساچوسٹس کے "شہر کالڈن" نے میساچوسٹس کے ایوان نمائندگان کی درخواست پر، کہ ریاست میں موجود تمام شہر آزادی کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کا اعلان کریں، عمل کرتے ہوئے ٹاؤن میٹنگ میں متفقہ طور پر آزادی کے حق میں فیصلہ دے دیا.... "لہٰذا ہم نفرت اور حقارت کے ساتھ غلاموں کی بادشاہی سے اپنے تمام تعلقات منقطع کرتے ہیں۔ اور برطانیہ کو آخری مرتبہ "خدا حافظ" کہتے ہیں۔

"جب انسانی واقعات کے دوران، کسی ایک قوم کے لیے اپنے سیاسی بندھن تحلیل کرنا ضروری ہو جائیں تو اسے اس کی وجوہات کو بیان کرنا چاہیے۔ یہ "منشور آزادی" کے ابتدائی جملے تھے۔ پھر دوسرے پیراگراف میں ایک زوردار فلسفیانہ بیان درج تھا:

> "ہم ان سچائیوں پر یقین رکھتے ہیں جو اپنی شہادت خود ہیں، کہ تمام انسانوں کو برابری کی سطح پر پیدا کیا گیا ہے، اور ان کے خالق حقیقی نے انہیں ناقابل تنسیخ حقوق سے نوازا ہے۔ جن میں زندگی، آزادی اور خوشیوں کے لیے جدوجہد شامل ہے۔ ان حقوق کی حفاظت کے لیے انسانوں میں حکومتیں قائم کی جاتی ہیں۔ جو اپنے تمام اختیارات ان لوگوں سے حاصل کرتی ہیں جن پر حکومت کی جا رہی ہوتی ہے۔ جب کبھی بھی کسی بھی قسم کی حکومت ان مقاصد کے لیے ضرر رساں اور نقصان دہ بن جائے تو یہ لوگوں کا حق ہے کہ وہ اسے تبدیل یا ختم کر دیں، اور نئی حکومت قائم کر لیں۔"

اس کے بعد اس میں بادشاہ سے ناراضگیوں کی ایک فہرست تھی:

> "بار بار ڈھائے جانے والے ظلم وستم، جن سب کا مقصد ان ریاستوں پر ایک مکمل جابرانہ ریاست کا قیام تھا، اس فہرست میں بادشاہ پر نوآبادیاتی حکومتیں تحلیل کرنے، ججوں پر تسلط حاصل کرنے، لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے فوج کے لشکر بھجوانے، نوآبادیاتی تجارت کو دنیا کے دوسرے حصوں سے کاٹنے، آبادکاروں پر ان کی مرضی کے خلاف ٹیکس لگانے، اور ان کے خلاف جنگ کرنے، موت، تباہی و بربادی اور ظلم واستبداد کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بیرونی قاتلوں پر مشتمل بڑی بڑی افواج کو نقل وحمل کی سہولتیں فراہم کرنے کے الزامات لگائے گئے۔"

حکومتوں پر عوامی اقتدار، بغاوت اور انقلاب کا حق، سیاسی ظلم واستبداد پر برہمی، معاشی بوجھ اور فوجی حملے، یہ وہ سب عوامل تھے جنہوں نے آبادکاروں کی ایک بڑی تعداد کو نہ صرف متحد کرنے میں کردار ادا کیا بلکہ اُن لوگوں کو بھی جو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف شکایات رکھتے تھے، انگلینڈ کے خلاف صف آرا کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔

منشور آزادی نے مشترکہ مفاد کا جو دائرہ کھینچا تھا کچھ لوگ واضح طور پر اس سے محروم تھے جن میں انڈینز، کالے غلام اور خواتین شامل تھیں۔ دراصل منشور آزادی کے ایک پیراگراف میں بادشاہ پر غلاموں کو بغاوتوں اور انڈینز کو حملوں پر اکسانے کے الزامات بھی لگائے گئے تھے۔

> "اس نے ہم میں خانگی بغاوتوں کو ابھارا، اور ہماری سرحدوں پر آباد انڈینز کو ہم پر حملوں کے لیے اکسانے کے لیے کوششیں کیں، جن کی جنگی حکمت عملی تمام عمر کے مردوں، بچوں اور خواتین کو بلا امتیاز قتل کرنا ہے۔"

منشور آزادی سے بیس سال پہلے میساچوسٹس کی مجلس قانون ساز نے 3 نومبر 1755ء کے ایک اعلان میں "پنوبسکوٹ انڈینز کو باغی، دشمن اور غدار قرار دیتے ہوئے ہر مرد انڈین کی کھوپڑی کے لیے چالیس پونڈ اور بارہ سال سے کم عمر انڈینز اور خواتین کی کھوپڑیوں کے لیے بیس پونڈ کا انعام مقرر کر رکھا تھا۔"

تھامس جیفرسن نے منشور آزادی کے ایک پیراگراف میں بادشاہ پر نوآبادیوں میں افریقہ سے غلاموں کی نقل وحمل اور "اس بدترین تجارت کو روکنے یا اس پر قدغن لگانے کی ہر قانونی کوشش کو دبانے" کا الزام لگایا۔ اس سے غلامی اور غلاموں کی تجارت کے بارے میں اخلاقی نفرت اور غصے کا اظہار ہوتا ہے۔ (غلامی کے ساتھ جیفرسن کی ذاتی نفرت کو اس حقیقت کے ساتھ رکھ کر دیکھیں کہ جب اس نے وفات پائی تو اس کے پاس ایک سو غلام تھے۔) دراصل اس کے پیچھے ورجینیا اور بعض دوسرے جنوبی باشندوں کا غلاموں کی بڑھتی ہوئی تعداد (کل آبادی کا 20 فی صد) پر غلاموں کی بغاوتوں کا بڑھتا

ہوا خوف کارفرما تھا۔

جیفرسن کا یہ پیراگراف کونٹی نینٹل کانگریس نے حذف کر دیا، کیونکہ غلاموں کے مالک خود بھی غلاموں کی تجارت ختم کرنے کے خواہشمند نہیں تھے، لہٰذا سیاہ فام غلاموں کے بارے میں یہ بات بھی انقلاب کے عظیم منشور آزادی سے حذف کر دی گئی۔

اس جملے کا استعمال کہ "تمام مرد برابر پیدا کیے گئے ہیں۔" غالباً خواتین کو دانستہ طور پر نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں تھی۔ یہ محض اس وجہ سے تھا کہ یہ بات ان کی سوچ میں بھی نہیں تھی، کہ خواتین بھی اس قابل ہیں کہ انہیں کسی بات میں شامل کیا جائے۔ سیاسی طور وہ کہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ اگرچہ عملی ضروریات نے خواتین کو گھروں میں کھیتوں میں یا دایہ جیسے پیشوں میں ایک مخصوص اختیار دے رکھا تھا، لیکن سیاسی حقوق کے حوالے سے یا شہری حقوق میں برابری کے نظریے میں ان کو محض نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ منشور آزادی اپنی زبان وتحریر کے حوالے سے محض سفید فام مردوں کی زندگی آزادی اور خوشیوں تک محدود تھا، تو اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کو تشکیل دینے والوں، دستخط کرنے والوں، اور اعلان کرنے والوں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں، کہ ان کی پیش نظر صرف وہ تصورات اور نظریات مقدم تھے، جو اٹھارویں صدی کے مراعات یافتہ مردوں کو مرغوب تھے۔ تاریخ پر مایوسانہ نگاہ رکھنے والے ریفارمروں اور حامی انقلابیوں پر اکثر ماضی کے سیاسی اہم ادوار سے بہت زیادہ توقعات رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ ایسا کرتے بھی ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی بات کرنا جن کو منشور آزادی میں انسانی حقوق کے دائرے سے باہر رکھا گیا تھا، محض صدیوں بعد اور بے مقصد طور پر اس دور کی اخلاقی ناکامیوں کی مذمت کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ یہ اس روش کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے جس پر چلتے ہوئے منشور آزادی نے دوسروں کو نظر انداز کرتے ہوئے امریکہ کے مخصوص گروہوں کو متحرک کیا۔ یقیناً آج ہمارے دور میں بھی اپنے مطلب کی رائے عامہ ہموار کرنے، اس رائے عامہ میں موجود مفادات کی سنجیدہ آویزشوں پر، اور نسل انسانی کے بڑے حصوں کو نظر انداز کرنے کے عمل پر پردہ ڈالنے کے لیے بھی ایسی جذباتی اور فکر انگیز زبان استعمال کی جاتی ہے۔ منشور آزادی کے الفاظ کے پس منظر دراصل یہ حقیقت کارفرما تھی کہ اہم لوگوں کا ابھرتا ہوا طبقہ، دولت اور اقتدار کے اس ڈھانچے کو جو نوآبادیاتی تاریخ کے ڈیڑھ سو سال میں کھڑا ہوا تھا، بغیر کوئی گزند پہنچائے اپنے حق میں امریکیوں کی اتنی تعداد کو جمع کرنا چاہ رہے تھے، جو انگلینڈ کو شکست دینے کے لیے کافی ہو۔ حقیقت میں منشور آزادی پر دستخط کرنے والوں میں 69 فی صد وہ لوگ تھے جو انگلینڈ کے زیر سایہ نوآبادیاتی عہدوں پر فائز تھے۔

جب بوسٹن میں ٹاؤن ہال کی بالکونی سے منشور آزادی اپنے تمام تر آتشیں اور انقلابی الفاظ کے ساتھ پڑھ کر سنایا گیا، تو اس کو پڑھنے والا تھامس کرافٹس تھا، جو کہ لائل نائن گروپ کا کارکن تھا۔ یہ وہ

کنزرویٹو تھے جنہوں نے برطانیہ کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کی مخالفت کی تھی۔ منشور آزادی پڑھے جانے کے چار دن بعد بوسٹن کمیٹی آف کارسپانڈنس نے عوام الناس کو فوج میں لازمی بھرتی ہونے کو کہا۔ امراء اپنا نعم البدل دے کر اس زبردست کی بھرتی سے بچ سکتے تھے۔ جب کہ غربا کو ہر صورت میں فوجی خدمات ادا کرنا پڑیں۔ اس نے عوامی سطح پر ہنگاموں اور جلوسوں کو جنم دیا، جس میں یہ نعرہ لگایا گیا۔
''استبداد آخر استبداد ہے، اس کا موجب خواہ کوئی بھی ہو۔''

انقلاب کی ایک قسم

برطانوی افواج پر امریکیوں کی فتح پہلے سے موجود مسلح افراد کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔ تقریباً ہر سفید فام مرد کے پاس بندوق تھی اور وہ اسے چلانے میں مہارت رکھتا تھا۔ انقلابی لیڈرشپ عوام الناس پر اعتبار نہیں کرتی تھی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انقلاب غلاموں اور انڈینز کے لیے کوئی دلکشی نہیں رکھتا۔ وہ مسلح سفید فام لوگوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ کام آسان نہیں تھا۔ دستکار، ملاح اور کچھ دوسرے لوگ برطانویوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔ لیکن جنگ کے لیے عام جوش و جذبہ اتنا زوردار نہ تھا۔ جان شائی اپنی کتاب ''A People Numerous and Armed'' میں انقلابی فوج کے بارے میں لکھتا ہے ''شاید آبادی کا محض پانچواں حصہ سرگرم باغیانہ خیالات کا حامل تھا۔ جان ایڈمز کے اندازے کے مطابق ایک تہائی مخالفت میں، ایک تہائی حق میں اور ایک تہائی غیر جانبدار تھے۔''

نو آبادیاتی فوج میں شامل ہونے والے اولین لوگ معاشرے کے باعزت طبقے سے تعلق رکھتے تھے یا پھر کم از کم مکمل شہری حقوق کے حامل افراد تھے۔ جیسا کہ شائی کہتا ہے، جن لوگوں کو فوج میں شامل نہیں کیا گیا تھا ان میں دوستانہ تعلق رکھنے والے انڈینز، آزاد سیاہ فام، سفید فام ملازمین اور آزاد سفید فام تھے جن کے اپنے کوئی مستقل ٹھکانے نہیں تھے۔ لیکن اشد ضرورت کے تحت نچلے طبقے کے جوانوں کو بھی بھرتی کیا جانے لگا۔ میساچوسٹس اور ورجینیا میں آوارہ گردوں کو بھی فوج میں بھرتی کیا جانے لگا۔ درحقیقت فوج غربا کے لیے توقعات اور امیدوں کا محور بن گئی تھی۔ جس میں بھرتی ہو کر وہ اپنی حیثیت میں قدرے اضافہ کر سکتے تھے، کچھ رقم حاصل کر سکتے تھے اور اپنے سماجی رتبے میں کچھ اضافہ کر سکتے تھے۔

یہ وہی روایتی ہتھیار تھا جسے کسی بھی سماجی نظم و ضبط کے ذمہ دار افراد سرکش اور نافرمان آبادی کو متحرک اور تابعدار بنانے کے لیے استعمال کرتے آ رہے ہیں۔ یعنی غربا کو فوجی خدمات کی مہم جوئی اور صلہ جات کی پیشکش کرتے ہوئے ایسے مقصد کے لڑنے مرنے پر تیار کرنا جس میں انہیں واضح طور پر کوئی اپنی ذاتی مفاد نظر نہ آتا ہو۔ بنکر ہل پر زخمی ہونے والا ایک لیفٹیننٹ جان سکاٹ بیان کرتا ہے کہ اس نے باغی

افواج میں کس طرح شمولیت اختیار کی!

"میں ایک جفت ساز (موچی) تھا۔ اور اپنی روزی محنت مزدوری کے ذریعے حاصل کرتا تھا۔ جب یہ بغاوت شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میرے ہمسائے کمیشن حاصل کر گئے تھے جو کہ مجھ سے کسی طور پر افضل نہیں تھے۔ میں بہت زیادہ اولوالعزم انسان تھا اور کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے بلند مرتبے پر فائز ہوں۔ مجھے پرائیویٹ سپاہی کے طور پر شمولیت کی دعوت دی گئی۔ میں نے لیفٹیننٹ کے طور پر بھرتی ہونے کی پیشکش کی جو کہ قبول کر لی گئی۔ میں نے خیال کیا کہ میں بھی ترقی کی راہ پر چل نکلا ہوں۔"

سکاٹ ان بہت سے انقلابی جنگجوؤں میں سے ایک تھا جو غریب اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور فوج میں بھی نچلے عہدوں پر فائز تھے۔ "پیٹربرو" کی امدادی افواج کے بارے میں شائی کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ شہر کے نمایاں اور بااثر افراد نے جنگ میں محض مختصر عرصہ کے لیے خدمات انجام دیں۔ دوسرے امریکی شہروں میں بھی یہی صورتحال نظر آتی ہے۔ جیسا کہ شائی کہتا ہے۔ "انقلابی امریکیوں کا تعلق معاشرے کے متوسط طبقے سے ہو سکتا ہے، جو اپنے دور کے بہت سے دوسرے لوگوں سے زیادہ خوش باش اور خوشحال تھے۔ لیکن اس میں ایک بڑی اور ہر روز بڑھتی ہوئی تعداد کافی زیادہ غریب لوگوں کی بھی تھی، اور انہوں نے 1775ء اور 1783ء کے دوران حقیقی لڑائی میں اہم کردار ادا کیا اور بہت سی تکالیف جھیلیں۔"

اس وقت صرف ایک معاملہ اہمیت کا حامل تھا۔ دوسرے تمام معاملات زندگی پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔ فوجوں کی صف بندی ہو رہی تھی اور عوام اپنے راستوں کا انتخاب کر رہے تھے، لوگ انقلاب کا راستہ منتخب کرنے پر مجبور تھے۔ اگرچہ آزادی میں ان کی ذاتی دلچسپی یا مفاد واضح نہیں تھا۔ جنگ نے حکمران اشرافیہ کو اندرونی خطرات اور مصائب سے آزاد کر دیا تھا۔

جنگِ آزادی کے لیے معمول کے مطابق زبردستی فوجی بھرتی کی مہم شروع ہو گئی تھی۔ زبردستی فوج میں بھرتی پر برطانیہ کے خلاف ہنگاموں کی یاد ابھی تازہ ہی تھی کہ 1779ء میں امریکی نیوی کے لیے زبردستی بھرتی کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس وقت کا ایک پنسلوانیا آفیسر کہتا ہے۔ "ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا ہمارا رویہ بھی ان برطانویوں جیسا نہیں، جن کے ہم محکوم تھے، اور اگر اسے جاری رکھا گیا تو اس کے وہی ناخوشگوار اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، یعنی حکام سے عوام کی بیزاری، جو کہ آسانی سے کھلی بغاوت اور.... خون خرابے پر منتج ہو سکتی ہے۔

اس جنگ میں ہونے والی ابتدائی لڑائیوں میں انتہائی جنوبی علاقوں بنکر ہل، بروک لین ہائٹس، ہارلم ہائٹس، میں امریکیوں کو شکست کی ہزیمت اٹھانا پڑی، جبکہ ٹرن ٹون اور پرنسٹن میں اور پھر 1777ء میں

نیو یارک، ساراٹوگا میں لڑی جانے والی بڑی جنگ جس نے پانسہ پلٹ دیا امریکیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ واشنگٹن کی منجمد فوج پنسلوانیا میں وادی فورج میں انتظار کر رہی تھی، جبکہ بنجمن فرینکلن نے فرانس کی حکومت سے گفت و شنید کی جو انگلینڈ سے انتقام لینے کے لیے بے چین تھی۔ جنگ نے جنوب کا رُخ اختیار کر لیا جہاں انگلینڈ فتح کے بعد فتح سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ پھر امریکیوں کو بہت بڑی فرانسیسی فوج کی مدد حاصل ہو گئی۔ فرانسیسی نیوی نے برطانیہ سے آنے والی رسد اور تازہ دم فوج کا راستہ بند کر دیا، جس کے بعد امریکیوں کو 1781ء میں یارک ٹاؤن، ورجینیا میں آخری فتح حاصل ہو گئی۔

اس تمام عرصے میں امریکہ میں غریب اور امیر کے درمیان پائے جانے والے جھگڑے دبائے جانے کے باوجود گاہے بگاہے سر نکالتے رہے۔ جنگ، جیسا کہ ایرک فونر کہتا ہے "بعض آبادکاروں کے لیے بہت بڑے بڑے مالی فوائد لے کر آئی جب کہ دوسروں کے لیے شدید مشکلات کا باعث بنی۔"

مئی 1779ء میں فلاڈلفیا آرٹلری کی فرسٹ کمپنی نے اسمبلی میں "سفید پوش اور غریب" طبقے کی مشکلات کے بارے میں اپیل داخل کی، اور ان لوگوں کے خلاف تشدد کی دھمکی دی: "جو کہ معاشرے کے اہل فنون کو تباہ و برباد کرتے ہوئے، حریصانہ طور پر دولت کے انبار اکٹھے کر رہے ہیں۔" اکتوبر کے مہینے میں "فورٹ ولیم کے فسادات" ظہور میں آئے، جس میں ایک ملیشیاء کا دستہ شہر کے ایک دولتمند وکیل اور انقلابی آفیسر جیمز ولیم جس نے قیمتوں کے کنٹرول اور 1776ء میں پنسلوانیا کے جمہوری آئین کی مخالفت کی تھی، کے گھر مارچ کرتا ہوا پہنچ گیا۔ ملیشیا کے اس دستے کو کو فلاڈلفیا کے باثروت شہریوں کے "ایک خوشحال بریگیڈ" نے واپس دھکیل دیا۔

جنگ کے دوران نوآبادیوں پر جو "کونٹی نینٹل کانگرس" حکومت کر رہی تھی، اس میں دولتمند افراد کا غلبہ تھا، جو آپس میں کاروباری اور خاندانی بندھنوں میں جڑے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ورجینیا کا رچرڈ ہنری لی، میساچوسٹس کے ایڈمز اور پنسلوانیا کے شپنز کے ساتھ گہرے مراسم رکھتا تھا۔

کانگریس نے ان آفیسرز کے لیے تمام عمر کے لیے آدھی تنخواہ کی منظوری دے دی جو جنگ کے آخر تک فوج میں خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ اس فیصلے نے ان عام سپاہیوں کو نظر انداز کر دیا جو تنخواہیں نہیں لے رہے تھے، جو سردی سے ٹھٹھر رہے تھے، بیماریوں سے مر رہے تھے، اور سویلین منافع خوروں کو دولتمند سے دولتمند ترین ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ 1681ء میں نئے سال کے دن مورس ٹاؤن نیوجرسی کے نزدیک خیمہ زن پنسلوانیا کے فوجیوں نے شاید رم کے نشہ میں دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آفیسروں کو مار بھگایا اور ایک کیپٹن کو جان سے مار ڈالا، دوسروں کو زخمی کیا اور توپوں سے مسلح ہو کر فلاڈلفیا میں "کونٹی نینٹل کانگرس" کی جانب مارچ شروع کر دی۔

جارج واشنگٹن نے صورتحال کو بڑی احتیاط کے ساتھ قابو میں کیا۔ امن کے لیے بات چیت

کی جس کے نتیجے میں آدھے آدمیوں کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ اور دوسرے آدھے آدمیوں کو طویل رخصت پر بھیج دیا گیا۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد نیو جرسی لائن میں ایک فوجی بغاوت نے جنم لے لیا، جس میں دوسو آدمی شامل تھے۔ انہوں نے اپنے آفیسرز کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور ریاست کے دارالحکومت ٹرن ٹون کی طرف چل نکلے۔ اب واشنگٹن پوری طرح تیار تھا۔ چھ سو فوجیوں کا ایک دستہ جن کا کھانا پینا اور لباس بہت عمدہ تھا باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، ان کو گھیر کر غیر مسلح کر دیا، اور ان کے تین اہم لیڈروں پر اسی جگہ مقدمہ چلایا گیا۔ ایک کو معافی دے دی گئی، اور دو کو فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، فائرنگ سکواڈ ان کے دوستوں پر مشتمل تھا، جو رائفلوں کے گھوڑے دباتے ہوئے خود بھی رو رہے تھے۔ یہ "ایک مثال" تھی، واشنگٹن نے کہا۔

دوسال بعد پنسلوانیا لائن میں ایک دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور فوج کو خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ لیکن 80 فوجیوں نے اپنی تنخواہوں کا مطالبہ کرتے ہوئے فلاڈلفیا میں کونٹی نینٹل کانگریس کے ہیڈکوارٹرز پر حملہ کر دیا، اور ممبران کو دریا عبور کر کے پرنسٹن میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا، جیسا کہ ایک تاریخ دان نے لکھا: "شرمناک طریقے سے مٹھی بھر شرابی ہوئے باغیوں کے ہاتھوں دروازوں سے باہر دھکیل دیے گئے۔"

انقلاب کے دوران فوجی اپنے حکام کے خلاف بغاوت کا جو کام شاذ ہی کر سکتے تھے، وہ کام سویلین زیادہ آسانی سے سرانجام دے سکتے تھے۔ "رونالڈ ہوف مین" لکھتا ہے: "انقلاب نے ڈیلا ویئر، میری لینڈ، نارتھ کیرولینا، ساؤتھ کیرولینا اور جورجیا ریاستوں کو خاص طور پر اور ورجینیا کو کسی حد تک طبقاتی تقسیم پر مبنی عوامی آویزشوں میں دھکیل دیا، جو کہ جدوجہد کے سارے دورانیے میں جاری رہیں۔ جنوب میں نچلے طبقوں نے انقلاب کے لیے متحرک ہونے میں مزاحمت کا مظاہرہ کیا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم پر سیاسی اشرافیہ کی حکومت رہے گی خواہ برطانیہ کے خلاف انقلاب کی یہ جنگ جیت جائیں یا ہار جائیں۔

سیاہ فاموں کی 20 فی صد آبادی (اور بعض ریاستوں میں 50 فی صد) کے پیش نظر غلاموں کی بغاوت کا خوف بڑھ گیا تھا۔ واشنگٹن نے جنگ آزادی میں لڑنے کے لیے سیاہ فاموں کی غلامی سے آزادی کی شرط کو ٹھکرا دیا تھا۔ لہٰذا جب ورجینیا میں برطانوی ملٹری کمانڈر "لارڈ ڈن مور" نے اپنی افواج میں شامل ہونے پر ورجینیا کے غلاموں سے آزادی کا وعدہ کیا تو اس سے خوف اور سراسیمگی پھیل گئی۔

اس سے بھی زیادہ پریشان کن میری لینڈ میں انقلاب کی حمایت کرنے والے متمول خاندانوں کے خلاف سفید فاموں کا ہنگامہ آرائی تھی جو سمجھتے تھے کہ ان لوگوں نے اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کر رکھی ہے۔ اس کے باوجود میری لینڈ کے حکام کنٹرول قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے زمینوں اور

غلاموں پر لگائے گئے ٹیکسوں میں بہت زیادہ چھوٹ دی اور مقروض لوگوں کو کاغذی زر میں ادائیگی کی اجازت دے دی۔ یہ اقتدار قائم رکھنے کے لیے اعلیٰ طبقے کی ایک قربانی تھی جو کہ کارگر ثابت ہوئی۔

تاہم نچلے جنوبی حصے کے عوام جنگ میں کسی قسم کا حصہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس جنگ میں ان کا کوئی مفاد موجود نہیں ہے۔ اس علاقے میں موجود واشنگٹن کے فوجی کمانڈر "نتھانیل گرین" نے اس بے وفائی سے نمٹنے کے لیے بعض مراعات دینے اور بعض کے ساتھ ظلم و تشدد کے ساتھ پیش آنے کی حکمت عملی اپنائی۔ تھامس جیفرسن کے نام ایک خط میں اس نے "وفاداروں" پر اپنے فوجیوں کے حملے کو یوں بیان کیا ہے۔ "انہوں نے ان کا خوفناک قتل عام کیا، ایک سو سے زائد مارے گئے، بہت سے لوگوں کو ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا۔ اس کے غداروں پر بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے، جو کہ اس علاقے میں بہت زیادہ ہیں۔" عام طور پر تمام ریاستوں میں مراعات کو بہت محدود رکھا گیا۔ نئے آئین جو تمام ریاستوں میں 1776ء سے 1780ء کے دوران وضع کیے گئے پرانے آئینوں سے مختلف نہ تھے۔ صرف پنسلوانیا میں ووٹ دینے کے لیے اور کوئی عہدہ سنبھالنے کے لیے جائیداد کی اہلیت کو ختم کیا گیا۔

انقلاب کے معاشرے میں طبقاتی تعلقات پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان زمینوں کا کیا بنا جو برطانوی وفادار بھاگتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ یہ اس طور پر تقسیم کی گئیں کہ انقلابی لیڈروں کو دہرا فائدہ حاصل ہوا، ایک طرف تو انہوں نے اپنے دوستوں اور خود اپنے آپ کو نوازا اور دوسرے طرف کچھ بچی کھچی زمینیں چھوٹے کسانوں میں تقسیم کر کے نئی حکومت کے لیے وسیع البنیاد حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ حقیقت میں اس نئی قوم کو ایک اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس کے ہاتھوں میں بے شمار دولت آگئی تھی، جو کہ تاریخ کے دولتمند ترین حکمران طبقے کو جنم دینے کے لیے کافی ہونے کے ساتھ ساتھ پھر بھی اسقدر باقی بچ گئی تھی کہ دولتمند طبقے اور محروم طبقے کے درمیان حد فاصل کے طور پر ایک مضبوط متوسط طبقہ پیدا کر سکتی تھی۔

ایڈمنڈ مورگن انقلاب کی طبقاتی نوعیت کو یوں بیان کرتا ہے: "یہ حقیقت کہ اس جدوجہد میں نچلے طبقات بھی برابر کے شامل تھے، اس حقیقت کی نفی نہیں کرتی کہ دراصل عمومی سطح پر یہ جدوجہد اعلیٰ طبقے کے افراد کے درمیان عہدوں اور اقتدار کی جدوجہد تھی۔"

کارل ڈیگلر اپنی کتاب "Out of our Past" میں لکھتا ہے۔ امریکی انقلاب کے نتیجے میں کوئی نیا معاشرتی طبقہ اقتدار میں نہیں آیا تھا۔ جن لوگوں نے اس بغاوت کو تشکیل دیا ان میں سے زیادہ تر نوآبادیاتی حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔" جارج واشنگٹن امریکہ کا ایک امیر شخص، ہنکوک بوسٹن کا ایک خوشحال تاجر اور بنجمن فرینکلن امریکہ کا سب سے زیادہ دولتمند پرنٹر تھا، علیٰ ہذا۔

دوسری طرف شہر کے ہنرمندوں، مزدوروں اور ملاحوں اور چھوٹے زمینداروں میں فوج میں

خدمات انجام دینے کی حسین اور دوستانہ یادوں کے ساتھ، تھوڑی بہت زمین تقسیم کر کے انقلاب کی چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے "ایک قوم" کا بلند درجہ عنایت کرنے تک محدود رکھا گیا۔ اور اس طرح ایک مضبوط عوامی حمایت اور ایک قومی ہم آہنگی پیدا کی گئی، جسے نظر انداز کئے گئے اور پسے ہوئے لوگوں کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے بھی عظیم "امریکہ" کہا جا سکتا تھا۔

سٹاگٹن لینڈ' انقلابی دور میں ڈچس کاؤنٹی، نیویارک کے اپنے ایک گہرے مطالعے میں اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ 1776ء میں نیویارک میں بڑی جاگیرداریوں کے خلاف مزارعین کی بغاوتیں ہوئیں۔ رینسی لیئروک کی جاگیر 10 لاکھ ایکڑ پر مشتمل تھی۔ مزارعین نے اس کی کچھ زمین پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر دیا، عدالتوں سے مایوسی کا سامنا کرتے ہوئے وہ تشدد پر اتر آئے۔ پوکیپسی میں 1700 مسلح مزارعین نے عدالتوں کو بند کر دیا اور جیلیں توڑ دیں، لیکن اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔

جنگ کے درمیان مزارعین ایک ایسی قوت بن گئے تھے۔ جن سے ہر دم خطرہ محسوس کیا جانے لگا تھا۔ بہت سے مزارعین نے لگان دینا بند کر دیا تھا۔ مقننہ نے پریشان ہو کر برطانوی وفاداروں کی زمین ضبط کرنے کا قانون پاس کیا، اور کاؤنٹی میں موجود پہلے سے 1800 آزاد مالکان میں مزید 400 کا اضافہ کر دیا۔ آزاد مالکان نے محسوس کیا کہ اگرچہ وہ اب مزارعین نہیں ہیں وہ اب مرتہن تھے، جو مالکان کو لگان ادا کرنے کے بجائے اب بنکوں کو قرضہ واپس کر رہے تھے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ برطانوی حکمرانی کے خلاف بغاوت نے نوآبادیاتی اشرافیہ کے بعض گروپس کو یہ موقع فراہم کیا کہ ان لوگوں کو ہٹانے کے لیے جو برطانیہ کے وفادار تھے چھوٹے زمینداروں کو کچھ مراعات دے سکیں، اور غریب سفید فام کارکنوں اور مزارع کسانوں کی پرانی حیثیت میں ہی رہنے دیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقامی امریکیوں یعنی انڈینز کے لیے یہ انقلاب کیا معنی یا اہمیت رکھتا تھا؟ انہیں اعلان آزادی کے خوبصورت الفاظوں میں سے نظر انداز کر دیا گیا تھا، ظاہر ہے انہیں امریکہ کے ان علاقوں پر حکومت کرنے والوں کے انتخاب کا کوئی حق نہیں دیا گیا تھا، جہاں کے وہ باسی تھے۔ اور نہ ہی اب ان کے لیے ان خوشیوں کا حصول ممکن رہا تھا، جو سفید فام یورپیوں کی آمد سے پہلے صدیوں سے انہیں حاصل تھیں۔ اب جب کے برطانوی راستے ہٹ گئے تھے، امریکی انڈینز کو ان کی زمینوں سے بے دخل کرنے کا سنگ دلانہ عمل آزادی سے جاری رکھ سکتے تھے، جو مزاحمت کرتے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ مختصراً جیسا کہ فرانسیس جننگز لکھتا ہے، سفید فام امریکی مشرق میں برطانوی سامراج کے کنٹرول کے خلاف اور مغرب میں خود اپنی سامراجیت کے قیام کے لیے لڑ رہے تھے۔

نیویارک میں موہاکس اور ریاست کے درمیان دوستی کے دور کا خاتمہ کرتے ہوئے، ایک پیچیدہ ٹھگ بازی کے ذریعے آٹھ سو ہزار ایکڑ موہاک زمین پر قبضہ کر لیا گیا۔ 1753ء میں موہاک سردار ہینڈرک

نے گورنر جارج کلنٹن اور نیویارک پروونشل کونسل میں اپنی تلخیوں اور شکایات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

"میرے بھائی، جب ہم اپنی زمینوں کے بارے میں اپنی کچھ شکایات بیان کرنے تمہارے پاس آئے تھے، ہمیں توقع تھی کہ ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ اور ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد میں ہونے والا معاہدہ ٹوٹنے کے قریب ہے، اور میرے بھائی، تم نے کہا تھا کہ "البانے" میں اس کی تلافی کی جائے گی، لیکن ہم انہیں اچھی طرح جانتے ہیں ہمیں ان پر بھروسا نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ (البانے کے تاجر) انسان نہیں بلکہ درندے ہیں، لہٰذا...... ہم اپنے گھر پہنچتے ہی اپنے بھائیوں دوسری 5 اقوام کو گھونگوں کی بیلٹ بھجوائیں گے تاکہ انہیں پتا چل جائے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ کی زنجیر ٹوٹ چکی ہے۔ لہٰذا میرے بھائی، میری باتیں مزید سننے کی توقع نہ رکھنا، اور میرے بھائی، ہم بھی اب تمہاری مزید باتیں سننے کو تیار نہیں"

جب برطانوی "سات سالہ جنگ" کے دوران شمالی امریکہ کے لیے فرانسیسوں کے ساتھ لڑ رہے تھے تو انڈینز فرانسیسوں کی جانب سے لڑے تھے۔ فرانسیسی تاجر تھے، لیکن انڈینز کی زمینوں کے قابض نہ تھے۔ جبکہ برطانوی واضح طور پر ان کی شکارگاہوں اور رہائش کی جگہوں پر حریصانہ نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

جب 1763ء میں جنگ کا خاتمہ ہوا تو فرانسیسوں نے اپنے پرانے اتحادیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپلاشینز کے مغرب میں واقع زمینیں برطانوی کے حوالے کر دیں۔ اس لیے انڈینز برطانیہ کے مغربی قلعوں پر حملے کرنے کے لیے متحد ہو گئے۔ اس جنگ کو برطانوی "پونٹیاک کی سازش" کا نام دیتے ہیں۔ لیکن فرانسس جنگز اس کے لیے آزادی کی خاطر لڑی جانے والی "جنگ آزادی" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ برطانوی جنرل جیفرے ایمرسٹ کے احکام کے تحت فورٹ پٹس کے کمانڈر نے جو کہ حملہ آور انڈینز سرداروں سے گفت و شنید کر رہا تھا، انہیں ایک چیچک کے ہسپتال میں استعمال ہونے والے کمبل تحفے میں دیئے۔ یہ ان ہتھکنڈوں کی ابتداء تھی جنہیں آج "بیالوجیکل جنگی حکمت عملی" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں انڈینز میں جلد ہی چیچک کی وبا پھوٹ نکلی۔

دیہاتوں کو نذر آتش کرنے کے باوجود، برطانوی انڈینز کے ارادوں کو کچل نہ سکے، اور انہوں نے گوریلا جنگ جاری رکھی۔ آخر میں برطانویوں کے ساتھ ایک امن معاہدہ ہوا جس کے تحت اپلاشینز میں ایک حد بندی کر دی گئی جس سے آگے انڈینز حدود میں آباد کار تجاوز نہیں کریں گے۔ اسے "1763ء کا شاہی فرمان" کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے نے امریکیوں کو بہت طیش دلایا (ورجینیا کے اصل چارٹر میں کہا گیا تھا کہ اس کی زمین مغرب کی جانب سمندر تک جاتی ہے)۔ اس سے یہ بات سمجھ آ جاتی ہے کہ انقلاب کے دوران زیادہ تر انڈینز برطانیہ کی جانب سے کیوں جنگ لڑتے رہے۔ اپنے فرانسیسی اتحادیوں اور بعد

میں انگلش اتحادیوں کے چلے جانے کے بعد انڈینز کو زمینوں کی حریص نئی قوم کا تنہا سامنا کرنا پڑا۔
ساحل سمندر کے ساتھ زمینوں پر مشرقی اشرافیہ کے قبضے کے بعد غربا جو زمین کے متلاشی تھے
انہیں مغرب کی جانب دھکیل دیا گیا۔ وہ امراء کے لیے ایک دفاعی حصار کی حیثیت اختیار کر گئے تھے،
کیونکہ یہ سرحد پر بسنے والے لوگ تھے جو انڈینز کا پہلا نشانہ بنتے تھے۔

امریکی انقلاب کے بعد سیاہ فام غلاموں کی صورت حال مزید پیچیدہ ہو گئی تھی۔ ہزاروں سیاہ
فام برطانیہ کے ساتھ مل کر لڑتے رہے تھے۔

شمالی ریاستوں میں، فوج میں سیاہ فاموں کی شمولیت، غلاموں کے لیے شدید معاشی ضرورت
کی عدم موجودگی، اور انقلاب کی چرب زبانی غلامی کے خاتمے کا باعث تو بنی لیکن بہت سست رفتاری سے،
یعنی 1810ء تک تیس ہزار سیاہ فام، جو کہ شمال میں سیاہ فام آبادی کا ایک چوتھائی حصہ تھے، غلامی کی زندگی
بسر کر رہے تھے، 1840ء میں بھی شمال میں ایک ہزار سیاہ فام غلام موجود تھے۔ بالائی جنوب میں پہلے کی
نسبت آزاد سیاہ فاموں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ زیریں جنوب میں چاولوں اور کپاس کی کاشت میں
اضافہ کے ساتھ غلامی میں بھی اضافہ ہوا۔

انقلاب نے جو ایک کام دکھایا وہ یہ تھا کہ اس نے سیاہ فاموں کے لیے ایک موقع اور محل پیدا
کیا، اور انہوں نے سفید فام معاشرے کو حاصل مراعات کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات یہ
مطالبات بالٹی مور، فلاڈلفیا، رچمنڈ اور سوانا کی نئی سیاہ فام اشرافیہ کی جانب سے کئے گئے اور بعض اوقات
یہ مطالبات جرأت مند اور فن تقریر کے ماہر غلاموں کی جانب سے کئے گئے۔ اعلان آزادی کا حوالہ دیتے
ہوئے سیاہ فاموں نے کانگریس اور ریاستی مقننہ میں غلامی کے خاتمے اور سیاہ فاموں کو برابری کے حقوق
دینے کی عرض داشتیں پیش کیں۔ 1780ء میں ڈارٹ ماتھ اور میساچوسٹس کے سیاہ فاموں نے بھی ریاست
کی مقننہ میں ووٹ کے حق اور نمائندگی کے ساتھ ٹیکس کی شرط کے خلاف اپیلیں دائر کیں۔

"....ہم اپنے آپ کو ستم زدہ خیال کرتے ہیں، جیسا کہ ہمیں وطن کی آزادی سے
حاصل ہونے والی مراعات حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ہمیں ووٹ کا یا ان لوگوں
کو منتخب کرنے کا جو ہم پر ٹیکس لگاتے ہیں کوئی حق حاصل نہیں، اس کے باوجود ہمارے بہت
سے سیاہ فام (یہاں "Colour" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو کہ سیاہ فاموں کے لیے ایک
معروف اصطلاح تھی) مشترکہ مقصد کی خاطر اور طاقت کے اسی طرح کے استبداد (ٹیکسوں
کے حوالے سے) کے خلاف میدان جنگ میں شریک ہوئے، یہ باتیں سب کے علم میں ہیں
جنہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے....."

ایک سیاہ فام آدمی بنجمن بینیکر نے، جس نے اپنے بل بوتے پر ریاضی اور علم الفلکیات میں

مہارت حاصل کی اور سورج کے ایک گرہن کی درست پیشگوئی کی، اور اس کا تقرر نئے شہر واشنگٹن کا نقشہ
تیار کرنے کے لیے کیا گیا تھا، تھامس جیفرسن کو لکھا:

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے آپ بھی پوری طرح آگاہ
ہیں اور اسے یہاں ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، کہ ہم انسانوں کی ایک ایسی نسل ہیں جو
ایک لمبے عرصے سے دنیا کی دشنام طرازی اور ملامت کے نیچے جسمانی مشقت کرتے آ رہے
ہیں، یہ کہ ہمیں ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اور یہ کہ ہمیں ایک لمبے عرصے سے
انسانوں کے بجائے گدھے تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اور کسی ذہنی صلاحیت کے شاذ ہی قابل سمجھا
جاتا ہے.... میں ذاتی طور پر یہ خیال کرتا ہوں، کہ آپ ان بے سرو پا اور باطل خیالات اور
آراء کو ختم کرنے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے جو ہمارے حوالے
سے عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں؟ اور یہ کہ آپ کہ خیالات بھی میرے خیالات سے مطابقت
رکھتے ہوں گے، جو کہ یہ ہیں کہ کائنات کے خالق نے ہم سب کو پیدا کیا ہے، اور یہ کہ نہ
صرف اس نے ہم سب کو ایک ہی گوشت پوست سے پیدا کیا ہے، بلکہ اس نے بغیر کسی
جانب داری کے ہم سب کو ایک جیسے ہی احساسات عطا کئے ہیں اور ہم سب کو ایک جیسی
صلاحیتوں سے نوازا ہے۔"

بنجمن نے جیفرسن کو مشورہ دیا، اپنے آپ کو ان تنگ تعصبات سے آزاد کرا لو جو تمہاری سانسوں
میں رچ بسے ہیں۔" جیفرسن نے اپنی پوری کوشش کی جیسا کہ وہ ایک روشن خیال، اور سوچ و بچار رکھنے
والا انسان تھا، لیکن امریکی معاشرے کی ساخت، کاٹن کی کاشت کی طاقت، غلاموں کی تجارت، شمالی اور
مغربی اشرافیہ کے درمیان اتحاد کی سیاست، اور نو آبادیوں میں نسلی تعصب پر مبنی ایک مستحکم کلچر، اور ساتھ ہی
ساتھ اس کی اپنی کمزوریاں، عملی ضروریات اور نظریاتی نظام سے نفسیاتی پیوستگی کا یہ اشتراک تھا، جس نے
جیفرسن کو ساری زندگی غلاموں کا مالک بنائے رکھا۔

سیاہ غلاموں کی کم تر حیثیت، نئے معاشرے سے انڈینز کا انخلاء نئی قوم میں دولتمند اور طاقتور کی
بالادستی کا قیام، یہ وہ معاملات تھے جو انقلاب کے وقت تک نو آبادیوں میں پہلے ہی طے کر لیے گئے تھے۔
انگریزوں کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد اب ان سب معاملات کو ریاستوں کے آئین
میں دستاویزی، ٹھوس، باضابطہ اور قانونی شکل دی جا سکتی تھی، جو کہ فلاڈلفیا میں انقلابی لیڈران نے ایک
کنونشن میں تیار کیا تھا۔

بہت سے امریکی 1787ء میں تیار کئے گئے آئین کو اسے تیار کرنے والے دانشمند اور انسان
دوست افراد کا ایک غیر معمولی ذہانت پر مبنی کارنامہ خیال کرتے تھے۔ امریکی آئین کا ایک اور جائزہ بیسویں

صدی کی ابتداء میں تاریخ دان چارلس بیئرڈ نے پیش کیا (جس نے بہت زیادہ غم وغصہ اور برہمی کو جنم دیا اور نیو یارک ٹائمز" نے ایک مذمتی اور ملامتی اداریہ بھی تحریر کیا) اپنی کتاب "آئین کی ایک معاشی توضیح" میں بیئرڈ نے ان پچپن افراد کے معاشی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ پیش کیا جو 1787ء میں آئین تشکیل دینے کے لیے فلاڈلفیا میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ ان میں اکثریت پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے۔ زیادہ تر لوگ امیر ترین افراد تھے جو زراعت، غلاموں کی تجارت، صنعت کاری یا بحری جہازوں کے کاروبار میں مصروف تھے۔ ان میں سے آدھے افراد نے سود پر قرضے دے رکھے تھے، اور محکمہ خزانہ کے ریکارڈ کے مطابق پچپن میں سے پینتالیس افراد کے پاس حکومت کے بانڈز تھے،

اس طرح بیئرڈ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آئین ساز افراد کی اکثریت کا معاشی مفاد ایک مضبوط مرکزی حکومت کے قیام میں مضمر تھا، صنعت کار اپنے فائدے کے محصولات چاہتے تھے۔ سود پر پیسے دینے والے قرضوں کی ادائیگی میں کاغذی زر کا استعمال بند کروانا چاہتے تھے، زمینوں کے سٹے باز تحفظ چاہتے تھے، جیسا کہ وہ انڈینز کی زمینوں پر قبضے کر رہے تھے، غلاموں کے مالک غلاموں کی بغاوتوں اور فرار کے خلاف مرکزی تحفظ کے خواہاں تھے۔ بانڈ ہولڈر ایسی حکومت کے متمنی تھے جو پوری قوم سے ٹیکس وصول کر کے ان کے بانڈز کی ادائیگی کر سکے۔

بیئرڈ کے مطابق چار گروپس کو آئین کی کونشن میں شامل نہیں کیا گیا تھا جن میں غلام، معاہداتی ملازمین، خواتین اور بے مالک لوگ (جن کی کوئی جائیداد نہ تھی) شامل تھے۔ لہٰذا آئین میں ان لوگوں کے مفادات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

اس نے یہ واضح کرنا چاہا تھا کہ وہ نہیں سمجھتا کہ آئین محض بانی بابوں کے ذاتی مفاد کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ ان گروپس کے فائدے میں تیار کیا گیا تھا، جن کی نمائندگی یہ بابے کرتے تھے۔ معاشی مفادات کو وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر بہت واضح طور پر سمجھتے تھے اور انہیں مادی طور پر محسوس کرتے تھے۔

1787ء میں ایک مضبوط مرکزی حکومت کی نہ صرف بڑے معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے ضرورت تھی بلکہ نا مطمئن کسانوں کی بغاوت کے فوری خطرے سے نمٹنے کے لیے بھی اس کی اشد ضرورت تھی۔ اہم واقعہ جس سے یہ خوف شدت اختیار کر چکا تھا مغربی میساچوسٹس میں 1786ء کی گرمیوں میں ہونے والی بغاوت تھی جسے "شیز بغاوت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

میساچوسٹس کے مغربی شہروں میں بوسٹن کی مقننہ کے خلاف ناراضگی پائی جاتی تھی۔ 1780ء کے آئین میں ووٹ کے لیے صاحب جائداد ہونے کی شرط لگا دی گئی تھی، کوئی بھی شخص اچھا خاصہ دولتمند ہونے کے بغیر حکومتی عہدہ نہیں سنبھال سکتا تھا۔ مزید برآں مقننہ کاغذی زر جاری کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ جیسا کہ بعض دوسری ریاستوں جیسا کہ "رہوڈ آئی لینڈ" میں کیا گیا تھا۔ تاکہ قرضے کے نیچے دبے

ہوئے کسانوں کے لیے اپنے قرضے ادا کرنے آسان ہو سکیں۔

مغربی علاقوں میں مقننہ کے خلاف منظم ہونے کے لیے غیر قانونی اجتماعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان اجتماعات میں سے ایک میں ایک شخص جس کا نام "پلو جوگر" تھا، نے کہا:

"میرا ناجائز طور پر غلط استعمال کیا گیا، جنگ میں مجھے میرے حصے کی نسبت زیادہ کے لیے مجبور کیا گیا، مجھے، طبقاتی محصولات، ٹاؤن محصولات، صوبائی محصولات، براعظمی محصولات اور تمام قسم کے محصولات کے بوجھ تلے دبائے رکھا گیا، مجھے پولیس آفیسر، کانسٹیبل، اور محصولات وصول کرنے والے کھینچتے اور گھسیٹتے پھرے، اور مجھے اپنے مویشی اونے پونے بیچنے پڑے....

...اور ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ بڑے لوگوں کی جیبوں میں جاتا رہا ہے، اور میں نے سوچا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اٹھ کھڑے ہوں، اور اس سب کا خاتمہ کر دیں اور ہمارے اوپر کوئی عدالتیں، کوئی پولیس آفیسرز کوئی محصول اکٹھے کرنے والے اور نہ ہی کوئی وکیل ہوں...."

ہمپشائر کاؤنٹی میں نارتھمپٹن اور سپرنگ فیلڈ کے شہروں میں، ان کسانوں کے جنہوں نے قرضے ادا نہیں کئے تھے کہ مویشی پکڑنے اور ان کی پکی ہوئی کٹائی کے لیے تیار زمینیں قبضے میں لینے کے لیے عدالتی کارروائیاں جاری تھیں۔ اور اسی طرح کونٹی نینٹل آرمی کے پرانے فوجی بھی فوج سے فراغت پانے پر اچھا سلوک نہ ہونے کی بنا پر ناراض تھے، انہیں فوری ادائیگی کے بجائے مستقبل میں ادائیگی کے سرٹیفیکیٹس دیئے گئے تھے۔ انہوں نے کسانوں کو سکواڈز اور کمپنیوں میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان پرانے فوجیوں میں سے ایک "لیوک ڈے" تھا۔ جو عدالت کی کارروائی والے دن صبح سویرے ایک فوجی بینڈ کا دستہ لے کر پہنچ گیا، جو گزشتہ گرمیوں کی شدید گرمی میں قرض داروں کی جیل میں بندی کی یادوں سے ابھی تک غصے سے بھرے ہوئے تھے۔

شیرف نے عدالت کے تحفظ کے لیے مسلح کسانوں کیخلاف مقامی ملیشیا سے مدد طلب کی۔ لیکن ملیشیا کی اکثریت لیوک ڈے کے ساتھ تھی۔ شیرف نے پانچ سو آدمیوں کو جمع کرنے کا بندوبست کیا، اور جج اپنے کالے ریشمی چغے پہنے انتظار کر رہے تھے۔ کہ شیرف ان کو بحفاظت کمرہ عدالت تک پہنچانے کا انتظام کر لے۔ لیکن وہاں عدالت کی عمارت کی سیڑھیوں پر لیوک ڈے جنرل کورٹ کے غیر آئینی اقدامات کے خلاف عوام کے آئینی احتجاج کے حق کی پٹیشن کے ساتھ کھڑا تھا، اور ججوں سے اس وقت تک عدالت برخاست کرنے کی درخواست کر رہا تھا جب تک جنرل کورٹ کسانوں کی جانب سے کوئی قدم اٹھا سکے۔ لیوک ڈے کے ساتھ پندرہ سو مسلح کسان کھڑے تھے، ججوں کی عدالت برخاست کر دی۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد وورسسٹر اور ایتھول میں کسانوں نے بندوقوں کے زور پر عدالتوں کو ان کی جائیدادیں ضبط کرنے کے لیے اجلاس منعقد کرنے سے روک دیا، اور ملیشیا یا تو کسانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے یا پھر ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔ کونکورڈ میں دو جنگوں میں حصہ لینے والا ایک پچاس سالہ فوجی بگھیوں، چھکڑوں اور گھوڑوں کے ایک بڑے قافلے کی سربراہی کرتے ہوئے اسے شہر میں لے گیا، جبکہ ججوں کو ایک پیغام بھیج دیا گیا: "اس کاؤنٹی کے عوام کی یہ آواز ہے کہ جج اس وقت تک عدالت کی عمارت میں داخل نہ ہو جب تک لوگوں کی مشکلات اور مصائب کا ازالہ نہیں کیا جاتا، جو وہ اس وقت جھیل رہے ہیں۔" اس پر کاؤنٹی کے ایک اجلاس نے ججوں کو عدالت برخاست کرنے کا مشورہ دیا، جو کہ انہوں نے قبول کر لیا۔

گریٹ بیرنگٹن میں ملیشیا کے ایک ہزار جوانوں کو مسلح آدمیوں اور لڑکوں سے بھرے ہوئے ایک چوک کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ملیشیا میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا اکثریت چوک میں اکٹھے ہونے والے ہجوم کے حق میں تھی۔ یہ لوگ جنرل کورٹ کے اجلاس تک چیف جسٹس سے اپنی عدالت برخاست کرنے کا وعدہ لے کر واپس چوک میں جمع ہو گئے۔ انہوں نے جیل کو توڑ دیا اور قرض داروں کو آزاد کر دیا، چیف جسٹس جو کہ دیہاتی ڈاکٹر بھی تھا نے کہا "میں آج تک اپنے مصائب کے ازالے کے لیے کسی کو اس سے بہتر طریقے کی نشاندہی کرتے ہوئے انہیں سنا، جو لوگوں نے اختیار کیا ہے۔"

گورنر اور میساچوسٹس کے سیاسی لیڈر خوفزدہ ہو گئے سیموئیل ایڈمز جسے کبھی بوسٹن میں انقلابی لیڈر کے طور پر دیکھا جاتا تھا، نے اب لوگوں سے قانون کی پاسداری کرنے کے لیے اصرار کیا۔ اس نے کہا "برطانوی ایجنٹ" کسانوں کو ابھار رہے ہیں۔ گرین وچ شہر کے لوگوں نے جواب دیا "تمہارے پاس بوسٹن میں پیسے ہیں اور ہمارے پاس نہیں ہیں اور کیا تم نے خود انقلاب کے دوران غیر قانونی کام نہیں کیے؟ اب باغیوں کو "ریگولیٹرز" کہا جانے لگا تھا۔ ان کا نشان شکران (ایک زہریلا پودا) کی شاخ تھی۔

مسئلہ میساچوسٹس سے آگے نکل چکا تھا۔ "جزیرہ رہوڈ" میں قرض داروں نے مقننہ پر قبضہ کر لیا تھا اور کاغذی زر جاری کر رہے تھے۔ نیو ہمپشائر میں کئی سو آدمیوں نے ستمبر 1786ء میں "ایگزٹر" میں مقننہ کا گھیراؤ کر لیا اور ٹیکسوں کی واپسی اور کاغذی زر کے اجرا کا مطالبہ کر دیا۔ وہ صرف اس وقت منتشر ہوئے جب فوجی کارروائی کی دھمکی دی گئی۔

ڈینئیل شیز مغربی میساچوسٹس میں سامنے آیا۔ جب انقلاب شروع ہوا وہ ایک غریب کھیت مزدور تھا۔ اس نے کونٹی نینٹل آرمی میں شمولیت اختیار کی اور لیکزنگٹن بنکر ہل اور سارا ٹوگا میں لڑتا رہا، اور ایک جھڑپ میں زخمی ہو گیا۔ 1780ء میں تنخواہ نہ ملنے پر استعفاد دے دیا اور گھر چلا گیا۔ اور جلد ہی اسے قرضہ ادا نہ کرنے پر عدالت کا سامنا کرنا پڑا، اس کے علاوہ دوسرے لوگوں سے جو سلوک ہو رہا تھا اس کا بھی اس نے

مشاہدہ کیا۔ ایک بیمار خاتون جو قرضہ ادا نہیں کر سکتی تھی اس کے نیچے سے اس کی چارپائی بھی کھینچ لی گئی۔

19 ستمبر کو میساچوسٹس کی سپریم جوڈیشل کورٹ نے بغاوت کے گیارہ لیڈروں پر، جن میں تین اس کے ذاتی دوست بھی شامل تھے، بدامنی پھیلانے، ہنگامہ آرائی کرنے اور لوگوں کو بہکانے کا الزام لگایا۔ اس واقعہ پر شیز مکمل طور پر بھڑک اٹھا۔ شیز نے سات سو مسلح کسانوں کو جن میں زیادہ تر پرانے فوجی تھے، منظم کیا اور انہیں لے کر سپرنگ فیلڈ کی جانب چل پڑا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملیشیا میں سے بھی کچھ لوگ ان میں شامل ہو گئے اور چاروں طرف کے دیہاتوں سے لوگ ان میں شمولیت اختیار کرتے چلے گئے۔ ججوں نے ایک دن کے لیے سماعت ملتوی کر دی، پھر عدالت برخاست کر دی۔

اب بوسٹن میں جنرل کورٹ کا اجلاس شروع ہوا تو گورنر جیمز باؤڈن نے اسے حکومتی وقار بحال کرنے کو کہا۔ انگلینڈ کے خلاف حالیہ بغاوت میں حصہ لینے والے جواب عہدوں پر فائز تھے، نظم و ضبط کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سام ایڈمز نے ہنگاموں کے خلاف قانون بنانے اور پروانہ حاضری ملزم کی شق کو معطل کرنے اور حکام کو بغیر سماعت کے لوگوں کو جیل میں رکھنے کی اجازت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی ناراض اور غصے سے بھرے ہوئے کسانوں کو کچھ مراعات دینے کے لیے قانون سازی بھی کی گئی، جس کے مطابق پرانے ٹیکس پیسوں کے بجائے اجناس کی صورت میں ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب کسانوں اور ملیشیا کے درمیان ٹکراؤ شدت اختیار کر گیا۔ لیکن موسم سرما کی برف باری نے کسانوں کی عدالتوں کی طرف پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنا شروع کر دی۔ جب شیز نے ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ بوسٹن کی جانب مارچ شروع کی ایک برفانی طوفان نے انہیں پسپا کر دیا اور اس کا ایک آدمی سردی سے منجمد ہو کر مر گیا۔

بوسٹن کے تاجروں کے مہیا کردہ فنڈ کے ذریعے جنرل بنجمن لنکن کی قیادت میں ایک فوج میدان میں اتر آئی۔ باغی تعداد میں بہت تھوڑے اور فرار کے راستے پر تھے۔ شیز نے "ورمونٹ" میں پناہ لے لی اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار پھینکنے شروع کر دیے مختلف جھڑپوں میں کچھ مزید اموات ہوئیں، باڑوں، اور فصلوں کے ذخائر کو آگ لگانے، ایک جنرل کے گھوڑوں کو موت کے گھاٹ اتارنے جیسے، تشدد کے غیر منظم اور اکا دکا واقعات رونما ہوتے رہے۔ اور رات کی تاریکی میں دو برف گاڑیوں کے ٹکرانے سے ایک حکومتی فوجی ہلاک ہو گیا۔

گرفتار کیے گئے باغیوں پر نارتھمپٹن میں مقدمہ چلایا گیا اور چھ کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ پٹس فیلڈ کے ہائی شیرف کے دروازے پر ایک پیغام چھوڑا گیا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میرے ملک کے بہت سے افراد کو موت کے قابل سمجھا گیا ہے کیونکہ وہ انصاف کے لیے لڑے ہیں.... موت کے لیے تیزی سے تیاری کر لو، کیونکہ

تمہاری یا میری زندگی بہت کم ہے۔"

تینتیس مزید باغیوں پر مقدمات چلائے گئے اور چھ مزید باغیوں کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ جنرل لنکن نے معافی اور رحم دلی کے مظاہرے کی پُرزور سفارش کی، لیکن سیموئیل ایڈمز نے کہا" "بادشاہی میں غداری کے جرم پر معافی کا جواز پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص ایک جمہوریہ کے قوانین کے خلاف بغاوت کی جرأت کرے اسے موت کا سامنا ضرور کرنا چاہیے۔" بہت سی پھانسیاں دی گئیں اور کچھ کو معاف بھی کر دیا گیا۔ ورمونٹ میں شیز کو معافی دے دی گئی وہ 1788ء میں میساچوسٹس واپس آ گیا اور وہیں 1825ء میں غربت اور گمنامی میں مر گیا۔

تھامس جیفرسن نے، جو کہ شیز بغاوت کے وقت فرانس میں سفیر تھا، اس قسم کی بغاوتوں کو معاشرے کے لیے صحت مند قرار دیا۔ اپنے ایک دوست کو خط میں اس نے لکھا" میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھار چھوٹی موٹی بغاوت ایک اچھی چیز ہے..... یہ ایک دوا ہے جو حکومت کی صحت برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے..... خدا ہمیں معاف کرے، اگر ہمارے بیس سال اس قسم کی بغاوتوں کے بغیر گزر جائیں..... آزادی کے پودے کو گاہے بگاہے محب الوطن اور غداروں کی خون کی ضرورت ہوتی ہے یہ ایک قدرتی کھاد ہے۔"

لیکن جیفرسن منظر سے بہت دور تھا۔ ملک کی سیاسی اور معاشی اشرافیہ اس قدر بردبار نہیں تھی۔ انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ وباء پھیل سکتی ہے۔ واشنگٹن آرمی کے ایک پرانے فوجی جنرل ہیری ناکس نے پرانے فوجیوں پر مشتمل "دا آرڈر آف سینسناٹی" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ناکس نے 1786ء کے آخری حصے میں واشنگٹن کو شیز بغاوت کے بارے میں لکھا، اور اس نے ملک کے بہت سے دولتمند اور با اختیار لیڈروں کے خیالات کو بیان کیا۔" وہ لوگ جو باغی ہیں خوشحال لوگوں کے مقابلے میں اپنی غربت کا موازنہ کرتے ہیں....ان کا مسلک یہ ہے، امریکہ کی جائداد کو برطانویوں کے قبضے سے سب کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں آزاد کروایا گیا ہے، لہٰذا یہ سب قوم کی مشترکہ جائداد تصور کی جانی چاہیے۔"

جنگ کے دوران واشنگٹن کا ایک اے ڈی الیگزینڈر ہملٹن، نئی اشرافیہ کا ایک طاقتور اور بڑا زیرک لیڈر تھا۔ اس نے اپنی سیاسی فلاسفی ان الفاظ میں بیان کی:

> "تمام معاشرے اپنے آپ کو اقلیت اور اکثریت میں تقسیم کر لیتے ہیں، اول دولتمند اور عالی خاندان والے ہوتے ہیں.... عوام شورش پسند اور متلون مزاج ہوتے ہیں، وہ درست بات کو شاید ہی پرکھ سکتے یا اس کا تعین کر سکتے ہیں، لہٰذا اعلیٰ طبقے کو حکومت میں نمایاں اور مستقل حصہ دو.... ایک مستقل ادارے کے علاوہ کوئی دوسرا جمہوریت کی کوتاہ اندیشی کو روک نہیں سکتا۔"

آئینی کنونشن میں ہملٹن نے صدر اور سینیٹ کے تاحیات انتخاب کا مشورہ دیا۔ کنونشن نے اس

کے مشورے کو قبول نہ کیا۔ لیکن نہ ہی اس نے عوامی انتخابات کی حمایت کی، سوائے ایوان نمائندگان کے، جہاں عام آدمی کے ووٹ ڈالنے کی اہلیت کا تعین ہر ریاست کی مقننہ نے کیا تھا (ہر ریاست میں ووٹ ڈالنے کے لیے جائداد کا مالک ہونا ضروری قرار دیا گیا تھا) اور خواتین، انڈینز اور غلاموں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ آئین میں سینیٹرز کے انتخاب کا حق سٹیٹ لیجسلیٹرز کو سونپا گیا، صدر کا انتخاب سٹیٹ لیجسلیٹرز کے منتخب کردہ رائے دہندگان کے ذریعے قرار پایا اور سپریم کورٹ کی تقرری کا حق صدر کو سونپا گیا۔

تاہم انقلاب کے بعد کے معاشرے میں جمہوریت کا مسئلہ رائے دہی پر آئینی حد بندیاں نہیں تھا۔ یہ آئین کی دسترس سے باہر معاشرے کی غریب اور امیر میں تقسیم میں پنہاں تھا۔ کیونکہ اگر کچھ لوگ بہت زیادہ دولت اور اثر و رسوخ کے مالک تھے، اور ان کے پاس زمین، پیسے، اخبارات، چرچ اور تعلیمی نظام تھا، تو رائے دہندگان کا حلقہ چاہے کتنا بھی وسیع کیوں نہ ہوتا ان کی طاقت کو کیسے ختم کر سکتا تھا؟ یہاں ایک اور مسئلہ بھی تھا، کیا ایسا نہیں تھا کہ نمائندہ حکومت کا مزاج اتنا قدامت پسندانہ تھا کہ باوجود وسیع بنیادوں پر استوار ہونے کے وہ کوئی ہنگامہ خیز تبدیلی نہیں چاہتی تھی۔

آئین کی تصدیق کرنے کا وقت آیا۔ اسے ریاستوں کے کنونشن میں پیش کیا جانا تھا اور اس کی تصدیق کے لیے ضروری تھا کہ تیرہ ریاستوں میں سے نو ریاستیں اس کے حق میں ووٹ ڈالتیں، نیو یارک جہاں تصدیق کے لیے بحثیں عروج پر تھیں، اخبارات میں مضامین کا ایک گمنام سلسلہ چل نکلا تھا، ان سے ہمیں آئین کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضامین جو آئین کو منظور کرنے کے حق میں تھے وہ جیمز میڈیسن الیگزینڈر ہملٹن، اور جون جے نے لکھے تھے۔ انہیں "فیڈرلسٹ پیپرز" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ (آئین کے مخالفین کے لیے 'اینٹی فیڈرلسٹ" کا نام استعمال کیا جاتا تھا۔)

فیڈرلسٹ پیپر 10 میں جیمز میڈیسن نے یہ دلیل دی تھی کہ نمائندہ حکومت کو ایک ایسے معاشرے میں امن قائم کرنا ہوگا، جو طبقاتی جھگڑوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ جھگڑے "جائداد کی غیر مساویانہ تقسیم" سے پیدا ہوئے ہیں، وہ جو جائداد رکھتے ہیں اور وہ جو اس سے محروم ہیں، معاشرے میں اپنے مفادات کی واضح نگہداشت کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔" اس کا کہنا تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس طبقاتی جدوجہد پر جس نے دولت میں نابرابری سے جنم لیا ہے، کس طرح قابو پایا جائے۔ اقلیتی طبقے کو اس اصول کے ذریعے کہ فیصلہ اکثریت رائے سے کیا جائے گا، قابو کیا جا سکتا ہے

لہٰذا میڈیسن کے نزدیک اصل مسئلہ اکثریتی طبقے کو قابو کرنا تھا، اور اس کا حل آئین میں ایک "وسیع جمہوریہ" کی صورت میں موجود تھا۔ یعنی تیرہ ریاستوں پر مشتمل ایک وسیع قوم کی تشکیل، کیونکہ پھر "یہ ان تمام کے لیے مزید مشکل ہو جائے گا، جو خود اپنی قوت آزمانا چاہتے ہیں اور مل جل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔"

امن کے قیام کے لیے ایک جمہوریہ کی اپنی اس دلیل میں میڈیسن فیڈرلسٹ نمبر 11 میں

بڑے واضح طور پر بتاتا ہے، کہ وہ کس کے لیے امن قائم کرنا چاہتا ہے۔ ''کاغذی زر، قرضوں کے خاتمے، جائداد کی غیر مساویانہ تقسیم یا کسی بھی دوسرے ناموزوں یا ضرر رساں منصوبے کے خلاف غم وغصہ کا کسی ایک رکن کی نسبت پورے وفاق میں سرایت کرنے کا امکان کم ہوگا۔''

جب آئین کی شقوں کے پس پردہ ہمیں معاشی مفاد نظر آتے ہیں، تو پھر یہ دستاویز دانشمند افراد کی محض ایک عمدہ اور منظم معاشرہ قائم کرنے کی کوشش نظر نہیں آتی، بلکہ یہ مخصوص گروہوں کا اپنی مراعات کو قائم رکھنے اور عوام کو صرف اس قدر حقوق اور آزادی دینے کا ایک کارنامہ نظر آتا ہے۔ جو عوامی حمایت کو یقینی بنا سکے۔

نئی حکومت میں میڈیسن اور اس کے ساتھیوں جیفرسن اور منرو کا تعلق ایک ہی پارٹی (ڈیموکریٹ ری پبلیکنز) سے تھا۔ ہملٹن کا تعلق واشنگٹن اور ایڈمز کی ہمراہی سے متحارب پارٹی (دی فیڈرلسٹس) سے تھا۔ لیکن دونوں، ایک ورجینیا کا غلاموں کا مالک دوسرا نیویارک کا تاجر، نئی حکومت کے اہداف پر متفق تھے جو کہ وہ قائم کرنے جا رہے تھے۔ اس بارے وہ امریکی نظام سیاست میں دونوں مخالف سیاسی پارٹیوں میں بنیادی اتفاق کی روایت کی توقع رکھتے تھے۔ ہملٹن نے کہیں اور ''فیڈرلسٹ پیپرز'' میں لکھا تھا، کہ ''نیا وفاق مقامی جتھہ بندیوں اور بغاوتوں کو کامیابی سے دبانے کے قابل ہوگا۔'' اس نے براہ راست شیز بغاوت کا حوالہ دیا ''پرآشوب صورت حال جس سے میساچوسٹس بمشکل باہر نکل سکا اسی بات کا ثبوت ہے کہ اس قسم کی صورتحال کا کہیں بھی دوبارہ پیدا ہونا محض قیاس آرائی نہیں۔''

یہ شاید میڈیسن یا ہملٹن تھا (انفرادی پیپرز کے مصنفین کا ہمیشہ نام نہیں لکھا ہوتا تھا) جس نے فیڈرلسٹ پیپر نمبر 63، میں ''ایک مضبوط سینیٹ'' کی ضرورت پر زور دیا۔ جیسا کہ ''بعض دفعہ لوگوں کو ان کی اپنی غلطیوں اور مغالطوں کے خلاف تحفظ فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور ''ان نازک لمحات میں، اعتدال پسند اور معزز شہریوں کی تنظیم کی جانب سے عوام، کو گمراہ کن راستے پر چلنے سے روکنے کے لیے اور اس نقصان سے بچانے کے لیے جس کا انتخاب خود لوگوں نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے کیا ہو، مداخلت کس قدر فائدہ مند ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ معقولیت، انصاف اور حقیقت لوگوں کے ذہنوں پر خود بخود واضح ہو جائے؟''

آئین دراصل جنوب میں بسنے والے غلاموں کے تاجروں کے مفادات اور شمال کے دولتمند تاجروں کے مفادات کے درمیان ایک سمجھوتا تھا، تیرہ ریاستوں کو تجارت کے لیے ایک بڑی مارکیٹ میں متحد کرنے کے مقصد کے لیے شمالی نمائندے ایسے قوانین کے خواہاں تھے، جو بین الریاستی تجارت کی راہیں ہموار کر سکیں، اور اس بات پر مصر تھے کہ ایسے قوانین محض کانگریس کی اکثریت رائے سے پاس کیے جائیں، جنوب اس بات پر رضامند تھا بشرطیکہ غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار دیے جانے سے پہلے اسے بیس سال تک جاری رہنے دیا جائے۔

چارلس بیرڈ ہمیں متنبہ کرتا ہے، کہ حکومتیں، بشمول امریکہ کی حکومت کے غیر جانبدار نہیں

ہوتیں، وہ ہمیشہ نمایاں معاشی مفادات کی نمائندگی کرتی ہیں اور یہ کہ ان کے آئین کا مقصد ہی ان مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ یہاں بہت سے لوگ جائدادوں کے مالک تھے۔ لیکن کچھ لوگوں کے پاس دوسروں کی نسبت بہت زیادہ جائدادیں تھیں۔ چند لوگ بہت بڑی بڑی جائدادوں کے مالک تھے۔ بہت سے لوگ (اندازاً ایک تہائی) بہت تھوڑی جائداد رکھتے تھے اور باقی ماندہ کے پاس کچھ نہ تھا۔

تاہم ایک تہائی لوگوں کی ایک معقول تعداد تھی جو محسوس کرتے تھے کہ ان کے پاس کچھ نہ کچھ ضرور ہے جس کے لیے ایک مستحکم حکومت کی ضرورت ہے۔ یہ اٹھارویں صدی کے اختتام پر دنیا میں کسی بھی حکومت کے لیے حمایت کی سب سے بڑی بنیاد تھی۔ اس کے علاوہ شہروں میں بسنے والے کاریگروں کا ایک ایسی حکومت کے قیام میں بہت بڑا مفاد پوشیدہ تھا جو ان کی مصنوعات کو بیرونی مقابلے سے تحفظ فراہم کر سکے۔

یہ بات نیویارک کے حوالے سے خاص طور پر درست تھی۔ جب نو اور دس ریاستوں نے آئین کی تصدیق کر دی تو نیویارک کے چار ہزار کاریگروں نے اس کی خوشی میں فلوٹس اور بینرز کے ساتھ جلوس نکالا۔ جس میں بیکری کے کاریگر لوہار، شراب بنانے والے بحری جہاز بنانے اور مرمت کرنے والے، بیرل بنانے والے، بگھیاں بنانے والے اور درزی شامل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت انہیں برطانوی ہیٹوں، جوتوں اور دوسری اشیاء کے خلاف تحفظ فراہم کرے جو انقلاب کے بعد نوآبادیوں میں سیلاب کے ریلے کی طرح امڈی چلی آ رہی تھیں۔ اس کے نتیجے میں کاریگروں نے ووٹ ڈالتے وقت دولتمند قدامت پسندوں کی حمایت کی۔

اس طرح، یہ آئین امریکی نظام کی پیچیدگی کا مظہر ہے، یعنی یہ دولتمند اشرافیہ کے مفادات کی تکمیل کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی چھوٹی جائدادوں کے مالکان اوسط آمدنی والے کارکنوں، اور کسانوں کے لیے بھی اتنا کچھ مہیا کرتا ہے کہ ان کی مدد سے اپنی حمایت کی ایک وسیع بنیاد استوار کر سکے۔ یہ بنیاد مہیا کرنے والا معمولی سا خوشحال طبقہ جو یہ بنیاد مہیا کرتا ہے، وہ سیاہ فاموں، انڈینز اور بہت غریب سفید فاموں کے خلاف ایک فصیل کا کام دیتا ہے۔ وہ اشرافیہ کو اس قابل بنانے میں مددگار ہے کہ وہ کم از کم استبداد اور زیادہ سے زیادہ قانون کا سہارا لے کر اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں، اور اس سارے عمل کو حب الوطنی اور یکجہتی کے حسین نغموں کے ساتھ خوشگوار بھی بنا سکیں۔

آئین اس کے بعد عوامی سطح پر زیادہ قابل قبول بن گیا جب پہلی کانگریس نے اس پر تنقید کے ردعمل میں ترجیحات کا سلسلہ پاس کیا جسے ''بل آف رائٹس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان ترجیحات کے بعد بظاہر حکومت عوام کی آزادیوں (مثلاً بولنے کی آزادی، شائع کرنے کی آزادی، عبادت کرنے کی آزادی، اپنے حق کے لیے قانونی مدد کی آزادی، منصفانہ سماعت کی آزادی، گھروں میں سرکاری مداخلت

سے آزادی) کی امین نظر آنے لگی۔ یہ نئی حکومت کے لیے عوامی پشت پناہی کے حصول کے لیے تیار کیا گیا مسودہ تھا۔ جس بات کی وضاحت نہیں کی گئی تھی (جیسا کہ یہ وہ وقت تھا جب آزادی کی باتیں نئی تھیں اور ان کی حقیقت کو پرکھا نہیں گیا تھا)، وہ یہ تھی: کسی بھی شخص کی آزادی کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے جب اس کی حفاظت ایک دولتمند اور طاقتور طبقے کو سونپ دی گئی ہو۔

حقیقت میں یہی مسئلہ آئین کی دوسری دفعات کے بارے میں بھی موجود تھا، مثال کے طور پر وہ شق جس میں ریاستوں کو معاہدات کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کو کہا گیا تھا، یا وہ شق جو کانگریس کو لوگوں پر ٹیکس لگانے اور رقوم پر تصرف کا اختیار دیتی تھی۔ یہ سب کچھ بظاہر معمول کے مطابق اور بے ضرر سا نظر آتا ہے۔ جب تک کوئی یہ سوال نہ کرے کس پر ٹیکس اور کس کے لیے؟ کیا تصرف، اور کس کے لیے؟

ہر شخص کے معاہدے کو تحفظ فراہم کرنا بظاہر بڑا منصفانہ فعل نظر آتا ہے، جب تک ہم اس پہلو پر غور نہیں کرتے کہ غریب اور امیر کے درمیان، مالک اور ملازم کے درمیان، زمیندار اور مزارع کے درمیان، قرضہ دینے والے اور قرضہ لینے والے کے درمیان کئے گئے معاہدے عام طور پر دونوں فریقین میں سے طاقتور کے حق میں ہوتے ہیں۔ اس طرح ان معاہدات کو تحفظ فراہم کرنا حکومت کی عظیم طاقت، اس کے قانون، عدالتوں اور پولیس کو مراعات یافتہ کے پلڑے میں ڈالنے کے مترادف ہے، اور اس پر عمل اگر قدیم دور کے وحشیانہ اور ظالمانہ انداز میں نہ بھی ہو لیکن قانون کے مطابق تو ہوتا ہے۔

''بل آف رائٹس'' کی پہلی ترمیم سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس معصومیت کے پس پردہ بھی مفاد چھپا ہوا تھا۔ یہ ترمیم کانگرس نے 1791ء میں منظور کی جس کے مطابق یہ پاس ہوا کہ کانگرس ایسا کوئی قانون نہیں بنائے گی، جو تقریر یا پریس کی آزادی کو محدود کرنے کا موجب بنے۔'' لیکن اس ترمیم کو آئین کا حصہ بنانے کے باوجود، سات سال بعد کانگرس نے ایک قانون پاس کیا جو واضح طور پر آزادی تقریر کے حق کو محدود کرتا تھا۔

یہ 1789ء کا ''سیڈیشن ایکٹ'' تھا جو کہ ایڈمز کی انتظامیہ کے تحت اس وقت منظور کیا گیا جب انقلاب فرانس اور آئرلینڈ کی بغاوت کے بعد آئرلینڈ اور فرانس کے باشندوں کو امریکہ میں خطرناک انقلابیوں کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ ''سیڈیشن ایکٹ'' کے تحت حکومت، کانگرس یا صدر کے خلاف انہیں بدنام کرنے یا ان کے خلاف عوامی نفرت پیدا کرنے کے لیے کسی قسم کی جھوٹی، رسوا کن، یا بدنیتی پر مبنی بات کرنا یا لکھنا جرم قرار دیا گیا۔ یہ شق پہلی ترمیم کی براہ راست خلاف ورزی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے لاگو کر دیا گیا۔ دس امریکیوں کو حکومت کے خلاف باتیں کرنے پر قید کر دیا گیا، اور 1798ء سے 1800ء تک استغاثہ کے ججوں کے طور پر بیٹھنے والے سپریم کورٹ کے تمام ممبران نے اسے آئین کے مطابق قرار دیا۔

پہلی ترمیم کے باوجود امریکہ میں برطانیہ کا عام قانون جو ''بغاوت انگیز تحریر'' کے خلاف ہے

رائج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اگر حکومت کسی بیان یا تحریر کو قبل از وقت روک نہ سکے یا اس پر پابندی نہ لگا سکے تو ایسی بات کرنے والے یا تحریر لکھنے والے کو بعد میں سزا دی جا سکتی ہے۔ اس قانون کی موجودگی کو پہلی ترمیم جسے آزادی رائے کے تحفظ میں ایک پختہ دیوار سمجھا جاتا ہے، اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

کیا آئین میں شامل معاشی شقیں بھی اسی طرح کمزور انداز میں لاگو کی گئی تھیں؟ اس کی ایک مثال ہمیں تقریباً فوری طور پر واشنگٹن کی پہلی انتظامیہ کے تحت ملتی ہے۔ جب کانگریس کے ٹیکس لگانے اور رقوم پر تصرف کے اختیار کو خزانے کے سیکرٹری الیگزینڈر ہملٹن نے فوری طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ہملٹن نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ حکومت کو اپنی مضبوطی کے لیے معاشرے کے دولتمند عناصر سے اتحاد کرنا چاہیے کانگریس کو قوانین کا ایک سلسلہ تجویز کیا جو کہ اس فلسفے پر عمل کرتے ہوئے لاگو کر دیا گیا۔ بنک آف امریکہ، امریکی حکومت اور مخصوص بنکنگ مفادات کے حامل افراد کے درمیان شراکت داری کی بنیاد پر قائم کیا گیا۔ صنعتکاروں کی مدد کے لیے ایک محصول نامہ درآمد و برآمد پاس کیا گیا۔ اور حکومتی بانڈ ہولڈرز کو ان کے بانڈز کی پوری قیمت ادا کرنے پر اتفاق کیا گیا، جنگی بانڈز کی کثیر تعداد دولتمند لوگوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کے پاس تھی۔ ان بانڈز کی ادائیگی کے لیے رقوم پیدا کرنے کے لیے ٹیکس قوانین پاس کئے گئے۔

ان ٹیکس قوانین میں سے ایک وہسکی ٹیکس تھا، جس نے خاص طور پر چھوٹے کسانوں کو متاثر کیا جو غلہ پیدا کرتے تھے اور اسے وہسکی میں تبدیل کر کے پھر فروخت کرتے تھے۔ 1794ء میں مغربی پنسیلوانیا کے کسانوں نے ہتھیار اٹھا لیے، اور ٹیکس کی وصولی کے خلاف بغاوت کر دی، سیکرٹری خزانہ ہملٹن نے ان کو اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج کی قیادت کی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آئین کے پہلے سالوں کے دوران اس کی کچھ شقوں، حتیٰ کہ وہ جن کی بڑے زور و شور اور شاندار طریقے سے تشہیر کی گئی تھی (پہلی ترمیم جیسی)، پر عملدرآمد کو بہت ہلکے انداز میں لیا گیا، جبکہ کچھ دوسری شقوں (ٹیکس کے اختیارات جیسی) کو طاقت کے ساتھ لاگو کیا گیا۔

پھر بھی، بانی بابوں کو من گھڑت اساطیر نے گھیر رکھا ہے۔ کیا وہ دانشمند اور انصاف پرور لوگ تھے جو طاقت کا توازن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے؟ حقیقت میں وہ توازن کے خواہاں نہیں تھے، سوائے ایک توازن کے جو اشیاء کو ان کی پہلی والی حالت میں ہی برقرار رکھ سکے، اس دور کی نمایاں قوتوں کے درمیان توازن، یقیناً وہ غلاموں اور آقاؤں، جائداد سے محروم اور جائداد کے مالکوں، انڈینز اور سفید فاموں کے درمیان کسی توازن کے خواہاں نہ تھے۔

تقریباً آدھی آبادی ان بابوں کی نظروں سے اوجھل تھی، اس کا ذکر اعلان آزادی میں کہیں نہیں ملتا، آئین کی تشکیل میں اسے غیر حاضر رکھا گیا، نئی سیاسی جمہوریہ میں وہ کہیں نظر نہیں آتی، وہ آدھی آبادی ابتدائی امریکہ کی خواتین پر مشتمل تھی۔

دوستانہ استبداد

ہم بڑی آسانی سے ملک کی آدھی آبادی کو نظر انداز کرتے ہوئے معیاری تاریخوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نئے علاقے تلاش کرنے والے مرد، زمینوں کے مالک مرد، تاجر مرد، سیاسی راہنما مرد، فوجی شخصیات مرد، گویا ہر کام مرد ہی سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں خواتین کو نظر انداز کر دینا ان کی کم تر اور دبی ہوئی معاشرتی حیثیت کا غماز ہے۔

اپنی اس عدم موجودگی کے پیش نظر وہ سیاہ فام غلاموں جیسی کوئی مخلوق تھیں (اس طرح غلام خواتین کو دہرے استبداد کا سامنا تھا)۔ نیگروز کے رنگ اور چہروں کے خدوخال کی طرح، خواتین کی جسمانی انفرادیت ان کے ساتھ اس گھٹیا سلوک کی بنیاد تھی۔ یوں محسوس ہوتا کہ ان کے مخصوص جسمانی اوصاف نے مردوں کے لیے بہت آسانی پیدا کر دی تھی۔ کہ وہ ایک ایسی مخلوق کو استعمال بھی کر سکتے تھے، اس کا استحصال بھی کر سکتے تھے، اور عزیز جاں بھی خیال کر سکتے تھے جو بیک وقت ان کی نوکر، بستر کی ساتھی، زندگی کی ہمجولی اور ان کے بچوں کی حاملہ، استاد اور محافظ تھی۔

اس قریبی تعلق اور بچوں کے ساتھ ایک طویل تعلق کی وجہ سے، ایک خاص مربیانہ تعلق بھی تھا، جو بعض اوقات، خاص طور پر طاقت کے مظاہرے کے وقت، برابری کے سلوک میں بھی بدل جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا نجی اور ذاتی استبداد تھا جس کا خاتمہ بہت مشکل تھا۔

ابتدائی معاشروں میں، امریکہ اور کہیں بھی کسی دوسری جگہ، جہاں جائداد کی ملکیت مشترکہ ہوتی تھی، اور خاندان چچیوں، چچاؤں، دادیوں اور داداؤں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہوئے بہت بڑے بڑے ہوتے تھے، خواتین کے ساتھ سفید فام معاشروں کی نسبت زیادہ برابری کا سلوک روا رکھا جاتا تھا، جنھوں نے بعد میں ان پر "تہذیب" اور نجی ملکیت متعارف کرواتے ہوئے قبضہ کر لیا۔

مثال کے طور پر جنوب مشرق کے "زونی" قبائل میں پھیلے ہوئے خاندان اور بڑی بڑی برادریاں خاتون کے زیر سایہ ہوتی تھیں، جس کا خاوند بیاہ کر اس کے پاس رہنے کے لیے آ جاتا تھا۔ مکان خواتین کی ملکیت تصور کئے جاتے تھے اور زمین برادری کی ملکیت ہوتی تھی، اور جو بھی زمینوں میں پیدا ہوتا

خواتین اس میں برابر کی مالک ہوتی تھیں، خود اپنے خاندان میں رہتے ہوئے عورت زیادہ محفوظ ہوتی تھی۔ اور وہ جب چاہتی تھی خاوند کو اس کی جائداد اپنے پاس رکھتے ہوئے طلاق دے سکتی تھی۔

یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ خواتین کو مردوں کے ساتھ برابری کا درجہ دیا جاتا تھا، لیکن ان کے ساتھ عزت احترام کا سلوک کیا جاتا تھا، اور معاشرے کی مشترکہ نوعیت انہیں زیادہ اہم مقام عطا کرتی تھی۔ سیوکس قبیلے میں لڑکی کی بلوغت کی تقریب ایسی تھی جو نوجوان سیوکس دوشیزہ کو فخر و ناز سے سرفراز کرتی تھی۔

> "اے میری بیٹی اچھائی کے راستے پر چل، اور بادل کے سائے کی طرح بھینسوں کے سیاہ ریوڑ، وسیع چراگاہوں میں چلتے ہوئے تیرے پیچھے پیچھے آئیں گے.....اے میری بیٹی ہمیشہ فرض شناس، دوسروں کا احترام کرنے والی، نرم خو اور پاکباز رہنا، غیرت مندی اور خودداری کے راستے پر چلنا، اگر عورت کی خودداری اور پاکبازی گم ہو جائے، تو بہار آئے گی لیکن بھینسوں کی قطاریں گھاس میں بدل جائیں گی۔ دھرتی کے کرم گسترانہ اور مضبوط دل کے ساتھ مضبوطی سے قائم رہنا، کوئی بھی قوم اس وقت تک ذلت کا سامنا نہیں کر سکتی جب تک اس کی خواتین کمزور اور بے عزت نہ ہو جائیں۔"

جن حالات میں سفید فام آبادکار امریکہ آئے تھے، انہوں نے خواتین کے لیے مختلف صورت احوال پیدا کر دی تھیں۔ جہاں ابتدائی نو آبادیاں زیادہ تر محض مردوں پر مشتمل تھیں، وہاں خواتین کو جنسی غلاموں، بچے پیدا کرنے والیوں اور تنہائی کی ساتھیوں کے طور پر درآمد کیا گیا۔ 1619ء میں جب پہلے سیاہ فام غلام ورجینیا میں آئے، انیس خواتین ایک بحری جہاز پر جیمز ٹاؤن پہنچیں: "خوش اطوار، نوجوان اور پاک صاف..." اپنی رضا سے آبادکاروں میں بیویوں کے طور پر بیچی گئیں، ان کی قیمت ان کے یہاں تک پہنچنے کا کرایہ تھا۔ ان ابتدائی سالوں میں بہت سی خواتین معاہداتی ملازمین کی صورت میں یہاں آئیں، جن میں زیادہ تر تیرہ سے انیس سال کی لڑکیاں تھیں، اور جب تک ان کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی، یہاں ان کی زندگی غلاموں سے کسی طور پر بھی مختلف نہ تھی۔ انہیں اپنے مالکوں اور مالکاؤں کا تابع دار رہنا ہوتا تھا۔ ان کے مالکوں کی ان کے ساتھ جنسی بدسلوکی عام تھی۔ "امریکی ورکنگ وومن" کے مصنفین (باکسن ڈال، گورڈن اور ریور بائی) کے مطابق "ان کو بہت کم معاوضہ دیا جاتا تھا اور اکثر گستاخانہ اور سخت سلوک کا نشانہ بنایا جاتا تھا، اور عمدہ خوراک اور خلوت سے محروم رکھا جاتا تھا۔

1756ء میں، الزبتھ سپرگز نے اپنے والد کو اپنے مصائب کے بارے میں لکھا، ہم بدقسمت انگلش لوگ یہاں جن مصائب سے گزر رہے ہیں وہ یہاں انگلینڈ میں آپ کے تصور سے بھی باہر ہیں، اور میں بھی انہی بدقسمتوں میں سے ایک ہوں۔ میں تقریباً دن رات محنت کر رہی ہوں۔

ظاہر ہے اس قسم کی خوفناک صورتحال میں مزاحمت تو جنم لیتی ہے مثال کے طور پر 1645ء میں

کونیکٹیکٹ کی جنرل کورٹ نے ایک خاتون ''سوزن سی'' کو اپنی مالکہ کے خلاف باغیانہ رویہ رکھنے پر
''اصلاحی گھر'' میں بھیج دیا اور وہاں اسے شدید مشقت اور گھٹیا کھانے پر رکھا۔
سیاہ فام غلاموں کو امریکہ لے جاتے ہوئے دوران سفر جن وحشت ناک مناظر کا تصور کیا
جا سکتا ہے، وہ سیاہ فام خواتین کے لیے یقیناً بہت زیادہ ثابت ہوتے ہوں گے، جو کہ عام طور پر سامان
تجارت (غلاموں) کا ایک تہائی ہوتی تھیں، ایک غلاموں کا تاجر لکھتا ہے۔
''میں نے حاملہ خواتین کو بچے جنتے ہوئے دیکھا جب کہ وہ لاشوں کے ساتھ زنجیروں میں
بندھی ہوئی تھیں، جو ہمارے شرابی اور سیرز نے اٹھائی نہیں ہوتی تھیں.... جہازوں کے تہہ خانوں میں کسی
ڈبے میں چچوں کی طرح پیک کیے گئے انسانوں کے درمیان وہ گرمی سے کھولتے ہوئے پسینوں میں بچوں
کو جنم دیتی تھیں،.... جہاز کے عرشے پر ایک نوجوان نیگرو خاتون کو زنجیروں سے جکڑ رکھا تھا جو خریدنے اور
جہاز پر لادنے کے فوراً بعد حواس کھو چکی تھی۔''

ایک خاتون ''لنڈا ابرٹ'' جو غلامی کی زنجیروں سے فرار ہوئی اپنی ایک دوسری پتا بیان کرتی ہے:
''اب میں اپنے پندرھویں سال میں داخل ہو چکی تھی.... جو کہ ایک غلام لڑکی
کی زندگی میں ایک غمناک دور کا آغاز ہوتا ہے۔ میرے مالک نے میرے کانوں میں
گندے الفاظ کی سرگوشیاں شروع کر دیں۔ جیسے کہ میں جوان تھی میں ان کی اہمیت سے بے
بہرہ نہیں تھی۔ میرا مالک مجھے ہر موڑ پر گھیر لیتا تھا، اور مجھے باور کراتا تھا کہ میں اس کی ملکیت
ہوں۔ اور زمین آسمان کی قسمیں کھاتا کہ وہ مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گا۔ جب میں
دن بھر کی مشقت کے بعد تازہ ہوا کے لیے باہر نکلتی اس کے قدم میرا پیچھا کر رہے ہوتے اگر
میں اپنی ماں کی قبر پر جھکتی اس کا سیاہ سایہ وہاں بھی میرے اوپر ہوتا۔ نرم دل جو مجھے قدرت
نے عطا کیا تھا وہ آنے والی غمناک بدقسمتی کا سوچ کر بھر جاتا تھا۔

حتیٰ کہ سفید فام خواتین جو کہ ملازماؤں یا غلاموں کی صورت میں نہیں بلکہ اولین آباد
کاروں کی بیویوں کی صورت لائی گئی تھیں کو بھی مخصوص مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اٹھارہ شادی شدہ
خواتین ''سے فلاور'' نامی جہاز پر لائی گئیں۔ تین حاملہ تھیں، اور ان میں سے ایک نے امریکی ساحل پر
پہنچنے سے پہلے ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔ بچوں کی پیدائش اور بیماری نے خواتین کو گھیر لیا، بہار کے موسم
تک ان اٹھارہ خواتین میں سے صرف چار زندہ بچی تھیں۔

تمام خواتین ان نظریات تلے دبی ہوتی تھیں جو وہ انگلینڈ سے اپنے ساتھ لے کر آتی تھیں،
انگلش قانون ایک 1632ء کی دستاویز میں جسے ''دی لاز ریزولوشنز آف وومن رائٹس'' کا نام دیا گیا تھا یوں
بیان کیا گیا تھا: ''یہ الحاق جسے ہم شادی کا نام دیتے ہیں، دو افراد کے درمیان ایک بندھن ہے۔ یہ درست

ہے کہ آدمی اور بیوی ایک وجود ہیں، لیکن اس مفہوم میں کہ.... کہ اس کا نیا وجود اس سے برتر، اس کا ساتھی
اور اس کا مالک ہے۔''

''جولیا سپورویل'' نوآبادیاتی دور میں خواتین کی قانونی حیثیت کا ان الفاظ میں ذکر کرتی
ہے۔ ''خاوند کا اختیار بیوی کے وجود پر اسے بدنی سزا دینے تک تسلیم کیا جاتا تھا.... لیکن اسے اپنی بیوی کو
مستقل جسمانی نقصان پہنچانے یا اسے جان سے مار دینے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔''

جہاں تک جائداد کا تعلق تھا: ''اپنی بیوی کی جائداد اور اس کی زمین پر مکمل تصرف کے علاوہ،
خاوند اس کی کسی بھی دوسری آمدنی کا مالک ہوتا تھا، اپنی محنت سے وہ جو کچھ کماتی تھی وہ بھی خاوند وصول کرتا
تھا..... ظاہر ہے اس کا مطلب یہ تھا بیوی اور خاوند کی مشترکہ محنت کا پھل خاوند کی ملکیت ہوتا تھا۔''

عورت کے لیے شادی کے بندھن کے بغیر بچہ پیدا کرنا جرم تھا۔ اور نوآبادیاتی عدالتوں کے
ریکارڈ ''حرامی بچے پیدا کرنے پر خواتین کے خلاف استغاثوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جبکہ ان بچوں کے
باپ قانون کی زد میں آئے بغیر آزاد گھومتے رہے۔ 1747ء کے ایک نوآبادیاتی ''رسالے'' میں ایک
خاتون ''مس پولی بیکر'' کی ایک تقریر شائع کی گئی جو اس نے نیو انگلینڈ میں، بوسٹن کے نزدیک کونیکٹیکٹ کی
ایک عدل و انصاف کی عدالت کے سامنے کی، جہاں اسے پانچویں مرتبہ حرامی بچہ جننے پر سزا سنائی گئی۔

''.... میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گی، میں سمجھتی ہوں یہ قانون جس کے تحت
مجھے سزا دی گئی، نہ صرف اپنے وجود میں نامعقول ہے بلکہ خاص طور پر میری ذات کے لیے
سخت جابرانہ بھی ہے.... قانون کی رو سے میں حاملہ نہیں ہو سکتی....'' میرے جرم کی نوعیت کیا
ہے، میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگاتے ہوئے پانچ خوبصورت بچے دنیا میں لے آئی ہوں۔ میں
ٹاؤن شپ پر بوجھ ڈالے بغیر صرف اپنی ذاتی محنت سے ان کی عمدہ پرورش کر رہی ہوں، اور
اس سے بھی بہتر پرورش کر سکتی تھی اگر مجھے بھاری ادائیگیاں اور جرمانے نہ بھرنے پڑتے، نہ
ہی مجھ سے کسی کو ذرہ بھر شکایت ہے سوائے نمائندگان انصاف کے، کیونکہ میں نے بغیر شادی
کے بچے پیدا کیے ہیں، جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ شادی کی فیس سے محروم ہو گئے ہیں، لیکن
کیا اس میں میرا کوئی قصور ہو سکتا ہے''

خاندان میں باپ کی حیثیت کو امریکہ اور انگلینڈ کے ایک موثر جریدے ''سپیکٹیٹر'' میں یوں
بیان کیا گیا تھا ''مرد کی سوچ میں برتری یا اقتدار کے احساس سے بڑھ کر کوئی چیز لطف انگیز نہیں.... میں اپنے
خاندان کو پدری حاکمیت خیال کرتا ہوں، جس میں میں خود ایک بادشاہ بھی ہوں اور پروہت بھی ہوں۔''

لندن میں شائع ہونے والی ایک بہت زیادہ فروخت ہونے والی ''پاکٹ بک'' جس کا نام
تھا: ''ایک بیٹی کے لیے نصیحت'' نوآبادیاتی امریکہ میں بہت زیادہ پڑھی جاتی تھی۔ ''سب سے پہلے ایک

عموی بنیاد قائم کرنے کے لیے یہ بات اچھی طرح گوش گزار کر دینی چاہیے کہ فطرت میں ایک جنسی نابرابری پائی جاتی ہے۔ اور دنیا کے نظام کو بہتر طور پر چلانے کے لیے، مرد تھے جنہوں نے قوانین وضع کیے، انہیں عقل و دانش کا زیادہ حصہ عطا کیا گیا تھا۔"

اس قدر طاقتور تعلیم کی موجودگی میں خواتین میں بغاوت کا پایا جانا یقیناً حیران کن امر ہے۔ خواتین یا باغیوں کو ہمیشہ مخصوص نااہلیوں کا سامنا رہا، وہ اپنے مالک کی مسلسل نگاہ میں رہتی ہیں، اور اپنے اپنے گھروں میں دوسری خواتین سے جدا زندگی بسر کرتی ہیں، اسی طرح وہ اس روزمرہ کے میل جول سے محروم ہوتی ہیں، جو دوسرے پسے ہوئے گروہوں کو جرأت عطا کرتا ہے۔

"این ہچن سن" ایک مذہبی خاتون تھی، تیرہ بچوں کی ماں اور جڑی بوٹیوں سے علاج میں مہارت رکھتی تھی۔ اس نے میساچوسٹس بے کالونی کے ابتدائی سالوں میں چرچ کے پادریوں کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود اور دوسرے عام لوگوں بائبل کی خود اپنے طور پر بھی تشریح کر سکتے ہیں۔

اس پر چرچ کی جانب سے کفر بکنے کے جرم میں اور حکومت کے اختیار کو چیلنج کرنے کے جرم میں دو مرتبہ مقدمہ چلایا گیا۔ سول مقدمے کی کارروائی کے دوران وہ حاملہ اور بیمار تھی۔ لیکن انہوں نے اسے بیٹھنے کی اجازت نہ دی یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ گئی۔ مذہبی مقدمے میں اس پر کئی ہفتے تک سوالات کیے گئے اور اس مرتبہ بھی وہ بیمار تھی، لیکن اس نے سوالات کرنے والے کو بائبل کے ماہرانہ علم اور حیران کن فصاحت کے ساتھ چیلنج کیا۔ آخر میں جب اس نے تحریری طور پر معافی نامہ لکھ کر دیا تو وہ اس پر مطمئن نہ ہوئے انہوں نے کہا: "اس نے سچے دل سے معافی نامہ نہیں لکھا۔"

اسے نوآبادی سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ اور جب وہ رہوڈ جزیرے کی جانب جانے کے لیے روانہ ہوئی تو پینتیس خاندان اس کے پیچھے چل پڑے، پھر وہ "لونگ آئی لینڈ" کے ساحلوں کی جانب چلی گئی۔ جہاں انڈینز نے، جن کی زمینیں دھوکے سے ہتھیالی گئی تھیں، اسے اپنے دشمنوں میں سے خیال کرتے ہوئے اسے اور اس کے خاندان کو قتل کر دیا۔ "بیس سال بعد ایک شخص "میری ڈائر" جو اس پر مقدمے کے دوران اس کے حق میں بولا تھا، واپس میساچوسٹس آیا تو آبادی حکومت نے اسے دوسرے دو کوئیکرز (ایک کرسچن فرقے "سوسائٹی آف فرینڈز" کے ممبران) کے ہمراہ بغاوت، اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی۔ عوامی معاملات میں خواتین کی کھلم کھلا شمولیت شاذ ہی رہی، اگرچہ جنوبی اور مغربی سرحدوں پر حالات نے اسے گاہے بگاہے ممکن بنایا۔

انقلاب کے دوران جنگ کی ضروریات خواتین کو عوامی معاملات میں باہر لے کر آئیں، خواتین نے محب الوطن گروپ تشکیل دیے، برطانیہ کے خلاف کارروائیاں کیں، آزادی کے لیے مضامین لکھے، ۱۷۷۷ء میں خواتین نے بوسٹن ٹی پارٹی کی طرز پر ایک "کافی پارٹی" مہم انجام دی۔ اس واقعے کے

بارے میں "ابیگیل ایڈمز" نے اپنے خاوند جون" کو ایک خط میں لکھا۔

"ایک ممتاز دولتمند اور کنجوس تاجر (جو کہ کنوارہ تھا) کے پاس کافی کا ایک بڑا بیرل اس کے گودام میں موجود تھا، جس کو اس نے کمیٹی کے پاس چھ شیلنگ فی یونٹ سے کم قیمت پر بیچنے سے انکار کر دیا۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد، کچھ لوگ ایک سو بتاتے ہیں، اور کچھ اس سے زیادہ، ایک گھوڑا گاڑی اور لکڑی کے بکسوں کے ساتھ وہاں جمع ہو گئی، اور گودام کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے چابیاں طلب کیں جو کہ اس نے دینے سے انکار کر دیا، جس پر ایک خاتون نے اسے گردن سے دبوچا اور اسے اٹھا کر گھوڑا گاڑی کے اوپر پھینک دیا۔ جب انہوں نے گھوڑا گاڑی کو الٹ کر اسے باہر زمین پر دے مارا، تو کوئی پناہ نہ پاتے ہوئے اس نے چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ پھر انہوں نے گودام کا دروازہ کھول کر ساری کافی خود ہی بکسوں میں بھری اور گھوڑا گاڑی لے کر روانہ ہو گئیں۔ مردوں کا ایک بڑا مجمع خاموش تماشائیوں کی طرح کھڑا حیرت زدہ ہو کر اس ساری ترسیل کو دیکھتا رہا....."

حال ہی میں خواتین تاریخ دانوں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ امریکی انقلاب کے دوران کارکن طبقے کی خواتین کی خدمات کو، لیڈران کی بیگمات بیویوں کے برعکس (ڈولی میڈیسن، مارتھا واشنگٹن، اور ابیگیل ایڈمز) نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مارگریٹ کوربن جسے "ڈرٹی کیٹ" کہا جاتا تھا۔ ڈیبورا سیمپسن گارنٹ، اور مولی پیچر" نچلے غریب طبقے کی خواتین تھیں، جنہیں تاریخ دانوں نے بیگمات کے روپ میں پیش کیا۔ جب کہ وہ غریب خواتین جو لڑائی کے آخری سالوں میں فوجی کیمپوں میں گئیں اور فوجیوں کی مدد کی اور لڑائیوں میں حصہ لیا۔ انہیں بعد میں کسبیوں اور رنڈیوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ جبکہ مارتھا واشنگٹن کو "ویلی فورج" میں اپنے خاوند کے پاس جانے پر تاریخ کی کتابوں میں خاص مقام دیا گیا۔

اگر کہیں خواتین کے جذبات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ تو وہ تقریباً ان مراعات یافتہ خواتین کی تحریریں ہیں، جو معاشرے میں ایسا مقام رکھتی تھیں، جہاں سے وہ آزادانہ طور پر اپنے خیال سے کا اظہار کر سکتی تھیں، اور انہیں لکھنے اور اپنی تحریریں ریکارڈ پر لانے کے مواقع میسر تھے۔ ابیگیل ایڈمز نے "منشور آزادی، سے بھی پہلے مارچ ۱۷۷۶ء میں اپنے خاوند کو لکھا،

"نئے ضابطہ قوانین میں، جو کہ میں سمجھتی ہوں تمہارے لیے تشکیل دینا ضروری ہے۔ خاوندوں کے ہاتھ میں لامحدود اختیارات نہ سونپے جائیں۔ یاد رکھو، تمام مرد ظالم ہوتے ہیں اگر انہیں موقع میسر ہو۔ اگر خواتین کی جانب خصوصی توجہ یا خبر گیری سے کام نہ لیا گیا۔ تو ہم نے بغاوت کا پختہ ارادہ کیا ہوا ہے۔ اور ہم ایسے قوانین کو ماننے کی ہرگز پابند نہ ہوں گی جن میں ہماری کوئی آواز یا نمائندگی شامل نہ ہو۔"

تاہم جیفرسن نے اپنے اس جملے کو کہ "تمام مرد برابر پیدا کئے گئے ہیں" یہ کہہ کر کہ امریکی خواتین "اتنی عقلمند ہیں کہ سیاسی بکھیڑوں میں پڑ کر اپنی پیشانیوں پر سلوٹیں نہیں ڈلوانا چاہتی" مزید اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انقلاب کے بعد کسی بھی نئے ریاستی آئین میں سوائے نیوجرسی کے، خواتین کو ووٹ کا حق نہ دیا گیا، اور اس ریاست نے بھی 1780ء میں یہ حق منسوخ کر دیا، نیویارک کے آئین میں لفظ "مرد" کا استعمال کرتے ہوئے خصوصی طور پر خواتین کو رائے دہی سے محروم رکھا گیا۔

کارکن طبقے کی خواتین کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا، جس کے واسطے سے وہ اپنی اس ماتحتی پر اپنے باغیانہ خیالات جو بھی تھے کا اظہار کر سکتیں، نہ صرف یہ کہ وہ سخت ترین حالات میں بہت زیادہ بچے جن رہی تھیں بلکہ گھروں میں کام بھی کرتی تھیں: "منشور آزادی" کے لگ بھگ دور میں فلاڈلفیا میں چار ہزار خواتین اور بچے مقامی فیکٹریوں کے لیے گھروں میں کاتنے کا کام کر رہے تھے، خواتین دکانوں اور سراؤں کو بھی چلا رہی تھیں۔

انقلاب کے دوران اور بعد میں خواتین کی برابری کے نظریات موجود تھے: "ٹوم پین" نے خواتین کی برابری کے لیے آواز بلند کی، انگلینڈ کی مصنفہ "میری وول سٹون کرافٹ" کی کتاب "وِنڈیکیشن آف دی رائٹس آف وومن" انقلاب کے فوراً بعد امریکہ میں دوبارہ شائع ہوئی۔ جس میں اس نے لکھا "میں خواتین کو اس جانب لانے کی خواہش رکھتی ہوں کہ وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی طاقت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔"

امریکی انقلاب اور جنگ کے دوران امریکی معاشرے کے اتنے زیادہ پہلو تبدیلی کے عمل سے گزر رہے تھے کہ خواتین کی حیثیت میں تبدیلیاں پیدا ہونا ضروری ہو چکا تھا، قبل از صنعتی امریکہ میں، ابتدائی آبادکاروں کے معاشرے میں خواتین کی عملی ضرورت نے برابری کے کچھ سامان پیدا کر دیئے تھے۔ خواتین اہم ملازمتوں پر کام کر رہی تھیں، مثلاً اخبارات شائع کرنا، چمڑے کے کارخانوں کا انتظام و انصرام، سراؤں اور شراب خانوں کو چلانا اور ہنر مند کاموں میں مصروف تھیں، 1795ء میں "مین" کے ایک فارم پر ایک دادی "مارتھا موربلارڈ" نے اپنے پچیس سالہ دایہ" کے پیشے کے دوران ایک ہزار سے زیادہ بچوں کو پیدا کیا۔

اب خواتین کو گھروں سے نکال کر صنعتی زندگی میں دھکیلا جا رہا تھا۔ جبکہ ساتھ ہی خواتین کے لیے گھروں میں مقید رہنے کا دباؤ بھی جاری تھا، جہاں ان پر آسانی سے قابو رکھا جا سکتا تھا: "خواتین کے مقام" کا نظریہ جس کا نفاذ مردوں کے ہاتھ میں تھا بہت سی خواتین کے لیے قابل قبول تھا۔ اس وقت اس بات کی بہت اہم ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، خواتین کو ان کے مقام پر رکھنے کے لیے، سکول میں اور گھر میں خواتین کو ایسے نظریات کی تعلیم دی جائے جو انہیں مردوں کا تابع فرمان بنائے رکھے، عورت سے ہر

حال میں پاکبازی کی توقع رکھی جاتی تھی۔

جب امیلا بلومر نے 1851 میں اپنی حامی مساوات نسواں پبلیکیشن میں خواتین کو روایتی لباس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے چھوٹے سکرٹ اور پینٹیں پہننے کا مشورہ دیا تو خواتین کے عوامی رسائل و جرائد میں اس پر بہت حملے کئے گئے۔

ایک خاتون کا کام گھر کی فضا کو خوشگوار رکھنا، مذہب کو قائم رکھنا، اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا، کھانا پکانا، گھر کی صفائی کرنا، کپڑے سینا، اور گھر کی سجاوٹ کے لیے پھولوں کے گلدستے تیار کرنا ہے۔ ایک خاتون کو بہت زیادہ پڑھنا نہیں چاہیے اور مخصوص کتابوں سے احتراز برتنا چاہیے۔

1808ء میں نیویارک میں ایک خطبے میں کہا گیا، کس قدر دلچسپ اور اہم فرائض خواتین کو بطور بیوی کے سونپے گئے ہیں.... خاوند کی مشیر اور دوست، جو اس کی پریشانیوں کو کم کرنے، اس کے غموں کو ہلکا کرنے اور اس کی خوشیوں میں اضافہ کرنے کے لیے اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دیتی ہے۔

خاتون پر گھریلو ذمہ داریاں ڈالنے کا مسلک دراصل اسے "مختلف لیکن برابر" کے اصول کے ذریعہ مطمئن رکھنے کا ایک طریقہ کار تھا، یعنی اسے ایسا کام سونپتے ہوئے جو اتنا ہی اہم ہے جتنا مرد کا کام لیکن نوعیت میں مختلف اور علیحدہ ہے۔ اس "برابری" کے اندر یہ حقیقت بھی موجود تھی۔ کہ عورت اپنے جیون ساتھی کا انتخاب نہیں کرتی تھی، اور جب اس کی شادی ہو جاتی تھی، اس کی زندگی متعین ہو جاتی تھی۔ شادی زنجیریں ڈال دیتی تھی اور اور بچے ان زنجیروں کو مزید مضبوط کر دیتے تھے۔

"حقیقی نسائیت مسلک" عورت کی واضح طور پر نظر آنے والی ماتحتی کی حیثیت کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکا؟ وہ ووٹ نہیں دے سکتی تھی۔ جائداد نہیں رکھ سکتی تھی، اگر وہ کام کرتی تھی تو اس کا معاوضہ اس معاوضے کا ایک چوتھائی یا نصف ہوتا تھا جو وہی کام کرنے پر مرد کو ملتا تھا۔ خواتین کو قانون اور طب کے پیشوں، کالجوں سے اور وزارتوں سے نکالا ہوا تھا۔

تمام خواتین کو ایک ہی درجے میں رکھنا، تمام کو پروان چڑھنے کے لیے ایک ہی گھریلو ماحول میں رکھنا، ایسا عمل تھا، جس نے باقی ماندہ طبقاتی فرق کو مٹاتے ہوئے جنس کی بنیاد پر ایک طبقہ پیدا کر دیا تھا۔ تاہم کچھ قوتیں اس طبقاتی مسئلے کو اجاگر کرنے میں مصروف تھیں، "سیموئیل سلاٹر" نے 1789ء میں نیو انگلینڈ میں کاتنے کی مشینری متعارف کروائی، اور اب ایسی نوجوان لڑکیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو حقیقت میں ناکتخدا ہوں.... اور فیکٹریوں میں کاتنے والی مشینوں پر کام کر سکیں۔ 1814ء میں میساچوسٹس کے شہر "والتھام" میں پاور لومز متعارف ہوئیں۔ اور اب روئی کو کپڑے میں تبدیل کرنے کا تمام کام ایک ہی چھت کے نیچے انجام پانے لگا۔ نئی ٹیکسٹائل فیکٹریاں بڑی تیزی سے پھیلیں، اور ان میں 80 سے 90 فیصد کام خواتین انجام دیتی تھیں،، جن میں اکثریت 15 سال سے 30 سال تک کی خواتین کی تھی۔

ابتدائی صنعتی ہڑتالوں نے 1830ء کے عشرے میں ان ٹیکسٹائل فیکٹریوں میں جنم لیا۔ 1836ء میں خواتین کی اوسط آمدنی 37 سینٹ روزانہ تھی اور ہزاروں خواتین 25 سینٹ روزانہ کماتی تھیں، اور انہیں بارہ سے سولہ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔ 1824ء میں رہوڈ جزیرے پر "پاؤ ٹکٹ" میں پہلی خواتین فیکٹری کارکنوں کی ہڑتال ہوئی، 202 خواتین نے کم مزدوری اور لمبے اوقات کار کے خلاف مردوں کا ساتھ دیا۔ چار سال بعد "ڈوور" "نیو ہمپشائر" میں خواتین نے تنہا ہڑتال کی۔

1834ء میں میساچوسٹس، "لوویل" میں جب ایک نوجوان خاتون کو ملازمت سے نکال دیا گیا تو دوسری لڑکیوں نے اپنی لومز چھوڑ دیں۔ ان میں سے ایک لڑکی شہر کے ٹیوب ویل پر چڑھ گئی، اور ایک اخبار کے مطابق وہاں کھڑے ہو کر "میری ڈل سٹون کرافٹ" کی خواتین کے حقوق اور مردوں کی ناانصافی پر شعلہ فشاں تقریر کی، جس نے سامعین پر بہت زیادہ اثر ڈالا، اور انہوں نے اپنا راستہ خود منتخب کرنے کا پختہ عزم کیا، خواہ وہ اس راہ میں ماری بھی جائیں۔"

ان ہڑتالوں کے دوران خواتین نے کئی مرتبہ ڈنڈوں اور پتھروں سے مسلح ہو کر ٹیکسٹائل مل کے لکڑی کے گیٹ توڑ دیئے اور لومز کو بند کر دیا۔

"کیتھرین بیچر" جو کہ اپنے دور کی ایک خاتون ریفارمر تھی، نے فیکٹری نظام کے بارے میں لکھا ہے:

"میں سردیوں کے وسط میں وہاں تھی۔ اور ہر صبح مجھے پانچ بجے مزدوروں کو بلانے والی گھنٹیوں کے ذریعے اٹھا دیا جاتا تھا.... پھر دوپہر کے کھانے کے لیے آدھ گھنٹے کا وقفہ دیا جاتا تھا جس میں آنے اور جانے کا وقت بھی شامل ہوتا تھا۔ پھر واپس مل میں آ کر شام سات بجے تک کام کرنا ہوتا تھا.... ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کام کا تمام وقت کمروں کے اندر گزارنا پڑتا تھا۔ جہاں تیل کے لیمپ روشن ہوتے اور ہر کمرے میں 40 سے 50 خواتین اور مرد موجود ہوتے تھے، اور انہیں اسی ہوا میں، جو وہاں چلتے ہوئے ہزاروں کرگھوں، تکلوں اور لومز سے اڑنے والے کپاس کے ذرات سے بھری ہوتی تھی، سانس لینا ہوتا تھا۔"

اور اعلیٰ طبقے کی خواتین کی زندگی؟ ایک انگریز خاتون "فرانسس ٹرولوپ" اپنی کتاب "ڈومیسٹک مینرز آف دی امریکن" میں لکھتی ہے۔

"میں یہاں ایک اعلیٰ طبقے کی "فلاڈلفین لیڈی" کی روزانہ کی معروفیات بیان کرنا چاہوں گی.... وہ سو کر اٹھتی ہے تو اس کا پہلا گھنٹہ بڑی باریک بینی کے ساتھ اپنے لباس کی ترتیب میں صرف ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ صاف ستھری، اکڑی ہوئی اور خاموش اپنے ڈائننگ روم میں

داخل ہوتی ہے۔ جہاں اس کا ایک آزاد سیاہ فام فٹ مین ناشتہ لے کر آتا ہے...اپنی بگھی کے آنے سے بیس منٹ پہلے وہ اپنے چیمبر میں چلی جاتی ہے (جیسا کہ وہ اسے کہتی ہے) اور اپنا برف جیسا سفید اپرن جھاڑتی ہے تہہ کرتی ہے اپنے قیمتی لباس کو سیدھا کرتی ہے...اور اپنا خوبصورت زنانہ ہیٹ سر پر رکھتی ہے، اور سیڑھیوں سے نیچے اترتی ہے، عین اس وقت اس کا آزاد سیاہ فام "کوچ مین" اس کے آزاد سیاہ فام "فٹ مین" کو اطلاع دیتا ہے کہ بگھی تیار ہے، وہ اس میں قدم رنجہ فرماتی ہے اور دبدبے والے انداز میں کہتی ہے "ڈورکاس سوسائٹی کی جانب۔"

"لوول" میں خواتین کارکنوں کی ایک اصلاحی تنظیم نے فیکٹریوں میں خواتین کے حالات پر مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا۔ ایک مضمون میں اس نے خواتین کارکنوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے لکھا۔ "وہ غلامی کے تمام تر مفہوم کے مطابق غلاموں سے ذرہ بھر بھی کم نہیں ہیں، بالکل غلاموں کی طرح ان سے صبح پانچ بجے سے شام سات بجے تک لگاتار کام لیا جاتا ہے، اور اس دوران "حاجات ضروریہ" کے لیے صرف ایک گھنٹے کا وقفہ دیا جاتا ہے۔

اس دور میں "نیو یارک ہیرلڈ" نے خواتین کے ایک جلسے کی روئیداد بیان کی جس میں "700 خواتین نے ان غلط کاریوں اور استبداد کا حل تلاش کرنے کے لیے جن کا انہیں کام کے دوران سامنا ہوتا تھا ایک جلسہ کیا۔" ہیرلڈ نے اپنا تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "ہمیں امید نہیں کہ آیا اس قسم کے اجلاس خواتین مزدوروں کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی لا سکتے ہیں...ایسے تمام اجلاس ہمیشہ بے نتیجہ رہے ہیں۔"

متوسط طبقے کی خواتین نے، اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھے جانے پر، پرائمری سکول ٹیچنگ پر اجارہ داری جمانا شروع کر دی، ٹیچروں کے طور پر انہیں زیادہ پڑھنے، آپس میں اظہار خیال کے زیادہ مواقع میسر ہونے لگے اور خود تعلیم نے اپنے طور پر ان کے سوچ بچار کے پرانے طریقوں میں تبدیلی پیدا کر دی، انہوں نے میگزینوں اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے اور کچھ خواتین نے پبلیکیشنز شروع کر دیں، 1780ء اور 1840ء کے دوران خواتین میں شرح خواندگی دوگنی ہو گئی۔

خواتین ہیلتھ ریفارمر بن گئیں، جنسی رویوں میں دہرے معیاروں اور طوائفوں پر ظلم وستم کے خلاف خواتین تحریکوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے مذہبی تنظیموں میں شمولیت اختیار کرنا شروع کر دی، چند ایک جو زیادہ طاقتور تھیں وہ غلامی کے خلاف اٹھنے والی تحریک میں شامل ہونے لگیں، اس طرح 1840ء کے عشرے میں واضح نسوانی تحریکیں ظہور میں آئیں اور خواتین عملی طور پر ناظم، متحارک اور مقرر بن چکی تھیں،

جب "ایماولیرڈ" نے 1819ء میں نیو یارک مقننہ میں تقریر کی تو اس نے انہیں بتایا کہ خواتین کی تعلیم کو "خاص طور پر اس بات پر مرکوز رکھا گیا ہے جو انہیں جوانی اور حسن کی دلکشی اور سحر کا مظاہرہ کرنے

تک محدود رکھے۔" اس نے کہا اصل مسئلہ یہ ہے" کہ مردوں کے ذوق کو، وہ جو بھی ہے، خواتین کے کردار کی تشکیل میں معیار بنایا گیا ہے، عقل اور مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اور ہمارا وجود بنیادی ہے اور ہم مردوں کے زیرنگیں نہیں ہیں۔

1921ء میں "ویلیرڈ" نے "ٹرائے فی میل سیمنری" کی بنیاد رکھی جو لڑکیوں کی تعلیم کا پہلا منظور شدہ ادارہ تھا۔ بعد میں اس نے لکھا کہ اس نے کس طرح اپنی طالبات کو انسانی جسم کے بارے میں پڑھا کر لوگوں کو پریشان کر دیا۔ "30 کے عشرے کے شروع میں مائیں جنہوں نے "سیمنری" کی کلاسوں میں شرکت کی وہ اس قدر گھبرا گئیں کہ... لڑکیوں کی شرم و حیا کو محفوظ رکھنے اور انہیں بار بار کے ہنگاموں سے بچانے کے لیے ٹیکسٹ بکس کے ان صفحات پر موٹے کاغذ چسپاں کرنا پڑے، جن پر انسانی جسم کی تشریح کی گئی تھی۔"

خواتین نے مکمل مردوں کے پیشہ ورانہ سکولوں میں داخل ہونے کے جدوجہد شروع کر دی:

"الزبتھ بلیک ول" نے اپنی میڈیکل ڈگری 1849ء میں حاصل کی، جنیوا کالج میں داخل ہونے کے لیے اسے بار بار بے سوچے سمجھے انکاروں کا سامنا کرنا پڑا جن کو اس نے عبور کر لیا۔ پھر اس نے غریب خواتین اور بچوں کے لیے "نیویارک ڈسپنسری" قائم کی، تا کہ غریب خواتین کو اپنی ہی جنس کی ڈاکٹر سے مشورہ لینے کا موقع میسر آ سکے۔ اپنی پہلی سالانہ رپورٹ میں، اس نے لکھا:

> "میرا پہلا طبی مشورہ ایک عجیب تجربہ ثابت ہوا۔ ایک بوڑھی عورت کو ہونے والے شدید نمونیے کے کیس میں مشورے کے لیے میں نے ایک بہت بڑے رتبے کے ایک نرم دل ڈاکٹر کو مشورے کے لیے بلایا۔ مریض کو دیکھنے کے بعد وہ میرے ساتھ میرے کمرے میں آیا اور اس نے کمرے میں یہ کہتے ہوئے پریشانی کے عالم میں گھومنا شروع کر دیا، ایک انتہائی غیر معمولی کیس، ایسا کیس اس سے پہلے میں نے زندگی میں نہیں دیکھا، میں حقیقت میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ میں نے اس کی یہ باتیں بڑی حیرانی اور الجھاؤ کی صورت میں سنیں، کیونکہ یہ نمونیہ کا ایک واضح کیس تھا، اور کوئی غیر معمولی حد تک خطرناک بھی نہیں تھا، پھر اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس کی ساری پریشانی اور الجھاؤ کی وجہ مریض نہیں بلکہ میں خود تھی۔"

"اوبرلن" کالج خواتین کو داخلہ دینے میں بانی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن وہاں تھیالوجی سکول میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی "اینٹونٹ براؤن" تھی جس نے 1850ء میں گریجویٹ کیا، لیکن اسے پتہ چلا کہ اس کا نام کلاس لسٹ سے نکال دیا گیا تھا۔ سٹون کو داخلہ دے کر "اوبرلن" کو ایک سخت گیر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ امن سوسائٹی اور غلامی کیخلاف تحریکوں میں بہت زیادہ سرگرم تھی۔ سیاہ فام طلباء کو پڑھاتی تھی اور لڑکیوں کے لیے ایک مباحثہ کلب منظم کیا۔ اسے جلسہ تقسیم اسناد پر خطاب لکھنے کے لیے چنا گیا، پھر

اسے بتایا گیا کہ خطاب مرد پڑھے گا، تو اس نے لکھ کر دینے سے انکار کر دیا۔

1847ء میں لوسی سٹون نے میساچوسٹس، گارڈنر میں ایک چرچ میں خواتین لیکچر دینا شروع کر دیا جہاں اس کا بھائی "منسٹر" تھا۔ یہ چھوٹی سی تقریباً 100 پونڈ کی لڑکی شاندار مقرر تھی، امریکن اینٹی سلیوری سوسائٹی، کے لیے لیکچرار کے طور پر کئی مرتبہ اس پر ٹھنڈا پانی پھینکا گیا، کتاب پھینک کر گرایا گیا، اور اجتماعی حملے کیے گئے۔

جب اس نے ہینری بلیک ول سے شادی کی، انہوں نے اپنی شادی کی تقریب میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر مندرجہ ذیل الفاظ کہے۔

> "....ہم اس بات کا اعلان اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ یہ ایکٹ ہم پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا، نہ ہی ہم رضا کارانہ طور شادی کے ایسے موجود قوانین کی اطاعت کا وعدہ کرتے ہیں جو بیوی کو ایک آزاد اور جیتی جاگتی ہستی تسلیم نہیں کرتا ہے اور خاوند کو غیر منصفانہ اور غیر فطری برتری عطا کرتا ہے۔

وہ پہلی خاتون تھی جس نے شادی کے بعد اپنا نام ترک کرنے سے انکار کیا۔ وہ "مسز سٹون" تھی۔ جب اس نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا اس کا کہنا تھا کہ وہ ٹیکس کیوں ادا کرے جب کہ اسے حکومت میں کسی قسم کی نمائندگی حاصل نہیں ہے، تو حکومتی اہلکار اس کے گھر کی تمام اشیاء حتیٰ کہ اس کے بچے کا پنگوڑا بھی اٹھا کر لے گئے۔

نیویارک کے ایک چھوٹے سے قصبے میں "پوسٹ مسٹرس" امیلا بلومر نے جب ڈھیلی ڈھالی نیکر اور شرٹ کا استعمال شروع کیا تو اس کے بعد انقلابی قسم کی خواتین نے جسم کو نمایاں کرنے والے قدیم زنانہ زیر جاموں (whale-boned bodice, Corsets, petticoats) کی جگہ اس لباس کا استعمال شروع کر دیا۔ ریورینڈ جون ٹوڈ (اپنی بہت زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک میں اس نے نوجوان مردوں کو خود لذتی کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے اسے "ذہن کو تباہ کر دینے والا عمل گردانا") نے نئے نسوانی لباس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

> "کچھ خواتین نے نیکر اور شرٹ پہن کر نیم مرد بننے کی کوشش کی ہے.... میں چند الفاظ میں بتانا چاہوں گا کہ ایسا کیوں نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے لمبے لباس میں لپٹی ہوئی عورت زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ وہ باوقار انداز میں چلتی ہے.... اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کا سحر اور حسن ختم ہو جاتا ہے۔ زنانہ چغے اتار دو، پتلونیں پہن لو اور ٹانگوں اور بازوؤں کی نمائش کرو، عورت کا وقار اور سربستہ حسن سب ضائع ہو جائے گا۔"

خواتین دوسری اصلاحی تحریکوں مثلاً انسداد غلامی، اعتدال پسندی، لباس کے فیشنوں اور

جیلوں کی حالت، میں شمولیت کے بعد اپنی صورتحال کے بارے میں بھی دلیر اور تجربہ کار ہو چکی تھیں۔ "انجلینا گرمک" جو کہ جنوبی علاقے سے تعلق رکھنے والی ایک سفید فام خاتون تھی غلامی کے خلاف ایک شعلہ بیان مقررہ بن چکی تھی، اب بھانپ چکی تھی کہ یہ تحریک اب مزید آگے جائے گی:

"آؤ' سب سے پہلے ہم لاکھوں غلام مرد اور عورتوں کو ذلت اور حقارت کی زندگی سے نجات دلانے کے لیے قوم کو جگائیں....اس کے بعد لاکھوں خواتین کو ان کے گھٹنوں کے بل سے اٹھا کر ان کے قدموں پر کھڑا کرنا یا دوسرے الفاظ میں انہیں بچیوں سے خواتین میں تبدیل کرنا خود بخود آسان ہو جائے گا۔

انجلینا کی بہن سارہ گرمک نے لکھا:

"میری زندگی کے ابتدائی حصے میں میرے طبقے کو فیشن ایبل دنیا کی تتلیوں میں شمار کیا جاتا تھا، اور اس طبقے کی خواتین، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں، کی تعلیم افسوسناک حد تک کم ہے اور انہیں یہ سبق دیا جاتا ہے۔ کہ شادی ایک ضروری اور معاشرے میں نمایاں حیثیت کے حصول کا واحد راستہ ہے۔"

مزید لکھتی ہے:

"میری اپنے بھائیوں سے صرف ایک درخواست ہے کہ وہ ہماری گردنوں سے اپنے پاؤں اٹھالیں اور ہمیں اس دھرتی پر جو خدا نے ہمیں عطا کی ہے سیدھا کھڑا ہونے کی اجازت دے دیں.... جہاں تک میرا تعلق ہے مجھ پر یہ بات مکمل طور پر عیاں ہے کہ جو کام اخلاقی طور پر مرد کے لیے جائز ہے وہی کام اخلاقی طور پر عورت کے لیے بھی اتنا ہی جائز ہے۔"

سائرہ ایک زوردار مصنفہ تھی اور انجلینا ایک آتش بیاں مقررہ، ایک مرتبہ اس نے بوسٹن اوپیرا ہاؤس میں چھ دنوں تک مسلسل ہر روز رات کو خطاب کیا۔ وہ پہلی خاتون تھی جس نے (1838ء میں) میساچوسٹس کی ریاستی مقننہ کے سامنے انسداد غلامی کے حق میں خطاب کیا۔ اس کی تقریر نے ایک بڑی تعداد کو گرویدہ کر لیا، اور "سالم" کے ایک نمائندے نے تجویز پیش کی "ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو میساچوسٹس کے سٹیٹ ہاؤس کی بنیادوں کا جائزہ لے کر آیا وہ "مس گرمک" کے ایک مزید لیکچر کو برداشت کر سکتی ہیں یا نہیں۔"

دوسرے مسائل پر بولنے نے خواتین کی صورتحال پر بولنے کی راہ ہموار کی" "ڈورتھیا ڈکس" نے 1843ء میں میساچوسٹس کی مقننہ کے سامنے، جو کچھ اس نے جیلوں اور محتاج خانوں میں دیکھا تھا، کے بارے میں خطاب کیا۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں جو کچھ میں نے خود دیکھا ہے، تکلیف دہ اور نفرت انگیز تفصیلات جیسا کہ وہ ہیں.... قابل عزت ممبران! میں سب سے پہلے آپ کی توجہ ان پاگل قیدیوں کی طرف دلانا چاہوں گی جو اس "کامن ویلتھ" میں پنجروں' اندھیری کوٹھڑیوں، تہہ خانوں اور باڑوں میں بند پڑے ہیں، زنجیروں میں جکڑے ہوئے ان بے بس ننگے پڑے ہوئے انسانوں کو ڈنڈوں اور چابکوں سے مار مار کر اطاعت گزار بنایا جاتا ہے۔"

"فرانسس وائٹ" یوٹوپین معاشرے کی بانی' ایک لکھاری خاتون تھی جو 1824ء میں سکاٹ لینڈ سے نقل مکانی کر کے یہاں آئی۔ وہ غلاموں کی آزادی، برتھ کنٹرول اور جنسی آزادی کی بہت بڑی علمبردار تھی۔ وہ دو سال سے اوپر تمام بچوں کی حکومتی تعاون سے بنائے گئے بورڈنگ سکولوں میں مفت تعلیم کی خواہاں تھی۔ اس نے امریکہ میں انہیں خیالات کا پرچار شروع کیا جو یوٹوپین سوشلسٹ "چارلس فورئیر" نے فرانس میں کہا تھا: "تمدن کی ترقی کا انحصار خواتین کی ترقی پر ہے۔"

"میں یہ بات اصرار کے ساتھ کہوں گی کہ، جب تک خواتین معاشرے میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکتیں جو اچھے فہم اور اچھے احساس نے انہیں یکساں طور پر عطا کیا ہے، انسان ترقی تو کرے گا لیکن بہت کمزور رفتار کے ساتھ.... جب تک ایک سمت سے اختیار اور اقتدار اور دوسری جانب سے خوف اور فرماں برداری کا خاتمہ نہیں کیا جاتا، اور دونوں کو ان کے پیدائشی حق.... برابری کی سطح پر بحال نہیں کیا جاتا۔"

خواتین نے انسداد غلامی کے لیے قائم کی گئی انجمنوں میں کانگریس کو بھیجنے کے لیے ہزاروں یادداشتیں اکٹھا کرنے میں پورے ملک کے طول و عرض میں بہت زیادہ کام کیا۔ اس کام کے دوران حالات خود بخود ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ غلامی کے خلاف تحریک نے خواتین میں خود اپنے حقوق کے لئے خواتین تحریکوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ 1840ء میں "ورلڈ اینٹی سلیوری کونشن" لندن میں شروع ہوئی، بڑے تلخ بحث مباحثے کے بعد خواتین کو اس کونشن میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ ہوا، لیکن اس بات پر اتفاق ہوا کہ وہ پردوں سے گھیری ہوئی ایک جگہ میں بیٹھ کر اجلاسوں میں شرکت کر سکتی ہیں۔ خواتین خاموش احتجاج کے طور پر گیلری میں بیٹھیں اور "ولیم لائیڈ گیریسن" ایک "حامی انسداد" جو خواتین کے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا، ان کے ساتھ بیٹھا۔

یہ وہ وقت تھا کہ "الزبتھ کیڈی سٹنون نے "لوسریشا موٹ" اور دوسری خواتین سے ملاقاتیں کیں اور ایک منصوبہ تیار کیا جس کے نتیجے میں تاریخ کی پہلی "وومن رائٹس کونشن" منعقد ہوئی۔ یہ کونشن نیویارک، سینیکا فالز میں منعقد کی گئی جہاں الزبتھ کیڈی سٹنون ایک ماں اور ایک گھریلو خاتون کے طور پر رہتی تھی۔ اپنی حالت پر پورے دکھ اور ملال کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا "ایک عورت کچھ بھی نہیں

ہے' ایک بیوی سب کچھ ہے۔' بعد میں اس نے لکھا:

"ورلڈ اینٹی سلیوری کنونشن" پر میرے تجربات، خواتین کی قانونی حیثیت کے
بارے میں جو کچھ پڑھ چکی تھی، اور استبداد جس کا میں نے ہر جگہ مشاہدہ کیا یہ سب کچھ اکٹھا ہو کر
میری روح کو بہا کر لے گیا..... مجھے کچھ بجھائی نہیں دیتا تھا کہ میں کیا کروں یا کہاں سے ابتداء
کروں..... میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال انگڑائیاں لے رہا تھا احتجاج اور بحث مباحثے
کے لیے ایک عوامی جلسہ"

"سینیکا کاؤنٹی کوریئر" میں ایک اعلان شائع کروایا گیا، جس میں "خواتین کے حقوق" پر بات چیت کے لیے شرکا کو 19 اور 20 جولائی کو ایک جلسے میں مدعو کیا گیا تھا۔ تین سو خواتین اور کچھ مرد اس میں شامل ہوئے جلسے کے اختتام پر ایک "ڈیکلریشن آف پرنسپلز" پر 68 خواتین اور 32 مردوں نے دستخط کیے۔ اس ڈیکلریشن میں زبان اور الفاظ کا اتار چڑھاؤ "اعلانِ آزادی" والا استعمال کیا گیا۔

جب انسانی تاریخ کے دھارے میں، نوعِ انسانی کے ایک حصے کے لیے
یہ ضروری ہو گیا کہ دھرتی کے باسیوں میں وہ ایک ایسی حیثیت کو قبول کر لیں جو کہ اس
سے مختلف تھی جو آج تک انہیں حاصل تھی....

ہم ان سچائیوں پر پختگی سے قائم ہیں جو خود اپنے وجود میں سچ ہیں؛ کہ تمام
مردوں اور عورتوں کو برابر پیدا کیا گیا ہے کہ ان کے خالق نے انہیں چند نا قابلِ انتقال حقوق
سے نوازا ہے؛ جن میں زندگی، آزادی اور خوشیوں کا حصول شامل ہیں۔

انسانی تاریخ بار بار کے دہرائے گئے ظلم و ستم اور مرد کی طرف سے عورت کے
حقوق غصب کرنے پر مشتمل ہے۔ جس کا واحد مقصد اس پر پوری طرح سے جور و استبداد کی
حکمرانی قائم کرنا ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے ہم مخلص دنیا کے سامنے یہ حقائق پیش
کرتی ہیں....

اس کے بعد شکایات کی ایک فہرست ہے اور پھر قراردادوں کا ایک سلسلہ ہے۔

سینیکا فالز کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں "وومن کنونشنز" کا ایک سلسلہ چل نکلا، 1851ء میں ایک ایسی ہی کنونشن میں ایک عمر رسیدہ سیاہ فام خاتون جو نیو یارک میں غلام پیدا ہوئی تھی، بھورا لباس اور سفید پگڑی باندھے کچھ پادریوں کی باتیں سن رہی تھی، جو بحث میں چھائے ہوئے تھے۔ یہ "سوجورنر ٹروتھ" تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اپنی نسل کی برہمی اور اپنی جنس کی برہمی کے ساتھ بحث میں شامل ہوتے ہوئے پھٹ پڑی:

یہاں جو آدمی بیٹھا ہوا ہے کہتا ہے کہ خواتین کو بگھیوں میں سوار ہونے کے لیے

مدد کی ضرورت ہے، گڑھوں اور ناہموار زمین پر چلتے ہوئے انہیں سہارے کی ضرورت
ہے..... بگھیوں میں سوار ہوتے وقت میری آج تک کسی نے مدد نہیں کی، بارش کے گدلے
پانی کے گڑھوں سے پار ہونے میں کوئی میری مدد کو نہیں آیا، نہ ہی کبھی مجھے کوئی اچھی جگہ دی گئی
ہے۔ اور کیا میں ایک عورت نہیں ہوں؟

میرے بازو کو دیکھیں! میں نے ہل چلایا ہے، فصل بیجی ہے، اور اپنے اوپر لاد لاد کر
باڑوں میں جمع کی ہے، اور کوئی مرد مجھ سے آگے نہیں جا سکا، اور کیا میں ایک عورت نہیں ہوں؟

میں نے اتنا کام کیا ہے اور جب کبھی مجھے میسر آ سکا اتنا ہی کھایا ہے جتنا کہ ایک
مرد، اور کوڑے بھی سہتی رہی، اور کیا میں ایک عورت نہیں ہوں؟

میں نے تیرہ بچے پیدا کیے ہیں، اور اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں غلاموں کے
طور پر فروخت ہوتے دیکھا ہے۔ اور جب میں ماں کا دکھ محسوس کرتے ہوئے روئی سوائے
مسیح کے مجھے کسی نے نہیں سنا۔

اور کیا میں ایک عورت نہیں ہوں؟

اس طرح سے 1830ء، 1840ء اور 1850ء کے عشروں میں خواتین نے اپنے آپ کو خواتین کے دائرے میں رکھے جانے کے خلاف مزاحمت کا آغاز کیا۔ وہ قیدیوں کے حق کے لیے، دیوانوں کے حق کے لیے، سیاہ فام غلاموں کے حق کے لیے اور خواتین کے حقوق کے لیے ہر قسم کی تحریک میں حصہ لے رہی تھیں۔

ان تحریکوں کے درمیان حکومتی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر مزید زمینوں کی جستجو اور قومی وسعت کی خواہش پوری قوت سے ابھر کر سامنے آئی۔

جب تک گھاس اگتی ہے یا پانی بہتا ہے

ایک ایسے معاشرے میں جہاں سفید فام دولتمند مردوں کو مکمل غلبہ حاصل تھا، ماتحت زندگیاں بسر کرنے والے گروہوں میں سے خواتین کی حیثیت قدرے مختلف تھی یہ ان سے قریب تر، ان کے گھروں میں رہتی تھیں، مزید برآں ان کی ضرورت تھیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے انہیں طاقت کی ضرورت نہ تھی بلکہ مربیانہ شفقت بھی کام دکھا سکتی تھی۔ لیکن جہاں تک یہاں بسنے والے انڈینز کا تعلق تھا، وہ ان کے لیے بالکل اجنبی اور ایک بیرونی مخلوق تھے، نہ ہی ان کو ان کی ضرورت تھی۔ بلکہ حقیقت میں یہ ان کی راہ میں رکاوٹ تھے، ان کے ساتھ صرف طاقت سے نمٹا جا سکتا تھا، سوائے بعض مواقعوں کے جب دیہاتوں کو جلانے کے بعد شفقت کی زبان بھی استعمال کی جا سکتی تھی۔

لہٰذا "انڈین اخراج" (جیسا کہ مہذب انداز میں کہا جاتا تھا) نے اپلاشینز اور مسیسپی کے درمیان زمینیں سفید فاموں کے قبضے کے لیے واگزار کر دی تھیں۔ جنوب میں کپاس کی کاشت کے اور شمال میں غلے کی پیداوار کے لیے زمینیں خالی کروائی گئیں۔ اور پھر نقل مکانی، نہروں، ریلوے لائنوں، نئے شہروں اور ایک وسیع براعظمی سلطنت کے قیام کے لیے بحرالکاہل تک قبضہ کر لیا گیا۔ اس سارے عمل کی تکمیل کے لیے انسانی زندگیوں کی صورت میں جو قیمت ادا کی گئی اس کا درست اندازہ لگانا مشکل ہے جبکہ انسانی مصائب اور تکالیف کا موٹا موٹا تخمینہ بھی تقریباً ناممکن ہے۔

انقلابی جنگ کے دوران انڈینز کے تقریباً تمام بڑے بڑے قبائل نے برطانویوں کا ساتھ دیا تھا، وہ جانتے تھے کہ اگر برطانوی، جنہوں نے آبادکاروں کے مغرب کی جانب پھیلاؤ پر حد بندی مقرر کر رکھی تھی، یہاں سے چلے گئے تو پھر امریکیوں کو روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ حقیقت میں جب جیفرسن 1800ء میں امریکہ کا صدر منتخب ہوا، اس وقت تک پہاڑوں کے جنوب میں 700,000 آبادکار پہنچ چکے تھے۔ اب جیفرسن نے وفاقی حکومت کو پابند کیا کہ وہ مستقبل میں جورجیا سے "کریک" اور "چیروکی" قبائل کے انخلا کو یقینی بنائے۔ گورنر ولیم ہنری ہیریسن کی زیر قیادت انڈین علاقوں میں انڈینز کے خلاف جارحانہ کارروائیوں کا آغاز کر دیا گیا۔

جب 1803ء میں جیفرسن نے فرانس سے "لوئی سیانا" کا علاقہ خرید کر قوم کا حجم دگنا کر دیا، جو کہ اب مغربی سرحد اپلاشینز سے مسیسپی سے گزرتے ہوئے راکی مونٹینز تک پھیل گئی تھی۔ اس نے کانگریس کو مشورہ دیا کہ انڈینز کو ایک چھوٹے سے علاقے میں آباد کرنے اور کھیتی باڑی کی طرف راغب کرنے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ "اس مقصد کے لیے دو قسم کے اقدامات میں تیزی لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پہلا یہ کہ شکاری زندگی کو ترک کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جائے.....دوسرا ان علاقوں میں تجارتی کوٹھیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اس طرح انہیں زراعت، صنعت کاری اور تہذیب کی جانب راغب کیا جا سکے گا۔"

جیفرسن کی "زراعت.....صنعت کاری.....تہذیب" کی باتیں بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ امریکہ کی وسیع زمینوں کو زراعت، تجارت، منڈیوں، دولت، جدید سرمایہ دارانہ معیشت کے فروغ کے لیے استعمال میں لانے کے لیے انڈینز کا انخلا ضروری تھا۔ ان سب کاموں کے لیے زمین ناگزیر تھی، اور انقلاب کے بعد زمین کے دولتمند سٹہ بازوں نے زمین کے بڑے بڑے قطعات خرید لیے تھے، جن میں جارج واشنگٹن اور پیٹرک ہنری بھی شامل تھے۔ شمالی کیرولینا کے ایک سرویئر جون ڈونل سن نے اس علاقے کے نزدیک جہاں آج چٹانوگا کا شہر آباد ہے، بیس ہزار ایکڑ زمین خریدی، اس کے داماد نے 1795ء میں زمین کے سودوں کے لیے "ناش ویل" سے باہر تقریباً بائیس مرتبہ چکر لگائے۔ یہ اینڈریو جیکسن تھا۔

جیکسن زمینوں کا سٹہ باز، ایک کاروباری شخص اور غلاموں کا تاجر تھا، امریکہ کی ابتدائی تاریخ میں انڈینز کا ایک بہت بڑا جارحیت پسند دشمن تھا۔ وہ 1812ء کی جنگ کا ہیرو بن گیا تھا، جو کہ محض انگلینڈ کے خلاف اپنی بقا کی خاطر لڑی جانے والی ایک جنگ (جیسا کہ امریکہ میں پڑھائی جانے والی اکثر ٹیکسٹ بکس میں کہا گیا ہے) نہیں تھی، بلکہ فلوریڈا میں، کینیڈا میں اور انڈینز کے علاقے میں نئی قوم کی سرحدوں کو وسعت دینے کے لیے لڑی جانے والی ایک جنگ تھی۔

ایک شیوانی سردار ٹیکومس نے جو کہ بہترین مقرر بھی تھا۔ سفید فام حملے کے خلاف انڈینز کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا "یہ زمین سب کی ملکیت ہے.....ہر ایک کے استعمال کے لیے۔" جب اس کے ساتھی انڈینز کو ایک بہت بڑا علاقہ امریکہ کی حکومت کے حوالے کرنے کے لیے ترغیبات دی گئیں، تو وہ بہت زیادہ طیش میں آیا۔ 1811ء میں ٹیکومس نے الباما میں دریائے ٹیلاپوسا کے کنارے پر پانچ ہزار انڈینز کو اکٹھا کرنے کا بندوبست کیا اور ان سے کہا "سفید فاموں کی نسل کو ختم کر دو۔ انہوں نے تمہاری زمین پر قبضہ کر لیا ہے، تمہاری عورتوں کو بدچلن بنا دیا ہے، انہوں نے تمہارے مردوں کی راکھ کو پیروں تلے روندا ہے، جب وہ تمہارے لہو کی بو سونگھتے ہوئے واپس آئیں تو انہیں دھکیل کر باہر نکال دو۔"

جورجیا، الباما اور مسیسپی کے زیادہ تر علاقوں پر کریک انڈینز کا قبضہ تھا۔ 1813ء میں ان کے

کچھ جنگجوؤں نے فورٹ میمس میں 250 آدمیوں کا قتل عام کر دیا۔ اس پر جیکسن کے فوجیوں نے ایک کریک گاؤں کو جلا دیا اور مردوں، خواتین اور بچوں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ جیکسن نے اپنے فوجیوں کو چھینی گئی زمینوں اور لوٹ مار سے انعامات دینے کی حکمت عملی اپنا رکھی تھی۔

لیکن اس کے باوجود اس کے آدمیوں میں بغاوتیں جنم لیتی رہتی تھیں، وہ جنگ و جدل سے تھک چکے تھے، اور واپس گھروں کو جانا چاہتے تھے۔ جیکسن نے اس بارے میں اپنی بیوی کو لکھا۔ "وہ لوگ جو کبھی دلیر اور محب الوطن رضا کار تھے....اب وہ.....بد ورو کر شکائتیں کرنے والے، بغاوتوں پر اکسانے والے اور غدار بن گئے ہیں۔" جب ایک سترہ سال کے فوجی نے اپنی خوراک کو سلیقے سے رکھنے سے انکار کر دیا اور اپنے افسر پر بندوق تان کر اسے دھمکایا تو کورٹ مارشل نے اسے موت کی سزا سنائی، جیکسن نے اس کی اپیل مسترد کر دی اور سزا پر عملدرآمد کا حکم دے دیا۔ پھر وہ فائرنگ سکواڈ سے دور چلا گیا، جہاں گولیاں چلنے کی آواز نہ سن سکے۔

جیکسن نے جب ایک ہزار کریک انڈینز کے خلاف "ہارس شو بینڈ" کی جنگ لڑی جس میں اس نے اپنی جانب سے کم سے کم اموات کی قیمت پر آٹھ سو کریک مار ڈالے تو وہ قومی ہیرو بن گیا۔ اس کے سفید فام فوجی کریک انڈینز کے خلاف آمنے سامنے کے مقابلے میں ناکام ہو گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ چیروکی انڈینز نے جن کو جنگ میں شمولیت پر حکومتی دوستی کا جھانسا دیا گیا تھا، دریا تیر کر عبور کیا اور کریک پر پیچھے سے حملہ کر کے اس کے لیے یہ جنگ جیت لی۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو جیکسن اور اس کے دوستوں نے کریک زمینیں خریدنا شروع کر دیں، اس نے اپنے آپ کو ٹریٹی کمشنر (گفت و شنید کرنے والا آفیسر) مقرر کروا لیا اور 1814ء میں ایک معاہدہ لکھوایا جس کے تحت کریک کی آدھی زمین پر قبضہ کر لیا۔

اس معاہدے نے کچھ نئی اور اہم شروعات کی ابتداء کی۔ اس نے انڈینز کو زمین کی انفرادی ملکیت عطا کی، اس طرح اس نے انڈین کو انڈین سے جدا کر دیا، زمین کی اجتماعی ملکیت کا خاتمہ کر دیا، کچھ کو زمینوں کی صورت رشوت دی گئی اور کچھ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مقابلے اور چشم پوشی کی وہ فضا پیدا کر دی جو مغربی سرمایہ داری کی اہم صفت تھی۔ یہ صورت حال جیفرسن کے اس پرانے خیال کے عین مطابق تھی یعنی انڈینز پر قابو پانے کے لیے انہیں "تہذیب و تمدن" کے دائرے میں لایا جائے۔

ان معاہدوں نے اور زمینوں پر زبردستی قبضوں نے کپاس کی سلطنت اور غلاموں کے ذریعے کاشت کاری کی بنیادیں استوار کیں، جیکسن کے کام نے سفید فام آبادکاروں کو فلوریڈا کی سرحدوں تک پہنچا دیا، جو کہ ہسپانویوں کے قبضہ میں تھا۔ یہاں "سیمی نول" انڈینز کے دیہات تھے، جہاں فرار ہونے والے سیاہ فام غلام پناہ لیتے تھے، جیکسن نے یہ دلیل دیتے ہوئے کہ یہ مفرور سیاہ فام غلاموں کی اور لوٹ

مار کرنے والے انڈینز کی محفوظ پناہ گاہیں ہیں فلوریڈا پر بھی حملے شروع کر دیے۔ یہ فتح کے لیے لڑی جانے والی جنگ کی جدید کلاسک تمہید تھی۔

اس طرح 1818ء کی "سیمی نول" جنگ کی ابتداء ہوئی جو فلوریڈا پر امریکی قبضے کے بعد ختم ہوئی۔ سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ میں اس کا بڑے مہذب الفاظ میں "1819ء میں فلوریڈا کی خرید" کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے، لیکن دراصل اس پر قبضہ فلوریڈا کی سرحدوں کے پار جیکسن کے حملوں، سیمی نول کے دیہاتوں کو نذر آتش کرنے اور ہسپانوی قلعوں پر قبضوں کے ذریعے ممکن ہوا، جس کے نتیجے میں سپین اسے بیچنے پر مجبور ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، وہ "ذاتی دفاع کے غیر مبدل قوانین" کے مطابق کیا تھا۔

پھر جیکسن فلوریڈا کے علاقے کا گورنر بن گیا، اب وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بہتر تجارتی مشورے دینے کے قابل ہو گیا تھا۔ اپنے ایک بھتیجے کو اس نے "پنسا کولا" میں جائیداد خریدنے کا مشورہ دیا۔ فوج میں سرجن جنرل اپنے ایک دوست کو جتنے ممکن ہو سکیں غلام خریدنے کا مشورہ دیا کیونکہ ان کی قیمت جلد ہی بڑھنے والی تھی۔

فوج میں اپنے عہدے کو چھوڑتے ہوئے اس نے فوجی آفیسرز کو بھگوڑوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے نمٹنے کے لیے مفید مشورے بھی دیے (غریب سفید فام، اگرچہ ابتداء میں اپنی جانیں بھی دینے کو تیار تھے....شاید اب سمجھ گئے تھے کہ جنگ کے تمام ثمرات امراء کی جھولی ہی میں جاتے ہیں) جیکسن نے پہلی دو کوششوں پر کوڑے لگانے اور تیسری کوشش پر سزائے موت کا مشورہ دیا۔

اگر آپ امریکی تاریخ کی ہائی سکول کی نصابی کتب اور ابتدائی جماعتوں کی نصابی کتب کا مطالعہ کریں تو آپ کو جیکسن ایک سرحدی آدمی، سپاہی، جمہوریت پسند، عوامی شخصیت کے طور پر نظر آئے گا۔ لیکن غلاموں کا مالک، زمینوں کا سٹہ باز، فوج سے بھاگے ہوئے یا باغی سپاہیوں کو موت کی سزائیں دینے یا انڈینز کا خاتمہ کرنے والا جیکسن کہیں نظر نہیں آئے گا۔

1882ء میں جیکسن کے صدر منتخب ہونے کے بعد (جان کوئنسی ایڈمز کے بعد جو منرو کے بعد آیا، جو میڈیسن کے بعد آیا، جو جیفرسن کے بعد آیا)، دو سیاسی جماعتیں: "ڈیموکریٹس" اور "وہگز" تھیں، جن میں بنکوں اور محصولات کے حوالے سے اختلافات پائے جاتے تھے، جبکہ ان معاملات میں جو سفید فام غربا، سیاہ فاموں اور انڈینز کے لیے اہمیت کے حامل تھے، کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ اگرچہ کچھ سفید فام کارکن جیکسن کو اپنے ہیرو کے طور پر دیکھتے تھے، کیونکہ اس نے ایک دولتمند شخص کے بنک کی مخالفت کی تھی۔

جیکسن اور مارٹن وان برن جس کا انتخاب اس نے اپنے جانشین کے طور پر کیا تھا، کی زیر قیادت مسیسیپی کے مشرق میں آباد 70 ہزار انڈینز کو مغرب کی جانب دھکیل دیا گیا، نیو یارک میں "آئروکوئس وفاق" کو

رہنے دیا گیا، لیکن ایلیناس کے سیک اور فوکس انڈینز کو بلیک ہاک جنگ کے بعد نکال دیا گیا۔ جب بلیک ہاک سردار کو شکست کے بعد 1832ء میں گرفتار کیا گیا تو اس نے ہتھیار ڈالتے وقت مندرجہ ذیل خطاب کیا۔

(بلیک ہاک) اب سفید فاموں کا قیدی ہے، اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے ایک انڈین کو شرمندگی اٹھانا پڑے۔ وہ اپنے ہم وطنوں، ان کی بیویوں اور بچوں کے لیے ان کے خلاف لڑتا رہا جو سال بہ سال، انہیں دھوکا دینے اور زمینیں ہتھیانے کے لیے آتے تھے.... سفید فام بدمعاش سکول ماسٹر ہیں: وہ دروغ گوئی پر مبنی کتابیں اٹھائے ہوئے ہیں، اور جھوٹے معاہدے کرتے ہیں، وہ غریب انڈینز کے سامنے انہیں دھوکا دینے کے لیے مسکراتے ہیں، وہ ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہیں، تا کہ ان کو شرابی بنا سکیں اور ہماری بیویوں کو تباہ کر سکیں۔

سفید فام کھوپڑیوں سے کھال نہیں نوچتے، لیکن وہ اس سے بھی قبیح حرکت کرتے ہیں.... وہ دلوں میں زہر بھرتے ہیں.... خدا حافظ میری قوم.... بلیک ہاک، خدا حافظ۔

انڈینز کے بے دخل کرنے کے حوالے سے "لیوس کاس" جس نے جنگ کے سیکرٹری، مشی گن کے گورنر اور فرانس کے ساتھ حد بندی کے وزیر کے طور پر مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دی تھیں، اور صدارتی امیدوار بھی تھا، یوں رقمطراز ہے،

یوں نظر آتا ہے کہ ترقی پسندانہ بہتری کا اصول انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر پایا جاتا ہے، ہم سب لوگ اپنی زندگی میں عزت و توقیر، اقتدار و اختیار یا کسی اور چیز کے لیے جس کو حاصل کرنا ہمارے خوابوں اور تصورات کی تکمیل ہو، کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے حصول کے لیے ہماری جملہ کوششیں معاشرے میں ترقی کی راہیں کھولے رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے وحشی اور جنگلی ہمسایوں کی فطرت میں یہ جذبہ ناپید ہے۔

شان و شوکت اور نمود و نمائش کے شوقین، اعزاز یافتہ کاس (ہارورڈ نے اسے 1836ء میں جب انڈینز کی بے دخلی عروج پر تھی، قانون میں ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری سے نوازا تھا) نے جب وہ مشی گن کے علاقے کا گورنر تھا انڈینز سے ایک معاہدے کے تحت لاکھوں ایکڑ زمین ہتھیائی تھی۔ "ہمیں ان میں ان کے رجحانات کے خلاف دلچسپیوں کو مسلسل فروغ دینے کی ضرورت ہے.... ایک وحشی قوم جو اپنی روزی کے لیے غیر یقینی اور کم یاب شکار کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہے، وہ تہذیب یافتہ تمدن کے ساتھ اپنا ناتا نہیں جوڑ سکتی۔"

کاس نے شاونی اور چیروکی قبائل کے ساتھ 1836ء میں ہونے والے ایک معاہدے میں وعدہ کیا کہ اگر انڈینز مسیسیپی سے پار زمینوں کی طرف نکل جائیں تو "امریکہ وہاں تمہاری زمینوں کے بارے میں کبھی کوئی سوال نہیں اٹھائے گا۔ یہ میں تمہارے عظیم باپ "صدر" کے نام پر وعدہ کرتا ہوں، وہ

علاقہ اس نے سرخ عوام کو دے دیا ہے، جو ہمیشہ ان کے پاس، ان کے بچوں کے پاس اور ان کے بچوں کے بچوں کے پاس ہی رہے گا۔

انڈینز کا اپنا ہزاروں سال کا ورثہ انہیں اپنی زمینیں نہ چھوڑنے پر مجبور کرتا تھا۔ ایک بوڑھے چکاسا سردار نے کئی سال پہلے صدر منرو سے علاقہ خالی کرنے پر بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا، مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے باپ کی درخواست پر عمل نہیں کر سکتا.... ہم یہاں رہنا چاہتے ہیں، جہاں ہم جنگل کی بوٹیوں کی طرح پروان چڑھے ہیں، ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں کسی اور زمین پر جا کر بو دیا جائے" یہاں ہمارے آنول کاٹے گئے تھے اور ان سے نکلنے والا خون اس زمین میں جذب ہو گیا تھا۔ یہ زمین ہمیں بہت عزیز ہے۔"

سارے انڈینز سفید فام اینگلو کے اپنے لیے استعمال کیے جانے والے "بچوں" کے عام لقب اور صدر کے لیے "باپ" کے الفاظ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ٹیکومس کی انڈینز کے خلاف لڑنے والے اور مستقبل کے صدر ولیم ہنری ہیریسن سے ملاقات ہوئی تو ترجمان نے کہا" تمہارا باپ درخواست کرتا ہے کہ کرسی پر بیٹھ جاؤ" ٹیکومس نے جواب دیا" میرا باپ! سورج میرا باپ ہے، اور دھرتی میری ماں ہے، میں اپنی ماں کی گود میں بیٹھوں گا۔"

جیسے ہی جیکسن صدر منتخب ہوا جورجیا، الباما اور مسیسیپی نے اپنے علاقوں میں آباد انڈینز پر ریاستی اقتدار نافذ کرنے کے لیے قوانین پاس کرنا شروع کر دیے۔ انڈینز کی زمین کو ریاستی لاٹری کے ذریعے بانٹنے کے لیے تقسیم کر دیا گیا۔ وفاقی معاہدے اور وفاقی قوانین نے ریاستوں کو نہیں بلکہ کانگریس کو انڈینز قبائل پر اختیار و اقتدار تفویض کر رکھا تھا، جیکسن نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ریاستوں کی حمایت کی۔

اب اسے درست تدبیر ہاتھ آ گئی تھی، انڈینز پر مغرب کی سمت جانے کا دباؤ ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، لیکن اگر وہ وہاں رہنے کا انتخاب کرتے ہیں تو انہیں ریاستی قوانین کی پابندی کرنا تھی، جس نے ان کے ذاتی اور قبائلی حقوق کو پامال کر دیا تھا، اور وہ زمینیں ہتھیانے کے لیے سفید فاموں کے نہ ختم ہونے والے حملوں اور خوف و ہراس کا آسان شکار تھے۔ لیکن اگر وہ وہاں سے نکل جاتے ہیں تو وفاقی حکومت ان کی مالی مدد اور مسیسیپی سے پار زمینوں کی ضمانت دے گی۔ جیکسن نے ایک فوجی میجر کو جسے چکاسا اور چیروکی کے ساتھ گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا مندرجہ ذیل ہدایات دیں۔

سرداروں اور جنگجوؤں سے کہو کہ میں ان کا دوست ہوں.... لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسیسیپی اور الباما کی ریاستوں سے نکل جائیں اور ان زمینوں پر آباد ہو جائیں، جو میں انہیں پیش کرتا ہوں.... وہاں کسی بھی ریاست کی حدود سے باہر اپنی ذاتی زمین کی ملکیت کے ساتھ زندگیاں بسر کریں۔ جس کے وہ اس وقت تک مالک ہوں گے۔ جب

تک گھاس اُگتی رہے گی یا پانی بہتا رہے گا۔ میں ان کا دوست اور باپ ہونے کی حیثیت سے ان کی حفاظت کروں گا اور کرتا رہوں گا۔

یہ جملہ کہ "جب تک گھاس اُگتی ہے یا پانی بہتا ہے" انڈینز کی نسلوں میں بڑی تلخی کے ساتھ آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ (ویتنام میں لڑنے والے ایک انڈین فوجی جی آئی نے 1970ء میں نہ صرف جنگ کی ہولناکیوں کا بلکہ انڈین ہونے کے ناطے اپنے ساتھ روا رکھی جانے والی بدسلوکیوں کا کھلے عام اظہار کرتے ہوئے اس تاریخی جملے کو دہرایا اور رونا شروع کر دیا۔)

جب 1829ء میں جیکسن نے اقتدار سنبھالا "چیروکی" کے علاقے میں سونا دریافت ہوا۔ ہزاروں سفید فاموں نے حملہ کر دیا، انڈینز کی جائدادوں کو تباہ و برباد کر دیا اور باڑیں لگا کر علاقے پر اپنے قبضے کا اعلان کر دیا۔ جیکسن نے وفاقی فوج کو انہیں ہٹانے کا حکم دیا اور انڈینز اور سفید فاموں کو کان کنی سے روک دیا۔ پھر اس نے فوج کو واپس بلا لیا اور سفید فام واپس پہنچ گئے، اور جیکسن نے کہہ دیا کہ وہ جورجیا کے اقتدار میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ سفید فام حملہ آوروں نے زمین اور ذخیرے پر قبضہ کر لیا، انڈینز سے زبردستی زمینیں پٹے پر دینے کے لیے دستخط کروا لیے۔ احتجاج کرنے والے انڈینز کو زدوکوب کیا، ان کی مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے الکحل فروخت کی اور علاقے سے ان جانوروں کا خاتمہ کر دیا جن کی انڈینز کو خوراک کے لیے ضرورت تھی۔

دباؤ کے تحت معاہدے کیے گئے اور کریک، چکتا اور چکیسا کی قبائلی زمینوں کو دھوکے کے ساتھ انفرادی ملکیتوں میں بانٹ دیا گیا اور ہر فرد واحد کو ٹھیکیداروں، سٹہ بازوں اور سیاستدانوں کا شکار بنا دیا گیا، کریک اور چکتا اور چکیسا اپنے انفرادی پلاٹوں پر قابض رہے، لیکن ان کی ایک بڑی تعداد کو "لینڈ کمپنیوں" نے دھوکے سے لوٹ لیا۔ جورجیا کے ایک بنک کے صدر کے مطابق جو کہ ایک لینڈ کمپنی میں حصہ دار تھا، کہا: "چوری وقت کا تقاضا ہے"

کریک نے جن کی زمینیں دھوکے سے ہتھیائی گئی تھیں اور جو پیسوں اور کھانے پینے کی اشیاء سے محروم ہو چکے تھے علاقہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ فاقہ زدہ کریک نے سفید فاموں کے فارموں پر حملے شروع کر دیے، جب کہ جورجیا کے ملیشیا اور آبادکاروں نے انڈینز آبادیوں پر حملے شروع کر دیے۔ اسی طرح دوسری کریک جنگ کا آغاز ہوا۔ الباما کے ایک اخبار نے جو کہ انڈینز کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا لکھا "کریک کے خلاف جنگ ایک بیہودہ حرکت ہے۔ یہ ایک ابلیسانہ اور گھٹیا ریشہ دوانی ہے جو مفاد پرست لوگوں نے، انسانوں کے ایک بے علم گروہ کو ان کے جائز حقوق اور ان کے پاس رہ جانے والی قلیل زمینوں سے محروم رکھنے کے لیے شروع کی ہے۔"

ایک کریک شخص نے جو کہ سو سال سے بھی زیادہ عمر کا تھا اینڈریو جیکسن کی انڈینز کو زمینوں

سے بے دخل کرنے کی پالیسی پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

بھائیو! میں نے اپنے عظیم سفید فام باپ کی بہت سی باتیں سنی ہیں۔ جب وہ پہلی بار وسیع پانیوں کے پار سے یہاں پہنچا تھا، تو وہ ایک چھوٹا سا.... بہت چھوٹا انسان تھا۔ اپنی بڑی کشتی میں بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اکڑ چکی تھی۔ اور اس نے اپنی آگ جلانے کے لیے تھوڑی سی زمین مانگی تھی.... لیکن جب سفید فام آدمی نے انڈینز کی آگ تاپ کر اپنے آپ کو گرم کر لیا اور ان کی ہومنی (ایک امریکی غلہ) سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ وہ بہت بڑا ہو گیا۔ اس کا قدم پہاڑوں کے آر پار پڑنے لگا، اور اس کے پیروں نے میدانوں اور دیواروں کو اپنے تلے لے لیا، اور اس کا سر چاند کو چھونے لگا۔ پھر وہ ہمارا عظیم باپ بن گیا۔ اسے اپنے سرخ بچوں سے بہت پیار تھا، اور اس نے محبت کے جذبے سے کہا "میرے بچو تھوڑا سا دور ہٹ جاؤ کہیں میرے قدموں تلے آ کر کچلے نہ جانا۔"

"ڈیل وین ایوری" نے اپنی کتاب "The Disinherited" میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، کہ علاقے سے بے دخلی انڈینز کے لیے کیا معنی رکھتی تھی۔

انڈین اپنے اردگرد کے تمام قدرتی خدوخال کی تمام حیاتی صفات سے ایک گہرا جذباتی لگاؤ رکھتا تھا۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ہر دلدل، جنگلوں میں واقع ہر کھلے میدان، پہاڑیوں، چٹانوں، چشموں، ندیوں سے واقف تھا، جیسا کہ صرف ایک شکاری ہی ہو سکتا ہے۔ وہ زمین کو انفرادی ملکیت کے اصول کو بالکل نہیں سمجھ پایا تھا بالکل اسی طرح جیسے ہوا کی ذاتی ملکیت کا تصور عقل سے بعید ہے۔ لیکن وہ اپنی دھرتی سے کسی ذاتی مالک کی نسبت زیادہ محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس دھرتی کا، چٹانوں، درختوں، جانوروں، اور پرندوں کی طرح، ایک لاینفک حصہ خیال کرتا تھا۔ اس کا وطن اس کے لیے ایک مقدس سرزمین تھی جہاں اس کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں دفن تھیں، اور دھرتی اس کے مذہب کا ایک قدرتی معبد تھی۔

جیکسن کے صدر منتخب ہونے سے کچھ ہی پہلے، 1812ء کی جنگ اور کریک جنگ کے کہرام کے بعد جنوبی انڈینز اور سفید فام ایک دوسرے کے بالکل نزدیک آباد ہو گئے تھے، اور قدرتی ماحول میں بڑے امن سے رہ رہے تھے، جہاں ان کی ضروریات کے لیے بہت کچھ موجود تھا۔ سفید فاموں کو انڈینز آبادیوں میں جانے کی اجازت تھی اور انڈینز اکثر سفید فاموں کے گھروں میں مہمان ہوتے تھے: "ڈیوے کروکٹ" اور "سیم ہوسٹن" جیسی سرحدی شخصیات انہی آبادیوں سے تعلق رکھتی تھیں، جو جیکسن کے برعکس، انڈینز کے عمر بھر کے دوست بن گئے۔

وہ قوتیں جو انڈینز کے انخلا کا موجب بنیں سرحدوں پر بسنے والے ان غریب سفید فاموں سے نہیں ابھری تھیں، جو انڈینز کے ہمسائے تھے۔ ان قوتوں نے صنعت کاری اور تجارت، آبادی میں اضافے، ریلوے لائنوں اور شہروں، زمین کی قیمتوں میں اضافے اور تاجروں کے لالچ سے جنم لیا۔ اس کے نتیجے میں انڈینز یا تو موت کے منہ میں چلے گئے یا جلاوطن کر دیے گئے اور زمینوں کے سٹے باز مزید دولتمند ہو گئے اور سیاستدان طاقتور بن گئے، جہاں تک غریب سفید فاموں کا تعلق تھا وہ پیادوں کا کردار ادا کر رہے تھے، جنہیں پہلے شدید حملے میں آگے دھکیلا جاتا تھا اور بلاتردد ضائع کر دیا جاتا تھا۔

جورجیا، الباما اور ٹینیسی میں 17,000 چیروکیز 9,00,000 سفید فاموں میں گھرے ہوئے تھے، چیروکیز نے فیصلہ کیا کہ بقا کے لیے ضروری ہے کہ سفید فاموں کی دنیا کو اختیار کر لیا جائے۔ وہ کسان، لوہار، ترکھان، معمار، اور جائدادوں کے مالک بن گئے۔

چیروکیز کی زبان، بہت زیادہ شاعرانہ، استعاراتی، خوبصورت طور پر بیانیہ تھی جسے رقص، ڈرامے اور رسوم نے مزید چاشنی دے دی تھی۔ یہ ایک صوتی اور تاثراتی زبان تھی۔ اب ان کے سردار سکویاہ" نے اسے تحریر کرنے کا طریقہ بھی ایجاد کر لیا تھا، جسے ہزاروں افراد نے سیکھ لیا تھا۔ چیروکیز کی قانون ساز کونسل نے پرنٹنگ پریس کے لیے رقم جمع کر لی، جس نے 21 فروری 1828ء میں ''چیروکی فونکس'' اخبار نکالنا شروع کر دی۔ یہ اخبار انگلش اور سکویاہ دونوں زبانوں میں شائع ہوتی تھی۔

اس سے قبل چیروکیز دوسرے انڈینز قبائل کی طرح بغیر کسی رسمی حکومت کے زندگیاں بسر کر رہے تھے، جیسا کہ وان ایوری لکھتا ہے؟

> انڈین حکومت کا بنیادی اصول ہمیشہ سے حکومت کا استرداد رہا ہے۔ عملی طور پر میکسیکو کے شمال میں بسنے والے تقریباً تمام انڈینز میں فرد کی آزادی کو فرد کے معاشرتی قومی فرض سے بہت زیادہ گراں بہا حیثیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ یہ طوائف الملوکی ان کے رہن سہن میں اس قدر رچی بسی ہے کہ اس کی ابتداء چھوٹی ترین معاشرتی اکائی یعنی خاندان سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ انڈین والدین اپنے بچوں پر کسی قسم کا نظم وضبط عائد نہیں کرتے۔ خودرائی یا خودسری کے اظہار کو بلوغت کی ایک موافق علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

ان میں شاید ہی کسی قسم کے مشاورتی اکٹھ یا اجلاس کا موقع آتا تھا، اور ایسے جلسوں کی رکنیت بہت ڈھیلی ڈھالی اور ہر مرتبہ تبدیل ہوتی تھی۔ جس میں کیے گئے فیصلے سوائے رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے کسی قسم کے ضابطے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اب سفید فام معاشرے میں گھرے ہوئے ان انڈینز میں سب کچھ تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ''چیروکیز'' نے اپنے اردگرد کے غلام معاشرے کو بھی اپنانا شروع کر دیا تھا۔ ان کے پاس ایک ہزار سے زیادہ غلام تھے۔ وہ اس ''تہذیب'' کی نقالی کرنے لگے تھے جس کے

بارے میں سفید فام بات کرتے تھے، انہوں نے مشنریوں اور عیسائیت کو خوش آمدید کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود وہ اس زمین سے زیادہ پسندیدہ نہیں بن سکے تھے، جس پر وہ رہ رہے تھے۔

کانگریس میں جیکسن کے 1829ء کے خطاب نے اس صورت حال کو مزید واضح کر دیا'' میں نے جورجیا اور الباما میں بسنے والی انڈینز کو متنبہ کر دیا ہے کہ آزاد حکومت قائم کرنے کی ان کی کسی بھی کوشش کو امریکہ کے حکام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھیں گے اور انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ مسیسیپی سے پار کے علاقوں میں نقل مکانی کر جائیں یا ان ریاستوں کے قوانین کے تحت زندگیاں بسر کریں۔'' کانگرس نے فوری طور پر ان کے انخلاء کا بل پاس کیا۔ اس میں طاقت کے استعمال کا ذکر نہیں تھا۔ بلکہ اس میں علاقے سے نکلنے والے انڈینز کو مدد فراہم کرنے کا ذکر تھا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر وہ نقل مکانی نہیں کرتے تو وہ بغیر کسی تحفظ، بغیر کسی فنڈ کے اور ریاستوں کے رحم وکرم پر ہوں گے۔

کچھ لوگ انڈینز کا دفاع کرنے والے بھی موجود تھے۔ ان سب میں سے پر جوش اور فصیح شاید ''سن'' تھا۔ نیو جرسی کے ''تھیوڈور فریلینگھوسن'' نے انڈینز کے انخلا پر بحث کرتے ہوئے سینیٹ میں کہا'' ہم نے قبائل کو اپنی مغربی سرحد پر انتہائی گھٹیا قسم کی ایک محدود سی زمینی پٹی میں جمع کر دیا ہے۔ ان کے لا محدود جنگلات میں سے بس یہی کچھ اب ان کے پاس رہ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود گھوڑے کی جونک کی طرح، ہمارا کبھی نہ ختم ہونے والا لالچ مزید! مزید! پکار رہا ہے.... جناب عالی.... کیا انصاف کے تقاضے جلد کی رنگت کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔''

اب ایک ایک کر کے قبائل پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا گیا تھا۔ چکتا علاقہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کے پچاس نمائندوں کو خفیہ طور پر پیسوں اور زمین کی رشوت پیش کی گئی۔ اور ''ڈانسنگ ربٹ کریک'' کے معاہدے پر دستخط ہو گئے، جس کے مطابق علاقہ چھوڑنے کے عوض دی گئی مالی امداد کے بدلے چکتا زمینیں امریکہ کے سپرد کی جانی تھیں۔ اس کے ساتھ سفید فام، بشمول شراب فروخت کرنے والوں اور دھوکا باز ٹھگوں کے ٹڈی دل کی طرح ان کی زمینوں میں پھیل گئے۔

1831ء میں تیرہ ہزار چکتا انڈینز نے مغرب میں ان علاقوں کی جانب لمبے سفر کا آغاز کیا جس کی آب و ہوا اور موسم ان کے لیے بالکل مختلف اور اجنبی تھا۔ وہ بیل گاڑیوں میں، گھوڑوں پر اور پیدل چل رہے تھے۔ پھر انہوں نے گھاٹ کی کشتیوں کے ذریعے دریائے مسیسیپی پار کیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ فوج ان کے قافلوں کو منظم کرے گی لیکن وہاں کوئی نظم وضبط نہ تھا۔ خوراک ختم ہو گئی تو بھوک نے گھیرا تنگ کر لیا۔

اس نقل مکانی کے درمیان آنے والا پہلا موسم سرما سرد ترین تھا۔ اور لوگ نمونیے سے مرنے شروع ہو گئے۔ گرمیوں میں مسیسیپی میں ہیضے کی خطرناک وبا پھوٹ پڑی اور چکتا باشندے سینکڑوں کی تعداد میں لقمہ اجل بن گئے۔ اب پیچھے رہ جانے والے سات ہزار چکتا انڈینز نے جانے سے انکار کر دیا۔

انہوں نے موت پر سفید فاموں کی ماتحتی کو ترجیح دی۔ان کی نسلیں آج بھی مسیسپی میں آباد ہیں۔

جہاں تک چیروکیز کا تعلق تھا،انہیں ریاست جورجیا کے پاس کئے گئے،قوانین کا سامنا کرنا پڑا۔ان کی زمینیں چھین لی گئیں،ان کی حکومت ختم کردی گئی،تمام قسم کے اجلاس اور اجتماعات پر پابندی لگا دی گئی۔ جو چیروکیز دوسروں کو نقل مکانی سے روکنے کا مشورہ دیتے انہیں قید کر دیا جاتا۔ چیروکیز کسی سفید فام کے خلاف عدالت میں گواہی نہیں دے سکتے تھے۔ چیروکیز سونے کی تلاش میں کھدائی نہیں کر سکتے جو حال ہی میں ان کی زمینوں میں دریافت ہوا تھا۔

چیروکیز قوم نے قوم کے نام ایک محضر نامہ جاری کیا، جو کہ انصاف کے لیے عوامی التجا تھی:

ہم جانتے ہیں کہ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مسیسپی سے دور نکل جانا ہمارے مفاد میں ہوگا۔لیکن ہم دوسری طرح سے سوچتے ہیں۔ ہمارے لوگ ہر جگہ دوسری طرح سوچتے ہیں....ہم اپنے آباؤاجداد کی سرزمین پر رہنا چاہتے ہیں....ہمارے ساتھ کئے گئے معاہدے ان معاہدوں کی تکمیل میں بنائے گئے امریکہ کے قوانین، ہماری رہائش اور ہماری مراعات کی ضمانت دیتے ہیں،اور ہمیں مداخلت کرنے والوں کے خلاف تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ہماری واحد خواہش یہ ہے کہ ان معاہدات پر عمل کیا جائے،اور ان قوانین کا نفاذ کیا جائے۔

اب انہوں نے تاریخ اور قانون سے ماورا ہو کر مزید کہا:

ہم ان لوگوں سے عاجزانہ درخواست کرتے ہیں جن کے نام مندرجہ بالا پیرا گراف لکھا گیا ہے، محبت کے عظیم قانون کو یاد کریں،"دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں۔" ہم ان سے مودبانہ التماس کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی خاطر یاد کریں،ان کے آباؤاجداد کو نقل مکانی پر مجبور کیا گیا،لہٰذا وہ پرانی دنیا سے نکل کر اذیتوں کی ہواؤں میں عظیم پانیوں پر بہتے ہوئے نئی دنیا کے ساحلوں پر آکر اترے، جب کہ انڈینز اس وسیع وعریض سلطنت کے واحد مالک تھے....ذرا یاد کرو انہیں امریکہ کے وحشیوں اور جنگلیوں نے کس طرح خوش آمدید کہا تھا، جب کہ طاقت ان کے ہاتھ میں تھی.... یہ سارے حقائق یاد کریں....ہمیں یقین ہے کہ وہ ان سب باتوں کو بھول نہیں سکتے اور نہ بھولیں گے....اور مصائب اور تکالیف کی اس آزمائش کی گھڑی میں ہمارے ساتھ ہمدردی کا سلوک کریں۔

اس پر جیکسن نے دسمبر 1830ء میں کانگریس کے نام اپنے دوسرے سالانہ پیغام میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ چکتا اور چکیسا قبائل پہلے ہی علاقہ خالی کرنے

پر رضامند ہو چکے ہیں،اور باقی ماندہ کا جلد از جلد انخلا سب کے لیے بہت سے فوائد کا حامل ہوگا۔اس نے اسی جانے پہچانے انداز کو دہراتے ہوئے کہا"ملک کے قدیمی باشندوں کے لیے جس قسم کے دوستانہ جذبات اور احساسات میرے دل میں ہیں شاید ہی کسی اور کے دل میں ہوں گے....تاہم،آبادی اور تہذیب وتمدن کی لہریں مغرب کی جانب بڑھ رہی ہیں،اور ہم اب مجبور ہیں کہ ایک منصفانہ تبادلے کے ذریعے سرخ آدمیوں کے قبضے سے جنوب اور مغرب کی زمینیں حاصل کرلیں۔"

جورجیا نے ایک قانون پاس کیا جس کے تحت سفید فام افراد کا ریاست جورجیا کو حلف دیئے بغیر انڈین علاقے میں رہنا جرم قرار دے دیا گیا، جب چیروکیز کے علاقے میں رہنے والے سفید فام مشنریوں نے چیروکیز کے قیام کے حق میں کھلم کھلا ہمدردیوں کا اظہار شروع کردیا تو 1831ء کے بہار کے موسم میں جورجیا ملیشیا ان کے علاقے میں داخل ہوگئی۔اور تین مشنریوں بشمول "سموئیل وورسیسٹر" کے گرفتار کرلیا۔ جورجیا کے قوانین کی فرماں برداری کا حلف اٹھانے سے انکار پر وورسیسٹر اور ایلیزر بٹلر کو چار سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ سپریم کورٹ نے وررسیسٹر کی رہائی کا حکم جاری کیا،لیکن جیکسن نے عدالتی حکم پر عمل کرنے سے انکار کردیا۔

جیکسن 1832ء میں دوبارہ منتخب ہوگیا،اب وہ انڈینز کے تیز تر انخلا کے لیے سرگرم ہوگیا۔ چکتا انڈینز کی ایک بڑی اکثریت اور چیروکیز کے کچھ لوگ علاقہ چھوڑ کر جا چکے تھے،لیکن اب بھی وہاں الباما میں 22,000 کریکس اور جورجیا میں 18,000 چیروکیز اور فلوریڈیا میں 8,000 سیمی نولز موجود تھے۔

کریکس کولمبس کے وقت سے اپنی زمینوں کے لیے ہسپانویوں،انگریزوں،فرانسیسیوں اور امریکیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔لیکن 1832ء تک وہ الباما کے ایک محدود علاقے میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ الباما کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی جو کہ اب 300,000 سے تجاوز کر چکی تھی۔ وفاقی حکومت کے مبالغہ آمیز وعدوں کے جھانسے میں آکر کریک نمائندوں نے واشنگٹن میں "ٹریٹی آف واشنگٹن" پر دستخط کردیئے،جس کے مطابق وہ مسیسپی سے پار انخلا پر متفق ہوگئے۔انہوں نے پانچ ملین ایکڑ اراضی اس شرط پر امریکہ کے حوالے کردی کہ دو ملین ایکڑ انفرادی طور پر کریکس میں تقسیم کردی جائے گی۔ جو اسے بیچ کر جا سکتے ہیں یا پھر وفاق کے تحفظ کے تحت الباما میں رہ سکتے ہیں۔

تقریباً فوراً ہی اس معاہدے میں کئے گئے وعدوں کو توڑ دیا گیا، کریک زمینوں پر ایک سفید فام حملہ شروع ہوگیا....لٹیرے،زمین کے متلاشی،دھوکا باز،وسکی بیچنے والے، ٹھگ سب یہاں امڈ پڑے.... ہزاروں کریک انڈینز کو ان کے گھروں سے نکال کر دلدلوں اور جنگلوں میں دھکیل دیا۔ وفاقی حکومت نے کچھ بھی نہ کیا۔اس کے بجائے اس نے فوری طور پر مغرب کی جانب انخلا کے حوالے سے ایک نئے معاہدے کے لیے گفت وشنید شروع کردی،جس کا انتظام کریک کو خود کرنا تھا،جس کے اخراجات قومی

حکومت نے ادا کرنے تھے، ایک فوجی کرنل نے، جو اس معاہدے پر عمل کے بارے میں مشکوک تھا، لکھا:

> وہ راستے کی فاقہ زدگی سے خوفزدہ ہیں، کیا وہ اس سے بچ سکتے ہیں، جب کہ ان میں سے کئی ایک اب بھی تقریباً فاقہ زدگی تک پہنچ چکے ہیں.... آپ اس ابتری اور زوال کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس میں سے یہ انڈینز گزشتہ دو، تین سال میں گزرے ہیں.... انہیں ڈرایا گیا، دھمکایا گیا، اور ان کے ذہنوں میں یہ بات نقش کر دی گئی، اور یہ احساس ان پر لاد دیا گیا کہ امریکہ میں ان کو مناسب تحفظ حاصل نہیں ہے، اور وہ اپنی حفاظت خود کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔

مشکلات کے باوجود کریکس نے علاقہ چھوڑنے سے انکار کر دیا، لیکن 1836ء میں ریاست اور وفاق دونوں کے حکام نے ان کے لازمی انخلا کا فیصلہ کر لیا۔ مایوسی میں گھرے ہوئے کریکس کے سفید فام آباد کاروں پر چند حملوں کو بہانہ بنا کر اعلان کر دیا گیا کہ کریک قوم نے "جنگ" کر کے اپنے معاہداتی حقوق ختم کر دیے ہیں۔

اب فوج ان کی مغرب کی جانب نقل مکانی کے لیے طاقت استعمال کرے گی۔ گیارہ ہزار فوجیوں کو ان کے پیچھے لگا دیا گیا۔ کریکس نے کوئی مزاحمت نہ کی، کوئی گولی نہ چلی، انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ کریکس جن کو فوج باغی یا ہمدردی رکھنے والے خیال کرتی تھی۔ ایک جگہ جمع کیے گئے۔ مردوں کو ہتھکڑیاں ڈال کر ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا گیا، اور فوجی پہرے میں مغرب کی جانب روانہ کر دیا گیا جبکہ ان کی خواتین اور بچے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کریکس آبادیوں پر فوجی دستوں نے حملے کیے، اور ان آبادیوں کے باسیوں کو اجتماع کے مقامات کی طرف دھکیل کر لے جاتے اور وہاں سے دو یا تین ہزار پر مشتمل قافلوں کی صورت میں مغرب کی جانب روانہ کر دیے جاتے۔ زمین اور جائیداد کے ازالے کے لیے کسی قسم کی گفت وشنید کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

قافلوں کی روانگی کے لیے اسی قسم کے نجی معاہدے کیے گئے جو چکتا قبیلے کے حوالے سے ناکام ہو چکے تھے، دوبارہ وہی ڈراما شروع ہوا تاخیر اور خوراک، خیموں، کپڑوں، کمبلوں، اور ادویات کی کمی ٹوٹی پھوٹی دخانی اور گھاٹ کشتیوں میں گنجائش سے زیادہ افراد لاد دیے جانے کے نتیجے میں کریکس کی ایک بڑی تعداد لقمہ اجل بن گئی۔

آٹھ سو کریک مردوں نے فلوریڈا میں امریکہ کی مدد کے لیے "سیمی نولز" سے جنگ کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اور ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کے خاندان ان کی واپسی تک وفاقی حکومت کے تحفظ کے تحت الباما میں رہ سکتے ہیں۔ وعدے پر عمل نہ کیا گیا۔ ان کے خاندانوں پر زمین کے متلاشی سفید فام لٹیروں نے حملے کرنے شروع کر دیے ان کی جائدادیں لوٹ لی گئیں اور انہیں گھروں سے نکال

دیا گیا عورتوں کی عزتیں لوٹ لی گئیں، پھر فوج نے ان کی حفاظت کا دعویٰ کرتے ہوئے ان تمام خاندانوں کو کریک سرزمین سے نکال کر "موبائل بے" پر پناہ گزینی کیمپ میں پہنچا دیا۔ سینکڑوں کریک خواتین اور بچے خوراک کی کمی اور بیماریوں کے باعث مر گئے۔

جب "سیمی نول" جنگ کے کریک واپس آئے تو ان کو اور ان کے خاندانوں کو مغرب کی جانب دھکیل دیا گیا۔ "نیو اورلینز" سے گزرتے ہوئے انہیں "ییلو فیور پلیگ" کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے دریائے مسیسپی پار کیا، 611 انڈینز ایک پرانی ٹوٹی پھوٹی دخانی کشتی "مون موتھ" پر لاد دیے گئے یہ کشتی دریائے مسیسپی میں ڈوب گئی اور 311 افراد ڈوب کر مر گئے۔ ڈوبنے والوں میں چار بچے فلوریڈا میں امریکہ کے لیے لڑنے والے کریک رضا کاروں کے کمانڈر کے تھے۔

چکتا اور چکیسا فوری طور پر نقل مکانی کے لیے تیار ہو گئے تھے کریکس خودسر اور ضدی تھے اور انہیں طاقت کے ذریعے نکالا گیا۔ کریکس غیر متشددانہ مزاحمت کر رہے تھے۔ ایک قبیلے "سیمی نولز" نے لڑنے کا فیصلہ کیا۔

اب جبکہ فلوریڈا امریکہ کی ملکیت بن چکا تھا۔ "سیمی نولز" کی زمین امریکی قبضہ گروپوں کے لیے کھلی پڑی تھیں، 1834ء میں "سیمی نولز" سردار جمع ہوئے اور امریکہ کے انڈین ایجنٹ نے انہیں بتایا انہیں لازماً مغرب کی جانب کوچ کرنا ہوگا، سیمی نولز نے جواب دیا:

> ہم سب کو ایک ہی عظیم باپ نے پیدا کیا ہے اور تمام ایک جیسے ہی اس کے بچے ہیں۔ ہم سب نے ایک ماں سے جنم لیا ہے اور ایک ہی پستان سے دودھ پیا ہے اس لیے ہم سب بھائی ہیں، اور بھائیوں کے طور پر ہمیں آپس میں دوستانہ سلوک روا رکھنا چاہیے۔ اگر ہم فوری طور پر ان گھروں سے نکلیں گے جن کے ساتھ ہمارے دل بندھے ہوئے ہیں تو ہمارے دلوں کے تار ٹوٹ جائیں گے۔

جب دسمبر 1835ء میں سیمی نولز کی سفر پر روانگی کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا گیا تو کوئی بھی نہ آیا۔ اس کے بجائے انہوں نے فلوریڈا کی تمام سرحدوں پر سفید فاموں کی ساحلی آبادیوں پر حملے کرنا شروع کر دیے۔ انہوں نے سفید فام خاندانوں کو قتل کیا، غلام پکڑے اور جائدادیں تباہ کر دیں۔

دسمبر 1835ء میں 110 فوجیوں پر سیمی نول نے حملہ کیا۔ ان میں سے تین فوجی زندہ بچے، زندہ بچنے والوں میں ایک نے بعد میں نے بتایا:

> یہ آٹھ بجے کا وقت تھا، میں نے اچانک ایک رائفل چلنے کی آواز سنی، اس کے بعد ایک بندوق کی گولی کی آواز آئی.... میں ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ہم پر سامنے سے اور ہماری بائیں جانب گولیوں کی بوچھاڑ آنا شروع ہو گئی.... مجھے صرف ان کے سر اور بازو لمبی گھاس سے

باہر نکلے ہوئے دکھائے دے رہے تھے۔ جو پورے میدان میں نزدیک اور دور تک پھیلے ہوئے اور چیل کے درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔

یہ اعلیٰ آتشیں اسلحہ سے لیس دشمن کے خلاف انڈینز کی ایک روایتی جنگی حکمت عملی تھی۔ جنرل جارج واشنگٹن نے فوج چھوڑتے ہوئے اپنے ایک آفیسر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا، جنرل سینٹ کلیئر، تین الفاظ یاد رکھو (Beware of suprise) "اچانک حملے میں حواس برقرار رکھو۔"

اب کانگریس نے سیمی نولز کے خلاف جنگ کے لیے مناسب رقم مختص کی۔ جنرل ون فیلڈ سکاٹ نے چارج لیا، اس کی فوج کے دستے متاثر کن انداز میں مارچ کرتے ہوئے سیمی نولز علاقے میں داخل ہوئے لیکن وہاں کسی کو بھی نہ پایا۔ وہ کیچڑ، دلدلوں، گرمی، اور بیماری سے تنگ آ گئے، انہیں ان تمام مصائب کا سامنا کرنا پڑا جو ایک مہذب فوج کو لوگوں کے ساتھ ان کی سرزمین پر لڑتے ہوئے پیش آ سکتے ہیں۔ 1836ء میں 103 کمشنڈ آفیسر نے باقاعدہ فوج سے استعفیٰ دے دیا، اور پیچھے صرف چھیالیس آفیسر رہ گئے۔

یہ جنگ آٹھ سال تک لڑی جاتی رہی، اس پر بیس ملین ڈالر خرچ ہوئے اور 500 امریکیوں کی جانیں گئیں، آخرکار 1840ء کے عشرے میں سیمی نولز تھکنا اور ہارنا شروع ہو گئے۔ وہ ایک بہت زیادہ وسائل کی حامل بڑی قوم کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں لڑ رہے تھے۔ انہوں نے صلح کی پیشکش کرنا شروع کر دیں، لیکن جب وہ صلح کے علم بلند کر کے آگے بڑھتے انہیں بار بار گرفتار کر لیا جاتا۔ 1887ء میں ان کا سردار "اسیولا" ایک صلح کے علم تلے گرفتار کر لیا گیا اور اسے بیڑیاں ڈال کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور وہ جیل میں ہی بیماری کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ جنگ خود بخود ختم ہو گئی۔

اس دوران چیروکیز نے مسلح جنگ نہ لڑی لیکن اپنے انداز میں مزاحمت کرتے رہے، لہٰذا حکومت نے پرانا کھیل یعنی چیروکیز کے خلاف چیروکیز کا استعمال شروع کر دیا۔ چیروکیز باشندوں پر دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ ان کا اخبار بند کر دیا گیا ان کی حکومت تحلیل کر دی گئی، مشنریوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا، ان کی زمینیں لاٹری کے ذریعے سفید فاموں میں بانٹ دی گئیں، 1834ء میں اپنی جدوجہد سے تھکے ہارے سترہ سو چیروکیز مغرب کی جانب نقل مکانی پر تیار ہو گئے۔ اکیاسی لوگ راستے میں مر گئے جن میں چنالیس بچے شامل تھے، زیادہ تر اموات خسرے اور ہیضے سے ہوئیں، جو زندہ بچے وہ مسیسپی سے پار اپنی منزل پر ہیضے کی وبا کے دوران پہنچے اور ان میں آدھے ایک سال کے اندر اندر مر گئے۔ اب جورجیا کے سفید فاموں نے اپنا علاقہ خالی کرانے کے لیے حملوں میں شدت پیدا کر دی۔

اپریل 1938ء میں رالف والڈو ایمرسن نے صدر "وان بورن" کو چیروکیز کے ساتھ انخلا کے معاہدے پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ایک کھلا خط بھیجا، (جس کی پشت پر ان میں سے ایک بڑی اکثریت کے دستخط تھے) اور استفسار کیا کہ امریکہ میں انصاف کے احساس کو کیا ہو گیا ہے۔ "جناب

عالی! اگر آپ بے وفائی کی اس دستاویز پر اپنی مہر ثبت کرتے ہیں تو آپ اس مقدس کرسی پر جس پر آپ تشریف فرما ہیں اور پوری قوم کے نام پر رسوائی کا دھبہ لگا دیں گے اور ساتھ ہی مذہب اور آزادی کا شریں شگون دنیاداری سے متعفن کر دیں گے۔

ایمرسن کے خط بھیجنے کے تیرہ دن بعد مارٹن وان بورن نے چیروکیز کے علاقے میں میجر جنرل ون فیلڈ سکاٹ کو حکم دیا کہ چیروکیز کے مغرب کی جانب انخلا کے لیے جیسی بھی فوجی طاقت کی ضرورت ہے اسے استعمال کیا جائے۔ باقاعدہ فوج کی رجمنٹس اور چار ہزار ملیشیا اور رضاکار چیروکیز کے علاقے میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

چیروکیز نے ظاہری طور پر عدم تشدد کو ترک کر دیا، تیں سردار جنہوں نے انخلا کے معاہدے پر دستخط کئے تھے وہ مردہ پائے گئے لیکن سترہ ہزار چیروکیز کو جلد گھیرے میں لے لیا گیا اور انہیں ایک بہت بڑے باڑے میں بند کر دیا گیا۔ یکم اکتوبر 1938ء کو پہلا قافلہ روانہ کیا گیا جسے "آنسوؤں کے سفر" کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ جیسے ہی مغرب کی جانب روانہ ہوئے بھوک، بیماری، پیاس اور گرمی سے مرنا شروع ہو گئے۔ اس قافلے میں صرف 645 بگھیاں تھیں اور لوگ ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ زندہ بچ جانے والوں کو سال کے آخر میں عین سردیوں کے درمیان مسیسپی کے کنارے پر رک جانے کا حکم دیا گیا۔ دریا برف سے بھرا ہو بہہ رہا تھا۔ سینکڑوں بیمار اور مرتے ہوئے لوگ بگھیوں اور زمین پر بے آسرا لیٹے ہوئے تھے۔ باڑے میں قید کے دوران یا مغرب کی جانب پیدل سفر کرتے ہوئے چار ہزار چیروکیز موت کے منہ میں جا چکے تھے۔

دسمبر 1838ء میں صدر وان بورن نے کانگریس سے خطاب کیا:

"مجھے کانگریس کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے حقیقی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ چیروکیز انڈینز کو مکمل طور پر دریائے مسیسپی کے مغرب میں ان کے نئے گھروں کی جانب نکال دیا گیا ہے، ان اقدامات نے جن کی کانگریس نے اپنے آخری اجلاس میں اجازت دی تھی بہت خوش کن اثرات مرتب کئے ہیں۔

''خدا کا شکر ہے.... ہم نے کوئی چیز مال غنیمت میں نہیں لوٹی''

کرنل ''اتھان ایلن ہچ کوک'' جو کہ ایک پیشہ ور فوجی، ملٹری اکیڈمی کا گریجوایٹ، تھرڈ انفنٹری رجمنٹ کا کمانڈ اور شیکسپیئر، چوسر، ہیگل اور سپینوزا کا قاری تھا، اپنی ڈائری میں لکھتا ہے

فورٹ جیسپ لا: 30 جون 1845ء گزشتہ شام واشنگٹن سٹی سے تیز رفتار ڈاک کے ذریعے احکامات موصول ہوئے.... جن میں جنرل ٹیلر کو فوری طور پر دریائے ریو گرینڈ کی جانب روانگی کا اور وہاں اس کے ساحل پر یا اس کے آس پاس پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا گیا تھا، تا کہ میکسیکو کی فوج کو جو کسی وقت دریا پار کر سکتی تھی واپس دھکیل دیا جائے.... مجھے یہ حکم بلس نے گزشتہ رات سونے کے بگل بجنے سے تھوڑی دیر پہلے پڑھ کر سنایا تھا۔ اس کے لیے ضروری تیاریوں کا سوچتے ہوئے میں ساری رات ایک لحہ بھی نہیں سو سکا.... تشدد تشدد کو جنم دیتا ہے اور ہماری یہ حرکت مزید ایسی حرکتوں اور خون خرابے کا موجب نہ بنے، میں بہت غلط سوچ رہا ہوں۔

''ہچ کوک'' غلط نہیں تھا۔ جیفرسن کی لوئی سیانا کی خرید نے امریکہ کے علاقے کو دو گنا کر دیا تھا۔ جو ''راکی ماؤنٹینز'' تک پھیل چکا تھا۔ جنوب مغرب میں میکسیکو تھا، جس نے سپین کے خلاف انقلابی جنگ لڑ کر 1821ء میں آزادی حاصل کی تھی۔ میکسیکو اس وقت موجودہ میکسیکو کی نسبت ایک بہت بڑا ملک تھا، جیسا کہ اس میں ٹیکساس، یوٹاہ، نیویڈا، اری زونا، کیلیفورنیا، اور کلوریڈو کا کچھ علاقہ بھی شامل تھا۔ ہنگاموں اور امریکہ سے مدد پانے کے بعد ٹیکساس 1836ء میں میکسیکو سے علیحدہ ہو گیا اور اپنے آپ کو ''لون سٹار ریپبلک'' قرار دیا۔ 1845ء میں کانگریس نے اسے ریاست کے طور پر اتحاد میں شامل کر لیا۔

اب وائٹ ہاؤس میں جیمز پوک تھا۔ جو کہ ڈیموکریٹ اور ایک وسعت پسند تھا۔ حلف برداری کی تقریب کی رات اس نے نیوی کے سیکرٹری سے کہا تھا کہ اس کے اہم اہداف میں سے ایک کیلیفورنیا کا حصول بھی ہے۔ اس کا جنرل ٹیلر کو ریو گرینڈ کی جانب فوج لے کر جانے کا حکم میکسیکو کو ایک چیلنج تھا۔ یہ بات واضح نہیں تھی کہ ریو گرینڈ ٹیکساس کی جنوبی سرحد ہے، اگر چہ ٹیکساس نے میکسیکو کے شکست خوردہ

جنرل ''سانٹا اینا'' سے زبردستی یہ بیان دلوایا ہوا تھا۔ جب وہ ان کی قید میں تھا۔ ٹیکساس اور میکسیکو کے درمیان روایتی سرحد ''دریائے نیوسس'' جو کہ ڈیڑھ سو میل شمال میں تھا اور اسے میکسیکو اور امریکہ دونوں نے سرحد کے طور پر تسلیم کیا ہوا تھا۔ تاہم پوک نے ٹیکساس کے الحاق کے لیے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ریو گرینڈ پر اس کے دعویٰ کو تسلیم کرے گا۔

فوج کو ریو گرینڈ کے ساحل پر اس علاقے میں بھیجنا جہاں میکسیکو کے لوگ آباد تھے، ایک واضح اشتعال انگیزی تھی۔ ٹیلر کی فوج متوازی دستوں میں گھاس کے میدانوں میں سے مارچ کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ جس کے بہت آگے آگے اور پہلوؤں پر سکاؤٹس کے دستے تھے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے رسد کا ایک سلسلہ چلتا ہوا آ رہا تھا۔ پھر گھنی جھاڑیوں کے جنگل میں سے ایک تنگ راستے پر چلتے ہوئے وہ 28 مارچ 1846ء کو ایک زرعی میدان میں پہنچے جہاں چاروں طرف فصلیں تھیں اور گھاس پھونس کی چھتوں والی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں، جہاں کے باسی بڑی تیزی سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دریا عبور کر کے ''میٹا موروس'' کے شہر میں بھاگ گئے تھے۔ ٹیلر نے وہاں کیمپ لگایا اور ایک قلعے کی تعمیر شروع کر دی۔ اور میٹا موروس کے سفید گھروں کی جانب رخ کر کے اپنی توپیں نصب کر دیں، جس کے باشندے حیرت بھری نگاہوں سے خاموش دریا کے کنارے ایک فوج کے قیام کا نظارہ کر رہے تھے۔

ایک اخبار ''واشنگٹن پوسٹ'' نے اس سے پہلے 1895ء میں ٹیکساس کے الحاق پر صدر پوک اور ڈیموکریٹک پارٹی کی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے لکھا تھا: ''الحاق کے عظیم فیصلے کو اس کی سرحدوں اور دعووں کے ساتھ تکمیل تک پہنچنے دیجیے۔ مغرب کی جانب لوگوں کے سیلاب کے آگے کون بند باندھے گا؟ کیلیفورنیا کی جانب ہمارے لیے راستہ کھل جائے گا۔ ہمارے مغربی لوگوں کی اس جانب روانگی کو کون روک سکے گا؟''

اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی 1845ء کے موسم گرما میں ''ڈیموکریٹک ریویو'' کے ایڈیٹر ''جون اوسولی ون'' نے ایک ترکیب استعمال کی جو مشہور مقولہ بن گئی ''پورے براعظم پر قبضہ جمانے کا 'روشن مقدر' ہمیں رحمت خداوندی نے ہماری ہر سال کروڑوں میں ضرب کھاتی ہوئی ترقی کے لیے عطا کیا ہے۔'' جی ہاں! ''روشن مقدر''۔

1846ء کی بہار میں کسی ایسے فوجی حادثے کی ضرورت تھی۔ جس کی آڑ لے کر جنگ کا آغاز کیا جا سکتا، یہی سب کچھ تھا جو اس وقت پوک پوری شدت سے چاہ رہا تھا۔ یہ حادثہ اپریل میں وقوع پذیر ہو گیا، جب جنرل ٹیلر کا کوارٹر ماسٹر کرنل کراس ''ریو گرینڈ'' کی ساحل پر گھوڑ سواری کرتے ہوئے غائب ہو گیا۔ اس کی لاش گیارہ دن بعد ملی اس کی کھوپڑی کسی کند آلے سے توڑ دی گئی تھی۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ اسے دریا پار کرنے والے میکسیکو کے گوریلوں نے قتل کیا تھا

اگلے دن (25 اپریل) ٹیلر کے سپاہیوں کا ایک گشتی دستہ میکسیکو کے گوریلوں کے گھیرے میں آ گیا۔ 16 سپاہی مارے گئے دوسرے زخمی ہوئے اور باقی ماندہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ "ٹیلر نے پوک" کو ایک پیغام بھیجا "جارحانہ کارروائیوں کا اب جواب دینا چاہیے جیسا کہ یہ شروع ہو گئی ہیں۔"

میکسیکو کے لوگوں نے پہلی گولی داغ دی تھی۔ لیکن انہوں نے کرنل ہچ کوک کے مطابق وہی کیا تھا جو امریکی حکومت چاہتی تھی۔ جیسا کہ ان واقعات سے پہلے اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

> میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا جاتا تھا کہ امریکہ جارح ہے.... ہماری یہاں موجودگی کا ہمیں ذرہ بھر حق نہیں تھا....ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے تھوڑی سی فوج ایک مقصد کے تحت بھیجی ہے تا کہ جنگ کی ابتداء کی جا سکے۔ اور اس بہانے سے کیلیفورنیا اور اس ملک کے جس قدر حصے پر قبضہ ہو سکے کر لیا جائے....اس کام میں میرا دل شامل نہیں ہے....لیکن ایک فوجی ہونے کے ناطے میں احکامات پر عمل درآمد کرنے کا پابند ہوں۔

9 مئی کو بغیر کسی جھڑپ کی خبر کے، پوک اپنی کیبنٹ کو اعلان جنگ کا مشورہ دے رہا تھا۔ پوک نے جو کچھ کیبنٹ کو کہا تھا اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا:

> میں نے کہا....اس وقت تک، جہاں تک ہمیں علم ہے ہمیں میکسیکو کی طرف سے کسی کھلی جارحیت کی خبر موصول نہیں ہوئی، لیکن بڑا واضح خطرہ موجود ہے کہ ایسا عمل ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا میری رائے میں ہمارے جنگ شروع کرنے کی کافی وجہ موجود ہے اور یہ ناممکن ہے....کہ میں زیادہ عرصہ خاموش رہ سکوں....جب کہ ملک اس موضوع پر پرجوش اور بے چین ہے....

ملک ہرگز پرجوش اور بے چین نہ تھا۔ لیکن صدر خود ضرور تھا۔ جب ٹیلر کی جانب سے میکسیکو کے لوگوں کے حملے کے نتیجے میں اموات کی خبر پہنچی، پوک نے خبر سنانے کے لیے کیبنٹ کا اجلاس طلب کر لیا۔ اور وہ یک آواز اس بات پر متفق ہو گئے کہ اسے اعلان جنگ کر دینا چاہیے۔ پوک کا کانگریس کو پیغام بہت برہم کر دینے والا تھا، میکسیکو امریکہ کی سرحد عبور کر کے ہمارے علاقے پر حملہ آور ہوا ہے اور امریکیوں کا خون امریکی سرزمین پر بہایا ہے۔"

کانگریس جنگ کے پیغام کی منظوری کے لیے فوری طور پر حرکت میں آ گئی۔ سرکاری دستاویزات کا ڈھیر مع پیغام جنگ، پوک کے بیان کو شہادت تصور کرتے ہوئے، بغیر پرکھے فوری طور پر ایوان میں پیش کر دیا گیا، جنگ کے لیے مطلوبہ رقم اور رضاکار مہیا کرنے کے لیے ایوان میں بحث کا وقت محض دو گھنٹے تک محدود رکھا گیا، اور اس میں بھی زیادہ تر وقت پیش کی گئی دستاویزات کے منتخب حصے پڑھ کر سنانے میں صرف کر دیا گیا، اور آخر میں اس مسئلے پر بحث کے لیے صرف آدھ گھنٹہ بچا۔

وہگ پارٹی بھی کیلیفورنیا حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے بغیر جنگ کے حاصل کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ تاہم وہ اس عمل کے لیے رقم اور آدمیوں سے انکاری نہیں تھی، اور انہوں نے ڈیموکریٹک کا ساتھ دیا اور اعلان جنگ کی بھاری اکثریت سے 14 کے مقابلے میں 174 ووٹوں سے تصدیق کر دی گئی۔ سینیٹ میں اس پر بحث کی گئی لیکن اس کے لیے ایک دن کا وقت دیا گیا اور سینیٹ نے بھی اقدام جنگ کو 2 کے مقابلے میں 40 ووٹوں سے پاس کر دیا، یہاں بھی وہگو نے ڈیموکریٹس کا ساتھ دیا۔ جان کوینسی ایڈمز (جس نے شروع میں "14 سرکشوں" کے ساتھ ووٹ دیا تھا) نے بھی بعد میں جنگ کے حق میں ووٹ دے دیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو ایلینا اس کا ابراہم لنکن کانگریس میں نہیں تھا۔ لیکن 1846ء کے انتخابات میں اسے بھی جنگ کے بارے میں بات کرنے اور ووٹ دینے کا موقع ملا۔ اس کی "جگہ کی قرارداد" نے بہت شہرت حاصل کی۔ اس نے پوک کو چیلنج کیا کہ جس جگہ "امریکی سرزمین پر" امریکیوں کا خون گرا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرے۔ لیکن اس نے فنڈز، رضاکار اور رسد کو روکتے ہوئے جنگ کے خاتمے کی کوشش نہ کی۔ 27 جولائی 1848ء کو اس نے ایوان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> اگر یہ کہنا کہ "جنگ غیر ضروری اور غیر آئینی طور پر شروع کی گئی۔ جنگ کی مخالفت کرنا ہے تو پھر "وہگز" نے بالعموم اس کی مخالفت کی ہے....میکسیکو کی ایک پرامن آبادی میں فوج کی پیش قدمی کرنا اور وہاں کے مکینوں کو خوفزدہ کر کے فصلیں اور جائدادیں چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کرنا، آپ کے نزدیک تو ایک مکمل دل آویز، پرامن اور غیر اشتعال انگیز عمل ہو سکتا ہے، لیکن ہمیں یہ ایسا محسوس نہیں ہوتا....لیکن جب جنگ شروع ہو گئی تھی اور ایک قومی وجہ بن چکی تھی تو آپ لوگوں کی جانوں اور رقوم کے ساتھ ہماری جانوں اور رقوم کا نذرانہ جنگ کی حمایت ہی تھی۔ لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ ہم نے ہمیشہ جنگ کی مخالفت کی ہے۔ چند افراد کی استثنا کے ساتھ، ضروری سامان رسد کے لیے ہمیشہ ہمارے ووٹ آپ کے ساتھ رہے ہیں۔

چند ایک گنے چنے کانگریس ممبران نے جو غلامی کے خلاف تھے جنگ سے متعلق تمام امور پر مخالفت میں ووٹ دیئے، کیونکہ وہ میکسیکو کی اس مہم کو جنوبی غلاموں کے علاقے کی وسعت خیال کرتے تھے۔ ان میں ایک اوہایو کا شعلہ بیان مقرر اور جسمانی طور پر طاقتور کانگریس مین "جاشوا گا ئڈنگز" تھا، جس نے اس جنگ کو "ایک جارحیت، ناپاک اور غیر منصفانہ جنگ" قرار دیا۔

جب مئی 1846ء میں کانگریس نے اعلان جنگ کر دیا تو نیو یارک، بالٹی مور، انڈیا نا پولس، فلاڈلفیا، اور بہت سے دوسرے مقامات پر جنگ کے حق میں جلوس اور ریلیاں نکلنا شروع ہو گئیں۔ ہزاروں لوگوں نے اپنے آپ کو فوج کے لیے پیش کرنا شروع کر دیا۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں شاعر

''والٹ وٹ مین'' نے ''بروک لین ایگل'' میں لکھا ''ہاں! میکسیکو کی اچھی طرح دھلائی ہونی چاہیے.... آیئے اب ہم اپنے ہتھیار اس جذبے کے ساتھ اٹھائیں جو دنیا کو یہ سبق سکھا دے کہ، جب ہم جنگ میں پہل نہیں کرتے، امریکی جانتے ہیں کہ کس طرح کچلا جاتا ہے۔ اور کس طرح پھیلا جاتا ہے۔''

اس جارحیت کے ساتھ اس خیال کو منسلک کر دیا گیا کہ امریکہ مزید لوگوں کو آزادی اور جمہوریت کی نعمت سے مالا مال کرنے جا رہا ہے، اس کے ساتھ نسلی برتری، نیو میکسیکو اور کیلیفورنیا کی خوبصورت زمینوں کی خواہش اور بحراوقیاس کے ساحلوں تک ایک تجارتی مہم جوئی کے جذبات وابستہ تھے۔

11 فروری 1847ء کے ''کانگریشنل گلوب'' میں ایک رپورٹ شائع ہوئی:

مسٹر جائلس آف میری لینڈ.... مجھے یقین ہے کہ ہم علاقہ حاصل کر لیں گے، اور اس سے پہلے کہ ہم اس جنگ کے بند ہونے کا اعلان کریں ہم ضروری علاقہ حاصل کر چکے ہوں گے.... ہمیں ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک ہر صورت میں پہنچنا ہے، ضروری ہے کہ ہم ٹیکساس سے سیدھا بحیرہ اکاہل تک پہنچ جائیں اور صرف گرجتی ہوئی سمندر کی لہریں ہی ہمارے قدم روکیں.... یہ سفید فام نسل کا مقدر ہے، یہ اینگلو سیکسن نسل کا نصیب ہے۔

دوسری طرف ''امریکن اینٹی سلیوری سوسائٹی'' کا کہنا تھا کہ جنگ محض ''میکسیکو کے وسیع و عریض علاقے میں امریکی غلامی کے فروغ اور دوام کے قابل نفرت اور ہولناک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔'' ایک ستائیس سالہ بوسٹن شاعر نے ''بوسٹن کوریئر'' میں طنزیہ نظمیں لکھنا شروع کر دیں (یہ بعد میں ''بگلو پیپرز'' کے نام شائع کی گئیں) ان میں نیو انگلینڈ کا ایک کسان ''ہوسیا بگلو'' اپنے دیہاتی لہجہ میں جنگ کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔

Ez fer war, I call it murder,--
--There you have it plain an' flat;
I don't want to go no furder
--Than my testyment fer that....
They jest want this Californy
--So's to lug new slave-state in
To abuse ye, an' to scorn ye,
--An' to plunder ye like sin.

1846ء کے موسم گرما میں جنگ ابھی شروع ہی ہوئی تھی جب ایک مصنف ''ہنری ڈیوڈ تھوریو'' جو کہ میساچوسٹس کونکورڈ میں رہتا تھا، نے میکسیکو کی جنگ کی مذمت کرتے ہوئے اپنا میساچوسٹس پول ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا اسے جیل میں ڈال دیا گیا اور ایک رات اس نے جیل میں بسر کی، اس کے ایک دوست نے اس

کی رضامندی کے بغیر اس کا ٹیکس ادا کر دیا اور اسے رہا کر دیا گیا۔ دو سال بعد اس نے ''سول حکومت کے خلاف مزاحمت'' ایک لیکچر دیا، جو بعد میں ''سول نافرمانی'' کے عنوان سے مضمون کی صورت میں شائع ہوا:

قانون کے لیے احترام کا جذبہ پیدا کرنا خاص طور پر انصاف کی خاطر، کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ قانون انسانوں میں معمولی سی انصاف پسندی کو بھی پیدا نہیں کر سکا، اور اس کے لیے احترام کے جذبے نے، انسانوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے لوگوں کو بھی ناانصافی کے گماشتوں میں تبدیل کیا ہے۔ قانون کے ناروا احترام کا نتیجہ آپ، اپنی خواہش کے خلاف، اپنی عقل سلیم اور ضمیر کے خلاف، قابل تعریف نظم میں پہاڑیوں اور وادیوں، میں میدان جنگ کی طرف مارچ کرتے ہوئے فوجی دستوں کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں یہ ایک انتہائی غیر معقول اور اختلاج قلب پیدا کرنے والی مارچ نظر آتی ہے۔

اس کا دوست اور ہمجولی مصنف رالف والڈو ایمرسن اس سے متفق تھا، لیکن احتجاج کو بے ثمر خیال کرتا تھا۔ جب ایمرسن، تھوریو کو ملنے جیل میں گیا، اور پوچھا: ''تم یہاں جیل میں کیا کر رہے ہو؟'' کہا جاتا ہے کہ تھوریو نے جواب دیا ''تم باہر کیا کر رہے ہو؟''

چرچ زیادہ تر، یا تو جنگ کے خلاف کھلم کھلا بولتے تھے یا پھر بزدلانہ طور پر خاموش تھے۔ ریورینڈ ''تھیوڈور پارکر'' نے، جو کہ بوسٹن کا ایک واحدنیت پسند پادری تھا، جنگ پر تنقید کو میکسیکو کے لوگوں کی مذمت کے پردے میں لپیٹ کر پیش کیا۔ اس نے میکسیکو کے لوگوں کو، ''ذلیل قوم، اپنی اصل، اپنی تاریخ اور کردار میں ذلیل'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ بالآخر وہ بھی انڈینز کی طرح شکست کو قبول کر لیں گے۔ اس نے مزید کہا کہ امریکہ کو پھیلنا چاہیے۔ لیکن یہ پھیلاؤ جنگ کے ذریعے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اپنے نظریات کی طاقت پر، اپنی تجارت کے زور اور اپنی اعلیٰ نسل، اعلیٰ نظریات اور ارفع تہذیب کے زور پر چھانا چاہیے۔

پارکر کی نسل پرستی بہت عام پائی جاتی تھی۔ اوہایو کا کانگریس مین ''ڈیلانو'' جو کہ غلامی کے خلاف ایک وہگ تھا، جنگ کی مخالفت اس لیے کرتا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ امریکی ان گھٹیا لوگوں کے ساتھ اختلاط قائم کریں گے جو ''ہر طرح کے رنگ و نسل کا ملغوبہ ہیں، جن میں ہسپانوی، انگلش، انڈینز اور نیگرو خون شامل ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ایک کاہل اور جاہل مخلوق نے جنم لیا ہے۔''

جیسے جیسے جنگ آگے بڑھتی گئی اس کی مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ''امریکن پیس سوسائٹی'' نے ایک اخبار ''ایڈووکیٹ آف پیس'' شائع کرنا شروع کیا۔ جس میں جنگ کے خلاف نظمیں، تقریریں، اپیلیں، خطبے اور فوجی زندگی کی ذلت و خواری اور جنگ کی ہولناکیوں کے چشم دید واقعات شائع کیے جاتے تھے۔ قومی راہنماؤں کی جنگ کے لیے محب الوطنی کی بنیادوں پر حمایت پیدا کرنے کی انتھک کوششوں کے باوجود یہ کھلم کھلا اختلاف رائے اور تنقید حیران کن بات تھی۔ محب الوطن گروہوں کے حملوں

کے باوجود جنگ کے خلاف اجلاس منعقد ہوتے رہے۔

جیسے ہی فوج میکسیکو شہر کے قرب وجوار میں پہنچی تو غلامی کے خلاف ایک اخبار "دا لبریٹر" نے بڑی دلیری اور جرأت کے ساتھ امریکی افواج کی شکست کی خواہشات کا اظہار کیا۔ دنیا بھر سے آزادی اور انسانیت سے محبت کرنے والے لوگ لازماً ان کی (میکسیکو والوں کی) شاندار فتح کے خواہاں ہوں گے۔"

ایک سابقہ غلام اور ایک غیر معمولی مقرر اور مصنف "فریڈرک ڈگلس" نے اپنی روچسٹر سے شائع ہونے والی اخبار "نارتھ سٹار" کے 21 جنوری 1848ء کے شمارے میں لکھا: "برادر جمہوریہ کے ساتھ موجود شرمناک اور غیر منصفانہ جنگ میں میکسیکو اینگلو سیکسن کے حرص ولالچ اور ہوس ملک گیری کا ایک بد قسمت شکار نظر آتا ہے۔" ڈگلس جنگ مخالفین کے کسی حقیقی قدم اٹھانے سے بیدلی کے مظاہرے پر بھی سخت نالاں تھا۔ (حتیٰ کہ حامیان انسداد غلامی نے بھی اپنے ٹیکسوں کی ادائیگی جاری رکھی۔):

> کوئی بھی نمایاں حیثیت یا شہرت کا حامل سیاستدان جنگ کے کھلم کھلا اور غیر مشروط استرداد سے اپنی پارٹی میں اپنی مقبولیت کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بھی تمام خطرات کو قبول کرتے ہوئے امن کے لیے کھڑا ہونے پر تیار نظر نہیں آتا تھا، اور تمام اس بات پر رضامند دکھائی دیتے تھے کہ جنگ کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھی جانی چاہیے۔

عوامی رائے کہاں تھی؟ اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ پہلے ہلے کے بعد فوج کے لیے بھرتی ڈانواں ڈول نظر آنے لگی تھی۔ میکسیکو جنگ کے تاریخ دان آسانی سے "عوام" اور "عوامی رائے" کی بات کرتے ہیں، تاہم ان کے شواہد "عوام" سے نہیں بلکہ اخبارات سے اکٹھے کیے گئے تھے۔ جنہیں وہ عوام کی آواز قرار دیتے ہیں۔ 1845ء میں "نیو یارک ہیرالڈ" نے لکھا "عوام پرزور طور پر جنگ کی حمایت میں ہیں۔" "نیو یارک مارننگ نیوز" نے لکھا "شہروں میں موجود نوجوان اور سرگرم خون، اپنی توانائیوں کا مصرف تلاش کر رہا ہے۔ اور اس وقت ان کی توجہ میکسیکو پر مرکوز ہے۔"

جنگ کے لیے عوامی حمایت کی شدت کا انداز لگانا ناممکن ہے۔ لیکن یہ شہادت موجود ہے کہ بہت سے منظم کارکنوں نے جنگ کی مخالفت کی۔ ٹیکساس کے الحاق کے خلاف نیو یارک، بوسٹن، اور لوویل میں آئرش کارکنوں نے مظاہرے کیے۔ مئی میں جب میکسیکو کی جنگ کا آغاز ہوا نیو یارک کے کارکنوں نے جنگ کی مخالفت کے لیے ایک اجلاس طلب کیا اور بہت سے آئرش کارکنوں نے اس میں شرکت کی۔ اجلاس میں جنگ کو غلاموں کے مالکوں کی ایک سازش قرار دیا گیا اور متنازعہ علاقے سے امریکی فوجیوں کے انخلا کا مطالبہ کیا گیا۔ اس سال "نیو انگلینڈ ورکنگ مینز ایسوسی ایشن" کی ایک کنونشن میں جنگ کی مذمت کی گئی اور اعلان کیا گیا "ہم جنوب میں بسنے والے غلاموں کے مالکوں کو سنبھالا دینے کے لیے ہتھیار نہیں اٹھائیں گے، جو ہمارے ملک کے پانچویں حصے کے لوگوں کی محنت پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔"

بعض اخبارات نے جنگ کے انتہائی ابتدائی دنوں میں احتجاج کیا۔ "ہورس گریلے" 12 مئی 1846ء کو "نیو یارک ٹریبیون" میں لکھا:

> ہم میکسیکو کی افواج کو آسانی کے ساتھ شکست دے سکتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں قتل کر سکتے ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میکسیکو پر ہماری فتوحات اور اس کے آدھے صوبوں کا امریکہ کے ساتھ الحاق ہمیں پہلے سے زیادہ آزادی، بہتر اخلاقیات اور زیادہ خوشحال صنعت سے نواز سکے گا؟....

وہ لوگ جنہوں نے جنگ لڑی، سپاہی جو پیدل چلتے رہے، جنہوں نے پسینے بہائے، بیمار ہوئے اور مر گئے ان کا کیا بنا؟ میکسیکو کے فوجی۔ امریکہ کے فوجی۔ ہم میکسیکو کے فوجیوں کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ہم امریکی فوج کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ جبری بھرتی والوں کے علاوہ رضا کاروں کو پیسوں اور مسلح افواج میں ترقی کے ذریعے سماجی رتبے میں اضافے کے لالچ دیے گئے۔ جنرل ٹیلر کی فوج کے آدھے سے زیادہ فوجی زیادہ تر آئرش اور جرمن تھے جو حال ہی میں نقل مکانی کر کے امریکہ پہنچے تھے، ان کی حب الوطنی زیادہ گہری نہیں تھی۔ حقیقت میں ان میں سے کئی ایک پیسوں کے لالچ میں بھاگ کر میکسیکو کی فوج میں شامل ہو گئے۔ کچھ جو میکسیکو فوج میں بھرتی ہوئے انہوں نے سان پیٹریشو (سینٹ پیٹرک) بٹالین کے نام سے اپنی علیحدہ بٹالین تیار کر لی۔

ابتداء میں تنخواہوں اور حب الوطنی کے جذبے کے تحت ان میں جوش اور جذبہ نظر آتا تھا۔ عسکری جذبہ نیو یارک میں بہت بلند تھا۔ جہاں مقننہ نے گورنر کو پچاس ہزار رضا کار بھرتی کرنے کا اختیار دیا تھا۔ "میکسیکو یا موت" کے بلے کارڈ دیکھنے میں آتے تھے۔ فلاڈلفیا میں بیس ہزار لوگوں کا ایک بڑا مجمع اکٹھا ہوا، اوہایو میں تین ہزار نوجوانوں نے رضا کارانہ خدمات پیش کیں۔

شروع کا جذبہ جلد ہی ماند پڑنے لگا۔ ایک نوجوان نے "کیمبرج کرانیکل" میں اپنا نام ظاہر کیے بغیر لکھا:

> نہ تو میں تم لوگوں میں شامل ہونے کی ذرہ بھر بھی سوچ رکھتا ہوں اور نہ ہی کسی طور پر، میکسیکو کے خلاف غیر منصفانہ جنگ میں، کسی قسم کی مدد کرنے کا سوچ سکتا ہوں۔ نہ تو میں اس قسم کی کسی بھی خواتین اور بچوں کی، شاندار" قتل و غارت میں شریک ہونا چاہتا ہوں جس کا مظاہرہ مونیٹری وغیرہ پر قبضہ کے دوران کیا گیا تھا، اور نہ ہی مجھے ایک کمینے اور گھٹیا فوجی جابر کے تحت زندگی بسر کرنے کا شوق ہے۔ جس کا ہر الٹا سیدھا حکم بلا چوں و چرا تسلیم کرتا چلا جاؤں.... جناب عالی!.... انسانوں کی یہ بے رحمانہ خونریزی رنگ لائے گی.... اور جلد وہ وقت آرہا ہے جب پیشہ ور فوجی کو لٹیرے، ٹھگ اور قاتل کے مترادف سمجھا جائے گا۔

رضا کاروں کی یونٹس غیر معقول وعدوں اور صریح دروغ بیانیوں کے ذریعے بھرتی کی گئیں۔
ایک شخص جس نے نیویارک رضا کاروں کی تاریخ لکھی وہ کہتا ہے۔ ''بہت سے لوگ، جو بے روزگار تھے اپنے بیوی بچوں کی خاطر بھرتی ہوئے، انہیں تین ماہ کی پیشگی تنخواہوں کی پیشکش کی گئی۔ اور وعدہ کیا گیا۔ کہ وہ اپنی تنخواہوں کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ کر جا سکتے ہیں جو ہر ماہ ان کا خاندان حاصل کر سکے گا.... میں جرأت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ پوری رجمنٹ دھوکے سے بھرتی کی گئی۔''

1846ء کے آخر تک بھرتی میں خاطر خواہ کمی آ گئی۔ لہٰذا جسمانی شرائط میں کمی کی گئی اور ہر شخص کو جو قابل قبول جوان بھرتی کے لیے لے کر آتا، فی کس دو ڈالر ادا کئے جاتے۔ لیکن یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ کانگریس نے 1847ء میں جنگ کے عرصے کے دوران خدمات انجام دینے کے لیے دس نئی باقاعدہ رجمنٹوں کے قیام کی اجازت دے دی، اور بھرتی ہونے والوں کو فوج سے باعزت طور پر فراغت پر ایک سو ایکڑ زمین دینے کا وعدہ بھی کیا گیا، لیکن بے اطمینانی پھر بھی جاری رہی۔

اور جلد ہی ان وعدوں کی چمک دمک پر جنگ کے حقائق نے دھول کی چادر چڑھا دی۔ میٹاموروس سے پہلے ریو گرینڈ پر جنرل ارسٹا کے زیرکمان میکسیکو فوج کے پانچ ہزار جوانوں کا جنرل ٹیلر کے تین ہزار جوانوں سے سامنا ہوا۔ گولے چلنے شروع ہوئے اور توپ خانہ رجمنٹ کے سموئیل فرنچ نے جنگ میں پہلی موت کا نظارہ دیکھا۔ ''جان ویبز'' اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے ''وہ نزدیک ہی موجود ایک گھڑسوار فوجی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گولہ آ کر گھوڑے کی زین کے اگلے پھول سے ٹکرایا اور آدمی کے اندر سے گزرتا ہوا ایک عنابی رنگ کے فوارے کی صورت میں اس کی کمر سے باہر نکل گیا۔

جب جنگ ختم ہوئی تو پانچ ہزار میکسیکن مر چکے تھے۔ یا زخمی ہو چکے تھے اور تقریباً پچاس امریکی لقمہ اجل بنے تھے۔ اس جنگ کے بعد کا منظر بیان کرتے ہوئے ویبز لکھتا ہے۔ ''رات کی تاریکی نے تھکے ماندے فوجیوں کو اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ وہاں چراہ گاہ کی گھاس پر گر کر سو گئے۔ ان کی چاروں طرف دونوں فوجوں کے زخمی نوجوان درد اور تکلیف سے چیخ اور کراہ رہے تھے۔ اور مشعلوں کی تھرکتی ہوئی روشنی میں ساری رات سرجن کی آری چلتی رہی۔''

میدان جنگ سے دور فوجی کیمپوں میں بھرتی کے پوسٹروں کا رومانس تیزی سے ماند پڑ چکا تھا۔ ''مسیسپی رائفلو'' کی سیکنڈ رجمنٹ جواب نیو اور لینز میں معروف کار تھی سردی اور بیماری کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ رجمنٹ کے سرجن نے اطلاع دی: ''ہماری رجمنٹ کو سروس کے آغاز سے چھ ماہ کے اندر اندر 167 اموات کا سامنا کرنا پڑا، اور 104 افراد کو ڈسچارج کیا گیا۔ رجمنٹ کے آٹھ سو افراد کو تین بحری جہازوں کے گوداموں میں ٹھونسا ہوا تھا۔ سرجن مزید لکھتا ہے:

> بیماری کے کالے بادل ابھی تک ہم پر منڈلا رہے تھے جہاز کے گودام.... جلد ہی

> بیماروں سے بھر گئے تھے۔ تعفن ناقابل برداشت تھا.... سمندر میں طغیانی شروع ہو گئی.... لمبی کالی راتوں میں ڈگمگاتا ہوا جہاز بیمار آدمی کو اس کی برتھ پر اس قدر زور زور سے پٹکتا کہ اس کے پہلو سیٹ کے کھردرے کونوں سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہو جاتے تھے.... جہاز کے تہہ خانوں میں بیمار فوجیوں کی ہذیانی چیخوں اور مرتے ہوئے آدمیوں کی ماتمی آہ و پکار نے پورے جہاز پر ایک ابتری کی فضا پیدا کر رکھی تھی.... چار ہفتے تک ہم ان قابل نفرت جہازوں میں سوار رہے اور براسوس کے مقام پر اترنے سے پہلے ہم اپنے اٹھائیس آدمیوں کو سیاہ لہروں کے سپرد کر چکے تھے۔

اس دوران زمین اور سمندر کے راستے اینگلو امریکی فوجیں کیلیفورنیا کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ نیوی کا ایک نوجوان آفیسر جنوبی امریکہ کی جنوبی راس کا چکر کاٹ کر ایک لمبے بحری سفر کے بعد کیلیفورنیا میں مونٹری کے مقام پر اُترا، اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

> ایشیا.... ہماری دہلیز پر آ جائے گا۔ آبادی کیلیفورنیا کے زرخیز علاقوں میں پھیل جائے گی۔ پورے ملک کے وسائل میں اضافہ ہو گا.... ریلوے کے اردگرد سرکاری زمین ریگستانوں سے باغات میں تبدیل ہو جائے گی۔

یہ ایک علیحدہ جنگ تھی جو کیلیفورنیا میں لڑی جا رہی تھی، جہاں اینگلو امریکی نے ہسپانوی آبادیوں پر حملے کئے، ان کے گھوڑے چوری کئے اور کیلیفورنیا کو میکسیکو سے الگ ''بیئر فلیگ ریپبلک'' قرار دے دیا۔ وہاں انڈینز بھی آباد تھے، نیوی کے آفیسر ''ریویرے'' نے ان کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا (جیسا کہ اس نے بعد میں بیان کیا):

> میں نے آپ لوگوں کو یہاں بات چیت کے لیے بلایا ہے۔ جس ملک میں آپ رہ رہے ہیں یہ اب میکسیکو کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ اس عظیم قوم کی ملکیت ہے جس کی سرحدیں اس عظیم سمندر سے جس کے بارے میں آپ نے سنا ہو گا یا دیکھا ہو گا، ہزاروں میل دور مشرق میں جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ ایک دوسرے عظیم سمندر تک پھیلی ہوئی ہیں.... ہماری فوجیں اب میکسیکو میں ہیں اور جلد ہی پورے ملک کو فتح کر لیں گی۔ لیکن آپ لوگوں کو ہم سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ وہ کام کریں گے جو جائز ہے.... اگر آپ لوگ اپنے نئے حکمرانوں سے وفادار رہیں گے.... مجھے امید ہے کہ آپ اپنی عادات تبدیل کر لیں گے۔ محنت اور کفایت شعاری سے کام لو گے، اور اپنی تمام بری عادات ترک کر دو گے جن پر تم عمل پیرا ہو.... ہم آپ کی حفاظت کریں گے اور تمہیں حقیقی آزادی سے نوازیں گے۔ لیکن بہکاوے میں آنے، لاقانونیت سے اور دوسرے جرائم سے بچنا ہو گا، کیونکہ فوج جو آپ کا تحفظ کر سکتی ہے یقیناً

سزا بھی دے سکتی ہے۔ اور یہ تمہیں تمہارے دوردراز کے خفیہ ٹھکانوں سے بھی نکال لائے گی۔

جنرل کیرنے'' آسانی کے ساتھ نیو میکسیکو میں داخل ہو گیا اور '' سانٹافی پر بغیر جنگ کے قبضہ ہو گیا۔ ایک امریکی سٹاف آفیسر نے دارالحکومت کے شہر میں امریکی فوج کے داخلے پر میکسیکن آبادی کے ردعمل کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

شہر میں ہمارا داخلہ انتہائی جنگی انداز کا تھا، چاروں طرف تنی ہوئی تلواریں اور خنجر نظر آ رہے تھے۔ جب امریکی جھنڈا لہرایا گیا اور پہاڑی سے توپ نے اپنی گرجدار آواز میں سلامی پیش کی تو بہت سی خواتین جواب تک بمشکل ضبط کئے بیٹھی تھیں، اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور انہوں نے دردناک آواز میں رونا اور چلانا شروع کر دیا۔ اور ہماری ہر سمت سے بظاہر اداسی میں ڈوبی ہوئی عمارتوں سے آنے والی ان آوازوں نے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے آنے والی آوازوں کو بھی دبا دیا۔

یہ اگست کا مہینہ تھا۔ دسمبر میں نیو میکسیکو، تاؤس میں میکسیکن نے امریکی راج کے خلاف بغاوت کر دی۔ بغاوت کو کچل دیا گیا اور گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ لیکن بہت سے باغی بھاگ گئے اور وقفوں وقفوں سے حملے کرنے لگے، کئی امریکیوں کو مار دیتے اور پہاڑوں میں جا چھپتے۔ امریکی فوج نے ان کا پیچھا کیا اور آخری فیصلہ کن معرکے میں چھ سے سات سو باغی سامنے آئے جن میں 150 مر گئے اور یوں محسوس ہوا کہ بغاوت اب ختم ہو گئی ہے۔

لاس اینجلز میں بھی بغاوت ہوئی اور وہاں موجود امریکی گیریژن کو میکسیکن نے ستمبر 1846ء میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ امریکی فوج جنوری میں ایک خونریز جنگ لڑنے تک لاس اینجلز پر دوبارہ قبضہ نہ کر سکی۔

جنرل ٹیلر نے ریئو گرینڈ سے پار پیش قدمی کرتے ہوئے میٹا مورس پر قبضہ کر لیا اور جنوب کی جانب بڑھنے لگا۔ لیکن اس کے رضاکار میکسیکو کے علاقے میں زیادہ بے قابو ہو گئے۔ شراب کے نشے میں دھت فوجیوں نے میکسیکو کے دیہاتوں میں لوٹ مار مچانا شروع کر دی اور عصمت دری کے واقعات میں اضافہ ہونے لگا۔

فوجی جیسے ہی ریئو گرینڈ سے '' کمارگو'' کی جانب بڑھے، گرمی ناقابل برداشت ہو گئی۔ پانی پرا گندہ ہو گیا، ہیضے اسہال اور دیگر اس قسم کی بیماریوں میں اضافہ ہونے لگا۔ حتیٰ کہ ایک ہزار فوجی لقمہ اجل بن گئے۔ ابتداء میں مرنے والوں کو فوجی بینڈ کی '' ڈیڈ مارچ'' کے ساتھ اعزاز سے دفنایا جاتا رہا، پھر مرنے والوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ رسمی فوجی تدفین کا عمل بند کر دیا گیا۔ جنوب کی جانب مونٹیری اور ایک دوسری جنگ میں فوجی اور گھوڑے بڑی اذیت کے ساتھ موت کے منہ میں چلے گئے۔ ایک آفیسر کے مطابق خون اور جھاگ سے زمین پھسلن کی شکل اختیار کر گئی۔

امریکی نیوی نے '' ویرا کروز'' میں بمباری کر کے بلا امتیاز سویلین لوگوں کے موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ نیوی کا ایک بم پوسٹ آفس پر گرا، ایک دوسرا سرجیکل ہسپتال پر گرا، پورے شہر پر تیرہ سو بم برسائے گئے یہاں تک کہ شہر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ '' نیو اورلینز ڈیلٹا'' کے ایک نمائندے نے لکھا '' میکسیکن نے مختلف طور پر 500 سے 1000 سے افراد کے مرنے اور زخمی ہونے کا اندازہ لگایا۔ تاہم اس بات پر سب متفق تھے کہ فوجیوں میں ہونے والا نقصان مقابلتہً کم تھا اور خواتین اور بچوں میں نقصان بہت زیادہ تھا۔

کرنل '' ہچ کوک'' شہر میں آنے کے بعد لکھتا ہے: '' ہمارے مارٹر گولوں سے لگنے والی خوفناک آگ کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہمارے گولے یقینی ہدف پر گرتے تھے جو کہ اکثر سول آبادیوں کا مرکز تھے.... یہ سب کچھ بہت بھیانک اور خوفناک تھا، میں اس کا سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔'' اس کے باوجود '' ہچ کوک'' ایک فرض شناس فوجی نے جنرل سکاٹ کی جانب سے میکسیکن لوگوں کے نام ایک پیغام کی شکل میں خط تحریر کیا جسے ہزاروں کی تعداد میں انگلش اور ہسپانوی زبان میں چھپوایا گیا۔ جس میں کہا گیا تھا '' ہمارے دلوں میں آپ کے لیے ایک ذرہ بھر بھی بری نیت نہیں ہے.... ہم یہاں کسی دنیاوی لالچ کے لیے نہیں آئے ہمارا مقصد صرف امن کا قیام ہے۔''

یہ امریکی اشرافیہ کی میکسیکن اشرافیہ کے خلاف جنگ تھی۔ دونوں فریق اپنے ہی عوام کو ابھار رہے تھے، استعمال کر رہے تھے، اور موت کے گھاٹ اتار رہے تھے، میکسیکن کمانڈر '' سانٹا اینا'' بغاوتوں پر بغاوتیں کچلتا رہا تھا۔ اس کے فوجی بھی فتح کے بعد لوٹ مار اور عصمت دری کرتے تھے۔ جب کرنل ہچ کوک اور جنرل ون فیلڈ سکاٹ سانٹا اینا کی جاگیر میں داخل ہوئے تو انہوں نے اس کی دیواریں خوبصورت تصاویر سے مزین پائیں۔ لیکن اس کی آدھی فوج مر چکی تھی اور زخمی تھی۔

جنرل سکاٹ نے میکسیکو شہر کے لیے آخری جنگ کے لیے اپنے دس ہزار فوجیوں کے ساتھ پیش قدمی شروع کی۔ وہ جنگ کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ میکسیکو شہر سے تین دن کی مسافت پر '' جلاپا'' کے مقام پر اس کی بارہ رجمنٹوں میں سے سات رجمنٹیں تحلیل ہو گئیں۔ ان کی بھرتی کا وقت ختم ہو چکا تھا، جنگ اور بیماری کی حقیقت ان کے لیے کافی تھی۔

میکسیکو شہر کے باہر '' چورو بسکو'' کے مقام پر میکسیکن اور امریکی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، تین گھنٹے کی جنگ میں دونوں طرف سے ہزاروں لوگ مارے گئے۔ میکسیکن قیدیوں کے ساتھ اکہتر امریکی فوج کے بھگوڑے بھی شامل تھے۔

جیسا کہ اکثر جنگوں میں ہوتا ہے۔ کہ چھوٹی موٹی جھڑپیں بغیر کسی مقصد کے لڑی جاتی ہیں۔ میکسیکو کے شہر کے قریب ایک ایسی ہی جھڑپ کے بعد جس میں خوفناک حد تک جانی نقصان ہوا، بحریہ کے ایک لیفٹیننٹ نے جنرل سکاٹ پر الزام لگایا، اس نے غلطی سے اس کی ابتدا کی اور ناکافی فوج کے ساتھ یہ

معرکہ لڑا گیا، ایک ایسے مقصد کے لیے جس کا وجود ہی نہیں تھا۔

میکسیکو شہر کے لیے آخری جنگ میں امریکی فوجیوں نے ''چپلو ٹیپک'' کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور 2,07,000 آبادی کے شہر میں داخل ہو گئے۔ جنرل سانٹا اینا شمال کی جانب نکل گیا تھا۔ یہ 1847ء کا ستمبر کا مہینہ تھا، ایک میکسیکن تاجر نے اپنے ایک دوست کو شہر پر بمباری کے بارے میں لکھا: ''بعض واقعات میں پورا پورا بلاک ہی تباہ کر دیا گیا اور بڑی تعداد میں مرد، خواتین اور بچے مرے اور زخمی ہوئے۔''

جنرل سانٹا اینا ''ہوامنیلا'' کی طرف فرار ہو گیا۔ جہاں ایک اور جنگ لڑی گئی اور اسے دوبارہ فرار ہونا پڑا۔ ایک امریکی انفنٹری کے لیفٹیننٹ نے ''واکر'' نامی ایک آفیسر کے جنگ میں مارے جانے کے بعد جو کچھ ہوا اس بارے میں اپنے والدین کو لکھا:

جنرل لین نے ہمیں بہادر فوجی واکر کی موت کا بدلہ لینے کو کہا.... سب سے پہلے ایک شراب کی دکان کو توڑ کر کھولا گیا، اور پھر شراب سے پاگل ہو کر غیظ و غضب کی ہر قسم کا مظاہرہ کیا گیا۔ عمر رسیدہ خواتین اور نوجوان لڑکیوں کے لباس پھاڑ کر انہیں برہنہ کر دیا گیا.... اور بہت سے فوجی غصے کے عالم میں اس سے بھی آگے بڑھ گئے، درجنوں آدمیوں کو گولیاں ماردی گئیں، ان کی جائدادیں، چرچ، سٹور، اور رہائشی گھروں کو لوٹا اور مسمار کر دیا گیا.... اس واقعہ پر مجھے زندگی میں پہلی بار اپنے امریکی ہونے پر شرمندگی کا احساس ہوا۔

پنسلوانیا سے تعلق رکھنے والا ایک رضا کار جنگ کے آخری ایام میں لکھتا ہے:

ہم یہاں سخت نظم و ضبط کے تحت ہیں ہمارے کچھ آفیسر بہت اچھے انسان ہیں، لیکن باقی ماندہ بڑے ظالم اور انسانوں کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کرنے والے ہیں.... آج رات ڈرل پر ایک آفیسر نے ایک سپاہی کی کھوپڑی اپنی تلوار سے چیر ڈالی.... لیکن جلد وہ وقت آنے والا ہے جب آفیسر اور جوان برابری کی سطح پر کھڑے ہوں گے...... ایک فوجی کی زندگی بہت زیادہ قابل نفرت ہے۔

15 اگست 1847ء کی رات کو شمالی میکسیکو میں ورجینیا مسیسپی اور شمالی کیلیفورنیا کی رضا کار رجمنٹوں نے کرنل ''رابرٹ ٹریٹ پین'' کے خلاف بغاوت کر دی۔ پین نے ایک باغی کو مار ڈالا، لیکن اس کے دو لیفٹیننٹوں نے بغاوت کچلنے میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں امن قائم رکھنے کی خاطر باغیوں کو بری کر دیا گیا۔

مارچ 1847ء میں فوج سے بھاگنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا فوج نے ہزار سے زیادہ بھگوڑوں کی تصدیق کی۔ جنگ کے دوران بھگوڑوں کی کل تعداد 9,207 تھی (5,331 باقاعدہ فوج کے سپاہی اور 3,876 رضا کار فوج سے) وہ جو بھاگے نہیں تھے ان پر قابو رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔ جنرل کشنگ نے میساچوسٹس

انفنٹری کی فرسٹ رجمنٹ کے ایسے 65 افراد کو ''ناقابل اصلاح حد تک باغی اور نافرمان قرار دیا۔''

فتح کی ناموری اور ستائش، صدر اور جرنیلوں کے حصے میں آئی، بھگوڑوں، مرنے والوں اور زخمیوں کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ میساچوسٹس رضا کار روانگی کے وقت 630 تھے۔ جب گھر واپس لوٹے تو ان میں سے 300 مر چکے تھے، زیادہ تر اموات بیماریوں کی وجہ سے ہوئی تھیں، اور ان کی واپسی پر استقبالیہ کھانے میں ان کے کمانڈر جنرل کشنگ پر اس کے فوجی ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے ''سی سی'' کی آوازیں نکال رہے تھے۔

جیسے ہی یہ فوجی واپس آئے تو حکومت کی طرف سے دیے گئے زمینوں کے وارنٹس خریدنے کے لیے زمین کے سٹہ باز ان کے گرد منڈلانے لگے۔ بہت سے فوجیوں نے جن کو نقد رقم کی اشد ضرورت تھی اپنے 160 ایکڑ پچاس ڈالر سے بھی کم قیمت پر فروخت کر دیے۔

میکسیکو نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ بہت سے امریکی پورے میکسیکو پر قبضے کے حق میں تھے۔ 1848ء میں ''گواڈلیوپ ہائیڈل گو'' کے معاہدے پر دستخط کیے گئے جس کے تحت آدھے میکسیکو پر قبضہ کر لیا گیا۔

ٹیکساس کی سرحد ''ریو گرینڈ'' مقرر کی گئی، نیو میکسیکو اور کیلیفورنیا امریکہ کے حوالے کر دیے گئے۔ امریکہ نے میکسیکو کو 15 ملین ڈالر ادا کیے، جس پر ''وہگ'' کے ایک ذی فہم نے کہا ''خدا کا شکر ہے.... ہم نے کوئی چیز مال غنیمت میں نہیں لوٹی۔''

بلاتسلیم غلامی، بے نجات آزادی

امریکی حکومت کی جانب سے غلامی کی حمایت ایک اشد عملی ضرورت پر مبنی تھی۔ 1790ء میں جنوبی علاقے میں ہر سال ایک ہزار ٹن کپاس پیدا کی جارہی تھی۔ 1860ء تک یہ دس لاکھ ٹن تک پہنچ چکی تھی۔ اسی دوران پانچ لاکھ غلاموں کی تعداد بھی بڑھ کر چالیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس بہت بڑے زرعی نظام کو بار بار کی غلام بغاوتوں اور سازشوں کی وجہ سے سخت خطرہ لاحق تھا (مثلاً 1800ء میں گیبریئل پروسر کی بغاوت، 1822ء میں ڈنمارک ویسی کی بغاوت اور 1831ء میں نیٹ ٹرنر کی بغاوت)۔ ان پر قابو پانے کے لیے مغربی ریاستوں نے ایک مؤثر نیٹ ورک تیار کیا جس کو قوانین، عدالتوں، مسلح افواج اور قوم کے سیاسی راہنماؤں کے نسلی تعصب کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

اس طرح کے ایک مضبوط اور محفوظ نظام کو ختم کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر غلام بغاوتوں یا ایک وسیع جنگ کی ضرورت تھی۔ بغاوت کی صورت میں قابو سے باہر ہو کر اس کا رخ سرمایہ داری کے تحفظ و فروغ کے لیے قائم کیے گئے دنیا کے سب کامیاب نظام کی جانب بھی گھوم سکتا تھا۔ اگر جنگ کا انتخاب کیا جاتا تو جنگ کرنے والوں کو اس کے نتائج کو بھی منظم کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غلاموں کو آزادی جان براؤن نے نہیں بلکہ ابراہام لنکن نے دلوائی۔ 1859ء میں جان براؤن کو وہی کام چھوٹے پیمانے کے تشدد کے ذریعے کرنے کی کوشش میں وفاقی حکومت کی سازباز کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا گیا جو کام کئی سالوں بعد ابراہام لنکن نے بڑے پیمانے کے تشدد کے ذریعے انجام دیا۔

ورجینیا، شمالی کیرولینا، اور کینٹکی میں تمباکو کی کاشت اور جنوبی کیرولینا میں چاولوں کی کاشت کا زرعی نظام جورجیا، الباما اور مسیسپی میں کپاس کی کاشت کے علاقوں میں پھیل گیا۔ اور اس کے لیے مزید غلاموں کی ضرورت تھی۔ لیکن 1808ء میں غلاموں کی برآمد غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی۔ اس لیے جیسا کہ جان ہوپ فرینکلن اپنی کتاب "سلیوری ٹو فریڈم" میں لکھتا ہے۔ ابتداء ہی سے اس قانون کا اطلاق نہیں کیا جا سکا تھا۔ لمبی اجاڑ ساحلیں، مخصوص منڈیاں اور اور خطیر منافعوں کی توقع امریکی تاجروں کے لیے کافی زیادہ ترغیبات تھیں۔" ایک اندازے کے مطابق سول وار سے پہلے ڈھائی لاکھ غلام غیر قانونی

طور پر درآمد کیے گئے۔

غلامی کو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟ شاید وہ لوگ اسے ہرگز بیان نہیں کر سکتے۔ جنہیں اس کا کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ شمال کے دو حریت پسند تاریخ دانوں کی بہت زیادہ فروخت ہونے والی ٹیکسٹ بک کے 1932ء کے ایڈیشن میں غلامی کو نیگروز کو "تہذیب یافتہ" بنانے کے لیے ایک "ضروری عبوری دور" قرار دیا تھا۔ ماہرین معاشیات اور اعداد و شمار کے ماہر تاریخ دانوں نے غلامی کو ان تخمینوں کی روشنی میں، کہ غلاموں کی خوراک اور طبی دیکھ بھال پر کتنی رقم خرچ ہوتی تھی، پرکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کیا یہ سب کچھ غلامی کی اس حقیقت کو بیان کر سکتا ہے جو وہ انسان محسوس کرتے ہیں جو غلامی کے قفس میں زندگی بسر کر رہے تھے؟ کیا غلامی کی کیفیات اتنی ہی اہم ہیں جتنا کہ غلامی کی موجودگی؟

"جون لٹل" ایک سابقہ غلام لکھتا ہے:

> وہ کہتے ہیں کہ غلام خوش ہیں، کیونکہ وہ ہنستے ہیں اور شاداں ہیں۔ میں نے خود اور تین یا چار دوسرے غلاموں نے ایک دن میں دو سو کوڑے کھائے ہیں، اور ہمارے پاؤں بیڑیوں میں رہے ہیں: پھر بھی، رات کو ہم گیت گاتے اور رقص کرتے تھے، اور اپنی زنجیروں کی کھنکھناہٹ سے دوسروں کو ہنساتے تھے۔ ہم یقیناً خوش باش لوگ تھے، ہم یہ سب کچھ اپنی تکالیف کو کم کرنے کے لیے اور اپنے دلوں کو مکمل طور ٹوٹ جانے سے بچانے کے لیے کرتے تھے۔ یہ اتنا ہی سچ ہے جتنا کہ انجیل۔ یہ بات درست ہے کہ ہمیں بہت زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے؟ اس کے باوجود میں نے خود یہ کیا ہے۔ میں زنجیروں میں جکڑا ہوا کلیلیں بھرتا اور کدکڑے نکالتا تھا۔

ایک زرعی رسالے میں کھیتوں میں کام کرنے والے غلاموں کی اموات کا ریکارڈ رکھا گیا تھا (جو کہ اب یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا میں محفوظ ہے)۔ اس کے مطابق 1850ء سے 1855ء تک مرنے والوں کی عمریں اور وجوہات درج ہیں۔ بتیس غلام جو اس عرصہ میں لقمہ اجل بنے، ان میں سے صرف چار افراد ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ پائے، چار پچاس کی عمر میں، سات اپنی چالیس کی دہائی میں، سات تیس اور بیس کی دہائی میں اور 9 پانچ سال کی عمر سے بھی پہلے موت کے منہ میں چلے گئے۔

لیکن کیا اعداد و شمار کا یہ ریکارڈ اس کیفیت کو بیان کر سکتا ہے جن سے وہ خاندان گزرتے تھے جن کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جاتا تھا، جب غلاموں کا مالک منافع کے لالچ میں ایک خاوند یا ایک بیوی یا ایک بیٹے یا ایک بیٹی کو بیچ دیتا تھا؟ 1858ء میں ایک غلام جس کا نام "ابریم سکری ون" تھا کو اس کے مالک نے بیچ دیا۔ اس نے اپنی بیوی کو لکھا "میری ماں اور میرے باپ کو میرا پیار پہنچانا اور انہیں میری طرف سے خدا حافظ کہنا، اور اگر ہم اس دنیا میں ایک دوسرے کو نہ مل سکے تو مجھے امید ہے کہ جنت میں ضرور ملیں گے۔"

غلاموں کی بغاوتیں امریکہ میں اس قدر عام یا بڑے پیمانے پر نہیں تھیں جتنی کیریبین جزائر اور جنوبی امریکہ میں تھیں۔ امریکہ میں غالباً سب سے بڑی غلاموں کی بغاوت نیو اورلینز کے قریب 1811ء میں وقوع پذیر ہوئی۔ بغاوت کے بعد میجر اینڈری کے فارم میں چار سے پانچ سو غلام اکٹھے ہوئے۔ بید کاٹنے والے چاقوؤں، کلہاڑیوں، اور ڈنڈوں سے مسلح ان غلاموں نے اینڈری کو زخمی کر دیا، اس کے بیٹے کو مار ڈالا، اور مارچ کرتے ہوئے ایک فارم سے دوسرے فارم میں داخل ہوتے گئے، ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا، ان پر امریکی فوج اور ملیشیا افواج نے حملہ کیا، ساٹھ موقع پر ہلاک ہو گئے اور سولہ پر مقدمہ چلا اور فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑے کر کے گولیوں سے اڑا دیے گئے۔

ڈنمارک ویسی کی سازش کو 1822ء میں اس پر عملدرآمد ہونے سے پہلے ہی کچل دیا گیا۔ منصوبے کے مطابق جنوبی کیرولینا کے شہر "چارلسٹن" کو آگ لگانا شامل تھا جو کہ اس وقت امریکہ کا چھٹا بڑا شہر تھا اور علاقے میں غلاموں کی ایک عام بغاوت کی ابتداء کرنا تھا۔ بہت سے شاہدین نے بتایا کہ اس منصوبے میں ہزاروں سیاہ فاموں کو کسی نہ کسی طور پر شریک کیا گیا تھا۔ ہربرٹ ایپ تھیکر کے بیان کے مطابق سیاہ فاموں نے 250 نیزے اور برچھے اور تین سو سے زائد خنجر تیار کیے ہوئے تھے۔ لیکن منصوبہ فاش ہو گیا اور ویسی سمیت پینتیس سیاہ فاموں کو پھانسی دیدی گئی۔ مقدمے کی ساری کارروائی چارلسٹن میں شائع ہوئی لیکن جلد ہی اسے مکمل طور پر تلف کر دیا گیا کیونکہ اس کا غلاموں کی نظر سے گزرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

1831ء کی گرمیوں میں ورجینیا کی کاؤنٹی ساؤتھمپٹن "نیٹ ٹرنر" نام کے ایک غلام نے خدائی مدد حاصل ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے ستر غلام اپنے ساتھ ملا لیے۔ یہ لوگ جوش اور جنون سے سرشار ایک فارم سے دوسرے فارم قتل و غارت کرتے ہوئے چل پڑے۔ انہوں نے تقریباً پچپن مردوں، خواتین اور بچوں کو مار دیا۔ انہوں نے بہت سے حامی جمع کر لیے۔ لیکن جب ان کے پاس اسلحہ ختم ہو گیا تو سارے کے سارے پکڑے گئے۔ ٹرنر اور شاید اٹھارہ دوسرے غلاموں کو پھانسی دے دی گئی۔

اس واقعہ نے جنوب میں غلاموں کے مالکوں میں سنسنی پیدا کر دی، لیکن ساتھ ہی انہوں نے غلامی کے نظام کو تحفظ دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کا تہیہ کر لیا۔ اس کے بعد ورجینیا میں 101,000 افراد پر مشتمل ملیشیا فوج قائم کی گئی جو کہ اس کی کل آبادی کا تقریباً 10 فی صد تھی۔ بغاوتیں اگرچہ شاذ شاذ تھیں لیکن غلاموں کے مالکوں کے لیے ایک مسلسل خطرہ تھیں۔

"یوجین جینوویس" اپنی کتاب Roll, Jordon, Roll میں غلامی کا جامع جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے "غلامی کے حوالے بیک وقت اس کی قبولیت اور مزاحمت دونوں ملتی ہیں، مزاحمت میں، جائداد کی چوری، تخریب کاری، اور کاہلی، نگرانوں اور مالکوں کا قتل، فارموں پر عمارتوں کو آگ لگانا اور فرار شامل تھا۔ حتیٰ کہ قبولیت میں بھی "ایک اعتراض کی روح اور پوشیدہ تخریبی افعال پائے جاتے تھے۔"

فرار ہو جانا مسلح بغاوت سے زیادہ حقیقت پسندانہ فعل تھا۔ 1850ء کے عشرے میں ہر سال تقریباً ایک ہزار غلام شمال، کینیڈا، اور میکسیکو کی طرف فرار ہوتے رہے۔ ہزاروں مختصر مدت کے لیے فرار ہوئے۔ دراصل فرار ہونا بھی ایک خوفناک اور دہشتناک عمل تھا لیکن اس کے باوجود فراریاں ہوتی رہیں۔ پناہ گزینوں کو تلاش کرنے کے لیے کتے استعمال کیے جاتے تھے، جو فرار ہونے والوں کو کاٹتے، چیر پھاڑ دیتے اور بازو اور ٹانگیں ناکارہ کر دیتے اور اگر وقت پر ان کو جا تا نہ کیا جاتا تو جان سے بھی مار ڈالتے۔

ہیریٹ ٹبمین غلامی میں پیدا ہوئی، جب وہ پندرہ سال کی تھی تو ایک نگران نے اس کے سر میں شدید ضرب لگائی۔ جس کی وجہ سے اسے آنکھوں کے آگے اندھیر چھا جانے کی مستقل بیماری لگ گئی۔ جوان ہونے پر فرار ہو گئی۔ پھر وہ "انڈر گراؤنڈ ریل روڈ" (شمالی باشندوں کی تنظیم جو پناہ گزین غلاموں کو غیر قانونی طور پر کینیڈا کی آزاد ریاستوں میں پہنچانے میں مدد فراہم کرتی تھی۔ اس میں زیادہ تر سیاہ فام شامل تھے) کی ایک مشہور کنڈکٹر بن گئی۔ اس نے امریکہ اور کینیڈا کے درمیان انیس خطرناک چکر لگائے جن میں اس نے تقریباً تین سو غلاموں کو آزاد کرا دیا۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک پسٹل ہوتی تھی اور پناہ گزینوں پر واضح کر دیتی تھی "تم آزاد ہو جاؤ گے یا مر جاؤ گے" اس نے اپنا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہا "میرے پاس دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب تھا، آزادی یا موت، اگر ایک حاصل نہ کر سکوں تو دوسرا انتخاب تو بہرحال میرے پاس ہوتا تھا تا کہ کوئی بھی آدمی مجھے زندہ نہ پکڑ سکے۔

ڈبلیو۔ ای۔ بی۔ ڈیو بوئس لکھتا ہے کہ مزاحمت کی ایک شکل زیادہ محنت نہ کرنا تھی۔

ایسے واقعات جن میں غریب سفید فاموں نے غلاموں کی مدد کی ہو اتنے عام نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی ایسے واقعات جنم لیتے رہے جنہوں نے غلاموں کے مالکوں کو ان سے بھی خوفزدہ کیے رکھا۔ جینوویس لکھتا ہے:

> غلاموں کے مالک.... ہمیشہ اس شک میں مبتلا رہتے تھے کہ وہ لوگ جن کے پاس غلام نہیں تھے غلاموں کو حکم عدولی حتیٰ کہ بغاوت پر بھی اکساتے ہیں۔ جس کی وجہ غلاموں سے ہمدردی نہیں بلکہ دولتمند کاشتکاروں سے نفرت اور اپنی غربت پر آزردگی تھی۔ بعض اوقات غلاموں کی بغاوتوں کے منصوبوں میں سفید فام بھی ملوث ہوتے تھے، اور ایسا ہر واقعہ سفید فام کاشتکاروں میں مزید خوف کا باعث بنتا تھا۔

اس بات سے وضاحت ہوتی ہے کہ سیاہ فاموں سے برادرانہ تعلقات رکھنے والے سفید فاموں کے خلاف پولیس سخت کارروائیاں کیوں کرتی تھی۔ اس ہمدردی کے بدلے میں سیاہ فام بھی ضرورتمند سفید فاموں کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ ایک سیاہ فام مفرور غلام نے ایک سیاہ فام خاتون کے بارے میں بتایا کہ اسے اس پاداش میں پچاس کوڑے مارے گئے کہ اس نے اپنے ایک غریب اور بیمار

سفید فام ہمسائے کو کھانا کھلایا تھا۔

جب جورجیا میں برنزوک نہر کی کھدائی کی گئی تو سیاہ فام غلاموں کو سفید فام آئرش مزدوروں سے علیحدہ رکھا گیا اور عذر یہ پیش کیا گیا کہ یہ آپس میں سرپھٹول کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات سچ بھی ہو، لیکن ایک دولتمند کاشتکار کی بیوی اور مشہور ایکٹرس فینی کیمبل اپنے جرنل میں لکھتی ہے:

> لیکن آئرش صرف جھگڑالو، بلوائی، جنگجو اور شرابی اور نیگروز سے حقارت کرنے والے ہی نہیں.....وہ مغلوب الغضب، من موجی، پرتپاک، فراخ دل لوگ ہیں.....وہ حقیقت میں غلاموں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھ سکتے ہیں، اور ممکنہ نتائج جو پیدا ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ لگانا میں آپ پر چھوڑتی ہوں۔ میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ ان کو کسی بھی صورت میں برنزوک نہر پر اکٹھے کام کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

غلاموں کو قابو رکھنے کے لیے ایک اور خوش تدبیری سے کام لیا گیا، سفید فام ملازمین کو، جو کہ خود بھی جنوبی علاقوں میں دو سو سال تک ایک معصیت بنے رہے، سیاہ فام غلاموں پر نگران مقرر کیا جانے لگا اور سیاہ فاموں کی نفرت کے سامنے ایک نئی فصیل کھڑی کر دی گئی۔

زرعی فارموں کے مالکوں نے ان پر قابو پانے کے لیے مذہب کا استعمال بھی کیا۔

جہاں تک سیاہ فام مبلغین کا تعلق تھا جینوویس ان کے بارے میں کہتا ہے "انہیں ایسی سرکش زبان استعمال کرنا پڑتی تھی جو ان کے سامعین کے جذبوں کو مناسب حد تک بلند رکھے۔ لیکن اس قدر آتش بیانی سے بھی کام نہیں لیتے تھے کہ وہ ایک ایسی جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں جو وہ کبھی بھی جیت نہیں سکتے تھے، اور نہ ہی ایسی گستاخانہ کہ حکمران طبقے کے غضب کو بھڑکا دے۔" اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ "کہ غلام طبقے کو صبر اور جس چیز سے فرار ممکن نہ ہو اس کو بہ رضا و رغبت تسلیم کر لینے کا سبق دیا جاتا تھا۔ مشکلات کا مستقل مزاجی سے سامنا کرنے کی ہدایت دی جاتی تھی تا کہ غلام طبقے کو زندہ اور صحت مند رکھا جا سکے۔"

کبھی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ غلامی نے سیاہ فام خاندانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ لیکن "فیڈرل رائٹرز پروجیکٹ" کے تحت 1930ء میں سابقہ غلاموں سے کیے گئے انٹرویوز مختلف کہانی بیان کرتے ہیں جس کا خلاصہ جارج راوک (فرام سن ڈاؤن ٹو سن اپ) میں یوں بیان کرتا ہے۔ "غلام برادری ایک عمومی سطح پر پھیلے ہوئے رشتہ داری کے نظام کے تحت عمل کرتی تھی، جس میں تمام بالغ افراد تمام بچوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور ان میں یہ تقسیم نہیں پائی جاتی تھی کہ 'یہ میرے بچے ہیں جن کا میں ذمہ دار ہوں، اور یہ تمہارے بچے ہیں جن کے تم ذمہ دار ہو.....' یہ ایک جان اور ایک قالب تھے جیسا کہ ہمیں اس معاشرتی عمل میں نظر آتا ہے جس میں سے امریکہ میں سیاہ فام غرور، سیاہ فام شناخت، سیاہ فام تہذیب، سیاہ فام برادری اور سیاہ فام بغاوت نے جنم لیا۔"

پرانے خطوط اور دستاویزات جو کہ تاریخ دان "ہربرٹ گٹ مین" نے کھنگال کر نکالی ہیں (دی بلیک فیملی ان سلیوری اینڈ فریڈم) ان سے غلام خاندانوں میں خاندان کی ٹوٹ پھوٹ اور بکھرنے کے خلاف ایک ہٹ دھرم اور سرکش مزاحمت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک سیاہ فام غلام عورت نے اپنے بیٹے کو خط لکھا ہے جس سے جدا ہوئے اسے بیس سال گزر چکے تھے "اپنے بڑھاپے میں میں تم سے ملنے کی شدید خواہش رکھتی ہوں۔۔۔اے میرے پیارے بیٹے میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ آؤ اور اپنی پیاری بوڑھی ماں سے ملو۔' کاش میں تم سے شدید پیار کرتی ہوں، تم اپنی ماں سے پیار کرتے ہو۔۔۔تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔"

ایک آدمی اپنی بیوی کو خط لکھتا ہے جسے اس کے بچوں سمیت بیچ دیا گیا تھا۔ "مجھے بچوں کے بال علیحدہ علیحدہ کاغذوں میں لپیٹ کر ان کے نام لکھ کر بھیجو.....میں تم سے اور بچوں سے ملنے کی خاطر دنیا کی ہر معصیت خوشی سے جھیل سکتا ہوں.....'لاورا' میں آج بھی تم سے ویسی ہی محبت کرتا ہوں۔"

غلامی کے بوجھ تلے دبے ہوئے سیاہ فاموں کی جرأت اور قوت پر زور دیتے ہوئے "لارنس لیوائن" (Black Culture and Black Consciousness) کہانیوں اور گیتوں کی شکل میں قبولیت اور بغاوت کے ایک پیچیدہ ملاپ پر مبنی غلاموں کی بھرپور تہذیب کی ایک خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔

> We raise de wheat,
> Dey gib us de corni;
> We back de bread,
> Dey gib us de crust,
> We sif de meal,
> Dey gib us de huss;
> We peal de meat,
> Dey gib us de skin,
> And dat's de way;
> Dey take us in....

مذہبی گیت اکثر ذو معنی ہوتے تھے، اے "کنعان" پیارے کنعان' میں اپنے وطن کنعان جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوں، اس گیت میں کنعان سے مراد شمالی علاقہ تھا جو غلاموں کے لیے آزادی کی سرزمین کنعان کی حیثیت رکھتا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران غلاموں نے نئے مذہبی گیت بنانا شروع کر دیے جن میں زیادہ واضح پیغامات تھے۔

> Before I'd be a slave,
> I'd be buried in my grave,
> And go home to my Lord and be saved.

جبکہ مغربی غلام اپنی آزادی کے انتظار میں تھے، شمال میں آزاد سیاہ فام باشندوں (جو کہ 1830ء میں ایک لاکھ تیس ہزار تھے اور 1850ء میں تقریباً دو لاکھ تھے) نے غلامی کے خاتمے کے لیے مظاہرے اور ہنگامے شروع کر دیے تھے۔ 1829ء میں ڈیوڈ واکر جو کہ ایک غلام کا بیٹا تھا لیکن شمالی کیرولینا میں آزاد پیدا ہوا تھا، بوسٹن آ گیا اور جہاں اس نے پرانے کپڑے بیچنے شروع کر دیے۔ اس نے ''واکرز اپیل'' کے نام سے ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا جو بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اس نے جنوبی علاقے کے غلاموں کے مالکوں کو بہت برانگیختہ کیا، جورجیا نے اس شخص کے لیے جو واکر کو زندہ اس کے حوالے کرے دس ہزار ڈالر اور جو کوئی اسے قتل کر دے اس کے لیے ایک ہزار ڈالر کے انعام کی پیشکش کی۔ جب آپ اس کی اپیل پڑھتے ہیں تو اس انعام کی پیشکش کو سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ سیاہ فاموں کو لازماً اپنی آزادی کے لیے جنگ کرنی چاہیے وہ کہتا ہے:

> ''ہمارے دشمنوں کو اپنی خونریزی اور ظلم و ستم کر لینے دو، انہیں اپنی خواہشات ایک مرتبہ پوری کر لینے دو، اپنی آزادی یا فطری حق کے لیے کوشش نہ کرو.... حتیٰ کہ آپ کو اپنا راستہ صاف نظر آئے۔ جب وہ وقت آ جائے اور آپ آگے بڑھیں تو پھر خوف یا مایوسی کا شکار نہ ہوں.... خدا نے اپنے فضل سے ہمیں دو آنکھیں، دو ہاتھ اور دو پاؤں اور ہماری کھوپڑیوں میں کچھ فہم بھی پیدا کیا ہے، جیسا کہ ان میں.... اور انہیں ہمیں غلام بنانے کا کوئی زیادہ حق حاصل نہیں ہے اتنا ہی حق ہمیں بھی ان کو غلام بنانے کا حاصل ہے.... کوئی شخص خواہ کتنا ہی کنز وریا گھٹیا کیوں نہ ہو اس کی کامیابی کا ایک دن ضرور ہوتا ہے۔ امریکیوں کے دن اب ختم ہو چکے ہیں۔

1830ء کی گرمیوں میں ایک دن ڈیوڈ واکر اپنی دکان کے دروازے پر مردہ حالت میں پایا گیا۔

بہت سے غلامی میں پیدا ہونے والے افراد نے لاکھوں افراد کی تشنہ خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ فریڈرک ڈگلس ایک غلام تھا جسے بالٹی مور میں بحری جہازوں کی گودی پر مزدوری کے لیے بھیجا گیا۔ کسی طرح اس نے لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیا، اور 1838ء میں 21 سال کی عمر میں شمال کی جانب فرار ہو گیا۔ جہاں وہ ایک مقرر، اخبار کے ایڈیٹر اور مصنف کے طور اپنے دور کا مشہور ترین سیاہ فام شخص بن گیا۔

اپنی سوانح عمری ''Narrative of the Life of Frederic Douglass'' میں اس نے اپنی حالت کے بارے میں اپنے بچپن کے ابتدائی خیالات کو تحریر کیا ہے:

> میں کیوں ایک غلام ہوں؟ کیوں کچھ لوگ غلام اور دوسرے آقا ہیں؟ کیا کوئی ایسا وقت بھی تھا جب ایسا نہیں تھا؟ یہ تعلق کس طرح وجود میں آیا؟ جب میں اس جستجو میں لگ گیا تو مجھے اس کا صحیح حل تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دراصل یہ رنگ نہیں بلکہ جرم تھا، خدا نہیں بلکہ

> انسان تھا جس نے غلامی کے وجود کو جنم دیا، اور نہ ہی مجھے دوسری سچائیاں تلاش کرنے میں دیر لگی مثلاً جو چیز انسان بناتا ہے انسان اسے ختم بھی کر سکتا ہے۔
>
> مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس دن سے یہ خیال بڑی شدت سے میرے دل میں گھر کر گیا تھا کہ ایک دن میں آزادی حاصل کر لوں گا۔ یہ خوش کن یقین میری انسانی فطرت کا ایک جبلی خواب تھا۔ غلامی کے لیے ایک مستقل خطرہ.... یہ آزادی کا ایک ایسا الاؤ ہے جسے غلامی قائم کرنے والی تمام طاقتیں سرد کرنے یا بجھانے کی قوت نہیں رکھتیں۔

1850ء کا ''فیوجیٹو سلیو ایکٹ'' (پناہ گزیں غلاموں کا ایکٹ) میکسیکو سے جنگ کے ذریعے حاصل کیے گئے علاقوں کی، غلامی سے پاک ریاستوں کی حیثیت سے، یونین میں شمولیت کے عوض، مغربی ریاستوں کو دی گئی ایک رعایت کے طور پر تھا۔ اس ایکٹ نے غلاموں کے مالکوں کے لیے اپنے سابقہ غلاموں کو پکڑنا یا محض سیاہ فاموں کو پکڑ کر یہ دعویٰ کر دینا کہ یہ مفرور شدہ غلام تھے آسان بنا دیا۔ شمالی سیاہ فاموں نے اس ایکٹ کے خلاف صدر ''فل مور'' جس نے اس پر دستخط کیے تھے اور ''ڈینیل ویبسٹر'' جس نے اس کی حمایت کی تھی کی مذمت کرتے ہوئے مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے ایک جے۔ ڈبلیو۔ لوگیون بھی تھا جو کہ ایک غلام عورت اور اس کے سفید فام مالک کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے مالک کے گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہوا کالج میں داخل ہوا، اور اب ''سائرا کیوس'' نیویارک میں پادری تھا۔ اس نے 1850ء میں اس شہر میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> اب وقت آ گیا کہ تابعداری کے انداز کو سرکشی کے رنگ میں بدل دیا جائے.... اور مسٹر فل مور اور مسٹر ویبسٹر کو واضح طور پر بتا دیا جائے کہ اگر انہوں نے یہ ایکٹ ہم پر لاگو کرنے کی کوشش کی، اور اپنے شکاری کتے ہماری طرف بھیجنے کی کوشش کی.... مجھے آزادی میرے خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور ساتھ ہی اس کی حفاظت کا حکم بھی ملا ہے.... میں اس قانون کا احترام نہیں کرتا.... میں اسے تسلیم نہیں کرتا.... یہ میری حیثیت کو غیر قانونی قرار دیتا ہے.... میں اسے غیر قانونی قرار دیتا ہوں۔

اگلے سال ''سائرا کیوس'' میں ایک مفرور غلام ''جیری'' کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا۔ کروباروں (لوہے کے لٹھ) سے مسلح ایک ہجوم دیواریں توڑ کر عدالت میں جا گھسا اور بندوقیں تانے پہریداروں کا مقابلہ کرتے ہوئے جیری کو آزاد کروا کر لے آیا۔

لوگیون نے ''سائرا کیوس'' میں اپنے گھر کو ''انڈر گراؤنڈ ریل روڈ'' کا ایک اہم سٹیشن بنا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے پندرہ سو غلاموں کی کینیڈا پہنچنے میں مدد کی تھی۔ اس کی غلامی کی سرگزشت اس کی سابقہ مالکہ کی نظر سے گزری، اس نے اسے واپس غلامی میں آنے یا پھر 1,000 ڈالرز زرتلافی ادا کرنے کے

لیے لکھا۔ لوگیون کا جواب غلامی کے خلاف تنظیم کے ایک اخبار "دی لبریٹر" میں شائع ہوا۔

مسز سارا ایگ.... تم نے لکھا ہے کہ تم نے مجھے اپنی قیمت ادا کرنے کی پیشکش کی ہے اور اگر میں نے تمہیں 1,000 ڈالر نہ بھیجے تو تم مجھے بیچ دو گی، اور ایک ہی سانس میں اور تقریباً اسی ایک فقرے میں تم لکھتی ہوں "تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہاری پرورش اس طرح ہی کی تھی جیسے ہم اپنے بچوں کی کرتے ہیں" اے خاتون! کیا تم اپنے بچوں کی پرورش انہیں منڈی میں فروخت کرنے کے لیے کرتی ہو؟ کیا تم ان کی چوکیوں پر کوڑے کھانے کے لیے ان کی پرورش کرتی ہو؟ کیا تم ان کی پرورش اس لیے کرتی ہو ان کو بیڑیاں ڈال کر کھیتوں میں ہانکا جائے؟ تمہیں شرم آنی چاہیے۔

کیا تم جانتی ہو کہ انسانی حقوق باہمی اور مبادل ہوتے ہیں اور اگر تم میری آزادی اور زندگی لیتی ہو تو تمہیں اپنی آزادی اور زندگی بھی گنوانا ہوگی؟ کیا خدا اور قدرت میں کوئی ایسا قانون ہے جو ایک انسان کے لیے ہو اور کسی بھی دوسرے انسانوں کے لیے نہ ہو۔

اگر تم یا میرے جسم اور حقوق کا کوئی دوسرا شے ساز، یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں اپنے حقوق کا کتنا احترام کرتا ہوں، تو اس کے لیے محض اتنا ہی کافی ہے کہ وہ یہاں آئے اور مجھے غلام بنانے کے لیے میری آزادی پر ہاتھ ڈالے۔

تمہارا وغیرہ وغیرہ!

جے۔ ڈبلیو لیگن

فریڈرک ڈگلس جانتا تھا کہ غلامی کا شرمناک فعل صرف مغرب تک ہی محدود نہیں بلکہ پوری قوم اس ساز باز میں شریک ہے۔ 5 جولائی 1852ء کو یوم آزادی پر خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا:

میرے ہم وطن شہریو! تمہاری 4 جولائی ایک امریکی غلام کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ میں اس کا جواب دیتا ہوں، ایک ایسا دن۔ جس دن اسے سال کے تمام باقی دنوں سے بڑھ کر اس ناانصافی اور ظلم کا احساس ہوتا ہے، جس کا وہ مسلسل شکار ہے۔ اس کے لیے تمہاری یہ تقریب مسرت ایک دکھاوا، تمہاری آزادی کی ڈینگیں ایک ناپاک اجازت نامہ: تمہاری قومی عظمت ایک متعفن غرور: تمہارے خوشی کے نعرے کھوکھلے اور بے روح: تمہاری ظلم وستم کی مذمت ایک کھلی بے شرمی: تمہارے آزادی اور برابری کے نعرے محض گھناونا مذاق، گرجوں میں تمہاری دعائیں اور مذہبی گیت تمہارے شکرانے کے خطبے، تمہاری تمام تر مذہبی نمود و نمائش اس کے نزدیک محض کھوکھلی لفاظی، دھوکا، فریب اور منافقت ہے.... ایک باریک نقاب ہے جس کی مدد سے ان جرائم کو ڈھانپنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو وحشیوں کی اس قوم کے لیے بدنامی کا باعث

ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو امریکہ جیسے وحشیانہ اور خونی عمل میں معروف ہو۔

نیٹ ٹرنر کی بغاوت کے بعد جنوب میں کسی سیاہ فام مزاحمت یا بغاوت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ لیکن 1841ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے پتا چلتا ہے کہ بغاوت کی چنگاریاں موجود تھیں۔ "کریول" نامی ایک بحری جہاز پر غلاموں کو لے جایا جا رہا تھا، انہوں نے عملے پر قابو پالیا اور ان میں سے ایک کو مار ڈالا اور برطانوی ویسٹ انڈیز (جہاں 1833ء میں غلامی ختم کر دی گئی تھی) پہنچ گئے۔ برطانیہ نے غلاموں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا (امریکی غلامی کے خلاف برطانیہ میں بہت زیادہ اضطراب پایا جاتا تھا)، اس پر انگلینڈ کے خلاف جنگ کے لیے کانگریس میں بہت زیادہ گرما گرمی ہوئی جس کی سیکرٹری سٹیٹ ڈینیل وبسٹر نے بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کی۔ "دی کلرڈ پیپلز پریس" نے ڈینیل وبسٹر کی شدید مذمت کی اور جنگ انقلاب اور 1812ء کی جنگ کو یاد کرتے ہوئے لکھا: "اگر جنگ کا اعلان کیا گیا.... تو کیا ہم اس حکومت کے دفاع کے لیے لڑیں گے، جس نے ہمیں ملک کی شہریت جیسے اہم اور بنیادی حق سے محروم رکھا ہوا ہے؟...."

جیسے جیسے تناؤ میں اضافہ ہوا، شمال اور جنوب کے سیاہ فام زیادہ سے زیادہ مخاصمت پر اتر آئے۔ 1853ء میں فریڈرک ڈگلس نے کہا:

میں تمہیں اصلاحات کے فلسفے کا بنیادی نقطہ سمجھانا چاہتا ہوں۔ انسانی آزادی میں پیش رفت کی تمام تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس ضمن میں جو بھی عظیم الشان کامیابیاں حاصل کی گئیں وہ تمام کی تمام جدوجہد کا نتیجہ تھیں.... بغیر جدوجہد کے کسی قسم کی پیش رفت ممکن نہیں ہوتی.... غاصب قوتیں بغیر مطالبے کے کسی چیز سے دست بردار نہیں ہوتیں، ایسا آج تک نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہوگا۔

خانہ جنگی سے پہلے کے عشروں میں شمالی نیگروز کے ذہنوں میں غلامی کس طرح ہمیشہ جاگزیں رہی، اس کا اندازہ ہمیں سنسناٹی کے ایک پرائیویٹ سکول کے بچوں سے ہوتا ہے، جسے نیگروز اپنے فنڈز سے چلا رہے تھے۔ بچے اس سوال کا جواب دے رہے تھے: "آپ کس چیز کے بارے میں زیادہ تر سوچتے ہیں؟ سکول کے ریکارڈ میں ہمیں صرف پانچ جواب ملے ہیں، جو کسی طرح سے محفوظ رہے۔ یہ پانچوں کے پانچوں غلامی کے بارے میں ہیں۔ ایک سات سال کے بچے نے لکھا: مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ ایک کشتی.... جو 200 غریب غلاموں کو لاد کر لا رہی تھی، دریا میں ڈوب گئی! اوہ! مجھے یہ خبر سن کر کس قدر صدمہ پہنچا، اس نے میرے دل کو اس قدر غم سے بھر دیا کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک منٹ کے اندر اندر بے ہوش ہو جاؤں گا۔"

تنسیخ غلامی کے حامی سفید فاموں نے بھی تقاریر، اخبارات اور انڈر گراؤنڈ ریل روڈ میں
جرأت مندانہ کارروائیاں کیں۔ تنسیخ غلامی کے حامی سیاہ فام جن کی زیادہ تشہیر نہیں ہوئی، وہ غلامی کے
خلاف تحریک کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ جب گیریسن نے 1831ء میں بوسٹن سے اپنا مشہور اخبار "دالبریٹر"
شائع کیا، تو پہلی نیگروز کنونشن کا انعقاد ہو چکا تھا۔ ڈیوڈ واکر اپنی "اپیل" لکھ چکا تھا اور تنسیخ غلامی کے حامی
سیاہ فاموں کا میگزین "فریڈم جرنل" منظر عام پر آ چکا تھا۔ "لبریٹر" کے پہلے پچیس مستقل خریداروں میں
زیادہ تر سیاہ فام تھے۔

سیاہ فاموں کو مسلسل تنسیخ غلامی کے حامی سفید فاموں کی نادانستہ نسل پرستی کے ساتھ جدوجہد
کرنا پڑی تھی۔ وہ اپنے طور پر اپنے جذبات کا آزادانہ اظہار بھی کرنا چاہتے تھے۔ ڈگلس نے "دی لبریٹر"
کے لیے بھی لکھا، لیکن 1847ء میں اس نے روچیسٹر سے اپنا علیٰحدہ اخبار "دی نارتھ سٹار" نکالنا شروع
کر دیا، جس کے نتیجے میں وہ گیریسن سے علیٰحدہ ہو گیا۔ 1854ء میں نیگروز کی ایک کانفرنس میں اعلان کیا
گیا "... یہ یقیناً ہماری اپنی جنگ ہے، کوئی دوسرا اسے ہمارے لیے نہیں لڑ سکتا.... غلامی کے خلاف "اینٹی
سلیوری" تحریک سے ہمارے تعلقات نئے انداز میں تشکیل پانے چاہئیں۔ بجائے اس پر انحصار کرنے کے
ہمیں خود قیادت سنبھالنی چاہیے۔" بعض سیاہ فام خواتین کو سہ گانہ رکاوٹوں کا سامنا تھا.... ایک غلام
معاشرے میں انسداد غلامی کا حامی ہونا، سفید فام اصلاح کاروں کے درمیان سیاہ فام ہونا، اور اصلاحی
تحریک میں جہاں مردوں کا غلبہ تھا، ایک خاتون ہونا۔ جب 1853ء میں وہ نیو یارک شہر میں منعقد ہونے
والی "نورتھ نیشنل ومنز کنونشن" میں سوجرنر ٹروتھ بولنے کے لیے کھڑی ہوئی تو اسے ان تینوں کا سامنا کرنا
پڑا۔ ہال مخالف ہجوم سے بھرا ہوا تھا انہوں نے آوازے کسے، سیٹیاں بجائیں اور دھمکیاں دینا شروع
کر دیں۔ اس نے کہا "میں جانتی ہوں کہ یہ سیٹیاں بجانا اور آوازے کسنا اس لیے ہے کہ ایک سیاہ فام عورت
تمہیں کچھ بتانے کے لیے کھڑی ہوئی ہے، اور وہ بھی خواتین کے حقوق کے بارے میں.... میں تم لوگوں کے
درمیان سننے کے لیے بیٹھی ہوئی ہوں، اور گاہے بگاہے میں آ کر آپ کو بتاتی رہوں گی کہ رات کے کتنے بج
چکے ہیں۔"

نیٹ ٹرنر کی بغاوت اور تشدد و بربریت کے ذریعے اسے دبانے کے بعد مغرب میں
حفاظتی انتظامات انتہائی سخت کر دیے گئے تھے۔ اب صرف کوئی باہر کا آدمی ہی بغاوت کی ابتداء کا
سوچ سکتا تھا۔ اور اس خوفناک جرأت اور ارادے کا مالک ایک سفید فام جان براؤن تھا۔ اس نے
ورجینیا "ہارپر فیری" میں وفاقی اسلحہ خانہ پر قبضہ کرنے اور پھر وہاں سے جنوبی علاقوں میں غلاموں
کی بغاوت کی ابتداء کرنے کا انوکھا منصوبہ تیار کیا۔

پانچ فٹ کی "ہیریٹ ٹبمن" جو کہ غلاموں کو آزادی دلانے کے بے شمار خفیہ منصوبوں کی راہنمائی

کر چکی تھی، جان براؤن کے ساتھ شریک تھی۔ لیکن بیماری کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ شامل نہ ہو سکی۔
فریڈرک ڈگلس نے بھی براؤن سے ملاقات کی تھی۔ اس نے اس منصوبے کی مخالفت کی کیونکہ اس میں
کامیابی کے امکانات بہت معدوم تھے، لیکن اس نے سفید بالوں والے ساٹھ سالہ لمبے، دبلے پتلے اور بیمار
شخص کی جرأت اور جذبے کی تعریف کی۔

ڈگلس کی رائے درست تھی، منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ مقامی ملیشیا نے نیوی کے جوانوں کے
ساتھ باغیوں کا گھیراؤ کر لیا، جس کی کمان "رابرٹ ای، لی" کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کے آدمی مارے گئے یا
گرفتار کر لیے گئے، براؤن نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے آپ کو اسلحہ خانہ کے گیٹ کے
نزدیک ایک چھوٹی سی اینٹوں کی عمارت میں محصور کر لیا۔ سپاہیوں نے دروازے کو گرزوں کی مدد سے توڑ
دیا اور بحریہ کا لیفٹیننٹ اندر داخل ہوا اور براؤن پر اپنی تلوار سے وار کیا۔ زخمی اور بیماری کی حالت میں اس
سے سوالات پوچھے گئے۔ ڈبلیو، ای، بی ڈوبوائس اپنی کتاب "جان براؤن" میں لکھتا ہے:

صورت حال کی منظر کشی: ایک بوڑھا خون کے چھینٹوں سے بھرا ہو شخص، چند گھنٹے
پہلے لگے ہوئے زخموں کی وجہ سے نیم مردہ، سردی میں زمین پر لیٹا ہوا ایک آدمی، پچھلے پینتالیس
اذیت ناک گھنٹوں سے جاگا ہوا، بالکل نگاہوں کے سامنے دو بیٹوں کی لاشیں پڑی ہوئیں،
سات ساتھیوں کی لاشیں دور اور نزدیک بکھری پڑیں، ایک بیوی اور غمزدہ خاندان، اور زندگی کا
آخری مقصد اور نصب العین سینے کے اندر مردہ پڑا ہوا۔

اس حالت میں لیٹے ہوئے براؤن نے گورنر ورجینیا کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے
کہا "بہتر ہے کہ تم جنوب کے تمام لوگ، اپنے آپ کو اس سوال کے منصفانہ جواب کے لیے تیار کریں... تم
مجھے بڑی آسانی سے ختم کر سکتے ہو۔ میں تقریباً اپنے خاتمے کے نزدیک ہوں، لیکن یہ سوال اب بھی حل
طلب ہے۔ میرا اشارہ نیگرو مسئلے کی جانب ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کیا اس کے خاتمے کا وقت ابھی نہیں آیا۔

رالف والڈو ایمرسن، جو کہ خود کوئی انقلابی کارکن ہرگز نہیں تھا، نے جان براؤن کی پھانسی پر کہا
تھا: "وہ تختہ دار کو صلیب کی طرح مقدس بنا دے گا۔"

جان براؤن کی پچیس افراد پر مشتمل حملہ آور فوج میں سے پانچ سیاہ فام تھے۔ ان میں سے
دو موقعہ پر مارے گئے، ایک فرار ہو گیا اور دو پکڑے گئے جنہیں حکام نے پھانسی دے دی۔ اپنی پھانسی سے
پہلے جان کوپ لینڈ نے اپنے والدین کو لکھا: "یاد رکھیں کہ موت تو ہر شخص کو آنی ہے، میں اپنے ان چند غریب
اور کچلے ہوئے بھائیوں کی آزادی کی خاطر موت کو گلے لگا رہا ہوں، جو غلامی کی چکی میں پس رہے ہیں، جس
کی خداوند نے اپنی مقدس انجیل میں شدید مذمت کی ہے.... میں تختہ دار سے بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوں"
جان براؤن کو ورجینیا کی ریاست نے قومی حکومت کی منظوری سے پھانسی کی سزا دی۔ یہ قومی

حکومت ہی تھی جس نے غلاموں کی تجارت کے خاتمے کے قانون کے نفاذ میں نرمی برتی، لیکن پناہ گزین غلاموں کو واپس غلامی میں لے جانے کے قانون پر سختی سے عمل کروایا۔ یہ قومی حکومت ہی تھی جس نے اینڈریو جیکسن کی انتظامیہ کے تحت تنسیخ غلامی کے حامیوں کے لٹریچر کو مغرب میں داخل ہونے سے روکے رکھا۔ یہ امریکہ کی سپریم کورٹ تھی جس نے فیصلہ دیا، کہ غلام ڈریڈ سکاٹ اپنی آزادی کا مقدمہ دائر نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ کوئی شخص نہیں بلکہ ملکیت ہے۔

ایسی حکومت بغاوت کے ذریعے غلامی کے خاتمے کو کبھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔ یہ صرف ایسی شرائط پر ہی غلامی کا خاتمہ قبول کر سکتی تھی، جو سفید فاموں کو قابل قبول ہوں، اور صرف اس وقت جب یہ شمال کی تاجر اشرافیہ کی سیاسی اور معاشی حاجات کی ضرورت ہو۔ یہ ابراہام لنکن تھا جس نے کاروباری ضروریات، نئی ری پبلکن پارٹی کے سیاسی عزائم اور انسانیت دوستی کے خوبصورت جذبے کو بڑے ہوشیاری کے ساتھ یکجا کر دیا۔ اس نے تنسیخ غلامی کو اپنی ترجیحات کی فہرست میں سب سے اوپر جگہ نہیں دی تھی لیکن اس کے لگ بھگ ہی رکھا، تا کہ اس کو تنسیخ غلامی کے حامیوں کے دباؤ اور عملی سیاسی فائدے کے پیش نظر عارضی طور سر فہرست بھی جگہ دی جا سکے۔

لنکن بہت زیادہ دولتمند افراد کے مفادات اور سیاہ فاموں کے مفادات کو تاریخ کے ایسے موڑ پر جب یہ مفادات آپس میں مل رہے تھے بڑی چابکدستی سے یکجا کر سکتا تھا۔ اور وہ ان دونوں کے مفادات کو امریکہ کے پھیلتے اور پھولتے ہوئے معاشی طور پر اولوالعزم اور سیاسی طور پر سرگرم سفید فام متوسط طبقے کے مفادات کے ساتھ جوڑ سکتا تھا۔ جیسا کہ رچرڈ ہاف سٹیڈر کہتا ہے:

> اس کے ذہن میں مکمل طور پر درمیانہ طبقہ تھا، اس نے ان لاکھوں امریکیوں کی بات کی جنہوں نے تنخواہ دار کارکنوں کے طور پر اپنی زندگیوں کا آغاز کیا، جن میں کھیتوں میں کام کرنے والے، کلرک، اساتذہ، مکینکس، مال بردار کشتیاں چلانے والے، لکڑیاں چیرنے والے شامل تھے۔ اور اب وہ اپنی جدوجہد سے آگے بڑھتے ہوئے چھوٹے زمیندار، خوشحال دکان دار، تاجر، طبیب اور سیاستدان بن چکے تھے۔

لنکن عملی سیاست میں ایک محتاط رویے کے ساتھ غلامی کے خلاف بڑی وضاحت اور جذبے کے ساتھ اخلاقی بنیادوں پر بات کر سکتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ''غلامی کا ادارہ ناانصافی اور بری پالیسی پر قائم کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے خاتمے کے لیے کی گئی کوششیں اس کے بد اثرات کو کم کرنے کے بجائے مزید اضافے کا سبب بنتی ہیں۔''

لنکن نے پناہ گزین غلاموں کے قانون ''فیوجیٹو سلیو لاء'' کی کھلم کھلا مذمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک دوست کو لکھا: ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان بے بس لوگوں کو اس طرح سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر

نکالنے سے مجھے سخت نفرت ہے.... لیکن میں اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا لیتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں۔''

اور جب اس نے 1849ء میں ایک کانگریس مین کی حیثیت سے کولمبیا کی ڈسٹرکٹ میں غلامی کو ختم کرنے کی قرارداد پیش کی تو اس کے ساتھ ایک شق شامل کی تھی جس کے مطابق مقامی حکام کو واشنگٹن میں پناہ لینے والے غلاموں کو گرفتار کر کے واپس بھجوانے کا اختیار دینے کو کہا گیا تھا۔ (اس وجہ سے بوسٹن کے ایک تنسیخ غلامی کے حامی وینڈل فلپس نے کئی سال بعد اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے ''ایلینائس سے غلاموں کا شکاری'' کہا تھا''۔) وہ غلامی کی مخالفت کرتا تھا، لیکن سیاہ فاموں کو برابری کی سطح پر نہیں دیکھ سکتا تھا، لہٰذا اس کا نظریہ ہمیشہ رہا تھا کہ غلاموں کو آزاد کر کے واپس افریقہ بھیج دیا جائے۔

1858ء میں سٹیفن ڈگلس کے ساتھ سینیٹ کے انتخابات کی مہم میں وہ اپنے سامعین کے نظریات کے مطابق (اور شاید اس بات کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے کہ انتخابات میں کتنا عرصہ باقی رہ گیا ہے) مختلف جگہوں پر مختلف باتیں کرتا رہا، جولائی کے مہینے میں شمالی ایلینائس (شکاگو) میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا:

> آیئے، ہم ایسی باتیں کرنا اور بال کی کھال اتارنا چھوڑ دیں کہ یہ آدمی یا وہ آدمی، یہ نسل یا وہ نسل یا وہ دوسری نسل کمتر ہے، لہٰذا انہیں کمتر درجے پر ہی رکھنا چاہیے۔ آیئے ان سب باتوں کو ترک کرتے ہوئے اس پوری سرزمین پر ایک قوم کی طرح متحد ہو کر رہنا شروع کریں، تا کہ ہم ایک مرتبہ پھر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر سکیں کہ تمام آدمی برابر پیدا کئے گئے ہیں۔

اس کے دو ماہ بعد جنوبی ایلینائس میں ''چارلسٹن'' میں تقریر کرتے ہوئے لنکن نے اپنے سامعین سے کہا:

> میں یہ بتایا چاہوں گا میں کسی بھی صورت میں سفید فام اور سیاہ فام نسلوں کی سماجی اور سیاسی برابری کے حق میں نہیں ہوں، اور نہ کبھی تھا (تالیاں اور نعرے)؛ اور میں کبھی بھی اس کے حق میں نہیں اور نہ رہا ہوں کہ نیگروز کو ووٹرز یا جیوری کے رکن بنایا جائے، اور نہ ہی انہیں کسی سرکاری عہدے کا اہل قرار دینے کے حق میں ہوں، اور نہ ہی سفید فام لوگوں سے ان کی شادیوں کو جائز خیال کرتا ہوں۔
>
> اور جب کہ وہ اس طرح نہیں رہ سکتے، جب کہ انہوں نے ہمارے ساتھ رہنا ہے تو پھر اعلیٰ اور کمتر کی حیثیت کا ہونا ضروری ہے، اور کسی بھی دوسرے شخص کی طرح میں اس بات کے حق میں ہوں کہ اعلیٰ حیثیت صرف سفید فاموں کو حاصل ہونی چاہیے۔

1860ء میں نیو ری پبلکن پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے لنکن کے صدر منتخب ہونے کے بعد جنوب کی یونین سے علیحدگی کے پس پشت جنوب اور شمال کی پالیسیوں میں مخاصمت کا ایک لمبا سلسلہ کار

فرماتھا۔ شمالی اشرافیہ، آزاد زمینوں، آزاد مزدوروں، اور آزاد منڈی اور صنعت کاروں کے تحفظ کے لیے بلند شرح محصول (درآمدات پر) کے ذریعے معاشی پھیلاؤ چاہتی تھی۔ جنوب کے غلاموں کے مالکان کے مفادات ان سب سے ٹکراتے تھے، وہ لنکن اور ری پبلکن کو ایسا عنصر خیال کرتے تھے جو مستقبل میں ان کی خوشگوار اور خوشحال طرز زندگی کے تسلسل کو ناممکن بنا رہا تھا۔

لہٰذا جب لنکن صدر منتخب ہوا تو سات جنوبی ریاستوں نے یونین سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لنکن نے جنوبی کیلیفورنیا میں "فورٹ سمٹر" میں وفاقی مستقر پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دشمنوں کو مزید ہوا دے دی اور چار مزید ریاستیں علیحدہ ہو گئیں۔ کنفیڈریشن تشکیل دی گئی اور سول وار شروع ہو گئی۔

مارچ 1816ء میں لنکن کا پہلا افتتاحی خطاب صلح جویانہ تھا "میرا غلامی کے ادارے میں جن ریاستوں میں یہ قائم ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ مداخلت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایسا کرنے کا کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" اور جنگ شروع ہونے کے چار ماہ بعد جب میسوری میں جنرل جان سی۔ فری مونٹ نے مارشل لاء کا اعلان کیا اور کہا کہ امریکہ کے خلاف مزاحمت کرنے والے مالکوں کے غلام آزاد کر دیے جائیں گے، تو لنکن نے اس کے حکم منسوخ کر دیا۔ وہ غلاموں والی ریاستوں میری لینڈ، کینٹکی، میسوری، اور ڈیلاویر کو یونین میں شامل رکھنے کا شدید خواہاں تھا۔

جب جنگ زیادہ شدت اختیار کر گئی، اموات بہت زیادہ ہو گئیں، جنگ جیتنے کا جنون حد سے بڑھ گیا اور تنسیخ غلامی کے حامیوں کی تنقید نے لنکن کے پس پشت ٹوٹے پھوٹے اتحاد کو خطرے میں ڈال دیا تو اس وقت لنکن نے غلامی کے خلاف عمل شروع کیا۔ ہوفس ٹیڈر اس بات کو یوں بیان کرتا ہے: "ایک حساس بیرومیٹر کی طرح وہ دباؤ کے رجحان کو ریکارڈ کرتا تھا، اور جب بنیادی تبدیلیوں کا دباؤ بڑھ گیا تو اس نے بھی اپنا رخ بائیں جانب کر لیا۔"

شمال میں نسل پرستی کی جڑیں اتنی ہی مضبوط تھیں جتنی کہ جنوب میں غلامی کی، اور جنگ نے ان دونوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ نیویارک کے سیاہ فام اس وقت تک ووٹ نہیں دے سکتے تھے جب تک ان کے پاس 250 ڈالر کی جائداد نہ ہو (یہ ایک ایسی شرط تھی جو سفید فاموں پر لاگو نہیں ہوتی تھی) اس کو ختم کرنے کے لیے 1860ء میں ایک تجویز پر رائے شماری کروائی گئی، لیکن اسے ایک کے مقابلے میں دو سے رد کر دیا گیا تھا۔

وینڈل فلپس، لنکن پر اپنی تمام تر تنقید کے باوجود اس کے منتخب ہونے کے امکانات کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کے منتخب ہونے کے دوسرے دن بوسٹن میں ٹریمونٹ ٹیمپل میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا:

> اگر ٹیلی گراف سچ بولتی ہے تو تاریخ میں پہلی مرتبہ غلام کو امریکہ کا صدر چنا گیا ہے۔ وہ تنسیخ غلامی کا حامی نہیں ہے، بمشکل ہی غلامی کے خلاف ہوگا، لیکن مسٹر لنکن غلامی

> کے خلاف نظریے کو تسلیم ضرور کرتا ہے۔ وہ سیاسی شطرنج میں ایک پیادہ ہے۔ اس کی اہمیت اس کی حیثیت میں ہے، تھوڑی سی کوشش سے ہم اس کو جلد فیل یا ملکہ میں تبدیل کر سکتے ہیں اور بازی جیت سکتے ہیں (نعرے اور تالیاں)۔

جنگ شروع کے ہونے کے بعد بھی ہمیں کانگریس کی اصل روح اس قرارداد میں نظر آتی ہے جو 1816ء کے موسم گرما میں پاس کی گئی، اس کے خلاف چند ایک گنتی کے ووٹ ڈالے گئے: "یہ جنگ.... ان ریاستوں میں قائم اداروں میں مداخلت یا ان کے خاتمے کے لیے نہیں شروع کی گئی۔ اس کا مقصد یونین کا تحفظ ہے۔"

تنسیخ غلامی کے حامیوں نے اپنی مہم تیز کر دی۔ 1861ء اور 1862ء میں ہر طرف سے غلاموں کی آزادی کے لیے آنے والی عرض داشتوں کے کانگریس میں انبار لگ گئے۔ وینڈل فلپس نے کہا: "ہو سکتا ابراہام لنکن یہ نہ چاہتا ہو.... نیگرو زگراری کے دندانے میں پھنسا ہوا وہ کنکر ہیں جسے نکالے بغیر مشین چل نہیں سکتی۔"

جولائی 1862ء میں کانگریس نے "کانفسکیشن ایکٹ" پاس کیا، جس کے مطابق یونین کے خلاف لڑنے والوں کے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن یونین کے جنرلز نے اس کا اطلاق نہ ہونے دیا، اور اس کے اطلاق نہ ہونے کو لنکن نے نظر انداز کر دیا: "نیویارک ٹریبیون" کے ایڈیٹر ہوریس گریلے نے لنکن کے نام ایک کھلا خط شائع کیا جس میں اس نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے لکھا: "آپ کے حامی آپ سے بددل اور ناراض ہو رہے ہیں، کیونکہ جمہوریہ کے خادم اول کی حیثیت سے آپ پر جو قانون کے اطلاق کا خاص اور فائق فرض سونپا گیا ہے اس کو نباہنے میں آپ عجیب اور تباہ کن طور پر کوتاہی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، میرا اشارہ نئے کانفسکیشن ایکٹ کی آزادی سے متعلق شقوں کی جانب ہے.... ہم سمجھتے ہیں کہ آپ ناجائز طور پر سرحدی غلام ریاستوں سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں کے زیر اثر آئے ہوئے ہیں۔"

گریلے نے جنگ جیتنے کی عملی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا: "ہمیں جنوب کے سیاہ فاموں سے سکاؤٹس، گائیڈز، جاسوسوں، ٹرک ڈرائیوروں، کھدائی کرنے والوں، درخت کاٹنے والوں کی ضرورت ہے خواہ ہم انہیں اپنے لیے لڑنے دیں یا نہ دیں.... میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ملک کے قانون کی دلی طور پر اور غیر جانبدارانہ طور پر تعمیل اور پابندی کی جائے۔"

لنکن نے گریلے کو جواب دیا:

> محترم جناب!.... میں کسی کو شک میں نہیں رہنے دینا چاہتا.... اس جدوجہد میں میرا سب سے اہم مقصد یونین کو بچانا ہے اور غلامی کو بچانا یا ختم کرنا نہیں، اگر میں کوئی غلام آزاد کیے بغیر اسے بچا سکا تو میں یہ کروں گا۔ اگر میں اسے سارے غلام آزاد کر کے بچا سکا تو

میں یہی کروں گا.... میں نے یہاں اپنا مقصد اپنے سرکاری فرض کے مطابق بیان کیا ہے۔ اور میں اپنے ذاتی موقف میں کسی قسم کی ترمیم یا تبدیلی نہیں چاہتا کہ ہر انسان، ہر جگہ آزاد ہونا چاہیے۔

جب ستمبر 1862ء میں لنکن نے غلاموں کی آزادی کا ابتدائی اعلان کیا تھا۔ تو یہ دراصل ایک فوجی چال تھی، جس میں جنوب کو یہ دھمکی دیتے ہوئے کہ اگر انہوں نے جنگ جاری رکھی تو ان کے غلاموں کو آزاد کر دیا جائے گا اور ان ریاستوں میں غلامی کے ادارے میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی جو شمال سے اتحاد کر لیں، بغاوت ختم کرنے کے لیے چار ماہ دیئے گئے تھے۔

لہٰذا جب یکم جنوری 1863ء میں غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا گیا تو اس میں ان علاقوں کے غلاموں کو آزاد کرنے کا اعلان کیا گیا جو ابھی تک یونین کے خلاف لڑ رہے تھے (جس میں ان کی فہرست بڑی احتیاط سے تیار کی گئی)، اور یونین کی سرحدوں کے اندر غلاموں کے بارے میں کچھ بھی نہ کہا گیا۔

اگرچہ غلامی کے خاتمے کا یہ اعلان ایک محدود سطح تک تھا، لیکن اس نے غلامی کے خاتمے کے حامیوں کو مہمیز لگا دی اور 1864ء کے موسم گرما میں غلامی کے خاتمے کے لیے قانون سازی کا مطالبہ کرتے ہوئے 400,000 دستخطوں کے ساتھ ایک یادداشت کانگریس کو بھجوائی گئی۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی مثال ملک کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ اس سال اپریل کے مہینے میں سینیٹ نے تیرہویں ترمیم منظور کی جس کے مطابق ملک سے غلامی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اور جنوری 1965ء میں ایوان نمائندگان نے بھی اس کی توثیق کر دی۔

اس اعلان کے ساتھ ہی یونین کی فوج سیاہ فاموں کے لیے کھول دی گئی۔ اور زیادہ سے زیادہ سیاہ فام جنگ میں شامل ہو گئے اور اب یہ جنگ ان کی آزادی کی زیادہ نظر آنے لگی تھی۔ جنگ میں اب تک بہت زیادہ سفید فام قربانیاں دے چکے تھے اور اس حوالے بہت سے زیادہ غم و غصہ پایا جاتا تھا خاص طور پر شمال کے غریب سفید فاموں میں جن کو ایک ایسے قانون کے تحت فوج میں بھرتی کیا گیا تھا، جس کے مطابق امیر سفید فام 300 ڈالر دے کر فوج میں بھرتی ہونے سے بچ سکتے تھے۔ اس کے نتیجے میں فوج میں زبردستی بھرتی کے خلاف 1863ء کے ہنگامے پھوٹ نکلے۔ شمالی شہروں کے غریب سفید فام اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کا نشانہ امیر سفید فام نہیں بلکہ سیاہ فام تھے، جو ان کے قرب و جوار میں رہتے تھے۔

یہ موت اور تشدد کی ایک بدمستی تھی۔ ڈیٹرائٹ میں رہنے والے ایک سیاہ فام نے جو کچھ دیکھا اسے وہ یوں بیان کرتا ہے۔ "ایک ہجوم تھا جنہوں نے چھکڑوں پر بیئر کے پیپے لادے ہوئے تھے اور ڈنڈوں اور اینٹوں سے مسلح تھے۔ وہ شہر میں گھوم رہے تھے اور سیاہ فام مردوں، عورتوں اور بچوں پر حملے کر رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا، اگر ہم نے نیگروز کے لیے مرنا ہے تو پھر ہم اس شہر میں

نیگروکو مار ڈالیں گے۔"

یہ سول وار (خانہ جنگی) انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ خونریز جنگ تھی اس وقت تک دونوں اطراف سے تین کروڑ کی آبادی میں سے چھ لاکھ آدمی مارے جا چکے تھے، یہ تعداد 1990ء میں امریکہ کی پچیس کروڑ کی آبادی میں سے پچاس لاکھ کے برابر تھی۔ جیسے جیسے جنگ شدت اختیار کرتی گئی، اموات میں اضافہ ہوتا چلا گیا، جنگ سے اکتاہٹ اور تھکاوٹ بڑھتی گئی اور سینکڑوں ہزار غلام زرعی فارموں سے فرار ہونے لگے، جنوب میں 40 لاکھ سیاہ فام ایک بڑی قوت بن چکے تھے، جسے کوئی ایک فریق، جو چاہے استعمال کر سکتا تھا۔

ڈوبوئس اس صورتحال کو "بلیک ری کنسٹرکشن" میں یوں بیان کرتا ہے۔ "یہ ایک سیدھا سادا تبادل تھا جس نے "لی" کو فوری طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، یا تو جنوب غلاموں کو انہیں آزاد کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے شمال کے خلاف لڑنے کے لیے استعمال کرتا، یا پھر وہ شمال کے آگے اس امید پر ہتھیار ڈال دیتا کہ جنگ کے بعد شمال غلامی کے دفاع میں ان کی مدد کرے گا، جیسا کہ پہلے کر چکا تھا۔ سیاہ فام خواتین نے جنگ میں خاص طور پر اس کے اختتام کے نزدیک بہت اہم کردار ادا کیا۔ سوجورنر ٹروتھ یونین کی فوج کے لیے سیاہ فاموں کو بھرتی کرنے میں سرگرم رہی اور بوسٹن کی جوزفین سینٹ پیری رافن نے بھی اس میدان میں اہم خدمات انجام دیں، ہیریٹ ٹبمن سیاہ فام اور سفید فام فوجیوں کی قیادت کرتے ہوئے زرعی فارموں پر حملے کرتی رہی اور ایک ایسی ہی مہم میں اس نے 750 غلام رہا کروائے۔

کہا جاتا ہے کہ سیاہ فاموں کا غلامی کو قبول کرنا اس حقیقت سے عیاں ہوتا ہے کہ خانہ جنگی کے دوران جب فرار ہونے کے بہت سے مواقع موجود تھے زیادہ تر غلام زرعی فارموں ہی میں رہے۔ حقیقت میں پانچ لاکھ غلام فرار ہوئے جو کہ تقریباً پانچ میں سے ایک کا تناسب تھا۔ یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے اگر ہم اس بات کو مدنظر رکھیں کہ بھاگ کر کہیں جانے اور زندگی بسر کرنے میں بہت سی مشکلات حائل تھیں۔

1865ء میں جنوبی کیرولینا کے ایک باغات کے کاشت کار نے "نیویارک ٹریبیون" میں لکھا:

> ہمارے معاملات کے آخری بحران میں نیگروز کے طرز عمل نے مجھے قائل کر دیا ہے کہ ہم سب ایک فریب اور مغالطے کے تحت ہی کوشش کر رہے تھے.... میں پختہ طور پر یہ سمجھتا تھا، کہ یہ لوگ مطمئن اور خوش ہیں اور اپنے مالکوں کے ساتھ لگاؤ رکھتے ہیں۔ لیکن واقعات اور حالات نے مجھے اپنے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اگر وہ مطمئن، خوش اور اپنے مالکوں سے وابستہ تھے تو وہ ان کو ضرورت کے وقت چھوڑ کر کیوں بھاگ گئے، اور دشمن کے ساتھ جا ملے، گویا کہ وہ جانتے تک نہیں تھے۔ اور اس طرح شاید انہوں نے بہت اچھے مالکوں کو چھوڑ دیا، جن کو وہ پیدا ہونے کے وقت سے جانتے تھے۔

جنگ نے غلاموں کی کسی عمومی بغاوت کو جنم نہ دیا، لیکن مسیسیپی، ارکنساس، اور کینٹکی کے بعض حصوں میں باغات کو تباہ و برباد کیا یا ان پر قبضہ کر لیا۔ دو لاکھ سیاہ فام فوج اور نیوی میں شامل ہو گئے، اور اڑتیس ہزار مارے گئے۔ تاریخ دان "جیمز میک فیرسن" لکھتا ہے: ''ان کی مدد کے بغیر شمال جنگ اتنی جلدی نہیں جیت سکتا تھا اور شاید کبھی بھی نہیں جیت سکتا تھا۔''

جنگ کے دوران یونین کی فوج میں اور شمالی شہروں میں جو کچھ سیاہ فاموں کے ساتھ ہوا اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ کنفیڈریسی پر مکمل فتح کے بعد بھی ان کی آزادی کس قدر محدود تھی۔ شمالی شہروں میں ان سیاہ فام فوجیوں پر حملے کیے جاتے تھے، جو ڈیوٹی پر نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ زینس ویلی اور اوہایو جیسے شہروں میں اکثر یہ نعرے سننے میں آتے تھے "نیگروز کو مار ڈالو"۔ سیاہ فام فوجیوں کو بھاری اور گندے کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جیسے کہ مورچے کھودنا لکڑی کے شہتیروں اور توپوں کو کھینچنا، اسلحہ لادنا، اور سفید فام رجمنٹوں کے لیے کنویں کھودنا وغیرہ۔ سفید فام کو 13 ڈالر ماہانہ دیئے جاتے تھے جبکہ نیگروز کو دس ڈالر ماہانہ ادا کیے جاتے تھے۔ جون 1864ء میں کانگریس نے نیگروز سپاہیوں کے لیے مساوی تنخواہ کا قانون پاس کیا۔

پے در پے فوجی شکستوں کے بعد وفاق کے سیکرٹری جنگ جوڈا بنجمن نے 1864ء کے آخر میں چارلسٹن میں ایک اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا "یہ بات سب کے علم میں ہے جنرل لی۔ نیگروز کو دفاع کے لیے استعمال کرنے اور اس مقصد کے لیے اگر ضروری ہو تو ان کو آزادی دینے کی ہماری پالیسی کے مکمل طور پر حق میں ہے۔" ایک بہت زیادہ برہم جنرل نے لکھا" اگر غلام اچھے فوجی ثابت ہو سکیں گے تو پھر غلامی کا ہمارا سارا نظریہ غلط ہے۔"

1865ء کے آغاز میں دباؤ بہت زیادہ بڑھ چکا تھا اور مارچ میں کنفیڈریسی کے صدر ڈیوس نے "نیگروز سولجر لاء" پر دستخط کر دیئے جس کے مطابق ایسے غلاموں کے نام باقاعدہ طور پر فوج میں درج کرنے کی اجازت مل گئی جن کو ان کے مالکوں اور ریاستوں کی رضامندی سے آزادی مل چکی تھی۔ لیکن بیشتر اس کے کہ اس کے کوئی اہم اثرات مرتب ہوں جنگ ختم ہو گئی۔

1930ء کی دہائی میں "فیڈرل رائٹرز پروجیکٹ" کے لیے گئے سابقہ غلاموں کے انٹرویوز میں جنگ کے اختتام کی یادداشتیں بیان کی گئی ہیں۔ سوی ملٹن کہتی ہے:

> میں تقریباً دس سال کی بچی تھی اور میں نے سنا کہ لنکن نیگروز کو آزاد کرنے والا ہے۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور اس رات بہت زیادہ ٹھنڈ تھی، لیکن ہر کوئی روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ کسی کو یہ پروا نہیں تھی کہ مسیس (مسیسیپی) یونین کے ساتھ اتحاد کر رہا ہے۔ اور ساری رات نیگروز باہر سخت سردی میں ناچتے اور گاتے رہے۔ اگلی صبح پو پھٹتے ہی ہم کمبل، کپڑے، برتن اور دیگچیاں، اور چوزے اپنی کمروں پر لادے چل پڑے.... اور جیسے ہی

> درختوں کے پیچھے سے سورج طلوع ہوا نیگروز نے گانا شروع کر دیا:
>
> سورج، تم یہاں رہو اور میں چلا جاؤں گا
> سورج، تم یہاں رہو اور میں چلا جاؤں گا
> سورج، تم یہاں رہو اور میں چلا جاؤں گا

اینا وڈز یاد کرتے ہوئے بتاتی ہے:

> ہمیں ٹیکساس آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، جب وہاں فوج داخل ہوئی اور ہمیں بتایا کہ تم سب آزاد ہو..... مجھے ایک عورت یاد ہے جو چھلانگ مار کر ایک بیرل پر چڑھی اور نعرہ لگایا، بیرل سے نیچے کودی اور نعرہ لگایا، دوبارہ چھلانگ لگا کر اوپر چڑھی اور نیچے کودی اور نعرے مارتی رہی..... وہ کافی دیر یہ عمل کرتی رہی چھلانگ لگا کر بیرل پر چڑھتی پھر نیچے کود جاتی، اس کی خوشی دیدنی تھی۔

''اینی سے ویدر'' کہتی ہے:

> ''مجھے یاد ہے جب کوئی شخص آیا اور اس نے چلاتے ہوئے کہا" تم نیگرو آخر کار آزاد ہو گئے ہو! تو اس نے اپنا کھرپا نیچے پھینکا اور عجیب سی آواز میں کہا" اس کے لیے ہم خدا کے شکر گزار ہیں"

ایک سابقہ غلام فینی بیری کہتی ہے؟

> نیگروز نعرے لگا رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور گیت گا رہے تھے، چیلن ہر جگہ بھاگا پھر رہا تھا اور گاتا پھر رہا تھا ہر شخص خوش تھا، "شو" بھاگ کر باورچی کی طرف گیا اور کھڑکی میں سے چلا کر کہا: ''ماں اب آپ کو ہر وقت کھانا نہیں بنانا پڑے گا، تم آزاد ہو! تم آزاد ہو!''

اکثر نیگروز سمجھتے تھے کہ قانونی طور ان کی حیثیت کچھ بھی ہو، ان کی اصل حیثیت کا انحصار اس بات پر ہو گا کہ آیا وہ ان زمینوں کے مالک بن سکیں گے جن پر وہ کام کرتے رہے تھے یا انہیں دوسروں کا نیم غلام بننے پر مجبور کر دیا جائے گا۔

تاہم چھوڑے گئے زرعی فارم اور باغات سابقہ کاشتکاروں اور شمال کے سفید فاموں کو پٹے پر دے دیئے گئے۔ جیسا کہ ایک سیاہ فاموں کے اخبار نے لکھا: ''سیاہ فاموں کو زرعی غلام بنا دیا گیا جو ان زرعی فارموں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے.... یہ تھی وہ آزادی جو یانکیوں (شمالی امریکیوں) نے سیاہ فاموں کو عطا کی اور جس کی بہت ڈینگیں ماری گئی تھیں۔''

کانگریس کی پالیسی کے تحت جس کی لنکن نے توثیق کی تھی: ''کانفسکیشن ایکٹ 1862ء'' کے

تحت ضبط کی گئی جائداد کنفیڈریٹ مالکان کے ورثا کو واپس سونپ دی گئی۔ بوسٹن میں ایک سیاہ فام فزیشن ڈاکٹر جان راک نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "حقیقت میں یہ غلام ہیں جن کی تلافی ہونی چاہیے، جنوب کی جائداد غلاموں کا حق ہے اور ان کو ملنی چاہیے۔"

جنوبی کیرولینا کے سمندری جزائر میں مارچ 1863ء میں 16,000 ایکڑ زمین برائے فروخت تھی، کچھ آزاد ہونے والے غلام رقم جمع کر کے 2,000 ایکڑ خریدنے میں کامیاب ہوئے، باقی ماندہ زمین سرمایہ کاروں اور سٹہ بازوں نے خرید لی۔ ان جزائر پر آزاد ہونے والے ایک غلام نے اپنی ایک سابقہ ٹیچر کو ایک خط لکھواتے ہوئے کہا: "پیاری مس! لنکن سے کہو کہ ہم زمین چاہتے ہیں۔ بالکل یہی زمین جو کہ ہمارے چہرے کے پسینے اور کمر کے خون سے زرخیز ہے...."

ایک سابقہ غلام تھامس ہال نے "فیڈرل رائٹر پروجیکٹ" کو بتایا: "لنکن نے ہمیں آزاد کرنے کی تحسین و تعریف سمیٹی ہے، لیکن کیا اس نے واقعی ہی ہمیں آزادی دی تھی، اس نے ہمیں اپنے طور پر زندگیاں بسر کرنے کا موقع مہیا کیے بغیر آزادی دی، اور ہمیں کام، خوراک اور کپڑوں کے لیے اب بھی جنوب کے سفید فاموں پر انحصار کرنا پڑتا ہے، اور انہوں نے ہمیں ہماری ضروریات اور اپنے اختیارات کے زور پر غلاموں کی طرح رکھا ہوا ہے، اگرچہ غلامی سے قدرے بہتر حالت ہے۔"

امریکی حکومت نے غلام ریاستوں کے خلاف 1861ء میں جو جنگ شروع کی تھی اس کا مقصد غلامی کا خاتمہ نہیں' بلکہ وسیع حدود، منڈیوں اور وسائل کو یکجا رکھنا تھا، لیکن فتح کے لیے شدید قسم کا جنگی جنون پیدا کرنے کی ضرورت تھی، اور اس جنگی جنون نے قومی سیاست میں نئی قوتوں کو متعارف کروایا۔ سیاہ فام اب اپنی آزادی کو بامعنی بنانے کے لیے زیادہ پرعزم تھے، زیادہ تر سفید فام، خواہ وہ "فریڈمین بیورو" کے اہلکار تھے، یا جنوبی کیرولینا کے سمندری جزائر میں ٹیچر تھے، یا بیرونی افراد جو سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے، نسلی مساوات کے حامی تھے۔

اس میں ری پبلکن پارٹی کا بھی گہرا مفاد پوشیدہ تھا، وہ جنوب کے سیاہ فاموں کے ووٹوں کی مدد سے قومی حکومت میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کی امید لگائے بیٹھی تھی۔ شمال کے تاجر بھی ری پبلکن کی پالیسیوں کو اپنے لیے فائدہ مند دیکھتے ہوئے وقتی طور پر اس کے ساتھ تھے۔

خانہ جنگی کے فوراً بعد جب سیاہ فاموں کو ووٹ ڈالنے کا موقع ملا تو انہوں نے ریاستی مقننہ اور کانگریس میں سیاہ فاموں کو منتخب کیا، اور جنوب میں مفت اور مخلوط نسلی تعلیم متعارف کروائی۔ ایک قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا، تیرہویں ترمیم کے مطابق غلامی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا: "امریکہ اور اس کی قانونی عملداری کے کسی بھی علاقے میں غلامی یا بغیر کسی کی رضامندی کے بیگار لینے کی اجازت نہیں ہوگی، ماسوائے کسی کو سزا دی گئی ہو، جس میں جرم کو قانونی تقاضوں کے مطابق ثابت کیا گیا ہو۔" چودہویں ترمیم

کے ذریعے "ڈریڈ سکاٹ" کے فیصلے کو منسوخ کر دیا گیا: "تمام اشخاص جو امریکہ میں پیدا ہوئے ہیں یا شہریت یافتہ ہیں وہ مکمل شہری ہیں۔" اور اس میں نسلی برابری کا بھی ایک مؤثر پیغام پوشیدہ تھا اور "ریاستی حقوق" کو شدید طور پر محدود کر دیا گیا تھا:

کوئی بھی ریاست ایسا قانون پاس کرنے یا نافذ کرنے کی مجاز نہیں ہوگی جو امریکہ کے شہریوں کے حقوق و مراعات میں کمی یا رکاوٹ کا باعث بنے، نہ ہی کوئی ریاست بغیر مناسب قانونی کارروائی کے کسی شخص کو زندگی، آزادی، یا جائداد سے محروم کر سکے گی، نہ اپنے دائرہ اختیار میں کسی شخص کو مساویانہ بنیاد پر قانونی تحفظ فراہم کرنے سے انکار کرے گی۔

پندرہویں ترمیم کے مطابق: "امریکہ یا کوئی بھی ریاست امریکہ کے شہریوں کے ووٹ دینے کے حق سے نسل، رنگ یا اس کی سابقہ غلامانہ حیثیت کی بنا پر انکار نہیں کرے گی یا اس حق کو محدود نہیں کرے گی۔"

کانگریس نے 1860ء کے عشرہ کے اختتام اور 1870ء کے عشرہ کے آغاز میں بہت سے قوانین پاس کیے جن میں نیگروز کو ان کے حقوق سے محروم کرنا جرم قرار دینے، وفاقی اہلکاروں کو ان حقوق کے نفاذ کا حکم دینے، نیگروز کو بغیر کسی اختیار کے معاہدات کرنے اور جائداد خریدنے کا حق دینے، کے قوانین شامل تھے، اور شہری حقوق کے ایکٹ 1875ء کے تحت نیگروز کو ہوٹلوں، تھیٹروں، ریل گاڑیوں، اور دوسرے عوامی مقامات میں داخل ہونے سے روکنا غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔

ان قوانین کے نفاذ جنوب میں تحفظ کے لیے موجود یونین آرمی کی موجودگی، اور "فریڈمین بیورو" کے اہلکاروں حاصل سول آرمی کی مدد سے، جنوب کے نیگروز کو آگے بڑھنے، ووٹ دینے، اور سیاسی تنظیمیں تشکیل دینے کے مواقع میسر آئے اور انہوں نے ان معاملات پر جو ان کے لیے اہم تھے بڑی شدت کے ساتھ اظہار کرنا شروع کر دیا۔

لیکن ان کو کئی سالوں تک اینڈریو جانسن نے آگے بڑھنے سے روکے رکھا' جو کہ لنکن کا نائب صدر تھا اور جنگ کے خاتمے پر لنکن کے قتل کے بعد صدر بن گیا۔ جانسن نے نیگروز کی مدد کے لیے پیش کیے گئے قانونی مسودوں کے خلاف اپنا حق استرداد استعمال کیا۔ اس نے کنفیڈریٹ ریاستوں کے لیے، سیاہ فاموں کے لیے برابری کی ضمانت مہیا کیے بغیر، یونین میں واپسی کے عمل کو آسان بنایا۔ اس کی صدارت کے دوران ان واپس آنے والی جنوبی ریاستوں نے "بلیک کوڈ" کا قانون وضع کیا، جس نے آزاد غلاموں کو کھیتوں میں کام کرنے والے لازمی غلام بنا دیا۔

اینڈریو جانسن کی ان سینیٹرز اور کانگریس کے ممبران کے ساتھ مخاصمت پیدا ہو گئی جو کچھ تو انصاف کی خاطر اور کچھ دوسرے سیاسی مقاصد کی خاطر آزاد کیے گئے غلاموں کے لیے برابری کے حقوق او

روؤٹ کی حمایت کرتے تھے۔ کانگریس کے یہ ممبران اس کے خلاف چند ایک معمولی قانونی خلاف ورزیوں کی بناء پر تحریک عدم اعتماد لانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن سینیٹ میں اسے عہدے سے ہٹانے کے لیے مطلوبہ دو تہائی تعداد میں ایک ووٹ کی کمی سے یہ تحریک عدم اعتماد ناکام ہو گئی۔ اس سال صدارتی انتخابات میں ری پبلیکن کا یولیسیس گرانٹ نیگروز کے 700,000 ووٹوں کی مدد سے 300,000 ووٹوں کی برتری سے صدر منتخب ہو گیا اور جانسن کی رکاوٹ صاف ہو گئی۔ اب جنوبی ریاستیں آئینی ترامیم کی توثیق کے بعد ہی یونین میں شمولیت اختیار کر سکتی تھیں۔

شمالی سیاستدان ان کے لیے جو کچھ بھی کر رہے تھے، جنوبی سیاہ فام زمین اور وسائل کی کمی کے باوجود اپنی آزادی کو زیادہ سے زیادہ پر معنی بنانے کے لیے پرعزم تھے۔ انہوں نے اپنے چرچ تعمیر کرتے ہوئے سیاسی طور پر سرگرم ہوتے ہوئے، اپنے خاندانی بندھنوں کو مضبوط کرتے ہوئے، اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہوئے، اپنے آپ کو سفید فاموں کے تسلط سے نکالنا شروع کر دیا۔

1869ء کے بعد کے دور میں سیاہ فام اپنے ووٹوں کی مدد سے دو نیگروز کو امریکی سینیٹ (ہرم ریولز اور بلانش بروس، ہر دو کا تعلق مسیسپی سے تھا) اور بیس سیاہ فام کانگریس کے لیے منتخب کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن 1901ء تک ان کی تعداد کم ہوتے ہوتے محض کانگریس میں ایک سیاہ فام تک رہ گئی۔

اب جنوبی ریاستوں کی مقننہ میں سیاہ فام بھی منتخب ہو کر آ گئے تھے اگرچہ سوائے جنوبی کیرولینا کے ایوان زیریں کے، تمام جگہوں میں وہ اقلیت میں تھے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سیاہ فام احمق، سست، بدعنوان اور جنوب کی حکومتوں کے لیے تباہ کن تھے، شمال اور جنوب دونوں میں بہت بڑی پروپیگنڈا مہم شروع کی گئی (یہ بات بیسویں صدی کی سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی کتابوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے)۔ اس میں شک نہیں کہ بدعنوانی موجود تھی لیکن یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ خانہ جنگی کے بعد شمال اور مغرب میں مالی لوٹ کھسوٹ پر سیاسی چشم پوشی کی وجہ حکومت میں سیاہ فاموں کی شمولیت کا نتیجہ تھا۔

یہ درست ہے کہ جنوبی کیرولینا کا سرکاری قرضہ جو کہ 1865ء میں 7 ملین ڈالر تھا 1873ء میں 29 ملین ڈالر تک پہنچ چکا تھا، لیکن نئی مقننہ نے ریاست کے سرکاری سکولوں میں پہلی مرتبہ مفت تعلیم متعارف کروائی تھی۔ 1876ء تک نہ صرف یہ کہ ستر ہزار نیگرو بچے سکول جا رہے تھے جب کہ اس سے پہلے ایک نیگرو بچہ بھی سکول نہیں جاتا تھا، بلکہ پچاس ہزار سفید فام بچے بھی سکولوں میں جا رہے تھے، جبکہ 1860ء میں ان کی تعداد محض بیس ہزار تک تھی۔

کولمبیا یونیورسٹی کا بیسویں صدی کا ایک دانشور، جان برجس "بلیک ری کنسٹرکشن" کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

عوام کے فائدے کے لیے انتہائی ذہین اور پاکباز لوگوں کی حکومت کے بجائے

یہ انتہائی جاہل اور بدمعاش لوگوں کی حکومت تھی۔۔۔۔ کالی چمڑی کا مطلب ایسے لوگوں کی نسل کا فرد ہونا ہے جو کہ جذبات کو عقل کے تابع نہیں کر سکی، لہٰذا یہ آج تک کسی قسم کی تہذیب کو جنم نہیں دے سکی۔

اس تبصرے کے پس منظر میں ہم جنگ کے بعد جنوب کے سیاہ فام لیڈروں کو پرکھ کر سچائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں، مثال کے طور پر "ہنری میک نیل ٹرنر" پندرہ سال کی عمر میں جنوبی کیرولینا کے باغات پر غلامی سے فرار ہوا۔ پڑھنا لکھنا سیکھا، بالٹی مور میں ایک وکیل کے پاس ہرکارے کے طور پر کام کرتے ہوئے قانون کی کتابوں کا مطالعہ کیا، بالٹی مور کے ایک میڈیکل سکول میں چپڑاسی کے طور پر کام کرتے ہوئے میڈیکل کی کتابوں کا مطالعہ کیا، ایک نیگرو رجمنٹ میں پادری کے فرائض انجام دیئے اور پھر جورجیا کی جنگ کے بعد مقننہ کے لیے منتخب ہوا۔

1968ء میں جورجیا کی مقننہ نے تمام نیگروز ممبران کو خارج کرنے کے حق میں ووٹ دیا، جو کہ دو سینیٹرز تھے اور پچیس نمائندگان تھے، اس موقع پر ٹرنر نے جورجیا کے ایوان نمائندگان میں خطاب کرتے ہوئے کہا (اٹلانٹا یونیورسٹی کی ایک گریجویٹ سیاہ فام طالبہ اس کی یہ تقریر منظر عام پر لے کر آئی):

مسٹر سپیکر! میں یہاں اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لیے آیا ہوں، اور ان لوگوں پر جو میری مردانگی کی دہلیز کو پار کرنے کی جرأت کرتے ہیں برق بن کر گروں گا۔۔۔۔

آج اس ایوان میں جو منظر پیش کیا گیا ہے اس کی کہیں بھی نظیر نہیں ملتی۔۔۔۔ دنیا کی تاریخ میں آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ایک ایسے ادارے کے سامنے جس نے قانون، انصاف اور عاملہ کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو ایک شخص کو اس جرم کے ساتھ بطور مجرم پیش کیا جائے کہ اس کا رنگ اپنے دوسرے ساتھیوں کی نسبت کالا ہے۔۔۔۔

جناب عالی! اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ اگر میں انسان ہوں، تو میں انسان کے حقوق کا مطالبہ کرتا ہوں۔

جناب عالی! میں جواب چاہتا ہوں کہ ہم نے ڈھائی سو سال تک آپ کے کھیتوں میں کام نہیں کیا اور آپ کی فصلیں سمیٹ کر آپ کو نہیں دیں۔ اور اس کے بدلے میں ہم نے آپ سے کیا مانگا ہے؟ کیا ہم اس پسینے کا جو ہمارے آباؤاجداد نے آپ کے لیے بہایا، ان آنسوؤں کا جو آپ نے ان کی آنکھوں میں بھرے، اور دل جو آپ نے توڑے، زندگیاں جو آپ نے ختم کیں، اور خون جو آپ نے بہایا، اس کے ازالے کا مطالبہ کر رہے ہیں، ہم یہ نہیں کہتے، ہم جو کچھ گزر چکا ہے اس کو بھول جانے کے لیے تیار ہیں، لیکن ہم اب آپ سے صرف اپنے انسانی حقوق مانگتے ہیں۔

"فرانسس ایلن واٹ کنزہارپر" بالٹی مور میں آزاد پیدا ہوئی، تیرہ سال کی عمر سے اس نے اپنا خرچہ خود اٹھانا شروع کیا، وہ ایک نرس کے طور پر کام کرتی رہی، بعد میں انسداد غلامی کے لیے کام کرتی رہی، اپنی شاعری خود سناتی، جنگ کے بعد تمام جنوبی ریاستوں میں تقاریر کیں۔ وہ تحریک نسواں کی زبردست حامی تھی اور 1866ء کی وومن رائٹس کونشن میں شریک تھی۔ اور" نیشنل ایسوی ایشن آف کلرڈ وومن" کی بانی تھی۔1890ء کے عشرے میں اس نے ناول "Iola Leroy, or Shadows Uplifted" تحریر کیا جو کسی سیاہ فام خاتون کا شائع ہونے والا پہلا ناول تھا۔

سیاہ فاموں کے لیے برابر کے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں، بعض سیاہ فام خواتین نے اپنی مخصوص صورتحال کے بارے میں آواز اٹھائی، سوجورنر ٹروتھ نے "امریکن ایکوَل رائٹس ایسوی ایشن کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> سیاہ فام مردوں میں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ ہلچل ہے، لیکن سیاہ فام خواتین کے لیے ایک لفظ بھی نہیں بولا جا رہا۔ اگر سیاہ فام مرد اپنے حقوق حاصل کر لیتے ہیں اور سیاہ فام خواتین محروم ہو جاتی ہیں، تو سیاہ فام مرد خواتین پر حاکم بن جائیں گے، اور یہ ایسا ہی برا ہو گا جیسا کہ پہلے تھا، لہٰذا میں اپنا معاملہ اس وقت اٹھانا چاہتی ہوں جب کہ ابھی گرما گری قائم ہے، کیونکہ اگر ہم معاملات پرسکون ہونے کا انتظار کرتے رہے تو اس معاملے کو آگے چلانے میں بہت زیادہ وقت درکار ہو گا....
>
> میری عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی ہے، اور میں تقریباً جانے کی تیاریاں کر رہی ہوں۔ میں نے چالیس سال غلامی میں اور چالیس سال آزادی میں گزارے ہیں اور سب کے لیے برابری کے حقوق حاصل کرنے میں مزید چالیس سال درکار ہوں گے۔

آئینی ترمیمات منظور کی گئیں، نسلی مساوات کے قوانین منظور ہوئے، اور سیاہ فام مردوں نے ووٹ دینے اور عہدے سنبھالنے شروع کر دیے، لیکن جب تک نیگروز کا کام اور ضروریات زندگی کے حصول کے لیے مراعات یافتہ سفید فاموں پر انحصار تھا، ان کے ووٹ خریدے جا سکتے تھے یا زبردستی حاصل کیے جا سکتے تھے، لہٰذا برابری کے سلوک کے بارے میں تمام قوانین بے معنی ہو جاتے تھے۔ جب تک یونین کے فوجی، بشمول سیاہ فام فوجیوں کے جنوب میں موجود رہے یہ عمل تاخیر کا حامل رہا۔ لیکن فوجی طاقت کا یہ توازن تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔

جنوب کی سفید فام عدیدیہ (چندسری حکومت) نے اپنی معاشی قوت کو کلکس کلین اور دوسری دہشت گرد تنظیمیں تشکیل دینے کے لیے استعمال کیا۔ شمال کے سیاستدانوں نے غریب سیاہ فاموں، جن کے ووٹ کے حق اور عہدوں پر تعیناتی کی محض طاقت کے زور پر برقرار رکھا جا سکتا تھا، کی سیاسی معاونت

سے حاصل ہونے والے فوائد کو جنوب میں ری پبلکن کی بالادستی اور تجارتی قانون سازی کو تسلیم کرتے ہوئے سفید فام بالادستی کے ساتھ موازنہ شروع کر دیا جو کہ زیادہ مستحکم صورت حال کی ضامن تھی، ان حالات میں یہ نظر آ رہا تھا کہ جلد ہی سیاہ فام دوبارہ ایسی صورتحال سے دوچار ہو جائیں گے جو غلامی سے کسی طور پر بھی بہتر نہیں ہو گی۔

جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی تقریباً فوری طور پر تشدد کا آغاز ہو گیا۔ مئی 1866ء میں "میمفس" کے سفید فام دیوانوں کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے چھیالیس نیگروز جن میں زیادہ تر یونین کی فوج کے پرانے سپاہی تھے اور ان سے ہمدردی رکھنے والے دو سفید فاموں کو قتل کر دیا۔ پانچ نیگروز خواتین کی عزت لوٹی گئی، نوے گھروں، بارہ سکولوں اور چار چرچوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔1866ء کی گرمیوں میں "نیو اورلینز" میں سیاہ فاموں کے خلاف ایک اور فساد میں پینتیس نیگروز اور تین سفید فاموں کو قتل کر دیا گیا۔

1860ء کے عشرے کے اختتام اور 1870ء کے عشرے کے آغاز میں تشدد کی لہر میں اضافہ ہو گیا جب "کوکلکس کلین" نے قتل و غارت، مار پیٹ اور نذر آتش کرنے کے لیے اپنے حملوں کا آغاز کر دیا۔ محض کینٹکی میں 1867ء اور 1871ء کے دوران قومی دستاویزات میں تشدد کے 116 واقعات درج ہیں، نمونے کے طور پر:

1- 14 نومبر 1867ء کو مرسر کاؤنٹی میں رابرٹ سن نامی ایک شخص کو جیل میں چھڑوانے کے لیے ہارروڈس برگ میں ایک ہجوم داخل ہوا۔
2- 28 مئی 1868ء کو ہجوم نے "سیم ڈیوس" کو ہارروڈس برگ میں پھانسی پر لٹکا دیا۔
3- 12 جولائی 1868ء کو کرچین میں ہجوم نے وم پارس کو پھانسی دیدی۔
4- 11 جولائی 1868ء کو براڈس فورڈ ویلی مارٹن کاؤنٹی میں ہجوم نے جیورو جر کو پھانسی پر لٹکا دیا۔
5- ساٹھ سالہ سیلاس ووڈفورڈ کو ہجوم نے بری طرح زدوکوب کیا۔
6- 4 جنوری 1871ء کو کوکلکس کلین نے "میلیے کاؤنٹی" میں ایک نیگرو کو قتل کر دیا۔

1870ء کے عشرے میں جب سفید فاموں کا تشدد انتہائی صورت اختیار کر گیا صدر گرانٹ کے تحت قومی حکومت نے بھی سیاہ فاموں کی حفاظت کے لیے کوئی مؤثر اقدامات نہ اٹھائے اور انہیں مسلح کرنے کے لیے تو وہ بالکل بھی تیار نہ تھی۔ جب یہ تشدد انتہائی صورت اختیار کر گیا تو سپریم کورٹ نے حکومتی اداروں کو جو اس سلسلے میں زیادہ آگے جانے کی کوشش کرتے تھے، پیچھے رکھتے ہوئے صورت حال کو جوں کا توں رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا، اس نے چودھویں ترمیم، جو کہ نسلی برابری کے لیے منظور کی گئی تھی، کی ایسی تشریح شروع کر دی جس نے اس کے اصل مقصد کو ختم کر کے رکھ دیا۔

1883ء میں سپریم کورٹ نے 1875ء کے "سول رائٹس ایکٹ" کو منسوخ کر دیا جس کے

تحت عوامی سہولیات کے استعمال میں نیگروز کے خلاف امتیاز کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا، سپریم کورٹ نے یہ تاویل پیش کی کہ کسی فرد کے حقوق پر کسی فرد کا حملہ اس ترمیم کے دائرہ اختیار میں نہیں آتا، چودھویں ترمیم میں صرف ریاست کے کسی ایسے عمل کا ذکر کیا گیا۔ یعنی "کوئی ریاست یہ نہیں کرے گی۔

سپریم کورٹ کے جسٹس "جون ہرلان" نے جو کہ خود بھی کینٹکی میں غلاموں کا سابقہ مالک تھا، ایک غیر معمولی اختلافی فیصلہ دیا، اس نے لکھا نجی سطح پر امتیاز برتنے سے روکنے کا آئینی جواز موجود ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ تیرھویں ترمیم جس کے تحت غلامی کا خاتمہ کیا گیا اس کا اطلاق زرعی فارموں کے مالکان پر انفرادی طور پر ہوتا ہے صرف ریاست پر نہیں، اس نے مزید دلیل یہ دی کہ امتیازی سلوک غلامی کا نشان ہے اور غلامی کی طرح یہ بھی غیر قانونی ہے۔ اس نے چودھویں ترمیم کی پہلی شق کا حوالہ بھی دیا جس کے مطابق ہر وہ شخص امریکہ میں پیدا ہوا ہے اس کا شہری ہے۔ اور آرٹیکل 4 کی شق کے مطابق "ہر ریاست کا شہری ان تمام مراعات و تحفظات کا حق دار ہے جو دوسری مختلف ریاستوں کے شہریوں کو حاصل ہیں۔

ہرلان ایک ایسی قوت کے خلاف لڑ رہا تھا جو استدلال اور انصاف کے مقابلے میں زیادہ طاقتور تھی۔ عدالت کا مزاج شمالی صنعتکاروں اور جنوبی کاشتکار تاجروں کے نئے اتحاد کی عکاسی کرتا تھا۔ اس مزاج کی انتہا "پلیسی بنام فرگوش" کے مقدمے کے فیصلے میں بڑی واضح نظر آتی ہے جب عدالت نے فیصلہ دیا کہ ریلوے سفید فاموں اور سیاہ فاموں کو علیحدہ علیحدہ کر سکتی ہے بشرطیکہ ہر ایک کو یکساں سہولتیں مہیا کی جاری ہوں کہرلان نے دوبارہ اس فیصلے سے اختلاف کیا: "ہمارا آئین رنگ اندھا ہے۔"

جو کچھ اس وقت ہو رہا تھا وہ 1877ء میں بڑے ڈرامائی اور واضح انداز میں کھل کر سامنے آ گیا، جب سال کا آغاز ہوا تو پچھلے نومبر میں ہونے والے صدارتی انتخابات پر شدید اختلافات جاری تھے۔ ڈیموکریٹک امیدوار سیموئیل ٹلڈن نے 184 الیکٹورل ووٹ حاصل کیے تھے اور اسے منتخب ہونے کے لیے ایک ووٹ کی ضرورت تھی۔ اس کے پاپولر (عوامی) ووٹ 250,000 سے زائد تھے۔ ری پبلکن امیدوار رودر فورڈ نے 166 الیکٹورل ووٹ حاصل کیے تھے۔ تین ریاستوں میں ابھی تک گنتی مکمل نہیں ہوئی تھی جن کے 19 الیکٹورل ووٹ تھے۔ اگر رودر فورڈ ہیس" سارے ووٹ حاصل کر لیتا تو اس کے 185 ووٹ ہو جاتے اور وہ صدر منتخب ہو جاتا، اس کے منیجرز کو یہ ہدف حاصل کرنا تھا۔ انہوں نے ڈیموکریٹک پارٹی اور سفید جنوب کو مراعات دیں جن میں یہاں سفید فاموں کی بالادستی میں حاصل واحد رکاوٹ یونین کے فوجیوں کے انخلا کا معاہدہ بھی شامل تھا۔

شمال کے سیاسی اور معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے طاقتور اتحادیوں اور استحکام کی ضرورت تھی۔ ملک 1873ء سے معاشی کساد بازاری کا شکار تھا اور 1877ء میں کسان اور کارکن باغی ہونا شروع ہو

گئے تھے۔ جیسا کہ "سی وان ووڈ ورڈ" نے اپنی تاریخ کی کتاب میں 1877ء کے سمجھوتے کا "دوبارہ الحاق اور رد عمل" کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> یہ ملکی تاریخ میں شدید کساد بازاری کا بدترین سال تھا۔ مشرق میں مزدور اور بے روزگار طبقے کے مزاج میں تلخی اور تشدد نمایاں ہو رہا تھا۔ مغرب میں زرعی انقلابی سیاست کی لہر بلند ہو رہی تھی۔ تحفظاتی محصولات، قومی بنکوں، ریلوے سبسڈیز اور زرعی بندوبست کے وسیع ڈھانچے کو، جس پر نیا معاشی نظام قائم کیا گیا تھا، مشرق اور مغرب دونوں جانب سے دھمکیاں موصول ہو رہی تھی۔

یہ جنوبی اور شمالی اشرافیہ کے درمیان مصالحت کا وقت تھا، ووڈ ورڈ سوال کرتا ہے: کیا جنوب کو شمالی قدامت پرستوں کے ساتھ شامل ہونے اور نئے سرمایہ دارانہ نظام کے لیے خطرے کے بجائے سہارا بننے پر اکسایا جا سکتا تھا؟

کروڑوں ڈالروں کے غلاموں کے نکل جانے سے جنوب کی دولت کا صفایا پھر گیا تھا۔ اب وہ قرضوں، سبسڈیز اور سیلاب کی روک تھام کے منصوبوں کے لیے قومی حکومت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "ووڈ ورڈ" کہتا ہے: "قرضوں، سبسڈیز امدادی رقوم اور بانڈز کے ذریعے، جیسا کہ کانگریس یہ سب کچھ بڑی فراخدلی کے ساتھ شمال کے سرمایہ داروں پر نچھاور کر چکی تھی، جنوب کے لوگ اپنی تقدیر سنوار سکتے تھے خاص طور پر مراعات یافتہ اشرافیہ تو ہر قیمت پر یہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی۔

لہٰذا معاہدہ طے پا گیا۔ کانگریس کے ایوانوں نے الیکٹرول ووٹوں کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک موزوں کمیٹی تشکیل دے دی۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ یہ "ہیس" کے ہیں اور اب وہ صدر تھا۔ جیسا کہ "ووڈ ورڈ" اس سارے عمل کا نتیجہ یوں بیان کرتا ہے:

> 1877ء کے سمجھوتے میں جنوب میں پرانا نظام بحال نہیں ہوا تھا.... اس میں سفید فام سیاسی خود مختاری اور نسلی پالیسی میں عدم مداخلت اور نئے معاشی نظام کی برکات سے انہیں مناسب حصے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ اس کے بدلے میں جنوب حاکم علاقے کا طفیلی بن گیا۔

جنگ کے بعد جنوب میں سیاہ فاموں کی جو قوت موجود تھی اس کے خاتمے میں نئی سرمایہ داری کی اہمیت کو "ہورس مین بونڈ" الاباما کی تعمیر نو کے حوالے سے میں اپنے مطالعہ میں تسلیم کرتا ہے۔ یہ کوئلے اور توانائی کا دور تھا اور شمالی الاباما کے پاس دونوں موجود تھیں۔ "فلاڈلفیا اور نیویارک حتیٰ کہ لندن اور پیرس کے بینکار بھی اس بات سے تقریباً گزشتہ دو عشروں سے آگاہ تھے۔ صرف ذرائع نقل و حمل کی ضرورت تھی۔" بونڈ کے مطابق 1870ء کے عشرے میں ریلوے لائنوں کو بچھانے کے لیے بینکار سامنے آنے لگے تھے، 1875ء

میں جے پی مورگن الباما اور جورجیا میں کئی ایک ریلوے لائنوں کے ڈائریکٹر کے طور پر سامنے آیا۔

1886ء میں اٹلانٹا کے آئین کے ایک ایڈیٹر "ہنری گراڈی" نے نیو یارک میں ایک رات کے کھانے پر تقریر کی سامعین میں جے پی مورگن، ایچ ایم فلیگر (جان۔ ڈی راک فیلر کا ایک ساتھی) رسل سیج، اور چارلس ٹفنی تھے۔ اس کی گفتگو نئے جنوب کے بارے میں تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ: "جو گزر چکا اسے بھول جائیں، آیئے مل کر امن اور خوشحالی کے ایک نئے دور کا آغاز کریں۔"

اسی ماہ کے دوران "نیو یارک ڈیلی ٹائمز" میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ "جنوب سے کوئلے اور لوہے کی چند اہم شخصیات نے نیو یارک کا دورہ کیا اور مطمئن واپس گئے۔ کیونکہ:

وہ جس وقت کا بیس سال سے انتظار کر رہے تھے آخر کار آن پہنچا ہے، یعنی جب شمال کے سرمایہ کار نہ صرف اپنی رقوم کے تحفظ بلکہ اس بات کے بھی قائل ہو جائیں گے کہ الباما، ٹینیسی اور جورجیا میں موجود کوئلے اور لوہے کے وسیع ذخائر پر خرچ کی گئی ان کی یہ رقوم بہت زیادہ منافع دلا سکتی ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ شمال کو نیگروز کی ماتحتی قبول کرنے کے لیے کسی قسم کے فکری انقلاب سے گزرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا تو شمال کی بیس ریاستوں میں سے انیس ریاستوں نے نیگروز کو ووٹ کا حق نہیں دیا تھا۔

1900ء تک جنوبی ریاستوں نے اپنے نئے منشوروں اور قوانین میں نیگروز کی علیحدگی اور ان کے ووٹوں کے خاتمے کو تحریری قوانین کی شکل دے دی تھی۔ "نیو یارک ٹائمز" نے اپنے اداریے میں لکھا: "شمال کے لوگ۔۔۔ اب نیگروز کے حق رائے دہی کے خاتمے کی مذمت نہیں کرتے۔۔۔۔ انہوں نے اسے "حفظ ذات" کے بالاتر قانون کے تحت بڑی اخلاص مندی سے قبول کر لیا ہے۔"

سفید فام معاشرے میں قبولیت رکھنے والے سیاہ فام راہنماؤں نے نیگروز کو سیاسی انفعالیت کا مشورہ دیا۔ جن میں "بکر، ٹی، واشنگٹن" بھی شامل تھا جو کہ ایک وقت وائٹ ہاؤس میں "تھیوڈور روز ویلٹ" کا مہمان بھی بن چکا تھا۔ اسے 1895ء میں بین الاقوامی نمائش اور کاٹن سٹیٹس کے سفید فام منتظمین کی طرف سے خطاب کے لیے مدعو کیا گیا۔ واشنگٹن نے جنوب کے نیگروز کو مشورہ دیا کہ وہ جہاں پر ہیں وہیں بطور کسان، مکینک، گھریلو ملازم اور دیگر پیشوں میں مہارت حاصل کرتے ہوئے اپنا مستقبل بنانے کی کوشش کریں۔

اس نے سفید فام آجرین سے بھی اجنبی زبان اور عادات کے مالک پناہ گزینوں کے بجائے سیاہ فاموں کو کام دینے کے لیے کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ نیگروز نہ تو ہڑتالیں کرتے ہیں نہ ہی مزدوروں کے ہنگاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ انتہائی صابر، ۔۔دار، قانون کے پابند ہیں اور کسی بات پر برا نہیں مانتے۔

میری نسل سے تعلق رکھنے والے عقلمند لوگ سمجھتے ہیں کہ سماجی برابری کے سوال پر ہنگامہ آرائی انتہا پسندوں کی احمقانہ حرکت ہے۔

شاید واشنگٹن کے نزدیک اپنی بقا کے لیے یہ بہترین حکمت عملی تھی جبکہ پورے جنوب میں نیگروز کو قتل کرنے، پھانسیاں دینے اور گھروں کو نذر آتش کرنے کے واقعات میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ امریکہ میں سیاہ فاموں کے لیے انتہائی گھٹیا دور تھا۔ "نیو یارک گلوب" کے نوجوان سیاہ فام ایڈیٹر تھا "تھامس فارچون" نے امریکہ میں نیگروز کی صورتحال پر بات چیت کرتے ہوئے 1883ء میں سینیٹ کمیٹی کے روبرو نیگروز میں پھیلی ہوئی وسیع غربت، حکومتی بے وفائی اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیگروز کی انتھک کوششوں کا ذکر کیا۔

فارچون نے کہا کہ جنوب میں ایک کھیت مزدور نیگرو کی اوسط مزدوری پچاس سینٹ روزانہ ہے۔ اور وہ بھی عام طور پر کرنسی کی صورت میں نہیں بلکہ "آرڈرز" کی صورت میں ہوتی ہے جس کے تحت وہ صرف اس سٹور سے اشیاء خرید سکتا ہے جو کاشتکار کی ملکیت ہوتا ہے۔ یہ سب ایک دھوکا دہی پر مبنی نظام کا حصہ ہے۔

فارچون نے "جنوب کے اصلاحی قید خانوں اور اس کے رسوائے زمانہ پابہ زنجیر بیگاریوں کا ذکر بھی کیا، جس کا مقصد سیاہ فاموں کو خوفزدہ کرنا اور ٹھیکیداروں کی انتہائی سستی بیگار مہیا کرنا تھا، جو وہ ان قید خانوں سے خرید سکتے تھے۔۔۔۔ ایک سفید فام جو کسی نیگرو کو مار ڈالتا ہے آزاد گھومتا رہتا ہے، جبکہ نیگرو جس پر سور چوری کرنے کا الزام ہوتا ہے اسے دس سال کے لیے ان پابہ زنجیر بیگاریوں میں بھیج دیا جاتا ہے"

بہت سے نیگروز فرار ہو گئے۔ تقریباً چھ ہزار سیاہ فام تشدد اور غربت سے نجات حاصل کرنے کے لیے ٹیکساس، لوئی سیانا، اور مسیسپی سے نکل کر کنساس میں آباد ہو گئے۔ "ہمیں کسی بھی لیڈر پر اعتماد نہیں سوائے خدا کے جو آسمان کا بادشاہ ہے۔" ان میں سے ایک کا کہنا تھا۔ وہ جو جنوب میں رہ گئے۔" انہوں نے 1880ء کے عشرے میں اپنے تحفظ کے لیے منظم ہونا شروع کر دیا جبکہ ہر سال تقریباً سو سے زائد نیگروز کو قتل کیا جاتا رہا۔

ایسے سیاہ فام راہنما بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ "بکر، ٹی، واشنگٹن" احتیاط اور اعتدال پسندی کی حمایت کرنے میں غلط ہے۔ جان ہوپ جورجیا کا ایک نوجوان سیاہ فام جس نے واشنگٹن کی کپاس کی نمائش میں تقریر سنی تھی۔ اس نے ٹینیسی، ناش ویلی میں نیگروز کالج کے طلباء سے کہا "اگر ہم برابری کے حقوق کے لیے کوشش نہیں کر رہے، خدارا مجھے بتایئے ہم پھر کس لیے زندہ رہ رہے ہیں؟ اگر ہمارا کوئی بھی سیاہ فام آدمی سفید فاموں یا سیاہ فاموں کو یہ کہتا ہے کہ ہم برابری کے حقوق کی جنگ نہیں لڑ رہے تو میرے نزدیک وہ بزدل اور بددیانت ہے۔"

ایک دوسرے سیاہ فام "ڈبلیو، ای، بی، ڈیو بوائس" نے جو اٹلانٹا یونیورسٹی میں پڑھانے آیا

انیسویں صدی کے اختتام پر نیگروز کی غداری کو امریکہ میں کسی بڑے واقعے کا پیش خیمہ قرار دیا، ایک ایسا واقعہ جو نہ صرف غریب سیاہ فاموں کو پیش آ رہا تھا بلکہ غریب سفید فام بھی اس کا شکار ہونے والے تھے۔ "بلیک ری کنسٹرکشن" میں اس نے اس ہی سرمایہ داری کو دنیا کے تمام ممالک میں استحصال اور بدعنوانی کے عمل کے ایک حصے کے طور پر دیکھا۔ تہذیب یافتہ علاقوں میں مزدوروں کو حق رائے دہی کی میٹھی گولیاں دے کر ورغلا اور بہلایا جا رہا تھا جس کی طاقت کو وسیع سرمائے کی طاقت سختی سے محدود کر رہی ہے۔ انہیں معاوضوں کی بلند شرح اور سیاسی عہدوں کی رشوت دے کر تہذیب یافتہ علاقوں کے پیلے، گندمی، سفید فام اور سیاہ فام مزدوروں کے استحصال میں شامل کیا جا رہا تھا۔

کیا ڈیو بوائس درست کہہ رہا تھا.... کہ خانہ جنگی سے پہلے اور بعد میں امریکی سرمائے کی افزائش کے دوران سیاہ فاموں کے ساتھ ساتھ سفید فام بھی کسی نہ کسی طور پر غلامی میں دھکیلے جا رہے تھے۔

خانہ جنگی کی ایک دوسری صورت

انیسویں صدی میں جنم لینے والی طبقاتی کشمکش کا ذکر عام طور پر امریکہ کی تاریخ کی ان کتابوں میں نہیں ملتا جو سکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس کشمکش کو عموماً دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے درمیان شدید مخاصمت کا رنگ دے کر پس پردہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ حقیقت میں دونوں پارٹیاں کم و بیش ایک ہی حیثیت کے بااثر اور غالب طبقات کی نمائندگی کرتی تھیں۔

اینڈریو جیکسن جو 1828ء لے کر دو مدتوں تک صدر کے عہدے پر فائز رہا، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے معاشرے کے ادنیٰ افراد، کسانوں، مکینکوں اور مزدوروں کے حقوق کی بات کی۔ اس نے اپنی زمینوں سے بے دخل کیے جانے والے انڈینز اور سیاہ فام غلاموں کی بات کیوں نہ کی۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ ملک میں بے شمار فیکٹریاں لگائی جا رہی تھیں، زیادہ سے زیادہ آبادکار یہاں پہنچ رہے تھے، اس پس منظر میں حکومت کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ نچلے سفید فام طبقے میں اپنی حمایت کے لیے وسیع بنیادیں استوار کرے۔ جیکسونین جمہوریت کا ڈرامہ اسی مقصد کے لیے رچایا گیا تھا۔

یہ ایک ایسی دوغلی سیاست تھی جس کا مقصد تیزی سے ترقی کرتی ہوئی معیشت اور متوقع ہنگاموں کے پیش نظر نچلے اور متوسط طبقے کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ یہ لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک دانشمندانہ طریقہ کار تھا۔ جس میں لوگوں کو دو مختلف سیاسی پارٹیوں میں سے ایک کے انتخاب کا حق دیا گیا تھا اور قدرے زیادہ جمہوری پارٹی کا انتخاب کرتے ہوئے ان کے باغیانہ جذبات کی کسی حد تک تسکین ہو جاتی تھی۔

امریکہ بڑی تیز رفتاری اور جوش و جذبے سے ترقی کر رہا تھا۔ 1790ء میں 10 لاکھ سے کم افراد شہروں میں رہائش پذیر تھے۔ 1840 تک ان کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ نیویارک کی آبادی 1820ء میں 130,000 تھی جو کہ 1860 تک 10 لاکھ تک پہنچ گئی۔ اور فرانسیسی سیاح الیکسی ڈی ٹوکویل نے جب لوگوں کی حیثیت میں عمومی برابری پر حیرانی کا اظہار کیا تو اس کا مشاہدہ حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

فلاڈلفیا میں مزدور طبقہ کے خاندان اپارٹمنٹس میں رہتے تھے اور عام طور پر ایک خاندان کے

پاس صرف ایک کمرہ ہوتا تھا۔ کوڑا کرکٹ اٹھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، حوائج ضروریہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اور تازہ پانی یا ہوا کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ دریائے سکویو کل سے پانی پمپ کرنے کا نیا نیا کام شروع ہوا تھا لیکن یہ پانی صرف امراء کے گھروں کو سپلائی کیا جاتا تھا۔

نیو یارک میں آپ غریب لوگوں کو گلیوں میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر لیٹے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ کچی آبادیوں میں سیوریج کا کوئی انتظام نہ تھا۔ گندا پانی گھروں کے صحنوں، گلیوں اور تہہ خانوں میں جمع رہتا تھا، جہاں غریب لوگ رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے 1837ء میں ٹائیفائڈ اور 1842ء میں ٹائفس کی وبائیں پھوٹ نکلیں۔ 1832ء میں ہیضے کی وباء میں امراء شہر چھوڑ کر نکل گئے، غریب کہیں نہ جا سکے اور وہیں موت کا شکار ہوتے رہے۔

یہ غریب لوگ حکومت کے سیاسی حلیف شمار نہیں کیے جا سکتے تھے۔ لیکن وہ بہر حال وہاں موجود تھے۔ اگرچہ عام طور پر ایسے نظر نہیں آتے تھے لیکن اگر اٹھ کھڑے ہوں تو غلاموں اور انڈینز کی طرح ایک خطرہ ضرور تھے۔ تاہم کچھ ایسے پختہ شہری بھی موجود تھے جو نظام کو مضبوط سہارا دے سکتے تھے۔ جن میں اچھا معاوضہ پانے والے کارکن اور زمینوں کے مالک کسان شامل تھے۔ ان میں نئے پیدا ہونے والے سفید پوش کارکن بھی تھے، جو ابھرتے ہوئے تجارتی دور میں پیدا ہوئے تھے انہیں اس نظام سے ایک قدرتی لگاؤ تھا اور ان کے معاوضے بھی اس قدر کافی تھے کہ وہ اپنے آپ کو اس بورژوا طبقے کے فرد خیال کرتے تھے اور کسی بھی بحران کی صورت میں اس طبقے کو سہارا دینے کے لیے تیار تھے۔

بڑی شاہراہوں، نہروں، ریلوے لائنوں اور ٹیلی گراف نے مغرب کے دروازے کھول دیے تھے۔ زرعی فارموں پر مشینوں کا استعمال شروع ہو رہا تھا۔ لوہے کے ہلوں نے ہل چلانے میں صرف ہونے والے وقت میں نصف سے بھی زیادہ کمی کر دی تھی۔ 1850ء کے عشرے میں "جان ڈیئر" کمپنی 10 ہزار ہل سالانہ تیار کر رہی تھی۔ "سائرس میک کارمک" شکاگو میں واقع اپنی فیکٹری میں فصل کاٹنے کے لیے ایک ہزار سالانہ مکینیکل ریپرز تیار کر رہی تھی۔ درانتی کے ساتھ ایک آدمی پورے دن میں بمشکل نصف ایکڑ گندم کاٹ سکتا تھا جب کہ اس نئے ریپر کی مدد سے وہ دن میں دس ایکڑ گندم کاٹ لیتا تھا۔

ایک ایسے معاشی نظام کو، جس کی منصوبہ بندی معقول طور پر انسانی ضروریات کے مطابق نہیں کی گئی تھی، بلکہ غیر منظم طور پر صرف منافع کی بنیادوں پر قائم تھا، بار بار کی گرم بازاری اور کساد بازاری سے بچانے کا کوئی طریقہ یا راستہ موجود نہ تھا۔ اس طرح ایک مرتبہ 1837ء اور دوسری مرتبہ 1853ء میں شدید کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑا۔ استحکام حاصل کرنے کا ایک طریقہ مقابلہ کو کم کرنا، کاروباروں کو منظم کرنا اور اجارہ داری کی طرف پیش قدمی تھا۔ 1850ء کے عشرے کے وسطی دور میں قیمتوں کے معاہدے اور کاروباری اداروں کا ادغام عام ہو گیا۔ "نیو یارک سنٹرل ریلویز" بہت سی ریلویز کا ادغام تھا۔ "تباہ کن

مقابلے" سے نمٹنے کے لیے "امریکن براس ایسوسی ایشن" تشکیل دی گئی۔ سوت کاتنے والے قیمتوں پر کنٹرول کے لیے "کاؤنٹی کاٹن سپنر ایسوسی ایشن" کے تحت منظم ہو گئے اور انہی مقاصد کے حصول کے لیے "امریکن آئرن ایسوسی ایشن" تشکیل دی گئی۔

ایسی صنعت میں، جس میں کثیر سرمایہ درکار تھا، خطرے کو کم از کم کرنا ضروری تھا۔ ریاستوں کی مقننہ نے کارپوریشنوں کو اجازت نامے جاری کیے کہ وہ کاروبار کر سکتی ہیں اور سرمایہ اکٹھا کر سکتی ہیں، جبکہ ان کے مالکان اور منیجروں کی ذاتی جائدادوں اور دولت کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ 1790ء سے 1860ء کے درمیان تئیس سو کارپوریشنوں کو اجازت نامے دیے گئے۔

مرکزی حکومت الیگزینڈر ہملٹن اور پہلی کانگریس سے ہی شروع ہوتے ہوئے کاروباری مفادات کو تحفظ فراہم کر رہی تھی اور یہ کام اب وسیع پیمانے پر کیا جا رہا تھا۔

ریلوے کے آدمیوں نے پیسوں، ریلویز میں حصص اور ریلوے پر سفر کے لیے مفت اجازت ناموں سے مسلح ہو کر واشنگٹن اور ریاستوں کے دارالحکومتوں کے دورے کیے۔ 1850ء سے 1857ء کے درمیان انہوں نے ریاستوں کی مقننہ سے 25 ملین ایکڑ سرکاری زمین مفت اور کروڑوں ڈالر بانڈز اور قرضوں کی صورت میں حاصل کیے۔ 1856ء میں "لاکراس اور ملووکی" ریلویز نے 190 اسمبلی ممبران کانگریس تیرہ سینیٹروں اور گورنروں میں 900,000 ڈالر کے حصص اور بانڈز تقسیم کر کے ایک ملین ایکڑ زمین حاصل کی۔ دو سالوں میں ریلوے دیوالیہ ہو گئی اور حصص اور بانڈز محض کاغذ کے ٹکڑے رہ گئے۔

مشرق میں مل مالکان مضبوط اور منظم ہو گئے تھے۔ 1850ء تک بوسٹن کے پندرہ خاندان جنہیں "ایسوسی ایٹس" کہا جاتا تھا امریکہ میں سوت کاتنے کے 20 فی صد کاروبار، میساچوسٹس میں انشورنس کے سرمائے کے 39 فی صد اور بوسٹن میں بنکنگ کے وسائل کے 40 فی صد پر قابض تھے۔

خانہ جنگی کے اختتام پر ان لوگوں کو جو ملک کا نظام چلا رہے تھے سب سے بڑی اور اہم ترجیح غلامی کے خلاف تحریک نہیں بلکہ دولت اور منافع کا حصول تھا۔ جیسا کہ "تھامس کاکرن" اور "ولیم ملر" نے "دی ایج آف انٹر پرائز" میں بیان کیا ہے:

> شمال کا ہیرو ایمرسن، پارکر، گیری سن، یا فلپس کے بجائے ویبسٹر تھا، جو کہ محصولات کا ٹھیکیدار زمینوں کا سٹے باز کارپوریشن وکیل، بوسٹن ایسوسی ایٹس کا نمائندہ سیاستدان اور ہملٹن کے تاج کا وارث تھا۔ اس کا کہنا تھا "حکومت کا اہم ترین مقصد ملک کے اندر جائداد کو تحفظ فراہم کرنا اور بیرونی دنیا میں ملک کی عزت اور شہرت کو قائم کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اتحاد کی تعلیم دی اور پناہ گزین غلاموں سے دستبرداری اختیار کی۔
>
> بوسٹن کے امراء کے بارے میں انہوں نے لکھا:

یہ بیکن ہل میں بڑی پر تعیش زندگی بسر کر رہے تھے اور اپنے ہمسایوں میں اپنی انسان دوستی اور فن اور کلچر کی سرپرستی کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ یہ لوگ سٹیٹ سٹریٹ میں کاروبار کرتے تھے جب کہ اوورسیئر ان کی فیکٹریوں کو چلاتے، فیجرز ان کی ریلویز کی دیکھ بھال کرتے اور ایجنٹ ان کے آبی وسائل اور زمینوں کی خرید و فروخت میں مصروف رہتے تھے۔

سیاسی استحکام اور معاشی کنٹرول کی کوششیں پوری طرح کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ صنعتی نظام، پر ہجوم شہر، اچانک آنے والے معاشی بحران جو قیمتوں میں اضافے اور بے روزگاری کا موجب بنتے، خوراک اور پانی کی کمی، منجمد کر دینے والی سردیاں، گرمیوں میں تپتے ہوئے اپارٹمنٹس، وبائی امراض، بچوں کی اموات، یہ وہ تمام عناصر تھے جو گاہے گاہے غریبوں کی جانب سے ردعمل کا باعث بنتے۔ بعض اوقات امراء کے خلاف بے ساختہ اور غیر منظم بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بعض اوقات یہ غم و غصہ سیاہ فاموں کے خلاف نسلی نفرت، کیتھولک کے خلاف مذہبی ہنگاموں، مقامی لوگوں میں پناہ گزینوں کے خلاف غیظ و غضب کی صورت اختیار کر لیتا۔ بعض اوقات یہ منظم مظاہروں اور ہڑتالوں کی شکل میں ظاہر ہوتا۔

ان سالوں کے دوران کارکن طبقے میں پائے جانے والے مکمل شعور کے بارے میں حسب معمول ہمیں تاریخ کے مطالعے سے کچھ زیادہ پتہ نہیں چل سکتا، تاہم جو کم و بیش شواہد ہمیں ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح یہ کارکنوں کی بظاہر عملی خاموشی کے پس پردہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ 1827ء میں فلاڈلفیا میں مکینکوں اور مزدور طبقے سے ایک خطاب کے کچھ اقتباس ہم تک پہنچے ہیں جو کہ ایک ان پڑھ مکینک غالباً ایک نوجوان جفت ساز نے لکھا ہے۔

> ہم پر ہر طرف سے ظلم و استبداد ہو رہا ہے۔ ہم سخت محنت کر کے دوسروں کے لیے زندگی کی آسائشیں مہیا کرتے ہیں جن سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جب کہ ہمیں انتہائی قلیل حصہ ملتا ہے۔ اور یہ بھی موجودہ معاشرتی حالات میں مالک کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔

سکاٹ لینڈ کی فرانسس رائٹ جس کا شمار خواتین کے حقوق کی ابتدائی علمبرداروں میں ہوتا تھا اور یوٹوپین سوشلسٹ تھی، کو فلاڈلفیا کے کارکنوں اور مزدوروں نے امریکہ میں اولین لیبر یونینز کی شہر کی سطح پر ایسوسی ایشن سے چار جولائی 1829ء کو خطاب کے لیے مدعو کیا۔ اس نے سوال کیا کہ کیا ''انقلاب اس لیے لایا گیا تھا تا کہ آپ کے ملک کی صنعت کے بیٹوں اور بیٹیوں کو تغافل، غربت، بھوک و افلاس اور بیماریوں کے نیچے کچل دیا جائے'' اس نے خدشہ ظاہر کیا کہ ''نئی ٹیکنالوجی انسانی محنت کی قدر و قیمت کو کم کر رہی ہے۔ ریاستیں انسانوں کو غلام اور ''چائلڈ لیبر'' کے ذہنوں اور جسموں کو اپاہج بنا رہی ہیں۔

اس سال کے آخر میں ''ورکنگ مینز ایڈووکیٹ'' کے پرنٹر اور ایڈیٹر ''جارج ہنری ایونس'' نے ''مزدوروں کا منشور آزادی'' تحریر کیا۔ حقائق کی جو فہرست اس نے ''مخلص اور غیر جانبدار'' شہریوں کے سامنے پیش کی

اس کا کچھ حصہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

> 1۔ ٹیکس عائد کرنے کے قوانین....انتہائی استبدادانہ انداز میں معاشرے کے ایک طبقے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔
>
> 3۔ ''پرائیویٹ انکارپوریشن'' کے قوانین تمام کے تمام جانبدارانہ ہیں....معاشرے کے دوسرے طبقوں کی قیمت پر ایک طبقے کی حمایت کرتے ہیں....
>
> 6۔ قوانین....ملک کے دس میں سے نو افراد کو، جو دولتمند نہیں ہیں، زندگی، آزادی اور خوشیوں کے حصول سے محروم رکھے ہوئے ہیں، مزارعین کے خلاف مالکان کے حق میں ''قانون استحقاق'' ایسے بے شمار قوانین میں سے ایک ہے، جسے یہاں مثال کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔
>
> ''ایونس'' کے نزدیک تمام لوگ بلوغت کی عمر کو پہنچنے پر برابر کی جائداد کے حق دار ہیں۔

1834ء میں بوسٹن میں شہر کی سطح پر قائم ایک ''ٹریڈز یونین'' جس میں چارلس ٹاؤن کے مکینکس اور ''ملن'' کی جفت ساز خواتین شامل تھیں، نے منشور آزادی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

> ہمارے قوانین جو مخصوص مراعات عطا کرتے ہوئے ایک مخصوص طبقے کو دوسرے شہریوں پر مسلط کرنے کا رجحان رکھتے ہیں وہ ان بنیادی اصولوں کے برعکس اور مخالف ہیں....
>
> ہمارا سرکاری نظام تعلیم ایسے تعلیمی اداروں کی فیاضانہ معاونت کرتا ہے۔ جو کہ دولتمند طبقے کی رسائی میں ہیں....جبکہ ہمارے عام سکول کی حالت ایسی دگرگوں ہے کہ....غریب لوگ بچپن ہی سے اپنے آپ کو کمتر خیال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس دور کی باغیانہ تحریکیں روایتی تاریخی کتب میں شامل نہیں ہیں۔ ایسے ہی 1835ء میں بالٹی مور میں ہونے والے ہنگامے ہیں جو اس وقت شروع ہوئے جب ''بنک آف میری لینڈ'' دیوالیہ ہو گیا اور لوگوں کی جمع پونجی ضائع ہو گئی۔ اس کو ایک بہت بڑا دھوکا خیال کرتے ہوئے ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا اور بنک سے تعلق رکھنے والے اسٹیبلشمنٹ کے گھروں کی کھڑکیاں توڑنا شروع کر دیں۔ جب ہنگامہ کرنے والوں نے ایک گھر کو تباہ کر دیا، تو ملیشیا نے حملہ کر کے بیس کے قریب افراد کو مار ڈالا، اور لگ بھگ سو آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ دوسرے دن شام کو دوسرے گھروں پر حملہ کیا گیا۔

ان سالوں میں ٹریڈ یونینز تشکیل پا رہی تھیں۔ عدالتوں نے انہیں کاروبار میں رکاوٹیں ڈالنے کی سازش قرار دیا اور انہیں غیر قانونی قرار دیا۔ نیویارک کے ایک جج نے درزیوں کی ''ایک سازش'' کے خلاف جرمانہ عائد کرتے ہوئے کہا: ''قانون کی پاسداری اور آزادی کی رکھوالی کرنے والی اس سرزمین پر ترقی کے راستے سب پر یکساں کھلے ہوئے ہیں....ہر امریکی اس بات سے بخوبی آگاہ ہے....اسے اپنی

حفاظت کے لیے کسی معنوی اکٹھ کی ضرورت نہیں۔ ایسی سرگرمیاں دراصل بیرونی عناصر کی پیداوار ہیں، اور مجھے پختہ یقین ہے کہ ان کی پشت پناہی بیرونی عناصر کر رہے ہیں۔"

اس فیصلے پر پورے شہر میں ایک اشتہار تقسیم کیا گیا:

دولتمند غریب کے مدمقابل

> اشرافیہ کا آکہ کار جج ایڈورڈز عوام! مکینکس اور کارکنوں کے خلاف آپ کی آزادی پر ایک ہلاکت خیز ضرب!.... انہوں نے یہ نظیر قائم کر دی ہے کہ محنت کش طبقے کو اپنی محنت کی قیمت کے تعین کا کوئی حق حاصل نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ فیصلہ صرف دولتمند افراد ہی کر سکتے ہیں کہ غریب آدمی کی کیا ضروریات ہیں۔

عدالت کے فیصلے کی مذمت کرنے کے لیے "سٹی ہال پارک" میں ستائیس ہزار لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے ایک "کمیٹی آف کارسپانڈنس" کا انتخاب کیا۔ جس نے تین ماہ بعد مکینکوں، کسانوں اور محنت کشوں کے ایک کنونشن کا انتظام کیا، جس کے نمائندگان کا انتخاب نیو یارک ریاست کے مختلف شہروں اور قصبوں کے کسانوں اور محنت کشوں نے کیا تھا۔ کنونشن کا اجلاس ہوا، جس میں موجودہ سیاسی پارٹیوں سے آزادی حاصل کرنے کا اعلان کیا گیا اور "ایکوئل رائٹس" پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی پارٹی قائم کی گئی۔

اگرچہ انہوں نے اپنے امیدوار کھڑے کئے لیکن ووٹ کے ذریعے کسی بڑی تبدیلی کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس تحریک کے ایک آتش بیان مقرر "سیتھ لوتھر" نے جولائی کے مہینے میں ایک جلوس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "ہم سب سے پہلے 'بیلٹ بکس' کو آزمائیں گے۔ اگر اس کے ذریعے ہمارا مقصد حاصل نہ ہو سکا تو ہمارا اگلا اور آخری حربہ 'کارتوسوں کا بکس' ہوگا۔"

1837ء کے بحران کے نتیجے میں مختلف شہروں میں جلوس نکالے گئے، اور جلسے منعقد کئے گئے، بنکوں نے سکوں کی صورت میں ادائیگیاں التواء میں ڈال دی تھیں، جاری کئے گئے بنک نوٹوں کے بدلے "زر مستحکم" میں ادائیگیاں کرنے سے انکار کر دیا۔ محنت کش طبقہ پہلے ہی اشیائے خورونوش خریدنے میں مصائب کا شکار تھا۔ اب آٹے، گوشت اور کوئلے کی قیمتیں ناممکن حد تک تجاوز کر گئی تھیں۔

فلاڈلفیا میں بیس ہزار لوگ جمع ہوئے، اور کسی شخص نے صدر "وان برن" کو اس واقعہ کی اطلاع ان الفاظ میں پہنچائی:

> آج سہ پہر "انڈی پنڈنس سکوائر" میں لوگوں کا ایک کثیر ہجوم، جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، تھا جمع ہوا۔ ان لوگوں کو گزشتہ روز اور گزشتہ رات شہر میں جا بجا بینرز اور پلے کارڈ آویزاں کر کے بلایا گیا تھا یہ سارا کام محنت کش طبقات نے ان لوگوں نے مشورے یا تعاون کے بغیر جو عام طور پر ایسے معاملات میں راہنمائی کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے طور پر

> اور اپنے ذرائع سے انجام دیا۔ آفیسرز اور مقررین کا تعلق انہی طبقات سے تھا.... اس کا رخ بنکوں کے خلاف تھا۔

نیو یارک میں "ایکوئل رائٹس" پارٹی (جسے عام طور پر "لوکوفوکس" کہا جاتا تھا) نے ایک جلسے کا اعلان کیا: "روٹی" "گوشت" کرائے اور ایندھن کی قیمتوں میں کمی ناگریز ہے۔ تمام لوگ خواہ بارش ہو یا دھوپ ہو ہر صورت میں سوموار کی سہ پہر 4 بجے پارک میں جمع ہو جائیں.... انسانیت کے تمام دوستوں کو، جو اجارہ داری اور منافع خوری کے خلاف مزاحمت میں حصہ لینا چاہتے ہیں، شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔" نیو یارک کے اخبار "کمرشل رجسٹر" نے اس جلسے اور بعد کے واقعات کی روئیداد شائع کی۔

> چار بجے سٹی ہال کے سامنے ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو چکا تھا.... مقررین میں سے ایک نے .... عوامی انتقام کا رخ مسٹر ایلی ہارٹ کی جانب پھیر دیا۔ "میرے ہم وطنو!" اس نے کہا: "مسٹر ہارٹ کے سٹور میں اس وقت آٹے کے 53,000 بیرل موجود ہیں۔ آؤ سب مل کر وہاں جائیں اور اسے آٹھ ڈالر فی بیرل کی پیشکش کریں اور دیکھیں کہ وہ کیا جواب دیتا ہے....."
>
> جلسے کے شرکاء کی ایک بڑی تعداد مسٹر ہارٹ کے سٹور کی جانب چل پڑی اور وہاں پہنچ کر آٹے کے سینکڑوں بیرل دروازے اور کھڑکیوں کے راستے باہر سڑک پر پھینک دیئے، تقریباً ایک ہزار بشل (92 سیر کے قریب ایک پیمانہ) گندم اور چار سو یا پانچ سو بیرل آٹا بدمعاشی کے بل بوتے پر بلاوجہ ضائع کر دیا گیا۔ تباہی مچانے والوں میں غیر ملکی سب سے زیادہ سرگرم تھے، اور تقریباً پانچ سو سے ایک ہزار کے لگ بھگ دوسرے افراد جو وہاں کھڑے تھے، اس اشتعال انگیز کارروائی میں ان کی معاونت کر رہے تھے۔
>
> ان ٹوٹے پھوٹے بیرلوں اور گندم کی پھٹی ہوئی بوریوں کے درمیان بے شمار خواتین ٹوکریوں، ڈبوں اور جھولیوں میں بھر بھر کر آٹا اور گندم اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔
>
> اب رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا، لیکن لوٹ مار کی کارروائی برابر جاری تھی جب تک پولیس اور اس کے بعد فوج کے دستے موقع پر نہیں پہنچے۔

یہ 1837ء میں ہونے والا آٹے کا ہنگامہ تھا۔ اس سال معاشی بحران کے نتیجے میں صرف نیو یارک شہر میں 50,000 افراد (محنت کش طبقے کا ایک تہائی) بے روزگار ہو چکے تھے اور پانچ لاکھ کی آبادی میں سے دو لاکھ افراد انتہائی مفلسی اور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

انیسویں صدی کے وسط میں ہونے والے ان منظم اور غیر منظم، پر تشدد اور پر امن مظاہروں، اجلاسوں اور ہنگاموں کا مکمل ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اس وقت ملک اگرچہ ترقی کر رہا تھا شہروں کی آبادی

تیزی سے بڑھ رہی تھی، لیکن محنت کش طبقے کی حالت بہت بری تھی رہائشی سہولیات نا قابل برداشت تھیں ملک کی معیشت بنکاروں، سٹہ بازوں، زمینداروں اور تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔

1835ء میں فلاڈلفیا میں پچاس مختلف صنعتی شعبوں میں ٹریڈ یونینز قائم ہوئیں، اور دس گھنٹے کام کے لیے مزدوروں، فیکٹری کارکنوں، جلد سازوں، زیوات بنانے والوں، کوئلے کی ترسیل کرنے والوں، قصابوں، فرنیچر سازوں نے کامیاب ہڑتالیں کیں۔

1840ء کے عشرے کی ابتداء میں فلاڈلفیا میں جولاہوں نے، جن میں زیادہ تر اپنے مالکان کے لیے اپنے گھروں میں کام کرنے والے آئرش آبادکار شامل تھے، معاوضے میں اضافے کے لیے ہڑتال کی اور جن لوگوں نے ہڑتال میں شامل ہونے سے انکار کیا ان کے گھروں پر حملے کئے گئے، اور ان کے کئے ہوئے کام کو تباہ و برباد کردیا۔ ایک شیرف کی زیرِ نگرانی پولیس کے ایک دستے نے ہڑتالیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، لیکن بندوقوں اور لاٹھیوں سے مسلح چار سو جولاہوں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔

تاہم جلد ہی کیتھولک آئرش جولاہوں اور مقامی پروٹسٹنٹ ہنرمندوں میں مذہب کی بنا پر دشمنی پیدا ہوگئی۔ مئی 1844ء میں فلاڈلفیا کی مضافاتی آبادی کنسنگٹن میں پروٹسٹنٹ کیتھولک ہنگامے شروع ہوگئے۔ متوسط طبقے کی مقامی سیاستدانوں نے ان مخالف گروپس کو مختلف سیاسی پارٹیوں میں شامل کرنا شروع کر دیا (مقامی لوگوں کو امریکی ری پبلکن پارٹی نے اور آئرش آبادکاروں کو ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنالیا) اب طبقاتی جھگڑوں نے پارٹی سیاست اور مذہبی منافرت کا رنگ اختیار کرلیا۔

اس کے نتیجے میں، جیسا کہ کنسنگٹن ہنگاموں کے مورخ ڈیوڈ منٹگمری نے لکھا ہے، فلاڈلفیا کا محنت کش طبقہ ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ جس کی وجہ سے اکثر مورخین اسے طبقاتی کشمکش سے پاک معاشرہ خیال کرتے رہے۔ جبکہ حقیقت میں انیسویں صدی کے امریکہ میں بھی طبقاتی کشمکش دنیا کے کسی بھی دوسرے صنعتی معاشرے میں پائی جانے والی کشمکش جتنی ہی شدید تھی۔

آئرلینڈ میں آلوؤں کی فصل تباہ ہونے کے بعد آئرش کسانوں نے بھوک وافلاس سے نجات حاصل کرنے کے لیے امریکہ کا رخ کرنا شروع کردیا۔ ان آبادکاروں کو پرانے بادبانی جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا جاتا تھا اور ان کے سفر کی داستانیں سیاہ فام غلاموں کو لانے والے، اور بعد میں جرمن، اطالوی اور روسی آبادکاروں کو لے کر آنے والے جہازوں سے کسی طور پر بھی مختلف نہ تھیں۔ ایک ایسے ہی بحری جہاز کی معاصرانہ شہادت ذیل میں پیش کی گئی ہے جو آئرلینڈ سے مئی 1847ء کو یہاں پہنچا اور اسے کینیڈا کی سرحد پر جزیرہ گروس پررو کے رکھا گیا۔

> آبادکاروں کو لانے والے بحری جہازوں پر مختصر ترین سفر کے دوران بھی جس عذاب اور تکلیف کو جھیلنا پڑتا تھا اس کا تصور بھی ناممکن ہے۔ ان پر گنجائش سے کہیں زیادہ انسانوں کو لادا گیا

> ہوتا جن پر بخار اور بیماریاں پوری شدت سے راج کررہی ہوتیں... عملے کا سلوک وحشیانہ اور ظالمانہ ہوتا، اور وہ طاعون کے خوف سے ان کے قریب بھی نہ پھٹکتا تھا... بچوں کی آہ و بکا اور مریضوں کی چیخ و پکار میں، ہر سمت موت ناچتی نظر آتی تھی۔

یہ نئے آنے والے آئرش آبادکار جو خود غربت اور نفرت کا شکار تھے کس بنا پر سیاہ فام غلاموں کے ہمدرد ہو سکتے تھے؟ محنت کش طبقے کے اکثر راہنما سیاہ فاموں کی زبوں حالی کو نظرانداز کئے رکھتے تھے۔ کانگریس کے لیے منتخب ہونے والے نیویارک ٹریڈ یونین کے ایک لیڈر "ایلی مور" نے ایوان نمائندگان میں انسداد غلامی کے حامی لوگوں کی عرضداشتیں وصول کرنے کے خلاف دلائل دیئے۔ نسلی نفرت طبقاتی کشمکش کا ایک آسان متبادل بن چکی تھی۔

دوسری طرف ایک سفید فام جفت ساز نے لِن جفت سازی فیکٹری کے کارکنوں کی اخبار "Awl" میں لکھا:

> ...ہم ایک باقاعدہ فوج کے علاوہ کچھ نہیں، جس نے اپنے تیس لاکھ بھائیوں کو غلامی میں جکڑ رکھا ہے... بنکر ہل یادگار کے سائے میں رہتے ہوئے، ہم انسانیت کے نام پر اپنے حقوق طلب کررہے ہیں اور دوسروں کے یہی حقوق سلب کئے ہوئے ہیں، کیونکہ ان کی جلد سیاہ ہے۔ کیا اس میں کوئی شک باقی رہ جاتا ہے کہ خدا اپنے منصفانہ غضب کے تحت ہمیں ذلت کے کڑوے گھونٹ پینے پر مجبور کرتے ہوئے سزا دے رہا ہے۔

دوسرا معاشی بحران 1857ء میں آیا۔ ریلوے اور صنعتکاری میں اچانک عروج، آبادکاروں کی آمد میں اضافے، حصص اور بانڈز میں بڑھتی ہوئی سٹہ بازی، چوری اور بدعنوانیوں نے تجارت میں فوری گرم بازاری پیدا کی، اور پھر اسی طرح اچانک سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا۔ اس سال اکتوبر تک 2,00,000 افراد بے روزگار ہو چکے تھے۔ اور حال ہی میں آنے والے ہزاروں آبادکار مشرقی بندرگاہوں پر یورپ واپسی کی امید لیے جمع ہونا شروع ہوگئے۔

نیوجرسی کے شہر نیوآرک میں کئی ہزار افراد پر مشتمل جلوس نکلا جو ملازمتوں کا مطالبہ کررہا تھا۔ اور نیویارک میں مین ہٹن میں ٹومپ کنز سکوائر پر پندرہ ہزار افراد جمع ہوئے۔ وہاں سے وہ وال سٹریٹ کی جانب روانہ ہوئے اور سٹاک ایکسچینج کے گرد پریڈ کرتے ہوئے انہوں نے "ہمیں کام چاہیے!" کے نعرے لگائے۔ اس موسم گرما میں نیویارک کی کچی آبادی میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ ایک دن پانچ سو افراد کے مجمعے نے پولیس پر پستولوں اور پتھروں سے حملہ کردیا۔ بیروزگار لوگوں نے روٹی اور کام کا مطالبہ کرتے ہوئے دکانوں کو لوٹنا شروع کردیا۔ نومبر میں ایک ہجوم نے "سٹی ہال" پر قبضہ کرلیا اور اسے خالی کرنے کے لیے امریکی بحریہ کا ایک دستہ آیا۔

1850ء میں ملک کے 60لاکھ محنت کشوں میں پانچ لاکھ خواتین بھی شامل تھیں۔جن میں سے تین لاکھ تین ہزار گھریلو ملازمہ، پچپن ہزار استانیاں تھیں۔فیکٹریوں میں کام کرنے والی ایک لاکھ اکیاسی ہزار خواتین میں سے آدھی ٹیکسٹائل ملز میں کام کر رہی تھیں۔

انہوں نے 1825ء میں اپنے طور پر پہلی خواتین ہڑتال منظم کی۔ یہ "یونائٹڈ ٹیلریسز آف نیو یارک" (درزنوں کی ایک متحدہ تنظیم) تھی، اور ان کا مطالبہ معاوضوں میں اضافہ کروانا تھا۔1828ء میں نیو ہیمپشائر کے شہر "ڈوور" میں مل خواتین کی پہلی ہڑتال ہوئی، جب کئی سو خواتین نے بینرز اور جھنڈوں کے ساتھ جلوس نکالا۔انہیں زبردستی ملوں میں واپس بھیج دیا گیا، ان کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا اور لیڈروں کو ملازمتوں سے نکال کر بلیک لسٹ کر دیا گیا۔

نیو ہیمپشائر ہی کے قصبے "ایگزٹر" میں مل خواتین نے ہڑتال کی، کیونکہ ان کے اوورسیئر زیادہ کام لینے کے لیے گھڑیاں پیچھے کر دیتے تھے۔ان کی ہڑتال کامیاب رہی اور کمپنی نے وعدہ کیا کہ آئندہ اوورسیرز اپنی گھڑیاں درست رکھیں گے۔

"لوول نظام" جس کے تحت نوجوان لڑکیاں ملوں میں کام کرنے جاتیں اور اقامت گاہوں میں رہتی تھیں جن کی نگرانی خواتین میٹرن کرتی تھیں۔شروع میں یہ نظام بہت اچھا نظر آیا، کیونکہ اس سے کام کرنے والی لڑکیوں کو گھر کے کام کاج سے فراغت مل گئی تھی۔ میساچوسٹس میں "لوول" پہلا قصبہ تھا جو ٹیکسٹائل ملز انڈسٹری کے لیے قائم کیا گیا تھا۔اس کا نام دولتمند اور بااثر لوول خاندان کی نسبت سے رکھا گیا تھا۔لیکن یہ اقامت گاہیں اپنے اصولوں اور قوانین کی وجہ سے جیل خانوں جیسی بن گئیں۔رات کا کھانا (جو کہ خواتین کے صبح چار بجے اٹھنے اور رات ساڑھے سات تک کام کرنے کے بعد دیا جاتا تھا) سادی روٹی اور شوربے پر مشتمل ہوتا تھا۔

لہٰذا "لوول" لڑکیاں منظم ہوئیں۔انہوں نے اپنا اخبار جاری کیا۔انہوں نے "ویونگ رومز" کے خلاف احتجاج کیا جن میں روشنی اور ہوا کی آمدورفت کا انتظام نہایت ناقص ہوتا تھا۔گرمیوں میں ناقابل برداشت حد تک گرم اور سردیوں میں نم آلود اور ٹھنڈے ہوتے تھے۔نوجوان خواتین نے "فیکٹری گرلز ایسوسی ایشن" تشکیل دی، اور 1836ء میں پندرہ سو خواتین نے بورڈنگ ہاؤس کے واجبات میں اضافے کے خلاف ہڑتال کی "ہیریٹ ہنسن" مل میں کام کرنے والی ایک گیارہ سالہ لڑکی تھی، بعد میں اس نے دور کو یاد کرتے ہوئے بتایا:

> ....جب میرے کمرے کی لڑکیاں متذبذب اور غیر یقینی حالت میں کھڑی تھیں....میں نے ان کی گفتگو سننے کے بعد خیال کیا کہ یہ باہر نکلنے کو تیار نہیں ہیں۔میں بے صبر ہو کر بچوں جیسی جرأت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے چل پڑی کہ "مجھے پروا نہیں ہے تم کیا کرتی ہو، میں یہ سب کچھ بدلنے کے لیے نکل رہی ہوں، خواہ کوئی اور نکلے یا نہ نکلے۔میں باہر کی جانب چل پڑی اور دوسری میرے پیچھے تھیں، جب میں نے گھوم کر اپنے پیچھے آنے والی لمبی لائن کو دیکھا تو میرا سینہ فخر سے تن گیا۔

ہڑتالیوں نے لوول کی گلیوں میں گیت گاتے ہوئے مارچ کیا۔وہ ایک ماہ تک ڈٹی رہیں، پھر ان کی رقم ختم ہونے لگی انہیں بورڈنگ ہاؤسز سے نکال دیا گیا اور ان میں سے بہت سی واپس کام پر چلی گئیں۔لیڈروں کو ملازمتوں سے نکال دیا گیا، جن میں "ہیریٹ ہنسن" کی والدہ بھی شامل تھی جو کہ ایک بورڈنگ ہاؤس کی میٹرن تھی، اس پر اس کی بیٹی کے ہڑتال میں شامل ہونے کا الزام لگایا گیا۔

مزاحمت جاری رہی لڑکیاں تازہ ہوا، کھلی فضا اور کم پریشانیوں کی حامل طرز زندگی کے تصورات سے چمٹی رہیں۔ان میں سے ایک ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "جون کے خوبصورت موسم میں میں کھڑکی سے جس قدر باہر جھک سکتی تھی جھک جاتی اور کمرے میں مشینوں کے مسلسل شور سے لاتعلق ہونے کی کوشش کرتی۔"

1835ء میں کام کے اوقات کو ساڑھے تیرہ گھنٹے سے گھٹا کر گیارہ گھنٹے کرنے اور معاوضے کی ادائیگی مخصوص دکانوں پر استعمال ہونے والے کوپنوں کے بجائے، نقد رقم کی صورت میں کرنے، اور دیر سے پہنچنے پر جرمانوں کے خاتمے کے لیے بیس ملوں میں ہڑتال ہوئی۔پندرہ ہزار بچے اور والدین ہڑتال پر چلے گئے اور یہ چھ ہفتے جاری رہی۔ہڑتال ناکام بنانے کے لیے ہڑتال توڑنے والے کارکن لائے گئے اور کچھ کارکن اپنے کام پر واپس آ گئے، لیکن ہڑتالیوں نے گیارہ گھنٹے اور اتوار کو نو گھنٹے کام کا مطالبہ منوالیا۔اس سال اور اگلے سال امریکہ کے مشرقی حصے میں 140 ہڑتالیں ہوئیں۔

1837ء کے خوف و ہراس کے بعد جس بحران کا آغاز ہوا اس کے نتیجے میں 1845ء میں "نی میل لیبر ریفارم ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا، جس نے میساچوسٹس کی مقننہ کو دن میں دس گھنٹے کام کے لیے ہزاروں یادداشتیں روانہ کیں۔لیکن قانون ساز کمیٹی نے جواب دیا، کہ کمیٹی نے صورت حال کا بغور جائزہ لیا ہے، کمیٹی کسی بھی صورت میں ملوں کے اندر اور باہر کے حالات اور طریقۂ کار اور صورت حال کو کسی قسم کے مشورے اور قانون سازی سے تبدیل نہیں کر سکتی۔"1840 کے عشرے کے اختتام پر نیو انگلینڈ کی دیہاتی خواتین نے جو ملوں میں کام کرتی تھیں ملازمتیں چھوڑنا شروع کر دیں اور ان کی جگہ آئرش آبادکار لینے لگے۔

نیو جرسی کے قصبے "پیٹرسن" میں ملوں میں ہڑتال کے پہلے سلسلے کا آغاز بچوں نے کیا۔جب کمپنی نے اچانک ان کے دوپہر کے کھانے کا وقت 12 بجے کے بجائے ایک بجے کر دیا۔بچے کام چھوڑ کر باہر نکل آئے والدین نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ان کے ساتھ قصبے کے دوسرے محنت کش افراد بڑھئی، معمار اور مکینکس بھی شامل ہو گئے، جنہوں نے اس جدوجہد کو دس گھنٹے کے دن کی جدوجہد میں تبدیل کر دیا۔تاہم ایک ہفتے کے بعد ملیشیا بلانے کی دھمکی پر بچے واپس کام پر آ گئے اور ان کے لیڈروں کو نکال دیا گیا۔اس کے

کے لیے دوپہر کے کھانے کا وقت دوبارہ 12 بجے بحال کر دیا گیا۔
فوراً بعد مزید پریشانی سے بچنے
میساچوسٹس میں بوسٹن کے شمال مشرق میں فیکٹریوں کے ایک شہر "لین" کے جفت ساز تھے جنہوں نے خانہ جنگی سے پہلے امریکہ کی لمبی ترین ہڑتال کا آغاز کیا۔ "لین" فیکٹریوں میں ہاتھ سے سلائی کرنے والے جفت سازوں کی جگہ سلائی مشین استعمال کرنے کا بانی تھا۔ لین کے فیکٹری کارکن 1830ء کے عشرے میں منتظم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے ایک مزاحمتی اخبار "Awl" نکالنا شروع کیا۔ 1844ء میں مارکس اور اینگلز کے کمیونسٹ مینی فیسٹو کے منظر عام پر آنے سے چار سال قبل "Awl" نے لکھا:

معاشرے کی پیداواری اور غیر پیداواری طبقات کی تقسیم، اور دونوں کے درمیان آمدنی کی غیر منصفانہ تقسیم، ہمیں ایک دوسرے امتیاز سے متعارف کراتی ہے۔ جو کہ سرمایہ اور محنت ہے..... اب محنت ایک جنس بن چکی ہے..... سرمایہ اور محنت ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔

1857ء کے معاشی بحران نے جوتوں کے کاروبار کو ختم کر دیا، اور لین میں بہت سے کارکن بے روزگار ہو گئے۔ سینے والی مشینوں کے خلاف جو جفت سازوں کی جگہ لے رہی تھیں پہلے سے ہی غم و غصہ پایا جاتا تھا، قیمتوں میں اضافہ ہو گیا تھا اور معاوضے بار بار کم کیے جا رہے تھے۔ 1859ء کی خزاں تک دن میں سولہ گھنٹے کام کر کے مرد تین ڈالر اور خواتین ایک ڈالر معاوضہ حاصل کر رہی تھیں۔

1860ء کے آغاز میں لین میں واقع لائسیم ہال میں تین ہزار جفت ساز جمع ہوئے اور واشنگٹن کے یوم پیدائش پر انہوں نے ہڑتال کا آغاز کر دیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر نیو انگلینڈ کے تمام جفت ساز قصبوں میں ہڑتالیں شروع ہو چکی تھیں، پچیس قصبوں میں بیس ہزار جفت سازوں نے ہڑتال کر دی۔ اخبارات نے اسے "شمال میں انقلاب"، "نیو انگلینڈ کے کارکنوں میں بغاوت"، "سرمائے اور محنت کے درمیان مخاصمت کا آغاز" قرار دیا۔

ایک ہزار خواتین اور پانچ ہزار مردوں نے لین میں برفانی طوفان کے دوران امریکی جھنڈے اٹھا کر مارچ کیا۔ خواتین کا ایک بہت بڑا جلوس منظم کیا گیا، برف سے اٹی ہوئی گلیوں میں انہوں نے "امریکی خواتین غلام نہیں بنیں گی" کے بینر اٹھا کر مارچ کیا۔ اس کے دس دن بعد دس ہزار ہڑتالی کارکنوں پر مشتمل ایک جلوس نے، جس میں سالم، ماربل ہیڈ اور دوسرے شہروں کے مرد اور خواتین نمائندگان شامل تھے لین کی گلیوں میں مارچ کیا۔ یہ نیو انگلینڈ میں ہونے والا مزدوروں کا اب تک سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔

بوسٹن سے پولیس اور ملیشیا کے دستے روانہ کیے گئے تاکہ ہڑتالی تیار شدہ جوتوں کی ریاست سے باہر ترسیل میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ ہڑتالیوں کے جلوس نکلنے جاری رہے جب کہ شہر کے کریانہ فروشوں اور پرچون فروشوں نے ہڑتالیوں کو کھانے پینے کی اشیا کی فراہمی جاری رکھی۔ پورے مارچ کے مہینے میں

ہڑتالیوں کے حوصلے بلند رہے لیکن اپریل میں ان کی قوت کمزور ہونا شروع ہو گئی۔ صنعکاروں نے ہڑتالیوں کو واپس لانے کے لیے یونینز کو تسلیم کیے بغیر معاوضوں میں اضافہ کر دیا تاکہ کارکنوں کو اپنے مالکوں کا انفرادی طور پر سامنا کرنا پڑے۔

خانہ جنگی کے دوران شمال اور جنوب دونوں میں طبقاتی امتیاز کو فوجی اور سیاسی اتحاد کے ذریعے دبا دیا گیا تھا۔ اس اتحاد کو فن خطابت کے ذریعے پروان چڑھایا گیا اور طاقت کے زور پر لاگو کیا گیا۔ اس جنگ کو جنگ آزادی کا خوبصورت نام دیا گیا تھا، لیکن محنت کش افراد اگر ہڑتال کی جرأت کرتے تو ان پر فوج کے ذریعے حملے کیے جاتے تھے۔ امریکی فوج کلوریڈو میں انڈینز کا قتل عام کیا، اور وہ لوگ جو لنکن کی پالیسیوں پر تنقید کرنے کی کوشش کرتے انہیں بغیر کسی مقدمے کے جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا تھا، اس وقت جیلوں میں تیس ہزار کے قریب سیاسی قیدی تھے۔

پھر بھی شمال اور جنوب دونوں میں امراء کے خلاف غریبوں میں پائی جانے والی نفرت اور غصے، اور بالا دست معاشی اور سیاسی قوتوں کے خلاف، بغاوت کی صورت میں اتحاد سے انکار کی علامات موجود تھیں۔

جنگ نے شمال میں اشیائے خورد و نوش اور ضروریات زندگی کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ مالکان پہلے سے زیادہ منافع کما رہے تھے جب کہ ملازمین کے معاوضے حسب معمول کم ہی رکھے گئے تھے۔ جنگ کے دوران پورے ملک میں ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ 21 نومبر 1863ء کی "فنچر ز ٹریڈ ریویو" کی سرخی "نیو یارک میں انقلاب" اگرچہ کسی حد تک مبالغہ تھا، لیکن اس دوران مزدوروں کی سرگرمیوں کی فہرست جنگ کے دوران غریبوں کے غم و غصے کی ایک مؤثر شہادت تھی۔

نیو یارک میں محنت کش عوام میں اٹھنے والے ہنگاموں نے شہر اور آس پاس کے سرمایہ داروں کو خوف میں مبتلا کر دیا تھا.....

شیشہ گری کا کام کرنے والوں نے اپنے معاوضے میں پندرہ فی صد کے اضافے کا مطالبہ کیا۔ جیسا کہ ہم اپنی فہرست کے نامکمل ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، تاہم یہ قاری کو قائل کرنے کے لیے کافی ہے کہ اب اس سرزمین پر سماجی انقلاب کی کامیابی ضروری ہو چکی ہے بشرطیکہ محنت کش ایک دوسرے کے ساتھ مخلص رہیں.....

چارلس ٹاؤن نیوی یارڈ میں ہڑتال کے بعد بوسٹن کے محنت کش پیچھے نہیں ہیں.....

شہر میں بگھیاں چلانے والے 800 افراد ہڑتال پر ہیں۔

بحری جہازوں کے بادبان باندھنے والے ہڑتال پر چلے گئے۔

"بوسٹن پوسٹ" کے مطابق جنوبی بوسٹن میں لوہے کے کارخانوں میں اور شہر

کے دوسرے حصوں میں کارکن ہڑتال کا ارادہ کر رہے ہیں۔

جنگ کی وجہ سے بہت سی خواتین دکانوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے لگیں۔ نیویارک شہر میں لڑکیاں صبح 6 بجے سے لے کر آدھی رات تک تین ڈالر ہفتہ کے معاوضہ پر چھتریاں سیتی تھیں۔ بروکلین اور نیویارک میں چھتریاں بنانے والی خواتین نے ہڑتال کر دی تھی۔ ''رہوڈ آئی لینڈ'' کے شہر ''پروویڈنس'' میں ''لیڈیز سگار میکر یونین'' (سگار بنانے والی خواتین کی یونین) تشکیل دی گئی۔

1864ء تک دو لاکھ مرد اور خواتین کارکنان ٹریڈ یونینز میں شامل ہو چکے تھے، جو کچھ صنعتوں میں نیشنل یونینز تشکیل دے رہے تھے اور مزدوروں کے اخبار نکال رہے تھے۔

یونین کے فوجیوں کو ہڑتالیں ختم کرانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ وفاقی فوجیوں کو کولڈ سپرنگز، نیویارک میں بندوقوں کی فیکٹری میں ہڑتال ختم کروانے کے لیے بھیجا گیا، جہاں کارکن اپنے معاوضوں میں اضافے کے طلبگار تھے۔ سینٹ لوئیس میں ہڑتالی مکینکوں اور درزیوں کو فوج نے زبردستی واپس کام پر بھیجا۔

شمال کے سفید فام کارکن اس جنگ کے لیے کسی قسم کا جوش و جذبہ نہیں رکھتے تھے جو سیاہ فام غلاموں'' یا سرمایہ داروں یا کسی بھی دوسرے کے لیے لڑی جا رہی تھی، ان کی دلچسپی صرف اپنی ذات تک محدود تھی۔ وہ خود بھی نیم غلامی کی حالت میں کام کر رہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ جنگ کروڑپتیوں کے نئے طبقے کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔

نیویارک کے آئرش محنت کش افراد جو حال ہی میں یہاں پہنچے تھے اور خود غربت اور مقامی امریکیوں کی نفرت کا شکار تھے۔ وہ بمشکل ہی سیاہ فاموں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ سیاہ فام گودیوں پر مزدوروں، حجاموں، بیروں اور گھریلو ملازموں کے طور پر اور دوسری مختلف ملازمتوں میں ان کے حریف تھے۔ ان ملازمتوں سے نکالے گئے سیاہ فاموں کو اکثر اوقات ہڑتالیں ناکام بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ پھر جنگ شروع ہو گئی فوج میں زبردستی بھرتی کی ابتداء ہوئی جو کہ ایک طرح سے موت کا سندیسہ تھی۔ 1863ء کے جبری بھرتی کے قانون میں امراء فوجی خدمات سے پیسے ادا کر کے یا اپنا نعم البدل دے کر جان چھڑوا سکتے تھے۔

جب جولائی 1863ء میں فوج میں بھرتی شروع ہوئی تو ایک ہجوم نے نیویارک میں فوجی بھرتی کے مرکزی دفتر کو تباہ کر دیا۔ پھر تین دن تک سفید فام کارکنوں کے جتھے عمارتوں، فیکٹریوں، ٹراموں کی پٹریوں اور گھروں کو تباہ و برباد کرتے ہوئے شہر میں گھومتے رہے۔ بھرتی کے خلاف مظاہرے اور ہنگامے پیچیدہ صورت اختیار کرتے ہوئے سیاہ فاموں، امراء اور ری پبلکن کے خلاف رخ پکڑنے لگے۔ بھرتی کے مراکز پر حملوں کے بعد شورش پسند امراء کے گھروں پر حملے کرنے لگے اور پھر سیاہ فاموں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے شہر میں

موجود سیاہ فاموں کے ایک یتیم خانے کو آگ لگا دی۔ گلیوں میں نظر آنے والے سیاہ فاموں کو گولیاں مارنا، جلانا اور پھانسیاں دینا شروع کر دیں۔ بہت سے لوگوں کو دریاؤں میں پھینک کر ڈبو دیا گیا۔

چوتھے دن یونین کی فوجیں گیٹس برگ کی جنگ سے واپس لوٹیں تو انہوں نے شہر میں ہونے والے ہنگاموں پر قابو پایا۔ شاید چار سو آدمی مارے گئے یا ایک ہزار، مرنے والوں کی درست تعداد کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ تاہم مرنے والوں کی تعداد امریکی تاریخ میں کسی بھی مقامی تشدد کے واقعے سے بڑھ کر تھی۔

دوسرے شمالی شہروں، نیوآرک، ٹرائے، بوسٹن ٹولیڈو، ایوانس ویلی میں بھی فوجی بھرتی کے خلاف ہنگامے ہوئے لیکن وہ اتنے طویل اور خونریز نہیں تھے۔ بوسٹن میں مرنے والے آئرش محنت کش تھے جنہوں نے ایک اسلحہ ڈپو پر حملہ کیا اور فوجیوں کی فائرنگ سے مارے گئے۔

جنوب میں سفید فام کنفیڈریسی کے بظاہر اتحاد میں بھی مخاصمت کے عناصر موجود تھے۔ سفید فاموں کی اکثریت، دو تہائی غلاموں کی مالک نہیں تھی۔ کاشت کار اشرافیہ چند ہزار خاندانوں پر مشتمل تھی۔

جنوب کے لاکھوں سفید فام غریب کسان تھے جو جھونپڑیوں اور باہر کھیتوں میں بنے ہوئے متروکہ باڑوں میں رہتے تھے۔ خانہ جنگی کی ابتداء پر مسیسپی کے شہر جیکسن کی ایک کاٹن فیکٹری میں کام کرنے والے سیاہ فام مزدوروں کو بیس سینٹ روزانہ اور سفید فام کارکنوں کو تیس سینٹ روزانہ مزدوری ادا کی جاتی تھی۔

کنفیڈریٹ فوج کے افسانوی جذبے کے پس پشت لڑنے میں بے دلی کی فضا پائی جاتی تھی، کنفیڈریسی کے جبری بھرتی کے قانون میں امراء کے لیے چھوٹ موجود تھی۔ کیا کنفیڈریٹ فوجیوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ وہ محض اشرافیہ کے مفاد میں لڑ رہے ہیں، جن سے ان کا کبھی بھی کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا؟ 1863ء میں رچمنڈ میں روٹی کے ہنگامے ہوئے۔ اس موسم گرما میں مختلف جنوبی شہروں میں فوجی بھرتی کے خلاف ہنگامے ہوئے ستمبر میں موبائل اور الباما میں روٹی کے ہنگامے ہوئے۔ ''جور جیالی ٹاٹم'' اپنی کتاب ''Disloyalty in the Confederacy'' میں لکھتی ہے۔ جنگ کے خاتمے سے پہلے ہر ریاست میں بہت زیادہ بے چینی پیدا ہو چکی تھی، اور بہت سے بے وفاؤں نے اپنے جتھے تشکیل دے لیے تھے اور بعض ریاستوں میں پوری طرح منظم سوسائٹیاں تشکیل دے لی تھیں۔

خانہ جنگی میں فنون جنگ کے جدید حربوں کا پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا، ہلاکت خیز توپوں کے گولے گیٹلنگ گنز (اولین مشین گنز) اور سنگینوں سے حملے، یعنی مشینی جنگ کی بلا امتیاز ہلاکتوں کے ساتھ دست بدست لڑائیاں بھی لڑی گئیں۔ ورجینیا کے شہر پیٹرس برگ میں ایک حملے کے دوران 850 فوجیوں کے دستے میں سے آدھے گھنٹے میں 632 مارے گئے۔ یہ ایک بہت وسیع قتل و غارت تھی دونوں جانب سے 6 لاکھ 23 ہزار افراد مارے گئے اور 4 لاکھ اکہتر ہزار زخمی ہوئے۔ ایک ملک جس کی کل آبادی 31 ملین تھی اس میں ایک

ملین سے زائد افراد مارے گئے اور زخمی ہوئے۔

جیسے جیسے جنگ طول پکڑتی گئی جنوبی فوج میں بھگوڑوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جہاں تک یونین کی فوج کا تعلق ہے اس میں جنگ کے خاتمے تک بھگوڑوں کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود 1861ء میں کنفیڈریسی کے لیے 600,000 افراد نے رضا کارانہ خدمات پیش کیں اور یونین آرمی میں بھی بہت بڑی تعداد رضا کاروں کی تھی۔ حب الوطنی کی نفسیات، خطرات سے کھیلنے کی کشش اور سیاسی لیڈران کی پیدا کردہ اخلاقی جہاد کی فضا نے مل جل کر امراء اور طاقتور طبقے کے خلاف طبقاتی نفرت اور غصے کو دشمن کے خلاف غصے میں تبدیل کر دیا تھا۔

جنگ کے اس شور و غوغے میں جب کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، کانگریس ایسے تمام قوانین پاس کیے جا رہی تھی جو کاروباری طبقے کے حق میں تھے اور لنکن ان پر دستخط کرتے ہوئے انہیں حتمی شکل دیے جا رہا تھا۔ یہ وہ قوانین تھے جن کی راہ میں زراعت پر مبنی جنوب اپنی علیحدگی تک حائل رہا تھا۔ ری پبلکن کا 1860ء کا پلیٹ فارم کاروباری طبقے کے لیے واضح پسندیدگی رکھتا تھا۔ اب 1861ء میں کانگریس نے "مورل ٹیرف" پاس کر دیا۔ اس نے غیر ملکی اشیاء کو مزید مہنگا کر دیا جس کی وجہ سے امریکی صنعتکاروں کو اپنی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کا موقع مل گیا اور امریکی صارف زیادہ قیمت ادا کرنے پر مجبور تھے۔

اگلے سال "ہوم سٹیڈ ایکٹ" پاس کیا گیا۔ جس کے تحت غیر مقبوضہ اور سرکاری مغربی زمین میں سے 160 ایکڑ زمین کسی بھی شخص کو جو اسے کاشت کرے پانچ سال کے لیے دی جانی تھی۔ کوئی بھی شخص جو 1.25 ڈالر فی ایکڑ ادائیگی کرنے پر تیار ہوتا اسے خرید سکتا تھا۔ عوام الناس میں بہت کم لوگ تھے جن کے پاس اس کام کے لیے ضروری 200 ڈالر ہوں۔ لہٰذا سٹہ باز آگے آئے اور انہوں نے بہت سی زمین خرید لی، ہوم سٹیڈ زمین 50 ملین ایکڑ کے قریب تھی۔ لیکن خانہ جنگی کے دوران کانگریس اور صدر نے 100 ملین ایکڑ سے زیادہ زمین مختلف "ریل روڈز" کو بغیر کسی قیمت کے دے دی۔ کانگریس نے حکومت کو بینکاروں کے ساتھ حصہ دار بناتے ہوئے ان کے منافع کی ضمانت دیتے ہوئے نیشنل بنک بھی قائم کیا۔

ہڑتالوں کے عام ہو جانے پر مالکان نے کانگریس سے مدد طلب کی۔ 1864ء میں "کنٹریکٹ لیبر لاء" کے تحت کمپنیوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا تھا کہ وہ غیر ملکی کارکنوں کے ساتھ ملازمت کا معاہدہ طے کر سکیں جب کہ وہ اپنی بارہ ماہ کی تنخواہ نقل مکانی پر اٹھنے والے اخراجات کی مد میں دینے کا وعدہ کر لیں۔ اس سے مالکان کو جنگ کے دوران نہ صرف سستی لیبر مہیا ہونے لگی بلکہ ہڑتال کو توڑنے والے کارکن بھی میسر آنے لگے۔

ان تیس سالوں میں جو خانہ جنگی پر منتج ہوئے عدالتوں میں قانون کی بار بار ایسی تاویلات کی گئیں جو ملک کی سرمایہ دارانہ ترقی کے لیے موزوں تھیں۔ مل مالکان کو اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لیے سیلابوں کے ذریعے دوسروں کی جائداد کو تباہ کرنے کا قانونی حق دے دیا گیا تھا۔ عوامی مفاد میں

کاشتکاروں کی زمینوں پر معمولی قیمتوں کی ادائیگی پر قبضہ کرنے کے قانون کے تحت نہریں نکالنے اور ریلوے بچھانے والی کمپنیوں کو کاشتکاروں کی زمینیں سستے داموں دے دی جاتی تھیں۔

یہ وہ دور تھا جب محنت کشوں کے تحفظ کے لیے بظاہر ہی کسی کوئی قانون موجود نہیں تھا، جیسا کہ آئندہ صدی میں کیا گیا۔ صحت اور تحفظ کے قوانین اول تو موجود ہی نہ تھے یا پھر ان کا اطلاق نہیں کیا جاتا تھا۔ میساچوسٹس میں موسم سرما میں "پیمبرٹن مل" منہدم ہو گئی جب کہ نو سو مزدور جن میں زیادہ تر خواتین تھیں اندر موجود تھے۔ 88 افراد مر گئے۔ اگرچہ اس بات کی قوی شہادت موجود تھی کہ عمارت بھاری مشینری کو سہارنے کے لیے مناسب طور پر تعمیر نہیں کی گئی تھی اور یہ بات تعمیراتی انجینئر کے علم میں تھی جیوری کو "نیت مجرمانہ" کی کوئی شہادت نہ مل سکی۔

خانہ جنگی کے دوران قانون کی عدالتوں میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا خلاصہ "مورٹن ہاروز" اپنی کتاب "دی ٹرانسفرمیشن آف امریکن لاء" میں یوں پیش کرتا ہے۔

> انیسویں صدی کے وسط میں کسانوں، کارکنوں، صارفین اور معاشرے کے دوسرے کمزور طبقات کی قیمت پر تاجروں اور صنعتکاروں کے مفاد میں قانونی نظام کی تشکیل نو کی گئی۔ اس نے عملی طور پر معاشرے کے کمزور ترین طبقات کے خلاف دولت کی قانونی تقسیم نو کو فروغ دیا۔

قدیم ادوار میں دولت اور وسائل کی غلط تقسیم محض طاقت کے زور پر کی جاتی تھی۔ اب جدید ادوار میں استحصال کو تہذیب کا لبادہ اوڑھا دیا گیا تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے قانون کو استعمال کیا جاتا تھا جو بظاہر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ نظر آتا تھا۔

جنگ کے خاتمے کے ساتھ قومی یک جہتی پر توجہ میں کمی ہو گئی اور لوگ اپنی روزمرہ زندگی اور بقا کے مسئلے کی جانب لوٹنے لگے۔ فوج سے فارغ کر دیے جانے والے سپاہی اب کام کی تلاش میں گلی کوچوں کی خاک چھان رہے تھے۔

وہ شہر جن میں فوجی لوٹ کر واپس آئے تھے، موت کے ایسے پھندے تھے جن میں ٹائفس، تپ دق، بھوک اور آتش زنی کا راج تھا۔ نیو یارک میں 1,00,000 افراد کچی آبادیوں کی کال کوٹھڑیوں میں رہ رہے تھے 12,000 خواتین پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے طوائفوں کے کوٹھوں پر کام کر رہی تھیں گلیوں میں دو دو فٹ اونچے کوڑے کے ڈھیر تھے جو چوہوں سے بھرے ہوئے تھے۔ فلاڈلفیا میں امراء کے لیے پینے کا پانی دریائے سکویو کل سے آتا تھا۔ جبکہ باقی تمام لوگ "ڈیلاویر" کا پانی پیتے تھے جس میں ہر روز تیرہ ملین گیلن گٹروں کا پانی پھینکا جاتا تھا۔ شکاگو کی عظیم آتش زنی میں اپارٹمنٹس یکے بعد دیگرے اس تیزی کے ساتھ زمین بوس ہوئے کہ لوگوں نے بتایا یوں محسوس ہوتا تھا گویا زلزلہ آ گیا ہو۔

جنگ کے بعد محنت کش کارکنوں میں آٹھ گھنٹے روزانہ کام کی تحریک شروع ہوئی جس کی معاونت کے لیے پہلی یونینز کا پہلا قومی وفاق، ''نیشنل یونین'' کے نام سے تشکیل دیا گیا۔ نیو یارک میں 100,000 کارکنوں کی تین ماہ کی ہڑتال کے بعد یہ مطالبہ تسلیم کرلیا گیا۔ اور جون 1872ء میں فتح کے جشن میں 150,000 کارکنوں نے شہر میں مارچ کیا۔

جنگ کے دوران صنعت میں آنے والی خواتین نے اپنے آپ کو یونینز میں منظم کیا اور سگار بنانے والیوں، درزنوں، چھتریاں بنانے والیوں، ٹوپیاں بنانے والے، پرنٹرز، دھوبنوں اور جوتے بنانے والیوں کی یونینز وجود میں آئیں انہوں نے ''ڈاٹرز آف سینٹ کرسپن'' تشکیل دی اور پہلی مرتبہ سگار یونین اور نیشنل ٹائپوگرافیکل یونین سے خواتین کے وجود کو تسلیم کرانے میں کامیاب ہوئیں۔

مل کے کام میں پیش خطرات نے منظم ہونے کی کوششوں میں تیزی پیدا کی۔ ملوں میں اکثر چوبیس گھنٹے کام جاری رہتا تھا۔ ''رہوڈ آئی لینڈ'' کے شہر ''پروویڈینس'' میں 1866ء میں ایک رات آگ بھڑک اٹھی۔ وہاں کام کرنے والے 600 کارکنوں، میں جن میں زیادہ تر خواتین تھیں، خوف و ہراس پھیل گیا اور بہت سی خواتین اوپر والی منزل کی کھڑکیوں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

میساچوسٹس کے شہر ''فال ریور'' میں کپڑا بننے والی خواتین نے مرد کپڑا بننے والوں سے علیحدہ ایک اپنی یونین تشکیل دی۔ انہوں نے مزدوری میں 10 فی صد کٹوتی کو جو مردوں نے قبول کرلی تھی قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تین ملوں میں ہڑتال کردی گئی، مردوں کی حمایت حاصل کی، اور 3,200 کارکنوں کی ہڑتال کے نتیجے میں 3,500 کھڈیاں اور 1,56,000 تکلے رک گئے۔ لیکن بچوں کو خوراک کی ضرورت تھی، انہیں آئندہ یونین میں شمولیت اختیار نہ کرنے کے ''آئرن کلیڈ اوتھ'' (جسے بعد میں ''یلو ڈاگ کنٹریکٹ'' کا نام دیا گیا) پر دستخط کرتے ہوئے کام پر واپس آنا پڑا۔

اس وقت سیاہ فام کارکنوں نے محسوس کیا کہ نیشنل لیبر یونین انہیں منظم کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہی ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی یونینز تشکیل دیں اور اپنے طور پر ہڑتالیں شروع کیں۔ مثلاً 1867ء میں الباما کے شہر موبائل میں 1867ء میں سیلابی پشتے بنانے والوں کی ہڑتال، چارلس ٹاؤن میں جہازوں پر سامان لادنے والے سیاہ فاموں کی ہڑتال اور ''سوانا'' میں گودی مزدوروں کی ہڑتال، اس سے غالباً ''نیشنل لیبر یونین'' میں تحریک پیدا ہوئی اور اس نے اپنے 1869ء کے کنونشن میں اعلان کیا کہ وہ ''مزدوروں کے حقوق پر نہ تو رنگ اور نہ ہی جنس کی تفریق کو تسلیم کرتی ہے۔''

تاہم اکثر یونینز نے ابھی تک نیگروز کو شامل نہیں کیا تھا، یا پھر انہیں اپنی علیحدہ یونینز بنانے کا مشورہ دیا تھا۔

نیشنل لیبر یونین نے اپنی زیادہ سے زیادہ توانائیاں سیاسی مسائل خاص طور پر کرنسی

اصلاحات، کاغذی زر (بنک نوٹوں) کے اجراء پر مرکوز کرنا شروع کردیں۔ جیسے جیسے اس نے محنت کشوں کی جدوجہد کو منظم کرنے سے پیچھے ہٹنا شروع کیا اور کانگریس نے اس کے مقاصد کے حصول میں معاونت شروع کردی تو اس کی اہمیت بھی ختم ہوتی چلی گئی۔

اصلاحات کے لیے پہلی مرتبہ قانون سازی کا آغاز ہوا اور لوگوں کی امیدیں بلند تھیں، 1869ء میں پنسیلوانیا کی مجلس قانون ساز نے کان کنی کے تحفظ کا قانون پاس کیا۔ کانوں میں ہوا کی آمدورفت، کان کنی کے عمل کو باضابطہ بنانے اور کان کنوں کی زندگی کے تحفظ کے لیے انتظامات کا حکم دیا اس سے کان کنوں کے رنج اور غصے میں کمی آئی، مجوزہ اہداف کو مکمل طور پر حاصل نہ کیا جاسکا۔

1873ء میں ایک اور معاشی بحران نے قوم کو تباہ کردیا۔ یہ بحران ایک ایسے نظام میں پوشیدہ تھا جس کی بنیادوں میں ابتری پائی جاتی تھی جس میں صرف بہت زیادہ دولتمند لوگ ہی محفوظ تھے۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جو وقتاً فوقتاً بحران کو جنم دیتا تھا (1837ء، 1857ء، 1873ء اور بعد میں 1893ء، 1907ء اور 1929ء کے بحران) جو تمام چھوٹے کاروبار کا صفایا پھیر دیتا اور محنت کش لوگوں کے لیے بھوک و افلاس، سردی اور موت لے کر آتا۔ جبکہ آسٹورز، وینڈر بلٹس، راک فیلرز، مورگنز کی دولت میں امن اور جنگ، بحران اور بحالی ہر دور میں اضافہ ہوتا رہتا۔ 1873ء کے بحران میں اینڈریو کارنیگی سٹیل کی مارکیٹ پر قابض ہوگیا اور ڈی راک فیلر نے تیل کے میدان میں اپنے تمام حریفوں کا صفایا کردیا۔

نومبر 1837ء میں ''نیو یارک ہیرالڈ'' نے ''بروک لین میں لیبر کی شدید کساد بازاری'' کی شہ سرخی لگائی۔ اس نے ان صنعتوں کی فہرست شائع کی جو یا تو بند کردی گئی تھیں یا جن میں مزدوروں کی چھانٹی کردی گئی تھی ان میں ''فیلٹ سکرٹ فیکٹری، پکچر فریم فیکٹری، گلاس کٹنگ فیکٹری اور سٹیل ورکس فیکٹری شامل تھیں۔ خواتین سے متعلقہ صنعتوں میں، خواتین کے ہیٹ بنانے والے، خواتین کے لباس تیار کرنے والے اور چھت ساز شامل تھے۔

1870ء کے پورے عشرے میں کساد بازاری جاری رہی۔ 1874ء کے شروع کے تین مہینوں میں نوے ہزار محنت کشوں کو جن میں تقریباً نصف تعداد خواتین کی تھی کو نیو یارک کے پولیس سٹیشنوں میں سونا پڑا۔ پورے ملک میں لوگوں کو کرایہ ادا نہ کرسکنے پر گھروں سے نکال دیا گیا۔ بہت سے لوگ خوراک کی تلاش میں شہروں میں گھومتے پھر رہے تھے۔ مایوسی کے شکار محنت کشوں نے یورپ اور جنوبی امریکہ جانے کی کوششیں شروع کردیں۔ 1878ء میں ''ایس ایس میٹروپولس'' مزدوروں سے لدا ہوا امریکہ سے جنوبی امریکہ کے لیے روانہ ہوا اور تمام مسافروں سمیت سمندر میں ڈوب گیا۔

پورے ملک میں عوامی اجتماعات اور بے روزگاروں کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ بے روزگاروں کی کونسلیں قائم کی گئیں۔ 1873ء کے آخر میں نیو یارک میں کوپر انسٹی ٹیوٹ میں ایک عوامی جلسہ

منعقد ہوا۔ عوام کی ایک بڑی تعداد نے اس میں شرکت کی، شرکاء چاروں طرف گلیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ جلسے میں مطالبہ کیا گیا کہ کسی بھی بل کو قانونی شکل دینے سے پہلے عوامی ووٹوں کے ذریعے منظوری حاصل جائے، کسی بھی شخص کی ملکیت میں 30,000 ڈالر سے زیادہ رقم نہیں ہونی چاہیے اور انہوں نے دن میں آٹھ گھنٹے کام کا مطالبہ بھی کیا۔

شکاگو میں بیس ہزار بے روزگاروں کا جلوس سڑکوں پر مارچ کرتا ہوا سٹی ہال پہنچا۔ یہ لوگ بھوکوں کے لیے روٹی، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے اور بے گھروں کے لیے گھروں کا مطالبہ کر رہے تھے، اس کے نتیجے میں دس ہزار خاندانوں کی کچھ مدد کی گئی۔

جنوری 1872ء کو محنت کشوں کے ایک بڑے جلوس کو پولیس نے سٹی ہال پہنچنے سے روک دیا۔ یہ ہجوم "ٹومپ کنز سکوائر" پہنچ گیا جہاں پولیس نے انہیں بتایا کہ وہ جلسہ نہیں کر سکتے۔ وہ وہاں کھڑے رہے اور پولیس نے ان پر حملہ کر دیا۔ ایک اخبار نے رپورٹ دی "پولیس کی لاٹھیاں برسنا شروع ہوئیں۔ بچے اور خواتین چیختے ہوئے چاروں سمت بھاگنے لگے۔ بہت سے لوگ اس بھگدڑ میں پیروں کے نیچے کچلے گئے سڑک پر کھڑے تماشائیوں کو پولیس نے گھوڑوں کے سموں کے نیچے کچل دیا اور لاٹھیاں برسائیں۔

یہ وہ وقت تھا جب مالکان ہڑتال توڑنے کے لیے حال میں آنے والے آبادکاروں کو لے کر آئے، جو ملازمتوں کے لیے بے تاب تھے اور ان کی زبان اور کلچر ہڑتالیوں سے مختلف تھا۔ 1874ء میں پٹس برگ کے ارد گرد تار کول والے کوئلے کے علاقے میں ہڑتالی کارکنوں کی جگہ اطالوی باشندوں کو لایا گیا۔ اس کے نتیجے میں منظم کارکنوں اور اطالویوں کے درمیان تلخ جذبات نے جنم لیا اور تین اطالوی قتل کر دیئے گئے۔

1876ء میں اعلان آزادی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر کئی نئے اعلانات سامنے آئے، سفید فاموں اور سیاہ فاموں نے علیحدہ علیحدہ اپنے اوہام کا اظہار کیا۔ ایک "نیگرو اعلان آزادی" میں ری پبلکن پارٹی کی پرزور مذمت کی گئی جس پر انہوں نے کبھی مکمل آزادی کے حصول کے لیے انحصار کیا تھا۔ اور سیاہ فام رائے دہندگان کے لیے آزاد سیاسی کارروائی کی تجویز پیش کی۔ اور ایلینا س کی "ورکنگ مین" کی پارٹی نے شکاگو میں جرمن سوشلسٹوں کے زیر انتظام 4 جولائی کے جشن میں اپنے "اعلان آزادی" میں کہا:

> موجودہ نظام نے محنت کشوں کے استبداد کے لیے سرمایہ داروں کو اپنے مفاد میں قوانین وضع کرنے میں مدد دی ہے۔
>
> اس نے جائیداد کو نمائندگی اور قانون سازی میں غیر متناسب اہمیت دیتے ہوئے جمہوریت کے نام کو جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے جدوجہد کی اور جانیں دیں ایک دھوکا اور فریب بنا دیا ہے۔

> اس نظام نے سرمایہ داروں کو اس قابل بنایا.... کہ وہ مطلب پرست ریلویز کے لیے حکومتی امداد، اندرونی گرانٹس اور قرضہ جات حاصل کر سکیں، جنہوں نے ذرائع آمدورفت پر اجارہ داری قائم کر کے صنعتکاروں اور صارفین دونوں کو لوٹا ہے۔
>
> اس نے نیگروز کی غلامی کے خاتمے کے لیے دنیا کے سامنے خانہ جنگی کا ایک نا معقول ڈرامہ پیش کیا ہے جبکہ حقیقت میں سفید فام آبادی کی ایک بڑی اکثریت کو جس نے قوم کی ساری دولت پیدا کی ہے کو ایک ایسی غلامی میں دھکیلا ہے جو اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور ذلت آمیز ہے۔
>
> لہٰذا ہم شکاگو کے محنت کشوں کے نمائندگان اس عظیم قومی اجتماع میں باضابطہ طور پر اعلان کرتے ہیں....
>
> ہم اس ملک کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کی تمام تر اطاعت سے گلو خلاصی کا اعلان کرتے ہیں آزاد اور خود مختار اشیاء پیدا کرنے والوں کے طور پر خود اپنے قوانین بنانے، اپنی پیداوار کا خود انتظام کرنے اور اپنے اوپر خود حکومت کرنے کے لیے پوری جدوجہد کریں گے۔

1877ء میں ملک کساد بازاری میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان گرمیوں میں گرم علاقے کے شہروں میں جہاں غریب خاندان کال کوٹھڑیوں میں رہتے تھے اور آلودہ پانی پیتے تھے، بچے بہت بڑی تعداد میں بیماریوں کا شکار ہونے لگے۔ "نیویارک ٹائمز" نے لکھا: "پہلے ہی مرتے ہوئے بچوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی ہے جلد ہی، جیسا کہ ہمیں ماضی سے پتہ چلتا ہے، ہر ہفتے شہر میں ہزاروں شیر خوار بچوں کی اموات ہونے لگیں گی۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں جہاں گٹروں کا پانی گلیوں میں بہہ رہا تھا 139 بچے موت کے منہ میں چلے گئے اس سال بارہ شہروں میں ریلوے کارکنوں کی ہنگامہ خیز ہڑتالوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے قوم کو اس قدر جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ تاریخ میں آج تک کسی بھی مزدوروں کی کشمکش نے ایسے اثرات مرتب نہیں کئے تھے۔

ہڑتالوں کا یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ایک ریلوے کے بعد دوسری ریلوے نے معاوضوں میں کٹوتی کرنا شروع کر دی۔ جبکہ صورتحال پہلے سے ہی کم معاوضوں (بارہ گھنٹے کام کرنے والے "بریک مین" کے لیے 1.75 ڈالر روزانہ)، ریلوے کمپنیوں کے منصوبوں اور منافع خوریوں، کارکنوں میں اموات اور زخمی ہونے کے واقعات (ہاتھوں، پیروں، انگلیوں کے کٹنے اور بوگیوں کے درمیان کارکنوں کے پس جانے) کی وجہ سے بہت زیادہ تناؤ کا شکار تھی۔

ویسٹ ورجینیا، مارٹنس برگ میں بالٹی مور اور اوہایو کے سٹیشن پر کارکن معاوضوں کے لیے لڑنے کا تہیہ کرتے ہوئے گاڑیوں سے انجن علیحدہ کر کے شیڈوں میں لے گئے اور اعلان کیا کہ جب تک 10 فی صد کٹوتی کا اعلان واپس نہیں لیا جاتا "مارٹنس برگ" سے کوئی ٹرین روانہ نہیں ہوگی۔

مارٹنس برگ کے یارڈز میں چھ سو مال گاڑیاں پھنس گئی تھیں، ویسٹ ورجینیا کے گورنر نے نئے منتخب ہونے والے صدر "رودر فورڈ ہیس" سے وفاقی فوجی دستے بھیجنے کی درخواست کی۔ امریکہ کی زیادہ تر فوج جنوب میں انڈین جنگوں میں مصروف تھی۔ کانگریس کے پاس فی الحال فوج کے لیے کافی رقم موجود نہیں تھی، لیکن جے پی مورگن، اگسٹ بل مونٹ اور دوسرے بینکاروں نے آفیسر کو ادا کرنے کے لیے رقم کی پیشکش کی (لیکن نچلے رینک کے فوجیوں کے لیے نہیں)۔ وفاقی فوجی مارٹنس برگ پہنچے اور مال گاڑیاں چلنا شروع ہوئیں۔

بالٹی مور میں ریلوے ہڑتالیوں سے ہمدردی رکھنے والے ہزاروں افراد نے نیشنل گارڈ کے اسلحہ خانے کا گھیراؤ کر لیا۔ ہجوم نے اس پر پتھر برسانا شروع کر دیے اور فوجی فائرنگ کرتے ہوئے باہر آئے۔ اب گلیاں خونریز جنگ کا منظر پیش کرنے لگیں۔ جب شام ہونے کو آئی تو دس افراد مر چکے تھے اور اس سے زیادہ بری طرح زخمی ہو چکے تھے، جبکہ ایک فوجی زخمی ہوا تھا۔ 120 میں سے آدھے فوجی نکل گئے اور باقی ماندہ ٹرین ڈپو میں چلے گئے، جہاں دو سو افراد کے مجمعے نے ایک مسافر ٹرین کے انجن کو تباہ کر دیا، پٹری اکھاڑ دی اور ملیشیا کو دوبارہ دوڑیں لگوانا شروع کر دیں۔

اس وقت تک پندرہ ہزار لوگوں نے ڈپو کا گھیراؤ کر لیا۔ اور تین مسافر بوگیاں، سٹیشن کا پلیٹ فارم اور ایک انجن نذر آتش کر دیا۔ گورنر نے وفاقی فوج کے لیے درخواست کی، پانچ سو فوجی آ گئے اور بالٹی مور میں امن ہوا۔

اب ریلوے کارکنوں کی بغاوت مزید پھیل گئی سینٹ لوئیس کے اخبار ری پبلکن کے ایڈیٹر "جوزف ڈکس" نے لکھا:

> تقریباً ہر گھنٹے بعد ہڑتالوں کی خبریں آ رہی تھیں، پنسلوانیا کی عظیم ریاست انتشار کا شکار تھی۔ نیوجرسی ایک دہشت کی گرفت میں تھا، نیویارک میں ملیشیا کے جتھے نظر آ رہے تھے، اوہایو، لیک ایری سے لے کر دریائے اوہایو تک کا علاقہ لرز اٹھا تھا، انڈیانا ایک دہشت ناک تذبذب میں گھرا ہوا تھا، ایلینائس اور خاص کر اس کا عروس البلاد شکاگو ابتری اور گھبراہٹ کے گرداب کے کنارے کھڑا تھا، سینٹ لوئیس پہلے سے ہی بغاوت کے خطرات سے دوچار تھا۔

ہڑتال پٹس برگ اور پنسلوانیا ریلوے تک پھیل چکی تھی۔ ریلوے اور مقامی آفیسرز نے فیصلہ کیا کہ پٹس برگ ملیشیا اپنے ہی شہر کے لوگوں کو نہیں مارے گا، اور فلاڈلفیا کی فوج بلانے پر اصرار کیا۔ اب تک پٹس برگ میں دو ہزار بوگیاں بیکار کھڑی تھیں۔ فلاڈلفیا کے فوجی آ گئے، اور پٹڑی کو صاف کرنے کا کام شروع کیا، ہجوم اور فوجیوں کے درمیان پتھروں اور گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ کم از کم دس افراد مارے گئے، جو

تمام کے تمام محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اور ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ریلوے سے نہیں تھا۔

اب پورا شہر غضب ناک ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایک ہجوم نے فوجیوں کو گھیرے میں لے لیا جو اب انجن شیڈ میں چلے گئے تھے۔ ریلوے کی بوگیوں کو آگ لگا دی گئی عمارتیں جلنا شروع ہو گئیں۔ اور آخر میں انجن شیڈ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ فوجی جان بچانے کے لیے باہر نکل آئے۔ غلے کا ایک بہت بڑا گودام اور شہر کا ایک چھوٹا سا حصہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ چند دنوں میں جو بیس افراد مارے گئے جن میں چار فوجی بھی شامل تھے۔ اناسی عمارتیں جل کر خاکستر ہو گئیں۔ پٹس برگ میں ایک عمومی ہڑتال جیسی کیفیت پیدا ہو گئی، جن میں ملوں کے کارکن، ریلوے بوگیاں تیار کرنے والے، کان کن، مزدور اور کارنیگی سٹیل پلانٹ کے ملازمین شامل تھے۔

پنسلوانیا کی پوری نیشنل گارڈ کے نو ہزار جوانوں کو طلب کر لیا گیا۔ لیکن بہت سی کمپنیاں حرکت میں نہ آ سکیں، کیونکہ دوسرے شہروں کے ہڑتالیوں نے ٹریفک کو بند کر دیا تھا۔ پنسلوانیا کے شہر لبنان میں ایک نیشنل گارڈ کمپنی نے بغاوت کر دی اور ایک جوش، جذبے سے سرشار ہو کر شہر میں مارچ کیا۔ الٹونا میں فوجیوں کو فسادیوں نے گھیر لیا، جو برباد شدہ انجنوں کی وجہ سے مفلوج ہو گئے تھے، انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور فسادیوں کے ساتھ اخوت کا اظہار کیا اور پھر انہیں ایک نیگرو ملیشیا کمپنی کے سیکشن کے ساتھ گیت گاتے ہوئے گھروں کو جانے کی اجازت دی گئی۔

ریڈنگ، پنسلوانیا میں ریلوے تنخواہیں ادا کرنے میں دو ماہ پیچھے تھی، وہاں دو ہزار افراد جمع ہوئے۔ آدمی جنہوں نے کوئلے کی دھول سے اپنے چہرے سیاہ کیے ہوئے تھے، باقاعدہ طور پر پٹڑیاں اکھاڑنے، کانٹوں کو جام کرنے، بوگیوں کو پٹڑیوں سے اتارنے، بوگیوں اور ریلوے کے پلوں کو نذر آتش کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

ایک نیشنل گارڈ کمپنی پہنچی۔ ہجوم نے پتھر برسائے اور پسٹل کے فائر کیے۔ سپاہیوں نے ہجوم پر فائر کیے، چھ آدمی مارے گئے۔ ہجوم بکھر گیا اور زیادہ خطرناک ہو گیا۔ سپاہیوں کے ایک دستے نے اعلان کیا کہ وہ فائر نہیں کریں گے۔ ایک سپاہی نے کہا اس کے بجائے وہ "فلاڈلفیا اینڈ ریڈنگ کول اینڈ آئرن" کے صدر سے گولی پار کرنا پسند کرے گا۔

شکاگو میں کئی ہزار ممبران پر مشتمل "ورکنگ مینز" پارٹی تھی۔ اس کے زیادہ تر ممبران جرمنی اور بوہیمیا کے آبادکار تھے۔ ریلوے کی ہڑتالوں کے دوران 1877ء کے موسم گرما میں اس نے ریلی نکالنے کا اعلان کیا۔ چھ ہزار آدمی جمع ہوئے اور انہوں نے ریلوے کو قومیانے کا مطالبہ کیا۔ البرٹ پارسنز نے شعلہ فشاں تقریر کی، وہ الاباما سے تھا اور خانہ جنگی کے دوران کنفیڈریسی کی جانب سے لڑتا رہا تھا۔ اس نے ہسپانوی اور انڈین خون کی حامل ایک بھوری رنگت والی خاتون سے شادی کی تھی، ٹائپ سیٹر کا کام کرتا تھا

اور "ورکنگ مینز" پارٹی کا ایک شعلہ بیان انگلش بولنے والا مقرر تھا۔

اگلے دن نوجوان لوگوں کا ایک ہجوم، جس کا گزشتہ شام نکلنے والی ریلی سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا ریلوے یارڈ میں آیا، مال گاڑیوں کی آمد و رفت کو روکا، مل کارکنوں، گوداموں میں کام کرنے والے کارکنوں اور مشکین جھیل کے بحری جہازوں کے عملے کو جمع کیا اور اینٹوں اور لکڑی کے گوداموں کو بند کر دیا۔ اس دن البرٹ پارسنز کو شکاگو ٹائمز کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا اور اسے بلیک لسٹ کر دیا گیا۔

پولیس نے ہجوم پر حملہ کر دیا۔ مظاہرین کے سروں میں بلا امتیاز لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں، ہر لاٹھی پر مظاہرین میں سے ایک آدمی گر جاتا، زمین پر ہر طرف گرے ہوئے مظاہرین نظر آ رہے تھے امریکی انفنٹری کی دو کمپنیاں مزید پہنچ گئیں اور نیشنل گارڈز خانہ جنگی میں حصہ لینے والے پہلے سے موجود سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے، پولیس نے ہر لمحہ بڑھتے ہوئے ہجوم پر گولیاں چلائیں اور تین آدمی مارے گئے۔ اگلے دن پانچ ہزار افراد کے ایک مسلح ہجوم نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ پولیس بار بار فائرنگ کرتی رہی۔ جب یہ سب کچھ اختتام کو پہنچا اور مرنے والوں کی گنتی کی گئی، وہ معمول کے مطابق کارکن لڑکے تھے، ان میں سے اٹھارہ کے سر لاٹھیوں سے کچلے ہوئے تھے اور جسم گولیوں سے چھلنی تھے۔

واحد شہر جہاں "ورکنگ مینز" پارٹی نے واضح طور پر باغیوں کی راہنمائی کی سینٹ لوئیس تھا۔ یہ آٹے کی ملوں، فونڈریوں، پیکنگ ہاؤسز، مشین شاپس، شراب سازی اور ریلوے انڈسٹری کا شہر تھا۔ یہاں بھی دوسرے شہروں کی طرح ریلوے کارکنوں کی تنخواہوں میں کٹوتی کی گئی تھی۔ یہاں "ورکنگ مینز" پارٹی کے تقریباً ایک ہزار ممبران موجود تھے جن کا تعلق بیکری، ٹین گری، فرنیچر سازی، سگار سازی اور شراب سازی کی صنعتوں سے تھا۔ پارٹی قومیت کے حوالے سے جرمن، انگلش، فرنچ اور بوہیمین چار سیکشنوں میں منظم تھی۔

چاروں سیکشن کشتیوں کے ذریعے دریائے مسیسپی پار کر کے ریلوے کارکنوں کے جلسہ عام میں شرکت کے لیے مشرقی سینٹ لوئیس میں پہنچے۔ مشرقی سینٹ لوئیس میں ریلوے کارکنوں نے ہڑتال کا اعلان کیا۔ مشرقی سینٹ لوئیس کا میئر ایک یورپی آباد کار تھا۔ جو خود بھی جوانی میں ایک متحرک انقلابی رہ چکا تھا اور ریلوے کے کارکنوں کے ووٹ شہر میں اکثریت سے تھے۔

سینٹ لوئیس میں بھی "ورکنگ مینز" پارٹی نے ایک جلسہ عام کا اعلان کیا جس میں پانچ ہزار لوگ شریک ہوئے۔ انہوں نے ریلوے، کان کنی اور تمام صنعتوں کو قومیانے کا مطالبہ کیا۔

ان جلسوں میں سے ایک میں ایک سیاہ فام نے تقریر کی جو کہ دخانی کشتیوں اور سیلابی پشتوں کی تعمیر کا کام کرتا تھا۔ اس نے کہا: "کیا آپ لوگ بلا امتیاز رنگ و نسل ہمارے ساتھ کھڑے ہو۔" ہجوم نے بلند آواز سے جواب دیا: "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

شہر میں عمومی ہڑتال کے لیے اشتہارات تقسیم کیے گئے۔ دریا کے ساتھ ساتھ دخانی کشتیوں پر

کام کرنے والے بوجھ لادنے والے چار ہزار نیگروز اور چھ سو فیکٹری کارکن نعرے لگاتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور دس ہزار کا مجمع کیمونسٹ مقررین کو سننے کے لیے جمع ہو گیا۔

نیو یارک میں کئی ہزار لوگ "ٹومپ کنز سکوائر" میں جمع ہوئے، ہجوم کا لہجہ اعتدال پسندانہ تھا۔ انہوں نے "ووٹ کے ذریعے سیاسی انقلاب کی بات کی، کہا گیا: "اگر آپ متحد ہو جائیں تو ہم پانچ سال کے اندر سوشلسٹ ریپبلک قائم کر سکتے ہیں...." یہ ایک پر امن جلسہ تھا۔ اور پر امن طور پر برخاست ہو گیا۔ پلیٹ فارم سے جو آخری الفاظ سنے گئے وہ یہ تھے: "اگرچہ ہم غریب لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، لیکن ہمارے پاس آزادی سے بولنے کا حق موجود ہے اور یہ حق ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا"، پولیس نے لاٹھیاں برساتے ہوئے حملہ کر دیا۔

سینٹ لوئیس میں، دیگر کئی مقامات کی طرح، ہجوم کے زور اور جوش و جذبہ کو سنبھالنا مشکل تھا۔ جب جلسہ اختتام کو پہنچا تو پولیس، ملیشیا اور وفاقی فوج آگے بڑھی اور ہڑتالی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور پھر انہیں ریلوے ملازمت سے نکال دیا گیا۔

جب 1877ء میں ہونے والی ریلوے کی یہ عظیم ہڑتالیں اختتام کو پہنچیں تو ایک سو کے قریب آدمی مر چکے تھے اور ایک لاکھ ہڑتالیوں نے شہر کے بے شمار بے روزگاروں کو بھی متحرک کر دیا تھا۔ ہڑتالوں کے عروج کے دوران ملک کی 75,000 میل لمبی ریلوے پٹڑیوں کے نصف سے زیادہ حصے پر مال گاڑیوں کی آمد و رفت رک چکی تھی۔

ریلوے نے کچھ مراعات دیں اور تنخواہوں میں سے کچھ کٹوتیاں واپس لے لیں لیکن اپنی "کول اینڈ آئرن پولیس" کو بھی مضبوط کیا۔ بہت سے بڑے شہروں میں نیشنل گارڈز کے اسلحہ خانہ تعمیر کیے گئے تھے۔ جن میں بندوقوں کے لیے جھروکے بنائے گئے تھے۔

1877ء میں، اسی سال سیاہ فاموں کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ ان کے پاس خانہ جنگی کے دوران کیے گئے مساویانہ سلوک کے وعدے کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے مناسب طاقت نہیں ہے، محنت کش طبقے کو بھی سمجھ آ گئی تھی کہ وہ اس قدر متحد یا طاقتور نہیں ہیں کہ نجی سرمائے اور حکومت کی طاقت کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔

لٹیرے نواب اور باغی

1877ء میں باقی ماندہ صدی کے لیے لائحہ عمل تیار کر لیا گیا تھا: سیاہ فاموں کو پیچھے رکھا جائے گا۔ سفید فام محنت کشوں کی ہڑتالیں برداشت نہیں کی جائیں گی؛ شمال اور جنوب کے ممتاز صنعتکار اور سیاستدان ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے اور انسانی تاریخ کی عظیم ترین معاشی نشوونما کی جانب بڑھنے کے لیے مناسب انتظامات کریں گے۔ اور وہ یہ کام سیاہ فام لیبر، سفید فام لیبر، یورپی آبادکاروں کی لیبر، چینی لیبر اور خواتین کی لیبر کی مدد اور قیمت پر انجام دیں گے۔ اور کارکنوں کو نسل، جنس، قومیت، اور سماجی طبقے کے حوالے سے اس طور پر معاوضے ادا کریں گے کہ یہ لوگ مختلف سطحوں پر استبداد کا شکار رہیں۔ یہ دولت کے اہرام کھڑے کرنے کا ایک دانشمندی سے تیار کیا گیا منصوبہ تھا۔

خانہ جنگی اور 1900ء کے درمیان، دخانی قوت اور برقی قوت نے انسانی قوت کی جگہ لے لی تھی۔ لوہے نے لکڑی کی جگہ لے لی اور لوہے کی جگہ سٹیل نے لے لی تھی (بسمر کے طریقے سے پہلے لوہے کو سٹیل میں تبدیل کرنے کی شرح تین سے چار ٹن روزانہ تھی، اب اتنی ہی مقدار پندرہ منٹ میں تیار کر لی جاتی تھی)۔ مشینیں اب سٹیل کے آلات چلا سکتی تھیں۔ تیل مشینوں کو چکنا کرنے اور گھروں، گلیوں، اور فیکٹریوں کو روشن کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا، لوگوں کی آمدورفت اور سامان کی ترسیل ریلوے کے ذریعے ہو رہی تھی جو کہ سٹیل کی پٹڑیوں پر دخانی قوت سے چلتی تھی۔ ٹیلی فون، ٹائپ رائٹرز اور حسابی مشینوں نے تجارت کے کام کو تیز کر دیا تھا۔

مشینوں نے زراعت کو تبدیل کر دیا تھا۔ خانہ جنگی سے پہلے ایک ایکڑ گندم کاشت کرنے کے لیے 61 گھنٹے کی محنت درکار تھی۔ 1900ء میں یہ کام 3 گھنٹے 19 منٹ میں ہونے لگا۔ مصنوعی برف، اشیائے خورونوش کی لمبے فاصلوں تک ترسیل کو ممکن بنا دیا اور گوشت پیک کرنے کی صنعت نے جنم لیا۔

بھاپ ٹیکسٹائل ملز کے تکلے اور سلائی مشینیں چلانے کے لیے استعمال کی جانے لگی، یہ کوئلے سے پیدا کی جاتی تھی۔ ہوا کے دباؤ سے چلنے والے برموں سے زمین میں کوئلے کے لیے پہلے سے بڑے سوراخ کیے جا سکتے تھے 1860ء میں 14 ملین ٹن کوئلہ نکالا جا رہا تھا، 1884ء میں یہ 100 ملین ٹن تک پہنچ

گیا۔ زیادہ کوئلے کا مطلب زیادہ سٹیل تھا، کیونکہ کوئلے سے جلنے والی بھٹیاں لوہے کو سٹیل میں تبدیل کرتی تھیں۔ 1880ء میں ایک ملین ٹن سٹیل پیدا کیا جا رہا تھا، 1910ء تک یہ 25 ملین ٹن تک پہنچ گیا۔ اب بھاپ کی جگہ برقی قوت نے لینا شروع کر دی تھی۔ بجلی کی تاروں کے لیے تانبے کی ضرورت تھی۔ جو کہ 1880ء میں 30,000 ٹن پیدا کیا گیا اور 1910ء میں 50,000 ٹن پیدا کیا گیا۔

یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے نئے طریقوں اور نئی مشینوں کے لیے ذہین موجدوں، نئی کارپوریشنوں کو چلانے کے لیے ہوشیار ناظمین، زرخیز زمینوں اور معدنیات سے مالا مال ایک ملک، کرتوڑ محنت، مضر صحت اور خطرناک کاموں کے لیے انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی ضرورت تھی۔ یورپ اور چین سے آبادکار آنے لگے جنہوں نے انسانی قوت میں اضافہ کیا۔ کسان جو نئی مشینری خریدنے کے یا ریلوے کے نئے کرایے ادا کرنے کے قابل نہ تھے انہوں نے شہروں کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ 1860ء اور 1914ء کے دوران نیویارک کی آبادی 8 لاکھ 50 ہزار سے 40 لاکھ ہو گئی، شکاگو کی آبادی ایک لاکھ 10 ہزار سے 20 لاکھ اور فلاڈلفیا کی 6 لاکھ 50 ہزار سے 15 لاکھ ہو گئی۔

کچھ موجد خود ہی کاروباروں کے ناظم بن گئے، مثلاً برقی آلات کا موجد تھامس ایڈیسن، جب کہ کچھ تاجروں نے دوسرے لوگوں کی ایجادوں کو اپنے طور پر نئے رنگ میں ترتیب دیا، جیسا کہ شکاگو کے ایک قصاب گستاوس سوفٹ نے برف سے ٹھنڈی کی گئی ریلوے بوگی اور ساتھ برف سے ٹھنڈے کیے گئے گودام کا اکٹھا استعمال کر کے 1885ء میں گوشت پیک کرنے والی اولین نیشنل کمپنی کا آغاز کیا۔ جیمز ڈیوک نے سگرٹ رول کرنے والی نئی مشین کو استعمال کیا جو تمباکو کی ٹیوب کو رول اور پیسٹ کر کے دن میں 100,000 سگرٹ تیار کر سکتی تھی۔ 1890ء میں اس نے چار بڑی سگرٹ ساز کمپنیوں کو اکٹھا کر کے "امریکن ٹوبیکو کمپنی" تشکیل دی۔

جب کہ کچھ کروڑ پتیوں نے غربت سے آغاز کیا تھا لیکن اکثر ایسے نہیں تھے۔ ٹیکسٹائل، ریلوے اور سٹیل انڈسٹری کے 1870ء کے 303 ایگزیکٹو کے ایک مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان میں سے 90 فی صد کا تعلق متوسط یا اعلیٰ طبقے کے خاندانوں کے ساتھ تھا۔ ہاریشو ایلگر کی "چیتھڑوں سے دولتمندی تک" کہانیاں چند لوگوں کی حد تک درست ہیں، لیکن زیادہ تر افسانوی قصے ہیں۔ غریبوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے بہت مفید کہانیاں ہیں۔

زیادہ تر دولت حکومت اور عدالتوں کے گٹھ جوڑ سے سمیٹی گئی۔ بعض اوقات اس گٹھ جوڑ کے لیے پیسے ادا کیے گئے۔ تھامس ایڈیسن نے اپنے فائدے میں قانون سازی کے لیے سیاستدانوں میں سے ہر ایک کو 1000 ڈالر ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ڈینئل ڈریو اور جے گولڈ نے "ایری ریلوے" پر 8 ملین ڈالر کے واٹر سٹاک (کمپنی کے اثاثوں کی اصل مالیت سے زیادہ کے حصص فروخت کرنا) کی فروخت کو قانونی

حیثیت دلوانے کے لیے نیو یارک کی مقننہ کو رشوت دینے کے لیے ایک ملین ڈالر خرچ کیے۔

پہلی بین البراعظمی ریلوے یونین پیسفک اور سنٹرل پیسفک ریلویز کی ملی بھگت سے عوام کے خون پسینے، سیاست اور لوٹ مار کی مدد سے بچھائی گئی۔ سنٹرل پیسفک مغربی ساحل سے مشرق کی جانب بچھانی شروع کی گئی، اس نے 9 ملین ایکڑ مفت زمین اور 24 ملین ڈالر کے حکومتی بانڈز حاصل کرنے کے لیے واشنگٹن میں 200,000 ڈالر رشوت دی اور ایک تعمیراتی کمپنی جو کہ دراصل اس کی اپنی ہی تھی کو 79 ملین ڈالر ادا کیے جو کہ حقیقی اخراجات سے 36 ملین ڈالر زائد تھے۔ اس کی تعمیر تین ہزار آئرش اور 10 ہزار چینیوں کی مدد سے جن کو ایک سے دو ڈالر یومیہ ادا کیے جاتے تھے چار سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔

یونین پیسفک نبراسکا سے مغرب کی جانب بچھانی شروع کی گئی۔ اسے 12 ملین ایکڑ مفت زمین اور 27 ملین ڈالر حکومتی بانڈز کی صورت میں دیئے گئے۔ اس نے "کریڈٹ موبائلر" کمپنی قائم کی، اور اسے تعمیر کے لیے 94 ملین ڈالر ادا کیے جب کہ حقیقی لاگت 44 ملین ڈالر تھی۔ تحقیقات سے بچنے کے لیے اس کے حصص سستے داموں کانگریس کے ارکان کو فروخت کیے گئے۔ یہ کام میساچوسٹس کے کانگریس مین "اوکس ایمس" کے مشورے پر کیا گیا جو کہ بیلچے تیار کرنے والی کمپنی کا مالک اور "کریڈٹ موبائلر" کا ڈائریکٹر تھا، جس نے کہا: "خود اپنی جائداد کی دیکھ بھال کرنے کے لیے لوگوں کا حصول مشکل نہیں ہے۔" یونین پیسفک نے جنگ سے فارغ ہونے والے فوجیوں اور آئرش آبادکاروں پر مشتمل 20 ہزار کارکن استعمال کیے جنہوں نے پانچ میل روزانہ کی شرح سے پٹری بچھانے کا کام کیا، اور سینکڑوں کی تعداد میں سخت گرمی اور شدید سردی اور انڈینز کے ساتھ جھڑپوں میں مارے گئے جو اپنے علاقے میں دراندازوں کی مخالفت کررہے تھے۔

دونوں ریلویز نے راستے میں آنے والے شہروں سے امدادی رقوم حاصل کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ لمبے ٹیڑھے میڑھے راستے اختیار کیے۔ 1869ء میں موسیقی اور تقریروں کے شور و غوغے میں دونوں ریلویز "یوٹاہ" کے مقام پر آپس میں ملادی گئیں۔

ریلویز کی تعمیر میں اس صریح دھوکے کے نتیجے میں ریلوے کی مالیات پر بینکاروں کا کنٹرول اور زیادہ ہوگیا، جو اس کے زیادہ استحکام کے متمنی تھے۔ 1890ء کے عشرے میں ملک کی ریلوے چھ بڑے نظاموں میں مرکوز کردی گئی تھی۔ ان میں سے چار پر مکمل طور پر یا جزوی طور پر "ہاؤس آف مورگن" کا کنٹرول تھا، اور دوسری دو پر کیمن، لیوب اور کمپنی بینکاروں کا کنٹرول تھا۔

مالیتی اختراع کے اس منصوبے کی بھاری انسانی قیمت ادا کرنا پڑی۔ 1889ء میں "انٹرسٹیٹ کامرس کمیشن" کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ریلوے کے 22,000 کارکن مرے اور زخمی ہوئے تھے۔

جے پی مورگن نے جنگ سے قبل ایک بینکار کے بیٹے کی حیثیت سے اچھے کمیشن پر ریلویز

کے حصص بیچنے سے آغاز کیا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران اس نے فوج کے اسلحہ خانہ سے 3.50 ڈالر فی رائفل کے حساب سے 5,000 رائفلز خریدیں اور میدان جنگ میں ایک جنرل کے آگے 22 ڈالر فی رائفل کے حساب سے فروخت کردیں۔ یہ رائفلیں خراب تھیں اور ان کو استعمال کرنے والے فوجیوں کے انگوٹھے اُڑ گئے۔ کانگریس کی کمیٹی نے اس بے ضابطگی پر ایک مختصری مبہم رپورٹ پیش کی، لیکن وفاقی جج نے اس سودے کو قانونی طور پر درست اور جائز قرار دے دیا۔

مورگن خانہ جنگی میں فوجی خدمت سے اپنے ایک بدل کو 300 ڈالر ادا کر کے بچ نکلا تھا۔ اسی طرح جان ڈی راک فیلر، اینڈریو کارنیگی، فلپس آرمو، جے گولڈ اور جیمز میلون بھی لازمی فوجی بھرتی سے بچ گئے تھے۔ میلون کے باپ نے اسے لکھا: ایک شخص اپنی جان کو خطرے میں ڈالے اور اپنی صحت کو قربان کیے بغیر بھی محب الوطن ہوسکتا ہے۔ بہت سی ایسی جانیں ہیں جن کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔"

دولت سمیٹتے ہوئے مورگن نے قومی معیشت میں معقولیت اور نظم پیدا کیا۔ اس نے نظام کو مستحکم رکھا۔ اس کا کہنا تھا، ہم معاشی ہلچل نہیں چاہتے، یعنی ہمیں ایسی معیشت کی ضرورت نہیں: "جہاں ایک دن کچھ ہوا ہو اور دوسرے دن کچھ اور ہوا ہو" اس نے ریلویز کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا، اور ان سب کو بنکوں سے منسلک کیا اور بنکوں کو انشورنس کمپنیوں کے ساتھ منسلک کیا۔ 1900 تک 100,000 میل ریلوے اس کے کنٹرول میں تھی جو کہ کل ملک کی ریلوے کا نصف تھا۔

جان ڈی راک فیلر "کلیولینڈ" میں بک کیپر (کھاتہ نویس) تھا، ایک تاجر بنا اور دولت اکٹھی کی، وہ بھانپ گیا کہ تیل کی نئی انڈسٹری میں، جو شخص آئل ریفائنریز کو کنٹرول کرے گا وہ انڈسٹری کو بھی کنٹرول کرسکتا ہے۔ 1862 میں اس نے پہلی ریفائنری خریدی، اور 1870ء میں "اسٹینڈرڈ آئل کمپنی آف اوہائیو" قائم کی۔ اور ریلویز کے ساتھ خفیہ معاہدہ کیا کہ وہ ان کے ذریعے اپنا تیل بھجوائے گا اگر وہ اسے اپنی قیمتوں میں چھوٹ دیں گے اور اس طرح اپنے حریفوں کو کاروبار سے باہر دھکیل دیا۔ ریفائنری کے ایک مالک نے کہا "اگر ہم بیچتے نہیں ہیں تو ہمیں کچل کر باہر نکال دیا جائے گا۔ مارکیٹ میں صرف ایک خریدار ہے اور ہمیں اس کی شرائط پر بیچنا پڑے گا۔"

اینڈریو کارنیگی سترہ سال کی عمر میں ٹیلی گراف کلرک تھا۔ پھر پنسلوانیا ریلوے کے سربراہ کا سیکرٹری مقرر ہوا، پھر وال سٹریٹ میں بہت بڑے کمشن پر ریلویز بانڈز فروخت کرنے لگا اور جلد ہی لاکھوں پتی ہوگیا۔ 1872ء میں وہ لندن گیا اور سٹیل پیدا کرنے کے بسمر کے نئے طریقہ کار کا مشاہدہ کیا، اور واپس امریکہ آ کر ملین ڈالر کا سٹیل پلانٹ تعمیر کیا۔ کانگریس نے بہت زیادہ محصولات لگوا کر بیرونی ممالک کو مقابلہ سے خارج کردیا۔ 1900 تک وہ 40 ملین ڈالر سالانہ منافع حاصل کررہا تھا۔ اور اسی سال ایک عشائیہ پارٹی میں اس نے اپنی سٹیل کمپنی جے پی مورگن کے آگے فروخت کردی۔ اس نے اس کی

قیمت ایک نوٹ پر لکھ کر اسے دی جو کہ 492,000,000 ڈالر تھی۔

پھر مورگن نے کارنیگی کی کارپوریشن کو دوسری کارپوریشنوں کے ساتھ شامل کرتے ہوئے "یو ایس سٹیل کارپوریشن" تشکیل دی، اور اس ادغام کا بندوبست کرنے کے لیے 150 ملین ڈالر فیس وصول کی۔ اس صورتحال میں حصص اور بانڈز مالکان کو منافع کس طرح تقسیم کیا جا سکتا تھا؟ کانگرس نے بھاری محصولات کے ذریعے بیرونی سٹیل کو مقابلے سے باہر رکھا ہوا تھا۔ 28 ڈالر فی ٹن کی قیمت مستحکم تھی، جبکہ 200,000 افراد روزانہ بارہ گھنٹے اتنے کم معاوضے پر کام کر رہے تھے جس سے وہ بمشکل اپنے خاندان کا پیٹ بھر سکتے تھے۔

تمام انڈسٹریوں میں یہی صورتحال تھی، زیرک اور قابل کاروباری افراد مقابلے کو ختم کرتے ہوئے، بلند قیمتوں کو مستحکم رکھتے ہوئے، معاوضوں کو کم سے کم رکھتے ہوئے اور حکومتی سبسڈیز (امدادی رقوم) کو استعمال کرتے ہوئے بزنس ایمپائرز تعمیر کر رہے تھے، یہ انڈسٹریاں "فلاحی ریاست" کی برکات سے مسلسل فیض یاب ہو رہی تھیں، نئی صدی کی ابتدا پر "امریکن ٹیلی فون اور ٹیلی گراف" کی ملک کے ٹیلیفون نظام پر مکمل اجارہ داری تھی۔ "انٹرنیشنل ہارویسٹ" زرعی مشینری کا 85 فی صد تیار کر رہی تھی، اور دوسری تمام صنعتوں میں بھی وسائل پر چند افراد کا اجارہ تھا۔

بنک ان اجارہ داریوں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے، انہوں نے طاقتور کارپوریشن ڈائریکٹروں کو ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح منسلک کر دیا تھا۔ جن میں سے ہر ایک بہت سی دوسری کارپوریشنوں کے بورڈ میں بیٹھتا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں سینیٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق مورگن اپنے عروج کے دوران اڑتالیس کارپوریشنوں کے بورڈز کا ممبر تھا، اور راک فیلر سینتیس کارپوریشنوں کے بورڈز میں بیٹھتا تھا۔

اس دوران امریکہ کی حکومت بالکل وہی کردار ادا کر رہی تھی جو کارل مارکس نے سرمایہ دار ریاست کا بیان کیا تھا۔ نظم و نسق کے قیام میں غیر جانبداری کا ڈھونگ رچاتی، لیکن امراء کے مفادات کو تحفظ فراہم کرتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ امراء آپس میں متفق تھے، پالیسیوں پر ان میں اختلافات موجود تھے، لیکن ریاست کا مقصد اعلیٰ طبقہ کے اختلافات کو پرامن طور پر ختم کرنا، نچلے طبقے کی بغاوت کو قابو کرنا اور ایسی پالیسیاں اختیار کرنا تھا، جو نظام کے طویل المدتی استحکام کا موجب بنیں۔ 1877ء میں روڈرفورڈ ہیس کو منتخب کرنے کے ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز کے درمیان ہونے والے بندوبست نے معاملہ طے کر دیا تھا۔ خواہ ڈیموکریٹس جیتیں یا ری پبلکنز قومی پالیسی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئے گی۔

جب گورنر کلیولینڈ جو کہ ڈیموکریٹ تھا 1884ء میں صدارت کے لیے کھڑا ہوا تو ملک میں عمومی تاثر تھا کہ وہ اجارہ داریوں اور کارپوریشنوں کی قوت کا مخالف ہے، اور ری پبلکن پارٹی جس کا امیدوار

جیمز بلین تھا امراء کے حق میں ہے، لیکن جب کلیولینڈ نے بلین کو شکست دے دی تو جے گولڈ نے اسے ٹیلی گرام بھیجی، میں سمجھتا ہوں کہ...." ملک کے وسیع تر کاروباری مفادات آپ کے ہاتھوں میں مکمل طور پر محفوظ رہیں گے...." اور وہ درست تھا۔

کلیولینڈ نے خود صنعتکاروں کو یقین دلایا کہ اس کے انتخاب سے انہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے "جب تک میں صدر رہوں گا کسی بھی انتظامی پالیسی کے نتیجے میں کاروباری مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا.... عاملہ کے اختیارات ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کے پاس جانے کا مطلب موجودہ صورتحال میں کوئی بڑا ردوبدل ہرگز نہیں ہوتا۔"

صدارتی انتخابات میں حقیقی وسائل سے پہلوتہی برتی گئی تھی۔ یہ معمول کی انتخابی مہمات کی طرح نظر آتے تھے، پارٹیوں میں پائی جانے والی بنیادی مماثلت کو شخصیات، افواہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اجاگر کرتے ہوئے چھپایا گیا تھا، ہنری ایڈمز جو کہ اس دور کا ایک زیرک ادبی نقاد تھا، نے اپنے ایک دوست کو لکھا:

> ہماری سیاست اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا.... بہت بڑے بڑے مسائل کا سامنا ہے.... لیکن دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کوئی بھی حقیقی مفادات کی بات نہیں کرتا۔ ایک مشترکہ رضامندی کے تحت ان کو جوں کا توں رکھنے پر متفق ہیں.... اس کے بجائے پریس ایک انتہائی دلچسپ جھگڑے میں مصروف ہے کہ آیا کلیولینڈ ایک ناجائز بچے کا باپ ہے اور کیا یہ ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ رہ رہا ہے یا نہیں۔

1887ء میں خزانے میں فاضل دولت کی موجودگی میں کلیولینڈ نے ٹیکساس کے کسانوں کو خشک سالی کے دوران بیج خریدنے کے لیے 100,000 ڈالر کی امدادی رقم ادا کرنے کے بل کو ویٹو کر دیا۔ اس کا کہنا تھا: "ایسے معاملات میں وفاقی مدد.... حکومت کی جانب سے پدرانہ نگہداشت کی توقع کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جو کہ قومی کردار کی مضبوطی کو کمزور کرنے کا باعث بنتی ہے۔" لیکن اسی سال اپنے فاضل سونے کے ذخائر کو دولت مند بانڈز ہولڈرز کو بانڈز کی حقیقی قیمت 100 ڈالر پر 28 ڈالر زائد ادا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ دولتمند افراد کی خدمت میں 45 ملین ڈالر سے زائد کا ایک تحفہ تھا۔

کلیولینڈ انتظامیہ کی اہم اصلاحات نے امریکی اصلاحی قانون سازی کا پول کھول دیا۔ 1887ء کے "انٹرسٹیٹ کامرس" ایکٹ کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ریلویز کو مسافروں کے حق میں بہتر بنانے کے لیے استعمال ہوگا۔ لیکن "رچرڈ اولنے" نے جو کہ "بوسٹن اینڈ مین" اور دوسری ریلوز کا وکیل تھا اور جلد بعد کلیولینڈ کا اٹارنی جنرل بن گیا تھا، ریلوے آفیشلز کو جو کہ "انٹرسٹیٹ کامرس کمیشن" کے شاکی تھے بتایا کہ "ریلوے کے نقطہ نظر سے" کمیشن کو ختم کرنا عقلمندی نہیں ہوگی۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

کمیش....ریلویز کے لیے بہت فائدہ مند ہو سکتا ہے یا ہے۔ یہ ریلویز پر حکومتی نگرانی کے عوامی مطالبے کو پورا کرتا ہے، جبکہ حقیقت میں یہ نگرانی برائے نام ہی ہو گی.... عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کمیشن کو ختم نہ کیا جائے بلکہ اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

ری پبلکن ک کا بنجمن ہیری سن جو کہ کلیولینڈ کے بعد 1889ء سے 1893ء تک صدر منتخب ہوا، ریلویز کا وکیل رہ چکا تھا، اور 1877ء کی ہڑتال کے دوران فوجیوں کی ایک کمپنی کی کمان کر چکا تھا۔ ہیری سن کی صدارت کے دوران بھی اصلاحات کا سلسلہ جاری رہا۔ 1890ء میں "شرمین اینٹی ٹرسٹ ایکٹ" پاس ہوا، جس کے تحت کسی بھی ایسے اتحاد یا سازش کو غیر قانونی قرار دیا گیا جو ریاستوں کے درمیان بیرونی تجارت کو محدود یا پابند رکھنے کا باعث بنے۔ اس ایکٹ کے محرک سینیٹر جان شرمین نے کہا کہ یہ اس لیے ضروری ہے تا کہ اجارہ داری پر تنقید کرنے والوں کو مطمئن کیا جا سکے۔ "آپ کو لازماً ان کے مطالبے پر کان دھرنے ہوں گے ورنہ پھر "سوشلسٹوں" کیمونسٹوں اور مروجہ نظام کے مخالفین کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ معاشرے میں ایسی قوتیں سر اٹھا رہی ہیں جن کو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا گیا تھا....

1892ء میں کلیولینڈ دوبارہ منتخب ہو گیا اس مرتبہ اسے ملک میں ہونے والے ہنگاموں کا سامنا کرنا پڑا جو کہ 1893ء کی کساد بازاری اور عوام میں پائے جانے والے خوف و ہراس کی وجہ سے شروع ہوئے تھے۔ اس نے بے روزگار افراد پر مشتمل واشنگٹن میں مظاہر کرنے والے "کوکسی کے جتھے" (Coxey Army) کو منتشر کرنے کے لیے فوج کا استعمال کیا، اور اگلے سال ریلویز کی قومی ہڑتال کو توڑنے کے لیے دوبارہ فوج استعمال کی۔

اس دوران سپریم کورٹ اپنے نظر آنے والے "سنجیدہ سیاہ پوش انصاف" کے باوجود حکمران اشرافیہ کے مفاد میں کام کر رہی تھی۔ یہ کس طرح آزاد ہو سکتی تھی جبکہ اس کے ممبران کا انتخاب صدر کرتا تھا، اور سینیٹ ان کی تصدیق کرتی تھی؟ یہ غریب اور امیر کے درمیان غیر جانبدار کیسے ہو سکتی تھی جبکہ اس کے ممبران اکثر سابقہ، دولتمند وکلاء ہوتے تھے، اور ان کا تعلق ہمیشہ معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے ہوتا تھا؟ انیسویں صدی کے شروع میں کورٹ نے ریاستوں کے درمیان تجارت پر وفاقی کنٹرول کو قائم کرتے ہوئے قومی طور پر منظم کی گئی معیشت کے لیے قانونی بنیادیں مہیا کر دیں، اسی طرح معاہدے کو مقدس قرار دیتے ہوئے کارپوریٹ سرمایہ داری کے لیے قانونی بنیاد مہیا کی۔

1895ء میں عدالت نے "شرمین اینٹی ٹرسٹ ایکٹ" کو بے ضرر بنانے کے لیے اس کی تشریح کی۔

چودھویں ترمیم کی منظوری کے فوراً بعد سپریم کورٹ نے سیاہ فاموں کے تحفظ کے حوالے سے اس کی حیثیت کو کمزور کرنا اور اسے کارپوریشنوں کے تحفظ کے لیے استعمال کرنے کی راہیں نکالنا شروع کر

دیں۔ 1886ء میں سپریم کورٹ نے 230 حکومتی قوانین کو ختم کر دیا جو کہ کارپوریشنوں کے معاملات کو منظم کرنے کے لیے پاس کئے گئے تھے۔

1893ء میں سپریم کورٹ کے جسٹس ڈیوڈ جے بریور نے "نیو یارک سٹیٹ بار ایسوی ایشن" سے خطاب کرتے ہوئے کہا "قوم کی دولت کا چند ہاتھوں میں ہونا ایک غیر متبدل قانون ہے......"

یہ محض 1880ء اور 1890ء کے عشروں میں پایا جانے والا ایک من موجی خیال نہیں تھا بلکہ یہ بانی بابوں تک پہنچتا ہے۔ جنہوں نے اپنی قانون کی تعلیم "بلیک سٹون کنٹریز" کے دور میں حاصل کی تھی جس کے مطابق "ذاتی جائداد کے قانون کو اس قدر احترام حاصل ہے کہ اس سے معمولی سے انحراف کا بھی جواز موجود نہیں، یہاں تک کہ پورے معاشرے کے مشترکہ مفاد کی خاطر بھی اس میں انحراف کی گنجائش موجود نہیں۔

جدید دور میں کنٹرول کو قائم رکھنے کے لیے طاقت اور قانون سے بڑھ کر بھی کچھ عوامل کی ضرورت ہے۔ شہروں اور فیکٹریوں کے ارد گرد ایسے گنجان آباد علاقے وجود میں آئے جہاں کے باسیوں کی زندگیوں میں بغاوت کے جذبات بھرے ہوئے تھے، ان لوگوں کو یہ سبق دینے کی ضرورت تھی کہ جو جیسا بھی ہے سب ٹھیک ہے۔ لہٰذا سکولوں، چرچوں اور عوامی ادب میں یہ سبق دیا جاتا تھا کہ دولتمند ہونا فضلیت کی علامت ہے جبکہ غریب ہونا ذاتی اور شخصی ناکامی کا نتیجہ ہے۔ غریب آدمی کے لیے دولت کا حصول غیر معمولی محنت کا مرہون منت ہے اور غیر معمولی قسمت کا متقاضی ہے۔

ایسے دولتمند افراد کو جو اپنی بے شمار آمدنی کا ایک حصہ تعلیمی اداروں کے لیے وقف کر دیتے تھے انسان دوست خیال کیا جاتا تھا۔ راک فیلر پورے ملک میں کالجوں کو چندے دیتا تھا اور یونیورسٹی آف شکاگو کے قیام میں دل کھول کر مدد کی، "سینٹرل پیسیفک" کے ہنگٹن نے دو نیگرو کالجوں ہیمپٹن انسٹی ٹیوٹ اور ٹسکیگی انسٹی ٹیوٹ کو رقوم دیں۔ کارنیگی نے کالجوں اور عوامی لائبریریوں کو رقوم دیں۔ "جونز ہاپکنز یونیورسٹی" کی بنیاد ایک کروڑ پتی تاجر نے رکھی۔ اور کروڑ پتی کورنیلس وینڈر بلٹ ایزرا کورنل، جیمز ڈیوک اور لی لینڈ سٹینفورڈ نے اپنے ناموں کے ساتھ یونیورسٹیاں قائم رکھیں۔

یہ تعلیمی ادارے اختلاف رائے اور معاشرتی نزاع کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے متوسط افراد کو امریکی نظام کے مطابق تربیت دی۔ اساتذہ، ڈاکٹرز، وکلاء، ناظمین، انجینئرز، ٹیکنیشنز، اور سیاستدانوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جو نظام کو جاری و ساری رکھنے میں مددگار ثابت ہوا اور بدامنی کے خلاف ایک وفادار روک کا کام کر سکیں۔

اس دوران سرکاری سکولوں نے کارکنوں کی پوری نسل کو پڑھنے، لکھنے اور حساب کتاب کے قابل بنا دیا، اور نئے صنعتی دور کے لیے خواندہ محنت کش طبقہ پیدا کیا۔ اہم بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو حکام کی تابعداری سکھائی گئی تھی۔ ایک صحافی جس نے 1890ء کے عشرے میں سکولوں کا جائزہ لیا لکھتا ہے "استاد کا

سخت رویہ صاف طور پر نظر آتا ہے، شاگرد مکمل طور پر اس کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں وہ بے حس و حرکت اور خاموش نظر آتے ہیں، کمرہ جماعت کا ماحول حوصلہ شکن اور بے مہر ہوتا ہے۔"

یہ عمل بیسویں صدی میں بھی جاری رہا، جب ولیم بیگلے کی "کلاس روم مینجمنٹ" اساتذہ کی تربیت کے لیے ایک معیاری کتاب بن گئی اور اس کے تیس ایڈیشن شائع کیے گئے۔ بیگلے نے لکھا: ایک شخص جو تعلیمی نظریہ کا ٹھیک طور پر مشاہدہ کرتا ہے، وہ کمرہ جماعت کے کٹھ پتلی معمول میں ان تعلیمی قوتوں کو دیکھ سکتا ہے جو بچے کو ایک ننھے وحشی سے، قانون اور ضابطے پر عمل کرنے والی مخلوق میں تبدیل کر رہی ہوتی ہیں، جو مہذب معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط اور اختتام پر ہائی سکولوں کو صنعتی نظام میں معاونت کے لیے پروان چڑھایا گیا۔ حب الوطنی کو پروان چڑھانے کے لیے تاریخ کے مضمون کو وسیع طور پر نصاب میں شامل کیا گیا۔ اساتذہ کے تعلیمی اور سیاسی معیار کو کنٹرول کرنے کے لیے وفاداری کے حلف، ٹیچر سرٹیفیکیشن اور شہریت کی شرط کو متعارف کروایا گیا۔ صدی کے آخر میں سکول اسٹیبلشمنٹ کو (جو اساتذہ نہیں تھے) ٹیکسٹ بکس پر بھی کنٹرول دے دیا گیا۔ ریاستوں نے مخصوص قسم کی ٹیکسٹ بکس پر پابندی کا قانون پاس کیا۔ مثال کے طور پر "ایڈاہو" اور "مونٹانا" نے ایسی نصابی کتب پر پابندی عائد کر دی جو سیاسی نظریات کا پرچار کرتی تھیں۔

دقیانوسیت اور فرمانبرداری کو فروغ دینے والے اس علم اور تعلیم کے عظیم ریلے کے خلاف اختلاف رائے اور احتجاج پر مبنی ادب نے جنم لیا، جو عظیم رکاوٹوں کی موجودگی میں بھی ایک قاری سے دوسرے قاری تک اپنا راستہ بناتا رہا۔ فلاڈلفیا کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک محنت کش ہنری جارج نے "جس نے اپنے طور پر تعلیم حاصل کی اور صحافی اور ماہر معیشت بن گیا، ایک کتاب لکھی جو 1879ء میں شائع ہوئی اور نہ صرف امریکہ میں بلکہ پوری دنیا میں اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس کی کتاب "Progress and Poverty" میں یہ دلیل دی گئی تھی کہ دولت کی بنیاد زمین ہے، اس پر اجارہ داری قائم کر دی گئی ہے اور زمین پر محض ایک ٹیکس سے باقی تمام ٹیکسوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور اس سے اتنی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے جس سے غربت کے مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے اور قوم میں دولت کی مساوی تقسیم کی جا سکتی ہے۔

میساچوسٹس کے ایک وکیل اور مصنف "ایڈورڈ بیلامے" کی طرف سے معاشی اور سماجی نظام کو ایک مختلف قسم کے چیلنج کا سامنا ہوا۔ اس نے سادا اور دلچسپ زبان میں "Looking Backward" کے نام سے ایک ناول لکھا۔ جس میں مصنف گہری نیند سو جاتا ہے اور سن 2000ء میں جاگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اشتراکی معاشرے میں پاتا ہے جس میں لوگ باہمی تعاون کے ساتھ کام کرتے اور زندگیاں بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ "لکنگ بیک ورڈ" کی، جس میں اشتراکیت کو بڑے واضح اور خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا تھا، چند سالوں کے اندر اندر لاکھوں کاپیاں فروخت ہو گئیں، اور پورے ملک میں اس خواب کو حقیقت

کا روپ دینے کے لیے ایک سو سے زیادہ گروپ منظم ہو گئے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت، کاروباری افراد، چرچوں، سکولوں کی جانب سے لوگوں کی سوچ پر کنٹرول کرنے کی انتھک کوششوں کے باوجود، لاکھوں امریکی موجودہ نظام پر کی گئی شدید تنقید پر کان دھرنے اور زندگی بسر کرنے کے دوسرے طریقوں کے بارے میں سوچنے کے لیے تیار تھے۔ انہیں محنت کشوں اور کسانوں کی ان عظیم تحریکوں سے تقویت ملی جنہوں نے 1880ء اور 1890ء کے عشروں میں پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ تحریکیں 1830ء اور 1877ء کے دوران جنم لینے والی ہڑتالوں اور مزارعین کی جدوجہد سے بہت آگے نکل گئی تھیں، یہ پورے ملک میں اٹھنے والی ایسی تحریکیں تھیں، جو حکمران اشرافیہ کے لیے پہلے کی نسبت بہت زیادہ دھمکی آمیز اور خطرناک طور پر معنی خیز تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ کے اہم شہروں میں انقلابی تنظیمیں موجود تھیں اور ہر طرف انقلابی باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔

1880ء اور 1890ء کے عشروں میں یورپ سے آبادکاروں کی آمد میں پہلے سے زیادہ تیزی آ چکی تھی۔ وہ سب کے سب غریب لوگ ایک خوفناک بحری سفر میں سے گزر کر آتے تھے۔ اس مرتبہ جرمن اور آئرش آبادکاروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی، یہ لوگ جنوبی اور مشرقی یورپ سے آنے والے روسی، اطالوی، یہودی اور یونانی تھے۔ جو کہ مقامی پیدا ہونے والے اینگلوسیکسن کے لیے پہلے آنے والے لوگوں کی نسبت زیادہ اجنبی تھے۔

ان مختلف نسلی گروہوں کی آمد سے محنت کش طبقہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ آئرش لوگوں کو ابھی تک وہ نفرت یاد تھی جس کا سامنا یہاں آمد پر انہیں کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے نئے سیاسی سربراہوں کے پاس ملازمتیں حاصل کرنا شروع کر دی تھیں جو ان کے ووٹوں کے متمنی تھے۔ وہ جو پولیس میں بھرتی ہو گئے تھے ان کی مڈبھیڑ نئے یہودی آبادکاروں سے ہوئی۔ 30 جولائی 1902ء میں نیویارک کی یہودی برادری نے ایک اہم "ربی" کی وفات پر بہت بڑے جنازے کا بندوبست کیا اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا، جس کی راہنمائی آئرش لوگوں نے کی جو کہ یہودیوں کے اپنی ہمسائیگی میں آنے پر نالاں تھے۔

نئے آنے والے آبادکاروں کے درمیان ایک شدید معاشی مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ ریلوے کمپنیوں نے کمر توڑ محنت اور کم معاوضوں پر کام کرنے کے لیے چینی مزدوروں کو درآمد کیا تھا، 1880ء تک کیلیفورنیا میں ان کی تعداد 75,000 تک پہنچ گئی تھی جو کہ کل آبادی کا دسواں حصہ تھی۔ ان کو مسلسل تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ "راک سپرنگز" میں 1885ء کی گرمیوں میں سفید فاموں نے پانچ سو چینی کان کنوں پر حملہ کر دیا اور اٹھائیس چینیوں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔

اس دوران مزدور بچوں کی تجارت پروان چڑھی، یہ بچے یا تو والدین کے ساتھ معاہدے کے تحت حاصل کیے جاتے یا پھر اغواء کر لیے جاتے تھے۔ اس کے بعد بچوں کی غلاموں کی طرح نگرانی کی جاتی، بعض اوقات بھکاری موسیقاروں کے طور پر باہر بھیجے جاتے۔ بچے ریوڑوں کی صورت میں نیو

یارک اور فلاڈلفیا کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔

جیسے ہی آبادکاروں کو شہری حقوق حاصل ہوتے، انہیں امریکہ کے دو پارٹی نظام میں شامل کر لیا جاتا اور انہیں کسی ایک پارٹی کے ساتھ وفاداری کے لیے کہا جاتا تھا۔ ان کی سیاسی قوت کو انتخابات کے ذریعے نچوڑ لیا جاتا تھا۔ نومبر 1894ء میں "ایل اٹالیا" میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اطالوی باشندوں کی ری پبلکن کی حمایت کے لیے کہا گیا۔ آئرش اور یہودی ڈیموکریٹس کی حمایت میں تھے۔

1880ء میں عشرے میں 5.5 ملین اور 1890 کے عشرے میں 4 ملین آبادکار آئے اور یوں مزدوروں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے معاوضوں کی شرح کم رہی۔ آبادکار مقامی مزدوروں کی نسبت زیادہ بے یار و مددگار تھے۔ اور ان پر کنٹرول کرنا آسان تھا۔ وہ تہذیبی طور پر بے خانماں تھے اور ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس لیے یہ ہڑتالیں ختم کرانے میں بہت مددگار ہوتے تھے۔ اکثر اوقات ان کے بچے بھی کام کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں ضرورت سے زیادہ محنت کش لوگوں کی تعداد اور بے روزگاری کا مسئلہ مزید شدید ہو گیا تھا۔ 1880ء کے عشرے میں امریکہ میں سولہ سال سے کم عمر کے 11,18,000 بچے (چھ میں سے ایک بچہ) کام کر رہے تھے۔

خواتین آبادکار گھریلو ملازم، طوائفیں، گھر ہستنیں، فیکٹری کارکن بن گئیں اور بعض اوقات بغاوتوں میں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔

1884ء میں کپڑوں کی ملوں میں کام کرنے والی اور ہیٹ بنانے والی خواتین نے ہڑتال کر دی۔ اگلے سال نیو یارک میں چغے اور قمیض بنانے والے مرد اور خواتین (علیحدہ علیحدہ اجلاس کرتے ہوئے لیکن باہم مل کر عمل کرتے ہوئے) ہڑتال پر چلے گئے۔ "نیو یارک ورلڈ" نے اسے "روٹی اور مکھن کی بغاوت" قرار دیا۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے زیادہ معاوضے اور کم اوقات کار کا اپنا مطالبہ منوالیا۔

اسی موسم سرما میں یونکرز میں چند قالین باف خواتین کو "نائٹس آف لیبر" میں شمولیت کے جرم میں ملازمتوں سے نکال دیا گیا اور فروری کی شدید سردی میں پچیس سو خواتین باہر نکل آئیں اور انہوں نے مل کا محاصرہ کر لیا، پولیس نے محاصرہ کرنے والیوں پر حملہ کیا اور انہیں گرفتار کر لیا، لیکن جیوری نے انہیں بے قصور قرار دے دیا۔ نیو یارک کے کارکنوں نے ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان عشائیہ دیا جس میں تمام شہر کی یونینز کے دو ہزار نمائندگان نے شرکت کی۔ ہڑتال چھ ماہ تک جاری رہی اور خواتین نے اپنی ملازمتیں دوبارہ بحال کروالیں اور چند مطالبے بھی تسلیم کروالیے، لیکن یہ سب کچھ ان کی یونین کو تسلیم کیے بغیر کیا گیا۔

جدوجہد کی ان تمام داستانوں میں حیران کن پہلو یہ نہیں کہ ہڑتالی وہ سب کچھ حاصل نہ کر سکے جو وہ چاہتے تھے، بلکہ یہ ہے کہ بہت زیادہ مشکلات کے باوجود انہوں نے مزاحمت کی، جرأت کی اور نیست و نابود نہ ہوئے۔

شاید یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ روز روز کا جھگڑا کافی نہیں تھا، بنیادی تبدیلی کی ضرورت تھی، جو اس وقت کی انقلابی تحریکوں کو فروغ دینے کا باعث بنا۔ 1883ء میں پیٹس برگ میں انارکسٹوں کا ایک جلسہ ہوا، جس میں ایک منشور پاس کیا گیا "....تمام قوانین محنت کش طبقے کے خلاف وضع کیے گئے ہیں.....لہٰذا موجود نظام کے خلاف محنت کش افراد اپنی جدوجہد کے حق میں کسی بھی سرمایہ دارانہ پارٹی سے مدد کی توقع نہیں کر سکتے، انہیں اپنی آزادی اپنی کوششوں سے حاصل کرنا ہوگی۔"

منشور میں بلا امتیاز جنس اور نسل سب کے لیے برابر کے حقوق کا مطالبہ کیا گیا۔ اس میں اشتراکی منشور کا حوالہ دیا گیا: "تمام دنیا کے محنت کشو، متحد ہو جاؤ، تمہارے پاس گنوانے کے لیے اپنی زنجیروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور جیتنے کے لیے پوری دنیا تمہارے سامنے ہے۔"

شکاگو میں نئی "انٹرنیشنل ورکنگ پیپلز ایسوسی ایشن" جو کہ یورپ میں "فرسٹ انٹرنیشنل" سے وابستہ تھی، کے پانچ ہزار ممبر تھے۔ انہوں نے پانچ زبانوں میں اپنی اخباریں شائع کیں، عوامی مظاہروں اور جلوسوں کو منظم کیا، ہڑتالوں کے دوران اپنی لیڈر شپ کے ذریعے بائیس یونینز میں طاقتور اثرات کی حامل تھی، جنہوں نے مل کر "سینٹرل لیبر یونین آف شکاگو" قائم کی۔ ان تمام انقلابی گروپس میں نظریاتی اختلاف پایا جاتا تھا، لیکن نظریات پیش کرنے والوں کو محنت کشوں کی جدوجہد کی عملی ضروریات اکثر اوقات متحد کر دیتی تھیں۔ 1880ء کے عشرے کے وسط میں یہ جدوجہد عروج پر تھی۔

1886ء کے موسم بہار میں روزانہ آٹھ گھنٹے کام کی تحریک بہت بڑھ چکی تھی۔ یکم مئی کو "امریکن فیڈریشن آف لیبر" نے، جسے قائم ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے، جہاں جہاں بھی آٹھ گھنٹوں کے دن سے انکار کیا گیا تھا قومی سطح پر ہڑتالوں کی اپیل کی۔ "نائٹس آف لیبر" کے سربراہ ٹیرنس پاوڈرلے نے یہ کہتے ہوئے کہ پہلے آجروں اور ملازمین کو آٹھ گھنٹے کے دن کے بارے میں تعلیم دینا ضروری ہے ہڑتال کی مخالفت کر دی، لیکن نائٹس کی اسمبلیوں نے ہڑتال کے منصوبے تیار کر لیے۔ "برادرہڈ آف لوکوموٹیو انجینیئرز" کے چیف ایگزیکٹو نے یہ کہتے ہوئے کہ "دو گھنٹے کم کا مطلب دو گھنٹے مزید کونوں کھدروں میں بے کار کھڑے ہونا اور مزید دو گھنٹے پینے پلانے کے لیے ہے۔" دن میں آٹھ گھنٹے کام کی مخالفت کی، لیکن ریلوے کے کارکنوں نے اتفاق نہ کیا اور آٹھ گھنٹے کام کے لیے شروع کی گئی تحریک کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

لہٰذا پورے ملک کے 11,562 اداروں کے 3,50,000 کارکن ہڑتال پر چلے گئے، ڈیٹرائٹ میں 11,000 کارکنوں نے گیارہ گھنٹے کا جلوس نکالا، نیو یارک میں براڈوے پر 25,000 افراد نے مشعل بردار جلوس نکالا، شکاگو میں 40,000 کارکنوں نے ہڑتال کی اور 45,000 کارکنوں کے کام کے اوقات میں کمی کر دی گئی تا کہ انہیں ہڑتال پر جانے سے روکا جا سکے۔ شکاگو میں تمام ریلویز چلنا بند ہو گئیں اور شکاگو کی صنعت مفلوج ہو کر رہ گئی، مویشی خانے بند ہو گئے۔

شکا گو میں حکمت عملی کی تیاری کے لیے کاروباری افراد کی ''سٹیزنز کمیٹی'' کا ہر روز اجلاس ہوتا رہا۔ ریاست کی ملیشیا کو طلب کر لیا گیا اور پولیس تیار کھڑی تھی، اور یکم مئی کو ''شکاگو میل'' نے کہا کہ ''انٹرنیشنل ورکنگ پیپلز ایسوسی ایشن'' کے انارکسٹ لیڈروں ''البرٹ پارسنز'' اور ''اوگسٹ سپائیز'' پر نگاہ رکھی جائے۔ ''ان پر کڑی نگاہ رکھیں، کسی بھی قسم کا کوئی ہنگامہ یا نقصان ہوتا ہے تو ان کو ذاتی طور پر ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اگر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے تو انہیں عبرت کی مثال بنا دیا جائے۔''

پارسنز اور سپائیز کی قیادت میں ''سنٹرل لیبر یونین'' نے دوسری بائیس یونینز کے ساتھ مل کر 1885ء کے موسم خزاں میں ایک شعلہ فشاں قرارداد پاس کی تھی۔ جس میں اپنے مطالبات منوانے کے لیے مزدور طبقے کو مسلح ہونے کو کہا گیا تھا۔ اور کہا گیا کہ صرف یہی ایک زبان ہے جو کسی کی سمجھ میں آتی ہے۔

3 مئی کو واقعات کے ایک ایسے سلسلے نے جنم لیا جنہوں نے پارسنز اور سپائیز کو ٹھیک طور پر اس صورتحال میں دھکیل دیا جس کے بارے میں ''شکاگو میل'' نے کہا تھا (اگر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے تو انہیں عبرت کی مثال بنا دیا جائے) اس دن ''میک کورمک ہارویسٹر ورکس'' کے سامنے جہاں ہڑتالیوں اور ان سے ہمدردی رکھنے والوں کی ہڑتال توڑنے والے مزدوروں کے ساتھ ہاتھا پائی اور لڑائی ہوئی، پولیس نے بھاگتے ہوئے ہڑتالیوں پر فائرنگ کی اور ان میں سے کئی ایک کو زخمی کر دیا اور چار کو مار ڈالا۔ سپائیز غضب ناک ہو گیا اور ''اربیٹرزی ٹنگ'' کی پرنٹنگ شاپ گیا اور ایک اشتہار چھاپا جو کہ انگلش اور جرمن دونوں زبانوں میں تھا۔

انتقام!

محنت کشو! ہتھیار اٹھالو!...تم برسوں سے ایک شرمناک ذلت برداشت کرتے چلے آ رہے ہو...تم نے جان توڑ محنت کی ہے....تم نے اپنے بچے فیکٹری مالکان پر قربان کر دیے ہیں...مختصراً تم ان تمام سالوں میں انتہائی گھٹیا اور تابع دار غلام رہے ہو، کیوں؟ نہ ختم ہونے والی حرص کو پورا کرنے اور اپنے کاہل اور چور مالکان کی تجوریوں کو بھرنے کے لیے؟ جب آخر میں تم نے ان سے اپنے بوجھ ہلکے کرنے کی التماس کی، تو انہوں نے تم پر اپنے خون کے پیاسے شکاری کتے چھوڑ دیے، اور تمہیں گولیوں سے بھون ڈالا....اب وقت آ گیا ہے کہ تم بھی ہتھیار اٹھالو!

4 مئی کی شام کو گھاس منڈی چوک میں ایک جلسے کا اعلان کیا گیا اور تقریباً تین ہزار لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ یہ ایک پرامن جلسہ تھا، طوفانی بادل چھانے لگے اور رات پڑنے لگی لوگوں کی تعداد کم ہو کر چند سو تک رہ گئی۔ پولیس کے 180 سپاہیوں کا ایک دستہ پہنچ گیا اور ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ مقرر نے کہا کہ جلسہ تقریباً ختم ہونے کو ہے۔ پھر اچانک پولیس دستے کے درمیان ایک بم پھٹا اور ساٹھ سپاہی زخمی ہو گئے

جن میں سے سات بعد میں مر گئے، پولیس نے ہجوم پر گولیاں چلانا شروع کر دیں، کئی لوگ مر گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔

کسی شہادت کے بغیر کے بم کس نے پھینکا تھا پولیس نے آٹھ انارکسٹ لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ ''شکاگو جرنل'' نے لکھا'' گرفتار شدہ انارکسٹوں کے خلاف فوری انصاف ہونا چاہیے۔ اس ریاست میں جرم سے متعلقہ امور کے بارے میں قانون اس قدر سادا ہے کہ مقدمہ بہت مختصر ہوگا۔'' ایلیناس کے قانون کے مطابق جو شخص قتل پر ابھارتا ہے وہ قتل کرنے کا مرتکب خیال کیا جاتا تھا۔ آٹھ گرفتار شدہ انارکسٹوں کے خلاف شہادتیں ان کے خیالات اور تحریریں تھیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی گھاس منڈی چوک میں موجود نہیں تھا، سوائے ''فیلڈن'' کے جو بم پھٹنے کے وقت تقریر کر رہا تھا۔ جیوری نے انہیں مجرم قرار دے دیا اور موت کی سزا سنائی۔ ان کی اپیل خارج کر دی گئی، امریکی سپریم کورٹ نے کہا یہ ان کے دائرہ اختیار میں نہیں آتا۔

اس واقعہ نے بین الاقوامی جوش و جذبے کو جنم دیا۔ فرانس، ہالینڈ، روس، اٹلی، اسپین میں جلسے ہوئے۔ لندن میں جارج برنارڈ شا، ولیم موریس، پیٹر کراپوٹکن اور کچھ دوسرے لوگوں نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔ ایلیناس سپریم کورٹ کے آٹھ ممبران کے اپیل مسترد کرنے پر جارج برنارڈ شا نے اپنے روایتی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''اگر دنیا سے آٹھ آدمیوں کا جانا ہی مقدر تھا تو بہتر تھا ایلیناس سپریم کورٹ کے آٹھ ممبران کو الوداع کہا جاتا۔''

مقدمہ کی سماعت کے ایک سال بعد چار انارکسٹوں البرٹ پارسنز، جو کہ ایک پرنٹر تھا، اگسٹ سپائیز، جو کہ پوشش میکر تھا، ایڈولف فشر، اور جارج اینجل کو پھانسی دے دی گئی۔ اکیس سالہ بڑھئی لوئیس لنگ نے اپنی کال کوٹھڑی میں اپنے منہ میں ڈائنامائیٹ کی سلاخ رکھ کر اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا دیا۔ جبکہ باقی تین افراد جیل میں قید رہے۔

ان کی پھانسی نے پورے ملک میں لوگوں کو بھڑکا دیا۔ شکاگو میں پچیس ہزار افراد نے ماتمی جلوس نکالا۔

جبکہ اس کا فوری نتیجہ انقلابی تحریک کے دب جانے کی صورت میں نکلا، اس کے دور رس اثرات نے بہت سے لوگوں میں طبقاتی غم و غصے کو جنم دیا، جس نے دوسرے لوگوں، خاص طور پر نوجوان نسل کو انقلابی مقاصد کے حصول کے لیے عمل پر اکسایا۔ ایلیناس کے نئے گورنر جون پیٹر آلٹ گلڈ کو چھ ہزار دستخط شدہ عرضداشتیں بھیجی گئیں، جس نے حقائق کی چھان بین کی، اور جو کچھ ہو چکا تھا اس کی مذمت کی اور باقی ماندہ تین قیدیوں کو معافی دے دی۔ ہر سال پورے ملک میں گھاس منڈی کے شہیدوں کی یاد میں جلسے منعقد کیے جاتے رہے۔ ان لوگوں کی تعداد کے بارے میں جاننا مشکل ہے جن کی سیاسی بیداری

گھاس منڈی کے واقعات کی مرہون منت ہے۔

اس غم و غصے کی جھلک اس سال موسم خزاں میں نیو یارک کے میئر کے انتخابات میں دیکھنے میں آئی۔ ٹریڈ یونینز نے ایک "انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی" تشکیل دی اور میئر کے لیے ایک انقلابی ماہر معاشیات ہنری جارج کو نامزد کیا جس کی کتاب "پراگرس اینڈ پاورٹی" (ترقی اور غربت) لاکھوں کارکنوں نے پڑھ رکھی تھی۔

ڈیموکریٹس نے ایک لوہے کے صنعت کار "ابرام ہیوٹ" اور ری پبلکنز نے "تھیوڈور روز ویلٹ" کو نامزد کیا۔ جبر اور رشوت کے سہارے چلائی گئی مہم کے نتیجے میں "ہیوٹ" 41 فی صد ووٹ لے کر کامیاب ہو گیا، جارج' روز ویلٹ سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے دوسرے نمبر پر رہا، روز ویلٹ 27 فی صد ووٹوں کے ساتھ تیسرے نمبر آیا۔ "نیو یارک ورلڈ" نے اسے ایک انتباہ کے طور پر لیا۔

دونوں سیاسی پارٹیوں، وال سٹریٹ اور عوامی پریس کی مشترکہ قوت کے خلاف ہنری جارج کو 67,000 دیئے گئے ووٹوں کے ذریعے ایک خاموش احتجاج ریکارڈ کرایا گیا ہے، اور معاشرے کے لیے ایک انتباہ ہے کہ وہ مزدور طبقہ کے مطالبات کی طرف توجہ دے اگر وہ انصاف پرحق اور معقول ہیں۔

ملک کے دوسرے شہروں میں بھی مزدوروں کے امیدوار میدان میں اترے، جن میں سے "مل واوکی" کا میئر منتخب ہوا، اور فورٹ ورتھ، ٹیکساس: ایٹن، اوہایو، اور لیڈ ویلی، کلوریڈو، میں کئی ایک مقامی آفیشلز کامیاب ہوئے۔

یوں معلوم ہوتا تھا وہ گھاس منڈی کا واقعہ مزدور تحریک کو کچلنے میں ناکام رہا تھا۔ 1886ء کا سال معاصرین میں "مزدوروں کی عظیم بیداری" کی علامت بن گیا۔ 1881ء سے 1885ء تک اوسطاً سالانہ 500 ہڑتالیں ہوئیں جن میں ہر سال تقریباً 150,000 مزدوروں نے حصہ لیا۔ 1886ء میں 1400 سے زائد ہڑتالیں ہوئیں جن میں 500,000 کارکنوں نے حصہ لیا، "جان کامنز" اپنی کتاب "دی ہسٹری آف لیبر موومنٹ ان دی یونائیٹڈ سٹیٹس" میں لکھتا ہے!

یہ ہڑتالیں غیر ہنر مند طبقے کی طرف سے شروع کی گئی عظیم تحریک کی علامتیں تھیں، جو آخر کار بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہو..... اس تحریک نے ہر طور پر معاشرتی جنگ کی صورتوں کو جنم دیا۔ ہر اہم ہڑتال میں سرمایہ داری کے خلاف مزدوروں کی شدید نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ "نائٹس آف لیبر" کے تمام افعال میں سرمایہ سے شدید تلخی کا اظہار ہوتا تھا، اور جہاں کہیں بھی لیڈروں نے اس تحریک نے کو حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کی، انہیں ان کے پیروکاروں نے مسترد کردیا۔

حتیٰ کہ جنوب کے سیاہ فاموں میں بھی وقفے وقفے سے بغاوتیں ہوتی رہیں، جہاں قومی حکومت کی رضامندی کے ساتھ جنوبی ریاستوں کی تمام تر فوجی، سیاسی اور معاشی قوتیں انہیں مطیع اور کام میں معروف رکھنے کے لیے پوری طرح سے کوشاں تھیں۔ کپاس کے کھیتوں میں سیاہ فاموں کو اپنے فارموں میں بکھیر کر رکھا گیا تھا۔ لیکن گنے کے کھیتوں میں کام گروہ کی صورت میں کرنا پڑتا تھا لہٰذا یہاں ان کی طرف سے منظم ردعمل کا موقع موجود تھا۔

1886ء میں "نائٹس آف لیبر" گنے کے کھیتوں میں بھی منظم ہونا شروع ہو گئی تھی، سیاہ فام کارکنوں نے، جو کہ اپنی مزدوریوں میں اپنے بچوں اور خاندانوں کی کفالت نہیں کر سکتے تھے یومیہ ایک ڈالر کا مطالبہ کر دیا۔ ان کو معاوضہ عام طور پر مخصوص سٹوروں پر قبول کئے جانے والے کوپنوں کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ اگلے سال خزاں کے موسم میں گنے کے کھیتوں میں کام کرنے والے تقریباً دس ہزار کارکنوں نے ہڑتال کر دی، ان میں 90 فی صد نیگروز اور "نائٹس" کے ممبران تھے۔ ملیشیا پہنچ گیا اور بندوقوں کی جنگ شروع ہو گئی۔

لوئی سیانا کے شہر تھیبو ڈوکس میں تشدد پھوٹ پڑا، جہاں سینکڑوں ہڑتالیوں کو ان کے فارموں پر جھونپڑیوں سے نکال دیا گیا تھا اور وہ بالکل خالی جیبوں، چیتھڑوں میں اپنے بستر، کپڑے اور بچے اٹھائے ہوئے جمع ہو گئے تھے۔ ان کے کام سے انکار نے گنے کی تمام فصل کو خطرے میں ڈال دیا تھا، اور تھیبو ڈوکس میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تھا، نائٹس آف لیبر" کے دو لیڈر نیگرو بھائیوں ہنری اور جارج کو کس کو گرفتار کر لیا گیا، اس کے بعد ان کے بارے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ 22 نومبر کی رات کو فائرنگ شروع ہو گئی دونوں فریقین ایک دوسرے پر الزام لگاتے رہے، اگلی دوپہر تک تیس نیگروز مر چکے تھے یا مر رہے تھے، اور سینکڑوں زخمی ہو گئے دو سفید فام زخمی ہوئے۔ "نیو اورلینز" میں ایک نیگرو اخبار نے لکھا!

.... لنگڑے مردوں اور اندھی خواتین کو گولیاں ماری گئیں، بچوں اور سفید بالوں والے بوڑھوں کو بے دردی سے زمین پر کھینچا گیا، نیگروز نے کسی قسم کی مزاحمت کا مظاہرہ نہ کیا، وہ کسی قسم کی مزاحمت کر بھی نہیں سکتے تھے جیسا کہ قتل و غارت غیر متوقع تھی۔ ان میں سے جو مرنے سے بچ گئے وہ جنگل میں بھاگ گئے، ان میں سے اکثریت اس شہر میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ امریکہ کے شہریوں کو ایک ہجوم نے مار ڈالا جس کو ریاست کا ایک جج ہدایات دے رہا تھا..... اپنے معاوضوں میں اضافہ کا مطالبہ کرنے والے محنت کشوں کے ساتھ کتوں جیسا سلوک کیا گیا۔

مقامی پیدا ہونے والے غریب سفید فاموں کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی جنوب میں ان کی حیثیت زمینوں کے مالک ہونے کے بجائے مزارعین کی تھی۔ جنوبی شہروں میں وہ گھروں کے مالک

نہیں تھے بلکہ کرایہ دار تھے اور جنوبی شہروں کی کچی آبادیاں بدترین حالت میں تھیں جہاں غریب سفید فام سیاہ فاموں کی طرح رہتے تھے۔ صحت کے ایک ریاستی بورڈ کے مطابق ''مٹی کی کچی گلیاں کوڑے، گند اور کیچڑ سے لدی ہوئی تھیں۔''

1891ء میں ''ٹینیسی کول مائن کمپنی'' کے کان کنوں کو ایک ''ناقابل تبدیل معاہدے'' پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا گیا؟ جس میں ہڑتال نہ کرنے کا معاہدہ، کوپنوں میں ادائیگی اور نکالے گئے کوئلے کے وزن کرنے کے حق سے دستبرداری جیسی شرائط شامل تھیں (انہیں وزن کے مطابق معاوضہ دیا جاتا تھا) انہوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا۔ اور ان کی جگہ سزا یافتہ لوگوں کو لایا گیا۔

31 اکتوبر 1891ء کی رات کو ایک ہزار مسلح کان کنوں نے کانوں کے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا، پانچ سزا یافتہ مجرموں کو آزاد کر دیا، اور ان باڑوں کو جلا دیا جن میں مجرموں کو رکھا گیا تھا۔ کمپنیوں نے ہتھیار پھینک دیے اور مجرموں کو استعمال کرنے اور ''ناقابل تبدیل معاہدے'' سے دستبرداری، اور کان کنوں کو نکالے گئے کوئلے کے وزن کے مطابق ادائیگی پر راضی ہو گئیں۔

اگلے سال ٹینیسی میں مزید بغاوتوں نے جنم لیا۔ کان کنوں نے ٹینیسی کول اینڈ آئرن کمپنی کے پہریداروں کو قابو کر لیا مجرموں کو بند کرنے والوں باڑوں کو جلا دیا اور مجرموں کو ''ناش ویلی'' بھجوا دیا۔ ٹینیسی کی دوسری یونینز ان کی مدد کو آ گئیں۔ اس سارے منظر کا مشاہدہ کرنے والے ایک مبصر نے ''چٹانوگا فیڈریشن آف ٹریڈز'' کو اپنی رپورٹ میں بتایا، پورا علاقہ اس ایک بات پر متفق تھا کہ: ''سزا یافتہ مجرموں کو یہاں سے نکالا جائے۔'' سوموار والے دن جب کان کن گزر رہے تھے میں نے 840 رائفلیں گنی تھیں....سفید فام اور نیگرو شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔''

اسی سال ''نیو اورلینڈ'' میں بیالیس یونینز کی مقامی شاخوں نے اپنے بائیس ہزار ممبران کو جن میں اکثریت سفید فاموں کی تھی لیکن کچھ سیاہ فام بھی شامل تھے (ہڑتالی کمیٹی میں صرف ایک سیاہ فام تھا)، ہڑتال کی اپیل کی، اس میں شہر کی نصف آبادی شامل تھی۔ ''نیو اورلینڈ'' میں کاروبار زندگی جامد ہو گیا۔ تین دن بعد (ہڑتال توڑنے والوں کو لا کر، مارشل لاء اور ملیشیا کی دھمکیوں کے ذریعے) ہڑتال ایک سمجھوتے کے تحت ختم ہو گئی، جس میں کام کے اوقات میں رعایت اور معاوضوں میں اضافہ کیا گیا تھا۔ لیکن یونینز کو سودے باز ایجنٹ کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

1892ء میں پورے ملک میں ہڑتالوں کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی: ''نیو اورلینڈ میں عمومی ہڑتال اور ٹینیسی میں کوئلے کے کان کنوں کی ہڑتال کے علاوہ نیو یارک کے شہر بوفیلو میں ریلوے کے کانٹے والوں کی ہڑتال اور ایڈاہو کے شہر'' کیورڈی ایلین'' میں تانبے کے کان کنوں کی ہڑتال ہوئی۔ کیورڈی ایلین کی ہڑتال میں ہڑتالیوں اور ہڑتال توڑنے والوں میں بندوقوں کی لڑائی ہوئی اور بہت سے لوگ مارے گئے۔

1892ء کے اوائل میں پنسلوانیا کے شہر پٹس برگ کے بالکل ساتھ ''ہوم سٹیڈ'' میں کارنیگی سٹیل پلانٹ کی مینجمنٹ ''ہنری کلے فریک'' کے ہاتھوں میں تھی جبکہ کارنیگی یورپ میں تھا۔ فریک نے کارکنوں کے معاوضوں میں کمی اور ان کی یونین توڑنے کے فیصلہ کیا۔ اس نے سٹیل مل کے گرد پندرہ میل لمبی اور بارہ فٹ اونچی باڑھ تعمیر کروائی، اور اس کے اوپر خاردار تاریں لگا کر بندوقوں کے لیے جھریاں بنوائیں۔ جب کارکنوں نے معاوضوں میں کمی کو قبول نہ کیا تو فریک نے تمام کارکنوں کو فارغ کر دیا۔ ہڑتال توڑنے والوں کی حفاظت کے لیے ''پنکرٹن ڈی ٹیکٹو ایجنسی'' کی خدمات حاصل کی گئیں۔

5 جولائی 1892ء کی رات کو ''پنکرٹن'' کے سینکڑوں گارڈز ہوم سٹیڈ سے پانچ میل نیچے دریا میں بجروں پر سوار ہوئے اور پلانٹ کی جانب روانہ ہوئے جہاں ہزاروں ہڑتالی اور ان کے ہمدرد انتظار کر رہے تھے، ہجوم نے پنکرٹن کے گارڈ کو بجرے سے نیچے قدم نہ رکھنے کا انتباہ کیا۔ ایک ہڑتالی بجرے سے اتر کر خشکی تک آنے والے تختے پر لیٹ گیا۔ اور جب پنکرٹن کے آدمیوں نے اسے ایک طرف کرنے کی کوشش کی تو اس نے گارڈ کی پنڈلی کو زخمی کرتے ہوئے فائر کر دیا۔ اس کے بعد دونوں طرف سے شروع ہونے والی فائرنگ میں سات کارکن مارے گئے۔

پنکرٹنز کو واپس بجروں میں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ان پر چاروں طرف سے حملے شروع ہو گئے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے، اور بپھرے ہوئے ہجوم نے انہیں شدید زدوکوب کیا۔ دونوں طرف سے آدمی مرے۔ اگلے کئی دنوں تک علاقے پر ہڑتالیوں کا مکمل کنٹرول رہا۔ اب ریاست حرکت میں آئی، گورنر نے ہڑتال توڑنے والوں کے تحفظ کے لیے ملیشیا بھجوائی جو جدید ترین بندوقوں اور گیٹلنگ گنز (ابتدائی مشین گنز جن میں نو بیرل گھومتے ہوئے فائر کرتے تھے) سے مسلح تھا۔

ہڑتالی لیڈروں پر قتل کا الزام لگایا گیا، 100 دوسرے ہڑتالیوں پر دوسرے جرائم کا مقدمہ چلایا گیا۔ دوستانہ جیوریز نے تمام کو بری کر دیا۔ ہڑتال چار ماہ جاری رہی، لیکن پلانٹ نے ہڑتال توڑنے والے مزدوروں کی مدد سے پیداوار جاری رکھی جن کو ٹرین میں لایا جاتا تھا جو عموماً بند ہوتی تھیں، انہیں نہ تو اپنی منزل مقصود کا علم تھا اور نہ ہی یہ علم تھا کہ ہڑتال جاری ہے۔ ہڑتالی، وسائل ختم ہو جانے پر کام پر واپس آنے کو راضی ہو گئے، ان کے لیڈروں کو بلیک لسٹ کر دیا گیا۔

ہوم سٹیڈ ہڑتال کے دوران نیو یارک کا ایک نوجوان انارکسٹ جس کا نام ''الیگزینڈر برک مین'' تھا، اپنے انارکسٹ دوستوں بشمول اس کی محبوبہ ''ایما گولڈمین'' کے تیار کردہ منصوبے کے مطابق پٹس برگ آیا اور ''ہنری کلے فریک'' کے قتل کا پختہ ارادہ کرتے ہوئے اس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ برک مین کا نشانہ اچھا نہیں تھا، اس نے فریک کو زخمی کر دیا اور خود قابو میں آ گیا پھر اس پر مقدمہ چلا اور اس پر قتل کی کوشش کا جرم ثابت ہو گیا۔

اس نے چودہ سال ریاست کی جیل میں بسر کیے، اس کی کتاب ''پریزن میموریز آف این انارکسٹ'' میں قتل کی کوشش اور جیل میں گزرے ہوئے اس کے سالوں کی ایک صوتی تصویر پیش کرتی ہے۔ جبکہ اس نے قتل کرنے کی افادیت کے بارے میں اپنا ذہن تبدیل کر لیا تھا، لیکن وہ ہمیشہ مخلص انقلابی رہا۔ ایما گولڈن کی سوانح عمری ''لیونگ مائی لائف'' میں ہمیں اس دور کے انقلابی نوجوانوں میں پائے جانے والے غم و غصے، ناانصافی کے احساس اور نئی قسم کی زندگی کی خواہش کی جھلک ملتی ہے۔

1893ء میں ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا معاشی بحران آیا۔ کئی عشروں کی اندھا دھند صنعت کاری کے فروغ، معاشی اتھل پتھل، بے قابو سٹہ بازی اور منافع خوری کے نتیجہ میں سب کچھ بیٹھ گیا، 642 بنک ختم ہو گئے اور 16,000 کاروبار ٹھپ ہو گئے، 15 ملین محنت کشوں میں سے 3 ملین بے روزگار ہو گئے کسی بھی ریاستی حکومت نے کوئی امدادی کارروائی نہ کی، لیکن پورے ملک میں عوامی مظاہروں نے شہری حکومتوں کو مفت لنگر خانے اور قائم کرنے اور لوگوں کو سڑکوں اور پارکوں میں کام دینے پر مجبور کر دیا۔

نیو یارک شہر میں یونین سکوائر میں ایما گولڈ مین نے بے روزگاروں کے ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کیا اور ان لوگوں کو جن کے بچوں کو کھانے پینے کی اشیاء کی ضرورت تھی مشورہ دیا کہ سٹوروں پر جائیں اور وہاں سے کھانے پینے کی اشیاء لے جائیں۔ اسے عوام کو ہنگاموں پر اکسانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور دو سال کی قید سزا دے دی گئی، ایک اندازے کے مطابق شکاگو میں 200,000 افراد بے روزگار ہو چکے تھے، ہر رات کو سٹی ہال اور پولیس اسٹیشنوں کے فرش اور سیڑھیاں ان بے گھر لوگوں سے بھر جاتی تھیں جو رات بسر کرنے کے لیے وہاں آتے تھے۔

کساد بازاری ایک سال تک جاری رہی اور پورے ملک میں ہڑتالوں کی لہر لے آئی۔ ان میں سے سب سے بڑی 1894ء میں ریلویز کارکنوں کی قومی سطح پر کی گئی ہڑتال تھی جو ایلینائس میں شکاگو کے بالکل ساتھ واقع ''پل مین کمپنی'' سے شروع ہوئی۔

ریلویز کی ملازمت امریکہ میں سب سے خطرناک کام تھا۔ ہر سال ریلویز کے دو ہزار سے زائد کارکن حادثات میں مر جاتے تھے اور تیس ہزار کے قریب زخمی ہوتے تھے۔ ''لوکوموٹیو فائر مین میگزین'' کے مطابق اس کی وجہ ریلویز مینیجرز کی افرادی قوت میں کمی کرنا اور ڈبل ڈیوٹی لینا تھی، جس کی وجہ سے کارکنوں کو نیند اور آرام کے لیے مناسب وقت نہیں ملتا تھا۔ ان تمام حادثات کی وجہ ریلویز کمپنیوں میں لالچ اور بدعنوانی تھی۔

یہ 1893ء کی کساد بازاری تھی جس نے یوجین ڈبس کو عمر بھر یونین ازم اور سوشلزم کے لیے کام کرنے پر راغب کیا، اس نے انیس سال کی عمر تک چار سال ریلویز میں کام کیا، لیکن جب اس کا ایک دوست ریلوے انجن کے نیچے آ کر مر گیا تو اس نے یہ کام چھوڑ دیا اس نے ایڈورڈ بیلامے کی ''لکنگ بیک ورڈ'' پڑھی جس نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

1893ء کے بحران کے دوران بشمول ڈبس کے ریلوے کارکنوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے ریلوے کے تمام کارکنوں کو متحد کرنے کے لیے، ''امریکن ریلوے یونین'' تشکیل دی۔ ''ریلویز کے ملازمین کو متحد کرنا اور ان میں مراتب کو ختم کرنا اور تمام کارکنوں کو برابری کی سطح پر منظم کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔''

ڈبس ہر ایک کو شامل کرنا چاہتا تھا، لیکن سیاہ فاموں کو شامل نہ کیا گیا، 1894ء کے جلسے میں منشور میں شامل سیاہ فاموں کو باہر رکھنے کی شق 100 کے خلاف 112 ووٹوں کے ساتھ منظور کر لی گئی۔ بعد میں ڈبس نے خیال کیا کہ اس کے ''پل مین'' کی ہڑتال پر فیصلہ کن اثرات ہو سکتے تھے، کیونکہ سیاہ فام کارکن کسی طور پر بھی ہڑتالیوں سے تعاون کرنے پر تیار نہ تھے۔

جون 1894ء میں ''پل مین پیلس کار کمپنی'' (ریلوے بوگیاں بنانے والی کمپنی) کے کارکنوں نے ہڑتال کر دی۔ انہیں فوری طور پر شکاگو کے علاقے میں دوسری یونینز کی حمایت حاصل ہو گئی۔ پل مین کے ہڑتالیوں نے ''امریکن ریلوے یونین'' کے جلسے میں حمایت کے لیے اپیل کی:

> جناب صدر اور امریکن یونین کے بھائیو! ہم نے پل مین میں اس لیے ہڑتال کی ہے کہ ہم ناامید ہو چکے تھے۔ ہم نے ''امریکن ریلوے یونین'' میں اس لیے شمولیت اختیار کی ہے کیونکہ یہاں ہمیں امید کی کرن نظر آتی ہے۔ آج کے اس اجلاس پر بیس ہزار مردوں، خواتین اور بچوں کی نظریں مرکوز ہیں۔ وہ بڑی بے تابی کے ساتھ، ناامیدی کے ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں، امید کی وہ روشن کرنیں تلاش کر رہے ہیں جو اس روئے زمین پر صرف اور صرف آپ دے سکتے ہیں۔
>
> آپ سب یقیناً جانتے ہوں گے کہ ہماری ہڑتال کی فوری وجہ ہماری شکایات سننے والی کمیٹی کے دو ممبران کی ملازمت سے برخاستگی اور معاوضوں میں پانچ مرتبہ کی جانے والی کمی ہے.... پل مین خود اور پل مین قصبہ دونوں انسانیت کے جسم پر ایک ناسور ہیں، اس شہر میں جسے اس نے اپنا نام دے رکھا ہے وہ تمام مکانات، سکولوں اور چرچوں جو کہ خدا کے گھر ہیں، کا مالک ہے۔

''امریکن ریلوے یونین'' نے مثبت جواب دیا، اس نے پورے ملک میں موجود اپنے ممبران سے کہا ''پل مین'' کی بوگیوں کو استعمال نہ کریں جیسا کہ حقیقت میں تمام مسافر ٹرینوں میں پل مین کی بوگیاں تھیں، اس کا مطلب تمام ٹرینوں سے بائیکاٹ، یعنی قومی سطح پر ہڑتال تھا۔ جلد ہی تمام شکاگو سے چلنے والی چوبیس ریلویز جامد ہو گئیں۔ کارکنوں نے مال گاڑیوں کو پٹریوں سے اتار دیا، ریلوے لائنیں بلاک کر دیں انجن ڈرائیوروں کو جنہوں نے تعاون کرنے سے انکار کیا کھینچ کر اتار دیا گیا۔

ریلویز کے مالکان کی نمائندگی کرنے والی "جنرل مینجرز ایسوسی ایشن" ہڑتال توڑنے کے لیے بھیجے جانے والے دو ہزار سپاہیوں کے اخراجات ادا کرنے پر رضامند ہو گئی۔ لیکن ہڑتال جاری رہی۔ ریلویز کے سابقہ وکیل امریکہ کے اٹارنی جنرل رچرڈ اولنے نے قانونی بنیادوں پر کہ وفاقی ڈاک میں مداخلت کی جا رہی ہے ٹرینیں بلاک کرنے کے خلاف عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ جب ہڑتالیوں نے حکم امتناعی کو نظر انداز کر دیا تو صدر کلیولینڈ نے وفاقی فوج کو شکاگو پہنچنے کا حکم دیا۔ 9 جولائی کو ہڑتالیوں نے 100 بوگیوں کو نذر آتش کر دیا۔ اگلے دن ملیشیا حرکت میں آ گیا۔ پانچ ہزار کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ ملیشیا پر پتھر پھینکے گئے، اور فائرنگ کا حکم دیا گیا۔ "شکاگو ٹائمز" نے رپورٹ دی:

> حملے کا حکم دے دیا گیا تھا..... اس وقت تک صرف سنگینوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ ہنگامہ کرنے والوں کی اگلی صفوں میں درجنوں افراد کو سنگینوں کے زخم لگے..... پولیس کسی قسم کے رحم کا مظاہرہ کرنے کو تیار نہ تھی، اور ہجوم کو خاردار تاروں کے ساتھ دھکیل کر اسے بے رحمانہ طور پر ڈنڈوں سے پیٹا گیا..... جس علاقے میں لڑائی ہو رہی تھی میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ فوجیوں نے عوام پر گولیاں برسائیں پولیس اور فوج کے ہاتھوں مارے جانے والے لوگ گندوں کی طرح زمین پر پڑے تھے۔

اس دن شکاگو میں تیس لوگ مارے گئے، 53 افراد شدید زخمی ہوئے۔ ہڑتال کے خاتمے تک تقریباً چونتیس افراد مارے جا چکے تھے۔ شکاگو میں چودہ ہزار فوجیوں اور ملیشیا کی مدد سے ہڑتال کچل دی گئی تھی۔ ڈبس کو گرفتار کر لیا گیا اس پر توہین عدالت اور حکم امتناعی کی نافرمانی کے الزامات لگائے گئے۔

ڈبس نے عدالت میں سوشلسٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ لیکن جیل میں گزارے گئے چھ ماہ کے دوران اس نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اپنے جیل کے ساتھیوں سے بات چیت کی جو سوشلسٹ تھے۔ بعد میں اس نے لکھا "مجھے آویزشوں کے شور غوغا میں سوشلزم کا بپتسمہ دیا گیا..... ہر سنگین کی چمک میں اور ہر رائفل کے شعلے میں طبقاتی کشمکش منکشف ہوئی۔"

جیل سے نکلنے کے دو سال بعد ڈبس نے "ریلوے ٹائمز" میں لکھا: "مسئلہ سوشلزم بمقابلہ سرمایہ داری ہے۔ میں سوشلزم کی طرف ہوں کیونکہ میں انسانیت کو مقدم خیال کرتا ہوں۔ ہم سونے کی غلامی میں بہت عرصہ تک پس چکے ہیں، دولت تہذیب کی مناسب بنیادیں استوار نہیں کر سکتی، معاشرے کو ازسرنو پیدا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم ایک عالمگیر تبدیلی کے قریب ہیں۔

اس طرح 80 اور 90 کے عشروں میں اٹھنے والی محنت کشوں کی بغاوتیں 1877ء کی بیساختہ ہڑتالوں کی نسبت زیادہ منظم تھیں۔ اب محنت کشوں کی جدوجہد پر انقلابی تحریکیں اثر انداز ہو رہی تھیں، سوشلزم کے نظریات مزدور لیڈروں پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ انقلابی ادب ابھر رہا تھا، بنیادی تبدیلیوں اور زندگی بسر کرنے

کے نئے امکانات پر باتیں ہو رہی تھیں۔

اس دور میں جو زمین پر کام کرتے تھے، کسان، شمال اور جنوب، سیاہ فام اور سفید فام، خانہ جنگی سے پہلے کے سالوں کے مزارعین کے احتجاجوں سے آگے بڑھ کر زرعی بغاوت کے عظیم ترین تحریک کو جنم دے رہے تھے، جو ملک میں آج تک دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

اس دور کے دیہاتی ادب میں ہمیں جو عام طور پر مایوسی کی فضا نظر آتی ہے ہمیں گاہے بگاہے ایک مختلف طرز زندگی کے خواب بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، جیسا کہ "ہیملن گارلینڈ" کے ناول "A Spoil of Office" کی ہیروئن ایک کسانوں کی پکنک میں کہتی ہے:

> "مجھے وہ وقت نظر آ رہا ہے جب کسانوں کو کھیتوں میں واقع تنہا گھروں میں رہنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میں کسانوں کو گروپس کی صورت میں آتے دیکھتی ہوں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ان کے پاس اتنا وقت ہو گا کہ وہ کتابیں پڑھ سکیں، اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھروں میں جا سکیں۔ میں انہیں ہر دیہات میں قائم خوبصورت کمیونٹی ہالوں میں لیکچر سنتے دیکھ رہی ہوں۔ میں انہیں قدیم دور کے سیکسنز (پانچویں صدی میں انگلینڈ آ کر بسنے والے جرمن باشندے) کی طرح شام کے وقت گانے اور ناچنے کے لیے سرسبز میدانوں میں جمع ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ میں ان کی ہمسائیگی میں شہر ابھرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں جہاں سکول، چرچ، کنسرٹ ہال، اور تھیٹر ہیں، مجھے وہ دن نظر آ رہا ہے جب کسان محض محنت کرنے والے بیل اور ان کی بیویاں قیدی غلام نہیں ہوں گی، بلکہ یہ خوش باش مرد اور خواتین ہوں گی جو اپنے ثمربار کھیتوں میں ناچتے اور گاتے ہوئے اپنے خوشگوار کاموں پر جا رہے ہوں گے۔

1860ء اور 1910ء کے درمیانی عرصہ میں امریکی فوج نے "گریٹ پلینز" (وسیع میدانوں) سے انڈینز دیہات کا خاتمہ کرتے ہوئے، ان علاقوں تک رسائی حاصل کرنے اور بہترین زمینوں پر قبضہ کرنے کے لیے ریلویز کے لیے راستہ ہموار کیا۔ پھر کسان آئے اور بچی کچھی زمینوں پر آباد ہو گئے۔ 1860ء سے 1900ء تک امریکہ کی آبادی 31 ملین سے بڑھ کر 75 ملین ہو گئی۔ مشرق کے گنجان آباد شہروں کو خوراک کی ضرورت تھی۔ کسانوں کی تعداد 2 ملین سے 6 ملین ہو گئی۔

زراعت میں مشینیں آ گئیں، لوہے کے ہل، گھاس کاٹنے کی مشینیں، ریپرز، ہارویسٹرز، روئی سے بنولے الگ کرنے والے بہتر بیلنے اور صدی کے اختتام پر بہت بڑے کمبائن جو فصل کاٹتے، گاہتے اور بوریوں میں بند کرتے تھے، آ گئے تھے۔ 1830ء میں ایک بشل (تقریباً 35.24 لٹر حجم کا پیمانہ) گندم حاصل کرنے میں تین گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ 1900ء میں یہ کام 3 منٹ میں ہونے لگا۔ فصلوں کی کاشت کے لیے علاقائی تخصیص نے جنم لیا، جنوب میں کپاس اور تمباکو پیدا ہوتا تھا اور وسطی مغرب میں گندم اور مکئی پیدا کی جاتی تھی۔

زمین کی کاشت پر رقم خرچ ہوتی تھی، مشینوں کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ کسانوں کو قرض لینا پڑتا تھا اور وہ امید رکھتے تھے کہ ان کی فصلیں اچھے داموں فروخت ہو جائیں گی اور وہ بنکوں کے قرضے ادا کر دیں گے۔ نقل و حمل کے لیے ٹرینیں تھیں، ان کے غلوں کو سنبھالنے کے لیے غلوں کے تاجر اور بڑے بڑے گودام موجود تھے۔ لیکن ان کی پیداوار کی قیمتیں نیچے جا رہی تھیں، جبکہ نقل و حمل کے اخراجات اور قرضے بڑھتے چلے جا رہے تھے، کیونکہ ایک اکیلا کسان اپنے غلے کی قیمت کو کنٹرول نہیں کر سکتا تھا، جبکہ اجارہ دار ریلوے اور اجارہ دار بینکار جو چاہتے تھے وصول کر سکتے تھے، کسان جو ادائیگی نہیں کر سکتے تھے ان کی زمینیں اور گھر قبضہ میں لے لیے جاتے اور وہ مزارعین بننے پر مجبور ہو جاتے۔ 1880ء تک 25 فی صد زرعی زمینیں مزارعین کے پاس مزارعت پر تھیں اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بہت سے کسانوں کے پاس زمینوں کے کرائے ادا کرنے کے لیے بھی رقم نہ تھی اور وہ کھیت مزدور بن گئے تھے۔ 1900ء تک ملک میں 4.5 ملین کھیت مزدور تھے یہ وہ مقدر تھا جو ہر اس کسان کا منتظر تھا، جو اپنے قرضے ادا نہیں کر سکتا تھا۔

کیا یہ بدحال اور قلاش کسان مدد کے لیے حکومت سے رجوع کر سکتے تھے؟ حکومت بینکاروں کی مدد کر رہی تھی اور کسانوں کو نقصان پہنچا رہی تھی اس نے کاغذی زر کی مقدار سونے کی رسد کے برابر رکھی ہوئی تھی، جبکہ آبادی میں اضافہ ہو چکا تھا اور کم سے کم کاغذی زر گردش میں تھا کسانوں کو اپنے قرضے ڈالروں میں ادا کرنا پڑتے تھے جن کا حصول بہت مشکل تھا۔ بینکار قرضہ واپس لیتے ہوئے وہ ڈالر وصول کر رہے تھے جو ان سے مہنگے تھے جو انہوں نے دیئے تھے، یہ ایک طرح کا سود کے اوپر سود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کی کسان تحریکوں کا زیادہ تر موضوع گرین بیکس (کاغذی زر جس کے لیے خزانے میں سونا نہیں رکھا جاتا تھا) چھاپ کر یا کاغذی زر جاری کرنے کی بنیاد چاندی کو بنا کر زر کی گردش میں اضافہ کرنا تھا۔

جنوب میں فصلوں کو رہن رکھنے کا نظام انتہائی ظالمانہ تھا۔ اس نظام کے تحت کسان اپنی ضروریات کی اشیاء بیوپاریوں سے حاصل کرتے تھے۔ ان کے پاس ادائیگی کے پیسے نہیں ہوتے تھے لہٰذا بیوپاری ان کی فصلوں کو رہن رکھ لیتے تھے جس پر کسانوں کو 25 فی صد سود ادا کرنا پڑتا تھا۔ کسان ہر سال زیادہ مقروض ہوتا چلا جاتا تھا اور آخرکار اس سے زمین ہتھیالی جاتی تھی اور وہ مزارع بن جاتا تھا۔

1877ء کی کساد بازاری کے عروج پر سفید فام کسانوں کا ایک گروپ ٹیکساس میں ایک فارم پر جمع ہوا اور "فارمرز الائنس" تشکیل دیا۔ چند سالوں میں یہ پوری ریاست میں پھیل گیا۔ 1886ء تک 2000 ذیلی اتحادوں کی صورت میں 100,000 کسان اس میں شامل ہو چکے تھے۔ انہوں نے قدیم نظام کے متبادل تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ "الائنس میں شمولیت اختیار کرو اور کواپریٹوز تشکیل دو، اشیائے ضرورت مل کر خریدو اور کم قیمت پر حاصل کرو۔" انہوں نے اپنی کپاس ایک جگہ اکٹھا کرنا شروع کر دی اور اس کو مل جل کر فروخت کرنا شروع کیا۔ انہوں اسے "بلکنگ" کا نام دیا۔

کچھ یاستوں میں گرینج تحریک پروان چڑھی، اس نے کسانوں کی مدد کے لیے قوانین پاس کروانے کا بندوبست کیا۔ لیکن یہ ایک قدامت پرست تحریک تھی۔ یہ بحران کا دور تھا اور گرینج بہت کم کام کر رہی تھی۔ اس کی ممبرشپ کم ہوتی گئی جبکہ "الائنس" پھیلتا چلا گیا۔

ابتدا ہی سے الائنس نے محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی تحریک کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ جب "گال وسٹن" ٹیکساس میں "نائٹس آف لیبر" کے آدمیوں نے ایک جہازی کمپنی کے خلاف ہڑتال کی تو ٹیکساس میں الائنس کے ممبران کے ایک گروپ نے ایک قرارداد پاس کی۔

> جیسا کہ ہم غیر منصفانہ مداخلت دیکھ رہے ہیں جو سرمایہ دار محنت کشوں کے تمام شعبوں میں کر رہے ہیں.... ہم "نائٹس آف لیبر" کی اجارہ دارانہ استبداد کے خلاف ان کی دلیرانہ جدوجہد میں اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں.... ہم نائٹس کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا عہد کرتے ہیں۔

1886ء کے موسم گرما میں ٹیکساس میں ڈیلاس کے قریب ایک قصبے کلیبرن میں الائنس کے ممبران جمع ہوئے اور عوامی تحریک کی پہلی دستاویز تیار کی، جس میں ایسی قانون سازی کا مطالبہ کیا گیا تھا، جو لوگوں کو اس شدید اور شرمناک بدسلوکی کے خلاف تحفظ فراہم کر سکے، جو صنعتی طبقات، مغرور سرمایہ داروں اور طاقتور کارپوریشنوں کے ہاتھوں برداشت کر رہے تھے۔ انہوں نے تمام محنت کش تنظیموں کا اجلاس طلب کیا اور ریلویز کے کرایوں کو باضابطہ بنانے، ان زمینوں پر جو محض سٹہ بازی کی خاطر خریدی گئی تھیں بھاری ٹیکسوں اور زر کی رسد میں اضافہ کی تجاویز پیش کی۔

الائنس پھیلتا چلا گیا۔ 1887ء تک تین ہزار ذیلی الائنسز میں اس کے ممبران کی تعداد 200,000 تک پہنچ چکی تھی۔ 1892ء میں کسان مقررین تینتالیس ریاستوں میں پہنچ چکے تھے اور 2 ملین کسان خاندانوں سے رابطہ کر چکے تھے۔ یہ باہمی تعاون، کسانوں کی اپنی تہذیب اور سیاسی جماعتیں پیدا کرنے پر مبنی ایک تحریک تھی۔

ٹیکساس سے منتظمین اتحاد تشکیل دینے کے لیے جورجیا آئے اور تین سالوں میں جورجیا کی 137 کاونٹیوں میں سے 134 کاونٹیوں میں اس کے 100,000 ممبر بن چکے تھے، جلد ہی ٹینیسی میں 96 کاونٹیوں میں سے 92 کاونٹیوں میں اس کے ممبران کی تعداد 3600 ذیلی اتحادوں کی صورت میں 125,000 تک پہنچ گئی تھی۔ مسیسپی میں الائنس جیسا کہ کسی نے کہا "سائیکلون کی مانند داخل ہوا" اور اسی تیزی سے لوئی سیانا اور شمالی کیرولینا میں پھیلتا چلا گیا۔ پھر شمال کی جانب کنساس اور ڈیکوٹا میں داخل ہوا جہاں 35 بڑے کواپریٹو سٹور قائم کیے گئے۔

اب "نیشنل فارمرز الائنس" میں ممبران کی تعداد 400,000 ہو چکی تھی۔ اور الائنس کو مزید

وسعت دینے کے لیے حالات بگڑ چکے تھے۔ کپی جو کہ 1870ء میں 45.ڈالر میں ایک بشل بکتی تھی اب 1889ء میں 10 ڈالر فی بشل بک رہی تھی۔ جنوب میں کسانوں کے حالات کسی بھی دوسرے علاقے کی نسبت بدترین ہو چکے تھے۔ 90فی صد کسان قرضوں پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس دوران صرف ایک کامیابی حاصل ہو سکی تھی، کسانوں سے پٹ سن کی بوریوں (کپاس ڈالنے کے لیے) کی بہت زیادہ قیمت وصول کی جاتی تھی، جو کہ ایک ٹرسٹ کنٹرول کرتا تھا۔ الائنس کے کسانوں نے پٹ سن کا بائیکاٹ کر دیا، اور اپنے سوتی بیگ تیار کرنا شروع کر دیے۔ اور پٹ بنانے والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے بیگ 14.ڈالر فی گز کے بجائے 05.ڈالر فی گز کے حساب سے فروخت کریں۔

الائنس نے کچھ تجربات بھی کیے۔ شمالی اور جنوبی ڈیکوٹا میں میں کسانوں کی فصلوں کی انشورنس کے لیے ایک بہت بڑے کوآپریٹو انشورنس منصوبے کا آغاز کیا گیا۔ جبکہ بڑی انشورنس کمپنیاں ایک ایکڑ پر 50.ڈالر وصول کرتی تھیں کوآپریٹو 25.ڈالر لیتے تھے۔ اس نے 2 ملین ایکڑ رقبے کا احاطہ کرتے ہوئے تیس ہزار پالیسیاں جاری کیں۔

ٹیکساس میں الائنس کا ایک اہم لیڈر "چارلس مکیون" تھا۔ وہ معاشیات میں ایک انقلابی، سیاست میں ایک قدامت پسند اور نسل پرست تھا۔ مکیون نے ایک منصوبہ پیش کیا جو کہ عوامی منشور کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ یہ ایک "ذیلی خزانے" کا منصوبہ تھا۔ اس کے مطابق حکومت کو اپنے گودام تعمیر کرنا تھے۔ جہاں کسان اپنی پیداوار جمع کروائیں اور اس "ذیلی خزانے" سے سرٹیفکیٹ حاصل کریں یہ گرین بیکس ہوں گے جن کا انحصار سونے یا چاندی پر نہیں ہو گا بلکہ زرعی پیداوار کی مقدار پر مبنی ہو گا، اس طرح بہت زیادہ کاغذی زر مہیا ہو سکے گا۔

مکیون کے "ذیلی خزانے" کے منصوبے کا انحصار حکومت پر تھا۔ اور جیسا کہ اس کو دو بڑی پارٹیاں اپنانے کو تیار نہیں تھیں۔ اس کا مطلب ایک تیسری پارٹی تشکیل دینا تھا (جو کہ خود مکیون کے خیالات کے خلاف تھا) الائنس نے اس پر کام شروع کر دیا۔ 1890ء میں الائنس کے 38 لوگ کانگریس کے لیے منتخب ہو گئے۔ جنوب میں الائنس نے جورجیا اور ٹیکساس کے گورنر منتخب کر لیے۔ اس نے جورجیا میں ڈیموکریٹک پارٹی پر قبضہ کر لیا اور جورجیا میں تین چوتھائی سیٹوں پر جیت گئی اور جورجیا کی امریکی کانگریس میں 10 سیٹوں میں سے 6 پر جیت گئی۔

کارپوریٹ طاقت ابھی تک سیاسی ڈھانچے پر غالب تھی۔ لیکن الائنس نئے خیالات اور نیا جذبہ پیدا کر رہا تھا۔ اب سیاسی پارٹی کے طور پر یہ پیپلز پارٹی (پاپولسٹ پارٹی) بن گئی اور کنساس کے قصبے ٹوپیکا میں 1890ء میں اس کا اجلاس ہوا۔ ریاست کی ایک مشہور عوامی مقرر "میری ایلن لیز" نے پر جوش ہجوم کو بتایا:

وال سٹریٹ کا ملک پر قبضہ ہے۔ اب یہ حکومت کسی طور پر بھی، لوگوں کی، لوگوں

کے ذریعے، اور لوگوں کے لیے نہیں، بلکہ، وال سٹریٹ کے ذریعے، وال سٹریٹ کے لیے ہے۔ ہم براہ راست حکومت سے قرض لینے کا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم حق انفکاک سے محرومی (رہن شدہ جائداد کے حقوق سے محروم ہو جانا) کے لعنتی نظام سے چھٹکارہ چاہتے ہیں.... ہم اپنے گھروں کی حفاظت کریں گے، اپنے آتش دانوں کی حفاظت کریں، اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو طاقت بھی استعمال کریں گے۔ ہم اپنے قرضے ان خون آشام کمپنیوں کو ادا نہیں کریں گے جب تک حکومت اپنے قرضے ہمیں ادا نہیں کرتی۔ لوگ اب جوابی حملے کے لیے مجبور ہو چکے ہیں، پیسوں کے متلاشی شکاری کتوں کو، جو آج تک ہمارے لیے مصیبت بنے رہے ہیں خبردار ہو جانا چاہیے۔

1892ء میں پیپلز پارٹی کے سینٹ لوئیس میں قومی کنونشن پر ایک منشور تیار کیا گیا۔ اس کی تمہید تحریک کے ایک دوسرے بڑے مقرر "اگنیشن ڈونلی" نے لکھی اور اسی نے حاضرین کے سامنے اسے پڑھ کر سنایا۔

ہم یہاں ایک ایسے وقت میں جمع ہوئے ہیں جب قوم کو اخلاقی، سیاسی اور مادی تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ بیلٹ باکس، قانون سازی، کانگرس سب پر بدعنوانی کا راج ہے، اور اب عدالتوں تک جا پہنچی ہے۔ لوگوں کے حوصلے پست ہو چکے ہیں...اخبارات کو امداد دی جارہی ہے یا پھر ان کی زبان بندی کر دی گئی ہے، عوامی رائے خاموش کر دی گئی۔ کاروبار اوندھا پڑا ہے۔ ہمارے گھر رہن رکھے ہوئے ہیں، محنت کشوں کو غربت میں دھکیل دیا گیا ہے اور زمین سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جمع ہو رہی ہے۔

1892ء جولائی میں اوہاما میں ہونے والے پیپلز پارٹی کے ایک نامزدگی کے اجلاس میں "آیوا" کے ایک عوامیت پسند اور یونین آرمی کے سابقہ جرنیل "جیمز ویور" کو صدارت کے لیے نامزد کیا گیا۔ عوامی تحریک اب انتخابی نظام سے منسلک ہو چکی تھی۔ ویور نے ایک ملین سے زائد ووٹ حاصل کیے لیکن جیت نہ سکا۔

پیپلز پارٹی کو شمالی ری پبلکنز اور جنوبی ڈیموکریٹس، شہری محنت کشوں اور دیہاتی کسانوں، سیاہ فاموں اور سفید فاموں جیسے مختلف گروپس متحد کرنے کا کام کرنا پڑ رہا تھا۔ جنوب میں ایک "کلرڈ فارمرز نیشنل الائنس" پروان چڑھا، جس کے اندازاً ایک ملین ممبر تھے لیکن اس کو سفید فاموں نے ہی منظم کیا تھا اور راہنمائی مہیا کی تھی۔ سیاہ فام منتظمین بھی تھے۔ لیکن ان کے لیے سیاہ فاموں کو اس بات پر قائل کرنا بہت مشکل تھا کہ اگر معاشی اصلاحات حاصل کر لی جاتی ہیں تو سیاہ فاموں کو ان تک برابر کی رسائی حاصل ہو سکے گی سیاہ فاموں نے اپنے آپ کو لنکن کی، اور شہری حقوق کی داعی، ری پبلکن پارٹی کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔

یہ سفید فام تھے جو نسلی اتحاد کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے۔ ایک اخبار نے لکھا: "سفید فام اور سیاہ

قام نسلوں کے خلاف اپنی جنگ میں متحد ہیں..."

الائنس میں موجود کچھ سیاہ فام بھی اتحاد کے حامی تھے "فلوریڈا کلرڈ الائنس" کے ایک لیڈر نے کہا: "ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ محنت کرنے والے سیاہ فام آدمی کا مفاد اور محنت کرنے والے سفید فام آدمی کا مفاد مشترکہ ہے۔"

جب 1891ء میں ڈیلاس میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو یہ بین النسلی اور انقلابی تھی سفید فاموں اور سیاہ فاموں کے درمیان دوٹوک اور شدید بحث مباحثہ ہوا تھا۔ "ٹائمز آف لیبر" کے ایک متحرک سیاہ فام نمائندے نے، جو "برابری" کے مبہم بیانات پر نا مطمئن تھا، کہا:

> اگر ہم برابر ہیں تو شیرف نیگروز کو عدالتوں میں کیوں طلب نہیں کرتا۔ اور مسافروں کی بوگیوں میں "نیگروز" کے بورڈ کیوں آویزاں ہیں۔ میں اپنے لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ پیپلز پارٹی کیا کرنے جارہی ہے میں انہیں بتانا چاہتا ہوں اگر یہ سفید اور کالے گھوڑے کو ایک ہی کھیت میں جوتنا چاہتی ہے۔

ایک سفید فام نے جواب دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ یہاں ریاست کی ہر ڈسٹرکٹ سے سیاہ فام نمائندہ موجود ہے۔ "وہ بھی ہماری طرح گڑھے میں گرے ہوئے ہیں۔"

سیاہ فاموں اور سفید فاموں کی صورتحال مختلف تھی سیاہ فام زیادہ تر کھیت مزدور اور کرائے کے مزدور تھے، جبکہ الائنس میں شامل زیادہ تر سفید فام کھیتوں کے مالک تھے۔ جب "کلرڈ الائنس" نے کپاس چننے والوں کی ایک ڈالر یومیہ اجرت کے لیے کپاس کے کھیتوں میں ہڑتال کا اعلان کیا تو سفید فام الائنس کے سربراہ "لیونڈاس پولک" نے اس کی مذمت کی جیسا کہ یہ الائنس کے کسانوں کے خلاف تھی جنہیں مزدوری ادا کرنا تھی۔

جنوب میں انتخابات میں کسی حد تک سیاہ فام اور سفید فام اتحاد موجود تھا، جس کے نتیجے میں کچھ سیاہ فام کیلیفورنیا کے مقامی انتخابات میں کامیاب ہو گئے۔ جورجیا میں پارٹی اجلاسوں میں سیاہ فام نمائندے بھی شریک تھے۔ 1892ء میں دو اور 1894ء میں چوبیس سیاہ فام نمائندے موجود تھے۔ ارکنساس پیپلز پارٹی نے اپنے پلیٹ فارم پر بلا امتیاز نسل، راندے ہوئے لوگوں کی بات کی۔

پھر بھی نسل پرستی کی جڑیں گہری تھیں اور ڈیموکریٹک پارٹی نے اس سے فائدہ اٹھایا اور پاپولسٹ پارٹی کے بہت سے کسانوں کو اپنے ساتھ جوڑ لیا۔ جب سفید فام مزارعین فصلیں رہن رکھنے کے نظام میں ناکام ہو گئے تو انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے سیاہ فاموں کو دے دی گئیں، اور نسل پرستی میں اضافہ ہو گیا۔ مغربی ریاستیں جنکی ابتدا 1890ء میں مسیسپی سے ہوئی سیاہ فاموں کو مختلف طریقوں سے رائے دہی سے روکنے اور زندگی کے ہر شعبے میں علیحدگی کو شدت سے قائم رکھنے کے لیے نئے آئین تشکیل

دے رہی تھیں۔

وہ قوانین جو سیاہ فاموں کو رائے دہی سے محروم رکھنے کے لیے تشکیل دیئے گئے تھے (مثلاً انتخابی ٹیکس، خواندگی کے ٹیسٹ، جائیداد کی شرائط) غریب سفید فاموں کی بھی رائے دہی سے محرومی کو یقینی بناتے تھے۔ اور جنوب کے سیاسی لیڈر اس بات سے آگاہ تھے، "الاباما" میں ایک آئینی کنونشن میں ایک سیاسی لیڈر نے کہا، وہ ہر اس آدمی سے رائے دہی کے حق کو واپس لینے کا خواہشمند ہے جو اس کے لیے ناموزوں اور نااہل ہے اور اگر کوئی قانون سیاہ فاموں کے ساتھ سفید فاموں پر بھی زد ڈالتا ہے تو اسے چلنے دیں۔

جورجیا کے ایک پاپولسٹ لیڈر "ٹام واٹسن" نے نسلی اتحاد کی وکالت کرتے ہوئے کہا "تمہیں اس لیے علیحدہ رکھا جاتا ہے تاکہ تمہاری کمائیوں کو فرداً فرداً لوٹا جا سکے۔ تمہیں ایک دوسرے سے نفرت کا سبق دیا جاتا ہے کیونکہ اس نفرت پر مالی استبداد کی اُس محراب کا کلیدی پتھر رکھا گیا ہے، جو تم دونوں کو غلام بناتی ہے۔" واٹسن سفید فاموں کی پارٹی کے لیے سیاہ فاموں کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب واٹسن نے اس حمایت کو پریشان کن اور کسی طور پر فائدہ مند نہ پایا تو اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ نسل پرستی کے حق میں بولنے لگا جس فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتا تھا۔

اس دور میں ہمیں طبقاتی اور نسلی جھگڑوں کی کئی ایک پیچیدگیاں نظر آتی ہیں۔ واٹسن کی انتخابی مہم میں 15 سیاہ فاموں کو لنچ (سفید فاموں کا قانون اپنے ہاتھ میں لے کر نیگروز کو مار ڈالنا) کروایا گیا۔ اور جورجیا میں 1891 کے بعد الائنس کے تحت کی گئی قانون سازی میں جیسا کہ ایلن وضاحت کرتا ہے "سیاہ فاموں کے خلاف سب سے زیادہ قوانین پاس کیے گئے جو کہ ایک سال کے عرصہ میں کبھی جورجیا کی تاریخ میں نافذ کیے گئے تھے۔ اس کے باوجود 1896ء میں جورجیا میں پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے "لنچ لاء" اور دہشت گردی کی مذمت کی گئی۔ اور مجرموں کو ٹھیکے پر دینے کے نظام کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔

"سی وان ووڈ ورڈ" جنوب میں پاپولسٹ تحریک کی ایک منفرد خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے: "اس سے پہلے یا اس وقت تک جنوب میں کبھی بھی دونوں نسلیں اتنا قریب نہیں آئی تھیں جتنا کہ پاپولسٹ جدوجہد کے دوران دیکھنے میں آیا۔"

پاپولسٹ تحریک نے ملک کے کسانوں کے لیے ایک نیا اور آزاد تمدن پیدا کرنے کے لیے شاندار کوشش کی، الائنس کا لیکچر بیورو پورے ملک میں پہنچا، اس میں 35,000 لیکچرار تھے، پاپولسٹوں نے اپنے پرنٹنگ پریسوں سے کتابوں اور پمفلٹوں کو ایک سیلاب کی طرح پورے ملک میں پھیلا دیا۔ ان کا ہدف فرسودہ تاریخ، معاشیات اور سیاسی نظریے پر نظر ثانی کرتے ہوئے کسانوں میں شعور پیدا کرنا تھا۔

"نیشنل اکانومسٹ" ایک پاپولسٹ میگزین کے 100,000 قارئین تھے۔ 1890ء کے عشرے میں ایک ہزار سے زیادہ پاپولسٹ جرائد شائع ہو رہے تھے۔ پاپولسٹ لیڈروں کی لکھی ہو کتابیں جیسا کہ

ہنری ڈیمارسٹ لائڈ کی "ویلتھ اگینسٹ کامن ویلتھ" اور ولیم ہاروے کائن کی "فنانشل سکول" بہت زیادہ پڑھی جاری تھیں۔ پاپولسٹ تحریک نے جنوبی علاقے کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں کے درمیان اگرچہ کبھی کبھار کے من موجی تعلقات تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی ایک دوسرے کی ضروریات پر وضاحت کے ساتھ بات کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایک ایسے مشترکہ شعور کی علامات موجود تھیں، جو مختلف حالات میں ایک متحدہ اور آگے بڑھنے والی تحریک میں بدل سکتی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ پاپولسٹ جن میں امریکی سفید فام چھائے ہوئے تھے اپنی سوچ میں نسل پرستی اور مقامیت کے بیج رکھتے تھے۔ لیکن اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ نسل پرستی کو معاشی نظام جتنا اہم خیال کرتے تھے۔ اس طرح "فارمرز الائنس" نے کہا: "پیپلز پارٹی سیاہ فاموں کو آزاد کرنے کے لیے وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا ہدف تمام انسانوں کو آزاد کرنا ہے...... مکمل صنعتی آزادی کو حاصل کرنا ہے جس کے بغیر کوئی سیاسی آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی۔"

پاپولسٹ تحریک آخر کار، سیاہ فاموں اور سفید فاموں، شہر کے محنت کشوں اور دیہات کے کسانوں کو متحد کرنے میں ناکام رہی۔ اس ناکامی کے ساتھ انتخابی سیاست کی کشش نے مل کر پاپولسٹ تحریک کو تباہ کر دیا۔ جب اس نے 1896ء میں "ولیم جیننگز برائن" کی حمایت میں ڈیموکریٹک پارٹی سے اتحاد کیا تو پاپولزم ڈیموکریٹک سیاست کے سمندر میں ڈوب گیا۔ انتخابی کامیابی کے دباؤ نے پاپولزم کو شہر بڑی پارٹیوں سے سودے بازی پر مجبور کر دیا۔ انتخابی سیاست اعلیٰ لیڈرشپ میں زرعی انقلابیوں کے بجائے سیاسی دلالوں کو آگے لے آئی۔

ایسے انقلابی پاپولسٹ موجود تھے جنہوں نے یہ بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جیتنے کی کوشش میں ڈیموکریٹس میں ادغام سے ہم وہ سب کچھ ہار جائیں گے جس کی ہمیں ضرورت ہے، یعنی ایک آزاد سیاسی تحریک۔ ان کا کہنا تھا کہ "فری سلور" جس کی بہت زیادہ تشہیر کی گئی ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائے گی۔

ہنری ڈیمارسٹ لائڈ کا کہنا تھا کہ بائرن کی نامزدگی میں "مارکس ڈیلی" ("ایناکونڈا کاپر" کا مالک) اور "ولیم رینڈلف ہرسٹ" (مغرب میں چاندی کی کانوں میں دلچسپی کا حامل) کا تعاون شامل تھا۔ وہ بائرن کی چرب زبانی کا ذکر کرتا ہے جس نے ڈیموکریٹک کنونشن میں بیس ہزار کے مجمعے کو ہلا کر رکھ دیا۔ لائڈ تلخی کے انداز میں لکھتا ہے۔

> غریب عوام ان کے لیے اپنے ہیٹ ہوا میں اچھال رہے ہیں جو انہیں کرنسی کے راستے سے مصائب سے نکالنے کا وعدہ کرتے ہیں... ان لوگوں کو چالیس سال تک کرنسی کے

> گورکھ دھندے میں رکھا جائے گا، جیسا کہ پچھلے چالیس سال سے ٹیرف بل میں اُلجھائے رکھا گیا ہے۔

1896ء کے انتخاب میں پاپولسٹ تحریک کے ڈیموکریٹک پارٹی کے ورغلاوے میں آنے کے بعد ڈیموکریٹک امیدوار بائرن کو "ولیم میک کنلے" نے شکست دے دی، جس کے لیے کارپوریشنیں اور پریس متحرک ہو گیا تھا۔ اور امریکہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ انتخابی مہم میں دولت کا بے تحاشہ استعمال ہوا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی میں پاپولزم کا اشارہ بھی برداشت نہیں کیا جا سکا تھا۔ اور اسٹیبلشمنٹ کا طاقتور طبقہ اسے شکست دینے کے لیے اپنے تمام تر اسلحہ کے ساتھ میدان میں اتر آیا تھا۔

یہ احتجاج اور بغاوتوں کے سالوں کے بعد، نظام کو مستحکم کرنے کا وقت تھا، جیسا کہ امریکہ میں انتخابات اکثر اس اہمیت کے حامل رہے ہیں، سیاہ فاموں کو جنوب میں قابو رکھا گیا ہوا تھا۔ انڈینز کو مغربی میدانوں سے دھکیل کر نکال دیا گیا تھا۔ 1890ء کی شدید سردیوں میں امریکی فوج نے "ونڈڈنی" (Wounded Knee) اور "جنوبی ڈیکوٹا" میں خیمہ زن انڈینز پر حملہ کیا اور تین سو مردوں، خواتین اور بچوں کو مار ڈالا۔ یہ کولمبس کے وقت سے لے کر چار سو سال سے جاری تشدد کی انتہا تھی، جس کا مقصد اس خیال کو مستحکم کرنا تھا کہ براعظم سفید فاموں کی لیکن صرف مخصوص سفید فاموں کی ملکیت ہے۔ کیونکہ 1896ء میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اگر ممکن ہو سکے تو قانون کے سہارے ورنہ اگر ضروری ہو تو طاقت کے ذریعے ریاست محنت کشوں کی ہڑتالوں کو کچلنے کے لیے ہر دم تیار کھڑی ہوتی تھی۔ اور جہاں کہیں بھی کوئی خطرناک عوامی تحریک پروان چڑھتی نظر آتی، دو پارٹیوں پر مشتمل نظام اپنے کسی ایک حصے کو وہاں بھجوا دیتا جو اس تحریک کو گھیرے میں لے کر اس کی قوت کو نچوڑ لیتا۔

اور ہمیشہ طبقاتی آزردگی کو قومی یکجہتی کے خوبصورت نعروں کے سیلاب میں ڈبونے کے لیے حب الوطنی کا پرچار کیا جاتا تھا۔ "میک کینلی" نے اپنی ایک فصیح و بلیغ تقریر میں کہا:

> ..... یہ سال حب الوطنی اور ملک پر جاں نثاری کا سال ہے مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ملک کے ہر کونے میں عوام ایک پرچم کے ساتھ دل جان سے مخلص ہیں۔ چمکتے ہوئے ستاروں اور دھاریوں والا پرچم: اور یہ کہ ملک کے عوام ملک کی مالی توقیر کو بھی اسی طرح قائم رکھنے پر تلے ہوئے ہیں جس طرح وہ پرچم کی عزت و توقیر کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

حب الوطنی کا سب سے اعلیٰ عمل جنگ تھا۔ "میک کینلی" کے صدر بننے کے دو سال بعد امریکہ نے سپین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

سلطنت اور عوام

تھیوڈور روز ویلٹ نے 1890ء میں اپنے ایک دوست کو لکھا: "میں اپنے دل کی بات تمہیں بتاتا ہوں ---- وہ یہ کہ میں کسی بھی جنگ کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں، کیونکہ میرے خیال کے مطابق اس ملک کو ایک جنگ کی ضرورت ہے۔"

منافع پرمبنی اس نظام کی، جو کہ پھیلاؤ کا فطری رجحان رکھتا تھا، پہلے ہی سمندر پار نظریں لگی ہوئی تھیں، کے شدید بحران کے دوران ملک کی سیاسی اور کاروباری اشرافیہ میں یہ خیال تقویت پکڑ چکا تھا کہ ملک کے اندر موجود صارفین کی کمی کو پورا کرنے کے لیے سمندر پار کی منڈیاں امریکی مصنوعات کی کھپت کے لیے بہترین ثابت ہو سکتی ہیں، اس طرح ان معاشی بحرانوں سے بچا جا سکتا ہے جنہوں نے 1890ء کے عشرے میں طبقاتی جنگ کو جنم دیا۔

کیا ایک بیرونی مہم، اس باغیانہ قوت کا رخ، جو کہ ہڑتالوں اور احتجاجی تحریکوں کا باعث بنتی ہے، ایک بیرونی دشمن کی طرف نہیں پھیر دے گی؟ اور کیا یہ لوگوں میں بجائے اس کے کہ وہ حکومت اور فوج کے خلاف ہوں، ان کے ساتھ اتحاد اور یکجہتی کا باعث نہیں بن سکتی؟ غالباً یہ ملک کی اشرافیہ کی اکثریت کا کوئی شعوری منصوبہ نہیں تھا بلکہ سرمایہ داری اور قومیت پرستی کے جڑواں محرکات کی فطری پیداوار تھا۔

سلطنت کو سمندر پار تک پھیلانے کا خیال کوئی نیا نہیں تھا۔ میکسیکو کے خلاف جنگ سے پہلے ہی امریکہ بحر الکاہل میں پہنچ چکا تھا "منرو ڈاکٹرائن" میں کیریبین جزائر اور ان سے بھی آگے جانے کی بات کی گئی تھی۔ منرو نے اس خیال کا اظہار اس وقت کیا تھا جب لاطینی امریکہ کے ممالک سپین کے تسلط سے آزادی حاصل کر رہے تھے، اور اس نے یورپیوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ لاطینی امریکہ کو امریکہ اپنے زیر اثر علاقہ خیال کرتا ہے اس کے فوراً بعد کچھ امریکیوں نے بحر الکاہل میں ہوائی جزائر، جاپان اور چین کی بڑی منڈیوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

یہ بات محض سوچ تک محدود نہیں تھی۔ 1962ء میں محکمہ خارجہ نے کیوبا کے خلاف فوجی طاقت استعمال کرنے کے لیے سینیٹ کمیٹی کو ایک فہرست پیش کی تھی جس میں 1798ء سے لے کر 1895ء تک

دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت کی 103 مثالیں پیش کی گئی تھیں، اس فہرست میں سے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں جن میں محکمہ خارجہ کی دی گئی وضاحتیں بھی شامل ہیں:

1852-53ء ارجنٹائن

انقلاب کے دوران امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے بحریہ کے دستے "بیونوس ایرس" میں اتارے گئے۔

1853ء نکاراگوا

سیاسی فسادات کے دوران امریکیوں کی زندگیوں اور مفادات کے تحفظ کے لیے۔

1853-54ء جاپان

جاپان کو امریکیوں کے لیے کھولنے کے لیے اور پیری مہم۔ (محکمہ خارجہ نے اس بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں دیں۔ لیکن اس میں امریکہ کے لیے اپنی بندرگاہیں میں کھولنے کے لیے جاپان پر دباؤ ڈالنے کے لیے بحری جنگی جہازوں کا استعمال کیا گیا۔)

1853-54ء ریوکیو اور بونن جزائر

کمانڈر پیری جاپان جانے سے پہلے اور جاپان کے جواب کا انتظار کرتے ہوئے، تین مرتبہ ان جزائر پر پہنچا اور اپنی بحری طاقت کا مظاہرہ کیا۔ دو مرتبہ بحریہ کے دستوں کو اتارا، اوکیناوا میں ناہا کے حکمران سے کوئلے کے حصول کے لیے رعائتیں حاصل کیں۔ بونن جزائر میں بھی طاقت کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہ تمام کارروائیاں تجارتی سہولیات کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کی گئیں۔

1854ء نکاراگوا

سین جوان ڈیل نورٹے (نکاراگو میں امریکی منسٹر کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے "گرے ٹاؤن" تباہ کر دیا گیا۔)

1855ء یوراگوئے

مونٹے ویڈیو میں ایک انقلاب کی کوشش کے دوران امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے یورپی اور امریکہ کی بحری افواج اتاری گئیں۔

1859ء چین

شنگھائی میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے۔

1860ء انگولا پرتگیزی جنوبی افریقہ

کیسمبو میں امریکیوں کی زندگی اور جائداد کے تحفظ کے لیے، جب مقامی لوگوں نے

ہنگامے شروع کر دیئے

1893ء ہوائی

ظاہری طور پر امریکیوں کی زندگی اور جائداد کے تحفظ کے لیے، درحقیقت ''سین فورڈ بی ڈول'' کے تحت قائم صوبائی حکومت کی مدد کے لیے اس کارروائی کی امریکہ نے تردید کی تھی۔

1894ء نکاراگوا

انقلاب کے بعد ''بلیوفیلڈز'' میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے۔

اس طرح 1890ء کے عشرے تک امریکہ کو سمندر پار علاقوں کی جانکاری اور مداخلت کا کافی تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ فوج، سیاست اور کاروبار کے بالائی حلقوں میں توسیع کا نظریہ بہت مقبول تھا۔ حتیٰ کہ کسان تحریکوں کے بعض لیڈر بھی اس کے حامی تھے جن کا خیال تھا بیرونی منڈیاں کھلنے سے ان کی اجناس کی مانگ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

امریکی بحریہ کا ایک کیپٹن ''اے ٹی ماہان'' وسعت کی پالیسی کا ایک مقبول مبلغ تھا اس نے تھیوڈور روزویلٹ اور دوسرے امریکی لیڈروں کی بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب سب سے بڑی بحریہ رکھنے والے ممالک دنیا کے وارث ہوں گے۔ میساچوسٹس کے سینیٹر ''ہنری کابوٹ لاج'' نے میگزین میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھا:

> ''بحرالکاہل میں تجارتی برتری کے حصول کے لیے ہمیں ہوائی جزائر پر کنٹرول حاصل کرنا چاہیے.....اور جب نکاراگوا نہر (جسے بعد میں 'نہر سویز' کا نام دیا گیا) مکمل ہو جائے تو جزیرہ کیوبا پر بھی کنٹرول حاصل کرنا ضروری ہوگا.....بڑی اقوام بڑی تیزی کے ساتھ اپنے مستقبل کی وسعت اور حالیہ دفاع کی خاطر دنیا کے بے آباد علاقوں پر قبضہ کر رہی ہیں اور دنیا کی بڑی اقوام میں سے ایک ہونے کے ناطے امریکہ کو کسی بھی صورت میں اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔''

سپین امریکی جنگ سے کچھ دیر پہلے ''واشنگٹن پوسٹ'' نے اداریہ لکھا: ہم میں ایک نیا شعور پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے یا اپنی طاقت کا شعور ہے اور اس کے ساتھ ایک نئی خواہش جنم لے رہی ہے اپنی طاقت کے مظاہرے کی خواہش.....جنگل میں خون کے ذائقے کی طرح سلطنت کا ذائقہ لوگوں کے منہ کو لگ گیا ہے۔''

کیا لوگوں کے منہ کو لگنے والا یہ ذائقہ جارحیت کے لیے کسی جبلی نفسانی خواہش کا نتیجہ تھا، یا اس کے پیچھے کوئی فوری خودغرضی کارفرما تھی؟ یا پھر منہ کو لگنے والے اس ذائقے کی ذمہ داری فوج، حکومت اور لوگوں کو خوش کرنے کے شوقین دانشور اور کروڑ پتی پریس تھا۔ جنہوں نے نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی

کی بلکہ اس کی بھرپور تشہیر اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا؟ کولمبیا یونیورسٹی کے سیاسی سائنسدان ''جان برجس'' نے کہا ''جرمن اور اینگلوسیکسن کو قومی ریاستیں قائم کرنے کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے، ان پر جدید دنیا میں سیاسی تہذیب وتمدن کو فروغ دینے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔''

اپنے صدارتی انتخاب سے کئی سال پہلے ''ولیم مک کینلے'' نے کہا تھا: ''ہمیں اپنی ضرورت سے زائد مصنوعات کے لیے بیرونی منڈیوں کی ضرورت ہے۔'' انڈیانا کے سینیٹر ''البرٹ بیورج'' نے 1897ء میں واضح کر دیا تھا کہ ''امریکی فیکٹریاں اس سے کہیں زیادہ پیدا کر رہی ہیں جو لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ امریکہ کی زمینیں ہماری ضروریات سے زیادہ پیداوار دے رہی ہیں۔ تقدیر نے ہمارے لیے ہماری پالیسی لکھ دی ہے، دنیا کی تجارت پر ہمارا قبضہ ہونا ضروری ہو چکا ہے۔''

جب 1893ء میں کچھ امریکیوں کی (ڈول خاندان کے مشنری اور اناس کے کاروبار کے مشترکہ مفادات کے پیش نظر) ہوائی میں اپنی حکومت قائم کر لینے کے بعد امریکہ نے قبضہ نہ کیا تو تھیوڈور روزویلٹ نے اس ہچکچاہٹ کو ''تہذیب کے خلاف ایک جرم'' قرار دیا۔ اور اس نے نیول وار کالج سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا ''تمام بڑی نسلیں جنگجو نسلیں رہی ہیں، کوئی بھی امن کی فتح جنگ کی ارفع فتح جتنی عظیم نہیں ہے۔''

فلاسفر ولیم جیمز، جو اپنے دور کا ایک مشہور سامراج دشمن بن گیا تھا، نے روزویلٹ کے بارے میں لکھا: ''وہ جنگ کی یوں تعریف کرتا ہے گویا یہ انسانی معاشرے کی ایک مثالی حالت ہے۔''

جبکہ یہ بات درست تھی کہ 1898ء میں امریکی مصنوعات کا 90فی صد ملک کے اندر فروخت ہوتا تھا، 10فی صد باہر فروخت ہوتا تھا جس سے تقریباً ایک بلین ڈالر حاصل ہوتے تھے۔ 1885ء میں سٹیل انڈسٹری کے ایک جریدے ''ایج آف سٹیل'' نے لکھا: ''ملکی منڈیاں ناکافی ہیں اور صنعتی اشیاء کی ضرورت سے زائد پیداوار کی کھپت کے لیے مستقبل میں بیرونی تجارت کو فروغ دینا ہوگا۔''

1880ء اور 1890ء کے عشروں میں تیل ایک بڑی برآمد بن گیا تھا۔ راک فیلر خاندان کی ''سٹینڈرڈ آئل کمپنی'' امریکہ کے مٹی کی تیل کی برآمد کے 90فی صد حصے پر قابض تھی اور دنیا کی 70فی صد مارکیٹ پر کنٹرول رکھتی تھی۔ کپاس کے بعد سمندر پار بھیجی جانے والی دوسری بڑی پیداوار تیل تھی۔

سمندر پار وسعت دلکش نظر آ سکتی تھی اگر یہ ایک فراخدلی کے عمل کے طور پر نظر آتی جیسا کہ کیوبا میں بیرونی تسلط کے خاتمہ کے لیے باغی گروپ کی مدد کرنا، 1898ء تک کیوبا کے باغی اپنی آزادی کے لیے اپنے ہسپانوی فاتحین کے خلاف تین سال سے لڑ رہے تھے۔ اس وقت مداخلت کے لیے ایک قومی مزاج پیدا کرنا ممکن تھا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں قوم کے تجارتی مفادات کیوبا میں فوجی مداخلت نہیں چاہتے

تھے۔ امریکی تاجر اگر محض بیرونی منڈیوں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے تو انہیں نوآبادیوں اور فتوحات کی جنگوں کی ضرورت نہیں تھی۔ بیسویں صدی میں "کھلی منڈیوں" کا نظریہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کا نمایاں پہلو بن چکا تھا۔ یہ سامراجیت کی جانب، یورپ کی روایتی سلطنتیں قائم کرنے کی نسبت ایک زیادہ پیچیدہ اور پر تصنع رسائی تھی۔ لیکن اگر پر امن سامراجیت قائم کرنا ممکن نہ رہے، تو فوجی کارروائی کی ضرورت پیدا ہو سکتی تھی۔

مثال کے طور پر جب 1897ء کے آخر اور 1898ء کے شروع میں چین جاپان کے ساتھ اپنی حالیہ جنگ کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا، جرمن فوج نے چینی بندرگاہ سنگ تاؤ (چنگ داؤ) پر قبضہ کر لیا۔ اگلے چند ماہ کے اندر اندر دوسری یورپی طاقتیں بھی چین میں داخل ہو گئیں اور امریکہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بڑی سامراجی طاقتیں چین کو تقسیم کر رہی تھیں۔

اس موقع پر "نیو یارک جرنل آف کامرس" جو کہ آزاد تجارت کی پر امن پیش رفت کی وکالت کرتا رہا تھا اب قدیم طرز کی فوجی "استعماریت" پر زور دینے لگا تھا۔ اس نے وسطی امریکہ میں سے دونوں سمندروں کو ملانے کے لیے نہر نکالنے اور ہوائی پر قبضہ کرنے اور بڑی بحریہ کے حق میں دلائل دینے شروع کر دیئے۔

اسی قسم کی تبدیلی 1898ء میں امریکہ کے کاروباری حلقوں میں بھی دیکھنے میں آئی۔ کاروباری افراد، سپین کے خلاف کیوبا کی بغاوت کی ابتدا ہی سے اس بغاوت کے وہاں کے تجارتی امکانات پر اثرات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جزیرے میں پہلے سے ہی ایک ٹھوس معاشی مفاد موجود تھا۔ کیوبا کے انقلاب کے لیے عوامی حمایت کی بنیاد اس خیال پر مبنی تھی کہ وہ "1776ء کے امریکیوں کی طرح، اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں امریکہ کی حکومت کیوبا میں رونما ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہوئے ذہن میں طاقت اور منافع کو رکھے ہوئے تھی۔ نہ تو کلیولینڈ نے جو کہ کیوبا کی بغاوت کے ابتدائی سالوں میں صدر تھا اور نہ اس کے بعد آنے والے صدر "مک کنیلے" نے باغیوں کو سرکاری طور پر ایک متحارب گروپ کے طور پر تسلیم کیا تھا۔ اس قسم کی قانونی منظوری امریکہ کو فوج بھیجے بغیر باغیوں کی مدد کرنے کے قابل بنا سکتی تھی۔ لیکن اس میں یہ خطرہ بھی موجود ہو سکتا تھا کہ باغی اپنے طور پر جیت جائیں گے اور امریکہ کو باہر ہی رکھیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور قسم کی خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کلیولینڈ کی انتظامیہ نے کہا" کیوبا کی فتح ایک سفید فام اور سیاہ فام جمہوریہ کی جانب جا سکتی ہے۔" جیسا کہ کیوبا دونوں نسلیں آباد تھیں۔ اور سیاہ فام جمہوریہ غالب ہو سکتی تھی۔ اس خیال کا اظہار ایک پر جوش سامراجی نوجوان ونسٹن چرچل نے "دی سیچرڈے ریویو" میں لکھے گئے ایک مضمون میں کیا تھا، جس کی ماں امریکی تھی اور باپ ایک انگریز تھا۔ اس

نے لکھا کہ جیسا کہ سپین کی حکومت بُری ہے اور باغیوں کو لوگوں کی مدد حاصل ہے یہ بہتر ہو گا کہ سپین اپنا تسلط قائم رکھ سکے۔

> ایک سنجیدہ خطرہ نظر آ رہا ہے۔ میدان جنگ میں پانچ باغیوں میں سے دو سیاہ فام ہیں۔ یہ لوگ.... کامیابی کی صورت میں ملک کی حکومت میں ایک نمایاں حصہ طلب کریں گے.... اس کا نتیجہ کئی سالوں کی جنگ کے بعد ایک دوسری سیاہ فام ریپبلک کی صورت میں نکلے گا۔

"دوسری" سیاہ فام ریپبلک کا ذکر ہیٹی کے حوالے سے کیا گیا تھا، جہاں 1803ء میں فرانس کے خلاف انقلاب کی صورت میں نئی دنیا میں پہلی سیاہ فام حکومت قائم ہوئی تھی۔ امریکہ میں سپین کے منسٹر نے امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) کو لکھا:

> انقلاب میں نیگرو عنصر ایک اہم حصہ ہے۔ نہ صرف اہم لیڈر سیاہ فام ہیں بلکہ ان کے دس میں سے آٹھ حمایتی بھی سیاہ فام ہیں.... اور جنگ کا نتیجہ، اگر جزیرے کو آزاد قرار دیا جاتا ہے، سیاہ فام عنصر کی علیحدگی اور سیاہ فام ریپبلک کی صورت میں نکلے گا۔

فروری 1898ء میں کیوبا کے واقعات میں "امریکی مفادات کی علامت" امریکہ کا جنگی جہاز "مین" جو ہوانا کی بندرگاہ پر لنگر انداز تھا ایک پر اسرار دھماکے سے تباہ ہو گیا اور ڈوب گیا اور اس کے عملے کے 268 افراد مارے گئے۔ دھماکے کی وجہ کی کوئی شہادت کبھی بھی نہ مل سکی۔ لیکن امریکہ میں ایک جوش اور جذبے کی فضا پیدا ہو گئی اور "مک کنیلے" جنگ کی جانب بڑھنا شروع ہو گیا۔

موسم بہار میں ایک مقام ایسا آیا کہ کہ "مک کنیلے" اور کاروباری طبقے دونوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ کیوبا سے سپین کو نکالنے کا ان کا ہدف بغیر جنگ کے حاصل نہیں کیا جا سکتا، اور اس کے ساتھ وابستہ ان کے اہداف یعنی کیوبا میں امریکی فوج اور معاشی اثرات کے تحفظ، کو محض کیوبا کے باغیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ اسے صرف امریکہ کی مداخلت کے ذریعے یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

اس سے پہلے کانگریس "ٹیلر ترمیم" منظور کر چکی تھی جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ امریکہ کیوبا پر قبضہ نہیں کرے گا۔ اس ترمیم کو پیش کرنے والے اور اس کی حمایت کرنے والے وہ لوگ تھے جو کیوبا کی آزادی میں دلچسپی رکھتے تھے جو یہاں کی منڈیوں تک کھلی رسائی کو کافی خیال کرتے تھے اور فوجی مداخلت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن 1898ء کے موسم بہار تک کاروباری طبقہ میں بھی فوجی کارروائی کے لیے بے تابی پیدا ہو چکی تھی۔ "جرنل آف کامرس" نے لکھا: ٹیلر ترمیم.... ضروری ہے کہ اس کی تشریح اس سے قدرے مختلف کی جائے جو کہ اس کے مصنف کے ذہن میں تھی۔"

کچھ ایسے مفادات بھی تھے جنہیں جنگ سے براہ راست فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ واشنگٹن میں یہ

رپورٹ پہنچی کہ بحریہ کے محکمے میں "جنگ کا جذبہ" سرایت کر چکا ہے۔ جس کی حوصلہ افزائی گولہ بارود، اسلحہ اور دیگر اشیاء سپلائی کرنے والے ٹھیکیدار کر رہے تھے جو کہ "مین" کی تباہی کے بعد محکمے میں اڈوہام کیے ہوئے تھے۔"

جریدہ "رسل سیج" نے کہا اگر جنگ شروع ہوتی ہے "تو یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ امراء کا کیا موقف ہے۔" کاروباری افراد کے بارے میں کیے گئے ایک سروے میں کہا گیا کہ "جون جیکب آسٹر، ولیم راک فیلر اور تھامس فارچون ریان" جنگ کے حق میں ہیں۔ اور جے پی مورگن کا خیال تھا کہ سپین کے ساتھ مزید بات چیت سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

25 مارچ کو "مک کینلے" کے ایک مشیر کی جانب سے ایک ٹیلی گرام وائٹ ہاؤس میں موصول ہوئی جس میں کہا گیا تھا: یہاں بڑی کارپوریشنیں اب یہ یقین رکھتی ہیں کہ ہم جنگ کریں گے۔ اسے گومگو کی حالت سے نجات کے طور پر، ہر کوئی خوش آمدید کہے گا۔

اس ٹیلی گرام کے ملنے کے دو دن بعد "مک کینلے" نے سپین کو التوائے جنگ کا مطالبہ کرتے ہوئے الٹی میٹم دے دیا اس نے کیوبا کی آزادی کے لیے کوئی بات نہ کی۔ کیوبا کے باغیوں کے ایک ترجمان، جس کا تعلق نیویارک میں مقیم کیوبا کے باشندوں سے تھا، اس الٹی میٹم کا مطلب یہ لیا کہ امریکہ محض سپین کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ اس نے اس کے جواب میں کہا:

> آزادی کو تسلیم کیے بغیر مداخلت کی موجودہ تجویز کے پیش نظر، ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہیں کہ ہم اس قسم کی مداخلت کو امریکہ کا کیوبا کے باغیوں کے خلاف اعلان جنگ خیال کریں۔

حقیقت میں جب "مک کینلے" نے 11 اپریل کو کانگریس سے جنگ کی اجازت طلب کی تو اس نے باغیوں کو متحارب گروپ کے طور پر تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ ہی کیوبا کی آزادی کی بات کی تھی۔ پھر بھی جب امریکی فوجیں کیوبا میں داخل ہوئیں تو باغیوں نے انہیں خوش آمدید کہا، وہ یہ امید رکھتے تھے کہ "ٹیلر ترمیم" کیوبا کی آزادی کی ضامن ہے۔

تاریخ کی بہت سی کتابوں میں سپین امریکہ جنگ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ عوامی رائے تھی جس نے "مک کینلے" کو سپین کے خلاف اعلان جنگ اور کیوبا میں فوجیں بھیجنے پر مجبور کیا۔ یہ بات درست ہے کہ بعض بااثر اخبارات بہت شدید دباؤ ڈال رہے تھے اور بہت سے امریکی مداخلت کا مقصد کیوبا کی آزادی خیال کرتے ہوئے، اور ٹیلر ترمیم کو اس بات کی ضمانت خیال کرتے ہوئے اس کی حمایت کر رہے تھے۔ لیکن کیا "مک کینلے" نے جنگ پریس اور عوام کے کچھ حصے (اس وقت ہمارے پاس عوامی رائے کے سروے کا کوئی بندوبست نہیں تھا) کے کہنے پر کاروباری طبقے کی خواہش کے بغیر شروع کی تھی؟

کیوبا کی جنگ کے کئی سال بعد ڈیپارٹمنٹ آف کامرس کے بیورو آف فارن کامرس کے سربراہ نے اس دور کے بارے میں لکھا: "سپین امریکہ جنگ وسعت کی اس عمومی تحریک کا نتیجہ بھی جس کی جڑیں صنعتی استعداد میں تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں تھیں، جو کہ ملکی قوتِ استعمال سے زیادہ پیداوار کر رہی تھی۔"

امریکی لیبر یونینز کیوبا کے باغیوں کے ساتھ اس وقت سے ہمدردی کے جذبات رکھتی تھیں جب 1895ء میں سپین کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا۔ لیکن وہ امریکہ کو وسعت دینے کے مخالف تھیں۔

جب "مین" کے دھماکے کے بعد پریس نے جنگ کے لیے پرزور پروپیگنڈا شروع کر دیا تو "انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف میشینسٹس" کے ماہوار جرنل نے اس بات سے اتفاق کیا کہ یہ ایک خوفناک تباہی تھی، لیکن اس نے یہ بات بھی کی کہ صنعتی حادثات میں محنت کشوں کی اموات پر اس قسم کا قومی شور و غوغا دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کا اشارہ پنسلوانیا میں کوئلے کی ہڑتال کے دوران 10 ستمبر 1897ء کے "لیٹی مر" قتل عام کی طرف تھا، جب ایک شیرف اور اس ماتحتوں نے مارچ کرتے ہوئے کان کنوں پر فائر کھول دیئے تھے اور اس کے نتیجے میں انیس کان کن مارے گئے تھے، اور اکثر کی پشت پر گولیاں لگی ہوئی تھیں، لیکن پریس میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ مزدوروں کے جرنل نے مزید کہا: "ہزاروں قیمتی جانیں جو ہر سال حرص و ہوا کے دیوتاؤں کے بھینٹ چڑھتی ہیں، سرمایہ داری کو محنت کشوں کے خون کا خراج جو باقاعدگی سے ادا کیا جاتا ہے، اس پر انتقام یا تلافی کی کوئی صدا سننے میں نہیں آتی۔"

چند یونینز، جیسا کہ "یونائٹڈ مائن ورکرز" نے "مین" کے ڈوبنے کے بعد امریکی مداخلت کے لیے آواز اٹھائی۔ لیکن زیادہ تر جنگ کے خلاف تھیں۔ "امریکن لانگ شور مین" یونین کے خزانچی بولٹن ہال نے ایک پمفلٹ "مزدوروں سے امن کی اپیل" لکھا جو کہ وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا "اگر جنگ ہوتی ہے تو آپ کو اپنی جانیں اور ٹیکس ادا کرنے ہوں گے، اور دوسرے ناموری حاصل کریں گے۔"

سوشلسٹوں نے، چند استثنات کے ساتھ (جیوئش ڈیلی فارورڈ" ان میں سے ایک تھی) جنگ کی مخالفت کی، ایک اہم سوشلسٹ اخبار "دی اپیل ٹو ریزن" جو کہ بہت زیادہ پڑھی جانے والی اخبار تھی نے لکھا: "جنگ کی تحریک لوگوں کو اندرونی غلط کاریوں کی تلافی سے روکنے کا حکمرانوں کا ایک مقبول طریقہ کار ہے۔" سان فرانسسکو کی اخبار "وائس آف لیبر" میں ایک سوشلسٹ نے لکھا: "یہ سوچا ایک خوفناک عمل ہے کہ اس ملک کے غریب محنت کشوں کو سپین کے غریب محنت کشوں کو زخمی کرنے اور مارنے کے لیے بھیجا جائے کیونکہ چند لیڈر انہیں ایسا کرنے لیے اُکسا رہے ہیں۔"

لیکن جب جنگ کا اعلان کر دیا گیا تو اکثر یونینز نے اس کی حمایت کی "سیموئیل گومپرز" نے جنگ کو "شاندار اور حق بجانب" قرار دیا۔ یہ روزگار کے زیادہ مواقع اور زیادہ معاوضے لے کر ہی نہیں بلکہ زیادہ قیمتیں اور زیادہ ٹیکس بھی لے کر آئی تھی۔

1898ء کے یوم مئی پر سوشلسٹ لیبر پارٹی نے نیو یارک میں جنگ کیخلاف ایک مارچ کو منظم کیا، لیکن حکام نے اس کی اجازت نہ دی۔ جبکہ یوم مئی پر یہودی اخبار "ڈیلی فارورڈ" کی بلائی گئی پریڈ کی اجازت دے دی گئی کیونکہ اس میں یہودی محنت کشوں کو جنگ کی حمایت کے لیے کہا گیا تھا۔

بوٹس ہال کی "لانگ شور مین" کی جنگ کے دوران بدعنوانیوں اور منافع خوری کی پیشگوئیاں حیران کن طور پر درست ثابت ہوئیں۔ رچرڈ مورس کے "انسائیکلوپیڈیا آف امریکن ہسٹری" میں پریشان کن اعداد و شمار دیے گئے ہیں:

"فوج میں خدمات انجام دینے والے 2,74,000 آفیسرز اور جوانوں میں سے سپین امریکہ جنگ اور فوج سے سبکدوشی کے عرصے کے دوران 5,462 افراد مختلف آپریشن تھیٹروں میں اور امریکہ میں کیمپوں میں مر گئے۔ جنگ کی وجہ سے ہونے والی اموات کی تعداد صرف 379 تھی باقی ماندہ اموات کو بیماری اور دوسری وجوہات کے ساتھ منسوب کیا گیا۔

یہی اعداد و شمار "والٹر ملس" کی کتاب "دی مارشل سپرٹ" میں دیے گئے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا میں یہ مختصر الفاظ میں اور "حنوط شدہ گوشت" (فوجی جرنیلوں کی ایک اصطلاح) کے ذکر کے بغیر ہے جو کہ گوشت پیک کرنے والوں نے فوج کو بیچا۔ یہ گوشت بورک ایسڈ نائٹریٹ آف پوٹاش اور مصنوعی رنگوں سے محفوظ کیا گیا تھا، لیکن اب گل سڑ چکا تھا۔ ہزاروں سپاہیوں کو "فوڈ پوائزننگ" ہو گئی۔ ایسے کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں جن سے پتہ چل سکے کہ پانچ ہزار غیر جنگی اموات میں سے کتنی اموات اس کی وجہ سے ہوئی تھیں۔

سپین کی فوجوں کو تین ماہ میں شکست دے دی گئی تھی، جس پر امریکی وزیر خارجہ "جان ہے" نے اسے "شاندار مختصر جنگ" کا نام دیا۔ امریکی فوج نے یوں ظاہر کیا جیسے کیوبا کے باغیوں کی فوج کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جب ہسپانویوں نے ہتھیار ڈالے تو کیوبا کے کسی بھی شخص کو ہتھیار ڈالنے کی منظوری دینے یا اس پر دستخط کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ جنرل "ولیم شافٹر" نے حکم دیا کہ کوئی مسلح باغی دارالحکومت کے شہر "سان تیا گو" میں داخل نہیں ہو سکتا، اور کیوبا کے باغی لیڈر جنرل "کالیکسٹو گارشیا" کو بتایا کہ سان تیا گو کے میونسپل دفاتر میں کوئی کیوبا کا آدمی داخل نہیں ہو سکتا بلکہ پرانے ہسپانوی سول حکام ہی سان تیا گو میں میونسپل دفاتر کے انچارج رہیں گے گارشیا نے ایک احتجاجی مراسلہ تحریر کیا..... جب سان تیا گو میں حکام کی تعیناتی کا سوال پیدا ہوتا ہے تو مجھے گہرے رنج و غم کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ حکام کیوبا کے باشندوں کے منتخب کردہ نہیں، بلکہ وہی ہیں جن کو سپین کی ملکہ مقرر کرتی ہے۔"

کیوبا میں امریکی فوج کے ساتھ امریکی سرمایہ بھی آ گیا تھا۔

"لمبر مینز ریویو" جو کہ لکڑی کی صنعت کا ترجمان تھا جنگ کے دوران لکھا: "کیوبا میں اب بھی 10,000,000 ایکڑ ایسے جنگلات موجود ہیں جنہیں ابھی تک ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا اور یہ قیمتی لکڑی

سے بھرے ہوئے ہیں جس کا ہر فٹ امریکہ میں فروخت کیے جانے کے قابل ہو گا، اور بہت زیادہ قیمت پائے گی۔"

جب جنگ ختم ہوئی تو امریکیوں نے ریلویز، کانیں اور گنے کی کاشت کے علاقے خریدنا شروع کر دیے، چند سالوں میں 30 ملین ڈالر امریکی سرمایہ یہاں لگا دیا گیا تھا۔ "یونائٹڈ فروٹ" کیوبا کی شوگر انڈسٹری میں آ گئی۔ اس نے 1.9 ملین ایکڑز زمین 20 ڈالر فی ایکڑ کے حساب سے خرید لی۔ "امریکن ٹوبیکو کمپنی" بھی پہنچ گئی۔ 1901ء میں قبضے کے اختتام تک کیوبا کی معدنیات کی 80 فی صد برآمدات امریکیوں کے ہاتھ میں تھی جس میں بڑا حصہ "بیتھلیہم سٹیل" کا تھا۔

فوجی قبضے کے دوران ہڑتالوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ستمبر 1899ء میں ہوانا میں ہزاروں مزدوروں کے ایک اجتماع میں آٹھ گھنٹے کام کے لیے ایک عمومی ہڑتال کا آغاز کیا گیا، امریکی جنرل ولیم لڈلو نے ہوانا کے میئر کو گیارہ ہڑتالی لیڈروں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اور امریکہ کے فوجیوں نے ریلوے سٹیشنوں اور گودیوں پر قبضہ کر لیا۔ پولیس شہر میں گشت کر کے اجلاسوں کو منتشر کرنے لگی، لیکن شہر کی معاشی سرگرمیاں جامد ہو کر رہ گئیں۔ تمباکو کا کام کرنے والوں نے ہڑتال کر دی، پرنٹرز نے ہڑتال کر دی، بیکر ہڑتال پر چلے گئے، سینکڑوں ہڑتالی گرفتار کر لیے گئے، اور پھر مقید لیڈروں کو ہڑتال ختم کرنے کی اپیل میں شامل کیا گیا۔

امریکہ نے کیوبا پر قبضہ نہ کیا۔ لیکن کیوبا کی آئینی کنونشن کو بتایا گیا کہ امریکہ کی فوج اس وقت تک واپس نہیں جائے گی جب تک "پلاٹ ترمیم" جو کہ کانگریس نے فروری 1901ء میں پاس کی تھی کو کیوبا کے آئین کا حصہ نہیں بنایا جاتا۔ اس ترمیم نے امریکہ کو کیوبا کی آزادی کے تحفظ کے لیے اور ایسی حکومت کے قیام کے لیے جو زندگی، جائداد اور شخصی آزادی کو تحفظ فراہم کرنے کے قابل ہو، مداخلت کا حق عطا کر دیا۔

"پلاٹ ترمیم" اب نہ صرف انقلابی اور مزدور پریس میں، بلکہ پورے امریکہ کے اخبارات اور گروپس میں کیوبا کی آزادی کے نظریہ سے بے وفائی کے طور پر دیکھی جا رہی تھی۔ "امریکن اینٹی امپیریلسٹ لیگ" نے بوسٹن کے فنیوئل ہال میں ایک عوامی جلسہ میں اس کی مذمت کی، سابقہ گورنر جارج باؤٹ ویل نے کہا" کیوبا کے ساتھ آزادی اور خود مختاری کے اپنے وعدے کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم اس جزیرے پر نو آبادیاتی مصبداری کی شرائط لاگو کر رہے ہیں۔"

آئینی کنونشن کے موقعے پر کیوبا کے باشندوں نے ہوانا میں پندرہ ہزار افراد پر مشتمل ایک مشعل بردار جلوس نکالا اور کنونشن کے شرکاء پر اس ترمیم کو مسترد کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ سان تیا گو سے آنے والے ایک سیاہ فام مندوب نے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "امریکہ کا اس بات کے تعین کرنے کا

حق کہ ہماری آزادی کو کب خطرہ ہے اور وہ کب اس کے تحفظ کے لیے مداخلت کر رہا ہے اپنے پاس محفوظ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر کی چابیاں ہم ان کو تھما دیں تا کہ وہ جب چاہیں اور جب ان کے دل میں خواہش پیدا ہو، خواہ ان کی نیت نیک ہو یا بد، دن ہو یا رات کسی بھی وقت اندر داخل ہو جائیں۔"

اس بات پر کنونشن نے اکثریت کے ساتھ "پلاٹ ترمیم" مسترد کر دی۔ تاہم اگلے تین ماہ میں امریکہ کے دباؤ، فوجی قبضے، کیوبا کو اپنی حکومت قائم کرنے کی اجازت دینے سے انکار نے اپنے اثرات مرتب کئے اور کنونشن نے کئی مرتبہ کے انکار کے بعد "پلاٹ ترمیم" کو اختیار کر لیا۔ 1901ء میں جنرل "لیونارڈ ووڈ" نے تھیوڈور روز ویلٹ کو لکھا: "پلاٹ ترمیم کے تحت کیوبا کے پاس بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر آزادی رہ گئی ہے۔"

کیوبا ایک کھلم کھلا نوآبادی نہیں تھی، لیکن اب یہ امریکہ کے حلقے میں تھا۔ تاہم سپین امریکہ جنگ امریکہ کی طرف سے بیت سے براہ راست ذیلی الحاق پر منتج ہوئی۔ کیریبین میں کیوبا کا ایک ہمسایہ جزیرہ "پیورٹو ریکو" سپین کے قبضے میں تھا جس پر امریکہ کی افواج نے قبضہ کر لیا۔ بحرالکاہل کی چوڑائی کے ایک تہائی فاصلے پر واقع ہوائی جزائر پر پہلے ہی امریکی مشنریوں اور اناس کے کاشت کاروں نے یلغار بول رکھی تھی۔ اور امریکی آفیسرز نے اسے ایک ایسا پکا ہوا پھل قرار دیا تھا جو توڑے جانے کے لیے تیار تھا۔ اسے کانگریس کی ایک مشترکہ قرارداد کے ذریعے 1898ء میں امریکہ میں شامل کر لیا گیا۔ اسی دوران ہوائی سے 23 سو میل اور جاپان کے راستے میں جزیرہ "ویک" پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ اور پھر بحرالکاہل میں تقریباً فلپائن کے قریب واقع گوام جزیرے کو جو کہ سپین کی ملکیت تھا قبضہ کر لیا گیا۔ دسمبر 1898ء میں سپین کے ساتھ ایک امن معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں گوام، پیورٹو ریکو، اور فلپائن جزائر 20 ملین ڈالر کی ادائیگی پر امریکہ کو سونپ دیئے گئے۔

اس مسئلے پر کہ فلپائن جزائر کو حاصل کیا جائے یا نہ، امریکہ میں گرما گرم بحث مباحثہ ہوا۔ جیسا کہ کہانی بیان کی جاتی ہے۔ صدر "مک کینلے" نے وائٹ ہاؤس میں آنے والے منسٹرز کے ایک گروپ کو بتایا کہ وہ کس طرح اس فیصلے پر پہنچا۔

> میں وائٹ ہاؤس کے فرشوں پر کئی راتوں تک آدھی آدھی رات تک گھومتا رہا، اور میں آپ کو یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا کہ میں نے گھٹنوں کے بل ہو کر ایک سے زیادہ راتوں میں خدا سے روشنی اور راہنمائی طلب کی۔ اور ایک رات کے پچھلے پہر میں یہ مجھ پر ظاہر ہوئی، میں نہیں جانتا کہ کس طرح لیکن یہ ظاہر ہوئی۔
>
> وہ یہ کہ ہم انہیں سپین کو واپس نہیں دے سکتے۔ یہ ایک بزدلانہ اور ذلت آمیز عمل ہو گا۔ اور یہ کہ ہم انہیں ان کے حال پر بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ اپنی حکومت قائم کرنے کے اہل نہیں ہیں، وہاں جلد انارکی اور لاقانونیت پھیل جائے گی، جو کہ سپین کی گزشتہ حکومت سے بھی بدتر ہو گی۔ اور اب اس کے سوا ہمارے لیے کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ ہم انہیں اپنی تحویل میں لے لیں، اور فلپائنیوں کو تعلیم دیں، انہیں اوپر اٹھائیں اور مہذب اور عیسائی بنائیں۔ اور اپنے ساتھی انسانوں کے طور پر جن کے لیے حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے، اللہ کے فضل و کرم کے ساتھ جو بہتر کر سکیں کریں۔ پھر میں مطمئن ہو کر اپنے بستر پر چلا گیا اور ایک پرسکون گہری نیند سویا۔

فلپائنیوں کو خدا کا یہ پیغام نہیں پہنچا تھا۔ فروری 1899ء میں وہ امریکہ کے خلاف بغاوت میں اٹھ کھڑے ہوئے، جیسا کہ وہ کئی مرتبہ ہسپانویوں کے خلاف بھی بغاوت کر چکے تھے۔ ایک فلپائنی لیڈر "ایمیلو آگیونالڈو" نے امریکہ کے خلاف لڑنے والے باغیوں کی قیادت سنبھال لی۔ اس نے امریکہ کے زیر حفاظت فلپائن کی آزادی کی تجویز پیش کی، لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔

امریکہ کو اس بغاوت کو کچلنے میں تین سال لگے، یہاں ستر ہزار فوجی استعمال کئے گئے (کیوبا میں اتاری جانے والی فوج سے چار گنا زیادہ) اور ہزاروں کی تعداد میں اموات ہوئیں (کیوبا کی نسبت کئی گنا زیادہ) یہ ایک شدید جنگ تھی۔ فلپائنیوں کے لیے جنگ اور بیماریوں کی وجہ سے اموات کی شرح بہت زیادہ تھی۔

سلطنت کو وسعت دینے کا چسکا پورے ملک میں سیاستدانوں اور کاروباری افراد کے منہ کو لگ چکا تھا۔ 9 جنوری 1900ء کو "البرٹ بیورج" نے ملک کے نمایاں معاشی اور سیاسی مفادات کی بات کرتے ہوئے سینیٹ میں کہا:

> جناب صدر! وقت صاف گوئی کا تقاضا کرتا ہے۔ جزائر فلپائن ہمیشہ کے لیے ہمارے ہیں.... اور فلپائن سے بالکل آگے چین کی لامحدود منڈیاں ہیں، ہم کسی سے بھی پسپائی اختیار نہیں کریں گے، ہم دنیا کو مہذب بنانے کے اپنے مشن سے جو خدا نے ہمیں سونپا ہے دستبردار نہیں ہوں گے، ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہمارا جنگی رویہ ظالمانہ ہے، سینیٹرز کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم امریکیوں یا یورپیوں سے نہیں نمٹ رہے بلکہ ہم مشرقی لوگوں سے نمٹ رہے ہیں۔

"مک کینلے" نے کہا تھا کہ باغیوں سے جنگ کا آغاز اس وقت ہوا جب انہوں نے امریکی افواج پر حملہ کیا۔ لیکن بعد میں امریکی سپاہیوں نے تصدیق کی کہ پہلی گولی امریکہ کی جانب سے چلائی گئی تھی جنگ کے بعد ایک فوجی افسر نے بوسٹن کے فینوئل ہال میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے کرنل نے اسے باغیوں کے ساتھ لڑائی کی ابتداء کرنے کا حکم دیا تھا۔

ہارورڈ فلاسفر ولیم جیمز، نمایاں امریکی کاروباری افراد، سیاستدانوں اور دانشوروں کی تحریک

میں شامل تھا جنھوں نے 1898ء میں "اینٹی ایمپرلسٹ لیگ" تشکیل دی تھی، اور امریکی عوام کو فلپائن کی جنگ کی ہولناکیوں اور سامراجیت کی برائیوں سے آگاہ کرنے کے لیے ایک لمبی مہم کا آغاز کیا تھا۔

"اینٹی ایمپرلسٹ لیگ" نے ان فوجیوں کے خط شائع کیے جو فلپائن میں فرائض انجام دے رہے تھے۔ کنساس کے ایک کیپٹن نے لکھا: کالوکان سترہ ہزار افراد پر مشتمل ایک قصبہ تھا۔ بیسویں کنساس رجمنٹ اس میں سے صفایا کرتے ہوئے گزری اور اب اس میں ایک بھی زندہ مقامی باشندہ موجود نہیں۔ "واشنگٹن ریاست سے تعلق رکھنے والے ایک رضا کار نے لکھا: "ہمارا لڑنے کا جذبہ بہت بلند تھا اور ہم سب نیگروز کو مارنا چاہتے تھے۔"

یہ امریکہ میں شدید نسل پرستی کا دور تھا۔ 1889ء اور 1903ء کے درمیانی سالوں میں تقریباً ہر روز اوسطاً دو نیگروز ہجوم کے ہاتھوں مارے جاتے تھے، انہیں پھانسی دی جاتی، جلا دیا جاتا یا ان کے جسمانی اعضا کاٹ دیئے جاتے تھے۔ فلپائنی لوگ بھوری جلد والے، جسمانی طور پر قابل شناخت اور عجیب و غریب زبان بولنے والے اور امریکیوں کے لیے عجیب و غریب حلیے کے حامل لوگ تھے۔ جنگ کے عمومی بلا امتیاز وحشیانہ پن کے ساتھ نسلی دشمنی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا تھا۔

نومبر 1901ء "فلاڈلفیا لیجر" کے منیلا میں مقیم نمائندے نے لکھا: "ہمارے آدمی بڑی بے رحمی کے ساتھ مردوں، عورتوں، بچوں، قیدیوں اور پکڑے گئے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں، متحرک باغیوں اور جن پر ذرا برابر بھی شک ہو، دس سے اوپر کے تمام لوگوں کو بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ وہ فلپائنیوں کو کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔"

منیلا میں بحریہ کے ایک میجر "لٹل ٹاؤن والر" پر جزیرہ سمار میں دس نہتے فلپائنیوں کو بغیر کسی مقدمے کے مار دینے کے الزام لگایا گیا۔ بحریہ کے دوسرے افسروں نے اس کے اعتراف کو یوں بیان کیا۔ "میجر نے کہا کہ جنرل سمتھ نے اسے مارنے اور جلانے کو کہا.... اس کا کہنا تھا کہ یہ قیدی بنانے کا وقت نہیں ہے اور وہ سمار کو ایک ہولناک ویرانے میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے۔ میجر نے جنرل سمتھ سے موت کے گھاٹ اترنے کے لیے عمر کی حد کے بارے میں پوچھا اور اس نے جواب دیا ہر کوئی جو دس سال سے اوپر ہے۔"

مارک ٹوئن نے فلپائن جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "ہم نے جزیرے کے چند ہزار لوگوں کو امن کی نیند سلا کر دفن کر دیا، ان کے کھیتوں کو تباہ کیا، ان کے دیہاتوں کو نذر آتش کیا اور ان کی بیواؤں اور بچوں کو گھروں سے باہر نکال دیا.... اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی ان رحمتوں کے ساتھ (یہ الفاظ میرے نہیں حکومت کے ہیں) ہم ایک عالمی طاقت بن گئے ہیں۔"

امریکیوں کی آتشیں قوت اس سے بہت زیادہ ارفع تھی جو باغی فلپائنی ان کے خلاف استعمال

کر سکتے تھے۔ پہلی جنگ میں ہی ایڈمرل ڈیوی "دریائے پاسگ" میں دخانی جہازوں کے ذریعے آگے بڑھا اور فلپائنیوں کے مورچوں پر 500 پونڈ کے آتشیں گولے برسائے۔ مردہ فلپائنیوں کی لاشوں کے اتنے اونچے ڈھیر لگ گئے تھے کہ امریکی سپاہیوں نے ان کو حفاظتی پشتے کے طور پر استعمال کیا۔ ایک برطانوی چشم دید گواہ نے کہا: "یہ کوئی جنگ نہیں تھی۔ یہ محض ایک قتل عام اور خون کی ہولی تھی۔" وہ غلط تھا، یہ جنگ تھی۔ باغیوں کا اس قسم کی انہونیوں کے خلاف سالوں تک سینہ سپر رہنے کا مطلب یہ تھا کہ انہیں عوامی حمایت حاصل تھی۔ فلپائن جنگ کے کمانڈر جنرل "آرتھر میک آرتھر" نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ "آگیونالڈو" کے فوجی آبادی کے ایک مختصر سے حصے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ "لوزون" کی پوری آبادی (جو کہ مقامی آبادی ہے) ہمارے خلاف تھی۔ لیکن اس نے کہا کہ "میں یہ نہ چاہتے ہوئے بھی ماننے پر مجبور ہوں، کیونکہ فلپائنی فوج کی گوریلا چالوں کا انحصار تقریباً پوری مقامی آبادی کے مکمل تعاون اور اتحاد پر ہے۔"

وحشیانہ پن اور سفاکی کی بڑھتی ہوئی شہادتوں اور "اینٹی ایمپرلسٹ لیگ" کے کام کے باوجود امریکہ میں کچھ ٹریڈ یونینز سامراجی وسعت کی حمایت کر رہی تھیں۔ لیکن "کارپینٹر جرنل" نے سوال اٹھایا۔ "انگلینڈ کی تمام تر نوآبادیاتی وسعت کے بعد وہاں کا محنت کش طبقہ کس قدر خوشحال ہو سکا ہے؟"

جب جزائر فلپائن پر قبضے کا معاہدہ 1899ء کے آغاز میں کانگریس میں زیر بحث تھا تو بوسٹن اور نیو یارک کی "مرکزی لیبر یونینز" نے اس کی مخالفت کی۔ اس پر قبضے کے خلاف نیو یارک میں ایک عوامی جلسہ ہوا۔ "اینٹی ایمپرلسٹ لیگ" نے فلپائن پر قبضہ کرنے کے خلاف ایک ملین سے زائد تحریری بیان تقسیم کیے۔ جبکہ لیگ کو منظم کرنے اور اس پر نمایاں طور پر غالب طبقہ دانشوروں اور کاروباری افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے پانچ لاکھ ممبران میں کثیر تعداد محنت کش افراد کی تھی جن میں خواتین اور سیاہ فام بھی شامل تھے۔ لیگ کے مقامی عہدیداروں نے پورے ملک میں اجلاس منعقد کیے۔ اس معاہدے کے خلاف مہم بہت طاقتور تھی اور جب سینیٹ نے اسے منظور کیا تو اسے صرف ایک ووٹ سے کامیابی حاصل ہوئی۔

جنگ کے بارے میں مزدوروں کے ملے جلے ردعمل (معاشی فوائد کے حوالے سے اس پر کشش محسوس کرتے ہوئے اور سرمایہ دارانہ پھیلاؤ اور تشدد کی وجہ سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے) سے یہ بات یقینی ہو گئی کہ مزدور جنگ رکوانے یا ملک میں موجود نظام کے خلاف طبقاتی جنگ شروع کرنے کے لیے متحد نہیں ہو سکتے۔

جنگ کے بارے میں سیاہ فام فوجیوں کا ردعمل بھی ملا جلا تھا۔ معاشرے میں آگے بڑھنے کی خواہش ہر ایک میں موجود ہوتی ہے جب کہ سیاہ فاموں کو ان مواقعوں سے محروم رکھا جاتا تھا، لیکن فوجی زندگی ایسے امکانات مہیا کرتی تھی۔ یہ نسلی غرور کا تقاضا تھا کہ ثابت کیا جائے کہ سیاہ فام بھی اتنے ہی جرأت مند اور

محب الوطن ہیں جتنے کہ دوسرے لوگ اور یہ موقع صرف جنگ ہی مہیا کرتی تھی۔ اس کے باوجود ایک وحشیانہ اور سفاکانہ جنگ کا شعور بھی تھا جو رنگدار لوگوں کے خلاف لڑی جا رہی تھی اور امریکہ میں سیاہ فاموں کے خلاف کیے جانے والے تشدد کا ہی ایک تسلسل تھی۔

فلوریڈا کے قصبے "ٹیمپا" میں مقیم سیاہ فام فوجیوں کو مقامی سفید فام آبادی کی طرف سے شدید نسلی نفرت کا سامنا تھا۔ ایک نسلی فساد "اس وقت شروع ہوا جب شراب کے نشے میں بدمست سفید فام فوجیوں نے اپنی نشانہ بازی کی مہارت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک نیگرو بچے کو ٹارگٹ کے طور پر استعمال کیا۔ نیگروز فوجیوں نے جوابی کارروائی کی۔ اور پھر ایک اخباری رپورٹ کے مطابق گلیاں نیگرو خون سے سرخ ہو گئیں۔

سیاہ فام رجمنٹ کے ایک پادری نے "کلیولینڈ گزٹ" کو کیوبا کی جنگ سے واپس آنے والے سیاہ فام فوجیوں کے بارے میں لکھا کہ کنساس سٹی میں ان کا استقبال درشتگی اور طنزیہ انداز میں کیا گیا۔ اس نے کہا کہ "ان سیاہ فام لڑکوں کو جو کہ ہمارے ملک کے ہیروز ہیں ریستورانوں کے کاؤنٹروں پر کھڑے ہو کر سینڈوچ کھانے اور کافی پینے کی اجازت نہیں دی جاتی، جبکہ سفید فام فوجیوں کو خوش آمدید کہا جاتا اور میزوں پر بیٹھنے کو کہا جاتا اور کھانے پینے کی اشیاء مفت مہیا کی جاتی ہیں۔

لیکن یہ فلپائن کی صورت حال تھی جس نے امریکہ میں بہت سے سیاہ فاموں کو مخالفت پر ابھارا۔ "افریقن میتھوڈسٹ ایپس کوپل چرچ" کے سینئر بشپ ہنری ایم ٹرنر نے فلپائن میں جاری مہم کو "فتوحات کی ایک ناپاک جنگ" قرار دیا اور فلپائنیوں کا ذکر "سیاہ محب الوطنوں" کے نام سے کیا۔

جزائر فلپائن میں چار سیاہ فام رجمنٹیں فرائض ادا کر رہی تھیں۔ بہت سے سیاہ فام فوجیوں نے جزائر میں موجود بھوری رنگت والے مقامی لوگوں کے ساتھ ایک تعلق خاطر قائم کر لیا، اور جب سفید فام فوجی فلپائنیوں کا ذکر کرنے کے لیے "نیگروز" اصطلاح استعمال کرتے تو غصے میں آ جاتے تھے۔ فلپائن مہم کے دوران سیاہ فام فوجیوں کی ایک بڑی تعداد فوج سے فرار ہوئی۔

فلپائن سے "ولیم سمس" نے لکھا: میں اس سوال سے لاجواب ہو گیا جو فلپائن کے ایک چھوٹے سے بچے نے مجھ سے کیا، اس نے کہا "امریکہ کا نیگرو یہاں کیوں آیا ہے.... ہم سے لڑنے کے لیے، جبکہ ہم اس کے بہت اچھے دوست ہیں، اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تم امریکہ کے ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں لڑتے جو نیگروز کو جلا دیتے ہیں۔"

انفنٹری رجمنٹ سے تعلق رکھنے والے ایک سیاہ فام "ولیم فلبرائٹ" نے جون 1901ء میں انڈیاناپولس کے ایک اخبار کے ایڈیٹر کو مینیلا سے لکھا: "جزائر میں کی جانے والی یہ جدوجہد ایک ناکام لیکن لوٹ مار اور ظلم کی استبداد کی ایک بہت بڑی سکیم ہے۔"

گھر واپس آ کر، جب کہ فلپائن کے خلاف جنگ ابھی جاری تھی، میساچوسٹس کے نیگروز کے ایک گروپ نے صدر "مک کینلے" کو ایک پیغام بھیجا:

ہم اس کھلے خط میں اپنی بات آپ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ ہم پر ہونے والی غلط کاریوں پر آپ کی غیر معمولی اور ناقابل فہم خاموشی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

....آپ نے ہمارے مصائب کو دیکھا ہے ہمارے ساتھ ہونے والے خوفناک سلوک اور مظالم کا آپ نے اپنے بلند مقام سے مشاہدہ کیا ہے۔ اور اس کے باوجود آپ کے پاس کوئی وقت نہیں اور کسی بھی موقعے نے ہماری خاطر آپ کے لبوں کو نہیں کھولا....

امریکہ کے سیاہ فاموں نے جب ان کے دلوں پر خوفناک توقعات اور اندیشوں نے اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے، آپ کی جانب رجوع کیا تھا۔ جب نارتھ کیرولینا کے اس شہر ولمنگٹن کو دو دنوں اور دو راتوں تک ایک خونریز انقلاب نے اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا، جب نیگروز کو بغیر کسی جرم کے محض ان کی جلد کے رنگ اور امریکی شہریت کے تحت حاصل اپنے حقوق کے مطالبے کے جرم میں، اس بدقسمت قصبے کی گلیوں میں کتوں کی طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا.... اور وہ وفاقی مدد کے منتظر رہے جو نہ تو آپ نے پہنچائی اور نہ ہی کبھی پہنچائیں گے۔

اور جب آپ نے اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مغربی علاقے کا دورہ کیا تو ہم نے دیکھا کہ آپ نے کس طرح مکاری کے ساتھ جنوب میں پائے جانے والے نسلی تعصب سے نمٹنے کی کوشش کی...... آپ نے کس طرح ایک لمبے عرصے سے ظلم و ستم سہتے ہوئے سیاہ فام شہریوں کو صبر، محنت اور اعتدال پسندی کا سبق دیا اور اپنے سفید فاموں کو حب الوطنی، جنگجویانہ وطن پرستی اور سامراجیت کا راستہ دکھایا....

صبر، محنت، اور اعتدال پسندی جس کا سیاہ فاموں کو سبق دیا گیا تھا اور حب الوطنی جس کی سفید فاموں کو ہدایت دی گئی تھی کسی نے بھی اپنا اثر نہ دکھایا۔ بیسویں صدی کے پہلے سال میں، ریاست کی طاقت کے تمام تر مظاہرے کے باوجود سیاہ فاموں، سفید فاموں، مردوں، اور خواتین کی ایک بڑی تعداد بے صبر، غیر اعتدال پسند اور غیر محب الوطن ہو گئی تھی۔

سوشلسٹ چیلنج

جنگ اور جنگجویانہ محبت الوطنی معمول کی زندگی سے جنم لینے والے طبقاتی غیظ کو التوا میں ڈال سکتی تھی، لیکن اس کا مکمل خاتمہ نہیں کر سکتی تھی۔ جیسے ہی بیسویں صدی کا آغاز ہوا یہ غیظ دوبارہ بھڑک اٹھا۔ انارکسٹ اور حقوق نسواں کی علمبردار "ایما گولڈ مین" نے جس کا سیاسی شعور، فیکٹری کے کام، گھاس منڈی کی پھانسیوں، ہوم سٹیڈ ہڑتال، اپنے محبوب اور ساتھی "الیگزینڈر برک مین" کی لمبی قید، 1890ء کے عشرے کی کساد بازاری، نیویارک کی ہڑتالی جدوجہد اور بلیک ویل جزیرے میں خود اپنی قید کے تناظر میں پروان چڑھا تھا، سپین امریکہ جنگ کے چند سال بعد ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> سفاک اور ظالم ہسپانویوں کے خلاف برہمی سے ہمارے دل کس طرح جلا کرتے تھے.... لیکن جب دھواں چھٹا اور مردے دفن کر دیے گئے تو اس جنگ کی قیمت عوام کو اشیائے صرف اور کرایوں میں اضافے کی صورت میں چکانا پڑی، جب ہم اپنی حب الوطنی کی نشاط انگیزی سے باہر آئے، تو ہم پر اچانک انکشاف ہوا کہ سپین امریکہ جنگ کی وجہ چینی کی قیمت تھی.... یعنی امریکی عوام کی زندگیاں، خون اور دولت امریکی سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال ہوئی تھی۔

مارک ٹوئن نہ تو انارکسٹ تھا اور نہ ہی انقلابی تھا۔ 1900ء میں 65 سال کی عمر میں وہ امریکی تمدن کے بارے میں مزاحیہ اور سنجیدہ کہانیاں لکھنے کے حوالے سے پوری دنیا میں جانا جاتا تھا۔ اس نے امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک کا بغور مشاہدہ کیا تھا اور پوری دنیا میں گھوما ہوا تھا اور صدی کی ابتداء میں اس نے "نیویارک ہیرالڈ" میں لکھا" میں آپ کی ملاقات پرشکوہ "میٹرن" سے کرواتا ہوں جس کا نام "کرسچن ڈم" (عیسائی دنیا) ہے۔ جو "کیاؤ چاؤ" "منچوریا" "جنوبی افریقہ" اور فلپائن میں اپنے لوٹ مار کے حملوں سے کیچڑ میں لتھڑی ہوئی دنیا کے سامنے شرم سار اور بے عزت ہو کر واپس آئی ہے، جبکہ اس کی روح کمینگی سے بھری ہوئی۔ جیبیں ناجائز دولت سے لبالب بھری ہوئیں اور منہ مقدس منافقتوں سے لتھڑا ہوا ہے۔"

پھر ابتدائی بیسویں صدی کے مصنفین تھے جنہوں نے سوشلزم کی بات کی، جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام پر کڑی تنقید کی۔ یہ محض مبہم اور غیر واضح پمفلٹ لکھنے والے نہیں تھے بلکہ امریکہ کی مشہور ادبی شخصیات میں سے تھے جن کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں پڑھی جاتی تھیں۔ ان میں اپٹن سنکلیئر، جیک لنڈن، تھیوڈور ڈریزر، اور فرینک نورس شامل تھے۔

اپٹن سنکلیئر کا ناول "دا جنگل" 1906ء میں شائع ہوا جس میں بیان کیے گئے شکاگو کے گوشت پیک کرنے والے پلانٹس کے حالات نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا اور گوشت کی صنعت کو منظم کرنے کے لیے قانون سازی کے مطالبات سامنے آئے۔ لیکن اس میں ایک آباد کار مزدور "جرگس روڈکس" کی کہانی کے ذریعے سوشلزم کی بات بھی کی گئی تھی کہ اگر لوگ مشترکہ طور پر دنیا کی دولت کے مالک ہوں مل کر کام کریں اور برابر کے شریک ہوں تو زندگی کتنی حسین بن سکتی ہے۔ "دا جنگل" سب سے پہلے ایک سوشلسٹ اخبار میں قسط وار شائع ہوا، بعد میں کتابی صورت میں لاکھوں کی تعداد میں پڑھا گیا، اور سترہ زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔

اپٹن سنکلیئر کی سوچ پر جیک لنڈن کی کتاب "پیپلز آف دا ابیس" نے گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ لنڈن سوشلسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔ وہ سان فرانسسکو کی کچی آبادی میں پروان چڑھا تھا اور ایک غیر شادی شدہ عورت کا بیٹا تھا۔ وہ اخبار یں بیچتا رہا، ایک ڈبوں میں اشیاء بند کرنے والی فیکٹری میں کام کیا، پٹ سن کی مل اور لانڈری میں کام کیا، مشرقی ساحل کی جانب ریلوے لائن بچھانے میں کام کرتا رہا، نیویارک کی سڑکوں پر پولیس کے ڈنڈے کھائے، نیاگرا کی آبشاروں میں آوارہ گردی کے جرم میں گرفتار ہوا، جیل میں لوگوں کو مار پڑتے اور اذیتیں سہتے دیکھا، خلیج سان فرانسسکو میں کستورا مچھلیاں (جن میں سچے موتی ہوتے ہیں) لوٹتا رہا، اس نے فلاؤبرٹ، ٹالسٹائی، مل ویلی اور کیمونسٹ مینی فیسٹو پڑھا، 1896ء کے موسم سرما میں الاسکا کے سونے کی کانوں میں سوشلزم کی تبلیغ کرتا رہا، بحیرہ بیرنگ میں دو ہزار میل کا سفر کر کے واپس آیا۔ اور دنیا کی مشہور مہماتی کتابوں کا مصنف بنا۔ 1906ء میں اس نے اپنا ناول "دا آئرن ہیل" لکھا جس میں فاشسٹ امریکہ کو متنبہ کیا گیا تھا اور انسانوں کے سوشلسٹ بھائی چارے کا پرچار تھا۔ اس ناول میں اس نے کرداروں کی زبانی نظام کو موردالزام ٹھہرایا۔

> اس حقیقت کے پیش نظر کہ جدید انسان غاروں کے دور سے زیادہ تکلیف دہ اور گھٹیا زندگی بسر کر رہا ہے جبکہ اس کی پیداواری قوت غاروں کے انسانوں کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ ہے، سوائے اس کے کوئی دوسرا نتیجہ نکالنا ممکن نہیں کہ سرمایہ دار طبقے نے یہ بگاڑ پیدا کیا ہے، مجرمانہ اور خودغرضانہ طور پر یہ بگاڑ پیدا کیا گیا ہے۔

نظام پر اس حملے کے ساتھ وہ یہ شعور بھی دیتا ہے۔ "ہمیں ان شاندار مشینوں کو تباہ نہیں کرنا

چاہیے جواس قدر مستعدی سے کم سے کم لاگت پر پیداوار دیتی ہیں۔ ہمیں انہیں کنٹرول کرنا چاہیے، آیئے ان کی استعداد کار اور سستے پن سے فائدہ اٹھائیں۔ آیئے ان کو اپنے لیے چلائیں۔ سوشلزم اس کا نام ہے۔"

یہ وہ وقت تھا جب خود ساختہ جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والی ایک ادبی شخصیت، ناول نگار ہنری جیمز، جو کہ سیاسی بیانات دینے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، نے 1904ء میں امریکہ کا دورہ کیا اور ملک کو "زہریلے" کے ایک بہت بڑے باغ کی مانند پایا۔ جس میں دولت کی ہوس کے ہر قسم کے زہریلے درخت پروان چڑھ رہے تھے۔

"مک ریکرز" (بڑے لوگوں اور سیاستدانوں کی بدعنوانیوں سے پردہ اٹھانے والے لوگ) نے محض جو کچھ وہ دیکھتے اسے بیان کرتے ہوئے معاشرے میں موجود اختلافات اور نزاع کو بہت ہوا دی۔ کچھ نئے بڑی سرکولیشن کے حامل میگزین نے ستم ظریفانہ طور پر محض منافع کے لالچ میں ان لوگوں کے مضامین شائع کیے: جن میں "ایڈا ٹربل" کے لکھے ہوئے "سٹینڈرڈ آئل کمپنی" کے کچے چٹھے، اور امریکہ کے بڑے شہروں میں ہونے والی بدعنوانیوں کے بارے میں "لنکن سٹیفنز" کی لکھی ہوئی داستانیں شامل تھیں۔

1900ء تک نہ تو جنگ کی حب الوطنی اور نہ ہی انتخابات میں سیاسی قوت کا انجذاب، نظام میں موجود خرابیوں کو دبانے میں کامیاب نظر آ رہا تھا۔ کاروباری ارتکاز کا عمل آگے بڑھ چکا تھا، اور ان پر بینکاروں کو کنٹرول واضح نظر آ رہا تھا۔ ٹیکنالوجی ترقی کر گئی اور کارپوریشنیں بڑی ہو گئیں۔ انہیں مزید سرمائے کی ضرورت تھی اور یہ سرمایہ بینکاروں کے پاس تھا۔

مورگن ہمیشہ ایک باقاعدگی، استحکام اور پیش بینی کے عنصر کی موجودگی کا خواہاں تھا۔ لیکن مورگن اور اس کے شریک کار کا بھی ایسے نظام پر مکمل کنٹرول نہیں تھا۔ 1907ء میں سراسیمگی، مالیاتی انہدام اور بحران نے جنم لیا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ بڑے کاروبار متاثر نہیں ہوتے تھے لیکن 1907ء کے بعد منافع اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ سرمایہ دار چاہتا تھا، صنعت اس تیزی سے نہیں پھیل رہی تھی جتنی تیزی سے پھیلنی چاہیے تھی اور صنعتکار اخراجات میں کمی کے راستے تلاش کرنے لگے۔

اس کا ایک طریقہ "ٹیلرازم" تھا۔ فریڈرک ڈبلیو ٹیلر ایک سٹیل کمپنی کا فورمین تھا۔ جس نے مل میں ہر کام کا تفصیلی تجزیہ کیا اور پیداوار اور منافع میں اضافہ کے لیے تفصیلی تقسیم کار، میکانائزیشن میں اضافہ، اور کام کے مطابق معاوضے کا نظام متعارف کروایا۔ ٹیلرازم کا مقصد کارکنوں کو مبادلہ پذیر (آسانی سے دوسرے کام پر لگائے جانے کے قابل) اور سادا کام کرنے کے قابل بنانا تھا، جس کی نئی تقسیم کار کو ضرورت تھی۔ تاکہ کارکنوں کو ان کی انفرادیت اور انسانیت سے محروم کر کے سامان تجارت کی طرح خریدا اور بیچا جا سکے۔

یہ نئی آٹو انڈسٹری کے لیے ایک بہت موزوں نظام تھا۔ 1909ء میں فورڈ نے 10607 گاڑیاں، 1913ء میں 168000، اور 1914ء میں 248,000 گاڑیاں (گاڑیوں کی کل پیداوار کا 40 فی صد حصہ) بیچیں، اور 30 ملین ڈالر کا منافع کمایا۔

آبادکاروں کی آمد اور محنت کشوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ٹیلرازم اپنے سادا اور غیر ہنر مند کام کی وجہ سے زیادہ قابل عمل ثابت ہوا۔ نیو یارک میں نئے آبادکار جن جگہوں پر کام کرتے وہ تازہ ہوا سے محروم اور تنگ و تاریک تھیں۔ شاعر ایڈون مارکہام نے جنوری 1907ء کے "کاسموپولیٹین میگزین میں لکھا۔

> تازہ ہوا سے محروم بند کمروں میں مائیں اور باپ دن رات سلائی کرتے ہیں۔
> وہ لوگ جو گھروں میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں انہیں فیکٹری کے کمروں میں بیٹھ کر کام کرنے والوں سے کم معاوضہ ادا کیا جاتا ہے..... بچوں کو کھیل کود سے ہٹا کر اپنے بڑوں کے ساتھ کام پر جوت دیا جاتا ہے۔ کیا یہ ظالم سماج نہیں ہے جو ان چھوٹی نازک روحوں کو بڑوں پر عائد ذمہ داریوں کے بوجھ تلے کچل رہا ہے، جبکہ اسی شہر میں ایک پالتو کتا گلے میں ہیرے جواہرات باندھے ایک خوبصورت خاتون کی مخملیں گود میں کھلی ہوا اور موسم کے مزے لے رہا ہوتا ہے؟

شہر میدان جنگ بن گیا۔ 10 اگست 1905ء کو "نیو یارک ٹریبیون" نے خبر دی کہ شہر کے نچلے مشرقی حصے میں واقع "فیڈرمین" بیکری میں ہڑتال اس وقت متشدد صورت اختیار کر گئی جب "فیڈرمین" نے پیداوار جاری رکھنے کے لیے ہڑتال توڑ مزدوروں سے کام لینا چاہا۔ ہڑتالیوں یا ان سے ہمدردی رکھنے والوں نے 183 آرچرڈ سٹریٹ پر واقع فلپ فیڈرمین کی بیکری کی دکان کو تباہ و برباد کر دیا۔

نیو یارک میں پانچ سو لباس تیار کرنے والی فیکٹریاں تھیں۔ ایک خاتون نے بعد میں ان فیکٹریوں میں کام کی صورتحال کو بیان کرتے ہوئے کہا:

> ان بیماریوں کو پروان چڑھانے والے تنگ سوراخ نما کمروں میں بچے بھی مردوں اور خواتین کے ساتھ ہفتے میں ستر سے اسی گھنٹے کام کرتے تھے۔ ان میں ہفتہ اور اتوار کا دن شامل ہوتا تھا..... ہفتے کی سہ پہر ایک سائن بورڈ آویزاں کر دیا جاتا تھا "اگر آپ اتوار کو نہیں آتے تو پھر سوموار کو آنے کی تکلیف نہ کریں" بچوں کی چھٹی کے دن کی خواہیں بکھر جاتیں، ہم رونا شروع کر دیتے بالآخر ہم بچے ہی تو تھے۔

1909ء کے موسم سرما میں "ٹرائی اینگل شرٹ ویسٹ کمپنی" کی خواتین منظم ہوئیں اور انہوں نے ہڑتال کا فیصلہ کیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکتیں جب کہ دوسری فیکٹریوں میں کام ہو رہا ہے، وہ ایک جلوس کی شکل میں چل پڑیں۔ تمام شاپس پر کام کرنے والے کارکنوں کا ایک جلسہ عام طلب کیا گیا: "کلارا" جو کہ ابھی انیس سال سے کم عمر کی اور پر جوش مقررہ تھی، اس کے جسم پر ابھی تک "[illegible]" پر

پڑنے والی مار کے نشانات موجود تھے کھڑی ہوئی اور کہا "میں اب عمومی ہڑتال کے اعلان کی قرارداد پیش کرتی ہوں۔ جلسہ کے شرکاء غضب ناک ہو رہے تھے انہوں نے ہڑتال کے حق میں ووٹ دے دیا۔

"پاؤلین نیومین" جوکہ ہڑتالیوں میں سے ایک تھی، سالوں بعد اس ہڑتال کے آغاز کو یاد کرتے ہوئے بتاتی ہے:

> ہر جانب سے ہزار ہا لوگ اپنی فیکٹریاں چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے، یہ تمام لوگ یونین سکوائر کی جانب جا رہے تھے۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا، سرما کی سردی ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھی۔ ہمارے پاس گرم ہونے کے لیے گرم کھال کے کوئی کوٹ نہ تھے، لیکن محض جذبہ تھا جو ہمیں آگے اور آگے لے کر جا رہا تھا یہاں تک کے ہم ہال کے اندر پہنچ گئے مجھے نوجوان لوگ نظر آ رہے تھے جن میں زیادہ تر خواتین تھیں جو چلی آ رہی تھیں اور انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، بھوک، سردی اور تنہائی.... اس خاص دن انہیں کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ یہ ان کا دن تھا۔

یونین کو امید تھی کہ تین ہزار افراد ہڑتال میں شریک ہوں گے۔ اکیس ہزار کارکن باہر نکلے، ہر روز ایک ہزار نئے ممبران نے "انٹرنیشنل لیڈر گارمنٹ ورکرز یونین" میں شمولیت اختیار کی، جس میں اس سے پہلے صرف چند ایک خواتین تھیں۔ سیاہ فام خواتین ہڑتال میں عملی طور پر سرگرم تھیں جو کہ پولیس، ہڑتال توڑنے والوں، گرفتاریوں اور جیلوں کے خلاف پورے موسم سرما میں جاری رہی۔ تین ہزار سے زائد فیکٹریوں میں کارکنوں نے اپنے مطالبات منوا لیے۔ خواتین اب یونین میں عہدیدار بن چکی تھیں۔ پاؤلین نیومین دوبارہ کہتی ہے۔

> ہم نے اپنے آپ کو تعلیم دینا شروع کیا۔ میں لڑکیوں کو اپنے کمرے میں مدعو کرتی۔ ہم اپنے زبان کے فہم کو بہتر بنانے کے لیے باری باری انگلش شاعری پڑھتی تھیں۔ ہماری سب سے مقبول نظم "پرسی شیلی" کی نظم "ماسک آف انارکی" تھی"....
>
> Rise like lions after slumber
>
> In unvanquishable number!
>
> Shake your chains to earth, like dew
>
> Which in sleep had fallen on you--
>
> Ye are many, they are few!

فیکٹریوں کی صورت حال میں کوئی زیادہ تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ 25 مارچ 1911ء کی سہ پہر کو آگ نے، جوکہ ایک ٹاکیاں پھینکنے والے ڈبے سے شروع ہوئی "ٹرائی اینگل شرٹ ویسٹ کمپنی" کی

آٹھویں نویں اور دسویں منزل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جوکہ فائر بریگیڈ کی سیڑھیوں کی پہنچ سے باہر تھیں۔ نیو یارک کے فائر چیف نے بتایا ہوا تھا کہ اس کی سیڑھیاں صرف ساتویں منزل تک پہنچ سکتی ہیں۔ لیکن نیو یارک کے 500,000 محنت کشوں کی آدھی تعداد سارا دن، شاید بارہ گھنٹے ساتویں منزلوں سے اوپر گزارتی تھی۔ قانون میں کہا گیا تھا کہ فیکٹریوں کے دروازے باہر کو کھلنے چاہیں، لیکن ٹرائی اینگل کمپنی میں دروازے اندر کو کھلتے تھے قانون کہتا تھا کہ کام کے وقت کے دوران دروازوں کو لاک نہیں کیا جا سکتا، لیکن ٹرائی اینگل میں دروازے لاک رکھے جاتے تھے تا کہ کمپنی اپنے کارکنوں پر نظر رکھ سکے۔ لہٰذا اس طرح سے پھنسی ہوئی نوجوان خواتین اپنی کام کی میزوں اور مقفل دروازوں کے سامنے جگمگے کی صورت میں جل کر راکھ ہو گئیں، یا پھر لفٹوں کی شافٹوں کے ذریعے نیچے اترنے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں "نیو یارک ورلڈ" میں جو خبر چھپی اس کے مطابق!

> چیختے ہوئے مرد، خواتین، لڑکیاں اور لڑکے کھڑکیوں کے چھجوں پر اکٹھے ہو گئے اور اکثر نے نیچے سڑکوں پر چھلانگیں لگا دیں۔ وہ شعلوں میں لپٹے ہوئے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ موت کے اس لمحے ایک قابل رحم رفاقت دیکھنے میں آئی.... لڑکیاں ایک دوسرے پر بازو رکھے چھلانگیں لگا رہی تھیں۔

جب یہ سب کچھ اختتام کو پہنچا تو ٹرائی اینگل کے 174 کارکن، جن میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی، مر چکے تھے۔ ان کی یاد میں "براڈ دے" پر ایک جلوس نکالا گیا جس میں 100,000 افراد نے شرکت کی۔

یونین سازی میں اضافہ ہو رہا تھا، لیکن "امریکن فیڈریشن آف لیبر" ایک منفرد یونین تھی۔ جس میں تقریباً سب کے سب مرد، سب کے سب سفید فام اور تقریباً تمام کے تمام ہنر مند کارکن تھے۔ 1910ء تک محنت کشوں کا پانچواں حصہ خواتین پر مشتمل تھا۔ لیکن سو میں سے صرف ایک یونین سے تعلق رکھتی تھی۔ سیاہ فام کارکن سفید فام کارکنوں کا ایک تہائی تھے۔ ان کو بھی "امریکن فیڈریشن آف لیبر" (اے ایف ایل) سے باہر رکھا گیا تھا۔

محنت کشوں کے نچلے طبقے میں بس علیحدگی پر گاہے بگاہے قابو پانے کی کوشش کی جاتی رہیں۔ "میری وک ڈوول" شکاگو کے مال خانوں میں خواتین کی یونین کی تشکیل کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: "شام کے وقت ایک ڈرامائی صورتحال پیدا ہو گئی جب دروازے پر کھڑی آئرش لڑکی نے کہا 'ایک سیاہ فام بہن اندر آنا چاہتی ہے میں اسے کیا کہوں؟ اور صدارت کرنے والی آئرش خاتون نے جواب دیا، ظاہر ہے اسے اندر آنے دو اور تمام خواتین اسے دلی خوش آمدید کہیں۔"

1907ء میں "نیو اورلینز" میں پشتوں پر عمومی ہڑتال ہوئی جس میں دس ہزار کارکن (گودیوں میں کام کرنے والے، ٹرک ڈرائیورز سامان اتارنے چڑھانے والے) شامل تھے۔ یہ ہڑتال بیس دن

جاری رہی جس میں سیاہ فام اور سفید فام شانہ بشانہ کھڑے رہے۔

لیکن یہ استثنات تھیں۔ عام طور پر سیاہ فاموں کو ٹریڈ یونین تحریک سے باہر ہی رکھا گیا تھا۔ ڈبلیو،ای،بی،ڈیو بوائس نے 1913ء میں لکھا: "اس کا واضح نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ کے نیگروز کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ان کے سب سے بڑے دشمن آجر نہیں ہیں جو انہیں لوٹتے ہیں بلکہ ساتھ کام کرنے والے سفید فام ہیں۔"

"اے ایف ایل" کے لیے نسل پرستی فائدہ مند تھی۔ خواتین اور غیر ملکیوں کو شامل نہ کرنا بھی فائدہ مند تھا۔ یہ زیادہ تر غیر ہنر مند کارکن تھے اور "اے ایف ایل" ہنر مند افراد کی رسد پر اجارہ داری رکھتے ہوئے ان کے لیے بہتر شرائط حاصل کر سکتی تھی۔

"اے ایف ایل" کے عہدیدار بڑی بڑی تنخواہیں لیتے تھے، آجروں کے ساتھ ساز باز کرتے، حتیٰ کہ اعلیٰ طبقے کے ساتھ میل جول رکھتے تھے۔ وہ تنقید سے بچنے کے لیے اجلاس میں سخت کنٹرول رکھتے تھے اور پیشہ ور بدمعاشوں کا استعمال کرتے تھے، جن کو دراصل ہڑتال توڑنے والوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے بھرتی کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں ان کو یونینز کے اندر مخالفین کو ڈرانے دھمکانے اور مار پٹائی کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

اس صورتحال میں (مزدوروں کی خوف ناک صورتحال، یونین آرگنائزیشن سے اخراج) محنت کش طبقہ انقلابی تبدیلی کا خواہشمند تھا، اپنے مصائب کی جڑیں سرمایہ دارانہ نظام میں دیکھتے ہوئے، ایک نئی قسم کی لیبر یونین کی جانب چل پڑے۔ 1905ء کی ایک صبح شکاگو کے ایک ہال میں پورے امریکہ سے دو سو شلسٹوں، انارکسٹوں اور انقلابی ٹریڈ یونینسٹس کی ایک کنونشن منعقد ہوئی۔ وہ آئی ڈبلیو ڈبلیو (انڈسٹریل ورکرز آف دی ورلڈ) تشکیل دے رہے تھے۔ "بگ بل ہے ووڈ" ویسٹرن فیڈریشن آف مائنرز کا ایک لیڈر اپنی سوانحعمری میں اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے پلیٹ فارم پر گرے ہوئے بورڈ کے ایک ٹکڑے کو اٹھایا اور اسے کنونشن شروع کرنے کے لیے ہتھوڑے کے طور پر استعمال کیا۔

> ساتھی کارکنو! یہ محنت کش طبقے کی کونٹی نینٹل کانگریس ہے۔ ہم یہاں ملک کے محنت کشوں کو، محنت کش طبقے کی تحریک کے لیے متحد کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں، جس کا مقصد محنت کش طبقے کو سرمایہ دارانہ غلامی کے بندھنوں سے نجات دلانا ہے....

مقررین میں "ہے ووڈ" کے ساتھ یوجین ڈبس' سوشلسٹ پارٹی کی راہنما اور "مدر میری جونز" سفید بالوں والی ستر سالہ خاتون جو کہ یونائیٹڈ مائنز ورکرز آف امریکہ کی منتظمہ تھی شامل تھے۔ کنونشن میں ایک آئین تیار کیا گیا، جس کی تمہید میں کہا گیا:

> محنت کش طبقے اور آجر طبقے میں کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ اس وقت تک امن

> نہیں ہو سکتا جب تک کروڑوں محنت کش افراد میں بھوک اور احتیاج موجود ہے، اور چند لوگ جو کہ آجرین کے طبقہ کو تشکیل دیتے ہیں زندگی کی ہر نعمت سے فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ یہ ضروری ہے کہ ان دونوں طبقات میں جدوجہد جاری رہے جب تک محنت کش سیاسی اور صنعتی میدانوں میں متحد نہیں ہوتے، اور محنت کش طبقے کی معاشی تنظیم کے ذریعے بغیر کسی سیاسی پارٹی کے الحاق سے اس پر قابض نہیں ہوتے جو وہ اپنی محنت سے پیدا کرتے ہیں۔

آئی ڈبلیو ڈبلیو کا ہدف کسی بھی صنعت سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کو بغیر کسی جنسی، نسلی اور ہنر کے امتیاز کے "ایک بڑی یونین" میں منظم کرنا تھا۔ انہوں نے آجرین کے ساتھ کسی بھی قسم کے معاہدے کرنے کی مخالفت کی، کیونکہ یہ عمل کارکنوں کو اپنے طور پر یا دوسرے ہڑتالیوں کے ساتھ ہمدردی کے طور پر ہڑتال سے روکتے ہیں، اور اس طرح یونین کے لوگوں کو ہڑتال توڑنے والوں میں شامل کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ لیڈروں کے ذریعے معاہدات کے لیے گفت وشنید نچلے طبقے کے محنت کشوں کی جدوجہد کے تسلسل میں رخنہ ڈالتی ہے۔ انہوں نے براہ راست عمل کی بات کی:

> "براہ راست عمل" سے مراد محنت کشوں کے ذریعے، محنت کشوں کے لیے اور خود محنت کشوں کی اپنے طور پر کی گئی صنعتی کارروائی ہے، جس میں نام نہاد لیڈروں اور منصوبہ ساز سیاستدانوں کی پُرفریب مدد شامل نہ ہو۔ ایک ایسی ہڑتال جس کی ابتدا متاثرہ محنت کشوں نے خود کی ہو اور اس کے خاتمے کا فیصلہ بھی وہ خود کریں "براہ راست عمل" ہے.... "براہ راست عمل" صنعتی جمہوریت ہے۔

آئی ڈبلیو ڈبلیو (جنہیں لوگوں نے "وبلیز" کہنا شروع کر دیا جس کی وجہ سمجھ نہیں آ سکی) کے لوگ جنگجو اور جرأت مند تھے۔ پنسلوانیا کے قصبے "مک کیس راکس" میں انہوں نے 1909ء میں "یو ایس سٹیل کمپنی" سے ملحق ایک کمپنی کے خلاف چھ ہزار کارکنوں کی ہڑتال کی راہنمائی کی ریاستی فوجیوں سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے ہر مرنے والے کارکن کے بدلے ایک فوجی کی زندگی لینے کا عزم کیا (ایک ایسی جھڑپ میں چار کارکن اور تین فوجی مارے گئے)، اور انہوں نے فیکٹریوں کی حصار بندی جاری رکھی یہاں تک کہ ان کے مطالبات مان لیے گئے۔

اس دور میں سپین، اٹلی اور فرانس میں "انارکوسینڈیکلزم" کا نظریہ بڑی قوت سے پروان چڑھ رہا تھا، یعنی کارکنوں کو مسلح بغاوت کے ذریعے ریاستی مشینری پر قبضہ حاصل کرنے کے بجائے عمومی ہڑتال کے ذریعے معاشی نظام کو جامد کرتے اور اس پر غلبہ حاصل کرتے ہوئے، اسے سب کے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو کے منتظم "جوزف ایٹر" نے کہا:

خاص طور پر اس ہڑتال کی لیڈر آئی ڈبلیو ڈبلیو کی "الزبتھ کرلے فلائن" سے تحریک پانے کا نتیجہ تھا:

بہت سی نجیب ملکائیں اور شہزادیاں ہیں
جن کا حسن ہیروں اور سچے موتیوں کا محتاج ہوتا ہے
لیکن واحد اور پوری طرح خالص خاتون
باغی لڑکی ہے۔

نومبر 1915ء میں "جوہل" پر اوتاہ کے شہر لیک سٹی میں ڈکیتی کے دوران ایک کریانہ فروش کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا۔

عدالت میں اس پر قتل کا جرم ثابت کرنے کے لیے کوئی براہ راست شہادت پیش نہ کی جا سکی، لیکن اس کے باوجود عدالت کے پاس اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی شہادتیں موجود تھیں۔ یہ مقدمہ عالمی شہرت کا حامل ہو گیا، اور گورنر کو دس ہزار سے زائد احتجاجی خطوط موصول ہوئے۔ لیکن جیل کو مشین گنوں کے حصار میں لے کر اسے فائرنگ سکواڈ کے ذریعے موت کی سزا دے دی گئی۔ اس سے چند لمحے پہلے اس نے "بل ہے ووڈ" کو لکھا: "ماتم میں وقت ضائع نہ کرو، اپنے آپ کو منظم کرو۔"

1912ء کے سال کے دوران آئی ڈبلیو ڈبلیو میساچوسٹس کے شہر لارنس میں جہاں "امریکن وولن کمپنی" کی چار ملیں تھیں، کئی ایک ڈرامائی واقعات میں شامل رہی۔ یہاں کام کرنے والے زیادہ تر لوگ نقل مکانی کر کے آنے والے خاندان تھے، جن میں پرتگیزی، فرانسیسی کینیڈین، انگلش، آئرش، روسی، اطالوی، شامی، لیتھونین، جرمن، پولش، اور بلجیئن شامل تھے، جو کہ گنجان آباد جل جانے والے لکڑی کے اپارٹمنٹس میں رہتے تھے اور اوسط تنخواہ فی ہفتہ 8.76 ڈالر تھی۔ لارنس میں موجود ایک خاتون ڈاکٹر "الزبتھ شپلے" نے لکھا: "کام شروع کرنے کے بعد دو تین سال میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد مر جاتی ہے۔ 100 میں سے 36 مرد اور خواتین جو مل میں کام کرتی ہیں 25 سال کی عمر تک پہنچنے تک یا اس سے پہلے مر جاتی ہیں۔

یہ موسم سرما کے وسط میں جنوری کا مہینہ تھا جب ایک مل میں کھڈیاں چلانے والوں میں تنخواہ کے لفافے تقسیم کیے گئے، جو کہ زیادہ تر پولش خواتین تھیں۔ لفافے کھولنے کے بعد انہیں پتا چلا کہ ان کی تنخواہیں جو خاندان کی کفالت کے لیے پہلے ہی بہت کم تھیں، مزید کمی کر دی گئی ہے۔ انہوں نے کھڈیاں بند کر دیں اور مل سے باہر نکل آئیں۔ اگلے دن ایک دوسری مل کے پانچ ہزار کارکنوں نے کام چھوڑ دیا اور ایک دوسری مل کی طرف چل پڑے، اس کے گیٹ پر جمع ہو گئے کھڈیوں کی بجلی بند کر دی اور دوسرے کارکنوں کو بھی کام چھوڑنے کو کہا۔ جلد ہی 10 ہزار کارکن ہڑتال پر تھے۔

نیویارک میں آئی ڈبلیو ڈبلیو کے ایک لیڈر ساٹھ سالہ اطالوی "جوزف ایٹر" کو ٹیلی گرام بھیجی گئی کہ وہ لارنس پہنچے اور ہڑتال کے عمل میں مدد کرے۔ کارکنوں میں سے ہر قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے

پچاس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، تا کہ اہم فیصلے کیے جا سکیں۔

آئی ڈبلیو ڈبلیو نے اجلاسوں اور پریڈوں کا انتظام کیا۔ ہڑتالیوں کو جن کی تعداد 50,000 تھی کو کھانا اور ایندھن مہیا کرتا تھا (لارنس کی کل آبادی 86,000 تھی)، لنگر خانے قائم کیے گئے اس کے لیے رقم پورے ملک میں موجود ٹریڈ یونینز، آئی ڈبلیو ڈبلیو کے ممبران، سوشل گروپس اور افراد کی جانب سے آنا شروع ہو گئی۔

میئر نے مقامی ملیشیا کو طلب کر لیا، گورنر نے ریاست کی پولیس کو ہڑتالیوں پر قابو پانے کا حکم دیا۔ ہڑتال شروع ہونے کے چند ہفتوں کے بعد پولیس نے ہڑتالیوں کی ایک پریڈ پر حملہ کیا۔ جس کے نتیجے میں سارا دن شہر میں ہنگامے ہوتے رہے۔ ایک ہڑتالی "اینا لوپیزو" کو گولی لگی اور مر گیا۔ شاہدین کا کہنا تھا کہ گولی پولیس نے ماری ہے، لیکن حکام نے جوزف ایٹر اور لارنس آنے والے آئی ڈبلیو ڈبلیو ایک دوسرا کارکن، ایک شاعر "آرٹرو گیووانیٹی" کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے کوئی بھی گولیاں چلنے کے مقام پر موجود نہیں تھا۔ لیکن الزام یہ لگایا گیا تھا کہ "جوزف ایٹر اور آرٹرو گیووانیٹی نے ایک آدمی کو جس کے نام کا علم نہیں ہے اس قتل کے لیے اکسایا، تیار کیا، مشورہ دیا یا حکم دیا۔"

مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور شہریوں کو گلیوں میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے سے روک دیا گیا۔ چھتیس ہڑتالیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور کئی ہڑتالیوں کو ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔ 30 جنوری بدھ کے روز ایک شامی نوجوان ہڑتالی "جون رامے" کو سنگینوں کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا۔ لیکن ہڑتالی ابھی بھی باہر تھے اور ملیں کام نہیں کر رہی تھی۔ ایٹر نے کہا "سنگینیں کپڑا نہیں بن سکتیں۔"

فروری میں ہڑتالیوں نے پکٹنگ شروع کر دی۔ لیکن ان کی خوراک ختم ہونا شروع ہو گئی اور بچے بھوک کا شکار ہونے لگے۔ نیویارک کے ایک سوشلسٹ اخبار "کال" نے مشورہ دیا کہ جب تک ہڑتال جاری رہتی ہے بچوں کو دوسرے شہروں میں ہمدرد خاندانوں کے پاس بھیج دیا جائے۔ تین دنوں میں "کال" کو چار سو خطوط موصول ہوئے جن میں بچوں کو لینے کی پیشکش کی گئی تھی۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو اور سوشلسٹ پارٹی نے ان خاندانوں سے درخواستیں لیتے ہوئے جو بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اور بچوں کے طبی معائنے کرواتے ہوئے بچوں کی ہجرت کے انتظامات شروع کر دیے۔

10 فروری کو چار سے چودہ سال کی عمر کے ایک سو سے زائد بچے لارنس سے نیویارک روانہ ہوئے۔ ان کا گرینڈ سنٹرل سٹیشن پر پانچ ہزار اطالوی سوشلسٹوں نے فرانسیسی قومی ترانہ اور سوشلسٹ ترانہ Internationale گا کر استقبال کیا۔ اگلے ہفتے مزید ایک سو بچے نیویارک پہنچے اور 35 بچے ورمونٹ کے شہر "باری" میں پہنچے۔ یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ اگر بچوں کی دیکھ بھال شروع ہو جائے تو ہڑتالی قائم رہ سکتے ہیں، کیونکہ ان کے جذبے بلند تھے۔ لارنس کے بلدیاتی آفیسروں نے بچوں سے لاپروائی کے

قانون کے حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مزید بچوں کو لارنس چھوڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

شہر کے حکم کے باوجود 24 فروری کو فلاڈلفیا جانے کے لیے چالیس بچوں کا ایک گروپ اکٹھا ہوا۔ ریلوے سٹیشن پولیس سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ''ویمنز کمیٹی آف فلاڈلفیا'' کی ایک ممبر نے کانگریس کے آدمیوں کو بیان کیا۔ ''جب روانہ ہونے کا وقت آیا، بچوں کو دو دو کی قطاروں میں ایک منظم جلوس کی شکل میں لایا گیا، ان کے والدین ان کے نزدیک ہی چل رہے تھے۔ وہ ٹرین کی جانب جانے ہی والے تھے کہ پولیس دائیں بائیں اپنی لاٹھیاں برساتے ہوئے ہمارے اوپر آن پہنچی....''

اس کے ایک ہفتہ بعد ایک جلسے سے واپس آنے والی خواتین کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا اور ان پر لاٹھیاں برسائیں۔ ایک حاملہ عورت کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لایا گیا، جہاں اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔ ابھی تک ہڑتالی قائم تھے اور انہوں نے گلیوں میں مارچ کرنا اور گیت گانا جاری رکھا۔

''امریکن وولن کمپنی'' نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے 5 سے 11 فی صد اضافے کی پیشکش کی (ہڑتالیوں نے اصرار کیا کہ سب سے بڑا اضافہ کم سے کم تنخواہ والوں کو ملنا چاہیے) اوور ٹائم کے لیے سوا گنا معاوضہ اور جنہوں نے ہڑتال میں حصہ لیا ہے ان کے خلاف کوئی امتیاز نہ برتا جائے 14 مارچ 1912ء کو دس ہزار ہڑتالی: ''لارنس کامن'' میں جمع ہوئے اور ''بل ہے ووڈ'' کی صدارت میں ہڑتال ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایٹر اور گیووینٹی پر مقدمہ چلا۔ ان کے لیے حمایت میں پورے ملک میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نیو یارک اور بوسٹن میں جلوس نکالے گئے۔ 30 ستمبر کو لارنس کے پندرہ ہزار کارکنوں نے دونوں آدمیوں کی حمایت کے لیے چوبیس گھنٹے کی علامتی ہڑتال کی جیوری نے ایٹر اور گیووینٹی کو بے گناہ پایا اور اس سہ پہر دس ہزار لوگ اس کا جشن منانے کے لیے لارنس میں جمع ہوئے۔

آئی ڈبلیو ڈبلیو نے ''ایک بڑی یونین'' کے اپنے نعرے کو سنجیدگی سے لیا۔ جب ایک کان یا فیکٹری کو منظم کیا جاتا تھا تو خواتین، غیر ملکی، سیاہ فام کارکن، انتہائی نچلے درجے کے اور انتہائی غیر ہنر مند کارکن شامل کیے جاتے تھے۔

1900ء میں 5,00,000 خواتین آفس ورکر تھیں۔ 1870ء میں ان کی تعداد 19,000 تھی۔ خواتین سوئچ بورڈ آپریٹرز، سٹور ورکرز، نرسیں تھیں۔ پانچ لاکھ کے قریب ٹیچر تھیں۔ ٹیچروں نے ''ٹیچر لیگ'' تشکیل دی۔ جس نے حاملہ ہونے والی خواتین کی ملازمت سے خود بخود برخاستگی کے خلاف جدوجہد کی۔ میساچوسٹس کے ایک شہر میں سکول کے بورڈ پر ''خواتین ٹیچرز کے لیے قوانین'' چسپاں کیے گئے تھے۔

1۔ شادی نہیں کریں گی۔

2۔ سکول بورڈ کی اجازت کے بغیر کسی بھی وقت شہر کو نہیں چھوڑیں گی۔

3۔ مردوں کے ساتھ محبت نہیں رکھیں گی۔

4۔ شام 8 بجے سے صبح 6 بجے تک گھر میں رہیں گی۔

5۔ مرکزی شہر میں آئس کریم سٹورز پر گھومتی نہیں پھریں گی۔

6۔ سگرٹ نوشی نہیں کریں گی۔

7۔ بگھی میں اپنے بھائی یا باپ کے علاوہ کسی مرد کے ساتھ نہیں بیٹھیں گی۔

8۔ شوخ رنگ کا لباس نہیں پہنیں گی۔

9۔ اپنے بالوں کو رنگ نہیں لگائیں گی۔

10۔ ٹخنوں سے دو انچ سے زیادہ اوپر لباس نہیں پہنیں گی۔

1909ء ''ویمنز ٹریڈ یونین' انڈسٹریل لیگ'' کی ہیڈ بک میں سٹیم لانڈریوں میں کام کرنے والی خواتین کے بارے میں لکھا گیا: ''ایک منٹ میں ایک شرٹ استری کرنا آپ کو کیسا لگے گا؟ ذرا تصور کریں کہ آپ 14،12،10 اور بعض اوقات 17 گھنٹے تک واش روم کے بالکل اوپر استری والی مشین پر کھڑے ہیں اور فرش میں سے گرم بھاپ نکل نکل کر اوپر اٹھ رہی ہے۔ 'لانڈری ورکرز یونین' نے ایک شہر میں کام کے اوقات 9 گھنٹے تک کروائے اور معاوضے میں پچاس فی صد اضافہ کروایا۔''

نئی صدی کے ابتدائی دور میں، ہڑتالوں کی جدوجہد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ 1890ء کے عشرے میں ہر سال تقریباً ایک ہزار کے لگ بھگ ہڑتالیں ہوئی تھیں۔ 1904ء تک سال میں چار ہزار ہڑتالیں ہوئیں۔ قانون اور فوج نے بار بار امراء کا ساتھ دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب سینکڑوں اور ہزاروں امریکیوں نے سوشلزم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل کے تین سال بعد، 1904ء میں ڈبس نے لکھا:

> ماضی کی ''نظریاتی اور سادہ'' ٹریڈ یونینز آج کی ضروریات کو پورا نہیں کرتیں.... ٹریڈ یونینز کے ممبران کو بتانا چاہیے.... کہ مزدور تحریک کا مقصد معاوضوں میں اضافے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہڑتال جیسے بے وقت کام سے آگے اور بہت آگے ہے.... اس کا بلند تر مقصد محنت کے عوامل پر نجی ملکیت کے سرمایہ دارانہ نظام سے چھٹکارا، تنخواہ دار غلامی کا خاتمہ اور تمام محنت کش طبقے دراصل تمام انسانیت کے لیے آزادی کا حصول ہے۔

''یوجین ڈبس'' جب ''پل مین'' ہڑتال کے دوران جیل میں تھا سوشلسٹ بن گیا تھا۔ اب وہ پارٹی کا ترجمان اور پانچ مرتبہ صدارتی امیدوار بن چکا تھا۔ ایک وقت میں پارٹی کے 100,000 ممبران اور 340 میونسپلٹیز میں 1,200 دفاتر تھے۔ اس کے اہم اخبار ''اپیل ٹو ریزن'' جس کے لیے ڈبس لکھتا تھا، کے پانچ لاکھ مستقل خریدار تھے۔ اس کے علاوہ بھی پورے ملک میں بہت سے سوشلسٹ اخبارات نکلتے تھے، لہٰذا

کل ملا جلا کر شاید 10 لاکھ لوگ سوشلسٹ جرائد کا مطالعہ کرتے تھے۔

سوشلزم شہری آبادکاروں (یہودی اور جرمن سوشلسٹ جو اپنی زبانیں بولتے تھے) کے مختصر سے حلقے سے نکل کر امریکی بن گیا تھا۔ سوشلسٹوں کی سب سے مضبوط ریاستی تنظیم، "اوکلاہاما" میں تھی، جس کے باقاعدہ طور پر چندہ ادا کرنے والے ممبران کی تعداد 1914ء میں بارہ ہزار تھی (نیویارک ریاست سے زیادہ) اور بلدیاتی دفاتر میں ان کے ایک سو سے زائد منتخب نمائندگان تھے، جبکہ اوکلاہاما مقننہ میں بھی ان کے چھ ممبر موجود تھے۔ "اوکلاہاما" ٹیکساس 'لوئی سیانا' آرکنساس میں پچپن ہفتہ وار سوشلسٹ اخباریں شائع ہوتی تھیں اور موسم گرما کے اجتماعات ہوتے تھے جن میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے تھے۔

1900 کے اوئل میں سوشلسٹ خواتین "نسوانی تحریکوں" میں سرگرم تھیں۔ اوکلاہاما کے سوشلسٹ لیڈر "کیٹ رچرڈز اوہیئر" کے مطابق نیویارک کی سوشلسٹ خواتین بہت عمدہ طریقے سے منظم ہیں۔ 1915ء میں نیویارک میں خواتین کے حق رائے دہی پر ریفرنڈم کے لیے مہم کے دوران انہوں نے ایک دن میں 60,000 انگلش اشتہارات، 50,000 یدش (یہودیوں کی زبان) اشتہارات، ایک سینٹ کی 2,500 اور پانچ سینٹ کی 1,500 کتابیں فروخت کیں، 40,000 سٹکرز لگائے اور 100 اجلاس کرائے۔

لیکن کیا خواتین کے ایسے مسائل تھے جو سیاسیات اور معاشیات کی پہنچ سے باہر تھے، جو سوشلسٹ نظام کے ذریعے خود بخود حل نہیں ہوں گے؟ اگر جنسی استبداد کی معاشی بنیاد کو درست کر دیا جائے، کیا برابری آجائے گی؟ ووٹ کے لیے لڑنا یا انقلابی تبدیلی سے کم تر کسی چیز کے لیے جدوجہد کرنا، کیا یہ بے مقصد تھا؟ جیسے جیسے بیسویں صدی کے اوئل کی نسوانی تحریک پروان چڑھی، خواتین نے حق رائے دہی، اور ہر میدان بشمول جنسی تعلقات اور شادی کے، برابری کے حقوق کے بولنا شروع کیا، منظم ہوئیں، احتجاج کیا، جلوس نکالے بحث مباحثہ تیز ہوتا گیا۔

جب اسی سال کی عمر میں "سوسن انتھونی" یوجین ڈبس کو بولتے سننے کے لیے آئی (پچیس سال پہلے وہ اسے بولتے سننے کے لیے گیا تھا، اس دن سے وہ آپس میں نہیں ملے تھے) تو انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملائے اور مختصر سی گفتگو کی، سوسن نے ہنستے ہوئے کہا: "ہمیں حق رائے دہی دے دو، ہم تمہیں سوشلزم دیں گی" ڈبس نے جواب دیا "ہمیں سوشلزم دو ہم تمہیں حق رائے دہی دیں گے۔"

"کرسٹل ایسٹ مین" جیسی بھی کچھ خواتین تھیں جو سوشلزم اور نسوانی حقوق کے اہداف کو یکجا کرنا چاہتی تھیں۔ جو مردوں اور عورتوں کے اکٹھا رہنے کے لیے روایتی شادی کے علاوہ کچھ طریقے ڈھونڈنا چاہتی تھیں، جن میں ان کی آزادی بھی برقرار رہے۔ وہ خود ایک سوشلسٹ تھی، لیکن اس نے لکھا کہ ایک عورت، جانتی ہے کہ عورت کی غلامی پوری کی پوری منافعے کے نظام کی پیداوار نہیں، اور نہ سرمایہ داری کے زوال سے اسے مکمل آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔"

بیسویں صدی کے پہلے پندرہ سالوں میں صنعتی مزدور خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ساتھ ہی ان کے مزدور جدوجہد کے تجربے میں بھی اضافہ ہوا۔ متوسط طبقے کی کچھ خواتین جو خواتین پر استبداد کا شعور رکھتی تھیں اور اس کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں، کالج جانے لگی تھیں اور محض ایک گھریلو خاتون کے علاوہ، اپنی ہستی سے آگاہ ہونے لگی تھیں۔

وہ جرائد اور رسائل کے پھیلائے ہوئے اس کلچر سے بغاوت کر رہی تھیں جو عورت کو ایک ساتھی، بیوی اور گرہستی کے طور پر پیش کرتا تھا۔ مساوات نسواں کی حامی ان خواتین میں سے کچھ نے شادی کی اور کچھ نے نہ کی۔ ان سب نے "مارگریٹ سانگر" کی طرح جو کہ ضبط تولید کی تعلیم کی بانی تھی، مردوں کے ساتھ تعلقات میں پیدا ہونے والے مسائل کے خلاف جدوجہد، کی مارگریٹ اپنی عائلی زندگی کے دوران جو کہ بظاہر خوشگوار تھی لیکن سخت قید و بند پر مبنی تھی "نروس بریک ڈاؤن" کا شکار ہو گئی تھی، اور اس نے اپنا مستقبل خود بنانے کے لیے اپنے خاوند اور بچوں کو چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو دوبارہ سے مکمل محسوس کرنے لگی۔ مارگریٹ نے "وومن اینڈ دا نیو ریس" میں لکھا! "کوئی عورت اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتی جو اپنے جسم کی مالک نہیں اور اس پر کنٹرول نہیں رکھتی، کوئی بھی عورت اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتی جب تک وہ شعوری طور پر یہ انتخاب نہیں کر سکتی کہ آیا وہ ماں بننا چاہتی ہے یا نہیں۔"

یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ مثال کے طور پر "کیٹ رچرڈز اوہیئر" گھر میں یقین رکھتی تھی، لیکن سمجھتی تھی کہ سوشلزم اسے بہتر بنا سکتا ہے۔ دوسری جانب "الزبتھ گرلے فلائن" نے اپنی سوانح عمری "ریبل گرل" میں لکھا: "ایک گھریلو زندگی اور ممکنہ طور پر ایک بڑا خاندان میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا.... میں بولنا، لکھنا، سفر کرنا، لوگوں کو ملنا، نئے مقامات دیکھنا، آئی ڈبلیو ڈبلیو کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ میں محض عورت ہونے کی وجہ سے اس کے لیے اپنا کام چھوڑ دوں...."

جب کہ اس دور میں خواتین کی ایک بڑی تعداد انقلابی، سوشلسٹ اور انارکسٹ تھی اس سے بھی بڑی ایک تعداد حق رائے دہی کی مہم میں شریک تھی۔ ٹریڈ یونین جدوجہد میں شریک تجربہ کار خواتین اب حق رائے دہی کی مہم میں شریک ہو رہی تھیں جیسا کہ گارمنٹ ورکرز کی "روز شینڈرمن" تھی۔ اس نے نیویارک میں "کوپر یونین" کے ایک اجلاس میں ایک سیاستدان کو، جس نے کہا تھا کہ خواتین کو حق رائے دہی دینے سے ان کی نسوانیت ختم ہو جائے گی جواب دیتے ہوئے کہا:

> لانڈریوں میں خواتین.... تیرہ چودہ گھنٹے خوفناک بھاپ اور گرمی میں گرم سٹارچ میں اپنے ہاتھ بھگوئے کھڑی رہتی ہیں.... یقیناً یہ خواتین سال میں ایک مرتبہ بیلٹ باکس میں اپنا ووٹ ڈالتے ہوئے اپنے حسن اور دلکشی سے اتنا زیادہ محروم نہیں ہوں گی جتنا وہ سارا سال فونڈریوں اور لانڈریوں میں کھڑا ہو کر محروم ہوتی ہیں...."

نیو یارک میں ہر بہار کے موسم میں خواتین کے حق رائے دہی کے لیے نکالے جانے والے جلوس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ 1912ء کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق:

پوری ففتھ ایونیو پر "واشنگٹن سکوائر" سے لے کر جہاں سے جلوس کا آغاز ہوا "ففٹی سیونتھ سٹریٹ" تک جہاں جلوس ختم ہوتا تھا نیو یارک کے ہزاروں مرد اور خواتین جمع تھے۔ جلوس کے راستے پر اطراف میں نکلنے والی ہر گلی کو انہوں نے بلاک کر رکھا تھا۔ بہت سے لوگ مذاق اور تمسخر اڑانے پر تلے ہوئے تھے، لیکن کوئی بھی ایسا نہ کر سکا۔ سڑک کے درمیان سینہ تان کر چلنے والی خواتین کی پانچ متاثر کن قطاروں نے تمسخر کے ہر خیال کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ خواتین ڈاکٹر، خواتین وکلاء، خواتین آرکیٹیکٹ، خواتین آرٹسٹ، ایکٹریسس، اور مجسمہ ساز، خواتین ویٹرس، گھریلو، صنعتی کارکن خواتین کی ایک بڑی تعداد، تمام کی تمام ایک ایسے عزم اور مقصد کے ساتھ چل رہی تھیں جس نے دونوں طرف کھڑے ہجوم کو ششدر کر دیا تھا۔

کچھ انقلابی خواتین متشکک تھیں۔ انارکسٹ اور مساوات نسواں کی حامی "ایما گولڈ مین" نے ہمیشہ کی طرح خواتین کے حق رائے دہی کے موضوع پر اپنے دل کی بات پرزور انداز میں کی:

دور جدید کا ایک عقیدہ، جس پر ہم اندھا دھند یقین کئے ہوئے ہیں، ہمہ گیر حق رائے دہی ہے۔۔۔۔اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی خواہ آپ کوئی بھی دلیل دیں کہ عورت کو اپنی آزادی کے سفر میں حق رائے دہی سے کبھی کوئی مدد ملی ہے نہ ملے گی۔۔۔۔اس کی ترقی، اس کی آزادی، اس کی خود مختاری اس کو اپنی ذات سے مل سکتی ہے۔ اول، اپنے آپ کو بطور شخصیت منوانے سے، دوئم، اپنے جسم پر کسی کے بھی حق سے انکار کرتے ہوئے، بچے پیدا کرنے سے انکار کرتے ہوئے جب تک وہ خود نہ چاہتی ہو، خدا، ریاست، معاشرے، خاوند، خاندان کی خادمہ ہونے سے انکار کرتے ہوئے، اپنی زندگی کو سادہ لیکن گہرا اور بھرپور بناتے ہوئے۔۔۔۔صرف یہی ایک راستہ ہے نہ کہ حق رائے دہی جو عورت کو آزادی دلوا سکتا ہے۔

اور ہیلن کیلر نے 1911ء میں حق رائے دہی کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک خاتون کو لکھا:

"ہماری جمہوریت بس ایک نام ہے۔ ہم ووٹ دیتے ہیں؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ ہم مطلق العنان حکمرانوں کے دو گروہوں میں سے ایک کا انتخاب کرتے ہیں، ہم جن کو منتخب کرتے ہیں ان میں محض ناموں کا فرق ہوتا ہے۔۔۔۔تم خواتین کے حق رائے دہی کا مطالبہ کرتی ہو۔۔۔۔کیا تمہارے مردوں نے اپنے لاکھوں ووٹوں کی مدد سے اپنے آپ کو ناانصافی سے آزاد کر لیا ہے۔"

اندھی اور بہری ہیلن کیلر نے اپنے جذبے اور قلم کے ساتھ جدوجہد کی، جب وہ ایک سرگرم اور کھلم کھلا سوشلسٹ بن گئی تو "بروک لین ایگل" جس نے اس سے پہلے اسے ہیروئن کے طور پر پیش کیا تھا، نے لکھا اس کی غلط فہمیوں میں اس کی واضح جسمانی کمزوریوں کا نتیجہ ہیں۔ اس کے جواب کو "ایگل" نے کوئی جگہ نہ دی، لیکن نیو یارک کے اخبار "کال" میں شائع ہوا۔ اُس نے لکھا جب اُس نے "بروک لین ایگل" کے ایڈیٹر سے ملاقات کی تھی تو اُس نے بڑی فراخدلی اُس کی تعریف کی تھی۔ "لیکن اب جب میں سوشلزم کے لیے باہر آئی ہوں تو وہ مجھے اور عوام کو یاد دلا رہا ہے کہ میں اندھی اور بہری ہوں، اس لیے خاص طور پر غلطیوں کا شکار ہو سکتی ہوں۔۔۔۔اس نے مزید کہا:

اوہ! یہ بیہودہ "بروک لین ایگل"! یہ کیسا بزدل پرندہ ہے! معاشرتی طور پر اندھا اور بہرہ، یہ ایک ناقابل برداشت نظام کا دفاع کرتا ہے ایک ایسا نظام جو مادی اندھے پن اور بہرے پن کی کافی حد تک وجہ ہے، جس سے ہم بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ایگل اور میری جنگ ہے۔ میں اس نظام سے نفرت کرتی ہوں جس کی یہ نمائندگی کرتا ہے۔ جب یہ جواباً لڑتا ہے تو اسے انصاف کے ساتھ لڑنا چاہیے۔ مجھے اور دوسرے لوگوں کو یہ یاد کرانا کہ میں دیکھ اور سن نہیں سکتی ایک منصفانہ لڑائی یا اچھی دلیل نہیں ہے۔ میں پڑھ سکتی ہوں، میں انگلش، جرمن اور فرانسیسی میں وہ تمام سوشلسٹ کتابیں پڑھ سکتی ہوں جن کا میرے پاس وقت ہے۔ اگر بروک لین ایگل کا ایڈیٹر ان میں کچھ کتابیں پڑھ لیتا تو وہ ایک عقلمند آدمی ہوتا اور ایک زیادہ اچھی اخبار نکالتا۔ اگر میں نے کبھی سوشلسٹ تحریک میں حصہ ڈالا تو وہ کتاب ہوگی جس کا میں بعض دفعہ خواب دیکھتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ میں اس کا کیا نام رکھوں گی؛ "صنعتی اندھا پن اور معاشرتی بہرہ پن"۔

"مدر جونز" مساوات نسواں کی تحریک میں خصوصی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اس نے ٹیکسٹائل کے کارکنوں اور کان کنوں اور ان کی بیویوں اور بچوں کو منظم کیا۔ اس کے بہت سے کارناموں میں سے ایک چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لیے واشنگٹن کی جانب بچوں کی ایک مارچ منظم کروانا تھا (جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو دس سے پندرہ سال کی عمر کے 284,000 بچے کانوں، ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے تھے)۔ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتی ہے:

1903ء کے موسم بہار میں پنسلوانیا کے شہر کنسنگٹن گئی، جہاں پچھتر ہزار چھوٹے بچے تھے۔ کارکن نے معاوضے میں اضافہ اور کام کے گھنٹوں میں کمی کے لیے ہڑتال کر رکھی تھی۔ ہر روز چھوٹے بچے یونین کے ہیڈکوارٹر میں آتے تھے۔ بعض کے ہاتھ کٹے ہوتے تھے، کچھ کے انگوٹھے غائب تھے، کچھ کی انگلیاں یا انگلیوں کے پورے نہیں تھے۔ وہ سر اور کندھے جھکا کر چلنے والی ننھی سی مخلوق تھے، ان کے کندھے گول اور جسم دبلے پتلے تھے۔ میں نے بچوں کے والدین سے پوچھا کہ اگر وہ اپنے چھوٹے بچے اور بچیاں مجھے

ہفتہ دس دنوں کے لیے دے سکتے ہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں یہ بچے صحیح سلامت واپس لوٹاؤں گی۔۔۔ "سوینی" نام کا ایک سابقہ فوجی تھا۔۔۔ چند خواتین اور مرد میرے ساتھ تھے۔۔۔ بچوں نے اپنی کمروں پر تھیلے اٹھائے ہوئے تھے جن میں چھری، کانٹا اور ٹین کا کپ تھا۔۔۔ ایک چھوٹے بچے کے پاس ڈرم تھا اور ایک دوسرے کے پاس توتی تھی، ہم نے بینر اٹھا رکھے تھے جن پر لکھا تھا۔۔۔ "ہم کھیلنے کے لیے وقت چاہتے ہیں۔"

سیاہ فام خواتین کو دہرے استبداد کا سامنا تھا۔ ایک نیگرو نرس نے 1912ء میں ایک اخبار میں لکھا:

> ہم جنوب کی غریب مزدوری کرنے والی سیاہ فام خواتین ایک خوفناک جنگ لڑ رہی ہیں۔۔۔ ایک طرف ہم باورچی خانوں میں، نہانے والے ٹبوں میں، سلائی مشینوں پر، بچوں کی گاڑیوں کے عقب میں، یا استری والے تختوں پر سیاہ فام مردوں کا شکار بنتی ہیں جو کہ ہمارے فطری محافظ ہونے چاہیے تھے۔ ہم سامان اٹھانے والے گھوڑوں، بار برداری کے جانوروں، غلاموں سے شاید ہی کچھ بہتر ہوں گی۔

بیسویں صدی کے اوائل کے حصے میں جسے سفید فام دانشوروں کی نسلیں "ترقی پسندانہ دور" قرار دیتی ہیں، ہر ہفتے کسی نہ کسی سیاہ فام کی سفید فاموں کے ہاتھوں موت کی خبر ملتی تھی۔ یہ شمال اور جنوب کے نیگروز کے لیے بہت ہی خراب دور تھا، یہ ان کے لیے "پستی کی انتہا" تھی جیسا کہ ایک سیاہ فام تاریخ دان "ریفورڈ لوگن" قرار دیتا ہے۔ 1910ء میں امریکہ میں 10 ملین نیگروز تھے اور ان میں سے 9 ملین جنوب میں آباد تھے۔

امریکہ کی حکومت (1901ء سے 1921ء تک کے دوران اس عرصہ میں تھیوڈور روز ویلٹ، ولیم ہاورڈ، ٹیفٹ، اور ووڈرو ولسن صدارت کے عہدے پر فائز رہے) خواہ ری پبلکن تھی یا ڈیموکریٹ تھی نیگروز کو سفید فاموں کے ہاتھوں مرتے دیکھتی رہی، جورجیا کے شہر سٹیٹس برو، ٹیکساس کے شہر براونز ویلی اور جورجیا میں کے شہر اٹلانٹا میں سیاہ فاموں کے خلاف ہونے والے خونریز ہنگاموں کا نظارہ کرتی رہی، لیکن عملی طور پر کچھ نہ کیا۔

سوشلسٹ پارٹی میں بھی نیگروز موجود تھے لیکن سوشلسٹ پارٹی نے اپنے راستے سے ہٹ کر نسل کے سوال پر کوئی کارروائی نہ کی۔

سیاہ فام منظم ہونا شروع ہوئے۔ ڈبلیو ای بی ڈوبوئس نے جو کہ اٹلانٹا جورجیا میں پڑھا رہا تھا، 1905ء میں پورے ملک میں نیگروز راہنماؤں کو نیاگرا فالز کے نزدیک بفالو کے ساتھ کینیڈین سرحد کے پار ایک کانفرنس میں مدعو کیا۔ یہ "نیاگرا تحریک" کا آغاز تھا۔

ڈوبوئس میساچوسٹس میں پیدا ہوا اور پہلا سیاہ فام تھا جس نے 1895ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اور حال ہی میں اس نے اپنی شاعری کی پر اثر کتاب "دی سولز آف بلیک فوک" لکھی اور شائع کی تھی۔ ڈوبوئس سوشلسٹوں سے ہمدردی رکھتا تھا، اگرچہ وہ خود بہت تھوڑا عرصہ پارٹی کا ممبر رہا تھا۔

نیاگرا میٹنگ طلب کرنے والوں میں سے اس کا ایک ساتھی بوسٹن کا ایک نوجوان سیاہ فام "ولیم منرو ٹروٹر" بھی تھا، جو کہ مخاصمانہ خیالات رکھتا تھا اور ایک اخبار "گارڈین" کا ایڈیٹر تھا۔ اس میں اس نے "بوکر۔ ٹی۔ واشنگٹن" کے معتدل نظریات پر شدید تنقید کی، جب 1903ء کے موسم سرما میں واشنگٹن نے بوسٹن کے ایک چرچ میں دو ہزار سامعین سے خطاب کیا، تو ٹروٹر اور اس کے حامیوں نے 9 برانگیختہ کرنے والے سوالات تیار کیے، جنہوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور گھونسوں اور تھپڑوں کا تبادلہ ہوا۔ ٹروٹر اور اس کا ایک دوست گرفتار ہو گئے۔ اس واقعے نے برہمی کے اس جذبے میں اضافہ کیا ہو گا جس کے نتیجے میں ڈوبوئس نے فوری طور پر نیاگرا میٹنگ کی دعوت دی۔ نیاگرا گروپ کا لہجہ بڑا سخت تھا:

> ہم عام سطح پر پائے جانے والے اس تاثر کو ختم کرنا چاہتے ہیں کہ سیاہ فام امریکی اپنی کمتری کو تسلیم کرتا ہے، ظلم استبداد کے سامنے فرمانبرداری اختیار کرتا ہے اور اپنی بے عزتی پر معذرت آمیز رویہ اختیار کرتا ہے۔ بے بسی کی وجہ سے ہم فرمانبرداری اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک امریکہ میں بے انصافی موجود ہے، دس ملین امریکیوں کی صدائے احتجاج، ان کے ساتھیوں کی سمع خراشی کرنے سے، کبھی بھی رک نہیں سکتی۔

ایلینائس کے شہر سپرنگ فیلڈ میں ایک نسلی فساد نے 1910ء میں "نیشنل ایسوسی ایشن فار دا ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپل" (این اے اے سی پی) کی تشکیل کے عمل کو تیز تر کر دیا۔ اس نئی تنظیم کی لیڈرشپ پر سفید فام چھائے ہوئے تھے، ڈوبوئس واحد سیاہ فام آفیسر تھا۔ وہ این اے اے سی پی کے جریدے "دی کرائس" کا پہلا ایڈیٹر بھی تھا۔ این اے اے سی پی کا ارتکاز قانونی کارروائی اور تعلیم پر تھا، لیکن ڈوبوئس نے اس جذبے کو بھی شامل کر دیا جو نیاگرا تحریک کی قرارداد کا روح رواں تھا: "ثابت قدمی کے ساتھ جرأتمندانہ تحریک، آزادی کا راستہ ہے۔"

اس عرصے میں سیاہ فاموں، مساوات نسواں کے حامیوں، مزدور راہنماؤں اور سوشلسٹوں پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ وہ قومی حکومت پر انحصار نہیں کر سکتے۔ یقیناً یہ "ترقی پسندانہ دور" تھا، اصلاحات کے دور کا آغاز، لیکن یہ مکمل رضامندی سے کی گئی اصلاحات نہیں تھیں، ان کا مقصد عوامی بغاوتوں کو فرو کرنا تھا کسی قسم کی بنیادی تبدیلیاں لانا نہیں تھا۔

اسے "ترقی پسندانہ" کا نام ان نئے قوانین کی وجہ سے دیا گیا تھا، جو تھیوڈور روز ویلٹ کی صدارت میں پاس کیے گئے، ان میں "گوشت کے معائنے کا ایکٹ"، ریلویز اور پائپ لائنوں کو ایک نظام

کے تحت لانے کا "ہپ برن ایکٹ' پیور فوڈ اینڈ ڈرگ ایکٹ شامل تھے۔ ٹیفٹ" کی صدارت میں "مین الکنز ایکٹ" نے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کو "انٹر سٹیٹ کامرس کمیشن" کی زیر نگرانی کر دیا۔ ووڈ رو ولسن کی صدارت میں اجارہ داریوں کے فروغ پر قابو پانے کے لیے فیڈرل ٹریڈ کمیشن متعارف کرایا گیا، ملک کی کرنسی اور بنکنگ نظام کو منظم کرنے کے لیے "فیڈرل ریزرو ایکٹ" منظور کیا گیا۔ ٹیفٹ کی صدارت میں تدریجی انکم ٹیکس کے نفاذ کے لیے آئین میں سولہویں ترمیم اور سینیٹرز کا انتخاب ریاست کی مقننہ کے ذریعے کرنے کے بجائے، جیسا کہ اصل آئین میں درج تھا، براہ راست عوامی ووٹنگ کے ذریعے کرنے کے لیے سترہویں ترمیم کی گئی۔ اس دور میں کئی ایک ریاستوں نے معاوضوں اور کام کے گھنٹوں کو باقاعدہ بنانے کے لیے، فیکٹریوں میں حفاظتی انتظامات کے معائنے اور زخمی ہونے والے کارکنوں کے لیے زر تلافی کے قوانین پاس کیے۔

اس میں شک نہیں کہ ان تبدیلیوں سے کسی حد تک عام لوگوں کو بھی فائدہ پہنچا۔ نظام زرخیز پیداواری اور پیچیدہ تھا۔ یہ معاشرے کے نچلے اور بالائی طبقے کے درمیان ایک حفاظتی ڈھال پیدا کرنے کے لیے اپنی دولت کا ایک مناسب حصہ ضرورت کے مطابق محنت کش طبقے کو دے سکتا تھا۔ 1905ء سے 1915ء کے درمیان نیویارک میں آبادکاروں کے ایک مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ 32 فی صد اطالوی اور یہودی مشقتی طبقے سے ترقی کر کے اوپر والے طبقے میں شامل ہو چکے ہیں (اگرچہ زیادہ اوپر نہیں تھے)۔

لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بہت سے اطالوی آبادکاروں کو اتنے مواقع میسر نہیں آ سکے تھے، کہ وہاں قیام کر سکتے۔ ایک چار سال کے عرصے میں یہاں پہنچنے والے سو میں سے تہتر اطالوی نیویارک سے واپس چلے گئے۔ اس کے باوجود کافی اطالوی تعمیراتی ورکرز بنے، کافی یہودی کاروباری اور پیشہ ور افراد بن گئے۔ جنھوں نے طبقاتی کشمکش کے اثرات کو کم کرنے کے لیے ایک متوسط طبقہ پیدا کیا۔

تاہم مزارعت پر کھیتی باڑی کرنے والوں، فیکٹری مزدوروں، کچی آبادیوں کے مکینوں، کارکنوں، کھیت مزدوروں، محنت کش مردوں اور خواتین، سیاہ فاموں اور سفید فاموں کی ایک بڑی اکثریت کے لیے حالات تبدیل نہیں ہوئے تھے۔

ایک مضبوط حکومت کے قیام کے لیے اصرار کا اصل مقصد ایسے نظام کو مستحکم کرنا تھا۔ جو بالائی طبقے کے لیے سودمند ہو۔ مثال کے طور پر تھیوڈور روزویلٹ نے ٹرسٹ توڑنے والے کے طور پر اپنی شہرت قائم کی تھی (ٹرسٹ صنعتکاروں کے ایسے اتحاد تھے جو اپنے مفاد کے لیے مقابلہ کو کم کرنے اور قیمتوں کو کنٹرول کرنے کے لیے تشکیل دیئے گئے: مترجم) لیکن جے پی مورگن کے دو آدمیوں، البرٹ گرے چیئرمین یو ایس سٹیل اور جارج پرکنز جو بعد میں روزویلٹ کے لیے مہم بھی چلاتا رہا، نے صدر کے ساتھ ایک نجی ملاقات کا انتظام کیا اور یہ یقین حاصل کیا کہ ٹرسٹ توڑنے کی مہم زیادہ وسعت اختیار نہیں کرے گی۔

1901ء میں "بینکرز میگزین" نے لکھا: جیسا کہ ملک کے کاروباری حلقوں نے اتحاد کا راز سیکھ لیا ہے، یہ بتدریج سیاستدانوں کی طاقت کو ختم کرتے ہوئے انھیں اپنے مقاصد کا تابع فرمان بنا لیں گے۔"

1904ء تک سات بلین ڈالر سے زائد سرمائے کے ساتھ 318 ٹرسٹ امریکہ کی 40 فی صد صنعتکاری پر قابض تھے۔

روزویلٹ کے مشیر صنعتکار اور بینکار تھے۔ وال سٹریٹ سے لکھے گئے اپنے پریشان سالے کے خط کے جواب میں روزویلٹ نے لکھا: میں بہت زیادہ اعتدال پسندی سے کام لینا چاہتا ہوں، لیکن خود کارپوریشنوں کے مفاد میں اور سب سے بڑھ کر ملک کے مفاد میں۔"

روزویلٹ نے "ہپ برن" کے ریگولیٹری ایکٹ کی اس لیے حمایت کی کیونکہ اسے اس سے بھی کسی بڑی چیز کا خدشہ تھا۔ اس نے "ہنری کابوٹ لاج" کو لکھا کہ اس بل کی مخالفت میں ریلوے کے لیے لابی کرنے والے بہت کوتاہ نظر ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ اس بل کی نامنظوری کا مطلب ریلویز پر حکومتی ملکیت کی تحریک کو تقویت دینا ہے۔

عوام کو قابو کرنے کے لیے بڑی مہارت سے کام لیا جا رہا تھا۔ رالف ایسلے نامی ایک ری پبلکن اور اعتدال پسند شخص نے جو سکول ٹیچر اور صحافی بھی تھا "نیشنل سوک فیڈریشن" کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد سرمائے اور محنت کے درمیان بہتر تعلقات استوار کرنا تھا۔ اس کے آفیسر زیادہ تر بڑے کاروباری افراد اور اہم قومی سیاستدان تھے، لیکن اس کا پہلا نائب صدر اے ایف ایل کا سموئیل گومپر تھا، جو ایک لمبے عرصے تک اس عہدے پر فائز رہا۔

این سی ایف ٹریڈ یونینز تک جدید اور شائستہ طریقے سے رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ انہیں ایک ناگزیر حقیقت تسلیم کرتے ہوئے بجائے مخاصمت کے صلح جوئی سے کام نکالنا چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ایک جنگجو کا سامنا کرنے کے بجائے ایک اعتدال پسند یونین سے معاملات طے کرنا بہتر ہے۔

بہت سی کاروباری شخصیات "سوک فیڈریشن" کی پیش کردہ چھوٹی موٹی اصلاحات بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ لیکن فیڈریشن کا طریقہ کار جدید ریاست سے مماثلت رکھتا تھا، جو کہ ہر وہ کام کرنے کے لیے پرعزم تھی جو مجموعی طور پر سرمایہ دار طبقہ کے مفاد میں ہو، اگرچہ یہ بعض سرمایہ داروں کے لیے باعث پریشانی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نئی رسائی نظام کے طویل المدتی استحکام پر مبنی تھی، خواہ اس کے لیے بعض اوقات قلیل المدتی منافع جات کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اس طرح فیڈریشن نے 1910ء میں کارکنوں کے لیے زر تلافی کا ایک نمونے کا بل تیار کیا، اگلے سال بارہ ریاستوں نے زر تلافی یا حادثاتی انشورنس کے قوانین پاس کر دیے۔ جب اس سال سپریم کورٹ نے کہا کہ کارکنوں کے لیے زر تلافی کا نیویارک کا قانون غیر آئینی ہے، کیونکہ یہ کارپوریشنوں

کو ضروری قانونی کارروائی کے بغیر جائداد سے محروم کرتا ہے۔ تو تھیوڈور روز ویلٹ بہت برہم ہوا۔ اس نے کہا کہ ایسے فیصلے سوشلسٹ پارٹی کی قوت میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔ 1920ء تک 42 ریاستوں نے کارکنوں کے لیے زرتلافی کے قوانین وضع کیے۔

اسی دور میں شہروں میں بھی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ بہت سے شہروں نے اختیارات میئر کے بجائے سٹی کونسل کو سونپ دیے۔ اس کا مقصد زیادہ بہتر کارکردگی اور زیادہ استحکام کا حصول تھا۔

پروگریسو تحریک خواہ اس کی لیڈر شپ وسکونسن کے سینیٹر "رابرٹ لافولٹ" جیسے دیانتدار اصلاح کاروں کے ہاتھوں میں رہی، یا اعتدال پسندی کا لبادہ اوڑھے ہوئے روز ویلٹ (جو کہ 1912ء میں پروگریسو پارٹی کا صدارتی امیدوار تھا) جیسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی، وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ یہ سوشلزم کے خلاف ایک روک ہے۔ پروگریسو کے ایک ترجمان جریدے "ملوو کی جرنل" نے لکھا: "اعتدال پسند سوشلزم کے خلاف اندھوں کی طرح لڑتے ہیں، جبکہ پروگریسو کی اس کے خلاف جدوجہد عقل وفہم کی بنیادوں پر ہے اور ان خرابیوں اور حالات کے خاتمے کا بندوبست کرتے ہیں جو اسے تقویت بہم پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔

سوشلسٹ تحریک پروان چڑھ رہی تھی۔ ہر کوئی سوشلزم کے خطرے کی بات کر رہا تھا جیسا کہ کالجوں، چرچوں اور اخبارات میں اس کے پرچار سے ظاہر ہوتا تھا۔ 1910ء میں تہتر سوشلسٹ میئر اور 340 شہروں اور قصبوں میں بارہ سو چھوٹے عہدیدار منتخب ہوئے۔ پریس نے اسے سوشلزم کی ابھرتی ہوئی لہر" قرار دیا۔

کیا پروگریسو اصلاحات، سرمایہ دارانہ نظام کی بدترین خامیوں کو درست کرنے، اسے مستحکم کرنے، سوشلسٹ تحریک کو بے اثر کرنے، سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کے اس دور میں طبقاتی امن کی بحالی کے لیے اقدامات، جیسے اپنے اہداف حاصل کرنے میں کامیاب رہیں؟ شاید کسی حد تک یہ کامیاب رہیں۔ لیکن سوشلسٹ پارٹی کا بڑھنا جاری رہا۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو نے ہنگامے جاری رکھے۔ اور وڈرو ولسن کے عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد کولوریڈو میں کارکنوں اور کارپوریٹ سرمایہ داروں کے درمیان ملک کی تاریخ کی شدید ترین اور تلخ ترین جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔

یہ کولوریڈو میں کوئلے کی ہڑتال تھی جو ستمبر 1913ء میں شروع ہوئی اور اپریل 1914ء میں "لڈلو قتل عام" پر اختتام پذیر ہوئی۔ جنوبی کولوریڈو میں گیارہ ہزار کارکن جن میں زیادہ تر بیرون ملک پیدا ہونے والے جرمن، اطالوی، اور سرب تھے جو کولوریڈو فیول اینڈ آئرن کارپوریشن کے لیے کام کرتے تھے جس کی ملکیت راک فیلر خاندان کے پاس تھی۔ انہوں نے اپنے ایک منتظم کی موت سے بپھرتے ہوئے، کم تنخواہ، کام کے خطرناک حالات، اور اپنے قصبوں پر کان کنی کی کمپنیوں کے جاگیردارانہ تصرف کے خلاف ہڑتال کر دی۔

"مدر جونز" جو اس وقت یونائیٹڈ مائنز ورکر کی آرگنائزر تھی علاقے میں آئی اور اپنی شعلہ بیانی سے کان کنوں میں آگ بھر دی اور ہڑتال کے شروع کے نازک مہینوں میں ان کی مدد کی، جب تک اسے گرفتار نہیں کر لیا گیا، اور اسے جانوروں کے کمرے جیسی ایک کوٹھڑی میں قید رکھنے کے بعد زبردستی ریاست سے نکال دیا گیا۔

جب ہڑتال شروع ہوئی تو کان کنوں کو فوری طور پر قصبے میں ان کی جھونپڑیوں سے نکال دیا گیا اور انہوں نے یونائیٹڈ مائنز ورکر یونین کی مدد سے نزدیکی پہاڑوں پر اپنے ٹینٹ لگا لیے اور ان ٹینٹ کالونیوں سے انہوں نے ہڑتال اور پکٹنگ کا عمل جاری رکھا۔ "بالڈون فیلکس ڈی ٹیکو ایجنسی" جس کی خدمات راک فیلر نے حاصل کی ہوئی تھیں کے گن مینوں نے گیٹلنگ گنز (چھ نالیوں والی مشین گن) اور رائفلیں استعمال کرتے ہوئے ٹینٹ کالونی پر حملہ کر دیا۔

کان کنوں کی اموات میں اضافہ ہوا، لیکن وہ قائم رہے، بندوقوں کی ایک لڑائی میں انہوں نے بکتر بند ٹرین واپس کر دی اور ہڑتال توڑنے والوں کو کانوں تک نہ پہنچنے دیا۔ کان کنوں کی مزاحمت اور اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے کانوں میں کام بند ہو گیا کولوریڈو کے گورنر نے (جسے راک فیلر کا ایک کان منیجر "ہمارا چھوٹا سا کاؤبوائے گورنر" کہا کرتا تھا) نیشنل گارڈ طلب کر لی، گارڈز کی تنخواہیں راک فیلر نے ادا کرنا تھیں۔

شروع میں کان کنوں نے خیال کیا کہ گارڈ ان کی حفاظت کے لیے آئے ہیں اور انہوں نے جھنڈوں اور نعروں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ جلد ہی انہیں سمجھ آ گئی کہ گارڈز وہاں ہڑتال کو ختم کرانے آئے ہیں۔ گارڈز رات کے اندھیرے میں وہاں ہڑتال توڑنے والے لے کر آئے، انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہاں ہڑتال ہے۔ گارڈز کے آدمیوں نے کان کنوں کو مارا پیٹا، سینکڑوں کے تعداد میں انہیں گرفتار کیا، اور علاقے کے مرکزی شہر ٹرینی ڈاڈ کی گلیوں میں خواتین کو ریوڑوں کی طرح ہانکا۔ اس کے باوجود ہڑتالیوں نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ جب انہوں نے 1913ء اور 1914ء کی سردیاں گزار لیں تو یہ بات واضح ہو گئی کہ ہڑتال توڑنے کے لیے کچھ سخت اقدامات کی ضرورت ہو گی۔

اپریل 1914ء میں نیشنل گارڈز کی دو کمپنیاں ایک پہاڑی پر متعین تھیں جو کہ "لڈلو" میں سب سے بڑی کالونی کے اوپر واقع تھی اور اس میں تقریباً ایک ہزار مرد، خواتین اور بچے رہ رہے تھے۔ 20 اپریل کی صبح خیموں پر مشین گن کا حملہ کر دیا گیا، کان کنوں نے جوابی فائرنگ کی ان کے لیڈر ایک یونانی جس کا نام "لوٹکاس" تھا کو امن کے لیے گفتگو کرنے کے بہانے پہاڑیوں میں بلایا، پھر نیشنل گارڈز کی ایک کمپنی نے اسے گولی مار کر ختم کر دیا۔ خواتین اور بچوں نے گولیوں سے بچنے کے لیے خیموں میں گڑھے کھود لیے۔ سورج غروب ہونے کے بعد گارڈ مشعلیں لے کر پہاڑی سے نیچے اترے اور خیموں کو آگ لگا دی اور

خواتین اور بچے بھاگ کر پہاڑیوں میں چھپ گئے جبکہ گارڈز نے تیرہ آدمیوں کو مار ڈالا۔

اگلے دن ٹیلی فون کا ایک لائن مین "لڈلو" خیمہ کالونی کی جل کر راکھ ہوئی باقیات میں سے گزر رہا تھا اس نے ایک خیمے میں سے ایک گڑھے پر پڑی ہوئی لوہے کی چارپائی اٹھائی تو اس کے نیچے گیارہ بچوں اور دو خواتین کی جلی ہوئی اور تڑی مڑی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس واقعے کو "لڈلو کے قتل عام" کا نام دیا گیا۔

یہ خبر بڑی تیزی سے پورے ملک میں پھیل گئی "ڈینور" میں یونائیٹڈ مائینز ورکر" نے "مسلح ہونے" کا حکم دیا۔ اور اپنے دفاع کے لیے کان کنوں کو قانونی طور پر دستیاب ہتھیار اور گولہ بارود جمع کرنے کو کہا۔ دوسری خیمہ نو آبادیوں سے تین سو مسلح کان کن "لڈلو" کے علاقے میں پہنچ گئے، انہوں نے ٹیلی فون اور ٹیلی گرام کی تاریں کاٹ دیں اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ ریلوے کارکنوں نے ٹرینی ڈاڈ سے "لڈلو" فوجی لے جانے سے انکار کر دیا۔ کولوریڈو سپرنگز میں تین سو یونین کان کن اپنے کاموں کو چھوڑ کر ریوالورز رائفلیں اور شاٹ گنیں اٹھا کر ٹرینی ڈاڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔

خود ٹرینی ڈاڈ میں کان کنوں نے "لڈلو" میں مرنے والے چھبیس افراد کے جنازے میں شرکت کی، پھر جنازے سے سیدھے ایک نزدیکی عمارت میں پہنچے جہاں ان کے لیے ہتھیار جمع کیے گئے تھے۔ انہوں نے رائفلیں اٹھالیں اور پہاڑیوں میں چلے گئے، کانیں تباہ کرنے لگے، کانوں کے گارڈز کو مارتے ہوئے کانوں کے اندر جانے والے راستوں کو دھماکے سے اڑانا شروع کر دیا۔ پریس رپورٹ کے مطابق پہاڑیوں پر ہر سمت انسان ہی انسان نظر آنے لگے۔

ڈینور میں ٹرینی ڈاڈ جانے والی فوجیوں کی ایک ریل گاڑی میں سوار کمپنی کے بیاسی سپاہیوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ پریس رپورٹ کے مطابق: "ان سپاہیوں نے اعلان کیا کہ وہ خواتین اور بچوں کو مارنے میں شریک نہیں ہوں گے۔ انہوں نے اس مشن پر جانے والے 350 افراد پر آواز کسے اور ان کے لیے بددعائیں کیں۔"

پانچ ہزار افراد نے ڈینور" میں ریاستی دارالحکومت کے سامنے لان میں شدید بارش کے دوران مظاہرہ کیا اور "لڈلو" میں نیشنل گارڈ کے آفیسروں پر قتل کے مقدمات چلانے کا مطالبہ کیا اور گورنر کی شریک جرم کے طور پر مذمت کی۔ "ڈینور سگار میکرز یونین" نے "لڈلو" اور "ٹرینی ڈاڈ" میں پانچ سو مسلح افراد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ڈینور ہی کی "یونائیٹڈ گارمنٹ ورکرز یونین" کی خواتین نے اپنی چار سو ممبرات کو ہڑتالیوں کی مدد کے لیے نرسوں کے طور پر بھجوانے کا اعلان کیا۔

پورے ملک میں جلوس نکالے جا رہے تھے اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ نیو یارک سٹی میں راک فیلر کے دفتر 26 براڈوے کے سامنے، ہڑتال کا دفاع کرنے والوں نے مارچ کیا۔ ایک پادری نے

اس چرچ کے سامنے جہاں بعض دفعہ راک فیلر خطبہ دیتا تھا۔ احتجاج کیا جسے پولیس نے ڈنڈوں سے پیٹا۔

"نیو یارک ٹائمز" نے "کولوریڈو" کے معاملات پر جو اب بین الاقوامی توجہ حاصل کر رہے تھے اداریہ تحریر کیا۔ "ٹائمز" نے وہاں ہونے والے ظلم ستم کے بجائے اس سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی کی غلطیوں پر زور دیا۔ "لڈلو" کے قتل عام پر ٹائمز کا اداریہ ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا "کسی کی فاش حماقت...." دو دن بعد جب کان کن مسلح ہو کر کان کنی کے علاقے میں پہاڑیوں پر موجود تھے "ٹائمز" نے لکھا "تہذیب کے مہلک ترین ہتھیار وحشیانہ سوچ رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کولوریڈو کی جنگ کس حد تک جا سکتی ہے۔ اگر اسے طاقت کے ذریعے دبایا نہیں جاتا.... صدر کو اپنی توجہ میکسیکو سے ہٹا کر کولوریڈو میں سخت اقدامات اٹھانے چاہیں۔"

کولوریڈو کے گورنر نے نظم وضبط بحال کرنے کے لیے وفاقی فوج طلب کی جس پر ووڈرو ولسن نے فوری عمل کیا۔ اس کے ساتھ ہڑتال خود بخود ختم ہو گئی۔ کانگریس کی کمیٹیاں آگے آئیں اور شہادتوں کے ہزاروں صفحات تحریر ہوئے۔ یونین اپنے آپ کو تسلیم نہ کروا سکی۔ چھیاسٹھ مرد، خواتین اور بچے مارے جا چکے تھے۔ ملیشیا کے کسی بھی فرد یا کانوں کے کسی بھی گارڈ پر فرد جرم عائد نہ کیا گیا۔

اس کے باوجود کولوریڈو شدید طبقاتی مخاصمت کا مقام بن چکا تھا جس کی جذباتی بازگشت پورے ملک میں گونج رہی تھی۔ جو بھی قانون سازی کی گئی، آزادی کے لیے جو بھی اصلاحات کی گئیں، جو بھی تحقیقات کی گئیں اور افسوس اور دلجوئی کے جو بھی الفاظ بولے گئے، طبقاتی بغاوت کا خطرہ اب بھی امریکہ کے صنعتی ماحول میں محنت کش طبقے میں پائے جانے والے بغاوت کے جذبے میں بڑے واضح طور پر پوشیدہ تھا۔

ٹائمز نے میکسیکو کا حوالہ دیا تھا۔ جس صبح "لڈلو" میں ایک خیمے میں موجود گڑھے سے لاشیں برآمد ہوئی تھیں۔ امریکہ کے جنگی بحری جہاز میکسیکو کے ساحل پر واقع شہر "ویرا کروز" پر بمباری کر رہے تھے اور میکسیکو کے سینکڑوں باشندوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے قبضہ کر رہے تھے۔ کیونکہ میکسیکو نے امریکی ملاحوں کو گرفتار کر لیا تھا اور امریکہ کو بیس توپوں کی سلامی پیش کرتے ہوئے معافی طلب نہیں کی تھی۔

کیا حب الوطنی کا جنون اور فوجی جذبہ طبقاتی کشمکش کو ختم کر سکتا تھا؟ 1914ء میں بے روزگاری اور مشکل وقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کیا بندوقیں توجہ کا رخ پھیر سکتی تھیں اور ایک بیرونی دشمن کے خلاف قومی ہم آہنگی کو جنم دے سکتی تھیں؟ یقیناً ویرا کروز پر بمباری اور "لڈلو" کالونی پر حملہ دو ایسے حادثات تھے جو اتفاقاً بیک وقت رونما ہوئے۔ شاید میکسیکو کا معاملہ نظام کا خود اپنی بقا کے لیے ایک جبلی ردعمل تھا جس کا مقصد اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے منقسم قوم میں جنگی اتحاد پیدا کرنا تھا۔

ویرا کروز کی بمباری ایک چھوٹا واقعہ تھا، لیکن چار ماہ میں یورپ میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی تھی۔

جنگ ریاست کی صحت ہے

"جنگ ریاست کی صحت ہے" یہ جملہ انقلابی مصنف "زینڈلف بورن" نے پہلی عالمی جنگ کے دوران کہا تھا۔ حقیقت میں جیسے ہی یورپی اقوام نے جنگ شروع کی، حکومتیں پھلنے پھولنے لگیں، حب الوطنی پروان چڑھی اور طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہو گیا۔ نوجوان کی ایک کثیر تعداد ماری گئی، اکثر اموات چند گز زمین یعنی مورچوں کی ایک قطار کی خاطر ہوئیں۔

امریکہ میں، جو ابھی تک جنگ میں شریک نہیں تھا، ریاست کی صحت کے بارے میں تشویش پائی جاتی تھی۔ سوشلزم پروان چڑھ رہا تھا آئی ڈبلیو ڈبلیو ہر جگہ نظر آ رہی تھی۔ طبقاتی جھگڑے عروج پر تھے۔ 1916ء کے موسم گرما میں سان فرانسسکو میں "پری پیئرڈنس ڈے" (Preparedness Day) کی پریڈ کے دوران ایک بم دھماکا ہوا جس میں نو افراد مر گئے، دو مقامی انقلابیوں "ٹام مونی" اور "وارن بلنگز" کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں بیس سال قید کی سزا دے دی گئی۔ اس تھوڑے عرصے کے بعد نیو یارک کے سینیٹر جیمز واڈز ورتھ نے تمام مردوں کے لیے لازمی فوجی تربیت کی تجویز پیش کی۔ جس کا مقصد لوگوں کو طبقات میں تقسیم ہونے سے بچانا تھا۔ بقول اس کے "یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو یہ باور کروائیں کہ ان پر اس ملک کے حوالے سے بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔"

اس ذمہ داری کی شاندار تعمیل یورپ میں ہو رہی تھی دس ملین لوگ میدان جنگ کا ایندھن بننے والے تھے اور بیس ملین جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والی بھوک اور بیماریوں کے ہاتھوں مرنے والے تھے۔ اور اس دن سے لے کر آج تک کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو یہ ثابت کر سکے کہ اس جنگ سے انسانیت کو کم از کم اتنا ہی فائدہ پہنچا ہو جو ایک انسانی زندگی کی قیمت کے برابر ہو۔ سوشلسٹوں کا یہ بیان کہ یہ ایک "سامراجی جنگ" ہے اب جائز معلوم ہوتا تھا اور اس پر بمشکل ہی کسی قسم کی بحث کی گنجائش نظر آتی تھی۔ یورپ کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک سرحدوں، نوآبادیوں اور اثر و رسوخ کے میدانوں کے لیے لڑ رہے تھے۔

جنگ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی شروع ہو گئی تھی جبکہ ترقی اور جدیدیت کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے (غالباً مغربی دنیا کے صرف طبقہ اشرافیہ میں)۔ بہت جلد وسیع پیمانے پر اموات کی

ابتداء شروع ہو گئی۔ "میرن" کی پہلی جنگ میں برطانوی اور فرانسیسی پیرس کی جانب جرمن پیش قدمی روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ دونوں جانب سے 5,00,000 افراد مارے گئے۔ اگست 1914ء میں برطانوی فوج میں بھرتی کے لیے 5 فٹ 8 انچ قد کی شرط تھی۔ اکتوبر میں اسے کم کر کے 5 فٹ 5 انچ کر دیا گیا۔ اس مہینے تیس ہزار فوجی مارے گئے، اور پھر 5 فٹ 3 انچ کے افراد کو بھی بھرتی کیا جانے لگا۔ جنگ کے پہلے تین ماہ کے دوران برطانیہ کی تمام اصل فوج ختم ہو چکی تھی۔

تین سال کے لیے فرانس میں جنگی صف بندیاں تقریباً جامد رہیں۔ دونوں فریق تھوڑی سی پیش قدمی کرتے پھر پسپائی اختیار کر لیتے، پھر چند گز یا چند میل آگے آتے اور پھر پسپا ہو جاتے، جبکہ لاشوں کے ڈھیر لگتے چلے گئے۔ 1916ء میں جرمنوں نے "ورڈن" کے مقام پر حصار توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی، برطانویوں اور فرانسیسیوں نے دریائے سین کے ساتھ جوابی حملہ کر دیا، چند میل آگے بڑھے اور 600,000 فوجیوں کا نقصان اٹھایا۔ ایک دن بادشاہ کی اپنی یارک شائر لائٹ انفنٹری کی نویں بٹالین نے آٹھ سو جوانوں کے ساتھ حملہ کیا، چوبیس گھنٹوں کے بعد وہ صرف چوراسی باقی بچے تھے۔

برطانیہ میں اتنے بڑے پیمانے پر اموات کا نہیں بتایا گیا تھا۔ یہی کچھ جرمنی کی جانب بھی ہو رہا تھا۔ جیسا کہ "ایرک ماریا ریمارک اپنے عظیم ناول میں لکھتا ہے: "جن دنوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مشین گنوں اور گولوں سے ٹکڑوں میں بکھر رہے تھے، سرکاری اطلاعات کے مطابق "مغربی محاذ پر سب کچھ ٹھیک تھا۔"

جولائی 1916ء میں برطانوی جنرل ڈگلس ہیگ نے انگلش فوجیوں کی گیارہ ڈویژنوں کو مورچوں سے نکل کر جرمن مورچوں کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ 6 جرمن ڈویژنوں نے اپنی مشین گنوں کے منہ کھول دیئے۔ 110,000 میں سے جنہوں نے حملہ کیا 20,000 مارے گئے مزید 40,000 زخمی ہوئے۔ ان تمام کی لاشیں اس آسیب زدہ، فاصل قطعہ زمین پر بکھری پڑی تھیں جو دونوں متحارب فریقین کی مورچہ بندیوں کے درمیان واقع تھی۔ یکم جنوری 1917ء کو ہیگ کو ترقی دے کر فیلڈ مارشل بنا دیا گیا۔ ان گرمیوں میں جو ہوا اس کو "ولیم لانگر" نے "انسائیکلو پیڈیا آف ورلڈ ہسٹری" میں مختصراً بیان کیا ہے:

> "ہیگ بڑی پر امیدی سے بڑے محاذ جنگ کی طرف روانہ ہوا۔ 'ایپرس' کی تیسری جنگ آٹھ بھاری حملوں کا ایک سلسلہ تھی، جو کہ بارش کے دوران پانی اور کیچڑ میں کئے گئے لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ صرف پانچ میل کے قریب زمین پر قبضہ حاصل ہو سکا اور برطانیہ کو اس کی قیمت 400,000 جانوں کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔"

فرانس اور برطانیہ کے عوام کو جنگ میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد نہیں بتائی جاتی تھی۔ جب جنگ کے آخری سال میں جرمنی نے سام پر ایک شدید حملہ کیا اور 300,000 برطانوی فوجیوں کو مار ڈالا یا زخمی کر دیا۔ لندن کے اخبار نے مندرجہ ذیل سطور شائع کیں:

اس بحران میں سویلین بھی اپنے ملک کی پوری خدمت کر سکتے ہیں۔
خوش ہو جائیے!
میدان جنگ میں اپنے دوستوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے لکھیں....
یہ مت سوچو کے تم ہیک سے بہتر جانتے ہو۔

موت اور دھوکا بازی کے اس گڑھے میں 1917ء کے موسم بہار میں امریکہ بھی کود پڑا۔ فرانسیسی فوج میں بغاوتیں ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ جلد ہی 112 ڈویژنوں میں سے 68 ڈویژنوں نے بغاوت کر دی۔ 629 افراد پر مقدمات چلائے گئے اور مجرم قرار دیے گئے 50 کو فائرنگ سکواڈ کے ذریعہ اڑا دیا گیا۔ امریکی فوجیوں کی شدید ضرورت تھی۔

صدر ووڈ رو ولسن وعدہ کر چکا تھا کہ امریکہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہے گا۔ لیکن اپریل 1917ء کو جرمنوں نے اعلان کیا کہ ان کے پاس آبدوزیں ہیں جو ہر ایسے جہاز ڈبو دیں گی جو ان کے دشمنوں کو رسد پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ولسن نے کہا کہ وہ ہر صورت میں تجارتی جہازوں میں جنگی علاقے میں امریکیوں کے سفر کرنے کے حق کا دفاع کرے گا۔

جرمنوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ امریکیوں کو غیر جانبدار تسلیم کر لیں گے، ایک غیر حقیقی سی بات تھی جبکہ امریکہ جرمنی کے دشمنوں کو بہت زیادہ مادی امداد بحری جہازوں کے ذریعے پہنچا رہا تھا۔ 1915ء کے آغاز میں ایک برطانوی تجارتی جہاز، لوسے ٹیئیا" کو جرمن آبدوز نے تارپیڈو مار کر غرق کر دیا جہاز اٹھارہ منٹ کے اندر ڈوب گیا اور 1198 افراد ڈوب کر مر گئے جن میں 124 امریکی بھی تھے۔

امریکہ نے دعویٰ کیا کہ "لوسے ٹیئیا" میں بے ضرر سامان لدا ہوا تھا۔ لہٰذا اسے تارپیڈو مارنا جرمنوں کی ایک وحشیانہ سفاکی ہے۔ حقیقت میں "لوسے ٹیئیا" بہت زیادہ مسلح تھا اور اس پر گولہ بارود کے ہزاروں ڈبے لدے ہوئے تھے۔ اس پر لدے سامان کی فہرست غلط تیار کی گئی تھی تا کہ اس حقیقت کو چھپایا جا سکے اور برطانوی اور امریکی حکومتوں نے اس کے سامان کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔

1914ء میں امریکہ ایک شدید کساد بازاری کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ لیکن 1915ء تک اتحادیوں کے جنگی آرڈرز کی وجہ سے معیشت کو کچھ سنبھالا مل گیا۔ اور اپریل 1917ء تک دو بلین ڈالر سے زائد کا سامان اتحادیوں کو فروخت کیا جا چکا تھا۔ امریکہ کی خوش حالی اب انگلینڈ کی جنگ کے ساتھ وابستہ تھی۔

خوشحالی کا دار و مدار زیادہ تر بیرونی منڈیوں پر ہے ملک کے لیڈر اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ اپنی صدارت کے آغاز میں "ووڈ رو ولسن" نے اپنا ہدف "دنیا میں کھلے دروازے" کے طور پر بیان کیا تھا۔ اور 1914ء میں اس نے کہا کہ وہ "بیرونی منڈیوں کی جائز فتح" کی حمایت کرتا ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے ساتھ انگلینڈ امریکی مصنوعات اور سود پر قرضوں کی ایک بڑی منڈی بن

چکا تھا۔ جے پی مورگن اینڈ کمپنی اتحادیوں کے ایجنٹس کے طور پر کام کر رہی تھی اور اس نے اتنے بڑے بڑے قرضے دینے شروع کر دیئے کہ دونوں نے بہت منافع کمایا، اور امریکی مالیات کو جرمن کے خلاف جنگ میں انگلینڈ کی فتح کے ساتھ منسلک کر دیا۔

صنعت کار اور سیاسی لیڈر خوشحالی کی بات ایسے کرتے تھے گویا یہ غیر طبقاتی ہو یا جیسے مورگن کے قرضوں سے ہر ایک کو فائدہ پہنچا ہو۔ یہ بات درست تھی کہ جنگ کا مطلب زیادہ پیداوار اور زیادہ روزگار تھا۔ لیکن کیا سٹیل پلانٹس کے ورکرز کو بھی اتنا ہی فائدہ پہنچا جتنا "یو ایس سٹیل" کو پہنچا جس نے 1916ء میں تنہا 348 ملین ڈالر کا منافع حاصل کیا؟ جب امریکہ جنگ میں شامل ہو گیا تو یہ دولتمند افراد ہی تھے جنہوں نے ملکی معیشت کا زیادہ براہ راست چارج سنبھال لیا۔ سرمایہ کار "برنارڈ باروچ" جنگی دور کی حکومتی ایجنسیوں میں سے سب سے طاقتور ایجنسی "وار انڈسٹریز بورڈ" کا سربراہ تھا۔ بینکارز ریلویز کے آدمی اور صنعتکار ان ایجنسیوں پر چھائے ہوئے تھے۔

پہلی عالمی جنگ کی نوعیت کے بارے میں بہت زیادہ سوجھ بوجھ پر مبنی ایک مضمون مئی 1915ء میں "اٹلانٹک منتھلی" میں شائع ہوا۔ "ڈبلیو، ای، بی، ڈو بوئس" کے اس مضمون کا عنوان تھا "دا افریقین روٹس آف وار" اس نے کہا تھا یہ جنگ سلطنتوں کے قیام کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ جرمن اور اتحادی جنوبی افریقہ کے سونے اور ہیروں کے لیے انگولا اور نائیجریا کے کوکا، کانگو کے ربڑ اور ہاتھی دانت، ویسٹ کوسٹ کے پام آئل کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جی ہاں! انگلینڈ، فرانس، جرمنی، اور امریکہ کا ہر ایک شہری پہلے سے بلند معیار کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن "یہ نئی دولت کہاں سے آئی ہے؟ یہ بنیادی طور پر دنیا کی سیاہ اقوام، ایشیا اور افریقہ، جنوبی اور وسطی امریکہ ویسٹ انڈیز اور جنوبی سمندر کے جزیروں سے آئی ہے۔"

"ڈو بوئس" کے مطابق بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک ایسا راستہ ایجاد کر لیا گیا تھا جو طبقاتی چپقلش کی جڑ اس کو نکالتے ہوئے استحصال کنندہ اور استحصال زدہ کو متحد رکھ سکتا تھا۔ اس نے لکھا: "اب یہ ماضی کی طرح محض تاجر برادری، یا اجارہ دار اشرافیہ، یا آجر طبقہ نہیں جو دنیا کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہے، بلکہ یہ ایک نئی جمہوریہ قوم ہے جو سرمائے اور محنت کے اتحاد سے وجود میں آئی ہے۔"

امریکہ "ڈو بوئس" کے اس نظریہ پر فٹ بیٹھتا تھا۔ امریکی سرمایہ داری کو امیر اور غریب کے درمیان ایک مصنوعی اشتراک مفادات پیدا کرنے کے لیے، جو غریب طبقے کے حقیقی اشتراک مفادات کی جگہ لے سکے جس کا اظہار گاہے بگاہے اٹھنے والی تحریکوں میں سامنے آتا تھا، بین الاقوامی رقابت اور وقتاً فوقتاً جنگ کی ضرورت تھی۔ جنگ کے لیے ایک قومی ہم آہنگی کی ضرورت تھی اور حکومت ایسی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے فوراً متحرک ہو گئی۔

عوامی سطح پر جنگ کے لیے کوئی خواہش موجود نہ تھی جس کا علم ہمیں اس سلسلے میں اٹھائے جانے

والے سخت اقدامات مثلاً نوجوانوں کی زبردستی فوج میں بھرتی، پورے ملک میں وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کی مہم اور بھرتی سے انکار کرنے والوں کے لیے سخت سزاؤں سے ہوتا ہے۔

ولسن نے جنگ کی راہ ہموار کرنے کے لیے کہا یہ جنگ "تمام جنگوں کے خاتمے کے لیے اور" دنیا کو جمہوریت کے لیے ایک محفوظ مقام بنانے کے لیے" لڑی جارہی ہے، لیکن اس کے باوجود امریکی عوام فوج میں بھرتی ہونے کے لیے تیزی سے آگے نہ آئے۔ ایک ملین افراد کی ضرورت تھی، لیکن اعلان جنگ کے بعد پہلے چھ ہفتوں میں صرف 73,000 رضا کار بھرتی ہوئے۔ کانگریس نے ایک بڑی اکثریت کے ساتھ زبردستی بھرتی کا قانون پاس کیا۔

حکومت نے عوامی سطح پر جنگ کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایک تجربہ کار اخباری شخصیت "جارج کریل" کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے امریکیوں کو جنگ کے لیے قائل کرنے کے لیے ایک "پبلک انفرمیشن" کمیٹی قائم کی، جس میں 75,000 مقررین کو بھرتی کیا گیا اور انہوں نے امریکہ کے 5,000 شہروں اور قصبات میں چار چار منٹ کی 750,000 تقاریر کیں۔ یہ ہچکچاہٹ کے شکار عوام کو ابھارنے کے لیے ایک بہت بڑی کوشش تھی۔

کانگریس کی جانب سے اعلان جنگ کے دوسرے دن سوشلسٹ پارٹی نے سینٹ لوئیس میں ایک ہنگامی کنونشن طلب کی اور اس اعلان کو "امریکہ کے عوام کے خلاف ایک جرم قرار دیا۔" 1917ء کے موسم گرما میں جنگ کے خلاف "مِنی سوٹا" میں ہونے والے سوشلسٹ اجلاسوں میں پانچ ہزار، دس ہزار اور بیس ہزار کسانوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور جنگ، زبردستی بھرتی اور منافع خوری کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ اوہایو کے ایک اعتدال پسند اخبار "ایکرون بیکن جرنل" نے لکھا: "کیا اب آئندہ ہونے والے انتخابات میں سوشلزم کی طاقت ور لہر "وسطی مغرب" کو بہا کر لے جائے گی۔" اس نے مزید کہا: "ملک میں اس سے قبل کبھی بھی ایک ایسی غیر مقبول جنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔"

1917ء میں میونسپل انتخابات میں پروپیگنڈا اور حب الوطنی کی لہر کے خلاف سوشلسٹوں نے حیران کن فتح حاصل کی۔ نیویارک کے میئر کے لیے ان کے امیدوار نے 22 فی صد ووٹ حاصل کئے جو کہ وہاں معمول کے سوشلسٹ ووٹ سے پانچ گنا زیادہ تھے۔ نیویارک کی ریاستی مقننہ میں 10 سوشلسٹ منتخب ہوئے۔ شکاگو میں پارٹی ووٹ جو کہ 1915ء میں 3.6 فی صد تھا۔ بڑھ کر 1917ء میں 34.7 فی صد ہو گیا "بفیلو" میں یہ 2.6 فی صد سے 30.2 فی صد پہنچ گیا اور اگرچہ کچھ اہم سوشلسٹ ('جیک لنڈن، اپٹون سینکلیئر، کلارنس ڈارو) امریکہ کی جنگ میں شمولیت کے بعد جنگ کے حامی ہو گئے تھے، زیادہ تر سوشلسٹوں نے مخالفت جاری رکھی۔

1917ء میں کانگریس نے "ایسپیونج ایکٹ" پاس کیا جس پر ولسن نے دستخط کر دیے۔ اس کے

نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گویا جاسوسی کے خلاف کوئی ایکٹ تھا۔ تاہم اس کی ایک دفعہ کے تحت اس شخص کو بیس سال قید کی سزا ہو سکتی تھی جو" جبکہ امریکہ حالت جنگ میں ہے جان بوجھ کر قصداً نافرمانی 'غداری' بغاوت یا امریکہ کی فوج یا بحریہ میں فرائض انجام دینے سے انکار پر اکسانے یا اکسانے کی کوشش کا مرتکب ہو گا یا قصداً امریکہ میں فوج کی لازمی بھرتی کے عمل میں مداخلت یا رکاوٹ کا باعث بنے گا۔۔۔" اس قانون کو ان امریکیوں کو قید کرنے کے لیے استعمال کیا گیا جنہوں نے جنگ کے خلاف تقریریں کیں یا لکھا۔

قانون پاس ہونے کے دو ماہ بعد ایک سوشلسٹ "چارلس شینک" کو فلاڈلفیا میں پندرہ ہزار اشتہار شائع کرنے اور تقسیم کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا، جن میں فوج میں زبردستی بھرتی کے قانون اور جنگ کی مذمت کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ فوج میں زبردستی بھرتی "انسانیت کے خلاف ایک ظالمانہ عمل ہے جو کہ وال سٹریٹ کے جنگی سرمایہ کاروں کے مفاد میں شروع کیا گیا ہے۔" شینک پر فرد جرم عائد کی گئی مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہونے پر اسے "ایسپیونج ایکٹ" کی خلاف ورزی کرنے پر چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ (یہ ایسے مقدمات میں دی جانے والی مختصر ترین سزا تھی۔) شینک نے اس کے خلاف اپیل کی، اس نے یہ دلیل دی کہ یہ ایکٹ تقریر اور تحریر پر پابندی لگاتے ہوئے پہلی ترمیم "کانگرس ایسا کوئی قانون پاس نہیں کرے گی جو تقریر اور پریس کی آزادی پر قدغن لگائے۔" کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ متفقہ تھا اور یہ اس کے مشہور حریت پسند ممبر "اولیور وینڈل ہومز" نے لکھا تھا۔ کیا شینک کو پہلی ترمیم کی وجہ سے تحفظ حاصل ہو سکا؟ ہومز نے لکھا:

> آزادی گفتار کا تحفظ ایسے شخص کو تحفظ فراہم نہیں کرتا جو ایک تھیٹر میں آگ آگ! کا جھوٹا شور مچا کر خوف و ہراس پیدا کرتا ہے..... ہر ایسے معاملے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا استعمال کئے گئے الفاظ ایسے حالات میں اور اس نوعیت کے استعمال کئے گئے ہیں جو واضح اور حقیقی خطرے کو جنم دینے کا باعث بنتے ہیں اور ایسی بنیادی برائیوں کو پیدا کرنے کی وجہ بنتے ہیں جن کو روکنے کا کانگریس کو حق حاصل ہے۔

ہومز کی منطق واضح اور دلکش تھی۔ کوئی بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ آزادی گفتار ایسے شخص پر لاگو ہو سکتی ہے جو تھیٹر میں آگ آگ کا شور مچا کر خوف و ہراس پیدا کرتا ہے۔ لیکن کیا یہ مثال جنگ پر تنقید کے حوالے سے کوئی جواز رکھتی ہے؟ کیا جنگ اپنی ذات میں ایک واضح اور موجود خطرہ نہیں ہے؟ حقیقت میں اس کے خلاف کسی بھی دلیل سے زیادہ واضح، زیادہ موجود اور زندگی کے لیے زیادہ خطرناک ہے۔

یوجین ڈبس کا کیس بھی جلد ہی سپریم کورٹ کے سامنے آیا۔ جون 1918ء میں ڈبس نے تین سوشلسٹوں سے ملاقات کی جو فوج میں زبردستی بھرتی کی مخالفت کرنے پر جیل میں تھے۔ پھر اس نے جیل سے باہر ایک سڑک پر عوام سے خطاب کیا اور دو گھنٹے تک سامعین کو مبہوت کئے رکھا۔ وہ بہترین مقرر تھا اور

گا ہے گا ہے اس کی آواز سامعین کے قہقہوں اور تالیوں کی گونج میں ڈوب جاتی تھی۔

وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم ایک عظیم آزاد جمہوریہ میں رہ رہے ہیں، یہ کہ ہمارے ادارے جمہوری ہیں اور یہ کہ ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم ہیں.... یہ ایک بہت بڑے مذاق کے علاوہ کچھ نہیں....

پوری انسانی تاریخ میں جنگیں فتوحات اور لوٹ مار کے لیے لڑی گئیں.... اور یہ جنگ کی ایک مختصر تعریف ہے۔ حکمران طبقہ ہمیشہ جنگیں مسلط کرتا ہے اور محکوم طبقہ ہمیشہ یہ جنگیں لڑتا ہے....

ڈبس کو ایسپیونج کی خلاف ورزی پر گرفتار کر لیا گیا اس کے سامعین میں فوج میں بھرتی کی عمر کے نوجوان موجود تھے اور اس کے الفاظ بھرتی کے راستے میں رکاوٹ ڈال سکتے تھے۔

اس کے الفاظ اس سے بھی بڑھ کر کچھ کر سکتے تھے:

جی ہاں! جلد ہی ہم اس قوم میں اور پوری دنیا میں اقتدار میں آنے والے ہیں.... ہم انسانوں کو غلامی اور ذلت میں دھکیلنے والے تمام سرمایہ دارانہ ادارے ختم کر دیں گے، اور ان کو آزاد اور انسانیت دوست اداروں میں تبدیل کر دیں گے.... سوشلزم کا سورج طلوع ہو رہا ہے.... مناسب وقت میں اس عظیم مقصد کی کامیابی کا گھنٹہ بجنے والا ہے.... جو تمام محنت کش طبقے کی آزادی اور تمام انسانوں میں بھائی چارے کا اعلان کرے گا (دیر تک گونج دار تالیوں کا شور)۔

ڈبس نے اپنے مقدمے کے دوران اپنا دفاع کرنے سے یا اپنی طرف سے گواہ پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے جو کہا تھا کسی بھی بات سے انکار نہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ جیوری اپنا غور و خوض شروع کرے اس نے کہا:

مجھ پر جنگ میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ جناب عالی! میں جنگ سے نفرت کرتا ہوں۔ خواہ میں تنہا بھی کھڑا ہوں میں جنگ کی مخالفت کروں گا.... مجھے ہر جگہ تکالیف برداشت کرتے اور جدوجہد کرتے ہوئے لوگوں سے ہمدردی ہے اس بات کا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس قوم میں پیدا ہوئے ہیں اور کہاں رہ رہے ہیں۔

جیوری نے اسے "ایسپیونج ایکٹ" کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا۔ ڈبس نے فیصلہ سنانے سے پہلے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

عزت مآب! سالوں پہلے میں نے ہر زندہ ہستی کے ساتھ اپنا گہرا تعلق محسوس کیا تھا۔ اور میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں اس زمین کی گھٹیا ترین مخلوق سے ایک ذرہ بھر بھی بہتر

نہیں ہوں۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ جب تک یہاں ادنیٰ طبقہ موجود ہے، میں اس میں سے ہوں؛ جب تک یہاں مجرمانہ عنصر موجود ہے، میں اس کا حصہ ہوں؛ جب تک جیل میں ایک بھی ذی روح موجود ہے، میں آزاد نہیں ہوں۔

جج نے ان لوگوں کی مذمت کی "جو اپنی قوم کے ہاتھ سے تلوار چھینتے ہیں جب کہ وہ ایک بیرونی اور ظالم قوت کے خلاف اپنا دفاع کر رہی ہو۔" اس نے ڈبس کو دس سال قید کی سزا سنائی۔

1919ء تک سپریم کورٹ نے ڈبس کی اپیل کی سماعت نہ کی۔ جنگ ختم ہو گئی۔ اولیور وینڈل ہومز نے متفقہ عدالت میں ڈبس کے جرم کی تصدیق کی، ہومز نے کہا ڈبس کی تقریر کا مفہوم یہ تھا کہ "محنت کش طبقے کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے" ہومز کے مطابق اس طرح ڈبس کی تقریر کے فطری اور تفہیمی اثرات فوجی بھرتی میں رکاوٹ کا باعث بنے تھے۔

صدر ولسن نے ڈبس کو معاف کرنے سے انکار کر دیا جو تیس ماہ سے جیل میں تھا۔ 1921ء میں چھیاسٹھ سال کی عمر میں اسے صدر وارن ہارڈنگ نے رہائی دلائی۔

"ایسپیونج ایکٹ" کے تحت 900 افراد جیل میں گئے۔ پریس نے بھی جنگ کے ممکنہ مخالفین کے لیے خوف کے ماحول میں شدت پیدا کرتے ہوئے حکومت کی مدد کی۔ "لٹریری ڈائجسٹ" نے اپنے قارئین سے کہا اگر کوئی ایسا ادارتی مقالہ ان کی نظر سے گزرے جو باغیانہ تاثر پیدا کرتا ہو اس کا تراشہ ہمیں بھجوائیں۔ نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریے میں لکھا: "یہ ہر اچھے شہری کا فرض ہے۔ بغاوت کی کوئی بھی شہادت جو ان کے علم میں آئے وہ ذمہ دار حکام تک پہنچائیں۔"

1917ء کے موسم گرما میں "امریکن ڈیفنس سوسائٹی" تشکیل دی گئی۔

"نیویارک ہیرالڈ" نے رپورٹ دی کہ "کل امریکن ڈیفنس سوسائٹی کے دفتر میں سو سے زائد افراد نے اپنے نام نگران گشت پارٹی میں درج کروائے ہیں۔ یہ نگران گشت پارٹی گلی محلوں میں باغیانہ تقاریر کی روک تھام کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔"

"ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس" نے ایک "امریکن پروٹیکٹو لیگ" کی کفالت اپنے ذمہ لی؛ جس کی جون 1917ء تک چھ سو شہروں اور قصبوں میں یونٹس قائم ہو چکی تھیں اور اس کے ممبران کی تعداد 100,000 کے قریب تھی۔ پریس رپورٹ کے مطابق اس کے ممبران علاقے کے بااثر افراد تھے جن میں بینکار، ریلوے اور ہوٹلوں کے لوگ شامل تھے۔ لیگ خطوط کو راستے میں اڑا لیتی تھی، گھروں اور دفاتر میں گھس جاتی تھی اور اس نے غداری کے تین ملین واقعات کا سراغ لگایا۔

"کریلز کمیٹی آن پبلک انفرمیشن" نے اشتہار دیا کہ "عوام کو ایسے اشخاص کے بارے میں جو مایوسانہ افواہیں پھیلاتے ہیں" ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس" میں رپورٹ کرنی چاہیے۔ 1918ء میں اٹارنی

جنرل نے کہا" یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک کی تاریخ میں اس سے زیادہ عوامی نگرانی کبھی نہیں کی گئی۔"

اتنی بڑی کوششیں کیوں کی جارہی تھیں؟ یکم اگست 1917ء کو "نیو یارک ہیرالڈ" نے لکھا کہ نیو یارک شہر میں پہلے بھرتی ہونے والے سو افراد میں سے نوے افراد نے استثنا کی درخواست دی ہے۔ منی سوٹا میں "مینیا پولس جرنل" میں ۶، اور ۲۱ اگست کی سرخیاں تھیں: "زبردستی قومی بھرتی کی مخالفت ریاستوں میں تیزی سے پھیل رہی ہے" اور "زبردستی بھرتی کیے جانے والوں نے اپنے پتے غلط دیے ہیں۔" فلوریڈا میں دو کھیت مزدور شاٹ گن لے کر جنگل میں گئے اور فوجی بھرتی سے بچنے کے لیے اپنے اعضا اڑا دیے۔ ایک نے اپنے ہاتھ کی چار انگلیاں اڑا دیں اور دوسرے نے کہنی سے نیچے اپنا ہاتھ اڑا دیا۔

جورجیا کے سینیٹر "تھامس ہارڈوک" نے کہا: "زبردستی فوجی بھرتی کے قانون کے نفاذ کے خلاف بلا شبہ کئی ہزار لوگوں کی جانب سے عمومی اور وسیع مخالفت پائی جاتی ہے۔ ریاست کے ہر حصے میں ہونے والے بڑے بڑے عوامی جلسوں میں اس کے خلاف احتجاج کیا گیا....." یہاں 330,000 افراد زبردستی بھرتی سے بچ نکلنے کی کوششوں کے مرتکب پائے گئے۔

اوکلاہاما میں سوشلسٹ پارٹی اور آئی ڈبلیو ڈبلیو مزارعین اور بٹائی پر کھیتی باڑی کرنے والوں میں متحرک رہ چکی تھیں جنھوں نے "ورکنگ کلاس یونین" تشکیل دی۔ زبردستی فوج میں بھرتی کے معترضین نے پورے ملک میں واشنگٹن کی جانب مارچ کا پروگرام تشکیل دیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ یونین اپنے منصوبے پر عمل کر پاتی اس کے ممبران کو گھیر لیا گیا اور گرفتار کر لیا گیا اور فوراً ہی 450 افراد پر بغاوت کا الزام لگا کر ریاست کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ لیڈروں کو ۱۰ سال قید کی سزا سنائی گئی اور دوسرے افراد کو ساٹھ دن سے دو سال تک کی سزا دی گئی۔

یکم جولائی 1917ء کو بوسٹن میں انقلابیوں نے جنگ کے خلاف ایک جلوس نکالا جس میں لوگوں نے بینرز اٹھا رکھے تھے:

کیا یہ عوام کی جنگ ہے؟ پھر زبردستی بھرتی کیوں؟
پانامہ کو کس نے لوٹا؟ بیٹی کو کس نے کچلا؟
ہم امن کا مطالبہ کرتے ہیں۔

نیو یارک کے جریدے "کال" کے مطابق آٹھ ہزار افراد نے مارچ میں شرکت کی جن میں 1000 سنٹرل لیبر یونین کے ممبرز، 2000 "لیٹش سوشلسٹ آرگنائزیشنز" کے ممبر، 1500 لیتھوانینز، چغہ سازی کے کاروبار سے وابستہ یہودی اور پارٹی کی دوسری شاخوں کے افراد شامل تھے۔ جلوس پر سپاہیوں اور بحریہ کے فوجیوں نے اپنے آفیسروں کے حکم پر حملہ کر دیا۔

پوسٹ آفس نے ان اخبارات اور رسائل کو دی گئی ڈاک کی رعایت واپس لینا شروع کر دی جو

جنگ کے خلاف مضامین شائع کرتے تھے۔ سیاست، ادب اور آرٹ پر مشتمل ایک سوشلسٹ میگزین "ماسز" کی ڈاک پر پابندی لگا دی گئی۔ اس میں 1917ء کے موسم گرما میں "میکس ایسٹ مین" نے ایک اداریہ تحریر کیا تھا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ اس نے لکھا: "کس مخصوص مقصد کی خاطر تم ہمارے جسموں کو اور ہمارے بیٹوں کے جسموں کو یورپ بھجوا رہے ہو؟ جہاں تک میرا تعلق ہے میں حکومت کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ مجھے ایک ایسی جنگ کے لیے زبردستی بھرتی کرے جس کے مقصد کو میں تسلیم نہیں کرتا۔"

لاس اینجلز میں ایک فلم دکھائی گئی تھی جس میں امریکی انقلاب اور آباد کاروں کے خلاف برطانوی ظلم و ستم دکھائے گئے تھے۔ اس کا نام "دی سپرٹ آف 76" تھا جس آدمی نے یہ فلم بنائی تھی اس کو "ایسپیونج ایکٹ" کے تحت دس سال قید کی سزا دی گئی، جج نے کہا تھا "فلم میں ہمارے اتحادی برطانیہ کی نیک نیتی پر سوال اٹھایا گیا ہے۔" اس مقدمے کو سرکاری طور پر "یو ایس بنام سپرٹ آف 76" کا نام دیا گیا۔ سکولوں اور یونیورسٹیوں نے جنگ کی مخالفت کی حوصلہ شکنی کی، کولمبیا یونیورسٹی میں ایک ماہر نفسیات "جے میک کین کیٹل" کو جو کہ یونیورسٹی پر بورڈ آف ٹرسٹی کے کنٹرول کا شدید ناقد اور جنگ کا مخالف تھا یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد احتجاج کے طور پر مشہور تاریخ دان "چارلس بیرڈ" نے کولمبیا کے تدریسی عملے سے استعفیٰ دے دیا۔

کانگریس میں بھی چند آوازیں جنگ کے خلاف اٹھیں۔ ایوان نمائندگان میں پہلی خاتون "جینٹ رینکن" نے جب اعلان جنگ پر حاضری کے دوران اس کا نام پکارا گیا تو کوئی جواب نہ دیا۔ دوسری حاضری پر وہ کھڑی ہو گئی اور اس نے کہا: "میں اپنے ملک کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتی ہوں" لیکن میں جنگ کے لیے ووٹ نہیں دے سکتی' میرا ووٹ نفی میں ہے۔ اس دور کا ایک مقبول گیت Didn't Raise My Boy to be a Soldier 'تھا تاہم یہ بعد میں آنے والے گیتوں مثلاً Over There; It's a Grand Old Flag اور Johnny Get Your Gun کے سامنے ماند پڑ گیا۔

سوشلسٹ "کیٹ رچرڈز او ہیئر" کو میسوری ریاست کی جیل میں پانچ سال کی قید کی سزا دی گئی۔ جیل میں اس نے لڑنا جاری رکھا۔ جب اس نے اور اس کے ساتھی قیدیوں نے تازہ ہوا کی عدم موجودگی پر احتجاج کیا، کیونکہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں بلاک میں اوپر کھڑکی کو بند رکھا جاتا تھا: تو اسے پہرے داروں نے سزا دینے کے لیے کھینچ کر باہر راہداری میں نکالا تو اس کے ہاتھ میں نظموں کی ایک کتاب پکڑ رکھی تھی جیسے ہی اسے باہر کھینچا گیا اس نے کتاب اوپر کھڑکی کی جانب پھینکی جس نے کھڑکی کے شیشے کو توڑ دیا، تازہ ہوا بہتی ہوئی اندر آئی، اس کی ساتھی قیدیوں نے خوشی سے نعرے لگائے اور تالیاں بجائیں۔

ایما گولڈ مین اور اس کے ساتھی انارکسٹ الیگزینڈر برک مین کو زبردستی بھرتی کی مخالفت کے جرم میں قید کی سزا سنائی گئی۔ اس نے جیوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "حقیقت میں جب ہم خود

جمہوریت میں اس قدر غریب ہیں ہم یہ دنیا کو کیسے دے سکتے ہیں۔''

آئی ڈبلیو ڈبلیو کے اخبار ''انڈسٹریل ورکرز'' نے اعلان جنگ سے کچھ دن پہلے لکھا تھا: ''امریکہ کے سرمایہ دارو! ہم تمہارے خلاف لڑیں گے، تمہارے لیے نہیں۔'' اب جنگ نے حکومت کو انقلابی یونین تباہ کرنے کا موقع دے دیا تھا۔

ستمبر 1917ء کے اوائل میں ''ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس کے ایجنٹوں نے پورے ملک میں آئی ڈبلیو ڈبلیو کے چوراسی میٹنگ ہالز پر چھاپے مارے اور ایسے خطوط، لٹریچر اور دیگر تحریری مواد قبضے میں لے لیا جو عدالت میں ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے، اپریل 1918ء میں آئی ڈبلیو ڈبلیو کے 101 افراد پر فوجی بھرتی میں رخنہ ڈالنے اور فوج سے فرار کی حوصلہ افزائی کے الزامات میں مقدمات چلائے گئے۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو کے ایک آدمی نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا:

> آپ نے سوال کیا ہے کہ آئی ڈبلیو ڈبلیو امریکہ کے ساتھ محب الوطن کیوں نہیں ہے۔ اگر آپ بے گھر ہوں اور آپ کے پاس اوڑھنے کو کمبل بھی نہ ہو۔ اگر آپ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر مغرب کی جانب کام کی تلاش میں نکلے ہوں اور اس وقت سے ان کا کوئی پتہ نہ چل رہا ہو، اگر آپ کی ملازمت آپ کو ایک جگہ اتنی دیر نہ رہنے دے کہ آپ ووٹ ڈالنے کے حقدار بن سکیں، اگر ہر وہ شخص جو نظم و ضبط اور قوم کی نمائندگی کر رہا ہو آپ کو مارے پیٹے، ٹرین میں بٹھا کر آپ کو جیل بھیج دے اور ''خدا کے نیک بندے'' تالیاں بجائیں اور انہیں اس پر عمل کرنے کو کہیں تو آپ کس طرح سے ایک آدمی سے محب الوطن ہونے کی توقع رکھتے ہیں؟ یہ جنگ کاروباری آدمی کی جنگ ہے اور ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم جائیں اور اس خوبصورت صورتحال کو جس سے ہم فیضیاب ہو رہے ہیں بچانے کے لیے اپنی جان دے دیں۔

جیوری نے ان تمام کو مجرم قرار دیا۔ جج نے ''ہے وڈ'' اور چودہ دوسرے افراد کو بیس سال قید کی سزا سنائی، تینتیس افراد کو دس سال کی قید اور باقی ماندہ افراد کو اس سے کم کی سزا سنائی۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو بکھر گئی ہے وڈ ضمانت کے دوران فرار ہو گیا اور روس پہنچ گیا جہاں وہ اپنی موت تک دس سال مقیم رہا۔

جنگ نومبر 1918ء میں ختم ہو گئی۔ پچاس ہزار امریکی فوجی مارے جا چکے تھے، اور پورے ملک میں تلخی کے احساس کے پھیلنے اور حب الوطنی کے طلسم کو ٹوٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جس کا پتا ہمیں جنگ کے بعد کے عشرے میں لکھے جانے والے ادب سے ملتا ہے۔ ارنسٹ ہیمنگوے نے ''فیئر ویل ٹو آرمز'' لکھا۔ چند سال بعد ایک کالج کے طالب علم، جس کا نام ''اِروِن شا'' تھا، نے ایک ڈرامہ ''بری دا ڈیڈ'' لکھا۔ اور ہالی ووڈ کے سکرین رائٹر ''ڈالٹن ٹرمبو'' نے ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا ناول ''جونی گاٹ ہز گن'' لکھا جو میدان جنگ میں ایک فوجی کے زندہ رہ جانے والے دھڑ اور دماغ کے بارے میں تھا۔

''فورڈ میڈوکس فورڈ نے ''نو مور پریڈز'' لکھا۔

دوران جنگ تمام قید و بند، دھمکیوں اور قومی اتحاد کی مہم کے باوجود جب جنگ ختم ہوئی تو اسٹیبلشمنٹ کو اب بھی سوشلزم کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ ملک میں موجود انقلابی چیلنج کی موجودگی میں دوبارہ اصلاح اور استبداد کی دہری حکمت عملی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اصلاح کے بارے میں ولسن کے دوستوں میں سے ایک دوست ''جارج ایل ریکورڈ'' نے تجویز پیش کی، جس نے 1919ء میں اسے لکھا کہ معاشی جمہوریت کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، تاکہ سوشلزم کے اس شر سے نمٹا جا سکے۔ اس نے کہا: ''تمہیں امریکہ میں موجود انقلابی قوتوں کا حقیقی لیڈر بن جانا چاہیے، اور ملک کو بنیادی، اصلاحات کا ایک تعمیری پروگرام پیش کرنا چاہیے، جو کہ سوشلسٹوں اور بالشویکوں کے پیش کردہ پروگرام کا ایک مؤثر نعم البدل ہو.....''

1919ء کے موسم گرما میں ولسن کے ایڈوائزر ''جوزف ٹملٹی'' نے اسے باور کروایا کہ ری پبلکن اور ڈیموکریٹس کے درمیان جھگڑا اس خطرے کے سامنے بالکل غیر اہم ہے جس کا دونوں پارٹیوں کو سامنا ہے۔ ''صنعتی اور معاشرتی بے چینی کے اس دور میں دونوں پارٹیاں ایک عام آدمی کی نظر میں بدنام ہیں۔''

1919ء کے اسی موسم گرما میں ولسن کے اٹارنی جنرل ''اے مچل پامر'' کے گھر کے سامنے ایک بم دھماکہ ہوا۔ چھ ماہ بعد پامر نے غیر ملکیوں (آبادکار جو شہری نہیں تھے) کے خلاف وسیع پیمانے پر چھاپے مارنے کا آغاز کیا۔ جنگ کے خاتمے کے قریب کانگریس نے ایک قانون پاس کیا جس کے مطابق ایسے غیر ملکیوں کو جو منظم حکومت کی مخالفت کرتے تھے یا جائیداد تباہ کرنے کی حمایت کرتے تھے ملک بدر کیا جا سکتا تھا۔ 21 دسمبر 1919ء کو پامر کے آدمیوں نے 249 غیر ملکیوں کو پکڑا جو روسی نژاد تھے (ان میں ایما گولڈ مین اور الیگزینڈر برک مین بھی شامل تھے) انہیں ایک بحری جہاز پر سوار کیا اور روس کی جانب روانہ کر دیا جو کہ اب ''سوویٹ روس'' تھا۔

جنوری 1920ء کو پورے ملک سے چار ہزار افراد کو گھیر کر پکڑا گیا، انہیں ایک لمبے عرصہ تک تنہائی میں رکھا گیا اور خفیہ سماعت کے بعد ملک بدر کر دیا گیا۔ بوسٹن میں ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس کے ایجنٹوں نے مقامی پولیس کی مدد سے میٹنگ ہالز پر یا علی الصبح گھروں میں چھاپے مار کر چھ سو افراد کو گرفتار کیا۔ انہیں جوڑوں کی صورت میں ہتھکڑیاں لگا کر زنجیروں سے باندھ کر گلیوں میں گھمایا گیا۔

1920ء ''انڈریا سالسیڈو'' نامی ایک ٹائپ سیٹر اور انارکسٹ کو نیو یارک میں ایف بی آئی کے ایجنٹوں نے گرفتار کیا، اور اسے آٹھ ہفتوں تک ''پارک رو بلڈنگ'' کی چودھویں منزل پر ایف بی آئی کے دفاتر میں رکھا گیا اور اسے خاندان، دوستوں یا وکلا سے ملاقات کی اجازت نہ دی گئی۔ پھر اس کا کچلا ہوا جسم بلڈنگ کے نیچے فٹ پاتھ پر پایا گیا۔ اور ایف بی آئی نے کہا کہ اس نے چودھویں منزل کی کھڑکی سے

چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی۔

''سالسیڈو'' کے بوسٹن میں دو دوستوں نے جو کہ انارکسٹ اور محنت کش تھے اس کی موت کا سنتے ہی اپنے پاس بندوقیں رکھنا شروع کر دیں، وہ میساچوسٹس، بروکٹن میں ایک ٹرام سے گرفتار ہوئے اور ان پر دو ہفتے قبل ایک جوتوں کی فیکٹری میں ہونے والی ڈکیتی اور قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ یہ نیکولا ساکو اور بارٹولومیو وینزیٹی تھے۔

ان پر مقدمہ چلا اور مجرم پائے گئے، انہوں نے سات سال جیل میں بسر کیے جب کہ ان کی اپیلیں چل رہی تھیں۔ اس دوران پورے ملک اور دنیا کے بیشتر افراد نے ان کے مقدمے میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ مقدمے کے ریکارڈ اور معروضی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ ساکو اور وینزیٹی کو انارکسٹ اور غیر ملکی ہونے کی بنا پر سزائے موت دی گئی۔ اگست 1927ء کو پولیس نے جلوسوں اور پکٹنگ کو گرفتاریوں اور مار پیٹ کے ذریعے ختم کیا اور فوج نے جیل کو گھیرے میں لیے رکھا جب کہ ان دونوں کو برقی کرسی کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا

ساکو کا اپنے بیٹے ''ڈانٹے'' کو آخری پیغام جو کہ اس نے بڑی مشکل سے سیکھی ہوئی انگلش میں لکھا، آنے والے سالوں میں لاکھوں افراد کے لیے ایک پیغام تھا:

> میرے بیٹے بجائے رونے پیٹنے کے مضبوط بنو، تا کہ اپنی ماں کو تسلی دے سکو.....اسے پرسکون دیہاتی علاقے میں لمبی سیر پر لے جانا، ادھر ادھر بکھرے ہوئے جنگلی پھول چننا.....لیکن میرے بیٹے ڈانٹے، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا زندگی میں آنے والی خوشیوں سے صرف تنہا خود ہی لطف اندوز نہ ہونا، ظلم ستم کے شکار لوگوں کو یاد رکھنا، کیونکہ یہ لوگ تمہارے حقیقی دوست ہیں.....زندگی کی جدوجہد میں تمہیں بہت سی خوشیاں اور محبت ملے گی، اور لوگ تم سے محبت کریں گے۔

ملک میں اصلاحات بھی ہوئیں۔ جنگ میں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا گیا۔ عدالتیں اور جیلیں اس نظریے کو تقویت دینے کے لیے استعمال کی گئیں کہ مخصوص نظریات اور مخصوص قسم کی مزاحمت کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اب بھی سزا یافتہ لوگوں کی کال کوٹھڑیوں سے یہ پیغام آ رہا تھا کہ امریکہ میں جسے غیر طبقاتی معاشرہ خیال کیا جاتا ہے اب بھی طبقاتی جنگ جاری تھی۔ بیس اور تیس کے عشرے میں یہ ابھی بھی جاری تھی۔

مشکل وقت میں اپنی مدد آپ

جنگ کو ختم ہوتے کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ فروری 1919ء میں آئی ڈبلیو ڈبلیو کی اعلیٰ قیادت جیل میں بند تھی، لیکن اس کی عام ہڑتال کی تجویز نے حقیقت کا روپ دھار لیا، اور واشنگٹن کے شہر سیاٹل میں 100,000 کارکنوں کے ہڑتال پر چلے جانے سے پانچ دن تک شہر میں کاروبار زندگی مکمل طور پر معطل ہو کر رہ گیا۔

اس کا آغاز بندرگاہ کی گودی پر کام کرنے والے کارکنوں کی ہڑتال سے ہوا، جو کہ اپنے معاوضے میں اضافے کا مطالبہ کر رہے تھے، انہوں نے سیاٹل سنٹرل لیبر کونسل سے حمایت کی اپیل کی، جس نے پورے شہر میں ہڑتال کی منظوری دے دی، اور دو ہفتوں میں ٹریڈ یونین کی ۱۱۰ برانچوں نے (جن میں زیادہ تر ''امریکن فیڈریشن آف لیبر'' چند آئی ڈبلیو ڈبلیو کی برانچیں شامل تھیں) ہڑتال کی حمایت میں فیصلہ دیا، ہڑتال میں شامل ہونے والی ٹریڈ یونین کی برانچ کے ورکروں نے ''جنرل سٹرائیک کمیٹی'' کے لیے اپنے تین ممبران کا انتخاب کیا اور ۶ فروری 1919ء صبح دس بجے ہڑتال شروع ہو گی۔

شہر میں تمام کاروبار ٹھپ ہو گیا سوائے ان سرگرمیوں کے جو ہڑتالیوں نے ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے جاری رکھیں، آگ بجھانے والے عملے نے اپنی ڈیوٹی پر موجود رہنے کا فیصلہ کیا۔ لانڈری کے کارکنوں نے صرف ہسپتال کی لانڈری کا کام جاری رکھا۔ صرف وہ گاڑیاں چل رہی تھیں جن کے اوپر لکھا ہوا تھا، ''سنٹرل سٹرائیک کمیٹی'' سے استثنا یافتہ'' علاقے میں پینتیس دودھ کے مراکز قائم کیے گئے۔

امن قائم رکھنے کے لیے ایک ''لیبر وار ویٹرنز گارڈ'' قائم کی گئی۔ اس کے ایک ہیڈ کوارٹر کے بلیک بورڈ پر لکھا ہوا تھا: ''اس تنظیم کا مقصد طاقت کے استعمال کے بغیر نظم وضبط کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کے کسی بھی رضا کار کے پاس پولیس کے اختیارات نہیں ہوں گے یا انہیں کسی بھی قسم کا اسلحہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہو گی، صرف ترغیب اور تبلیغ سے کام لیا جائے گا۔'' ہڑتال کے دوران شہر میں جرائم کی شرح میں بہت کمی آ گئی۔

میئر نے چوبیس سو مخصوص نمائندگان سے حلف لیا' جن میں سے زیادہ تر یونیورسٹی آف واشنگٹن کے طالب علم تھے۔ امریکی حکومت نے تقریباً ایک ہزار بحریہ کے جوانوں کو شہر میں بھجوایا عام ہڑتال پانچ دنوں بعد ختم ہوئی ''جنرل سٹرائیک کمیٹی'' کے مطابق اس کی وجہ مختلف یونینوں کے بین الاقوامی آفیسرز کا دباؤ اور اس کے ساتھ

ساتھ بند شہر میں زندگی بسر کرنے کی مشکلات تھیں۔

ہڑتال پر امن رہی تھی۔ لیکن جب یہ ختم ہوئی تو سوشلسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹرز اور پرنٹنگ مشینوں پر چھاپے مارے گئے اور گرفتاریاں کی گئیں۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو کے اکتالیس افراد کو انارکی کے رنگ لیڈرز قرار دے کر قید کر دیا گیا۔

عام ہڑتال پر اور وبلیز (آئی ڈبلیو ڈبلیو کے ارکان) کے منظم ہونے پر ایسا عمل کیوں دکھایا گیا؟ سیاٹل کے میئر کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ ہڑتال سے خوفزدہ نہیں تھی بلکہ اس بات سے خوفزدہ تھی جس کی یہ علامت تھی۔ اس نے کہا: "عام ہڑتال جس کا مظاہرہ سیاٹل میں کیا گیا، خود اپنی ذات میں انقلاب کا ایک ہتھیار تھی، یہ اس لیے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ یہ پرسکون تھی۔ کامیاب ہونے کی صورت میں یہ سب کچھ معطل کر کے رکھ دیتی، معاشرے کی زندگی کے دھارے کو روک دیتی..... کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکومت کو ناکارہ کر دیتی۔"

علاوہ ازیں سیاٹل کی عام ہڑتال جنگ کے بعد کی پوری دنیا میں اٹھنے والی بغاوت کے درمیان شروع ہوئی۔ "دی نیشن" کے ایک لکھاری نے اس سال کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

> موجودہ سال کا سب سے زیادہ غیر معمولی مظہر..... نچلے طبقے کے لوگوں کی بے نظیر بغاوت ہے۔
>
> روس میں اس نے زار کو تخت سے اتار پھینکا ہے.....کوریا، ہندوستان، مصر اور آئرلینڈ میں اس نے سیاسی جور و استبداد کے خلاف ایک ناقابل شکست مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ انگلینڈ میں یہ ریلوے ہڑتال کا موجب بنی۔ نیو یارک میں گودی کے مزدوروں نے ہڑتال کی اور لوگ یونین عہدے داروں کی حکم عدولی کرتے ہوئے ہڑتال پر رہے، اور پرنٹنگ کے کاروبار میں بھی بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی، جسے بین الاقوامی آفیسرز بھی، اگرچہ آجرین بھی ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کر رہے تھے، کنٹرول کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔
>
> عام آدمی..... پرانی لیڈر شپ پر اعتماد کھوتے ہوئے، خود اعتمادی کی جانب نئی رسائی حاصل کر چکا ہے۔

1919ء میں 3,50,000 سٹیل انڈسٹری کے کارکن ہڑتال پر چلے گئے، نیو انگلینڈ اور نیو جرسی میں 1,20,000 ٹیکسٹائل کارکنوں نے ہڑتال کر دی، اور نیو جرسی کے قصبے پیٹرسن میں ریشم کا کام کرنے والے 30,000 افراد نے ہڑتال کر دی۔ بوسٹن میں پولیس نے ہڑتال کر دی، اور نیو یارک شہر میں سگریٹ بنانے والوں، ٹرک چلانے والوں، اور حجاموں نے ہڑتال کر دی۔ پریس نے شکاگو میں "موسم گرما کے وسط کی شدید گرمی کے دوران مزید ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کی" اطلاع دی۔ انٹرنیشنل ہارویسٹ کے پانچ ہزار شہری کارکن گلیوں میں آ گئے۔

جب تیسرے عشرے کا آغاز ہوا تو صورتحال کنٹرول میں نظر آتی تھی۔ آئی ڈبلیو ڈبلیو تباہ کر دی گئی تھی، سوشلسٹ پارٹی بکھر رہی تھی۔ ہڑتالیوں کو طاقت کے استعمال سے دبا دیا گیا تھا اور معیشت ترقی کر رہی تھی جس کی وجہ سے کافی لوگوں کو اتنا کچھ مل رہا تھا کہ وہ بغاوت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

کانگریس نے تیسرے عشرے میں آبادکاروں کے خطرناک سیلاب (جو کہ 1900ء اور 1920ء کے درمیان 14 ملین تھے) کو روکنے کے لیے آبادکاروں کا کوٹا مقرر کرنے کا قانون پاس کیا۔ کوٹے میں اینگلو سیکسن کو ترجیح دی گئی تھی، سیاہ فام اور زرد فام لوگوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، اور لاطینیوں، سلاو اور یہودیوں کا آنا بہت زیادہ محدود کر دیا گیا تھا۔ کوئی بھی افریقی ملک سو سے زیادہ افراد نہیں بھیج سکتا تھا، جبکہ چین کے لیے بھی ایک سو کی حد مقرر کی گئی تھی۔

1920ء کے عشرے میں "کوکلکس کلین" کو دوبارہ احیاء دیا گیا اور یہ شمال میں پھیل گئے۔ 1924 تک اس کے 4.5 ملین ممبر تھے۔ این اے اے سی پی (نیشنل ایسوی ایشن فار دا ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپل) ہر جگہ پر موجود اجتماعی تشدد اور نسلی منافرت کے سامنے بے بس نظر آتی تھی۔ 1920ء کے عشرے میں "مارکس گاروے" کی زیر قیادت قومی تحریک کا مرکزی خیال یہ تھا کہ سفید فام امریکہ میں سیاہ فاموں کا کبھی بھی برابری کی سطح پر تسلیم کیا جانا امر محال ہے۔ اس نے سیاہ فام تفاخر اور نسلی علیحدگی کی تبلیغ کی اور واپس افریقہ چلا گیا، جو کہ اس کے نزدیک سیاہ فاموں کے اتحاد اور بقا کی واحد امید تھی۔ لیکن گاروے کی تحریک جنگ کے بعد کے عشروں میں سفید فام برتری کے طاقتور دھاروں کے سامنے اپنا راستہ نہ بنا سکی، اگرچہ کچھ سیاہ فاموں میں اس نے نئے جوش و جذبے کو جنم دیا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تیسرا عشرہ خوشحالی اور فن (جاز کا دور) کے حوالے سے ایک شاندار دور تھا۔ بے روزگاری جو کہ 1921ء میں 4,270,000 تک پہنچ چکی تھی 1927 تک دو ملین سے تھوڑی اوپر رہ گئی تھی۔ کارکنوں کے معاوضوں میں عمومی اضافہ ہوا تھا۔ کچھ کسانوں نے بہت زیادہ دولت بنائی۔ 40 فی صد خاندان جو 2000 ڈالر سالانہ سے زیادہ کما رہے تھے اب آسانی کے ساتھ نئے آلات مثلاً، گاڑیاں، ریڈیو، ریفریجریٹرز خرید سکتے تھے۔ لاکھوں لوگ اچھی گزر بسر کر رہے تھے۔ ان کی تعداد کم از کم اتنی ضرور تھی کہ ان کی موجودگی میں دوسرے لوگ جو یا تو بے روزگار تھے یا پھر بنیادی ضروریات زندگی کے حصول کے لیے مناسب آمدنیاں حاصل نہیں کر پا رہے تھے پس منظر میں چلے گئے تھے۔ ان میں مزارعت پر کھیتی باڑی کرنے والے اور بڑے شہروں میں رہنے والے سیاہ فام اور نوآباد خاندان شامل تھے۔

لیکن دولت اور خوش حالی کا اصل ارتکاز بالائی طبقے میں تھا۔ ایک فی صد پر مشتمل بالائی طبقہ کے خاندانوں کے دسویں حصہ کی آمدنی نچلے طبقے کے 42 فی صد خاندانوں کے برابر تھی۔ 1920ء کے عشرے میں تقریباً 25,000 کارکن اپنے کام کے دوران مارے گئے تھے اور 100,000 مستقل معذور ہو گئے تھے۔ نیو یارک میں بیس

لاکھ افراد ایسے اپارٹمنٹوں میں رہائش پذیر تھے جنہیں آتش زنی کے پھندے کہا جاتا تھا۔

سینکلیر لیوئس نے اپنے ناول "بابٹ Babbitt "میں اس دور کی خوشحالی کے جھوٹے احساس اور نئے آلات کی سطحی خوشیوں کو موضوع بنایا تھا۔

آخر کار ایک لمبی جدوجہد کے بعد خواتین نے 1920ء میں انیسویں ترمیم کے پاس ہونے کے ساتھ ووٹ کا حق حاصل کر لیا۔ لیکن ووٹ دینا اب بھی متوسط اور بالائی طبقے کی سرگرمی تھی اور یہ خواتین بھی تقلید کا شکار ہو کر دوسرے ووٹروں کی طرح پارٹی کی صف بندیوں میں بٹی ہوئی تھیں۔

تیسرے عشرے کے غریبوں کے بارے میں بہت کم سیاستدانوں نے بات کی، ان میں سے ایک "فیوریلو، لاگارڈیا" تھا، جو کہ غریب آبادکاروں کے علاقے "ایسٹ ہارلم" سے منتخب ہونے والا کانگریس کا رکن تھا (جو کہ عجیب طور پر سوشلسٹس اور ری پبلکن دونوں کے ٹکٹوں پر الیکشن لڑ کر آیا تھا)۔ اپنے حلقہ کے لوگوں کے بے شمار خطوط وصول کرنے پر "لاگارڈیا" نے گوشت کی بہت زیادہ قیمت کے بارے میں وزیرِ زراعت کو لکھا اور جواباً اسے ایک کتابچہ موصول ہوا کہ گوشت کے استعمال میں کس طرح کفایت سے کام لیا جائے۔ لاگارڈیا نے دوبارہ لکھا: "میں نے مدد کی درخواست کی تھی اور آپ نے ایک کتابچہ ارسال کر دیا ہے..... آپ کا کتابچہ.....اس بڑے شہر کے فلیٹوں میں رہنے والوں کے لیے کسی کام کا نہیں..... ہمیں گوشت پر منافع اندوزی کرنے والوں کے خلاف آپ کے محکمہ کی مدد درکار ہے، جو کہ اس شہر کے محنت کشوں کو مناسب غذا کے حصول سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔"

ہارڈنگ اور کولیج کی صدارتوں کے دوران بیس کے عشرے میں وزیرِ خزانہ "اینڈریو میلون" تھا جس کا شمار امریکہ کے امیر ترین افراد میں ہوتا تھا۔ 1923ء میں کانگریس کو "میلون پلان" پیش کیا گیا جو کہ بادی النظر میں "انکم ٹیکس" میں عمومی کمی کا بل نظر آتا تھا، سوائے اس کے کہ بالائی آمدنی والے حلقوں کو 50 فی صد سے 25 صد چھوٹ دی گئی اور نچلی آمدنی والے حلقوں کو 4 سے 3 فی صد چھوٹ دی گئی تھی۔

چند کانگریس ارکان نے جو محنت کشوں کے علاقوں سے منتخب ہو کر آئے تھے بل کے خلاف آواز اٹھائی، جیسا کہ میساچوسٹس کے "ولیم پی کونری" نے کہا "میلون ٹیکس بل کی اس شق کے مطالعے کے بعد جس سے خود میلون کو اس کے انکم ٹیکس میں 800,000 ڈالر کی بچت ہو گی اور اس کے بھائی کو 600,000 ڈالر کی، میں اس بل کی حمایت میں ووٹ نہیں دے سکتا۔"

"میلون پلان" پاس ہو گیا۔ 1928ء میں لاگارڈیا نے نیویارک کے غریب ترین علاقوں کا دورہ کیا اور کہا: "میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے حقیقت میں جو کچھ دیکھا اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مکمل طور پر ناقابلِ یقین نظر آتا ہے کہ غربت کے ایسے حالات حقیقت میں موجود ہو سکتے ہیں۔"

تیسرے عشرے کی خوشحالی کے بارے میں عام خبروں کے انبار میں ہمیں گاہے گاہے تلخ مزدور جدوجہد کی کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ 1922ء میں کوئلے کے کان کنوں اور ریلوے کے کارکنوں نے ہڑتال کر دی اس سال جزیرہ

رہوڈ میں طبقاتی احساس نے جنم لیا اور کچھ ہڑتالیوں نے انقلابی تحریکوں میں شمولیت اختیار کر لی۔

جنگ کے بعد سوشلسٹ پارٹی کے کمزور ہونے کے ساتھ ایک کیمونسٹ پارٹی تشکیل دی گئی اور کیمونسٹ بہت سی مزدور جدوجہدوں میں شریک رہے۔ انہوں نے اس عظیم ٹیکسٹائل ہڑتال میں اہم کردار ادا کیا جو 1929ء میں پورے شمالی اور جنوبی کیرولینا اور ٹینی سی میں پھیل گئی تھی۔ یونینوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مل مالکان جنوب کی سمت نکل گئے جہاں انہیں غریب سفید فاموں میں زیادہ تابعدار کارکن میسر تھے۔ لیکن ان کارکنوں نے کام کے زیادہ گھنٹوں اور کم معاوضوں کیخلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے خاص طور پر بغیر وقفے کے لگاتار کام پر ناراضگی کا اظہار کیا۔

شمالی کیرولینا کے شہر "گاسٹونیا" میں کارکنوں نے ایک نئی یونین "نیشنل ٹیکسٹائل ورکرز یونین" میں شمولیت اختیار کر لی جس کی قیادت کیمونسٹ کر رہے تھے، جس کے دروازے سیاہ فاموں اور سفید فاموں دونوں کے لیے کھلے تھے۔ جب ان میں سے کچھ کو ملازمتوں میں نکال دیا گیا تو دو ہزار کارکنوں میں سے نصف کارکنوں نے ہڑتال کر دی۔ کیمونسٹ مخالف اور نسل پرستی کے ایک نئے ماحول نے جنم لیا اور تشدد شروع ہو گیا۔ جنوبی کیرولینا میں ٹیکسٹائل ہڑتالیں پھیلنا شروع ہو گئیں۔

ایک ایک کر کے تمام ہڑتالیں تھوڑے بہت فوائد حاصل کر کے ختم ہوئی چلی گئیں لیکن گاسٹونیا میں ہڑتال جاری رہی۔ یہاں خیمہ بستوں میں رہنے والے ٹیکسٹائل کارکنوں نے اپنی قیادت میں موجود کیمونسٹوں کی مذمت کرنے سے انکار کرتے ہوئے ہڑتال جاری رکھی۔ ہڑتال توڑنے والوں کو لایا گیا اور ملیں چلتی رہیں۔ غیظ و غضب میں اضافہ ہوا اور پولیس کے ساتھ شدید جھڑپیں ہوئیں۔

ایک تاریک رات میں بندوقوں کی جھڑپ میں پولیس کا چیف مارا گیا۔ بشمول ایک کیمونسٹ پارٹی ناظم "فریڈ بیل" کے سولہ ہڑتالیوں اور ہمدردوں پر قتل کا الزام لگایا گیا۔ آخر میں سات افراد پر مقدمہ چلا انہیں پانچ سے بیس سال کی قید سنائی گئی۔ وہ ضمانت پر رہا ہو گئے اور ریاست سے نکل گئے، کیمونسٹ بھاگ کر سوویت روس چلے گئے، تاہم اس تمام تر ناکامیوں، مار کٹائی اور قتل و غارت کے بعد جنوب میں ٹیکسٹائل ٹریڈ یونین ازم کا آغاز ہو گیا۔

1929ء میں سٹاک مارکیٹ کا بیٹھ جانا، جو کہ امریکہ کی عظیم کساد بازاری کے آغاز کی علامت تھا، براہ راست اس اندھا دھند سٹہ بازی کا نتیجہ تھا جو اپنے ساتھ معیشت کو بھی لے ڈوبی۔ لیکن جیسا کہ "جان گال براتھ" نے اس عظیم کساد بازاری پر اپنے جائزے میں لکھا تھا اس سٹہ بازی کے پس پشت بنیادی طور پر بیمار معیشت کارفرما تھی۔ اس نے بہت زیادہ غیر صحت مند کارپوریٹ اور بینکنگ ڈھانچے، غیر مستحکم بیرونی تجارت، غلط معاشی اطلاعات، اور "آمدن کی غلط تقسیم" (معاشرے کے 5 فی صد بالاترین افراد نجی آمدن کے ایک تہائی حصے پر قابض تھے) کی نشاندہی کی تھی۔

ایک سوشلسٹ اس سے بھی آگے جاتے ہوئے کہے گا کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنی ذات میں غیر مستحکم ہوتا

ہے، یہ ایک ایسا نظام ہے جو منافع کے غالب محرک کے تحت کام کرتا ہے اس لیے یہ غیر مستحکم، نا قابل اعتبار اور انسانی ضروریات سے بے پرواہوتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر یہ بہت سے لوگوں کے لیے مستقل پریشانی کا باعث ہوتا ہے اور وقفے وقفے سے ہر ایک کے لیے بحران لے کر آتا ہے۔ سرمایہ داری، اپنی خود اصلاحی کوششوں، بہتر کنٹرول کے لیے اپنے انتظام کار کے باوجود 1929ء تک ایک بیمار اور نا قابل اعتبار نظام تھا۔

اس کساد بازاری کے بعد معیشت تباہ ہو چکی تھی اور بمشکل رینگ رہی تھی۔ پانچ ہزار سے زائد بنک بند ہو گئے تھے، اور بے شمار کاروبار خسارے میں جانے کی وجہ سے بند ہو گئے تھے۔ جو کاروبار جاری تھے انہوں نے بہت سے ملازمین کو فارغ کر دیا تھا، اور جو باقی رہ گئے تھے ان کے معاوضوں میں بار بار کمی کر رہے تھے۔ صنعتی پیداوار کم ہو کر 50فی صد رہ گئی تھی، اور 1933ء تک اندازاً 15 ملین (درست تعداد کا کسی کو علم نہیں) لوگ بے روزگار ہو چکے تھے جو کہ محنت کش طبقے کے ایک چوتھائی یا ایک تہائی کے برابر تھے۔

واضح طور پر، وہ لوگ جو معیشت کو منظم کرنے کے ذمہ دار تھے نہیں جانتے تھے کہ کیا ہو گیا ہے، وہ سخت حیران تھے، اسے تسلیم کرنے سے انکاری تھے اور نظام کی ناکامی کے بجائے دیگر وجوہات ڈھونڈ رہے تھے" ہربرٹ ہوور" نے اس معاشی تباہی سے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا: "ہم امریکہ میں آج غربت پر حتمی فتح حاصل کرنے کے قریب پہنچ چکے ہیں، جو کہ کسی بھی ملک کی تاریخ میں آج تک نہیں ہو سکا۔" ہنری فورڈ نے مارچ 1931ء میں کہا: "یہ بحران اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کیونکہ عام آدمی اپنا روزمرہ کا کام اس وقت تک انجام نہیں دیتا جب تک وہ پکڑا نہ جائے یا اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہ جائے۔ اگر لوگ کرنا چاہیں تو بہت سا کام موجود ہے۔" چند ہفتے بعد اس نے 75ہزار کارکنوں کو فارغ کر دیا۔

لاکھوں ٹن خوراک موجود تھی لیکن اس کی نقل وحمل اور فروخت منافع بخش نہیں تھی۔ گودام کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے لیکن لوگ انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ بہت زیادہ مکان تھے لیکن وہ خالی پڑے تھے کیونکہ لوگ کرایہ ادا نہیں کر سکتے تھے، انہیں نکال دیا گیا تھا اور اب کوڑے کے ڈھیروں پر فوری طور پر تشکیل پانے والے "ہوور ویلس" (جھونپڑیوں پر مشتمل بستیاں، جن کو صدر "ہوور" کی مناسبت یہ نام دیا گیا تھا) میں جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے۔

اخبارات میں شائع ہونے والے مختصر معاشرتی حقائق پورے معاشرے کی زبوں حالی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ 1932ء کے اوائل میں "نیویارک ٹائمز" میں شائع ہونے والی ایک کہانی کے مطابق:

> اپنے اپارٹمنٹ سے بے دخلی کے خلاف 15 جنوری تک حکم امتناعی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کے بعد، 46 بین کوک سٹریٹ، بروک لین کا رہائشی 48 سالہ سابقہ ٹھیکیدار پیٹر جے کارنل جو چھتیں ڈالنے کا کام کرتا تھا، اپنی بیوی کے بازوؤں میں گر کر دم توڑ گیا۔ وہ آج کل بے کار تھا اور پائی پائی کا محتاج تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی موت کی وجہ دل کی بیماری بتائی ہے جبکہ پولیس کے مطابق اس کی وجہ

> اپنے آپ اور اپنے خاندان کو سڑک پر آنے سے بچانے کے لیے دن بھر کی بے ثمر کوششوں کے نتیجے میں طاری ہونے والی شدید مایوسی تھی۔۔۔ کارنل کے ذمہ 5 ڈالر کرایہ کے بقاجات اور 39 ڈالر ایڈوانس کی رقم تھی، جو کہ اس کے مالک مکان نے طلب کی تھی۔ رقم کی ادائیگی میں ناکامی کی صورت میں خاندان کو گزشتہ کل جاری کردہ بے دخلی کے احکامات کے تحت ہفتے کے اختتام تک مکان خالی کرنا تھا۔ کہیں سے بھی کسی قسم کی مدد حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد اسے آج "ہوم ریلیف بیورو" نے بتایا تھا کہ اس کے پاس 15 جنوری تک اس کی مدد کرنے کے لیے کوئی فنڈز موجود نہیں ہیں۔

سٹریٹ 113' ایسٹ ہارلم کے ایک اپارٹمنٹ کے رہائشی نے واشنگٹن میں کانگریس کے رکن "لاگارڈیا" کو لکھا:

> میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری حالت بہت خراب ہے۔ میں حکومت سے پنشن لیتا تھا جو کہ بند کر دی گئی ہے۔ تقریباً سات ماہ سے میں بے روزگار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔۔۔۔ میرے چار بچے ہیں جنہیں کپڑوں اور خوراک کی ضرورت ہے۔۔۔۔ میری بیٹی جو آٹھ سال کی ہے بہت زیادہ بیمار ہے اور صحت یاب نہیں ہو رہی۔ میرا دو ماہ کا کرایہ واجب الادا ہے، اور مجھے خوف ہے کہ ہمیں گھر سے نکال دیا جائے گا۔

اوکلاہاما میں کسانوں کی زمینیں نیلام ہو رہی تھیں، ان کے کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ اور ٹریکٹر آ رہے تھے اور قبضہ کر رہے تھے۔ جان سٹین بیک، کساد بازاری سے متعلق اپنے ناول "دا گریپس آف ریتھ" میں اس وقت کے حالات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "بے دخل کیے گئے، اور نقل مکانی کرنے والے افراد کا کیلیفورنیا میں ایک سیلاب آ گیا تھا جن کی تعداد ڈھائی لاکھ اور تین لاکھ تھی۔ ان کے پیچھے نئے ٹریکٹرز زمینوں پر جا رہے تھے اور مزارعین کو نکالا جا رہا تھا۔ بے دخل کیے گئے بے گھر افراد کے نئے ریلے تیار ہو رہے تھے جو کہ جوش و جذبے سے بھرے ہوئے اور خطرناک تھے۔"

یہ لوگ جیسا کہ "سٹین بیک" نے کہا تھا خطرناک ہو رہے تھے۔ بغاوت کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ پورے ملک میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں اخبارات کی رپورٹوں سے اصل صورتحال کا پتہ چلتا ہے،

> انگلینڈ، ارکنساس، 3 جنوری 1931ء: 500 کسانوں نے جن میں زیادہ تر سفید فام اور اکثر مسلح تھے شہر کے کاروباری علاقے میں جلوس نکالا۔۔۔۔ وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کھانے پینے کی اشیاء کے حصول کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔ حملہ آوروں نے اعلان کیا کہ اگر انہیں کسی اور ذریعے سے مفت خوراک مہیا نہ کی گئی تو وہ سٹوروں سے لوٹ لیں گے۔

> ڈیٹرائٹ' 9 جولائی 1931ء: شہر کے "لاجنگ ہاؤس" سے فنڈز کی کمی کی وجہ سے نکالے گئے 500 بے روزگار افراد کی "کیڈلک سکوائر" میں ہنگامے کی کوشش کو ریزرو پولیس نے ابتداہی میں دبا

دیا۔

انڈیانا ہاربر، انڈیانا، 5 اگست 1932ء: پندرہ سو بے روزگار افراد نے "فروٹ گروورز ایکسپریس کمپنی" کے پلانٹ پر دھاوا بول دیا، وہ فاقہ کشی سے بچنے کے لیے ملازمتوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کمپنی نے پولیس کو طلب کر لیا جس نے ڈنڈوں سے مار پیٹ کر بے روزگاروں کو وہاں سے بھگا دیا۔

شکاگو، یکم اپریل 1932ء: پانچ سو سکول کے بچوں نے جن کے چہرے اترے ہوئے تھے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے، شہر کے مرکزی حصے میں "بورڈ آف ایجوکیشن" کے دفاتر کے سامنے مظاہرہ کیا ان کا مطالبہ تھا کہ سکول میں انہیں خوراک بھی مہیا کی جائے۔

بوسٹن، 3 جون 1932ء: پچیس بھوکے بچوں نے دوپہر کے بفے (کھانے) پر حملہ کر دیا جو کہ بوسٹن پریڈ کے دوران، جنگ میں حصہ لینے والے ہسپانویوں کے لیے لگایا گیا تھا۔ ان کو بھگانے کے لیے پولیس کی دو گاڑیاں بلائی گئیں۔

نیویارک، 21 جنوری 1933ء: کئی سو بے روزگار افراد نے "یونین سکوائر" کے قریب ایک ریستوران کا گھیراؤ کر لیا، وہ مفت میں کھانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

سیاٹل 16 فروری 1933ء: "کاؤنٹی سٹی بلڈنگ" جس پر بے روزگاروں کی پانچ ہزار کے قریب فوج نے قبضہ کر رکھا تھا، کا دو دن سے کیا گیا محاصرہ آج رات ختم ہو گیا ڈپٹی شیرف اور پولیس نے تقریباً دو گھنٹوں کی کوشش کے بعد مظاہرین کو بے دخل کر دیا۔

پہلی عالمی جنگ کے فوجیوں کے غم و غصے کا اظہار، جو اب بے روزگار تھے اور ان کے خاندان بھوکے تھے، 1932ء کے موسم بہار اور گرمیوں میں واشنگٹن میں ایک "بونس آرمی" کے جلوس کی صورت میں ہوا۔ جنگ کے ان فوجیوں کے پاس حکومت کے بونس سرٹیفکیٹس تھے جو کہ آنے والے سالوں میں ادا کئے جانے تھے، جبکہ ان کا مطالبہ تھا کانگریس ان کی ادائیگی ابھی کرے جبکہ پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ لہٰذا وہ پورے ملک سے واشنگٹن میں بیویوں، بچوں، کے ساتھ اور تنہا جمع ہونا شروع ہو گئے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی پرانی گاڑیوں میں، مال گاڑیوں پر چھپ چھپا کر اور پیدل چلتے ہوئے پہنچے۔

پچیس ہزار سے زائد فوجی آئے۔ زیادہ تر نے دارالحکومت سے پوٹومیک دریا کے پار اینا کوسٹیا فلیٹس پر قیام کیا، جیسا کہ "جان ڈوس پاسوس" نے لکھا: "لوگ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں سو رہے ہیں جو کہ پرانی اخباروں، کارڈ بورڈ کے ڈبوں، پیکنگ کریٹوں، پرٹین کے ٹکڑوں یا تارکول والے کاغذوں سے چھتیں ڈال کر بنائی گئی تھیں....."

صدر "ہوور" نے انہیں وہاں سے نکالنے کا حکم دیا۔ گھڑ سوار فوج کے چار دستے، انفنٹری کی چار یونٹیں، ایک مشین گن سکواڈرن اور چار ٹینک "وائٹ ہاؤس" کے قریب جمع ہوئے۔ جنرل ڈگلس میک آرتھر اس مہم

کا انچارج اور میجر ڈیوئٹ آئزن ہاور اس کا مددگار تھا۔ "جارج ایس پیٹن" آفیسرز میں سے ایک تھا۔ میک آرتھر فوجیوں کو لے کر "پنسلوانیا ایونیو" پہنچا، پرانی عمارات سے فوجیوں کو باہر نکالنے کے لیے اس نے آنسو گیس استعمال کی اور عمارات کو آگ لگا دی۔

پھر فوج اینا کوسٹیا کے پل سے پار چلی گئی۔ جیسے ہی فضا میں آنسو گیس پھیلی جنگ کے سابقہ فوجیوں کی بیویاں اور بچے بھاگنا شروع ہو گئے فوجیوں نے چند جھونپڑیوں کو آگ لگا دی اور جلد ہی پورا کیمپ آگ کی لپیٹ میں تھا۔ اس کے نتیجے میں دو سابقہ فوجی مارے گئے ایک گیارہ ہفتے کا بچہ بھی مر گیا۔ ایک آٹھ سال کا بچہ آنسو گیس کی وجہ سے جزوی اندھا ہو گیا۔ دو پولیس والوں کے سر کی ہڈیاں ٹوٹیں اور تقریباً ایک ہزار سابقہ فوجی گیس کی وجہ سے زخمی ہوئے۔

عوامی مشکلات، مدد کے لیے حکومت کی بے عملی، سابقہ فوجیوں کو منتشر کرنے کے لیے حکومتی کارروائی...... ان سب چیزوں نے نومبر 1932ء کے انتخابات پر گہرا اثر ڈالا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے "فرینکلن ڈی روز ویلٹ" نے ہربرٹ ہوور کو بھاری اکثریت سے شکست دی اور 1933ء کے موسم بہار میں اقتدار سنبھال لیا۔ اور ایک اصلاحی قانون سازی کے پروگرام کا آغاز کیا جو "نیو ڈیل" کے نام سے مشہور ہوا۔ جب اس کے ابتدائی دنوں میں واشنگٹن میں ایک سابقہ فوجیوں کا چھوٹا سا جلوس نکلا تو اس نے اس کا استقبال کیا اور انہیں کافی پیش کی، انہوں نے اس کے ایک مشیر سے بات چیت کی اور گھروں کو چلے گئے۔

روز ویلٹ کی اصلاحات گزشتہ قانون سازی سے بہت آگے چلی گئیں تھیں۔ ضرورتمند افراد کی مدد کرتے ہوئے انہیں دو واشد ضروریات کو بھی پورا کرنا تھا: جس میں سب سے پہلے سرمایہ داری کو از سر نو اس طرح سے منظم کرنا تھا، کہ یہ بحرانوں پر قابو پا سکے اور نظام کو مستحکم کر سکے، اور خودرو بغاوت میں تشویشناک اضافے کو روکنا تھا، جو کہ مزارعین اور بے روزگاروں کے منظم ہونے، اپنی مدد آپ کرنے کی تحریکوں، کئی شہروں میں عمومی ہڑتالوں کی صورت میں روز ویلٹ انتظامیہ کے ابتدائی ایام میں سر ابھار رہی تھی۔

پہلے ہدف یعنی نظام کو خود اس کے تحفظ کی خاطر مستحکم کرنے کے لیے روز ویلٹ نے اپنے اقتدار کے ابتدائی مہینوں میں "نیشنل ریکوری ایڈمنسٹریشن" (این آر اے) کا ادارہ نیشنل انڈسٹریل ریکوری ایکٹ کے تحت قائم کیا۔ اس کا مقصد قوانین کے ایک سلسلے کے ذریعے جس پر انتظامیہ، محنت کش اور حکومت تینوں متفق ہوں، معیشت پر کنٹرول حاصل کرنا اشیاء کی قیمتیں اور کارکنوں کے معاوضوں کا تعین اور مقابلے کو محدود رکھنا تھا۔ این آر اے میں بڑے صنعتکاروں اور کاروباری افراد کا تسلط تھا اور ان کے مفادات کا ہی تحفظ کرتی تھی۔ لیکن جہاں منظم محنت کش طاقتور تھے، این آر اے نے محنت کش لوگوں کو بھی کچھ مراعات دیں۔

این آر اے دو سال تک کام کرتی رہی پھر سپریم کورٹ نے یہ کہتے ہوئے کہ این آر اے صدر کے اختیارات میں بہت زیادہ اضافہ کر رہی ہے اسے غیر آئینی قرار دے دیا۔

نئی انتظامیہ کے ابتدائی مہینوں میں اے اے اے (ایگری کلچرل ایڈجسٹمنٹ ایڈمنسٹریشن) کا بل بھی پاس ہوا، جس کا مقصد زراعت کو منظم کرنا تھا۔ اس نے بھی بڑے جاگیرداروں کو فائدہ پہنچایا جیسا کہ آر این اے نے بڑے کاروباری افراد کو فائدہ پہنچایا تھا۔

ٹی وی اے (ٹینی سی ویلی اتھارٹی) کے قیام کے ساتھ حکومت کاروبار کی دنیا میں داخل ہو گئی، جو کہ ٹینی سی کی وادی میں حکومتی ملکیت کے تحت سیلابوں کو کنٹرول کرنے اور برقی قوت پیدا کرنے کے لیے ڈیموں اور پن بجلی پیدا کرنے والے پلانٹس پر مشتمل ایک نیٹ ورک تھا۔ اس نے بے روزگاروں کو روزگار مہیا کیا اور صارفین کو کم شرح پر بجلی مہیا کرنے میں مدد دی اور کسی حد تک سوشلسٹ طرز فکر کا غماز بھی تھا۔

لیکن اس طرح سے معیشت کی از سر نو تنظیم کا اہم ترین مقصد معیشت کو مستحکم کرنا اور دوسرا نچلے طبقے کی اس حد تک مدد کرنا تھا کہ ان کی بغاوت حقیقی انقلاب کی جانب نہ بڑھ جائے۔

جب روز ویلٹ نے صدارت سنبھالی اس وقت بغاوت حقیقی طور پر موجود تھی۔ ہر طرف سے مایوس لوگ اب حکومت کی مدد کا انتظار نہیں کر رہے تھے وہ براہ راست کارروائی کرتے ہوئے اپنی مدد خود کر رہے تھے۔ پورے ملک میں لوگ مکانوں سے بے دخلی کے خلاف خود بخود منظم ہو گئے تھے۔ نیو یارک، شکاگو اور دوسرے شہروں میں جیسے ہی یہ بات نکلتی کہ کسی کو گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہے، ایک ہجوم وہاں جمع ہو جاتا تھا۔ پولیس گھر کا سامان نکال کر باہر گلی میں رکھ دیتی، ہجوم سامان دوبارہ گھر میں رکھ دیتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی شہروں میں کارکنوں کے اتحادی گروپس منظم کرنے میں سرگرم تھی۔ "مسز ویلی جیفریز" ایک سیاہ فام خاتون نے سٹڈز ٹرکل" کو بے دخلی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا:

بہت سے لوگوں کو گھروں سے نکالا گیا۔ وہ بیلف لے کر آتے ہیں اور مکینوں کو سامان کے باہر نکال دیتے ہیں، اور جیسے ہی واپس جاتے ہیں، ہم انہیں واپس وہیں پہنچا دیتے ہیں، مرد بجلی کے کنکشن بحال کر دیتے ہیں اور ہارڈ ویئر سٹور سے پائپ لا کر چولہے دوبارہ فٹ کر دیتے ہیں۔ فرنیچر وغیرہ واپس اپنی جگہوں پر رکھ دیا جاتا ہے اور یہ نظر نہیں آتا کہ آپ کو باہر نکال دیا گیا تھا۔

پورے ملک میں بے روزگار کونسلو تشکیل دی گئیں تھیں، ایک صحافی ان کو یوں بیان کیا:

یہ کوئی راز نہیں ہے کہ اکثر شہروں میں کمیونسٹوں نے بے روزگار کونسلیں قائم کی ہیں اور عام طور پر ان کی قیادت کرتے ہیں، لیکن یہ کونسلیں جمہوری طور پر منظم کی گئی ہیں، اور ان پر اکثریت کی حکومت ہے.... کونسلوں کا ہتھیار جمہوریت کی عددی قوت ہے، اور ان کے فرائض میں غریب اور بے سہارا لوگوں کی بے دخلی کو روکنا اور اگر بے دخل کر دیا گیا ہو تو "ریلیف کمیشن" پر نئے گھر کے لیے دباؤ ڈالنا، اگر کسی بے روزگار کا گیس یا پانی کا کنکشن عدم ادائیگی کی وجہ سے منقطع کر دیا گیا ہو تو متعلقہ حکام سے مل کر بحال کروانا، اس بات کا دھیان کرنا کہ بے روزگار افراد جن کے پاس جوتے نہیں یا

لباس نہیں دونوں چیزیں اسے مہیا کرنا، معاونت کے معاملات میں سیاہ فاموں اور سفید فاموں اور غیر ممالک میں پیدا ہونے والوں کے درمیان امتیازات کو اشتہار بازی یا دباؤ کے ذریعے ختم کروانا،.... لوگوں کو ریلیف ہیڈ کوارٹرز تک جلوس کی شکل میں لے کر جانا اور ان کے لیے خوراک اور لباس کا مطالبہ کرنا شامل تھا۔ اور آخر میں بے روزگار افراد کو، جو جلوسوں، پریڈوں اور یونین کے اجلاس میں شرکت کے جرم میں گرفتار کیے گئے تھے، قانونی معاونت مہیا کرنا ہے۔

لوگ اپنی مدد آپ کے لیے اس وقت منظم ہوئے جب 1931ء اور 1932ء میں تجارتی ادارے اور حکومت ان کی مدد نہیں کر رہی تھی۔ "سیاٹل" میں ماہی گیروں کی یونین مچھلیاں پکڑتی اور ان لوگوں سے ان کا تبادلہ کرتیں جو پھل اور سبزیاں توڑتے تھے اور جو لکڑی کاٹتے تھے وہ ان کا تبادلہ کرتے۔ 1932ء کے آخر تک سینتیس ریاستوں میں اپنی مدد آپ کے لیے قائم کی گئی تنظیموں کی تعداد 330 تھی۔ جن کے ممبران کی تعداد 300,000 سے زائد تھی۔ 1933ء کے اوائل میں یہ سب ناکام ہوتی نظر آتی تھیں، وہ ایک ایسی معیشت میں جو خود لڑکھڑا رہی تھی ایک بہت بڑا کام کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شاید اپنی مدد آپ کی سب سے زیادہ شاندار مثال پنسلوانیا کے کوئلے کے علاقے میں دیکھنے میں آئی، جہاں بے روزگار کارکنوں نے کمپنی کے ملکیتی علاقے میں چھوٹی چھوٹی کانیں کھودیں، کوئلہ نکالا ٹرکوں میں لاد کر شہروں میں بھیجا اور کم قیمت پر فروخت کرنا شروع کر دیا۔ 1934ء تک غیر قانونی طور پر بیچے جانے والا یہ کوئلہ پچیس ہزار آدمی نکال رہے تھے اور اس کی ترسیل کے لیے چار ہزار گاڑیاں استعمال کی جا رہی تھی۔ جب ان لوگوں کو سزا دینے کی کوشش کی گئی تو مقامی عدالتوں نے ان کو مجرم نہ ٹھہرایا، اور مقامی جیلروں نے انہیں بند کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ سادہ کارروائیاں تھیں جو عملی ضروریات کے تحت کی گئیں، لیکن ان میں انقلابی امکانات موجود تھے۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے براہ راست کارروائی کرتے ہوئے محنت کش طبقہ بغیر اس کا ذکر کیے ایک پرزور طبقاتی شعور کا اظہار کر رہا تھا۔

کیا نئے نظام کو متعارف کروانے والے، روز ویلٹ اور اس کے مشیر، اس کے حمایتی کاروباری افراد بھی طبقاتی احساس رکھتے تھے؟ کیا وہ 1933ء اور 1934ء میں یہ سمجھتے تھے کہ کارکنوں کو اس نتیجے پر پہنچنے سے روکنے کے لیے کہ اپنے مسائل انہیں خود ہی حل کرنا ہوں گے، ان لوگوں کو ملازمتیں، کھانے پینے کی اشیاء اور امداد دینا ہو گی؟ شاید کارکنوں کے طبقاتی شعور کی طرح ان کارروائیوں نے بھی کسی تسلیم شدہ نظریے سے نہیں بلکہ فطری عملی ضرورت سے جنم لیا تھا۔

یہ ایسا شعور ہو سکتا تھا جس نے 1934ء کے اوائل میں مزدوروں کے اختلافات کو حل کرنے کے لیے کانگریس میں قانون سازی کا بل متعارف کروانے پر مجبور کیا۔ بل میں یونین کے نمائندگان کے لیے انتخاب، اور مزدوروں کے مسائل اور شکایات دور کرنے کے لیے ایک بورڈ کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ کیا یہ مکمل طور پر

ایسی قانون سازی نہیں تھی، جو اس خیال کو رد کر سکتی کہ کارکنوں کے مسائل صرف خود کارکن ہی حل کر سکتے ہیں؟ بڑے کاروباری افراد اسے مزدوروں کے بہت زیادہ مددگار خیال کرتے تھے اور اس کے مخالف تھے روزویلٹ بھی اس معاملے میں زیادہ پر جوش نہیں تھا۔ لیکن 1934ء میں ہونے والے مزدوروں کے ہنگاموں کے سلسلے نے اس بارے میں قانون سازی کی ضرورت کو مزید نمایاں کر دیا۔

1934ء میں مختلف صنعتوں میں 1.5 لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ اسی سال بہار اور موسم گرما میں نچلے طبقے کی اپنی یونین کی قیادت اور بحری جہازوں کے مالکان کے خلاف بغاوت کے دوران گودی کے مزدوروں نے ایک جلسہ کیا اور شیپ اپ (صبح سویرے لگنے والی مزدوروں کی منڈی جس میں سے روزانہ کی بنیاد پر کام کرنے والے مزدوروں کا انتخاب کر لیا جاتا تھا) کے خاتمے کا مطالبہ کیا اور ہڑتال پر چلے گئے۔

بحر الکاہل کی دو ہزار میل ساحل فوری طور پر مکمل بند ہو گئی۔ ٹرک ڈرائیوروں نے بھی تعاون کرتے ہوئے سامان گودی کے پیلٹ فارم تک لے جانے سے انکار کر دیا، بحری جہاز پر کام کرنے والے کارکن بھی ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ جب پولیس گودیاں کھولنے کے لیے آئی تو سب نے مل کر مزاحمت کی اور دو آدمی پولیس کی گولیوں سے مر گئے۔ ہڑتالیوں کے ایک بہت بڑی ماتمی جلوس نے لاکھوں مزید حمایتی پیدا کر دیے۔ پھر سان فرانسسکو میں عام ہڑتال کا اعلان ہوا اور 30,000 کارکنوں کی ہڑتال سے شہر کی زندگی جامد ہو کر رہ گئی۔

پانچ سو افراد پر مشتمل سپیشل پولیس بھرتی کی گئی اور انفنٹری، مشین گن، ٹینک، اور توپ خانہ کی یونٹوں پر مشتمل پینتالیس سو نیشنل گارڈز کی فوج تیار کی گئی۔ "لاس اینجلز ٹائمز" نے لکھا:

> سان فرانسسکو کی صورتحال کو "عام ہڑتال" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں حقیقت میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بغاوت کی شروعات ہیں یہ حکومت کے خلاف انقلاب کی تیاریاں ہیں، جس کی باگ ڈور کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں اس وقت صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اس بغاوت کو کسی بھی ضروری طاقت کے ذریعہ دبا دیا جائے۔

دباؤ بڑا شدید ہو گیا۔ فوج بھی وہاں موجود تھی۔ اے ایف ایل بھی ہڑتال کے خاتمے کے لیے دباؤ ڈال رہی تھی۔ گودی کے کارکنوں نے مصالحتی معاہدے کو تسلیم کر لیا، لیکن انہوں نے عام ہڑتال کی قوت کو ضرور واضح کر دیا۔

1934ء میں اسی موسم سرما میں "منیاپولس" میں ٹرک ڈرائیوروں کی ہڑتال کے نتیجے میں جسے دوسرے محنت کش لوگوں کی حمایت حاصل تھی شہر میں سوائے دودھ، برف اور کوئلے کے ٹرکوں کے جسے ہڑتالیوں نے چھوٹ دے رکھی تھی، کوئی چیز بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔ کاشتکار اپنی اشیاء خود شہر میں لے کر آتے تھے اور براہ راست لوگوں کے آگے بیچتے تھے۔ پولیس نے حملہ کر دیا اور دو ہڑتالی مر گئے۔ ان کے جنازے میں پچاس ہزار لوگوں نے شرکت کی، وہاں ایک بہت بڑا احتجاجی جلسہ ہوا اور جلوس کی صورت میں سٹی ہال تک آئے۔ ایک ماہ بعد مالکان نے

ٹرک ڈرائیوروں کے مطالبات تسلیم کر لیے۔

اسی سال 1934ء کے موسم خزاں میں سب سے بڑی ہڑتال ہوئی جبکہ جنوب میں 325,000 ٹیکسٹائل کارکنوں نے اس میں حصہ لیا۔ وہ ملوں سے باہر نکل آئے اور ٹرکوں اور گاڑیوں میں متحرک سکواڈرن قائم کیے جو ہڑتالی علاقوں میں پکٹنگ، گارڈز کے ساتھ ہاتھا پائی، ملوں میں داخل ہو کر مشینوں کے بیلٹ اتارتے پھر رہے تھے۔ یہاں بھی دوسری جگہوں کی طرح ہڑتال کی تحریک نے نچلے طبقے کی جانب سے یونین کی بالائی قیادت کے خلاف جنم لیا تھا۔ "نیویارک ٹائمز" نے کہا: "اس صورتحال میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ یہ معاملہ قیادت کے ہاتھوں سے مکمل طور پر نکل سکتا ہے۔"

دوبارہ حکومتی مشینری حرکت میں آئی۔ ساؤتھ کیرولینا میں پولیس آفیسرز اور ہڑتال توڑنے والے مسلح اشخاص نے پکٹس پر گولیاں چلائیں جس کے نتیجے میں سات آدمی مر گئے دوسرے بیس افراد زخمی ہو گئے۔ لیکن ہڑتال نیو انگلینڈ کی جانب پھیل رہی تھی۔ میساچوسٹس کے شہر "لووِل" میں پچیس سو ٹیکسٹائل کارکنوں نے ہنگامہ کیا، رہوڈ کے شہر "سیلس ویلی" میں پانچ ہزار افراد پر مشتمل ہجوم نے ریاست کی فوج سے، جو مشین گنوں سے مسلح تھی، مقابلہ کیا اور ٹیکسٹائل مل کو بند کر دیا۔ جزیرہ رہوڈ میں "وون ساکٹ" میں دو ہزار آدمی اٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ نیشنل گارڈ نے ایک شخص کو گولیاں چلا کر مار ڈالا تھا، انہوں نے شہر میں طوفان مچا دیا اور مل بند کر دی۔

18 ستمبر تک پورے ملک میں 421,000 ٹیکسٹائل کارکن ہڑتال پر تھے۔ وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں، ناظمین کو مارا پیٹا گیا اور مرنے والوں کی تعداد تیرہ تک پہنچ گئی۔ اب روزویلٹ خود آگے آیا، ایک ثالثی بورڈ قائم کیا اور یونین نے ہڑتال ختم کا حکم دیا۔

جنوب کے دیہاتی علاقے میں لوگوں نے منظم ہونا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کو تحریک دینے والے زیادہ تر کمیونسٹ تھے، لیکن اس کو ان سفید فام اور سیاہ فام لوگوں نے مزید تقویت دی جو مزارعت پر کھیتی باڑی کرتے تھے یا پھر کھیت مزدور تھے، انہیں ہمیشہ ہی معاشی مشکلات کا سامنا رہتا تھا، لیکن اب اس کساد بازاری کے دور میں ان کے مصائب دو چند ہو گئے تھے۔ آرکنساس میں "ساودرن ٹینیٹ فارمرز یونین" کا آغاز بٹائی پر کھیتی باڑی کرنے والے سیاہ فام اور سفید فام کاشتکاروں نے کیا اور یہ دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔

روزویلٹ کی "اے اے اے" غریب ترین کسانوں کی مدد نہیں کر رہی تھی، حقیقت میں یہ کسانوں کو کم کاشت کرنے پر اکساتی تھی، اس طرح مزارع اور بٹائی پر کاشت کرنے والے زمینیں چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ 1935ء میں 68 لاکھ کاشتکاروں میں سے 28 لاکھ مزارع تھے۔ بٹائی پر کاشت کرنے والوں کی اوسط سالانہ آمدنی 312 ڈالر تھی، کھیت مزدور جو ایک فارم سے دوسرے فارم پر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں نقل مکانی کرتے رہتے تھے، ان کی اپنی کوئی زمینیں نہیں تھیں، 1933ء میں وہ 300 ڈالر سالانہ کما رہے تھے۔

سیاہ فام کاشتکاروں کی حالت بہت زیادہ خراب تھی، اور کچھ ان اجنبیوں کی جانب راغب ہونے لگے

تھے جوان کے علاقہ میں کساد بازاری کے دوران نظر آنا شروع ہوئے تھے اور ان کو منظم ہونے کا مشورہ دیتے تھے۔ تیموذ ورروزن گارٹن کے لیے گئے ایک غیر معمولی انٹرویو میں "نیٹ شا" اس دور کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

کساد بازاری کے ان سالوں میں یہاں دیہاتی علاقے میں ایک یونین نے کام کرنا شروع کیا، جس کا نام "شیئر کروپر یونین" (بٹائی پر کاشتکاری کرنے والوں کی یونین) تھا، یہ ایک خوبصورت نام تھا، میں نے غور کیا اور سمجھ گیا کہ یہ جنوبی سفید فام اور سیاہ فام باشندوں کے لیے ایک بڑی تبدیلی کی بات ہے، یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کے بارے میں میں نے یہ بھی سنا کہ یہ غریب طبقے کے لوگوں کی تنظیم ہے۔ میں ایسی ہی تنظیم میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ میں اس کے بارے میں میں پورا علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"نیٹ شا" نے ایک سیاہ فام کاشتکار جو کہ اپنے قرضے ادا نہیں کر سکا تھا کی بے دخلی کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ:

ڈپٹی (پولیس آفیسر) نے کہا "میں آج صبح بوڑھے "ورجل جونز" کی ہر چیز پر قبضہ کرنے جا رہا ہوں۔"

میں نے اس سے التجا کی کہ وہ ایسا نہ کرے "اس طرح تم اسے بے دخل کر کے اس کے خاندان کے منہ سے نوالہ چھین رہے ہو۔"

نیٹ شا اپنے ساتھی کاشتکار جو اپنے قرضے ادا نہیں کر سکا تھا، کی بے دخلی کو روکنے کی کوشش میں گولی لگنے سے زخمی ہو گیا، پھر شا نے اپنی بندوق، اٹھائی اور جوابی فائرنگ کی۔ 1932ء کے اواخر میں، وہ گرفتار ہوا اور الباما کی جیل میں بارہ سال کی سزا کاٹی۔ اس کی کہانی اس بڑے استبدادی ڈرامے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جس میں سے "شیئر کروپر یونین" کے دور میں جنوب کے غریب عوام گزر رہے تھے۔

جورجیا کے دیہاتی علاقے سے تعلق رکھنے والا ایک سیاہ فام "ہوسیا ہڈسن" جو کہ دس سال کی عمر میں کھیتوں میں ہل چلاتا تھا اور بعد میں لوہے کے کارخانے میں کام کرنے لگا۔ 1931ء میں "سکاٹس بورو بوائز" کے کیس سے (نو سیاہ فام نوجوانوں پر دو سفید فام لڑکیوں کی عزت لوٹنے کا الزام لگا اور ایک جیوری نے جس میں تمام جج سفید فام تھے محض ایک کمزور سی شہادت پر انہیں مجرم قرار دے دیا) برانگیختہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سال اس نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی، اور 1932ء اور 1933ء میں اس نے برمنگھم میں بے روزگار سیاہ فاموں کو منظم کرنا شروع کیا۔ وہ اس دور کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

بلاک کمیٹیاں ہر ہفتے ملتی تھیں اور باقاعدہ اجلاس ہوتے تھے، ہم فلاحی پہلوؤں پر بات چیت کرتے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے آگہی کے لیے ہم "ڈیلی ورکرز" اور "ساوورن ورکرز" کا مطالعہ کرتے تھے، بے روزگاری سے نجات کے لیے کیا ہو رہا تھا، کلیولینڈ میں لوگ کیا کر رہے

تھے.... شکاگو میں ہونے والی جدوجہد.... یا پھر ہم "سکاٹس بورو" کیس کی تازہ ترین پیش رفت کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ لوگ ہمارے پاس آنا پسند کرتے تھے کیونکہ ہمارے پاس انہیں بتانے کے لیے ہمیشہ کوئی نئی بات ہوتی تھی۔

1934ء اور 1935ء میں سینکڑوں ہزار کارکن جو کہ "امریکن فیڈریشن آف لیبر" کی پوری طرح کنٹرول کی گئی مخصوص یونینز کے دائرہ کار سے باہر تھے، نئی کثیر پیداواری آٹو، ربڑ اور پیکنگ انڈسٹریز میں منظم ہونا شروع ہو گئے۔ اے ایف ایل ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ایک "کمیٹی فار انڈسٹریل آرگنائزیشن" قائم کی جس نے ان کارکنوں کو حرفتی صف بندیوں سے باہر ایک پلانٹ سے تعلق رکھنے والے کارکنوں کو ایک یونین میں منظم کرنا شروع کر دیا، یہ کمیٹی جس کی سربراہی "جان لیوئس" کے سپرد تھی اس سے علیحدہ ہو کر سی آئی او (کانگرس آف انڈسٹریل آرگنائزیشن) بن گئی۔

لیکن یہ کارکنوں کا سب سے نچلا طبقہ تھا جن کی ہڑتالوں اور بغاوتوں نے اے ایف ایل اور سی آئی او کی یونین قیادت کو حرکت میں آنے کو مجبور کیا۔ 30 کے عشرے کی ابتداء میں اوہایو کے شہر "ایکرن" میں ربڑ انڈسٹری کے کارکنوں نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی، یعنی "دھرنا ہڑتال" (کام چھوڑ کر وہیں بیٹھے رہنا) کا آغاز کیا۔

کارکن ہڑتال کی صورت میں کام چھوڑ کر باہر نکلنے کے بجائے وہیں پلانٹ میں بیٹھے رہتے اور اس کے بہت واضح فوائد تھے، وہ براہ راست ہڑتال توڑنے والوں کو کام کرنے سے روک سکتے تھے، انہیں یونین کے عہدیداروں کے ذریعے کارروائی نہیں کرنا پڑتی تھی بلکہ صورتحال پر ان کا براہ راست کنٹرول ہوتا تھا، انہیں سردی اور بارش میں باہر جلوس نہیں نکالنے پڑتے تھے، بلکہ چھت کے نیچے رہتے تھے۔ وہ اپنے کام، یا پکٹ لائن پر تنہا نہیں ہوتے تھے، وہ ہزاروں کی تعداد میں ایک چھت کے نیچے موجود ہوتے تھے، ایک دوسرے سے آزادانہ بات چیت کر سکتے تھے اور اجتماعیت کا احساس جاگزیں رہتا تھا۔

یہ طریقۂ کار 1936ء میں ہر جگہ پھیل گیا۔ اس سال دسمبر میں مشی گن کے شہر فلنٹ میں فشر باڈی پلانٹ نمبر 1 میں سب سے لمبی دھرنا ہڑتال کا آغاز ہوا۔ یہ اس وقت شروع ہوئی جب دو بھائیوں کو نکال دیا گیا اور یہ فروری 1937ء تک جاری رہی۔ چالیس دن تک وہاں دو ہزار ہڑتالیوں کی ایک دنیا آباد ہو گئی تھی۔ ایک ہڑتالی کے مطابق "یہ جنگ کی طرح تھی، میرے ساتھ جو لڑکے تھے وہ میرے گہرے دوست بن چکے تھے۔" کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھی جو تفریح، معلومات، کلاسوں، ڈاک کی خدمات اور صفائی وغیرہ کا بندوبست کرتی تھیں۔ عدالتیں قائم کر دی گئیں تھیں جو ان لوگوں کو سزائیں دیتی تھیں جو اپنی باری پر برتن دھونے سے انکار کرتے تھے، یا اِدھر اُدھر گند پھینکتے تھے یا ممنوع جگہوں پر سگریٹ نوشی کرتے تھے یا شراب وغیرہ لے کر آتے تھے۔ سزا کے طور پر زائد کام لیا جاتا تھا اور سب سے بڑی سزا پلانٹ سے اخراج تھا۔ سڑک کے پار ایک ریستوران ہڑتالیوں کے لیے تین وقت کا کھانا تیار کرتا تھا۔ پارلیمانی طریق کار، عوامی خطابات اور مزدور تحریک کی تاریخ پر کلاسیں لی جاتی تھیں۔ مشی گن

یونیورسٹی کے گریجوایٹ طالب علم صحافت اور تخلیقی انشا پردازی پر کورس کرواتے تھے۔

اس بارے میں امتناعی احکامات موجود تھے، لیکن پانچ ہزار مسلح کارکنوں کے ایک جلوس نے پلانٹ کو اپنے گھیرے میں لے لیا، اور حکم امتناعی کو لاگو کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ پولیس نے آنسو گیس کے گولوں سے حملہ کیا کارکنوں نے آگ بجھانے والے پائپوں سے جوابی کارروائی کی، تیرہ ہڑتالی گولیوں سے زخمی ہوئے لیکن پولیس کو واپس دھکیل دیا گیا۔ گورنر نے نیشنل گارڈ طلب کر لی۔ اس وقت تک ہڑتال جنرل موٹرز کے دوسرے پلانٹس تک پھیل چکی تھی۔ آخر کار سمجھوتا ہو گیا، چھ ماہ کا معاہدہ ہوا، جس میں بہت سے معاملات کو طے کیے بغیر چھوڑ دیا گیا، لیکن یہ تسلیم کر لیا گیا کہ آج کے بعد کمپنی افراد کے بجائے تمام معاملات یونین سے طے کرے گی۔

1936ء میں اڑتالیس "دھرنا ہڑتالیں" ہوئیں 1937ء میں 477 ہڑتالیں ہوئیں۔ ان میں سینٹ لوئیس کے الیکٹریکل کارکن، ٹینی سی کے شہر پلاسکی میں قمیصیں بنانے والے، کلوریڈو کے شہر "پیلیو بلو" میں جھاڑو اور برش بنانے والے، کونیکٹیکٹ کے شہر برج پورٹ میں کوڑا اٹھانے والے، نیو جرسی میں گورکن، "نیو یارک گلڈ فار دا جیوئش بلائنڈ" کے سترہ اندھے کارکن، ایلینائس کے اصلاحی جیل خانے کے قیدی شامل تھے اور ان سب سے بڑھ کر نیشنل گارڈ کمپنی کے تیس ممبر بھی شامل تھے جنہوں نے فشر باڈی دھرنا میں خدمات انجام دی تھیں اور اب وہ خود دھرنا مارنے والے تھے کیونکہ انہیں تنخواہیں ادا نہیں کی گئی تھیں۔

"دھرنے" نظام کے لیے خاص طور پر خطرناک تھے کیونکہ یہ معمول کی یونین قیادت کے کنٹرول میں نہیں تھے۔

مزدور ہنگاموں کے پیش نظر نظام کو مستحکم کرنے کے لیے "نیشنل لیبر ریلیشن بورڈ" کے قیام کے لیے "ویگنر ایکٹ 1935ء پاس کیا گیا۔ 1936ء، 1937ء، اور 1938ء کی ہڑتالوں کی لہر نے اس کی ضرورت میں مزید شدت پیدا کر دی۔ شکاگو میں 1937 کے "میموریل ڈے" (خانہ جنگی کے دوران مرنے والے فوجیوں کی یاد میں) پر "ریپبلک سٹیل" میں ایک ہڑتال پولیس کو باہر لے آئی، ہڑتالیوں کی بہت بڑی پکٹ لائن پر فائرنگ کرتے ہوئے ان میں سے دس کو مار ڈالا۔ پس مرگ معائنے سے ثابت ہوا کہ گولیاں کارکنوں کی پشت پر لگیں جیسا کہ وہ بھاگ رہے تھے، یہ میموریل ڈے کا قتل عام تھا۔ لیکن ریپبلک سٹیل اور اسی طرح فورڈ موٹر کمپنی، اور سٹیل کے دوسرے بڑے پلانٹس، آٹو موبائل، گوشت پیک کرنے کی اور الیکٹرک انڈسٹری کو منظم کیا گیا۔

ایک سٹیل کارپوریشن کی جانب سے ویگنر ایکٹ کو عدالت میں چیلنج کیا گیا، لیکن سپریم کورٹ نے اسے آئینی قرار دیتے ہوئے کہا کہ حکومت ریاستوں کے درمیان تجارت کو منظم کر سکتی ہے اور یہ کہ ہڑتالیں ریاستوں کے درمیان تجارت کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ٹریڈ یونینز کے نقطہ نظر کے مطابق نیا قانون یونین منظم کرنے میں معاون تھا۔ حکومتی نقطہ نظر کے مطابق یہ تجارت کے استحکام کے لیے معاون تھا۔

آجرین یونینز کو نہیں چاہتے تھے، لیکن ان کو کنٹرول کرنا زیادہ آسان تھا۔ نظام کو استحکام بخشنے کے لیے

اندھادھند ہڑتالوں، اور فیکٹریوں پر نچلے طبقہ کے کارکنوں کے قبضے کی نسبت زیادہ موزوں تھیں۔ 1937ء کے موسم بہار میں "نیو یارک ٹائمز" کے ایک مضمون کا عنوان تھا: "غیر قانونی دھرنوں کے خلاف سی آئی او یونینز کی جدوجہد"

اس طرح 30 کے عشرے کے وسط میں مزدوروں کی براہ راست کارروائی کو کنٹرول کرنے کے دو پیچیدہ طریقے وضع کیے گئے۔ اول: "نیشنل لیبر ریلیشن بورڈ" نے یونینز کو قانونی حیثیت عطا کی، ان کی بات سننا شروع کی اور ان کی مخصوص شکایات کو حل کرنا شروع کیا۔ اس طرح یہ مزدوروں کی توانائی کو انتخابات کی طرف موڑتے ہوئے ان کی بغاوت کی قوت کو اعتدال میں لا سکتی تھی، بالکل اس طرح جیسے آئینی نظام ممکنہ پریشان کن توانائی کو رائے دہی کی جانب موڑ دیتا ہے۔ "این ایل آر بی" معاشی کشمکش میں حدود کا تعین کر سکتی تھی جیسا کہ رائے دہی سیاسی کشمکش میں کرتی ہے۔ دوئم، کارکنوں کی تنظیم خود، یونین، حتیٰ کہ سی آئی او جیسی باغی اور جارح یونین بھی کارکنوں کی باغیانہ توانائی کا رخ معاہدات گفت و شنید، یونین میٹنگز کی طرف پھیر دیں گی، اور بڑی، با اثر اور باعزت تنظیمیں قائم کرنے کی خاطر ہڑتالوں کو کم سے کم کرنے کی کوششیں کریں گی۔

ان سالوں کی تاریخ رچرڈ کلوورڈ اور فرانسس پیون کی اس دلیل کی حمایت میں نظر آتی ہے۔ جو انہوں نے اپنی کتاب "پوئر پیپلز موومنٹ" (غریب لوگوں کی تحریک) میں دی تھی، کہ مزدوروں نے یونینز کے تسلیم کیے جانے یا ان کے مکمل طور پر منظم ہونے سے پہلے خود اپنے طور پر بغاوتوں کے ذریعے بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ "فیکٹری کارکن، عظیم کساد بازاری کے دوران یونینز میں منظم ہونے سے پہلے کے سالوں میں بہت زیادہ اثر رکھتے تھے اور انہوں نے حکومت سے کافی زیادہ مراعات حاصل کر لی تھیں۔ کساد بازاری کے دوران ان کی طاقت کی جڑیں تنظیم میں نہیں بلکہ انتشار میں تھیں۔

چالیس کے عشرے میں دوسری عالمی جنگ کے دوران یونین ممبر شپ میں بہت زیادہ اضافہ ہوا (1945ء میں سی آئی او اور اے ایف ایل دونوں میں سے ہر ایک کے 60 لاکھ سے زائد ممبر تھے) لیکن ان کی طاقت پہلے سے کم ہو چکی تھی۔ ہڑتالوں کے استعمال سے اس کی کامیابیاں کم ہوتی جا رہی تھیں۔ این ایل آر جی میں مقرر کیے گئے ممبران مزدوروں کے قدرے کم ہمدرد تھے، سپریم کورٹ نے دھرنا ہڑتالوں کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا، اور ریاستوں کی حکومتیں ہڑتالوں، پکٹنگ اور بائیکاٹوں کے خلاف رکاوٹیں ڈالنے کے قوانین پاس کر رہی تھیں۔

دوسری عالمی جنگ کی آمد نے پرانی مزدور بغاوت کو کمزور کر دیا کیونکہ جنگی معیشت نے زیادہ معاوضوں پر لاکھوں نئی ملازمتیں مہیا کر دی تھیں۔ "نیو ڈیل" بے روزگاری کو صرف ایک کروڑ تیس لاکھ سے نوے لاکھ تک کم کرنے میں کامیاب ہوئی تھی، یہ جنگ تھی جس نے تقریباً ہر آدمی کو کام پر لگا دیا تھا، جنگ نے اس کے علاوہ حب الوطنی، سمندر پار دشمن کے خلاف تمام طبقات میں اتحاد پیدا کیا اور کارپوریشنوں کے خلاف نفرت اور غصے کو متحرک کرنا مشکل بنا دیا۔ جنگ کے دوران سی آئی او اور اے ایف ایل نے ہڑتالوں کا اعلان نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

اس کے باوجود کارکنوں کی شکایات ایسی تھیں (جنگ کے دوران "کنٹرول" کا مطلب تھا کہ ان کے

معاوضے قیمتوں کی نسبت بہتر طور پر کنٹرول کیے جا رہے تھے) کہ انہوں نے بہت سی اندھادھند ہڑتالوں پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ 1944ء میں امریکہ کی تاریخ میں کسی بھی سال سے زیادہ ہڑتالیں ہوئیں۔

تیس اور چالیس کے عشرے امریکہ میں محنت کش طبقے کی دہری مشکل کو زیادہ واضح طور پر سامنے لے کر آئے۔ مزدوروں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے نظام نے کنٹرول کی نئی صورتوں سے استفادہ کیا، یعنی ان کی اپنی تنظیموں کے ذریعے اندرونی کنٹرول، اور قانون اور طاقت کے ذریعے بیرونی کنٹرول، دونوں کا استعمال کیا گیا۔ لیکن ان نئے کنٹرولز کے ساتھ نئی مراعات بھی آئیں، ان مراعات نے بنیادی مسائل حل نہ کیے اور بہت سے لوگوں کے لیے انہوں نے کچھ بھی حل نہ کیا۔ لیکن انہوں نے بہت سے لوگوں میں ترقی اور بہتری کا ایک ماحول پیدا کرنے اور نظام پر کچھ اعتماد بحال کرنے میں ضروری مدد مہیا کی۔

1938ء کا کم از کم معاوضے کا قانون، جس نے ہفتے میں چالیس گھنٹے کام اور چائلڈ لیبر کو غیر قانونی قرار دیا، اگرچہ بہت سے لوگ اس کے فیوض سے محروم رہے اور بہت کم معاوضے مقرر کیے گئے (پہلے سال پچیس سینٹ فی گھنٹہ) لیکن مزدوروں میں پائی جانے والی خفگی کو کسی حد تک کم کرنے کے لیے یہ کافی تھا۔ ضرورت مند افراد کی تعداد کے پیش نظر بہت کم مکانات تعمیر کیے گئے تھے، لیکن وفاق کی جانب سے سبسڈائزڈ رہائشی منصوبے، کھیل کے میدان، کیڑے مکوڑوں سے پاک اپارٹمنٹس، شکستہ رہائشی عمارات کی تعمیر نو کسی حد تک تسلی بخش عمل تھا۔ ٹی وی اے نے ملازمتیں مہیا کرنے، علاقوں کو بہتر بنانے، اور قومی سطح کے بجائے مقامی سطح پر سستی توانائی فراہم کرنے کے لیے علاقائی منصوبہ بندی کے موجود امکانات کے بارے میں تجویزات پیش کیں۔ سوشل سیکورٹی ایکٹ نے ریٹائرمنٹ وظائف اور بے روزگاری انشورنس، اور ماؤں اور زیر کفالت بچوں کے لیے ریاستی فنڈز مہیا کیے، لیکن کسانوں، گھریلو ملازمین اور بوڑھے لوگوں کو محروم رکھا گیا، اور کوئی ہیلتھ انشورنس نہ دی گئی۔ کارپوریشنوں کو بہت زیادہ تحفظ فراہم تھا۔

"نیوڈیل" میں ہزاروں مصنفین، فن کاروں، اداکاروں اور موسیقاروں کو کام مہیا کرنے کے لیے فیڈرل تھیٹر پروجیکٹ، فیڈرل رائٹر پروجیکٹ اور فیڈرل آرٹ پروجیکٹ کے لیے وفاقی رقم مہیا کی گئی۔ عوامی عمارات کی دیواروں پر نقش و نگار بنائے گئے، محنت کش طبقے کے لیے جنہوں نے کبھی تھیٹر ڈرامے نہیں دیکھے تھے تھیٹروں کا اہتمام کیا گیا، سینکڑوں کتابیں اور پمفلٹ لکھے گئے اور شائع کیے گئے۔ لوگوں نے پہلی مرتبہ سمفنی (کئی گتوں کا ساز) سنی۔ یہ لوگوں کے لیے فنون کا ایک خوبصورت تجربہ تھا۔ جو کہ امریکہ کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں گزرا تھا، اور جسے آج تک دوبارہ دہرایا نہیں گیا۔ لیکن 1939ء میں ملک کے زیادہ مستحکم ہونے کے ساتھ اور "نیوڈیل" کے اصلاحی جذبے کے کمزور ہونے کے ساتھ فنون کے لیے سبسڈائزڈ پروگرام بھی ختم ہو گئے۔

جب "نیوڈیل" ختم ہو گئی، سرمایہ داری اپنی جگہ صحیح سالم موجود رہی، دولتمند کو اب بھی قومی دولت کے ساتھ ساتھ قوانین، عدالتوں، پولیس، اخبارات، چرچوں، کالجوں پر کنٹرول حاصل تھا۔ روزویلٹ کو لاکھوں افراد کا

ہیرو بنانے کے لیے کافی لوگوں کو کافی مدد دی گئی تھی، لیکن وہی نظام جو کساد بازاری اور بحران لے کر آیا تھا، ضیاع، عدم مساوات، انسانی ضروریات پر منافع کو ترجیح کا نظام اپنی جگہ قائم رہا۔

سیاہ فام لوگوں کے لیے "نیوڈیل" نفسیاتی طور پر حوصلہ افزا تھی (مسز روزویلٹ ہمدرد تھا، کچھ سیاہ فاموں کو انتظامیہ میں عہدے دیئے گئے)، لیکن نیوڈیل پروگراموں میں زیادہ تر سیاہ فاموں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک مزارع کاشتکاروں، کھیت مزدوروں، نقل مکانی کرنے والوں، گھریلو ملازموں کا تعلق تھا وہ بے روزگاری انشورنس، کم از کم اجرت، سوشل سیکورٹی، یا زرعی سبسڈیز کے مستحق نہیں تھے۔ روزویلٹ جنوبی سفید فام سیاستدانوں کو جن کی سیاسی حمایت کی اسے ضرورت تھی ناراض نہ کرنے میں بہت محتاط تھا اس نے سیاہ فاموں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے خلاف کوئی بل پیش نہیں کیا تھا۔ مسلح افواج میں سفید فاموں اور سیاہ فاموں میں علیحدگی برقرار رکھی گئی تھی۔

سیاہ فام لوگوں کو ملازمتیں دینے کے حوالے سے امتیاز برتا جاتا تھا۔ انہیں سب سے آخر میں بھرتی کیا جاتا اور سب سے پہلے نکالا جاتا تھا۔ جب "سلیپنگ کار پورٹرز یونین کے سربراہ" اے فلپ رینڈلف" نے 1914ء میں واشنگٹن کی جانب ایک بہت بڑی مارچ کی دھمکی دی تو "روزویلٹ" ایک "فیئر ایمپلائمنٹ پریکٹسز کمیٹی" کے قیام کے لیے ایک ایگزیکٹو آرڈر پر دستخط کرنے کے لیے متفق ہوا۔ لیکن "ایف ای پی سی" کے پاس نفاذ کی کوئی طاقت نہیں تھی اور اس سے کوئی تبدیلی نہ آ سکی۔

"نیوڈیل" اصلاحات کے باوجود "بلیک ہارلم" جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ وہاں 350,000 لوگ رہتے تھے، باقی کے "مین ہیٹن" کی نسبت جہاں فی ایکڑ 133 افراد تھے یہاں فی ایکڑ 233 افراد تھے۔ پچیس سالوں میں اس کی آبادی چھ گنا بڑھ چکی تھی۔ دس ہزار خاندان چوہوں سے بھری ہوئی کوٹھڑیوں اور تہ خانوں میں رہائش پذیر تھے۔ ٹی بی عام تھی۔ تقریباً آدھی شادی شدہ خواتین گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرتی تھیں۔ وہ سفر کر کے برونکس پہنچتیں اور وہاں گلیوں کے کونوں پر جمع ہو جاتیں (اسے وہ غلاموں کی منڈی کہتی تھیں) جہاں سے انہیں ضرورتمند لوگ لے جاتے تھے۔ عصمت فروشی بھی سرایت کر چکی تھی۔ 1932ء میں ہارلم ہسپتال میں "بلیویو ہسپتال" کی نسبت جو کہ سفید فاموں کے مرکزی علاقے میں واقع تھا دوگنا زیادہ اموات ہوئیں۔ 19 مارچ 1935ء کو جب "نیوڈیل" کا بل پاس ہو رہا تھا ہارلم پھٹ پڑا۔ دس ہزار نیگرو گلیوں اور سڑکوں پر امڈ آئے اور سفید فام تاجروں کی جائیدادوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ سات سو پولیس مین موقع پر پہنچے اور امن بحال کیا۔ دو سیاہ فام مارے گئے۔

تیس کے عشرے کے وسط میں ایک نوجوان سیاہ فام شاعر نے جس کا نام "لینگسٹن ہیوز" تھا ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا، "Let America Be America Again"

....I am the poor white, fooled and pushed apart,
I am the Negro bearing slavery's scars.
I am the red man driven from the land,

I am the immigrant clutching the hope I seek--
And finding only the same old stupid plan.
OF dog eat dog, of mighty crush the week....
O, let America be America again--
The land that never has been yet--

تاہم جنوب اور شمال کے سفید فام امریکیوں کو سیاہ فام نظر نہیں آتے تھے۔ صرف انقلابی افراد نے نسلی امتیاز کو ختم کرنے کی کوششیں کیں، جن میں زیادہ تر ٹراٹسکائیٹ، سوشلسٹ اور کمیونسٹ تھے؛ "سی آئی او" جس پر کمیونسٹوں کا اثر تھا سیاہ فام کو کثیر پیداواری صنعتوں میں منظم کر رہے تھے۔ سیاہ فام اب تک ہڑتال توڑنے والوں کے طور پر استعمال کئے جا رہے تھے۔ لیکن اب سیاہ فاموں اور سفید فاموں کو ان کے مشترکہ دشمن کے خلاف متحد کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔

تیس کے عشرے میں حقوق نسواں کی کوئی بڑی تحریک موجود نہیں تھی۔ لیکن ان سالوں میں مزدوروں کی تنظیم سازی میں بہت سی خواتین سرگرم تھیں۔ "منی سوٹا" کی ایک شاعرہ "میری ڈل لیسور" چونتیس سال کی تھی جب ٹرک ڈرائیوروں کی عظیم ہڑتال نے 1934ء میں "میناپولس" کو جامد کر کے رکھ دیا۔ وہ اس میں بہت متحرک رہی اور بعد میں اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا:

میں اس سے پہلے کبھی ہڑتال میں شریک نہیں ہوئی تھی.... حقیقت یہ ہے کہ میں ڈری ہوئی تھی.... "کیا تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہے؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا.... ہم ہزاروں آدمیوں کو پلانے کے لیے کافی کے ہزاروں کپ بھرتے چلے گئے.... پھر میں نے دیکھا کہ ان آدمیوں کو کاروں سے نکال نکال کر ہسپتال کی چارپائیوں اور فرش پر لٹایا جا رہا تھا.... منگل کو، جنازے والے دن ایک ہزار مزید ملیشیا شہر میں داخل ہو گئی۔ سائے میں درجہ حرارت 90 سے اوپر تھا۔ میں وہاں گئی جہاں جنازے رکھے ہوئے تھے وہاں ہزاروں مرد اور خواتین آگ برساتے سورج کے نیچے جمع تھیں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آیا میں مارچ کر سکوں گی یا نہیں، میں جلوسوں میں مارچ کرنا پسند نہیں کرتی تھی.... تین خواتین مجھے اندر لے گئیں: "ہم سب مارچ کرنا چاہتی ہیں" انہوں نے بڑی نرمی سے کہا۔ "ہمارے ساتھ آؤ۔"

"سیلویا ووڈز" نے کئی سال بعد تیس کے عشرے میں لانڈری ورکر اور یونین ناظمہ کے طور پر اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے الائیس اور سٹاگلن لینڈ کو بتایا:

آپ کو لوگوں کو وہ باتیں بتانا ہوتی ہیں جو وہ دیکھ سکتے ہیں۔ پھر وہ کہیں گے "اوہ! میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا" یا "میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا".... ٹنی سی کی طرح۔ وہ سیاہ فاموں سے نفرت کرتا تھا۔ ایک غریب بٹائی پر کھیتی باڑی کرنے والا.... اس نے ایک سیاہ فام خاتون کے

ساتھ رقص کیا.... میں نے لوگوں کو تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ وہ اعتماد ہے جو لوگوں میں آپ نے پیدا کرنا ہے۔

بحران اور بغاوت کے ان دنوں میں بہت سے امریکیوں نے اپنی سوچ تبدیل کرنا شروع کر دی تھی۔ یورپ میں ہٹلر آگے بڑھ رہا تھا۔ بحرالکاہل سے پار جاپان چین پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ یورپی سلطنتوں کو نئی سلطنتوں سے خطرات لاحق تھے۔ امریکہ کے لیے جنگ زیادہ دور نہیں تھی۔

ایک عوامی جنگ

امریکہ نے جتنی بھی جنگیں لڑیں۔ دوسری عالمی جنگ کو سب سے زیادہ عوامی حمایت حاصل تھی۔ ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصے نے کبھی بھی اس قدر جوش اور جذبے سے کسی جنگ میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی، ایک لاکھ اسی ہزار افراد نے مسلح افواج میں خدمات انجام دیں، جن میں سے ایک لاکھ سمندر پار جنگ لڑ رہے تھے۔ ڈھائی لاکھ کارکنوں نے باقاعدگی کے ساتھ اپنی تنخواہیں جنگی بانڈز کے لیے پیش کیں۔ لیکن کیا اسے جنگ کے لیے معنوعی حمایت قرار دیا جا سکتا ہے، جبکہ قوم اپنی پوری طاقت کے ساتھ (نہ صرف خود حکومت بلکہ پریس، چرچ اور اہم انقلابی تنظیمیں بھی) جنگ کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئی تھیں؟ کیا اس تمام تر جذبے اور ولولے کے پس منظر میں کسی قسم کی نارضامندی یا مزاحمت کے ایسے آثار موجود تھے جن کی تشہیر نہ کی گئی ہو؟

یہ ایک ایسے دشمن کے خلاف جنگ تھی جو ناقابل بیان حد تک بُرا تھا۔ ہٹلر کا جرمنی مطلق العنانی (یک حزبی حکومت)، نسل پرستی، فوج گردی اور جنگی جارحیت کو فروغ دے رہا تھا جس کا دنیا ماضی قریب میں تجربہ کر چکی تھی۔ تاہم، کیا جو حکومتیں (انگلینڈ، امریکہ، سوویت یونین) یہ جنگ لڑ رہی تھیں کیا وہ کسی بالکل مختلف پہلو کی نمائندگی کر رہی تھیں، کہ ان کی کامیابی دنیا میں سامراجیت، نسل پرستی، مطلق العنانی، فوج گردی کے خلاف ایک کاری ضرب ثابت ہو سکتی؟

کیا امریکہ کا جنگ کے دوران کردار (بیرون ملک فوجی کارروائی میں، ملک کے اندر اقلیتوں کے ساتھ سلوک میں) ''عوامی جنگ'' سے مطابقت رکھتا تھا؟ کیا جنگ کے دوران ملک کی پالیسیاں دنیا میں ہر جگہ عام آدمی کی زندگی، آزادی اور خوشیوں کے حصول کے حقوق کی پاسداری کرتی تھیں؟ کیا جنگ کے بعد کا امریکہ ملک کے اندر اور سمندر پار اپنی پالیسیوں میں ان اقدار پر عمل پیرا تھا جن کے لیے جنگ لڑی گئی تھی؟

یہ سوالات غور و فکر کے محتاج ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت فضا جنگی جوش اور جذبے سے اس قدر لبریز تھی کہ اس بارے میں بات نہیں کی جا سکتی تھی۔

امریکہ کا ایک ایسے ملک کے طور پر تصور جو کہ کمزور اور بے بس ممالک کی حفاظت کرتا ہے صرف ہائی سکول میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی ''ٹیکسٹ بکس'' سے مطابقت رکھتا ہے۔ جبکہ دنیا کے معاملات میں اس کا ریکارڈ اس سے مختلف ہے۔ اس نے میکسیکو کے ساتھ جنگ کا آغاز کیا اور اس ملک کے تقریباً آدھے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کیوبا کو سپین سے آزادی دلوانے کا ڈرامہ رچایا اور پھر وہاں فوجی اڈا قائم کیا، سرمایہ کاری کی اور مداخلت کے حقوق حاصل کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس نے ہوائی، پیورٹو ریکو اور گوام پر قبضہ کر لیا اور فلپائنیوں کو محکوم بنانے کے لیے ایک وحشیانہ جنگ لڑی۔ اس نے جاپان کے ساحلوں کو اپنی تجارت کے لیے توپ بردار جہازوں اور دھمکیوں کے ذریعے کھولا۔ اس نے چین میں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ امریکہ کو بھی چین کے استحصال میں دوسری سامراجی طاقتوں کے برابر مواقع میسر آ سکیں۔ ''اوپن ڈور'' پالیسی کا اعلان کیا۔ اس نے چین میں مغربی برتری کو قائم کرنے کے لیے دوسری اقوام کے ساتھ مل کر پیکنگ میں فوجی بھیجے اور انہیں تیس سال سے زیادہ عرصہ وہاں رکھا۔

چین میں ''اوپن ڈور'' کا مطالبہ کرتے ہوئے اس نے لاطینی امریکہ میں (منرو ڈاکٹرائن اور بہت سی فوجی مداخلتوں کے ذریعے) ''کلوزڈ ڈور'' (بند دروازہ) پر اصرار کیا، یعنی سوائے امریکہ کے سب کے لیے بند۔ اس نے کولمبیا کے خلاف ایک انقلاب کی منصوبہ سازی کی اور نہر پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے پانامہ کی آزاد ریاست قائم کی۔ اس نے نکاراگوا میں ایک انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے بحریہ کے پانچ ہزار فوجی بھیجے اور وہاں سات سال تک اپنی طاقت کو برقرار رکھا۔ اس نے 1915ء میں ہیٹی میں دو مرتبہ مداخلت کی اور انیس سال تک وہاں اپنی فوج کو رکھا۔ 1900ء اور 1931ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ نے کیوبا میں چار مرتبہ مداخلت کی، نکاراگو میں دو مرتبہ، پانامہ میں چھ مرتبہ، اور گوئٹے مالا میں ایک مرتبہ مداخلت کی۔ 1924ء تک لاطینی امریکہ کی بیس ریاستوں میں سے نصف کی مالیات پر امریکہ کا اختیار تھا۔ 1935ء تک امریکہ کی سٹیل اور کاٹن کی آدھی سے زیادہ برآمدات لاطینی امریکہ میں فروخت کی جا رہی تھیں۔

1918ء میں پہلی عالمی جنگ کے خاتمے سے تھوڑا عرصہ پہلے سات ہزار امریکی فوجی روس میں اتحادی مداخلت کے لیے ایک فریق کے طور پر ''ولادی وستک'' میں اترے اور 1920ء کے آغاز تک وہاں رہے۔ چار ہزار مزید فوجی روس کی ایک دوسری بندرگاہ ''آرک انجل'' پر اُترے، اور تقریباً ایک سال وہاں رہے، یہ بھی اتحادی مہماتی فوج کے ایک حصہ کے طور پر وہاں پہنچے تھے۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ (دفتر خارجہ) نے کانگریس کو بتایا: ''یہ تمام کارروائیاں روس میں بالشویک انقلاب کے اثرات کو کم کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔''

مختصراً، اگر دوسری عالمی جنگ میں امریکہ کی شمولیت (جیسا کہ نازی حملوں کا مشاہدہ کرتے

ہوئے اس وقت اکثر امریکی سمجھتے تھے) کا مقصد دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے اصول کا دفاع کرنا تھا، تو اس کا اپنا قومی ریکارڈ اس اصول کی حمایت میں اس کی اہلیت کو مشکوک بنانے کے لیے کافی تھا۔

اس وقت جو بات واضح نظر آتی تھی وہ یہ تھی کہ امریکہ مخصوص آزادیوں کے ساتھ ایک جمہوریت تھی جبکہ جرمنی ایک آمریت تھی، جو ناروی نسل کی برتری کو قائم کرتے ہوئے یہودی اقلیت کو ظلم و استبداد کا نشانہ بنا رہی تھی، اور باغیوں کو بلا امتیاز مذہب قید کر رہی تھی۔ تاہم سیاہ فام، جرمنی میں یہودیت دشمنی کو دیکھتے ہوئے، امریکہ میں خود اپنی صورتحال کو اس سے مختلف نہیں دیکھتے تھے۔ اور امریکہ نے ہٹلر کی ظلم و استبداد کی پالیسی میں کچھ زیادہ ردعمل نہیں دکھایا تھا۔ حقیقت میں تیس کے پورے عشرے میں وہ ہٹلر کے ساتھ صلح جوئی میں انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ شامل رہا تھا۔ روز ویلٹ اور اس کا وزیر خارجہ "کارڈل ہل" ہٹلر کی یہودیت دشمن پالیسی پر کھلم کھلا تنقید کرنے سے اجتناب برتتے تھے۔ جب جنوری 1934ء میں سینیٹ میں ایک قرارداد پیش کی گئی جس میں جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ ہونے والے سلوک پر سینیٹ اور صدر سے افسوس اور دکھ کا اظہار کرنے اور یہودیوں کے حقوق کی بحالی کے لیے جرمن حکومت پر دباؤ ڈالنے کو کہا گیا تھا محکمہ خارجہ نے اس بات کو یقینی بنایا کہ یہ قرارداد منظر عام پر نہ آ سکے۔

جب 1935ء میں میسولینی کے اٹلی نے ایتھوپیا حملہ کر دیا تو امریکہ نے گولہ بارود اور اسلحہ وغیرہ پر تجارتی بندش عائد کر دی، لیکن امریکی تاجروں کو اٹلی میں بہت بڑی مقدار میں تیل بھیجنے کی کھلی اجازت تھی جو جنگ جاری رکھنے کے لیے اٹلی کے لیے بہت ضروری تھا۔ جب 1936ء میں سپین میں منتخب سوشلسٹ لبرل حکومت کے خلاف فاشسٹ بغاوت نے جنم لیا تو روز ویلٹ انتظامیہ نے غیر جانبداری کا ایکٹ پیش کیا جس نے سپین کی حکومت کو مدد کا راستہ بند کر دیا۔ جبکہ ہٹلر اور میسولینی نے فرانکو کو بہت اہم مدد فراہم کی۔

کیا یہ محض ایک غلط فیصلہ تھا یا ایک افسوسناک غلطی تھی؟ یا یہ ایک حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی تھی، جس کی اہم دلچسپی فاشزم کو روکنا نہیں بلکہ امریکہ کے سامراجی مفادات کو فروغ دینا تھا؟ تیس کے عشرے میں ان مفادات کے لیے سوویت دشمن پالیسی بہترین نظر آتی تھی۔ بعد میں جب جاپان اور جرمنی نے امریکہ کے عالمی مفادات کو خطرے میں ڈال دیا تو سوویت نواز اور نازی دشمن پالیسی قابل ترجیح بن گئی۔ روز ویلٹ یہودیوں پر ظلم کے خاتمے میں اتنی ہی دلچسپی رکھتا تھا جتنی خانہ جنگی کے دوران غلامی کے خاتمے کے لیے رکھتا تھا۔ پالیسی سازی میں ان کی ترجیح (ظلم و استبداد کے شکار لوگوں کے بارے میں ان کے ذاتی جذبات جو بھی ہوں) اقلیت کے حقوق نہیں بلکہ قومی طاقت تھی۔

یہ یہودیوں پر ہٹلر کا حملہ نہیں تھا جس نے امریکہ کو دوسری عالمی جنگ میں شمولیت پر اکسایا، یہ

کہنا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ 1861ء کی خانہ جنگی چالیس لاکھ سیاہ فام غلاموں کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔ ایتھوپیا پر اٹلی کا حملہ، ہٹلر کا آسٹریا پر حملہ، اس کا چیکوسلاواکیہ پر قبضہ، اس کا پولینڈ پر حملہ، ان واقعات میں سے کوئی بھی امریکہ کی جنگ میں شمولیت کا باعث نہیں تھا، اگرچہ روز ویلٹ نے انگلینڈ کو اہم امداد دینا شروع کر دی تھی۔

جس کے نتیجے میں امریکہ پوری طرح سے جنگ میں کود پڑا، وہ 7 دسمبر 1941ء کو ہوائی میں امریکی بحریہ کے اڈے پرل ہاربر پر جاپانیوں کا حملہ تھا۔ یقیناً اس کی وجہ جاپان کی سویلین آبادی پر بمباری کے نتیجے میں انسانیت کے حوالے سے پیدا ہونے والی کسی قسم کی تشویش نہیں تھی، جس نے روز ویلٹ کو اعلان جنگ پر مجبور کیا، نہ ہی 1937ء میں جاپان کے چین پر حملے یا اس کی "نانکنگ" میں سویلین آبادی پر بمباری نے امریکہ کو جنگ کے لیے برانگیختہ کیا تھا۔ یہ امریکہ کی بحرالکاہل میں قائم سلطنت کی ایک کڑی پر حملہ تھا، جس کی وجہ سے امریکہ کو جنگ میں کودنا پڑا۔

جب تک جاپان بڑی طاقتوں کے سامراجی کلب کا ایک شائستہ ممبر تھا جو کہ (اوپن ڈور پالیسی کو قائم رکھتے ہوئے) چین کے استحصال میں ان کا شریک تھا امریکہ کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس نے 1917ء میں جاپان کے ساتھ یہ کہتے ہوئے معلومات کا تبادلہ کیا تھا کہ "امریکہ کی حکومت تسلیم کرتی ہے کہ جاپان کے چین میں خاص مفادات موجود ہیں۔" اکیرا آرائی (آفٹر امپیریلزم) کے مطابق 1928ء میں چین میں امریکی قونصلوں نے جاپانی فوجیوں کی آمد کی حمایت کی تھی۔ لیکن جب جاپان نے چین پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے امریکہ کی امکانی منڈیوں کو خطرے میں ڈال دیا تو امریکہ کو تشویش پیدا ہوئی اور وہ اقدامات اٹھائے (سکریپ لوہے پر مکمل پابندی اور 1941ء کے موسم گرما میں تیل کی ترسیل پر مکمل پابندی) جنہوں نے جاپان کو حملے پر مجبور کیا۔

انگلینڈ اور روس کے ساتھ جنگ میں شامل ہونے کے بعد (جرمنی اور اٹلی نے پرل ہاربر کے فوراً بعد امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا) کیا امریکہ کے طرز عمل سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ جنگ کے اہداف انسانیت دوستی پر مبنی ہیں، یا ان کا ارتکاز طاقت اور منافع پر تھا؟ کیا وہ کچھ اقوام کا دوسری اقوام پر تسلط ختم کرنے کے لیے جنگ لڑ رہا تھا یا اس بات کو یقینی بنانے کے لیے لڑ رہا تھا کہ تسلط قائم کرنے والی اقوام امریکہ کی دوست تھیں؟

اگست 1941ء میں روز ویلٹ اور چرچل نے نیو فاؤنڈ لینڈ میں ملاقات کی اور دنیا کو "اٹلانٹک چارٹر" پیش کیا جس میں جنگ کے بعد کی دنیا کے لیے اعلیٰ اخلاقی اہداف مقرر کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "ان کے ممالک علاقائی یا دوسری کسی قسم کی وسعت کے خواہش مند نہیں ہیں" اور یہ کہ "وہ تمام اقوام کے لیے اپنی خواہش کے مطابق طرز حکومت کے انتخاب کے حق کا احترام کرتے ہیں۔" اس چارٹر کی اقوام کی

خودمختاری کے اقرار کے طور پر تشہیر کی گئی۔

تاہم "اٹلانٹک چارٹر" سے دو ہفتے قبل امریکہ کے قائم مقام وزیر خارجہ "سمنر ویلس" نے فرانسیسی حکومت کو یقین دلایا کہ جنگ کے بعد وہ اپنی سلطنت کو جوں کا توں برقرار رکھ سکتے ہیں۔ 1942ء کے آخر میں روزویلٹ کے ذاتی نمائندے نے فرانسیسی جنرل "ہنری جیراڈ" کو یقین دلایا کہ "یہ مکمل طور پر طے شدہ بات ہے کہ فرانس کی فرمانروائی ان تمام علاقوں اور نوآبادیوں پر، جہاں 1939ء میں فرانسیسی پرچم لہراتا تھا، جس قدر جلدی ممکن ہوسکا، دوبارہ بحال کردی جائے گی۔

یہ وہ دور تھا جب اخبارات کی شہ سرخیاں جنگی معرکوں اور فوجی نقل و حرکت سے بھری ہوتی تھیں۔ 1942ء میں شمالی افریقہ اور 1943ء میں اٹلی پر حملہ، رودبار کے پار جرمن مقبوضہ فرانس پر بہت بڑا ڈرامائی حملہ، شدید جنگی معرکے جن کے نتیجے میں جرمنی اپنی سرحدوں کی جانب اور سرحدوں کے اندر پسپائی اختیار کررہا تھا، برطانوی اور امریکی ایئر فورس کی بڑھتی ہوئی بمباری، اور ساتھ ہی نازی افواج پر روس کی فتوحات (رودبار سے پار حملے کے وقت روس جرمنوں کو روس سے باہر دھکیل چکا تھا اور 80 فی صد جرمن فوجیوں کو معروف رکھے ہوئے تھا)۔ 1943ء اور 1944ء کے دوران امریکی افواج ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک پہنچتے ہوئے جاپان سے نزدیک سے نزدیک تر فوجی اڈے قائم کررہی تھیں، تاکہ جاپان کے شہروں پر خوفناک بمباری کی جاسکے۔

جنگی معرکوں اور بمباری کے اس شور شرابے کے پس منظر میں امریکی سیاست کار اور کاروباری افراد اس بات کو یقینی بنانے کے لیے سرتوڑ کوشش کررہے تھے کہ جب جنگ بند ہو تو دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت امریکہ ہو۔ امریکہ کی کاروباری سرگرمیاں ان علاقوں میں بھی سرایت کرسکیں جن پر آج تک انگلینڈ کا غلبہ تھا۔ برابر رسائی کی اوپن ڈور پالیسی کو وہ یورپ سے ایشیا تک فروغ دینا چاہتا تھا، جس کا واضح مطلب انگلینڈ کو ایک طرف کرتے ہوئے امریکہ کے لیے جگہ بنانا تھی۔

مشرق وسطی اور اس کے تیل کے بارے میں یہی کچھ ہوا۔ مشرق وسطی میں تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ سعودی عرب تھا۔ 1945ء کے آغاز میں اس کا بادشاہ ابن سعود امریکی جنگی جہاز پر روز ویلٹ کا مہمان تھا۔

اس وقت روز ویلٹ نے ابن سعود کو تحریری پیغام بھیجا، جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ امریکہ عربوں سے مشورہ کیے بغیر فلسطین کی پالیسی تبدیل نہیں کرے گا۔ بعد کے سالوں میں تیل کے مفاد کا، مشرق وسطی میں یہودی ریاست کے سیاسی مفاد کے ساتھ مقابلہ جاری رہا، لیکن اس لمحے تیل زیادہ اہم نظر آتا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانیہ کی دم توڑتی ہوئی سامراجی طاقت کے مقابل میں

امریکہ اس کی جگہ لینے کے لیے تیار تھا۔ جنگ کے خاتمے سے پہلے ہی انتظامیہ، حکومت اور بڑے کاروباری افراد کے درمیان شراکت داری پر مبنی ایک نئے بین الاقوامی معاشی نظام کی تشکیل کی تیاری کر رہی تھی۔

شاعر "آرچی بالڈ میک لیش" جو اس وقت نائب وزیر خارجہ تھا، نے جو کچھ جنگ کے بعد کی دنیا میں دیکھا اس کے بارے میں تنقیدی طور پر بات کرتے ہوئے کہا: "جیسا کہ اب معاملات چل رہے ہیں، جو امن ہم قائم کریں گے، امن جو ہم قائم کرانے جارہے ہیں، وہ تیل کا امن ہوگا، سونے کا امن ہوگا، جہازرانی کا امن ہوگا، مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں، ایک ایسا امن جو بغیر کسی اخلاقی مقصد یا انسانی مفاد کے ہوگا۔

جنگ کے دوران انگلینڈ اور امریکہ نے بین الاقوامی کرنسی کے تبادلے کو منظم کرنے کے لیے "انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ" قائم کیا۔ اس میں ووٹنگ کا حق اپنے اپنے حصے کے سرمائے کی مقدار سے متناسب رکھا گیا تاکہ امریکی تسلط کو یقینی بنایا جاسکے۔ تعمیر نو اور ترقی کے لیے انٹرنیشنل بنک کا قیام عمل میں لایا گیا، اس کے قیام کی وجہ جنگ سے تباہ شدہ علاقوں کی تعمیر نو میں مدد کرنا بیان کی گئی تھی، لیکن اس کا اوّلین مقصد اس کے اپنے الفاظ میں "بیرونی سرمایہ کاری کو فروغ دینا تھا۔"

معاشی مدد جس کی ممالک کو جنگ کے بعد ضرورت تھی کو پہلے ہی سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جارہا تھا۔ "ایوریل ہیری من" روس میں امریکی سفیر نے 1944ء کے آغاز میں کہا تھا: "معاشی معاونت جو کہ ہمارے اختیار میں ہے وہ یورپ کے سیاسی حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک مؤثر ہتھیار ہے۔"

جنگ کے دوران اقوام متحدہ کی تخلیق کو دنیا کے سامنے مستقبل کی جنگوں سے بچنے کے لیے بین الاقوامی تعاون کے طور پر پیش کیا گیا۔ لیکن "اقوام متحدہ" پر مغربی استعماری ممالک، امریکہ، انگلینڈ اور فرانس اور مشرقی یورپ میں فوجی اڈوں کے ساتھ مؤثر حیثیت کی حامل نئی استعماری قوت سوویت یونین کا غلبہ تھا۔

جرمنی کے زیر قبضہ یورپ میں یہودیوں کی حالت زار روز ویلٹ کے لیے کوئی بڑی تشویش کی بات نہ تھی۔ ہنری فین گولڈ کی تحقیق (دا پولیٹکس آف ریسکیو) سے پتہ چلتا ہے کہ جب یہودیوں کو کیمپوں میں منتقل کیا جارہا تھا اور ان کو نیست و نابود کرنے کا عمل شروع ہورہا تھا، جو کہ چھ ملین یہودیوں اور ایک ملین غیر یہودیوں کے خوفناک خاتمے پر منتج ہوا۔ روز ویلٹ ایسے اقدامات اٹھانے میں ناکام رہا جو ہزاروں زندگیوں کو بچا سکتے تھے۔ اس نے اس معاملے کو اوّلین ترجیح کے طور پر نہ لیا اور اسے محکمہ خارجہ پر چھوڑ دیا اور محکمہ خارجہ میں یہودیت دشمنی اور سرد مہر بیوروکریسی عملی رکاوٹ بن گئی۔

کیا جنگ اس لیے لڑی جارہی تھی کہ ہٹلر "کم تر" نسلوں پر سفید فام ناروی نسل کی برتری قائم

کرنے کے غلط نظریات کا حامل تھا؟ امریکہ کی افواج کو نسلی بنیادوں پر الگ کیا گیا ہوا تھا جب 1945ء کے آغاز میں یورپ میں جنگ کے لیے جاتے ہوئے امریکی فوجی "کوئین میری" پر پھنس گئے تو سیاہ فاموں کو عرشے کی تازہ ہوا سے جس حد تک ممکن تھا دور رکھتے ہوئے جہاز کے تہ خانوں میں انجن روم کے پاس رکھا گیا تھا، جو کہ قدیم غلاموں کے بحری سفروں کی یاد دلاتا تھا۔

ریڈ کراس نے حکومت کی اجازت سے سفید فام اور سیاہ فام خون کے عطیات کو الگ الگ رکھا ہوا تھا۔ ستم ظریفانہ پہلو یہ تھا کہ "بلڈ بنک" کے نظام کو قائم کرنے والا ایک سیاہ فام ڈاکٹر "چارلس ڈریو" تھا اسے جنگ کے دوران خون کے عطیات کا انچارج مقرر کیا گیا اور پھر جب اس نے خون کی اس علیحدگی کو ختم کرنے کی کوشش کی تو اسے نکال دیا گیا۔ جنگ کے دوران مزدوروں کی اشد قلت کے دوران بھی ملازمتوں کے حوالے سے سیاہ فاموں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا تھا۔ ویسٹ کوسٹ کے ہوائی جہازوں کے پلانٹ کے ایک ترجمان نے کہا: "نیگروز کو صرف صفائی اور جاروب کشی اور اس جیسے دوسرے گھٹیا کاموں کے لیے رکھا جائے گا۔ ہوائی جہاز تیار کرنے والے کارکنوں کے طور پر ان کی تربیت کے باوجود ہم انہیں ملازمت نہیں دیں گے۔" روز ویلٹ نے اپنے قائم کیے گئے "فیئر ایمپلائمنٹ پریکٹسز کمیشن" کے احکام کے نفاذ کے لیے کبھی بھی کچھ نہ کیا۔

فاشسٹ اقوام اس بات پر زور دینے کی وجہ سے کہ خواتین کا مقام گھر کی چار دیواری ہے بدنام تھیں۔ لیکن اس کے باوجود فاشزم کے خلاف جنگ میں خواتین کو سوائے دفاعی صنعتوں میں استعمال کرنے کے جہاں ان کی اشد ضرورت تھی، ان کے ثانوی یا ماتحت کردار کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی مخصوص اقدامات نہ اٹھائے گئے۔ "وار مین پاور کمیشن" نے جنگی کاموں میں مصروف خواتین کی ایک بڑی تعداد کے باوجود خواتین کو پالیسی ساز اداروں سے دور رکھا۔ "وومن بیورو آف دا ڈیپارٹمنٹ آف لیبر" کی ایک ڈائریکٹر میری اینڈرسن کی ایک رپورٹ کے مطابق "وار مین پاور کمیشن" خواتین راہنماؤں کی جانب سے پروان چڑھنے والے اس رویئے پر مشکوک اور پریشان تھا، جسے اس وقت متشددانہ یا جہادی جذبہ میں فروغ کے طور پر لیا جا رہا تھا۔

امریکہ کی ایک پالیسی کو فاشزم کے نزدیک ترین قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ مغربی ساحل پر بسنے والے جاپانی امریکیوں کے ساتھ اس کا سلوک تھا۔ پرل ہاربر پر حملے کے بعد حکومت میں جاپان دشمنی کا جنون مکمل طور پر سرایت کر گیا تھا۔ کانگریس کے ایک رکن نے کہا "میں امریکہ میں، الاسکا، اور ہوائی میں ایک ایک جاپانی کو پکڑ کر انہیں حراستی کیمپوں میں ڈالنے کے حق میں ہوں، ان پر لعنت بھیجو! ان سے چھٹکارا حاصل کرو۔"

فرینکلن روز ویلٹ نے اس قسم کی شوریدگی کا مظاہرہ تو نہ کیا، لیکن اس نے بڑے سکون کے

ساتھ فروری 1942ء میں ایگزیکٹو آرڈر 9066 پر دستخط کر دیئے، جس کے تحت فوج کو بغیر کسی وارنٹ یا الزامات یا سماعت کے "ویسٹ کوسٹ" پر ہر جاپانی کو گرفتار کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ فوج نے 110,000 امریکی جاپانی مردوں، خواتین اور بچوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر لیا اور انہیں اندرونی علاقوں میں لے جا کر کیمپوں میں قیدی کے طور پر بند کر دیا۔ ان میں سے تین چوتھائی وہ لوگ تھے جو جاپانی والدین کے ہاں امریکہ میں پیدا ہوئے تھے اس لیے امریکی شہری تھے۔ دوسرے ایک چوتھائی (جو جاپان میں پیدا ہوئے تھے) قانونی طور پر شہریت سے محروم رکھے گئے تھے۔ 1944ء میں سپریم کورٹ نے فوجی ضرورت کی بنا پر ان کے زبردستی انخلا کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

جاپانی ان کیمپوں میں تین سال سے زیادہ عرصہ رہے۔ اس دوران یہاں ہڑتالیں ہوئیں، استغاثے دائر کیے گئے، عوامی جلسے کیے گئے، وفاداری کے حلف ناموں پر دستخط کرنے سے انکار کیا گیا اور کیمپ حکام کے خلاف ہنگامے کیے گئے۔ جاپانی "مچی ویگ لین" چھوٹی لڑکی تھی جب اس کے خاندان کا انخلا کیا گیا۔ وہ ہمیں اپنی کتاب "ایئرز آف اِن فیمی میں انخلا کے دوران ہونے والے گھپلوں، مصائب اور ساتھ اس کے خلاف مزاحمت کے بارے میں بتاتی ہے۔

یہ ایک حکومت کی شروع کی گئی ایک جنگ تھی، جس سے مستفید ہونے والا اہم طبقہ (اصلاحات کے مجموعوں کے باوجود) دولت مند اشرافیہ کا تھا۔ 1941ء تک تین چوتھائی مالیت تک کے فوجی ٹھیکے چھالیس بڑی کارپوریشنوں کے پاس تھے۔ صنعت میں سائنسی تحقیقات پر خرچ کیے گئے ایک بلین ڈالر میں سے 400 ملین ڈالر دس بڑی کارپوریشنوں کو ادا کیے گئے۔

اگر چہ بارہ ملین کارکن سی آئی او اور اے ایف ایل میں منظم تھے، محنت کش ماتحت حیثیت میں تھے۔ پانچ ہزار فیکٹریوں میں صنعتی جمہوریت کی علامت کے طور پر منتخب کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں، لیکن یہ زیادہ تر غیر حاضر کارکنوں کے لیے تادیبی گروپس کے طور اور پیداوار میں اضافہ کے آلات کے طور پر کام کرتی تھیں۔

حب الوطنی کے غالب ماحول اور جنگ جیتنے کے کامل جذبے اور اے ایف ایل اور سی آئی او کے ہڑتال نہ کرنے کے وعدوں کے باوجود بہت سے کارکن منجمد معاوضوں اور آسمان کی جانب تیزی سے بڑھتے ہوئے کاروباری منافعوں سے مایوس ہو کر ہڑتال پر چلے گئے۔ جنگ کے دوران 1,000 ہڑتالیں ہوئیں جن میں 6,770,000 کارکن شامل ہوئے۔ یہ امریکی تاریخ میں کسی بھی اتنی مدت میں ہونے والی سب سے زیادہ ہڑتالیں تھیں۔ صرف 1944ء میں کانوں میں، سٹیل ملوں میں اور آٹو اور ٹرانسپورٹیشن کا سازو سامان تیار کرنے والی صنعتوں میں، ایک ملین کارکنوں نے ہڑتال کی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو ہڑتالیں ریکارڈ تعداد میں جاری رہیں، 1946ء کے پہلے نصف میں تین ملین کارکن ہڑتال پر تھے۔

پرجوش حب الوطنی کے شور و غوغے کے نیچے، بہت سے لوگ تھے جو سمجھتے تھے کہ جنگ، فاشسٹ قوتوں کی جارحیت کو روکنے کی صورت میں بھی، غلط تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران مسلح افواج کے لیے زبردستی بھرتی کئے گئے 10 ملین افراد میں سے صرف 43,000 نے لڑنے سے انکار کیا۔ بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو بھرتی کے لیے پیش ہی نہ کیا، حکومتی فہرستوں میں زبردستی بھرتی سے فرار حاصل کرنے والے افراد کی تعداد لگ بھگ 350,000 تھی اور یہ سب کچھ جنگ کے لیے تقریباً کلی طور پر متفق امریکی معاشرے کے باوجود تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جو ادب سامنے آیا ان میں جیمز جون کا From Hero to Eternity جوزف ہیلر کا Catch-22 اور نورین میلر کا The Naked and the Dead قابل ذکر ہیں۔ The Naked and the Dead میں فوجی جنگ کے دوران باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک کہتا ہے "اس فوج میں صرف ایک خرابی ہے اور وہ ہے کہ اس نے کبھی جنگ ہاری نہیں۔"

ٹوگیو کو ایک جھٹکا سا لگا: "تم سمجھتے ہو کہ ہمیں اس جنگ کو ہار جانا چاہیے؟"

ریڈ نے اپنے آپ کو جذبات میں بہتے ہوئے محسوس کیا۔ "ان لعنتی جاپانیوں سے مجھے کیا عداوت ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے ان کے اس جنگل پر قبضے میں کوئی تکلیف ہے؟ میرے لیے اس کی کیا اہمیت ہے اگر "کمنگز" ایک اور سٹار حاصل کر لیتا ہے؟"

"جنرل کمنگز، وہ ایک اچھا انسان ہے۔" مارٹائنز نے کہا۔

"دنیا میں کوئی اچھا آفیسر نہیں ہے۔" ریڈ نے جواب دیا۔

جنگ کے بارے میں نیگروز میں باوجود اس کے نیگروز اخبارات اور نیگرو لیڈروں نے سیاہ فاموں کے جذبات کو متحرک کرنے کی پوری کوشش کی تھی، ایک عمومی بے تعلقی بلکہ نفرت پائی جاتی تھی۔ ایک سیاہ فام صحافی نے لکھا: "نیگرو جنگ کے بارے میں ناراض، کشیدہ خاطر اور مکمل طور پر بے پروا ہے کس کے لیے لڑوں؟ وہ پوچھ رہا ہے۔"

نیگرو کالج کے ایک طالب علم نے اپنے استاد کو بتایا: "فوج میں ہم سے نسلی امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ بحریہ میں ہمیں صرف میس مین کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ ریڈ کراس ہمارا خون لینے سے انکار کر دیتی ہے۔ آجرین اور لیبر یونینز ہمیں باہر دھکیل دیتی ہیں۔ سیاہ فاموں کا قتل و غارت جاری ہے۔ ہم حق رائے دہی سے محروم ہیں، نسلی امتیاز کا شکار ہیں، ہم پر تھوکا جاتا ہے، ہٹلر اس سے زیادہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟"

"این اے اے سی پی" کے لیڈر والٹر وائٹ نے یہ بات مڈ ویسٹ میں کئی ہزار سیاہ فام سامعین کے سامنے دہرائی، اس کا خیال تھا کہ وہ اس بات کو ناپسند کریں گے، لیکن اس کے بجائے جیسا کہ

وہ کہتا ہے "مجھے اس وقت سخت حیرانی اور مایوسی کا سامنا ہوا جب سامعین نے اس قدر تالیاں بجانا شروع کر دیں کہ مجھے انہیں خاموش کرانے کے لیے تیس چالیس سیکنڈ لگ گئے۔"

لیکن نیگروز کی جانب سے کوئی منظم مخالفت نہیں تھی۔ حقیقت میں کسی بھی جانب سے کوئی منظم مخالفت نہیں تھی۔ کیمونسٹ پارٹی پورے جوش و جذبے کے ساتھ اس کی حمایت میں تھی۔ سوشلسٹ پارٹی اس مسئلے پر بٹی ہوئی تھی۔ وہ اس کے حق میں یا مخالفت میں کوئی واضح بیان دینے کے قابل نہیں تھی۔

چند چھوٹے انارکسٹ اور صلح پسند گروپس نے جنگ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ امن اور آزادی کے لیے بین الاقوامی خواتین لیگ نے کہا: "قوموں، طبقات اور نسلوں کے درمیان جنگ اختلافات کو مستقل طور پر حل نہیں کر سکتی یا ان زخموں کو مندمل نہیں کر سکتی جو اس کی وجہ بنتے ہیں۔" کیتھولک کارکنوں نے لکھا: "ہم اب بھی صلح پسند ہیں۔"

سرمایہ دارانہ، فاشسٹ اور کیمونسٹ دنیا (متحرک نظریات، جارحانہ کارروائیوں) میں محض امن کی اپیل کرنا کچھ صلح پسندوں کو مناسب نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے "انقلابی عدم تشدد" کی بات کرنا شروع کر دی۔ "فیلوشپ آف ری کونسیلیشن" کے اے جے مسٹ نے کہا کہ دنیا ایک انقلاب کے درمیان ہے، اور وہ جو تشدد کے خلاف ہیں انہیں لازماً کسی قسم کے تشدد کے بغیر انقلابی قدم اٹھانا ہوگا۔ انقلابی صلح پسندی کی تحریک کو نیگروز، بٹائی پر کھیتی باڑی کرنے والوں، صنعتی کارکنوں جیسے پسے ہوئے اور اقلیتی گروپس کے ساتھ مؤثر رابطے قائم کرنا ہوں گے۔

صرف ایک منظم سوشلسٹ گروپ نے جنگ کی واضح مخالفت کی، یہ "سوشلسٹ ورکر پارٹی" تھی۔ 1943ء میں منیاپولس میں پارٹی کے اٹھارہ ممبران پر "سمتھ ایکٹ" کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا گیا، جس کے مطابق کسی بھی ایسے گروپ میں شمولیت کو، جو حکومت کو طاقت اور تشدد کے ذریعے ختم کرنے کی وکالت کرتا ہو جرم قرار دیا گیا تھا، انہیں قید کی سزائیں دی گئیں اور سپریم کورٹ نے ان کے کیس پر نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا۔

چند لوگ اس بات پر مصر رہے کہ حقیقی جنگ ہر قوم کے اندر ہے۔ ڈیوئٹ میکڈونلڈ کے میگزین "پولیٹکس" میں 1945ء کے اوائل میں ایک فرانسیسی کارکن فلاسفر "سائمن ویل" نے ایک مضمون لکھا:

> خواہ ہم نے فاشزم، جمہوریت یا پرولتاری آمریت کا نقاب اوڑھا ہو، حکومتی مشینری (بیوروکریسی، پولیس، فوج) ہماری سب سے بڑی حریف ہوتی ہے..... بدترین غداری یا بے وفائی اپنے آپ کو اس حکومتی مشینری کے تحت کر لینا اور اس کی خدمت کرتے ہوئے اپنی اور دوسروں کی تمام انسانی اقدار کو قدموں تلے روند دینا ہے۔

تاہم امریکی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ فوجی اور سویلین زندگی میں جنگ لڑنے کے لیے

پوری طرح متحرک تھا،اور جنگ کا ماحول زیادہ سے زیادہ امریکیوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔دشمن کے خلاف نفرت، خاص طور پر جاپانیوں کے خلاف، بہت زیادہ پھیل گئی تھی۔نسل پرستی واضح طور پر کارفرما نظر آتی تھی۔ٹائم میگزین نے ''ایووجیما'' کی جنگ کی رپورٹنگ کرتے ہوئے لکھا: ''ایک عام نامعقول جاپانی جاہل ہے۔شاید وہ انسان بھی ہے یا نہیں...... کچھ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔''

لہٰذا اس طرح جرمن اور جاپانی شہروں پر ہوائی حملوں اور آج تک کسی بھی جنگ میں کی گئی سویلین علاقوں پر شدید ترین بمباری کی حمایت کے لیے وسیع بنیاد مہیا کر دی گئی تھی۔

اٹلی نے ایتھوپیا جنگ میں شہروں پر بمباری کی تھی،اٹلی اور جرمنی نے سپین کی خانہ جنگی میں شہروں پر بمباری کی تھی،دوسری عالمی جنگ کے آغاز پر جرمنی کے جہازوں نے ہالینڈ میں روٹرڈیم، انگلینڈ میں کوونٹری اور دوسری جگہوں پر بم پھینکے۔روزویلٹ نے اسے ''انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی انتہائی غیر انسانی بربریت'' قرار دیا۔

جرمنی کی یہ بمباری جرمن شہروں پر برطانوی اور امریکی بمباری کے مقابلے میں بہت معمولی بمباری تھی۔جنوری 1943ء میں اتحادی ''کاسابلانکا'' میں اکٹھے ہوئے اور ''جرمنی کے فوجی، صنعتی اور معاشی نظام کو درہم برہم اور تباہ و برباد کرنے اور جرمن قوم کے حوصلے کو اس حد تک پست کرنے کے لیے کہ ان کی مسلح مزاحمت مہلک طور پر کمزور ہو سکے،بڑے پیمانے پر ہوائی حملے کرنے پر اتفاق کیا۔

اور اس طرح ہزاروں طیاروں کے ذریعے کولون،ایسن،فرینکفرٹ اور ہمبرگ پر بمباری کرتے ہوئے جرمن شہروں پر شدید ترین بمباری کا آغاز کیا۔انگلینڈ کے طیارے رات کو اڑتے اور ان کا فوجی اہداف کو نشانہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا تھا۔امریکی طیارے دن کے وقت پرواز کرتے اور بلندی سے اندھا دھند بم پھینکتے۔خوف و ہراس پھیلانے کے لیے اس بمباری کی انتہا 1945ء کے اوائل میں ڈریسڈن پر کی جانے والی بمباری میں دیکھنے میں آئی،جس میں بموں سے پیدا ہونے والی خوفناک حدت نے ایک خلا پیدا کر دیا اور اس کے نتیجے میں آگ نے ایک خوفناک آتشیں طوفان کی صورت میں پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا،اور ڈریسڈن میں ایک لاکھ سے زائد افراد مارے گئے۔

جاپان کے شہروں پر بھی سویلین آبادی کے حوصلے کو پست کرنے کے لیے اس خوفناک اور شدید بمباری کی حکمت عملی کو اپنایا گیا۔ٹوکیو پر ایک رات کی بمباری میں 80,000 انسان مارے گئے۔پھر 6 اگست 1945ء کو ایک تنہا امریکی طیارہ ہیروشیما کے آسمان پر نمودار ہوا اور دنیا کا پہلا ایٹم بم گرایا،جس کے نتیجے میں تقریباً ایک لاکھ افراد فوری طور پر لقمہ اجل بن گئے،اور لاکھوں لوگ تابکاری کے زہر سے آہستہ آہستہ موت کے منہ میں چلے گئے۔امریکی نیوی کے بارہ پائلٹ ہیروشیما سٹی جیل میں مارے گئے،یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے امریکی حکومت نے کبھی بھی سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا۔تین دن بعد دوسرا ایٹم بم ناگاسا

کی پر پھینکا گیا جس میں شاید 50,000 افراد مارے گئے۔

ان گھناؤنے مظالم کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ یہ جنگ کے فوری خاتمے کا باعث ہوگا اور جاپان پر حملے کی ضرورت نہیں ہوگی۔اس قسم کے حملے میں بہت زیادہ جانیں ضائع ہوں گی،وزیر خارجہ بائرن نے ان کا اندازہ دس لاکھ کے قریب بتایا اور ٹرومین نے جنرل جارج مارشل کے دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق 5 لاکھ بتایا۔حملے کی صورت میں ہونے والے اس نقصان کے اندازے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا،یہ سب محض سنی سنائی باتوں سے اخذ کئے گئے اندازے تھے۔جن کا مقصد اس بمباری کا جواز مہیا کرنا تھا جس کے نتائج انتہائی خوفناک تھے۔

اگست 1945ء میں جاپان انتہائی مایوس کن صورت حال سے دوچار تھا اور ہتھیار پھینکنے کے لیے تیار تھا۔''نیویارک ٹائمز'' کے فوجی تجزیہ نگار ''ہین سن بالڈون'' نے جنگ کے فوراً بعد لکھا: ''26 جولائی کو جب ہتھیار ڈالنے کا غیر مشروط ''پاٹس ڈم'' مطالبہ کیا گیا،دشمن فوجی نقطہ نگاہ سے انتہائی مایوس کن صورتحال سے دوچار تھا۔یہ صورتحال تھی جب ہم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کو ملیامیٹ کر دیا۔کیا ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت تھی؟ تاہم کوئی بھی شخص اس کا مثبت جواب نہیں دے سکتا،یقینی طور پر اس کا جواب ہر جگہ نفی میں ملے گا۔''

جنگ کے دوران ہوائی حملوں کے نتائج کو پرکھنے کے لیے 1944ء میں محکمہ جنگ کے قائم کئے گئے ''یو ایس سٹریٹجک بامبنگ سروے'' نے جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد سینکڑوں جاپانی سویلین اور فوجی لیڈروں کا انٹرویو کیا اور جنگ کے فوراً بعد رپورٹ پیش کی۔''31 دسمبر 1945ء سے پہلے یقینی طور پر اور یکم نومبر 1945ء سے پہلے تمام تر امکانات کے ساتھ،اگر ایٹم بم نہ بھی گرائے جاتے،اور اگر روس جنگ میں نہ بھی شامل ہوا ہوتا،اور اگر جاپان پر حملے کا کوئی منصوبہ نہ بھی بنایا گیا ہوتا،جاپان نے ہتھیار ڈال دینے تھے۔''

لیکن کیا اگست 1945ء میں امریکی لیڈروں کا اس کا علم ہو سکتا تھا؟ اس کا جواب واضح طور پر ''ہاں'' میں ہے۔جاپانیوں کا کوڈ توڑ لیا گیا تھا اور جاپان کے پیغامات راستے میں اُچکے جا رہے تھے۔اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ جاپان نے ماسکو میں اپنے سفیر کو اتحادیوں کے ساتھ امن مذاکرات کے لیے کام کرنے کی ہدایات دے دی تھیں۔13 جولائی کو وزیر خارجہ ''شیگنوری ٹوگو'' نے ماسکو میں اپنے سفیر کو ٹیلی گرام بھیجی کہ ''امن کے راستے میں واحد رکاوٹ غیر مشروط ہتھیار ڈالنا ہے۔''

اگر امریکہ صرف غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کے مطالبے پر اصرار نہ کرتا،یعنی اگر وہ ہتھیار ڈالنے کی صرف ایک شرط کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتے جو کہ جاپانیوں کی مقدس ہستی شہنشاہ کو اپنی جگہ قائم رہنے دینے کی شرط تھی،جاپانی ہتھیار ڈالنے کے لیے ضرور تیار ہو جاتے۔(حقیقت میں جب جنگ

ختم ہوئی تو شہنشاہ کو قائم رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی)

امریکہ نے امریکیوں اور جاپانیوں کی زندگیاں بچانے کے لیے یہ چھوٹا سا قدم کیوں نہ اٹھایا؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایٹم بم پر بہت زیادہ رقم اور کوشش صرف ہو چکی تھی جسے پھینکنا ہی نہیں تھا؟ یا اس کی وجہ وہ تھی جسے برطانوی سائنس دان "پی ایم ایس بلیکٹ" نے بیان کیا تھا یعنی امریکہ جاپان کے خلاف جنگ میں روس کے شامل ہونے سے پہلے بم گرانے کے لیے بہت بے چین تھا؟

روسی خفیہ طور پر متفق تھے (وہ سرکاری طور پر جاپان کے ساتھ جنگ میں نہیں تھے) کہ وہ یورپی جنگ کے خاتمے کے نوے دن بعد جنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ یورپی جنگ 8 مئی کو ختم ہو گئی اور 8 اگست کو روس کی جانب سے جاپان کے خلاف اعلان جنگ متوقع تھا، لیکن اس وقت تک بڑا بم گرایا جا چکا تھا، اور اگلے دن ایک دوسرا بم ناگاساکی پر گرایا جانے والا تھا۔ جاپانیوں نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے تھے نہ کہ روس کے سامنے، اور اس طرح جنگ کے بعد کے جاپان پر امریکہ کے قابض ہونے کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔ بحریہ کے وزیر "جیمز فورسٹال" کی ڈائری میں 28 جولائی 1945ء کے اندراج میں وزیر خارجہ جیمز ایف بائرن کو "روس کے آنے سے پہلے جاپان کے معاملات پر قبضہ کرنے کے لیے بہت زیادہ بے چین" بیان کیا گیا ہے۔

ٹرومین نے کہا "دنیا کو علم ہو جائے گا کہ پہلا ایٹم بم ہیروشیما ایک فوجی اڈے پر گرایا گیا۔ کیونکہ ہم نے پہلے حملے میں جہاں تک ممکن تھا، سویلین آبادی کو بچانے کی کوشش کی تھی۔" یہ ایک انتہائی احمقانہ بیان تھا۔ ہیروشیما میں مرنے والے 1,00,000 افراد تقریباً سارے کے سارے سویلین لوگ تھے۔ "یو ایس سٹریٹجک بامبنگ سروے" نے اپنی سرکاری رپورٹ میں کہا: "ہیروشیما اور ناگاساکی کو اہداف کے طور پر ان کی سرگرمیوں اور آبادی کے ارتکاز کی وجہ سے منتخب کیا گیا۔"

یوں نظر آتا ہے کہ ناگاساکی پر دوسرا بم گرانے کا فیصلہ پہلے سے ہی کر لیا گیا تھا، کوئی بھی شخص آج تک یہ وضاحت نہیں کر سکا کہ یہ کیوں گرایا گیا تھا کیا اس کی وجہ یہ تھی یہ پلوٹونیم بم تھا جبکہ ہیروشیما پر گرایا جانے والا یورینیم بم تھا؟ کیا ناگاساکی کے مرنے والے اور تابکاری کا شکار ہونے والے لوگ ایک سائنسی تجربہ کا شکار تھے؟ ناگاساکی میں مرنے والوں میں غالباً امریکی جنگی قیدی بھی شامل تھے۔ ایک فوجی رپورٹ میں اس بارے میں متنبہ کیا گیا تھا، لیکن منصوبے کو تبدیل نہ کیا گیا۔

یہ درست ہے کہ پھر جنگ فوری طور پر ختم ہو گئی۔ اٹلی کو ایک سال پہلے شکست دی جا چکی تھی، جرمنی نے حال ہی میں ہتھیار ڈالے تھے، جسے بنیادی طور پر مشرقی محاذ پر روسی فوجوں نے کچلا تھا جس میں اتحادی افواج نے مغرب میں مدد دی تھی۔ اب جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ فاشسٹ قوتیں تباہ کر دی گئی تھیں۔

لیکن ایک نظریے اور ایک حقیقت کے طور پر فاشزم کے بارے میں کیا گیا تھا؟ کیا اس کے ضروری عناصر (فوج گردی، نسل پرستی، سامراجیت) اب ختم ہو چکے تھے؟ یا یہ فاتحین کی پہلے سے ہی زہر آلود ہڈیوں میں سرایت کر چکے تھے۔

فاتحین سوویت یونین اور امریکہ تھے (اگرچہ انگلینڈ، فرانس اور قوم پرست چین بھی فاتح تھے لیکن یہ کمزور تھے)۔ اب یہ دونوں ممالک ایک سوشلزم کی آڑ میں اور دوسرا جمہوریت کی آڑ میں اپنے اپنے اثر و رسوخ کی سلطنت قائم کرنے میں لگ گئے۔ انہوں نے جو کچھ بانٹ سکتے تھے بانٹا اور کچھ آپس کی چھینا جھپٹی سے حاصل کیا۔ انہوں نے فاشسٹ ممالک کی نسبت زیادہ طاقتور فوجی ہتھیار تیار کیے اور ہٹلر، میسولینی اور جاپان سے بڑھ کر زیادہ ممالک کے مقدروں پر تسلط حاصل کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔

ساتھ ہی انہوں نے اپنے عوام کو بھی کنٹرول کرنے کے لیے اپنے اپنے طریقوں پر عمل شروع کر دیا، روس کا طریقہ قدرے اکھڑ تھا اور امریکہ کا طریقہ کار پر تصنع تھا، تاکہ اپنے اقتدار کو مضبوط بنایا جا سکے۔

جنگ نے کارپوریٹ منافع میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا، لیکن ساتھ ہی کسانوں کے لیے بلند قیمتیں، مزدوروں کے لیے زیادہ اجرتیں اور آبادی کے بڑے حصے کے لیے کافی خوشحالی بھی لے کر آئی۔ اس کی وجہ سے ان بغاوتوں سے بھی چھٹکارا مل گیا تھا جو تیس کے عشرے میں مسلسل خطرہ بنی رہی تھیں۔

یہ ایک پرانا سبق تھا جو حکومتوں نے سیکھا ہوا تھا کہ جنگ عوام پر کنٹرول کو آسان بنا دیتی ہے۔ چارلس ای ولسن "جنرل الیکٹرک کارپوریشن" کا صدر جنگ کے دوران کی صورتحال سے اس قدر خوش تھا کہ اس نے ایک "مستقل جنگی معیشت" کے لیے کاروباری افراد اور فوج کے درمیان مسلسل اتحاد کی تجویز پیش کی۔

اور یہی کچھ ہوا بھی، امریکی عوام جنگ کی تھکی ماندی تھی، لیکن ٹرومین کی انتظامیہ (روزویلٹ اپریل 1945ء میں وفات پا گیا تھا) نے ایک بحران اور سرد جنگ کی فضا پیدا کرنے کا کام کیا۔ درست ہے کہ سوویت یونین کے ساتھ رقابت حقیقی تھی۔ سوویت یونین جس کی معیشت جنگ کی وجہ سے تباہ ہو چکی تھی، 20 ملین لوگ مارے گئے تھے، اپنی صنعت کی از سر نو تعمیر کرتے ہوئے اور فوجی قوت کو دوبارہ بحال کرتے ہوئے حیران کن طور پر واپس آ رہا تھا۔ تاہم ٹرومین کی انتظامیہ نے سوویت یونین کو نہ صرف ایک رقیب کے طور پر بلکہ ایک فوری خطرے کے طور پر پیش کیا۔

ملک سے باہر اور ملک کے اندر مختلف چالوں کے ایک سلسلے کے ذریعے اس نے ایک خوف کی فضا قائم کر دی، کمیونزم کے بارے میں ایک ہسٹریا، جس نے فوجی بجٹ میں تیزی سے اضافہ کیا اور فوج سے متعلقہ اشیاء کی تیاری نے معیشت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ ان پالیسیوں نے بیرون ملک زیادہ جارحانہ اور اندرون ملک انسدادی کارروائیوں کے لیے حکومت کو جواز مہیا کیا۔

یورپ اور ایشیا میں اٹھنے والی انقلابی تحریکوں کو امریکی عوام کے سامنے سوویت پھیلاؤ کے طور پر پیش کیا گیا؛ اور اس طرح ہٹلر کی جارحیت کے خلاف پائی جانے والی نفرت کو استعمال کیا گیا۔

یونان میں دائیں بازو کی آمریت کے تحت مخالفین کو جیلوں میں ڈال دیا گیا اور ٹریڈ یونین لیڈروں کو عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں بائیں بازو کی گوریلا تحریک ابھرنا شروع ہو گئی۔ برطانیہ نے کہا کہ وہ بغاوت پر قابو نہیں پا سکتا اور امریکہ کو مداخلت کی دعوت دی۔ جیسا کہ بعد میں محکمہ خارجہ کے ایک آفیسر نے کہا: "برطانیہ نے ایک ساعت کے اندر امریکہ کو دنیا کی لیڈر شپ کا کام سونپ دیا۔"

امریکہ نے "ٹرومین ڈاکٹرائن" کے ساتھ جواب دیا، یہ نام ٹرومین کی ایک تقریر کو دیا گیا تھا جو اس نے 1947ء کے موسم بہار میں کانگریس میں کی، جس میں اس نے یونان اور ترکی کو 400 ملین ڈالر کی فوجی اور معاشی امداد دینے کو کہا۔ ٹرومین نے کہا کہ امریکہ ان "آزاد اقوام کی ہر صورت مدد کرے گا جو مسلح اقلیتوں اور بیرونی دباؤ کے ذریعے محکومی کی کوششوں کے خلاف مزاحمت کر رہی ہیں۔" بظاہر یہ بیان اقوام کی آزادی کے بارے میں تھا، لیکن امریکہ کی دلچسپی مشرق وسطیٰ کے تیل سے یونان کی قربت تھی۔

امریکہ کی فوجی مدد سے بغاوت کو 1949ء میں کچل دیا گیا تھا۔ یونانی حکومت کو امریکہ کی فوجی اور معاشی امداد جاری رہی۔ یونان میں ایسو، ڈو کیمیکل، کرائسلر اور دوسری امریکی کارپوریشنوں کا سرمایہ آنا شروع ہو گیا۔ لیکن ناخواندگی، غربت اور فاقہ کش کا پھیلاؤ جوں کا توں جاری رہا۔ امریکہ ایک وحشیانہ فوجی آمریت کو اقتدار میں رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جب دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی تو چین میں پہلے سے ہی وسیع عوامی حمایت کے ساتھ کمیونسٹ تحریک کی قیادت میں ایک انقلاب کی تیاریاں جاری تھیں۔ ریڈ آرمی جو جاپانیوں کے خلاف لڑ چکی تھی اب "چنگ کائی شیک" کی بدعنوان آمریت کو ختم کرنے کے لیے لڑ رہی تھی۔ "چنگ کائی شیک" کو امریکہ کی حمایت حاصل تھی، لیکن محکمہ خارجہ کے اپنے وائٹ پیپر کے مطابق اب چین میں وہ اپنے فوجیوں اور اپنی عوام کی حمایت سے محروم ہو چکا تھا۔ جنوری 1949ء میں چینی کمیونسٹ افواج پیکنگ میں داخل ہو گئیں اور خانہ جنگی اختتام کو پہنچ گئی۔ اب چین انقلابی تحریک کے ہاتھوں میں تھا، اور اس قدیم ملک میں پہلی مرتبہ بیرونی دباؤ سے آزاد عوامی حکومت قائم ہوئی تھی۔

جنگ کے بعد کے عشرے میں امریکہ کنزرویٹوز اور لبرلز، ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس کے درمیان سرد جنگ اور اینٹی کمیونزم کے بارے میں پالیسیوں پر ایک قومی مفاہمت اور اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس قسم کا اتحاد ایک لبرل ڈیموکریٹک صدر پیدا کر سکتا تھا، جس کی بیرون ملک جارحانہ پالیسی کو کنزرویٹوز کی حمایت حاصل تھی، اور جس کے ملک کے اندر فلاحی پروگرام (ٹرومین فیئر ڈیل) لبرلز کے لیے پرکشش تھے۔ 1950ء میں ایک ایسا واقعہ (ٹرومین کی کوریا میں غیر اعلانیہ جنگ)

رونما ہوا جس نے لبرلز اور کنزرویٹوز کے درمیان اتفاق رائے کے عمل کو تیز تر کر دیا۔

کوریا، جس پر پینتیس سال تک جاپان کا قبضہ رہا، دوسری عالمی جنگ کے بعد آزاد ہو کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، شمالی کوریا اپنی کمیونسٹ آمریت کے ساتھ سوویت یونین کے حلقہ رسوخ میں تھا، اور دائیں بازو کی آمریت کے ساتھ جنوبی کوریا امریکی حلقہ ارادت میں تھا۔ دونوں کے درمیان دھمکیوں کا تبادلہ ہوتا چلا آ رہا تھا جب 25 جون 1950ء میں شمالی کوریا کی افواج نے جنوب کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے 38 عرض بلد سے پار جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا۔ اقوام متحدہ نے جس پر امریکہ کا تسلط تھا اس مسلح حملے کو پسپا کرنے کے لیے اپنے ممبران سے مدد طلب کی اور امریکہ کی فوج اقوام متحدہ کی فوج بن گئی۔ ٹرومین نے کہا: "بین الاقوامی معاملات میں طاقت کے راج کا جواب دینا دور رس اثرات کا حامل ہوگا۔ امریکہ قانون کی حکمرانی کی سربلندی کے لیے کام کرتا رہے گا۔"

"طاقت کی حکمرانی" کا جو جواب امریکہ نے دیا، اس نے تین سال کی بمباری اور شیلنگ سے کوریا (شمالی اور جنوبی دونوں) کو تباہ و برباد کر کے ایک بوچڑ خانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ نیپام بم پھینکے گئے، جس کے ایک شکار کی حالت بی بی سی کے ایک نمائندے نے بیان کی ہے: "ہمارے سامنے ایک عجیب و غریب شکل کھڑی تھی، تھوڑی سی جھکی ہوئی، ٹانگیں پھیلی ہوئیں بازو اطراف میں پھیلے ہوئے، اس کی آنکھیں کوئی نہیں تھیں اور اس کا جسم تقریباً سارے کا سارا جو جلے ہوئے چیتھڑوں کے درمیان نظر آ رہا تھا، سخت کالے چھلکے سے ڈھکا ہوا تھا جس پر جا بجا رستی ہوئی پیلی پیپ کے داغ تھے...."

شمالی اور جنوبی کوریا دونوں کے تقریباً دو ملین افراد اس جنگ میں مارے گئے۔ یہ سب کچھ "طاقت کی حکمرانی" کے سدِ باب کے نام پر کیا گیا۔

اقوام متحدہ کی قرارداد میں مسلح حملے کو پسپا کرنے اور علاقے میں امن و تحفظ فراہم کرنے کو کہا گیا تھا۔ لیکن امریکی افواج شمالی کوریا کو واپس 38 عرض بلد کے پار دھکیلنے کے بعد شمالی کوریا میں آگے بڑھتی چلی گئیں اور چین کی سرحد پر "دریائے یالو" کے قریب پہنچ گئیں۔۔۔ جس کی وجہ سے چین کو جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ پھر چینیوں نے انہیں جنوب کی جانب دھکیلا اور جنگ 38 عرض بلد پر آ کر تعطل کا شکار ہو گئی پھر 1953ء میں گفت و شنید کے بعد شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان پرانی حد بندی کو بحال کر دیا گیا۔

کوریا کی جنگ کے نتیجے میں ملک کے اندر ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی جو بیرون ملک مداخلت اور ملک کے اندر معیشت کو فوجیانے کی پالیسی کو قائم رکھنے کے لیے قومی سطح پر اتحاد پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی۔ اس سے ان لوگوں کے لیے مشکل پیدا ہو گئی جو انقلابی ناقدین کے طور پر اتحاد سے باہر تھے۔

تیس کے عشرے کے بحرانی دور اور فاشزم کے خلاف جنگ کے دوران بایاں بازو بہت بااثر ہو چکا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کی حقیقی ممبر شپ کوئی زیادہ نہ تھی، غالباً 100,000 کے لگ بھگ تھی، لیکن یہ

ٹریڈ یونینز (جن کے ممبران کی تعداد لاکھوں میں تھی) میں، آرٹس کے شعبے میں، اور بے شمار امریکیوں میں، جو تیس کے عشرے میں سرمایہ داری نظام کی ناکامی کے باعث سوشلزم اور کیمونزم کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے، ایک مؤثر طاقت کی حامل تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اسٹیبلشمنٹ سرمایہ داری کو ملک میں زیادہ تحفظ فراہم کرنا، اور امریکی سلطنت کی حمایت کے لیے عوامی اتفاق رائے پیدا کرنا چاہتی تھی، اس کے لیے دائیں بازو کو کمزور اور تنہا کرنا ضروری تھا۔

یونان اور ترکی کے لیے ملک میں "ٹرومین ڈاکٹرائن" پیش کرنے کے دو ہفتے بعد 22 مارچ 1947ء میں ٹرومین ایگزیکٹو آرڈر 9835 جاری کیا، جس کے تحت حکومتی صفوں میں موجود "غیر وفادار" افراد کی تلاش کا پروگرام شروع کر دیا گیا، اگلے پانچ سالوں میں 6 ملین حکومتی ملازمین کی چھان بین کی گئی اور تقریباً پانچ سو افراد کو "مشکوک وفاداری" کی بنا پر فارغ کر دیا گیا۔

جنگ کے فوراً بعد عالمی واقعات نے ملک کے اندر اینٹی کیمونسٹ جہاد کی حمایت کے لیے عوامی رائے عامہ کو ہموار کرنا آسان بنا دیا تھا۔ 1948ء میں چیکوسلاواکیہ میں کیمونسٹ پارٹی نے غیر کیمونسٹ طرز حکومت کو ختم کر دیا اور اپنی حکمرانی قائم کر دی۔ اسی سال سوویت یونین نے برلن کا محاصرہ کر لیا اور جو کہ مشترکہ طور پر مقبوضہ شہر تھا اور امریکہ کو برلن میں ہوائی ذرائع سے رسد پہنچانے پر مجبور کر دیا۔ 1949ء میں چین میں کیمونسٹوں نے فتح حاصل کر لی اور اس سال سوویت یونین نے اپنا پہلا ایٹمی دھماکا بھی کیا، 1950ء میں کورین جنگ شروع ہو گئی۔ یہ تمام واقعات عوام کے سامنے عالمی کیمونسٹ سازش کے طور پر پیش کیے گئے۔

پوری دنیا میں نو آبادیوں کے لوگ آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے بغاوتیں کر رہے تھے۔ ہند چینی میں فرانسیسیوں کے خلاف، انڈونیشیا میں ولندیزیوں کے خلاف فلپائن میں امریکہ کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ براعظم افریقہ میں فرانسیسی مغربی افریقہ، کینیا اور ساؤتھ افریقہ میں ہڑتالوں کی صورت میں عدم اطمینان کی فضا چھائی ہوئی تھی۔

لہٰذا یہ محض سوویت پھیلاؤ تھا جو امریکہ کی حکومت اور امریکہ کے کاروباری مفاد کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔ حقیقت میں چین، کوریا، ہند چینی اور فلپائن مقامی کیمونسٹ تحریکوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ روسی ایجنٹ کا نتیجہ نہیں تھا یہ سامراج دشمن بغاوت کی ایک عمومی لہر تھی جسے امریکہ شکست دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے بجٹ کی عسکرکاری اور خارجہ پالیسی کے خلاف اندرونی مخالفت کو دبانے کے لیے قومی اتحاد اور اتفاق کی ضرورت تھی۔

اس ماحول میں ویسکونسن کا سینیٹر جوزف میک کارتھی، ٹرومین سے بھی دو قدم آگے جا سکتا تھا۔ "حکومتی کارروائیوں پر سینیٹ کمیٹی" کی "مستقل تحقیقات کی ذیلی کمیٹی" کے چیئرمین کے طور پر اس نے دعویٰ کیا کہ محکمہ خارجہ نے سینکڑوں کیمونسٹ ملازم رکھے ہوئے ہیں یہ ایک ایسا دعویٰ تھا جس کی اس کے

پاس کوئی شہادت نہ تھی۔ اس نے محکمہ خارجہ کے اطلاعاتی پروگرام، اس کے "وائس آف امریکہ" اور اس کی سمندر پار لائبریریوں کی جانچ پڑتال کی جن میں ایسے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں موجود تھیں جنہیں "میک کارتھی" کیمونسٹ خیال کرتا تھا۔

محکمہ خارجہ نے گھبراہٹ میں کارروائی کرتے ہوئے پوری دنیا میں اپنے لائبریری مراکز کو ہدایات بھجوائیں۔ چالیس کتابیں نکال دی گئیں جن میں "دی سلیکٹڈ ورکس آف تھامس جیفرسن" جس کو فلپ فونز نے مرتب کیا تھا، اور "ملیان مل مین" کی کتاب "دا چلڈرن ہاور" شامل تھیں کچھ کتابیں جلا دی گئیں۔

میک کارتھی کا حوصلہ مزید بڑھ گیا اس نے فوج میں مفروضہ تحریک کاروں کی تحقیقات کے لیے سماعت شروع کر دی۔ جب اس نے مشکوک کیمونسٹوں کے ساتھ مناسب سختی نہ کرنے پر جنرلوں پر حملے شروع کر دیے تو اس نے ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس دونوں کو اپنا مخالف کر لیا اور دسمبر 1954ء میں سینیٹ نے بھاری اکثریت سے اس کی مذمت میں ووٹ دیتے ہوئے اسے "رویے کی بنا پر امریکی سینیٹ کی ممبر شپ کے لیے ناموزوں قرار دے دیا۔"

عین اس وقت جب سینیٹ میک کارتھی پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے خلاف فیصلہ دے رہی تھی کانگریس میں موجود لبرل اور قدامت پسند دونوں ہی اینٹی کیمونزم کے بلوں کا ایک سلسلہ کانگریس میں پیش کر رہے تھے، لبرل "ہبرٹ ہمفری" نے کیمونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ لنڈن بی جانسن نے سینیٹ کے اقلیتی لیڈر کی حیثیت سے میک کارتھی پر ناپسندیدگی کی قرارداد کو پاس کروانے میں کردار ادا کیا۔ لیکن میک کارتھی کی کیمونسٹ دشمنی پر کوئی سوال نہ اٹھایا۔

جان ایف کینیڈی نے بطور سینیٹر میک کارتھی کے خلاف کوئی بات نہ کی (جب مذمتی ووٹ لیے جا رہے تھے وہ غیر حاضر تھا اور اس نے کبھی بات نہ کی کہ اس کا ووٹ کدھر جانا تھا)۔ میک کارتھی کا اس بات پر اصرار کہ کیمونزم چین میں اس لیے کامیاب ہوا کیونکہ امریکی حکومت کیمونزم کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی، کینیڈی کے اپنے نظریے کے نزدیک ترین تھا، جس کا اظہار اس نے جنوری 1949ء میں جب چینی کیمونسٹوں نے پیکنگ پر قبضہ کیا، ایوان نمائندگان میں ان الفاظ میں کیا:

"ہمارے سیاست کاروں اور ان کے مشیر، لیٹی موروں اور فیئر بنکوں (دونوں کا شمار چینی تاریخ کے عالموں میں ہوتا تھا، اووِن لیٹی مور، میک کارتھی کا پسندیدہ ہدف تھا اور جان فیئر بنک ہارورڈ کا ایک پروفیسر تھا) کو چین میں جمہوری نظام کے ادھورے پن پر اس قدر تشویش تھی کہ انہیں غیر کیمونسٹ چین سے وابستہ ہمارے غیر معمولی مفادات نظر نہ آ سکے.... اب اس ایوان کو تیزی سے ابھرتی ہوئی کیمونزم کی لہر کو پورا ایشیا نگلنے سے روکنے کے لیے لازماً اپنی ذمہ داریاں سنبھالنا ہوں گی۔"

لبرل سینیٹروں ہبرٹ ہمفری اور ہبرٹ لیمن نے مشتبہ تخریب کاروں کے لیے اسیری مراکز قائم کرنے کی تجویز پیش کی، جنہیں صدر کے "انٹرنل سیکورٹی ایمرجنسی" کے اعلان کے بعد بغیر کسی مقدمے کے وہاں رکھا جا سکے۔ جسے "ری پبلکنز انٹرنل سیکورٹی ایکٹ" میں شامل کر لیا گیا۔ جس میں کمیونسٹ تنظیموں کی رجسٹریشن کے لیے کہا گیا تھا اور مجوزہ کیمپ قائم کر دیئے گئے جو حسب ضرورت استعمال کے لیے تیار تھے۔ (1968ء میں اینٹی کمیونزم کی حقیقت طشت ازبام ہونے کے بعد یہ قانون منسوخ کر دیا گیا)۔

1947ء میں وفاداری کے بارے میں ٹرومین کے ایگزیکٹو آرڈر کے تحت محکمہ انصاف کو ایسی تنظیموں کی فہرست تیار کرنے کو کہا گیا جو اس کے خیال میں یک حزبی حکومت کی حامی، فاشسٹ، کمیونسٹ یا تخریب کار تھیں اور امریکہ کے طرز حکومت کو غیر آئینی طریقے سے تبدیل کرنے کی خواہش مند تھیں۔ سرکشی اور غیر وفاداری کے تعین کے لیے اٹارنی جنرل کی فہرست میں شامل کسی بھی تنظیم کی نہ صرف ممبر شپ بلکہ اس سے ہمدردی رکھنے کو بھی معیار قرار دیا گیا۔ 1954ء تک اس فہرست میں سینکڑوں گروپس شامل کئے جا چکے تھے۔

ٹرومین انتظامیہ نے سزاؤں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس نے قوم کے اینٹی کمیونزم رویے کو دوچند کر دیا۔ ان میں سب سے اہم 1950ء کے موسم گرما میں "جیولیس اور ایتھل روزنبرگ" کا کیس تھا۔

روزنبرگ پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس کے بڑے گواہ چند لوگ تھے جو پہلے ہی جاسوس ہونے کا اقرار کر چکے تھے اور یا تو جیل میں تھے یا چالان کئے گئے تھے۔ کلیدی گواہ ایتھل روزنبرگ کا بھائی "ڈیوڈ گرین گلاس" تھا۔ وہ 1944ء میں نیو میکسیکو کے شہر لاس الماس میں "مین ہیٹن پروجیکٹ لیبارٹری میں مشین مین تھا، جب وہاں ایٹم بم بنایا جا رہا تھا۔ اس نے گواہی دی کہ روزنبرگ نے اسے روسیوں کے لیے معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا۔

ہیری گولڈ جو کہ جاسوسی کے ایک دوسرے الزام میں پہلے ہی تیس سال کی قید کاٹ رہا تھا، جیل سے گرین گلاس کی گواہی کی تائید کرنے کے لیے لایا گیا۔ اُس کی روزنبرگ سے کبھی بھی ملاقات نہ ہوئی تھی، لیکن اس نے کہا کہ سوویت ایمبیسی کے ایک آفیسر نے یہ کہتے ہوئے کہ "میں جیولیس کے پاس سے آیا ہوں۔" اسے جیلی باکس کے ڈھکنے کا نصف حصہ دیا اور اُسے گرین گلاس سے رابطہ کرنے کو کہا۔ گولڈ نے بتایا کہ اس نے وہ خاکے لیے جو گرین گلاس نے اپنی یادداشت سے تیار کئے تھے اور روسی آفیسر کو دے دیئے۔

اس سارے معاملے میں کچھ پہلو پریشان کن تھے۔ کیا گولڈ نے جیل سے جلد رہائی پانے کے لیے تعاون کیا تھا؟ اپنی تیس سالہ سزا کے پندرہ سال کاٹنے کے بعد اسے پیرول پر رہا کر دیا گیا، کیا گرین گلاس (جب اس نے گواہی دی وہ زیر چالان تھا) بھی یہ بات جانتا تھا کہ اس کی زندگی کا انحصار اس کے تعاون پر ہے؟ اسے پندرہ سال کی سزا دی گئی اور آدھی سزا کاٹنے کے بعد اسے رہا کر دیا گیا تھا۔ گولڈ کی

گواہی کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتی تھی؟ بعد میں یہ بات سامنے آئی کہ اسے ایف بی آئی کے ساتھ چار سو گھنٹوں کے انٹرویوز کے بعد روزنبرگ کیس کے لیے تیار کیا گیا تھا اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ گولڈ ایک عادی اور بہت زیادہ تخیل پرست جھوٹا انسان تھا۔

اس مقدمے میں روزنبرگ کا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ تعلق ایک اہم عنصر تھا۔ جیوری نے انہیں مجرم قرار دیا اور جج "ارونگ کاف مین" نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ کوریا میں پچاس ہزار امریکی فوجیوں کی موت کے ذمہ دار ہیں، دونوں کو سزائے موت سنائی۔

مارٹن سوبل پر بھی روزنبرگ کے ساتھ شریک مجرم کے طور پر مقدمہ چل رہا تھا۔ اس کے خلاف اہم گواہ ایک پرانا دوست تھا جو کہ اس کی شادی پر شہ بالا تھا۔ جسے اپنے سیاسی ماضی کے بارے میں جھوٹ بولنے پر وفاقی حکومت کی جانب سے دروغ حلفی کے ممکنہ الزامات کا سامنا تھا۔ سوبل کے خلاف کیس اس قدر کمزور نظر آتا تھا کہ اس کے وکیل نے فیصلہ کیا کہ دفاع پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن جیوری نے سوبل کو قصوروار پایا اور "کاف مین" نے اسے تیس سال قید کا حکم سنایا۔ اسے "الکاٹ راز" بھیج دیا گیا اور پیرول پر اس کی رہائی سے بار بار انکار کیا گیا۔ رہائی سے پہلے اس نے مختلف جیلوں میں انیس سال گزارے۔

ایف بی آئی دستاویزات جو 1970ء کے عشرے میں عدالت میں طلب کی گئیں سے پتا چلا کہ جج کاف مین مدعیان کے ساتھ کیس میں دی جانے والی سزاؤں کے بارے میں خفیہ طور پر صلاح مشورے کرتا تھا۔ ایک دوسری دستاویز سے پتا چلا کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس فریڈ ونسن نے امریکہ کے اٹارنی جنرل کو خفیہ طور پر یقین دہانی کرائی کہ اگر سپریم کورٹ کا کوئی جسٹس سزا کے خلاف حکم امتناعی دیتا ہے تو وہ فوری طور پر فل کورٹ سیشن طلب کر کے اسے مسترد کر دے گا۔

عالمی سطح پر احتجاج کی ایک مہم چلی۔ البرٹ آئن سٹائن نے، جس کے خط پر روز ویلٹ نے جنگ کی ابتدا پر ایٹم بم کے لیے کام شروع کروایا، روزنبرگ کے لیے اپیل کی، جین پال سارتر، پابلو پکاسو اور بارٹولومیو وینزیٹی کی بہن نے بھی اپیلیں کیں۔ صدر ٹرومین کو بھی 1953ء میں عہدہ چھوڑنے سے کچھ دن پہلے اپیل کی گئی، جو کہ مسترد کر دی گئی۔ پھر ایک دوسری اپیل نئے صدر ڈیویٹ آئزن ہاور کو کی گئی، یہ پھر مسترد ہو گئی۔

آخری وقت پر جسٹس "ولیم او، ڈگلس" نے سزا کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔ چیف جسٹس فریڈ ونسن نے چھٹیوں پر گئے ہوئے جسٹسوں کو ملک کے مختلف حصوں سے واپس واشنگٹن لانے کے لیے سپیشل جیٹ طیارے بھجوائے، انہوں نے اس کی سزائے موت کے وقت 19 جون 1953ء سے پہلے حکم امتناعی کو کالعدم قرار دے دیا۔

پچاس کے عشرے کے اس ابتدائی دورانیے میں، "امریکہ خلاف سرگرمیوں کی ہاؤس کمیٹی"

نے امریکیوں کے کیمونسٹ تعلقات کے بارے میں چھان بین شروع کی اور انکار کرنے والوں کو قانون کی حکم عدولی پر سزا دی جاتی تھی، امریکی عوام میں ہزاروں پمفلٹ تقسیم کیے گئے "ایک سو باتیں جو آپ کو کیمونزم کے بارے میں جاننی چاہئیں" (کیمونسٹ کہاں پائے جاتے ہیں؟ ہر جگہ")۔ لبرل نے کمیٹی کو اکثر تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن کانگریس میں لبرل اور کنزرویٹو دونوں اس کے سال بہ سال فنڈز کے لیے ووٹ دیتے رہے۔

ٹرومین کے محکمہ انصاف نے کیمونسٹ پارٹی کے لیڈروں کو سمتھ ایکٹ کے تحت تشدد اور طاقت کے ذریعے حکومت الٹنے کا سبق دینے اور وکالت کرنے کی سازش کے جرم میں سزائیں دیں۔ شہادت عام طور پر یہ پیش کی جاتی تھی کہ کیمونسٹ مارکسٹ اور لیننسٹ لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ جو کہ استغاثہ کے مطابق پرتشدد انقلاب کی دعوت دیتا ہے۔ یقیناً کیمونسٹ پارٹی کی جانب سے پرتشدد انقلاب کے فوری خطرے کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی۔ لیکن سپریم کورٹ نے، جس کی سربراہی ٹرومین کا مقرر کردہ چیف جسٹس ونسن کر رہا تھا، پرانی ڈاکٹرائن "واضح اور موجود خطرہ" کا سہارا لیتے ہوئے کیمونسٹ پارٹی کی اعلیٰ قیادت کو جیل میں ڈال دیا۔

پوری فضا کیمونزم دشمنی سے بھری ہوئی تھی۔ ایک ایف بی آئی کے مخبر کی، کیمونسٹ کے طور پر اپنے استحصال کی داستان، جو کہ ایف بی آئی ایجنٹ بن گیا تھا "میں نے تین زندگیاں بسر کیں" پانچ سو اخبارات میں قسط وار شائع ہوئی اور ٹیلی ویژن پر بھی پیش کی گئی۔ ہالی ووڈ کی فلموں کے نام اس طرح کے تھے۔ "میں نے ایک کیمونسٹ کے ساتھ شادی کی۔" اور "ایف بی آئی کے لیے میں ایک کیمونسٹ تھا" 1948ء اور 1954ء کے درمیان ہالی ووڈ میں چالیس سے زیادہ اینٹی کیمونسٹ فلمیں تیار کی گئیں۔

بچوں اور جوانوں کو یہ سبق دیا جاتا تھا کہ کیمونزم دشمنی ایک جرأت منداور دلیرانہ فعل ہے۔ کارٹونوں کے ایک مزاحیہ سلسلے کا ہیرو "کیپٹن امریکہ" کہتا ہے۔ "کیمونسٹو، جاسوس غدارو، اور بیرونی ایجنٹو خبردار ہو جاؤ! کیپٹن امریکہ اپنے پیچھے تمام وفادار، محب الوطن افراد کے ساتھ تمہیں تلاش کر رہا ہے...." اور پچاس کے عشرے میں سکول کے بچے پورے ملک میں ہوائی حملوں سے بچاؤ کی مشقوں میں حصہ لیتے تھے۔ جن میں سائرن بجا کر امریکہ پر سوویت حملے کا اعلان کیا جاتا اور بچے اپنے ڈیسکوں کے نیچے اس وقت تک چھپے رہتے جب تک حملہ ختم ہونے کا سائرن نہ بجایا جاتا۔

یہ ایک ایسا ماحول تھا جس میں حکومت از سر نو اسلحہ بندی کے لیے عوامی حمایت حاصل کر سکتی تھی۔ وہ نظام جو تیس کے عشرے میں انتہائی برے حالات کا سامنا کر چکا تھا، اب پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ حربی پیداوار معاشی استحکام اور بلند شرح منافع لا سکتی ہے۔ 1960ء میں فوجی بجٹ 45.8 بلین ڈالر تھا جو کہ بجٹ کا 49.7 فی صد تھا۔ اس سال جان ایف کینیڈی صدر منتخب ہوا، اور اس نے فوری طور پر عسکری اخراجات

میں اضافہ کر دیا۔

سوویت فوجی ساز و سامان کے بارے میں من گھڑت خوف کے ایک سلسلے کے نتیجے میں اس کی بمباری اور میزائل قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، اور امریکہ نے اپنے ایٹمی اسلحہ خانہ میں اضافے کرنا شروع کیا یہاں تک کہ اسے بہت بڑی ایٹمی برتری حاصل ہو گئی۔ اس کے پاس ہیروشیما سائز کے 1500 ایٹم بم تھے جو کہ دنیا کے تمام اہم شہروں کو تباہ کرنے کے لیے کافی سے زیادہ تھے۔ ان بموں کو اہداف پر پھینکنے کے لیے امریکہ کے پاس 50 بین البراعظمی بلاسٹک میزائل، ایٹمی آبدوزوں پر 80 میزائل، سمندر پار اڈوں پر 90 میزائل، سوویت یونین تک پہنچنے کے قابل 1700 بمبار طیارے، طیارہ بردار بحری جہازوں پر ایٹمی ہتھیار لے جانے کے قابل 300 لڑاکا بمبار، اور اسی طرح ایٹم بم لے جانے کے قابل 1000 سپر سونک لڑاکا طیارے زمینی اڈوں پر موجود تھے۔

سوویت یونین واضح طور پر بہت پیچھے تھا۔ اس کے پاس پچاس سے سو کے درمیان بین البراعظمی بلاسٹک میزائل اور دو سو سے کم لمبے فاصلے تک پرواز کرنے والے بمبار طیارے تھے۔ لیکن امریکہ کا فوجی بجٹ بڑھتا چلا گیا، جنگی ہسٹریا کو ہوا دی جاتی رہی، دفاعی اور حربی ساز و سامان کے ٹھیکے لینے والی کارپوریشنوں کے منافع جات کئی گنا ہو گئے، ملازمتوں اور معاوضوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، اور امریکی آبادی کے ایک بڑے حصے کے روزگار کا انحصار جنگی صنعت پر تھا۔

اس دوران امریکہ مخصوص ممالک کو معاشی امداد دے کر دنیا پر امریکی کارپوریٹ کنٹرول کا ایک نیٹ ورک اور امداد لینے والے ممالک پر اپنا سیاسی اثر و رسوخ قائم کر رہا تھا۔ 1948ء کا "مارشل پلان" جس کے تحت مغربی یورپی ممالک کو چار سال میں 16 بلین ڈالر کی معاشی امداد دی گئی کا مقصد امریکی برآمدات کے لیے مارکیٹ پیدا کرنا تھا۔

مارشل پلان کا ایک سیاسی محرک بھی تھا۔ اٹلی اور فرانس کی کیمونسٹ پارٹیاں بہت مضبوط تھیں اور امریکہ نے ان ممالک کی کابینہ سے کیمونسٹوں کو باہر رکھنے کے لیے دباؤ اور رقم کے استعمال کا فیصلہ کیا۔

1952ء کے بعد بیرونی امداد کو غیر کیمونسٹ ممالک میں زیادہ سے زیادہ فوجی قوت قائم کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ جب جان ایف کینیڈی نے صدارت کا عہدہ سنبھالا تو اس نے لاطینی امریکہ کے لیے مدد کا ایک پروگرام "الائنس فار پروگرس" شروع کیا، جس میں لوگوں کے بہتر معیار زندگی کے لیے سماجی اصطلاحات پر زور دیا گیا۔ لیکن دراصل یہ دائیں بازو کی آمریت کو اقتدار میں رکھنے اور ان کو انقلابات کی زد سے بچانے کے لیے ایک فوجی امداد تھی۔

اس فوجی امداد کو فوجی مداخلت میں تبدیل کرنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ 1953ء میں جب ایران نے اپنی آئل انڈسٹری کو نیشنلائز کیا تو سی آئی اے نے حکومت کو ہی ختم کرا دیا۔ 1954ء میں گوئٹے

مالا میں ایک قانونی طور پر منتخب حکومت کو، جو کہ جمہوریہ گوئٹے مالا کی سب سے زیادہ جمہوری حکومت تھی، کرایہ کے فوجیوں کے ذریعے حملہ کروا کر ختم کر دیا گیا، جن کی تربیت ہنڈراس اور نکارا گوا کے فوجی اڈوں پر سی آئی اے نے کی تھی اور ان کی مدد کے لیے چار امریکی لڑاکا طیارے بھی تھے جن کو امریکی پائلٹ اڑا رہے تھے۔

گوئٹے مالا کا صدر جیکب اربنز ایک مائل بہ اشتراکیت سوشلسٹ تھا۔ کانگریس کی چھپن سیٹوں میں سے چار کیمونسٹوں کے پاس تھیں۔ امریکہ کے کاروباری مفادات کے لیے جو سب سے زیادہ پریشان کن بات ہوئی وہ یہ تھی کہ اربنز نے "یونائیٹڈ فروٹ" کی 234,000 ایکٹرز میں زر تلافی کی پیش کش کرتے ہوئے قبضے میں لے لی تھی، جو کہ "یونائیٹڈ فروٹ" کو قابل قبول نہ تھا۔ امریکی منصوبے کے مطابق کرنل کاسٹیلو آرمس کو اقتدار میں لایا گیا جس نے کنساس کے فورٹ لیون ورتھ میں فوجی تربیت حاصل کی تھی۔ اس نے "یونائیٹڈ فروٹ" کو زمین واپس کر دی، بیرونی سرمایہ کاروں کو سود اور حصص پر ٹیکس معاف کر دیا، خفیہ رائے دہی کا خاتمہ کر دیا اور ہزاروں سیاسی مخالفین کو جیل میں ڈال دیا۔

1958ء میں آئزن ہاور حکومت نے لبنان میں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہاں کی امریکہ نواز حکومت کو انقلاب کے ذریعے گرایا نہ جا سکے اور تیل سے بھرپور علاقے میں مسلح موجودگی کو قائم رکھنے کے لیے، بحریہ کے ہزاروں فوجیوں کو وہاں بھیجا۔

انقلابی حکومتوں کو، خواہ وہ کیمونسٹ ہوں، سوشلسٹ ہوں یا یونائیٹڈ فروٹ کے مخالف ہوں، گرانے یا ختم کرنے کے لیے ڈیموکریٹ اور ری پبلکن، لبرل اور کنزرویٹو میں پائے جانے والے اتفاق رائے کا واضح ترین ثبوت ہمیں کیوبا میں ملتا ہے۔ کیوبا کے فوجی آمر "فل جنسیو باتیستا" کو کئی سالوں سے امریکہ کی حمایت حاصل تھی۔ امریکہ کے کاروباری مفادات کیوبا کی معیشت پر غالب تھے اور کیوبا کی 80 سے 100 فی صد تک یوٹیلیٹیز (رفاہ عامہ کی خدمات)، کانیں، مویشی فارم اور آئل ریفائنریاں، 40 فی صد شوگر انڈسٹری اور 50 فی صد پبلک ریلویز ان کے کنٹرول میں تھیں۔

فیڈرل کاسترو کی چھوٹی سی گوریلا فورس جنگلوں اور پہاڑوں میں باتیستا کے فوج سے برسرپیکار تھی، جس کو زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت حاصل ہو رہی تھی، پھر وہ جنگلوں سے اور پہاڑوں سے باہر آ کر مارچ کرتے ہوئے ہوانا پہنچ گئے۔ باتیستا کی حکومت 1959ء کے سال نو کے دن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر خاتمے کو پہنچ گئی۔

اقتدار میں آ کر کاسترو نے قومی سطح پر تعلیم، رہائش اور بے زمین کسانوں میں زمین کی تقسیم کا کام شروع کیا۔ حکومت نے تین امریکی کمپنیوں سے ایک ملین ایکٹر سے زائد زمین قبضے میں لے لی جن میں "یونائیٹڈ فروٹ" بھی شامل تھی۔

کیوبا کو اپنے پروگراموں میں مالی معاونت کی ضرورت تھی۔ لیکن امریکہ کے زیر تسلط انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (بین الاقوامی مالیاتی فنڈ) نے قرضہ دینے سے انکار کر دیا، کیونکہ کیوبا نے اس کی "استحکام" کی شرائط کو تسلیم نہیں کیا تھا جو اُس کے انقلابی پروگرام کے لیے نقصان دہ تھیں، جس کا آغاز کیا گیا تھا۔ ان حالات میں کیوبا نے سوویت یونین کے ساتھ ایک تجارتی معاہدے پر دستخط کئے تو امریکی ملکیت کی حامل آئل کمپنیوں نے سوویت یونین سے آنے والے خام تیل کو ریفائن کرنے سے انکار کر دیا، کاسترو نے ان کمپنیوں پر قبضہ کر لیا۔ امریکہ نے کیوبا سے چینی کی خرید میں کمی کر دی جس پر کیوبا کی معیشت کا انحصار تھا۔ سوویت یونین فوری طور پر 700,000 ٹن چینی خریدنے پر رضامند ہو گیا، جو امریکہ نے خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔

1960ء کے موسم بہار میں صدر آئزن ہاور نے خفیہ طور پر سی آئی اے کو گوئٹے مالا میں جلاوطن کاسترو دشمن کیوبنز، کو کیوبا پر مستقبل میں حملہ کے لیے مسلح کرنے اور تربیت دینے کی اجازت دے دی۔ جب جان ایف کینیڈی نے عہدہ سنبھالا تو وہ اس منصوبے پر مزید آگے گیا۔ اور 17 اپریل 1961ء کو سی آئی اے کی تربیت یافتہ فوج جس میں کچھ امریکی بھی شامل تھے، ہوانا سے 90 میل کیوبا کی جنوبی ساحل پر "خلیج پگز" پر اتری۔ انہیں توقع تھی کہ وہ جنرل کاسترو کے خلاف عوامی بغاوت کھڑی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن یہ ایک مقبول حکومت تھی۔ وہ کسی قسم کی بغاوت پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ تین دنوں میں سی آئی اے کی فوجوں کو کاسترو کی فوج نے کچل دیا۔

"خلیج پگز" کا سارا معاملہ ہی منافقت اور جھوٹ پر قائم تھا۔ یہ حملہ اس معاہدے کی خلاف ورزی تھا، جس پر امریکہ نے "چارٹر آف دا آرگنائزیشن آف امریکن سٹیٹس" کے نام سے دستخط کئے تھے۔ جس کے مطابق "کوئی بھی ریاست یا ریاستوں کا گروپ کسی دوسری ریاست کے بیرونی یا اندرونی معاملات میں، خواہ اس کی جو بھی وجہ ہو، بلاواسطہ یا بالواسطہ مداخلت کا حق نہیں رکھتا تھا۔"

حملے سے چار دن پہلے، کیونکہ خفیہ اڈوں اور حملہ آوروں کی سی آئی اے کے تحت تربیت کے بارے میں پریس رپورٹس موجود تھیں، صدر کینیڈی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا "کسی بھی صورت میں امریکہ کی افواج کی جانب سے کیوبا میں کوئی بھی مداخلت نہیں کی جائے گی۔" یہ بات سچ تھی کہ وہاں اترنے والی فوجیں کیوبن تھیں، لیکن یہ سب کچھ امریکہ نے منظم کیا تھا اور امریکی جہاز بشمول امریکی پائلٹوں کے اس میں ملوث تھے، کینیڈی نے بغیر نشان کے بحریہ کے جیٹ طیاروں کو حملے میں استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ ان جہازوں کے چار امریکی پائلٹ مارے گئے تھے، اور ان کے خاندان والوں کو ان کے مرنے کے بارے میں کبھی بھی سچ نہ بتایا گیا۔

ملک کی مخصوص بڑی اخبارات نے کیوبا پر حملے کے بارے میں امریکی عوام کو دھوکا دینے کے

لیے کینیڈی انتظامیہ سے بھر پور تعاون کیا۔ "دا نیو ریپبلک" نے حملے سے چند ہفتے پہلے کیوبا کے جلاوطن لوگوں کو سی آئی اے کی تربیت کے بارے میں ایک مضمون شائع کرنے ہی والا تھا، کینیڈی نے اسے یہ مضمون شائع نہ کرنے کو کہا اور "دا نیو ریپبلک" نے اس کے کہنے پر عمل کیا، یہی کچھ "نیو یارک ٹائمز" نے بھی کیا۔

1960ء کے لگ بھگ دوسری عالمی جنگ کے پندرہ سال بعد "نیو ڈیل" اور جنگ کے سالوں کے دوران اٹھنے والی کیمونسٹ انقلاب پسندوں کی طاقتور لہر کو دبانے کی کوشش کامیاب ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کیمونسٹ پارٹی ابتری کا شکار تھی، اس کے لیڈر جیلوں میں تھے، اس کی ممبر شپ سکڑ چکی تھی، ٹریڈ یونین تحریک میں اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ ٹریڈ یونین تحریک خود بھی زیادہ قابو میں اور اعتدال پسند ہو چکی تھی۔ قومی بجٹ کا نصف حصہ فوجی بجٹ پر صرف ہو رہا تھا اور عوام اسے قبول کر رہی تھی۔

ایٹمی ہتھیاروں کے ٹیسٹ انسانی صحت کے لیے خطرناک اثرات کے حامل تھے لیکن عوام اس سے آگاہ نہ تھی۔ "اٹامک انرجی کمشن" اس بات پر مصر تھا کہ ایٹمی ٹیسٹوں کے مہلک اثرات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے، اور 1955ء کے ریڈرز ڈائجسٹ (امریکہ میں سب سے بڑی سرکولیشن کا حامل رسالہ) میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کہا گیا تھا: "ملک کے ایٹمی ٹیسٹوں کے بارے میں خوف پھیلانے والی داستانوں میں کوئی سچائی نہیں ہے۔"

پچاس کے عشرے میں ہوائی حملے سے بچاؤ کے لیے پناہ گاہوں کے بارے میں ایک پرجوش ہلچل پائی جاتی تھی، عوام کو بتایا جا رہا تھا کہ یہ انہیں ایٹمی دھماکوں سے محفوظ رکھیں گے۔ ایک سیاسی سائنسدان ہنری کیسنجر نے 1957ء میں ایک کتاب لکھی، جس میں اس نے کہا: "مناسب تدابیر سے ایٹمی جنگ اتنی تباہ کن نہیں رہتی جتنا کہ یہ نظر آتی ہے۔"

ملک مستقل جنگی معیشت پر چل رہا تھا جس میں غربت میں گھرے علاقے بھی موجود تھے، لیکن حالات کو پرامن رکھنے کے لیے کافی لوگوں کو ملازمتیں میسر تھیں اور وہ مناسب معاوضے حاصل کر رہے تھے۔ دولت کی تقسیم بدستور غیر مساویانہ تھی۔ 1953ء میں 1.6 فی صد بالغ افراد کے پاس 80 فی صد سے زیادہ کارپوریٹ حصص اور تقریباً 90 فی صد کارپوریٹ بانڈز تھے۔ 200,000 کارپوریشنوں میں سے 200 کارپوریشنیں (ایک فی صد کارپوریشنوں کا دسواں حصہ) قوم کی صنعتی دولت کے 60 فیصد پر قابض تھیں۔

جب جان ایف کینیڈی نے اپنی صدارت کے پہلے سال میں قوم کو اپنا بجٹ پیش کیا، تو یہ بات واضح ہو گئی کہ دولت کی تقسیم میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں لائی جائے گی۔ "نیو یارک ٹائمز" کے کالم نگار جیمز ریسٹن نے کینیڈی کے بجٹ مشورہ جات کو "بے روزگاری کے مسئلے پر کسی براہ راست قدم" سے احتراز قرار دیا، اس نے کہا: "اس نے پلانٹ کی توسیع اور تجدید کے لیے کاروباری سرمایہ کاری کو ٹیکس سے

چھوٹ دینے میں رضامندی کا اظہار کیا۔ اس نے شہری حقوق پر جنوبی کنزرویٹوز کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے یونینز کو معاوضوں کے مطالبات کو کم رکھنے پر زور دیا.... ان بارہ ماہ میں صدر نے امریکی سیاست میں حتمی مفاہمت کی جانب سفر کیا ہے۔"

اس مفاہمت کا مطلب سب کچھ جوں کا توں قائم رکھنا تھا۔ سیاہ فاموں کے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ معاشی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ایک جارحانہ خارجہ پالیسی جاری رکھی جا سکتی تھی۔ اور پھر 60 کے عشرے میں امریکی زندگی کے ہر میدان میں دھماکا خیز بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جس سے ثابت ہو گیا کہ نظام کے تحفظ کے تمام اندازے اور کامیابیاں غلط تھیں۔

کیا یہ اچانک پھٹ پڑتا ہے؟

1950ء اور 1960ء کے عشروں کی سیاہ فاموں کی بغاوتیں، شمال اور جنوب دونوں میں اچانک اور غیر متوقع طور پر شروع ہوئیں۔ لیکن شاید یہ غیر متوقع نہیں تھیں، ظلم و استبداد کے شکار لوگوں کی یادداشت ختم نہیں کی جا سکتی، اور ایسی یادوں کے ساتھ ایسے لوگوں میں بغاوت ہمیشہ سطح سے ایک انچ نیچے ہوتی ہے۔ امریکہ کے سیاہ فاموں کے لیے غلامی کی یادیں تھیں، اور اس کے بعد معاشرے میں امتیازی سلوک، علیحدگی، مشتعل ہجوم کے ہاتھوں قتل اور تذلیل کی یادیں تھیں۔ اور یہ محض یادیں نہیں بلکہ ایک موجود حقیقت تھی جو کہ نسل در نسل سیاہ فاموں کی روزمرہ زندگی کا ایک حصہ تھا۔

1930ء کے عشرے میں لانگسٹن ہیوز نے ایک نظم "لینکس ایونیو میورل" لکھی:

ادھورے خواب کا کیا انجام ہوتا ہے؟
کیا یہ دھوپ میں رکھے ہوئے
پھل کی طرح خشک ہو جاتا ہے؟
یا ناسور کی طرح مواد سے بھر جاتا ہے
اور پھر اچانک بہہ نکلتا ہے؟
یا یہ گلے سڑے گوشت کی طرح تعفن دینے لگتا ہے؟
یا شراب میں راب کی مانند
اس پر پپڑی جم جاتی ہے؟

ہو سکتا ہے کہ بھاری وزن کی طرح محض جھک جائے

یا پھر یہ اچانک پھٹ پڑتا ہے؟

ایک ایسے معاشرے میں جہاں پیچیدہ پابندیاں اور ضابطے موجود ہوں، وہاں لوگ اپنے دبے ہوئے جذبات کا اظہار فنون کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہی حال امریکہ کے سیاہ فام معاشرے کا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ "بلیوز" اپنی جانگدازی کے باوجود خفگی اور برہمی کے حامل ہوں، "جاز" کیسے ہی خوش کن کیوں نہ ہوں کسی انقلاب کے نقیب ہوں۔ پھر شاعری میں اظہار کوئی زیادہ ڈھکا چھپا نہ تھا۔ 1920ء کے عشرے میں "کلاڈ مک کے" جو کہ ان افراد میں سے ایک تھا جنہیں بعد میں "ہارلم رینیسانس" کا نام دیا گیا، نے ایک نظم لکھی، جسے "ہنری کیبٹ لاج" نے سیاہ فام نوجوانوں میں پائی جانے والی خطرناک لہر کے نمونے کے طور پر کانگریس کے ریکارڈ میں شامل کر دیا:

اگر ہم نے مرنا ہی ہے تو پھر پالتو سوروں کی طرح
باڑوں میں بند ذلت آمیز موت کیوں قبول کریں....
مردوں کی طرح ہم بزدل قاتلوں کی ٹولی کا سامنا کریں گے،
دیوار کے ساتھ لگے ہوئے، مرتے ہوئے، لیکن لڑتے ہوئے!

"کاؤنٹی کولن" کی نظم "انسیڈنٹ" ہر سیاہ فام امریکی کی بچپن کی یادداشتوں کو جگاتی ہے:

ایک مرتبہ بالٹی مور میں سفر کرتے ہوئے،
جب میرا وجود خوشی سے بھرا ہوا تھا،
مین نے ایک بالٹی مورین کو دیکھا
جو سیدھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں اس وقت آٹھ سال کا اور بہت چھوٹا تھا،
اور وہ مجھ سے کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا،
میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا، لیکن اس نے
اپنی زبان باہر نکالی اور کہا "نیگر۔"

میں مئی سے دسمبر تک
پورے بالٹی مور میں گھوما پھرا؛
وہاں جو کچھ بھی گزرا
یہی بات ہے جو مجھے آج بھی یاد ہے۔

1940ء کے دور میں "رچرڈ رائٹ" جو کہ ایک باصلاحیت سیاہ فام ناول نگار تھا، اس نے اپنی آپ بیتی "بلیک بوائے" میں لکھا کہ کس طرح سفید فام آدمیوں کی تفریح کے لیے اسے ایک دوسرے سیاہ فام لڑکے کے ساتھ لڑنے پر مجبور کیا گیا۔ "بلیک بوائے" بغیر کسی شرم کے ہر قسم کی تذلیل کو بیان کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی اپنی اندرونی سرکشی کا اظہار بھی کرتا ہے:

جنوب کے سفید فام خیال کرتے تھے کہ وہ "نیگرز" کو جانتے ہیں۔ وہ میں تھا جسے یہ "نیگر" کہتے تھے۔ وہ مجھے کبھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جو میں سوچتا تھا جو محسوس کرتا تھا اس کا انہیں کبھی علم نہیں ہو سکتا تھا.... میرے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں کسی طور پر بھی ایک گھٹیا انسان ہوں۔ اور ان جنوبی سفید فاموں کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ، بھی جو میں نے سنا تھا، کبھی بھی مجھے اپنی انسانیت کے بارے میں شک میں مبتلا نہیں کر سکا تھا۔

جنوب میں پولیس تشدد اور ہجوم کے ہاتھوں قتل و غارت کے باوجود سیاہ فام مزاحمت کر رہے تھے۔ کیمونسٹ پارٹی "الباما" میں ان 9 نوجوان سیاہ فاموں کے دفاع میں پوری طرح سرگرم تھی جن پر عصمت دری کا جھوٹا مقدمہ بنایا گیا تھا۔

1932ء میں جورجیا میں ایک انیس سالہ نوجوان سیاہ فام انجیلو ہرنڈن نے، جس کا باپ کان کنوں کے نمونیہ کی وجہ سے مر گیا تھا اور جو "کینٹکی" میں لڑکپن کے دوران کانوں میں کام کرتا رہا تھا، برمنگھم میں کیمونسٹ پارٹی کی قائم کی گئی "اَن ایمپلائمنٹ کمیٹی" میں شمولیت اختیار کر لی اور پھر پارٹی میں شامل ہو گیا۔ بعد میں اس نے لکھا:

> اپنی ساری زندگی میں محنت کرتا رہا، پسینہ بہاتا رہا، اور "جم کرو" (علیحدگی کا قانون) کا نشانہ بنا رہا۔ میں چند ڈالر ہفتہ کے لیے کانوں میں پیٹ کے بل لیٹتا رہا، اور ٹراموں میں "سیاہ فام" کے بورڈ کے پیچھے بیٹھ کر سفر کرتا رہا، جیسا کہ میں کوئی قابل نفرت مخلوق ہوں۔ لوگ مجھے "نیگر" اور "ڈارکی" کہہ کر پکارتے تھے۔ اور مجھے ہر سفید فام کو "جی جناب" کہنا پڑتا تھا خواہ اس کے دل میں میری عزت تھی یا نہیں۔
>
> مجھے اس سے ہمیشہ نفرت رہی لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے بارے میں کچھ کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور پھر اچانک مجھے ایک ایسی تنظیم نظر آئی جہاں نیگروز اور سفید فام اکٹھے بیٹھتے، اکٹھے کام کرتے تھے اور نسل یا رنگ کے کسی امتیاز کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

"ہرنڈن" "اٹلانٹا" میں کیمونسٹ پارٹی آرگنائزر بن گیا۔ اس نے اور اس کے ساتھی کیمونسٹوں نے 1932ء میں بے روزگاری کونسل کی بلاک کمیٹیاں منظم کیں، جنہوں نے ضرورت مند لوگوں کے لیے کرایوں میں اعانت حاصل کی۔ انہوں نے ایک مظاہرے کا بندوبست کیا جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی جن میں چھ سو سفید فام بھی شامل تھے اور اگلے دن بلدیہ نے بے روزگاروں کے لیے 6000 ڈالر کی مدد کے لیے ووٹ دیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہرنڈن کو گرفتار کر لیا گیا، کسی سے رابطہ نہ کرنے دیا گیا اور اس پر "جورجیا کے بغاوت کے خلاف قانون" کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اپنے مقدمے کے بارے میں اس نے بتایا:

> جورجیا کی ریاست نے وہ تحریری مواد پیش کیا جو میرے کمرے سے برآمد ہوا تھا، اور جیوری کو اس کے مختلف پیراگراف پڑھ کر سنائے۔ پھر انہوں نے مجھے بڑی تفصیل سے بے شمار سوالات پوچھے۔ کیا میں سمجھتا ہوں کہ مالکان اور حکومت کو بے روزگار کارکنوں کی انشورنس ادا کرنی چاہیے؟ یہ کہ نیگروز کو سفید فاموں کے ساتھ مکمل برابری حاصل ہونی چاہیے؟ کیا میں خیال کرتا ہوں کہ محنت کش طبقہ ملیں اور کانیں چلا سکتے ہیں؟ اور یہ کہ باس کا ہونا بالکل ضروری نہیں؟
>
> "میں نے انہیں کہا میں اس سب پر یقین رکھتا ہوں... اس کے علاوہ کچھ اور باتوں پر بھی....

ہرنڈن کو مجرم قرار دے دیا گیا اور اس نے پانچ سال جیل میں گزارے حتیٰ کہ 1937ء میں سپریم کورٹ نے جورجیا کے قانون کو جس کے تحت وہ مجرم گردانا گیا تھا غیر آئینی قرار دے دیا۔ سیاہ فاموں میں اس جیسے افراد تھے جو اسٹیبلشمنٹ کے خلاف خطرناک مخاصمت رکھتے تھے۔ اور کیمونسٹ پارٹی کے ساتھ منسلک ہو کر زیادہ خطرناک ہو جاتے تھے۔

کچھ دوسرے اہم سیاہ فام لوگ بھی کیمونسٹ پارٹی کے ساتھ منسلک تھے۔ جیسے کہ سیاہ فام وکیل بنجمن ڈیوس، جس نے ہرنڈن کا اس کے مقدمے میں دفاع کیا تھا، قومی سطح پر مشہور افراد جیسے کہ گلوکار اور اداکار "پال روبن سن" اور مصنف اور سکالر ڈبلیو، ای، بی، ڈو بوئس۔

سیاہ فاموں کا باغیانہ مزاج جو تیس کے عشرے میں مختلف جگہوں پر نظر آتا تھا، وہ دوسری عالمی جنگ کے دوران سطح کے نیچے سنسنا رہا تھا، جبکہ قوم ایک طرف نسل پرستی کی مذمت کر رہی تھی اور دوسری جانب مسلح افواج میں علیحدگی کو قائم رکھے ہوئے تھی، اور سیاہ فاموں کو کم معاوضوں والے کاموں پر رکھا ہوا تھا، جب جنگ ختم ہو گئی تو امریکہ کے نسلی توازن میں ایک نیا عنصر داخل ہوا، جو کہ افریقہ اور ایشیا میں سیاہ فام اور زرد فام اقوام کی بڑے پیمانے پر بغاوتیں تھیں جن کی مثال ماضی میں نہیں ملتی تھی۔

صدر ہیری ٹرومین کو جنگ کے بعد سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والی رقابت کے ساتھ ساتھ اس مسئلے سے بھی نبٹنا پڑ رہا تھا، اب نہ صرف ملک کے اندر بسنے والے سیاہ فاموں کو جو جنگ کے دوران کیے گئے وعدوں سے دلیر ہو چکے تھے، اور اپنی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ دیکھتے ہوئے مایوسی کا شکار ہو رہے تھے، کو مطمئن کرنے کے لیے نسلی مسئلے پر کارروائی ضروری ہو چکی تھی، بلکہ بیرون ملک غیر سفید فام دنیا میں امریکہ کے بارے میں قائم نسلی معاشرے کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے بھی ایسی کارروائی ضروری تھی۔ "ڈو بوئس" نے بہت عرصہ پہلے جو بات کہی تھی، یعنی "بیسویں صدی کا مسئلہ رنگ کے امتیاز کا مسئلہ ہے" اب 1945ء میں سروں پر منڈلا رہی تھی۔

ٹرومین نے 1946ء کے آخر میں شہری حقوق کے مسئلے پر ایک کمیٹی قائم کی جس نے تجویز پیش کی کہ شہری حقوق پر ایک مستقل کمیشن قائم ہونا چاہیے۔ کانگریس نے ہجوم کے ہاتھوں سیاہ فاموں کے قتل کے خلاف، ووٹنگ اور ملازمتوں میں نسلی امتیاز کو ختم کرنے کے لیے قوانین تجویز کیے۔

ٹرومین کی کمیٹی اپنے مقصد کے حصول میں بہت بے باک اور صاف گو تھی۔ اس نے کہا کہ نسلی امتیاز کے خاتمے کی "اخلاقی وجہ" کے ساتھ ساتھ ایک "معاشی وجہ" بھی ہے۔ یہ امتیاز ملک کو بہت مہنگا پڑ رہا تھا اور اس کی صلاحیتوں کا ضیاع تھا۔ اور شاید سب سے اہم وجہ بین الاقوامی اہمیت کی حامل تھی۔ "جنگ کے بعد کی دنیا میں ہماری حیثیت مستقبل کے حوالے سے اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ ہماری ادنیٰ ترین کارروائیاں بھی دور رس نتائج مرتب کریں گی۔ ہم اس حقیقت سے فرار حاصل نہیں کر سکتے کہ ہمارا شہری حقوق کا ریکارڈ عالمی سیاست میں ایک اہم معاملہ رہا ہے۔"

اب امریکہ دنیا میں اس طرح سے ابھر کر سامنے آیا تھا کہ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دنیا میں اس کی برتری داؤ پر لگی ہوئی تھی اور ٹرومین کی کمیٹی نے کہا تھا "ہماری ادنیٰ ترین کارروائیاں دور رس نتائج مرتب کریں گی۔"

اور امریکہ نے یہ امید رکھتے ہوئے ادنیٰ کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا کہ ان کے دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ کانگریس نے اس قانون سازی کے لیے کوئی اقدامات نہ اٹھائے جس کا شہری حقوق کی کمیٹی نے مشورہ دیا تھا۔ لیکن ٹرومین نے 1948ء کے صدارتی انتخابات سے چار ماہ قبل، جب اس کا مقابلہ بائیں بازو کی پروگریسو پارٹی کے امیدوار "ہنری ویلیس" سے تھا، ایک ایگزیکٹو آرڈر جاری کیا، جس میں مسلح افواج کو، جو دوسری عالمی جنگ میں نسلی علیحدگی کی حامل تھیں، "جس قدر جلدی ممکن ہو سکے" نسلی برابری کی پالیسیاں نافذ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس آرڈر کے فوری طور پر جاری کیے جانے کی وجہ محض انتخابات ہی نہیں بلکہ مسلح افواج میں سیاہ فاموں کے حوصلے کو بلند کرنا بھی تھا، جیسا کہ جنگ کے امکانات بڑھ چکے تھے۔ فوج میں اس نسلی امتیاز کے خاتمے کو دس سال سے زیادہ کا عرصہ لگا۔

ٹرومین دوسرے شعبوں میں بھی ایگزیکٹو آرڈر جاری کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ چودھویں اور پندرھویں ترامیم اور 1860ء اور 1870ء کے عشروں میں پاس کیے جانے والے قوانین نے نسلی امتیازات کو ختم کرنے کے لیے صدر کو کافی اختیارات دیے تھے۔ آئین میں صدر کو قوانین نافذ کرنے کے اختیارات دیے گئے تھے، لیکن کسی صدر نے بھی اس اختیار کو استعمال نہ کیا، اور نہ ہی ٹرومین نے کیا۔

جب جنوب کے جرأت مند سیاہ فاموں نے سکولوں میں نسلی علیحدگی کے خلاف سپریم کورٹ میں چارہ جوئی کے لیے مقدمات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تو آخرکار 1954ء میں عدالت نے "علیحدگی لیکن برابری" کے نظریے کو قلم زد کر دیا، جس کا وہ 1890ء سے دفاع کرتی آ رہی تھی۔ براؤن بنام بورڈ

آف ایجوکیشن کے مقدمے میں عدالت نے قرار دیا کہ سکول کے بچوں میں علیحدگی "کمتری کا ایک احساس پیدا کرتی ہے جو بچوں کے ذہنوں اور دلوں پر ایسے اثرات مرتب کرتی ہے جن کا ازالہ ممکن نہیں ہے۔" عدالت نے مزید کہا کہ سرکاری تعلیم کے میدان میں "علیحدگی، لیکن برابری کی سطح پر" کے نظریے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

عدالت نے فوری تبدیلی پر کوئی اصرار نہ کیا، اس نے کہا کہ علیحدگی کے عمل کو ایک مناسب رفتار سے ختم کر دیا جائے، لیکن 1965ء میں اس فیصلے کے دس سال بعد جنوب کے علاقوں میں 75 فی صد سے زیادہ سکولوں میں نسلی علیحدگی کا عمل جاری تھا۔

اس کے باوجود یہ ایک ڈرامائی فیصلہ تھا، اور 1954ء میں پوری دنیا میں یہ پیغام پہنچ گیا کہ امریکی حکومت نے نسلی علیحدگی کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ خود امریکہ میں بھی ان لوگوں کے لیے جو الفاظ اور حقیقت کے درمیان تفاوت کو نہیں سمجھتے یہ ایک مسرت انگیز تبدیلی تھی۔

دوسرے لوگوں کے لیے یہ ایک بڑی پیش رفت تھی جبکہ سیاہ فاموں کے نزدیک یہ سب کچھ کافی نہیں تھا۔ 1960ء کے عشرے کے اوائل میں پورے جنوب میں سیاہ فام ایک بڑی بغاوت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ساٹھ کے عشرے کے اختتام پر شمال کے سو کے قریب شہر شدید قسم کی سیاہ فام بغاوت کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ یقیناً یہ ان لوگوں کے لیے حیرانی کا باعث تھا جن کو غلامی اور ہر روز تذلیل کا وہ دور یاد نہیں تھا، جس کا اظہار شاعری' موسیقی اور گاہے گاہے اٹھنے والی برہمی اور زیادہ تر خاموش خفگی میں ہوتا تھا۔ ان یادوں میں سیاستدانوں کے کہے ہوئے وہ الفاظ' پاس کیے گئے قوانین اور عدالتوں کے فیصلے بھی شامل تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ بے معنی ثابت ہوئے تھے۔

ایسے لوگوں کے لیے جن کے دل تلخ یادوں سے بھرے ہوں اور ماضی کے ظلم واستبداد کو ہر روز دہرایا جا رہا ہو' بغاوت چند ساعتوں کے فاصلے پر رہتی ہے، اس کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا لیکن کوئی بھی غیر متوقع واقعہ اس الاؤ بھڑکانے کا سبب بن سکتا ہے، اور یہ واقعات 1955ء کے آخر میں الباما کے دارالحکومت "منٹگمری" میں اس وقت ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے جب ایک دوشیزہ "مسز روسا پارکس" جو "این اے اے سی پی" میں سرگرم رہی تھی، نے بس کے سفید فاموں والے حصے میں بیٹھنے کا ارادہ کیا اور گرفتار کر لی گئی۔ "میں سارا دن سخت محنت کرنے کے بعد بہت تھک چکی تھی، میں ان کپڑوں پر کام کرتی رہی تھی جو سفید فام پہنتے ہیں۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی، اور یہی بات میں جاننا چاہتی ہوں کہ کب اور کیسے ہم اپنے انسانی حقوق حاصل کر سکیں گے؟"

منٹگمری کے سیاہ فاموں نے ایک عوامی جلسے کا بلاوا دیا۔ انہوں نے تمام بسوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ نیگروز کو ملازمتوں پر لے جانے کے لیے "کار پولنگ" کے انتظامات کیے گئے، اکثر لوگوں نے

پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ بلدیہ نے اس کے جواب میں ایک سو لیڈروں پر بائیکاٹ کے لیے اکسانے کا الزام لگایا اور بہت سے لیڈروں کو جیل بھیج دیا۔ علیٰحدگی پسند سفید فام تشدد پر اُتر آئے۔ نیگروز کے چار چرچوں میں بم دھماکے کئے گئے۔ اٹلانٹا کے ستائیس سالہ پادری ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے گھر کے دروازے پر شارٹ گن کے فائر کئے گئے جو کہ بائیکاٹ کے لیڈروں میں سے ایک تھا۔ کنگ کے گھر پر بم پھینکے گئے، لیکن منٹگمری کے سیاہ فام ڈٹے رہے اور نومبر 1956ء میں سپریم کورٹ نے مقامی بسوں میں علیٰحدگی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

منٹگمری کے یہ واقعات محض ابتدا تھے' جو کہ اس تحریک کے خدوخال اور مزاج کو ترتیب دے رہے تھے جو آئندہ دس سالوں میں پورے جنوب کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔ چرچوں میں جذباتی اجلاس منعقد کئے گئے، موجودہ جدوجہد سے مناسبت رکھنے والی چرچ کی دعائیہ نظمیں لکھی گئیں، تحریک کے دوران عدم تشدد کے عہد کئے گئے اور جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے قربانیاں پیش کرنے کے لیے رضا مندی کا اظہار کیا گیا

بائیکاٹ کے دوران منٹگمری میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے مارٹن لوتھر کنگ نے جن جذبات کا اظہار کیا اس سے متاثر ہو کر لاکھوں افراد نسلی انصاف کے مطالبے کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے کہا ہمارا احتجاج صرف بسوں کے معاملے پر نہیں بلکہ ان معاملات پر ہے جن کی جڑیں ہماری گزشتہ تاریخ کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ اس نے کہا:

> ہم نے تذلیل برداشت کی ہے' ہم نے دشنام طرازی اور بدزبانی کو برداشت کیا ہے، ہم ظلم اور استبداد کے عمیق گڑھوں میں پڑے رہے ہیں اور ہم اس کے خلاف محض احتجاج کا ہتھیار لے کر اٹھے ہیں.... ہمیں صرف محبت کا ہتھیار استعمال کرنا ہوگا۔ ہمیں اُن لوگوں کے لیے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں ہمدردی اور بردباری کے جذبات رکھنے چاہئیں۔

کنگ کے محبت اور عدم تشدد پر اصرار نے پوری قوم میں سفید فاموں اور سیاہ فاموں میں ہمدردانہ جذبات پیدا کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ لیکن کچھ سیاہ فام ایسے تھے جو اس پیغام کو معصومانہ اور سادہ لوحی پر مبنی خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں جو دوسروں کے بہکاوے میں آئے ہوئے ہیں، ان کو پیار اور محبت سے جیتا جا سکتا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ لڑنا ناگزیر ہے۔ منٹگمری بائیکاٹ کے دو سال بعد نارتھ کیرولینا کے شہر "منرو" میں ایک سابق ملاح رابرٹ ولیمز نے، جو کہ "این اے اے سی پی" کا مقامی صدر تھا، اپنے اس نظریے کی وجہ سے کہ سیاہ فاموں کو تشدد کے خلاف اپنا دفاع کرنا چاہیے، اگر ضروری ہو تو بندوق کا استعمال بھی کریں، شہرت پائی۔ جب مقامی "کلان" کے آدمیوں نے منرو میں "این اے اے سی پی" کے ایک مقامی لیڈر کے گھر پر حملہ کیا تو ولیمز اور دوسرے سیاہ

فاموں نے رائفلوں سے مسلح ہو کر جوابی حملہ کیا۔ کلان پیچھے ہٹ گیا۔ (اب کلان کو اس کی اپنی وضع کردہ حکمت عملی، یعنی تشدد کے ذریعے جواب ملنا شروع ہو گیا تھا۔ شمالی کیرولینا میں انڈینز کی ایک آبادی پر کلان کے ایک حملے کو انڈینز کی گولیاں برساتی رائفلوں نے پسپا کر دیا۔)

اس کے باوجود آنے والے سالوں میں جنوب کے سیاہ فاموں نے عدم تشدد کی پالیسی پر اصرار جاری رکھا۔ یکم فروری 1960ء میں شمالی کیرولینا کے شہر "گرینز بورو" کے نیگرو کالج کے چار نئے داخل ہونے والے طالب علموں نے اندرون شہر واقع "وول ورتھ" کے لنچ کاؤنٹر میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا، جو کہ صرف سفید فاموں کے لیے مخصوص تھا۔ انہیں سروس دینے سے انکار کر دیا گیا، لیکن انہوں نے جگہ نہ چھوڑی اور ہر روز دوسرے سیاہ فام طالب علموں کو بھی ساتھ لے کر وہاں باقاعدگی سے آنا شروع کر دیا۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران پانچ جنوبی ریاستوں کے پندرہ شہروں میں لنچ کاؤنٹر میں جا کر بیٹھنے کا یہ عمل پھیل گیا۔

نیویارک میں اپنے ہارلم اپارٹمنٹ میں میتھ میٹکس کے ایک نوجوان نیگرو استاد "بوب موسس" نے اخبار میں "گرین بورو" کے لنچ کاؤنٹر میں بیٹھے ان لوگوں کی تصویر دیکھی۔ "تصویر میں طالب علموں کے چہرے پر خفگی، غصے اور مصمم ارادے کا ایک مخصوص تاثر نظر آ رہا تھا۔ جنوب میں نیگروز ہمیشہ مدافعت کرتے اور چاپلوسی کرتے نظر آتے تھے، اس مرتبہ وہ پیش قدمی کر رہے تھے۔ وہ میری ہی عمر کے لڑکے تھے، مجھے محسوس ہوا کہ یہ بات میری اپنی زندگی پر بھی اثر انداز ہو گی۔"

اس طرح آ کر بیٹھنے والوں کے ساتھ تشدد بھی کیا گیا، لیکن اگلے بارہ ماہ میں پچاس ہزار سے زائد افراد نے، جن میں زیادہ تر سیاہ فام اور کچھ سفید فام بھی تھے، سو سے زیادہ شہروں میں مختلف قسم کے مظاہروں میں حصہ لیا، اور چھتیس سو سے زائد لوگوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ لیکن 1960ء کے آخر تک "گرینز بورو" اور دوسری بہت سے جگہوں پر لنچ کاؤنٹرز سیاہ فاموں کے لیے کھول دیے گئے۔

1961ء کے موسم میں سفید فاموں اور سیاہ فاموں کا ایک گروپ اکٹھے سفر کرتے ہوئے واشنگٹن ڈی سی سے "نیو اورلینز" کے لیے ایک ہی بس میں سوار ہوا۔ یہ پہلے "فریڈم رائیڈرز" تھے جنہوں نے بین الریاستی سفر میں علیٰحدگی کے رواج کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس قسم کی علیٰحدگی کافی عرصے سے غیر قانونی قرار دے دی گئی تھی، لیکن وفاقی حکومت نے جنوب میں اس قانون کو کبھی نافذ نہیں کیا تھا۔ اب جان ایف کینیڈی صدر تھا' لیکن وہ خود نسلی مسئلے پر بہت محتاط نظر آتا تھا اور ڈیموکریٹک پارٹی کے جنوبی سفید فام لیڈروں کی حمایت کو اہمیت دیتا تھا

یہ بسیں کبھی بھی "نیو اورلینز" نہ پہنچ پائیں۔ جنوبی کیرولینا میں ان میں سوار لوگوں کو مارا پیٹا گیا، الاباما میں ایک بس کو آگ لگا دی گئی، "فریڈم رائیڈرز" کو مکوں اور لوہے کے راڈوں سے مارا پیٹا گیا۔ جنوبی

پولیس نے اور نہ ہی وفاقی حکومت نے مداخلت کی، ایف بی آئی کے ایجنٹ دیکھتے رہے، نوٹس تیار کیے اور عملی طور پر کچھ نہ کیا۔

اس صورتحال میں لنچ کاؤنٹرز میں جا کر بیٹھنے والے طالب علموں، جنہوں نے حال ہی میں "سٹوڈنٹ نان وائلنٹ کوآرڈی نیٹنگ کمیٹی" (ایس این سی سی) تشکیل دی تھی، نے مساویانہ حقوق کی خاطر عدم تشدد پر مبنی لیکن باغیانہ روش اپناتے ہوئے "ناش ویلی" سے برمنگھم کے لیے دوسری "فریڈم رائیڈز" کا بندوبست کیا۔ روانگی سے پہلے انہوں نے واشنگٹن ڈی سی میں ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس سے تحفظ فراہم کرنے کی درخواست کی جسے ٹھکرا دیا گیا۔ جیسا کہ "سپل مین کالج" کے ایک طالب علم "روبی ڈورس سمتھ" نے بیان کیا "جسٹس ڈیپارٹمنٹ نے انکار میں جواب دیا کہ وہ کسی کا تحفظ نہیں کر سکتا، لیکن اگر کوئی واقعہ ہوا تو اس کی تحقیق کریں گے۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ کیسے تحقیق کریں گے۔"

نسلی طور پر ملے جلے "ایس این سی سی" کے "فریڈم رائیڈرز" کو الاباما کے شہر برمنگھم میں گرفتار کر لیا گیا، ایک رات جیل میں رکھا گیا اور پولیس کی نگرانی میں "ٹینی سی" کی سرحد پر لا کر چھوڑ دیا گیا، وہ واپس برمنگھم پہنچ گئے اور منٹگمری کے لیے ایک بس پکڑی، لیکن سفید فاموں کے گروہ نے ان پر مکوں اور ڈنڈوں سے حملہ کر کے انہیں لہولہان کر دیا اور وہ وہاں سے جیکسن "مسیسپی" کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس دوران "فریڈم رائیڈرز" کی خبریں پوری دنیا میں پھیل گئیں اور حکومت مزید تشدد کو روکنے کے لیے بے تاب تھی۔ اٹارنی جنرل رابرٹ کینیڈی نے ان کے آزادانہ سفر کرنے کے حق پر اصرار کرنے کے بجائے "فریڈم رائیڈرز" کی گرفتاری اور ممکنہ گروہی تشدد سے بچانے کے مسیسپی پولیس کے حوالے کرنے کی حمایت کی۔ جیل میں "فریڈم رائیڈرز" نے مزاحمت کی، احتجاج کیا اور مساویانہ حقوق کا مطالبہ کیا۔

جورجیا کے ایک دور افتادہ چھوٹے سے شہر "البانے" میں جہاں غلامی کا ماحول ابھی تک جاری تھا 1961ء کے موسم سرما اور دوبارہ 1962ء میں عوامی مظاہرے شروع ہو گئے۔ "البانے" کے بائیس ہزار سیاہ فام افراد میں سے تقریباً ایک ہزار سے زائد افراد کو جلوس نکالنے، اجتماع کرنے، اور علیحدگی اور امتیاز کے خلاف مظاہرہ کرنے کے جرم میں جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہاں اُن تمام مظاہروں کی طرح جنہوں نے پورے جنوب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، چھوٹے سیاہ فام بچوں نے بھی شرکت کی، نئی نسل بھی اب آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ البانے کا پولیس چیف وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے بعد اپنے سامنے قطار میں کھڑے قیدیوں کے نام درج کر رہا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا اور ایک تقریباً نو سال کے سیاہ فام بچے کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" بچے نے سیدھا اس کی آنکھوں دیکھتے ہوئے کہا: "فریڈم، فریڈم"۔

1963ء میں برمنگھم میں ہزاروں سیاہ فام، پولیس کے ڈنڈوں، آنسو گیس، کتوں اور بڑی شدت کے ساتھ پانی پھینکنے والے فائر بریگیڈ کے پائپوں کا سامنا کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔

اور اس دوران پورے جنوب میں "ایس این سی سی" کے نوجوان، جن میں زیادہ تر سیاہ فام اور چند ایک سفید فام بھی شامل تھے، جورجیا، الاباما، مسیسپی، آرکنساس کی آبادیوں میں سرگرم ہو چکے تھے۔ مقامی سیاہ فاموں کے تعاون سے، وہ ووٹ کے لیے ناموں کے اندراج، نسل پرستی کے خلاف احتجاج اور تشدد کے خلاف جرأت اور حوصلہ پیدا کرنے کے لیے ان کو منظم کرنے میں مصروف تھے۔

جب 1964ء کا موسم گرما شروع ہوا تو "ایس این سی سی" اور شہری حقوق کے دوسرے گروپس نے، جو مسیسپی میں مل کر کام کر رہے تھے اور بڑھتے ہوئے تشدد کا سامنا کر رہے تھے، ملک کے دوسرے حصوں سے نوجوان افراد کو مدد کے لیے بلانے کا فیصلہ کیا۔ انہیں امید تھی کہ اس طرح مسیسپی کی صورتحال کی جانب توجہ مبذول ہو سکے گی۔ مسیسپی اور دوسرے کئی مقامات پر ایف بی آئی اور جسٹس ڈیپارٹمنٹ کے وکلاء محض تماشائیوں کے طور پر کھڑے رہے، جبکہ شہری حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کو مارا پیٹا گیا، جیلوں میں بند کیا گیا اور وفاقی قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی گئی۔

"مسیسپی سمر" (جب مسیسپی میں ایس این سی سی کے رضا کاروں نے سیاہ فام آبادی کے ووٹروں کے اندراج اور نسل پرستی کے خلاف عوام کو منظم کرنا شروع کیا) کی شام، جون 1964ء کے شروع میں شہری حقوق کی تحریک نے "وائٹ ہاؤس" کے نزدیک ایک تھیٹر کرائے پر حاصل کیا، اور مسیسپی کے سیاہ فام باشندوں کی ایک بس بھر کر نیویارک پہنچی تاکہ مسیسپی میں ہونے والے روزمرہ کے تشدد اور وہاں آنے والے رضا کاروں کو درپیش خطرات کے بارے میں عوام کو شہادت مہیا کر سکیں۔ آئینی امور کے ماہر وکلاء نے تصدیق کی کہ قومی حکومت اس قسم کے تشدد کے خلاف تحفظ دینے کا اختیار رکھتی تھی۔ اس شہادت کی ایک تحریری نقل صدر جانسن اور اٹارنی جنرل کینیڈی کو "مسیسپی سمر" کے دوران حفاظتی وفاقی موجودگی کی درخواست کے ساتھ پیش کی گئی۔ جس کا کوئی ردعمل دیکھنے میں نہ آیا۔

اس عوامی سماعت کے بارہ دن بعد مسیسپی کے ایک سیاہ فام نوجوان باشندے "جیمز چینے" اور دو سفید فام رضا کاروں اینڈریو گڈمین اور مائیکل شیورز کو فلاڈلفیا، مسیسپی میں گرفتار کر لیا گیا، رات گئے انہیں جیل سے نکال کر زنجیروں سے پیٹا گیا اور پھر گولیاں مار کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ آخر کار ایک مخبر کی شہادت پر شیرف اور ڈپٹی شیرف اور دوسرے اہلکاروں کو قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ اقدامات بہت دیر سے اٹھائے گئے۔ مسیسپی میں ہونے والے یہ قتل کینیڈی، جانسن اور دوسرے صدور کی زیر صدارت قومی حکومت کی جانب سے سیاہ فاموں کو تحفظ فراہم کرنے سے بار بار انکار کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔

قومی حکومت پر بداعتمادی میں شدت پیدا ہو گئی۔ اس موسم گرما کے اختتام پر واشنگٹن میں ڈیموکریٹک نیشنل کنونشن میں مسیسپی کے سیاہ فاموں نے ریاست کی چالیس فی صد سیاہ فام آبادی کی نمائندگی کرتے ہوئے شمولیت کی درخواست کی، اس درخواست کو لبرل ڈیموکریٹک لیڈرشپ نے جن

میں نائب صدارت کا امیدوار "ہربرٹ ہمفری" بھی شامل تھا مسترد کر دیا۔

کانگریس نے سیاہ فام بغاوت، شورش اور عالمی تشہیر پر ردعمل دکھانا شروع کیا۔ 1960، 1959ء اور 1964ء میں شہری حقوق کے قوانین پاس کیے گئے، ان میں ووٹنگ میں برابری اور ملازمتوں میں برابری کے بلند بانگ وعدے کیے گئے، لیکن ان پر بہت کم عملدرآمد کیا گیا، یا پھر یکسر نظر انداز کر دیے گئے۔ 1965ء میں صدر جانسن کی معاونت سے کانگریس نے حق رائے دہی کے لیے ایک طاقتور قانون پاس کیا، اور ووٹر کے طور پر نام کے اندراج اور ووٹ دینے کے حق کے لیے وفاقی حکومت کی جانب سے مکمل تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی۔ جنوب میں نیگرو ووٹنگ پر ڈرامائی اثر دیکھنے میں آیا۔ 1952ء میں ایک ملین جنوبی سیاہ فاموں کا ووٹروں کے طور پر اندراج ہوا (جو کہ ووٹ دینے کے اہل سیاہ فاموں کی تعداد کا 20 فی صد تھا)، 1964ء میں ان کی تعداد دو ملین ہو گئی (کل تعداد کا 40 فی صد)، 1968ء میں تین ملین یعنی کل تعداد کا ساٹھ فی صد تھے، یہ تعداد سفید فام ووٹر کی فی صد کے برابر تھی۔

وفاقی حکومت چاہتی تھی کہ بغیر بنیادی تبدیلیاں کیے دھماکا خیز صورتحال پر قابو پایا جا سکے، اس کے لیے وہ عوامی غم و غصے کے اخراج کے لیے بیلٹ بکس کے روایتی ذریعے، شائستہ یادداشتوں اور حکومتی سرپرستی میں پُرامن اجتماعات کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ جب شہری حقوق کے سیاہ فام لیڈروں نے 1963ء کے موسم گرما میں نسل کے مسئلے کو حل کرنے میں قوم کی ناکامی پر احتجاج کرنے کے لیے، واشنگٹن کی جانب ایک بڑی مارچ کا منصوبہ تیار کیا تو صدر کینیڈی اور دوسرے قومی راہنماؤں نے اسے فوراً اپنی سرپرستی میں لیتے ہوئے ایک دوستانہ اجتماع میں تبدیل کر دیا۔

اس اجتماع میں مارٹن لوتھر کنگ کی تقریر "میرا ایک خواب ہے......" نے 200,000 سیاہ فام اور سفید فام امریکیوں کو جوش و جذبے سے بھر دیا، یہ فصاحت اور حسن بیانی کا ایک شاندار نمونہ تھی، لیکن اس ناراضگی اور خفگی سے پاک تھی جو سیاہ فام محسوس کر رہے تھے۔ لیکن جب الاباما کے نوجوان، ایس این سی سی کے سیاہ فام لیڈر جان لیوئس نے، جو کہ بہت زیادہ گرفتاریوں اور مار پٹائی کا نشانہ بنا رہا تھا، جلسے میں غم اور غصے بھری ہوئی ایک سخت تقریر کرنے کی کوشش کی تو مارچ کے لیڈروں نے اس کی تقریر میں سے ایسے جملے حذف کروا دیے جو قومی حکومت پر تنقید کے حامل تھے یا باغیانہ جذبات کو ابھارنے کا باعث بن سکتے تھے۔

واشنگٹن کے اس اجتماع کے اٹھارہ دن بعد اس کی اعتدال پسندانہ روش کو جان بوجھ کر نقصان پہنچانے کی خاطر برمنگھم میں ایک سیاہ فاموں کے چرچ کے تہہ خانے میں بم دھماکا کیا گیا جس میں "اتوار سکول کلاس" میں شرکت کرنے والی چار لڑکیاں مر گئیں۔ صدر کینیڈی نے مارچ کے "گہرے جوش و جذبے اور پُرامن رویے" کی تعریف کی، لیکن سیاہ فام باغی "میلکم ایکس" غالباً سیاہ فام برادری کے مزاج کا صحیح ترجمان تھا۔ واشنگٹن مارچ اور برمنگھم دھماکے کے دو ماہ بعد اپنے پرزور اور شفاف انداز میں تقریر

کرتے ہوئے کہا:

نیگروز باہر سڑکوں پر موجود تھے۔ وہ واشنگٹن پر چڑھائی کی منصوبے بنا رہے تھے......وہ واشنگٹن پر چڑھائی کرنے، سینیٹ پر چڑھائی کرنے، وائٹ ہاؤس پر چڑھائی کرنے، کانگریس پر چڑھائی کرنے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، وہ پورے نظام کو جامد کر دینے، حکومت کو معمول کے کاموں سے روک دینے کی پوری طاقت رکھتے تھے۔

ادنیٰ اور محروم طبقے کے لوگ سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے سفید فاموں کو لرزہ براندام کر دیا تھا، واشنگٹن میں سفید فام اقتدار کے ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ خطرے کو بھانپ گئے اور وہ خود اس میں شامل ہو گئے، اس مارچ کا حصہ بن گئے......یہ ایک پکنک کا رنگ اختیار کر گئی، ایک سرکس کے روپ میں تبدیل ہو گئی، جس میں سرکس کے مسخرے بھی تھے اور کرتب دکھانے والے بھی......انہوں نے مارچ پر پورا قبضہ جما لیا......انہوں نے نیگروز کو بتایا کہ کس وقت شہر میں داخل ہونا ہے، کہاں قیام کرنا ہے، کون سے بینرز اٹھانے ہیں، کون سی تقاریر وہ کر سکتے ہیں، کون سے تقاریر نہیں کر سکتے اور پھر شام کو انہیں شہر سے نکل جانے کا کہا۔

لیکن جب سیاہ فاموں کے چرچوں میں بم پھٹ رہے ہوں، جب شہری حقوق کے نئے قوانین سیاہ فاموں کی بنیادی حالت میں کوئی تبدیلی نہ لا رہے ہوں، انہیں آسانی کے ساتھ "جمہوری اتحاد" میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

1963ء کے موسم بہار میں سفید فاموں میں بے روزگاری کی شرح 4.8 فی صد تھی، غیر سفید فاموں کے لیے یہ شرح 12.1 فی صد تھی۔ حکومتی اندازے کے مطابق سفید فام آبادی کا پانچواں حصہ غربت کے خط سے نیچے زندگی بسر کر رہا تھا اور سیاہ فام آبادی کا نصف اس خط سے نیچے تھا۔ شہری حقوق کے قانونی مسودے حق رائے دہی پر زور دیتے تھے، لیکن حق رائے دہی نسل پرستی یا غربت کا بنیادی حل نہیں تھا۔ ہارلم میں رہنے والے سیاہ فام جو برس ہا برس سے ووٹ ڈالتے آ رہے تھے اب بھی چوہوں سے بھری ہوئی خستہ حال آبادی میں رہ رہے تھے۔

عین ان سالوں کے دوران جب 1964ء اور 1965ء میں کانگریس سے آنے والی شہری حقوق کی قانون سازی اپنے عروج پر تھی، ملک کے ہر حصے میں سیاہ فام فسادات ہو رہے تھے

اگست 1965ء میں جب لنڈن بی جانسن "ووٹنگ رائٹس ایکٹ" کے قانون پر دستخط کر رہا تھا جس میں سیاہ فام ووٹروں کی وفاقی رجسٹریشن کے لیے کہا گیا تھا، لاس اینجلز کے شہر "واٹس" کی سیاہ فام آبادی میں دوسری عالمی جنگ کے بعد شدید ترین ہنگامے پھوٹ پڑے۔ یہ ہنگامے اس وقت شروع

ہوئے جب پولیس نے ایک نوجوان نیگرو ڈرائیور کو زبردستی گرفتار کیا، اردگرد کھڑے لوگوں پر لاٹھیاں برسائیں، اور ایک نوجوان سیاہ فام عورت کو پولیس پر تھوکنے کے جھوٹے الزام میں گرفتار کرلیا۔ سڑکوں پر شدید ہنگامے ہوئے، لوٹ مار کی گئی اور سٹوروں پر آگ کے بم پھینکے گئے۔ پولیس اور نیشنل گارڈز کو طلب کیا گیا، انہوں نے اپنی بندوقیں استعمال کیں۔ چونتیس افراد مارے گئے جن میں اکثریت سیاہ فاموں کی تھی، سینکڑوں زخمی ہوئے اور چار ہزار گرفتار کئے گئے۔

1960ء کے موسم گرما میں مزید ہنگامے شروع ہو گئے، شکاگو کے سیاہ فاموں نے پتھر برسائے، آگ کے بم پھینکے اور نیشنل گارڈز نے اندھادھند فائرنگ کی، تین سیاہ فام مارے گئے جن میں ایک تیرہ سال کا لڑکا اور ایک چودہ سال کی حاملہ لڑکی بھی شامل تھی۔ کلیولینڈ میں سیاہ فاموں کے دنگا فساد کو ختم کرنے کے لیے نیشنل گارڈ طلب کی گئی۔ چار نیگروز گولیاں لگنے سے مر گئے، دو کو نیشنل گارڈ کی گولیاں لگیں اور دو کو سفید فام سویلین نے گولیاں ماریں۔

اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ جنوبی تحریک کا عدم تشدد جو کہ شاید جنوبی ماحول میں ایک ضروری حکمت عملی تھی' سیاہ فام آبادیوں میں گھر کئے ہوئے غربت کے مسئلے سے نبٹنے کے لیے کافی نہیں تھی۔ 1910ء میں نوے فی صد نیگروز جنوب میں رہتے تھے، لیکن 1965ء تک مسیسیپی ڈیلٹا کی 80 فی صد کپاس کو چننے کے لیے مشینوں کے استعمال سے، 1940ء اور 1970ء کے دوران چالیس فی صد سیاہ فام دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں میں آ چکے تھے۔ 1965ء میں 80 فی صد سیاہ فام شہروں میں رہ رہے تھے اور پچاس فی صد سیاہ فام شمال میں رہ رہے تھے۔

1967ء میں ملک کی سیاہ فام آبادیوں میں امریکہ کی تاریخ کے شدید ترین ہنگامے شروع ہو گئے۔ نیشنل ایڈوائزری کمیٹی برائے شہری فسادات کی رپورٹ کے مطابق آٹھ بڑی بغاوتیں، 33 بڑی نہیں لیکن شدید اور 123 معمولی فسادات ہوئے۔ 83 افراد بندوق کی گولیوں سے مارے گئے جن میں زیادہ تعداد "نیوآرک" اور ڈیٹرائٹ کے باشندوں کی تھی۔ ان تمام فسادات کے دوران مرنے والوں کی ایک بھاری تعداد سویلین نیگروز پر مشتمل تھی۔

کمشن کے مطابق، "ایک مثالی فسادی ہائی سکول سے بھاگا ہوا ایسا نوجوان ہوتا ہے جو بہر صورت اپنے غیر فسادی سیاہ فام ہمسائے کی نسبت پڑھا لکھا ہوتا ہے، اور عام طور اپنی صلاحیت سے کم درجے کی ملازمت میں ہوتا ہے، یا پھر ایسے کام کر رہا ہوتا جو معاشرے میں گھٹیا خیال کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی نسل پر بہت فخر کرتا ہے، اور سفید فاموں اور متوسط طبقے کے سیاہ فاموں، دونوں کا شدید دشمن ہوتا ہے، اگرچہ سیاست سے باخبر ہوتا ہے لیکن یہ سیاسی نظام پر بالکل اعتماد نہیں رکھتا۔" رپورٹ میں فسادات کی وجہ سفید فام نسل پرستی کو قرار دیا گیا اور اس دھماکہ خیز صورت حال کے پیدا ہونے کے اسباب بھی بیان کئے

گئے جو دوسری عالمی جنگ کے بعد پورے امریکہ میں پروان چڑھے تھے:

> ملازمتوں، تعلیم اور رہائش کے معاملات میں پایا جانے والا امتیاز اور نسلی علیحدگی.... افلاس زدہ نیگروز کا ہمارے بڑے شہروں میں ارتکاز، جس نے انحطاط پذیر سہولیات اور خدمات کے بحران میں مزید اضافہ کر دیا اور تشنہ انسانی ضروریات.... نیگروز خاص کر نوجوانوں میں ایک نیا رویہ جنم لے چکا ہے، جس میں عزت نفس اور بڑھتا ہوا نسلی تفاخر سابقہ بے حسی اور اطاعت گزاری کی جگہ لے رہا ہے۔

لیکن بغاوت کا سامنا کرتے ہوئے نظام کے لیے، کمیشن رپورٹ خود ایک مؤثر ہتھیار تھی، ایک تحقیقاتی کمیٹی کا قیام، رپورٹ کا جاری ہونا، رپورٹ کے الفاظ جتنے بھی سخت ہوں' تسکین کا باعث بن سکیں گے۔

اس نے بھی پوری طرح کام نہ دیا۔ "بلیک پاور" ایک نیا نعرہ تھا' جو کہ سفید فاموں کی جانب سے کسی بھی "پیش رفت" پر بدگمانی اور سرپرستی کے استرداد کا اظہار تھا۔ میلکم ایکس اس جذبے کا ایک پُر جوش ترجمان تھا۔ فروری 1965ء میں ایک عوامی جلسے میں خطاب کے دوران قتل ہونے کے بعد وہ اس تحریک کا شہید بن چکا تھا۔ لاکھوں افراد نے اس کی "آپ بیتی" پڑھی۔ وہ اپنی موت کے بعد زیادہ پُر اثر بن کر ابھرا تھا۔

مارٹن لوتھر کنگ کو اگرچہ اب بھی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اب نئے ہیروز اس کی جگہ لے رہے تھے، مثال کے طور پر بلیک پینتھر کا ہیونیوٹن۔ "پینتھرز" کے پاس بندوقیں تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ سیاہ فاموں کو اپنا تحفظ خود کرنا چاہیے۔

میلکم ایکس نے 1964ء میں مسیسیپی سے ہارلم آنے والے سیاہ فام طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> تم آزادی صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہو کہ اپنے دشمن کو یہ باور کروا دو کہ تم آزادی کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو، پھر تمہیں آزادی مل جائے گی...... اسے حاصل کرنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ جب تم اس قسم کا رویہ اپناؤ گے تو وہ تمہیں "کریزی نیگرو" کہیں گے یا وہ تمہیں "کریزی نیگرز" کہیں گے' وہ نیگرو' نہیں کہتے۔ یا پھر تمہیں انتہا پسند اور تخریب کار، یا شرانگیز یا سُرخے یا انقلابی کہیں گے۔ لیکن جب تم ایک لمبے عرصے تک انقلابی رہو گے اور اپنے جیسے بہت انقلابی پیدا کر لو گے تو تب جا کر تم آزادی حاصل کر سکو گے۔

مارٹن لوتھر کنگ نے ان مسائل کی جانب زیادہ توجہ دینا شروع کر دی تھی جنہیں شہری حقوق کے

قوانین میں زیر بحث نہیں لایا جاتا تھا، یہ وہ مسائل تھے جو غربت سے جنم لے رہے تھے۔ 1968ء کے موسم بہار میں اس نے ویت نام کی جنگ کے خلاف بولنا شروع کر دیا، جو کہ کچھ نیگروز لیڈروں کے مشورے کے برخلاف تھا، جو یہ سمجھتے تھے کہ اس مسئلے پر بولنے سے واشنگٹن میں ان کے دوست ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس نے جنگ اور غربت کا تعلق جوڑتے ہوئے کہا: ''ہم اپنی ساری رقم موت اور تباہی پر خرچ کر رہے ہیں، اور ہمارے پاس زندگی سے متعلقہ اور تعمیری کاموں کے لیے کوئی رقم نہیں ہے۔''

اب کنگ ایف بی آئی کا اہم ہدف بن گیا تھا، جو اس کی ٹیلی فون پر نجی گفتگو ٹیپ کرتا، اسے جعلی خطوط بھیجتا، اسے دھمکیاں دیتا، بلیک میل کرتا، اور ایک بے نام خط میں یہاں تک کہا کہ اس نے خود کشی کر لی ہے۔ ایف بی آئی کی اندرونی خط و کتابت میں کنگ کی جگہ ایک سیاہ فام لیڈر تلاش کرنے کی بات چیت بھی چل نکلی۔ جیسا کہ 1976ء میں ایف بی آئی پر سینیٹ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا، ایف بی آئی نے ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی۔

کنگ نے ناگوار خاطر مسائل کی جانب اپنی توجہ مبذول کرنا شروع کر دی تھی۔ اس نے واشنگٹن میں صدر کی سرپرستانہ اجازت کے بغیر ''غریب لوگوں کی قیام گاہ'' کا ایک منصوبہ تیار کیا، اور وہ ٹینیسی کے شہر میمفس میں شہر سے کوڑا اٹھانے والوں کی ہڑتال کی حمایت کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ وہاں وہ اپنے ہوٹل کے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا کہ کسی نامعلوم نشانہ باز نے اسے گولی مار کر قتل کر دیا۔ ''غربا کی قیام گاہ'' پر کام جاری رہا اور پھر اسے پولیس کارروائی کے ذریعے اسی طرح سے ختم کر دیا گیا، جیسے پہلی عالمی جنگ کے پرانے فوجیوں کی 1932ء کی بونس آرمی کو تتر بتر کیا گیا تھا۔

کنگ کی موت نے پورے ملک میں شہری ہنگاموں کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں انتالیس افراد مارے گئے جن میں سے چھتیس سیاہ فام تھے۔ ایسی بے شمار شہادتیں سامنے آ رہی تھیں کہ تمام تر شہری حقوق کے قوانین کی موجودگی کے باوجود، عدالتیں سیاہ فاموں کو تشدد اور ناانصافی کے خلاف کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر:

> 1970ء کے موسم بہار میں میسیسپی کے شہر جیکسن میں ایک نیگرو کالج ''جیکسن سٹیٹ کالج'' کے احاطے میں پولیس نے شارٹ گنیں، رائفلیں اور سب مشین گن استعمال کرتے ہوئے اٹھائیس سیکنڈ تک گولیوں کی بوچھاڑ کی، چار سو گولیاں لڑکیوں کی اقامت گاہ پر لگیں، اور دو سیاہ فام طالب علم مارے گئے۔ ایک مقامی گرینڈ جیوری نے اس حملے کو جائز دیا، اور امریکہ ڈسٹرکٹ کورٹ کے جج ''ہیرالڈ کوکس'' (جس کا تقرر کینیڈی نے کیا تھا) نے کہا کہ ''وہ طالب علم جو شہری بدامنی پیدا کرتے ہیں انہیں لازمی طور پر زخمی ہونے یا مارے جانے کی توقع رکھنی چاہیے۔''

> اپریل 1970ء میں ایک پولیس مین نے بوسٹن میں بوسٹن سٹی ہسپتال کے وارڈ میں ایک سیاہ فام مریض کو چار گولیاں مار کر ہلاک کر دیا، جبکہ سیاہ فام نے اس پر ایک تولیہ پھینکا تھا۔ میونسپل کورٹ کے جج نے اسے بے قصور قرار دیتے ہوئے بری کر دیا۔

ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات لگاتار دہرائے جاتے رہے جو کہ ملکی اداروں میں پائی جانے والی گہری نسل پرستی کا نتیجہ تھے۔ اس کے علاوہ باغی سیاہ فام منتظمین کے خلاف پولیس اور فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (ایف بی آئی) ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تشدد کی کارروائیاں کر رہے تھے۔

4 دسمبر 1969ء کو صبح کے وقت پانچ بجے سے تھوڑا پہلے شکاگو پولیس کے ایک سکواڈ نے جو بندوقوں اور شارٹ گنوں سے مسلح تھا ایک اپارٹمنٹ پر حملہ کیا جہاں ''بلیک پینتھرز'' رہتے تھے۔ انہوں نے اپارٹمنٹ پر کم از کم دو سو گولیاں برسائیں، جس کے نتیجے میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا اکیس سالہ ''بلیک پینتھر'' لیڈر فریڈ ہمپٹن اور ایک دوسرا ''بلیک پینتھر'' مارک کلارک ہلاک ہو گئے۔ چند سال بعد عدالتی کارروائی کے دوران انکشاف ہوا کہ ایف بی آئی کا ایک مخبر ''بلیک پینتھر'' میں شامل تھا، جس نے پولیس کو عمارت کا نقشہ مہیا کیا اور اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں فریڈ ہمپٹن سوتا تھا۔

کیا حکومت اس لیے قتل و غارت اور دہشت گردی کا سہارا لے رہی تھی کیونکہ مراعات، قانون سازی، تقاریر، صدر لنڈن بی جانسن کے لکھے ہوئے شہری حقوق کے نغمے کا دھن سے پڑھنا، کام نہیں کر رہے تھے؟ 1956ء اور 1971ء کے دوران ایف بی آئی نے خفیہ اطلاعات کا ایک وسیع پروگرام تشکیل دیا (جسے COINTELPRO کا نام دیا گیا) جس کے تحت سیاہ فام گروپس کے خلاف 259 کارروائیاں کی گئیں۔ سیاہ فام بغاوت نے ان تمام کارروائیوں کا بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

کیا یہ خوف جنم لے رہا تھا کہ سیاہ فام رائے دہی کے میدان سے، جسے کنٹرول میں رکھنا آسان تھا، اپنی توجہ دولت اور غربت کی زیادہ خطرناک طبقاتی مخاصمت کی جانب موڑ سکتے ہیں؟ 1966ء میں ستر کے قریب غریب سیاہ فاموں نے، ایئر فورس کی ایک غیر مستعمل عمارت پر قبضہ کر لیا جسے فوج نے خالی کروایا۔ ایک مقامی خاتون مسز انیتا بلیک ویل نے کہا: ''میں محسوس کرتی ہوں کہ وفاقی حکومت نے ثابت کر دیا ہے کہ اسے غریب عوام کی کوئی پروا نہیں..... ہم اس سے تنگ آ چکے ہیں ہم اپنے لیے خود تعمیر کریں گے کیونکہ امریکہ میں کوئی ایسی حکومت نہیں جو ہماری نمائندگی کرتی ہو۔''

شہری حقوق کی نسبت اس نئے پہلو پر زور زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ طبقاتی استحصال کے مسئلے پر سیاہ فام اور سفید فام متحد ہو سکتے ہیں۔ نومبر 1963ء میں ''اے فلپ رینڈلف'' نے اے ایف ایل۔ سی آئی او کنونشن میں شہری حقوق کی تحریک پر بات کرتے ہوئے اس کی آئندہ سمت کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا: ''نیگرو کا آج کا احتجاج نچلے طبقے

کی جانب سے اٹھائی جانے والی اوّلین صدا ہے۔ جیسا کہ نیگرو سڑکوں پر آچکے ہیں اسی طرح ہر نسل کے بے روزگار لوگ سڑکوں پر نکلیں گے۔"

سیاہ فاموں کے ساتھ بھی وہی ہتھکنڈا استعمال کرنے کی کوشش شروع کر دی گئیں جو تاریخی طور پر سفید فاموں کے ساتھ کیا گیا تھا، یعنی سیاہ فاموں کی ایک مختصر سی تعداد کو معاشی خوشحالی کے سبز باغ دکھا کر نظام میں شامل کرنے کی کوششیں۔ "سیاہ فام سرمائے" کی بات کی جا رہی تھی، "این اے اے سی پی" اور "سی او آر ای" کے لیڈروں کو وائٹ ہاؤس میں مدعو کیا گیا۔ "چیس مین ہیٹن بنک" اور راک فیلر خاندان (چیس کے مالکان) نے "سیاہ فام سرمایہ" پروان چڑھانے میں خاص دلچسپی لی۔ تبدیلی بہت معمولی تھی لیکن اس کی تشہیر بہت زیادہ تھی۔ تبدیلی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے اخبارات اور ٹیلی ویژن پر سیاہ فام چہرے زیادہ نظر آنے لگے تھے، اور سیاہ فام لیڈروں کی ایک کم لیکن اہم تعداد کو ملک کے بڑے سیاسی دھارے میں شامل کر لیا گیا۔

اس کے خلاف کچھ نئی سیاہ فام صدائیں بلند ہوئیں۔ "رابرٹ ایلن" نے اپنی کتاب سرمایہ دار امریکہ میں سیاہ فام بیداری میں لکھا: "اگر کمیونٹی کو مجموعی طور پر فائدہ پہنچانا مقصود ہے تو پھر سیاہ فام کاروباری فرمیں سماج کی ملکیت کے طور پر چلائی جانی چاہئیں جو عام سیاہ فام کمیونٹی کی ملکیت ہوں نہ کہ کسی فرد کی یا محدود افراد پر مشتمل گروپس کی نجی ملکیت ہوں....."

ایک سیاہ فام خاتون "پیٹریشا روبن سن" ایک پمفلٹ میں جو کہ بوسٹن میں 1970ء میں تقسیم کیا گیا "پوئر بلیک وومن" میں کہتی ہے: "سیاہ فام خاتون اپنے آپ کو محروم طبقات اور ان کی انقلابی جدوجہد کے ساتھ جوڑتی ہے۔" اس کا کہنا تھا کہ "غریب سیاہ فام عورت مرد کے جارحانہ تسلط پر اعتراض کرتی ہے، اور اس طبقاتی نظام یعنی سرمایہ داری پر اعتراض کرتی ہے، جو اس سوچ کے بیج بوتا ہے۔"

ساٹھ اور ستر کے عشروں میں سیاہ فاموں کی بغاوت کے خطرے کو ختم کرنے کے لیے نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی بھرپور کوشش کی جا رہی تھی۔ جنوب میں سیاہ فام بڑی تعداد میں حق رائے دہی کا استعمال کر رہے تھے اور 1968ء کی ڈیموکریٹک کنونشن میں میسیسپی کے وفد میں تین سیاہ فام بھی شامل تھے۔ 1977ء تک گیارہ جنوبی ریاستوں میں 2000 سیاہ فام عوامی عہدوں پر فائز تھے (1965ء میں ان کی تعداد 72 تھی)۔ 2 کانگریس مین تھے، گیارہ ریاستوں کے سینیٹرز، 95 ریاستی نمائندے، 267 کاؤنٹی کمشنر، 76 میئرز، 824 سٹی کونسل کے ممبر، 18 شیرف یا پولیس چیف، 508 سکول بورڈ کے ممبر تھے۔

بظاہر یہ ایک ڈرامائی پیش رفت نظر آتی ہے۔ لیکن جنوب کی آبادی کا 20 فی صد ہونے کے باوجود تین فی صد سے کم سیاہ فام منتخب عہدوں پر فائز تھے۔ نیویارک کے رپورٹر نے 1977ء میں پیدا ہونے والی نئی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا: "جن علاقوں میں سیاہ فاموں کے پاس اہم شہری

عہدے ہیں، وہاں سفید فام عموماً ہمیشہ مضبوط معاشی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ جب اٹلانٹا میں ایک سیاہ فام "مے نرڈ جیکسن" میئر منتخب ہو گیا تو وہاں کے کاروباری طبقے نے اسے پوری طرح اپنے اثر و رسوخ میں جکڑے رکھا۔

جنوب کے وہ سیاہ فام جو شہر کے مرکزی تجارتی علاقوں میں واقع ریستورانوں اور ہوٹلوں میں جانے کی توفیق رکھتے، تھے انہیں اب روکا نہیں جاتا تھا۔ اب وہ کالجوں، یونیورسٹیوں، لاء سکولوں، میڈیکل سکولوں میں داخلے لے سکتے تھے۔ شمالی شہروں میں جہاں نسلی طور پر مخلوط سکول بنائے گئے تھے تمام بچوں کو ایک ہی بس میں گھر سے سکول اور سکول سے گھر لے جایا جا رہا تھا۔ اگرچہ ان کی رہائش گاہیں الگ الگ رکھی گئی تھیں۔ لیکن یہ تمام اقدامات سیاہ فام آبادیوں کی افسوسناک صورتحال، بڑھتے ہوئے جرائم، نشے کی لت اور تشدد کے رجحان کا مداوا نہ کر سکے۔

ڈیپارٹمنٹ آف لیبر کی 1977ء کے موسم گرما کی رپورٹ کے مطابق سیاہ فام نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح 39.8 فی صد تھی۔ اگرچہ اب سیاہ فاموں کی ایک قلیل تعداد کو نئے مواقع میسر تھے، لیکن اس کے باوجود ذیابیطس سے مرنے والے سیاہ فاموں کی تعداد دوگنا، اور انسانی قتل و غارت اور تشدد کا شکار ہونے والوں کی تعداد سات گنا تھی۔

اعداد و شمار مکمل صورت حال بیان نہیں کر سکتے۔ نسل پرستی جو کہ جنوب میں ہمیشہ ایک اہم حقیقت رہی ہے اب شمال میں بھی سر اٹھانے لگی تھی کیونکہ حکومت کی جانب سے غریب سیاہ فاموں کو ملنے والی مراعات نے غریب سیاہ فاموں کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ غلامی سے آزاد ہونے والے سیاہ فام سرمایہ دارانہ نظام میں اپنی جگہ بنانے کے لیے ملازمتوں کے حصول میں سفید فاموں کے مدِ مقابل آ رہے تھے، جبکہ ملازمتیں ضرورت کے مطابق بہت کم تھیں۔ اب رہائشی علاقوں کی علیحدگی کے خاتمے سے سیاہ فام بھی ان علاقوں کے نزدیک آ گئے تھے جہاں غریب سفید فام گنجان آبادیوں میں مصائب سے گھرے ہوئے زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ اس صورتحال میں انہیں اپنا غصہ نکالنے کے لیے اپنے قریب ہی ہدف مل گئے تھے۔

بوسٹن میں سفید فام سکولوں میں سیاہ فام بچوں اور سیاہ فام سکولوں میں سفید فام بچوں کے ایک ہی بس میں آنے جانے سے سفید فام بستیوں میں تشدد کا ایک نیا رجحان جنم لے رہا تھا۔ مخلوط سکولوں کے لیے مشترکہ بسوں کا استعمال ایک ایسی سہولت تھی جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دی گئی تھی۔ اس طرح حکومت کی جانب سے غربا کے لیے قائم کیے گئے ناقص اور ناکافی سکولوں میں داخلے کے لیے غریب سفید فام اور غریب سیاہ فام عوام کو آپس میں مقابلے میں الجھا دیا گیا۔

کیا سیاہ فام جو کہ گندی بستوں میں زندگی بسر کر رہے تھے اور متوسط طبقے میں اضافے کی وجہ

سے منقسم ہو رہے تھے، حکومتی حملوں کی زد میں تھے اور سفید فاموں کے ساتھ مخاصمت رکھنے پر مجبور کر دیے گئے تھے، کسی کنٹرول میں تھے؟ یقیناً ستر کے عشرے کے وسط تک کوئی بڑی سیاہ فام تحریک پروان نہیں چڑھ رہی تھی۔ لیکن ایک نیا سیاہ فام شعور بیدار ہو چکا تھا اور ابھی تک زندہ تھا۔

ویت نام، ایک ناممکن فتح

1964ء سے 1972ء تک انسانی تاریخ کی دولتمند ترین اور طاقتور ترین قوم نے ایک چھوٹے سے کسانوں کے ملک میں اٹھنے والی قوم پرستانہ انقلابی تحریک کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت کو استعمال کیا اور سوائے ایٹم بم کے تمام جنگی حربے استعمال کیے، لیکن شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب امریکہ نے ویت نام پر حملہ کیا تو یہ دراصل منظم جدید ٹیکنالوجی کا، منظم انسانی قوت کے ساتھ مقابلہ تھا جس میں انسانوں کی جیت ہوئی۔

اس جنگ کے دوران امریکہ میں قومی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ دشمن تحریک نے جنم لیا، یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے جنگ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ ساٹھ کے عشرے کی ایک چونکا دینے والی حقیقت تھی۔

1945ء کی خزاں میں جاپان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور اسے سابقہ فرانسیسی نوآبادی ہند چینی سے بھی نکلنا پڑا جس پر اس نے جنگ کی ابتدا میں ہی قبضہ کر لیا تھا۔ اس دوران وہاں ایک انقلابی تحریک پروان چڑھ چکی تھی جو نوآبادیاتی تسلط کے خاتمے اور ہند چینی کے کسانوں کے لیے ایک نئی زندگی کے حصول کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ ایک کمیونسٹ ہو چی منہ کی زیر قیادت انقلابی جاپانیوں کے خلاف لڑے اور جب وہ علاقے سے نکل گئے تو 1945ء کے آخر میں "ہنوئی" میں ایک شاندار جشن کا انعقاد کیا گیا۔ سڑکوں پر لاکھوں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جس میں قوم کی آزادی کا اعلان کیا گیا۔

اس اعلان کے الفاظ انقلاب فرانس کے انسانی اور شہری حقوق کے اعلان اور امریکہ کے اعلان آزادی سے مستعار لیے گئے تھے۔ "تمام انسان برابر پیدا کیے گئے ہیں، انہیں خالق حقیقی نے چند مخصوص ناقابل انتقال حقوق سے نوازا ہے، جن میں زندگی، آزادی اور خوشی کے حصول کے حقوق شامل ہیں۔" بالکل اسی طرح جس طرح 1776ء میں امریکیوں نے انگلش بادشاہ کے خلاف شکایات کی فہرست تیار کی تھی، ویت نامیوں نے فرانسیسی راج کے خلاف اپنی فہرست تیار کی:

"انہوں نے غیر انسانی قوانین ٹھونسے.... انہوں نے سکولوں کی نسبت جیلیں

زیادہ تعمیر کیں۔ انہوں نے بے رحمی کے ساتھ ہمارے محب الوطن لوگوں کو قتل کیا۔ انہوں نے ہر قسم کی بغاوت کو خون کے دریا میں ڈبو دیا۔ انہوں نے عوامی رائے عامہ کو پامال کیے رکھا..... انہوں نے ہمارے دھان کے کھیتوں، ہماری کانوں، ہمارے جنگلات اور ہمارے خام مال کو ہم سے زبردستی چھین لیا۔"

ویت نام جنگ کے بارے میں امریکی محکمہ دفاع کے جائزے میں، جسے "ٹاپ سیکرٹ" رکھا گیا تھا، ہوچی منہ کے کام کو یوں بیان کیا گیا تھا:

'اس نے "ویت منہ" کو پورے ویت نام میں پھیلی ہوئی واحد سیاسی تنظیم میں تبدیل کر دیا جو کہ جاپانیوں یا فرانسیسیوں کے خلاف مؤثر مزاحمت پیش کرنے کے قابل تھی۔ وہ جنگ کے دور کا واحد ویت نامی لیڈر تھا جسے عوامی حمایت حاصل تھی، اور اس نے اگست اور ستمبر میں جاپانیوں کو باہر نکال کر ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویت نام قائم کر کے 1945ء ویت نامی عوام کی بہت زیادہ وفاداریاں جیت لیں۔ ستمبر 1945ء میں چند ہفتوں کے لیے ویت نام اپنی جدید تاریخ میں پہلی اور آخری مرتبہ بیرونی تسلط سے مکمل آزاد ہوا، اور ہوچی منہ کی قیادت میں شمال سے جنوب تک متحد ہوا....."

مغربی طاقتیں پہلے ہی اس کو تبدیل کرنے کے لیے سرگرم ہو چکی تھیں۔ انگلینڈ نے ہند چینی کے جنوبی حصے پر قبضہ کر لیا اور پھر اسے فرانسیسیوں کو واپس کر دیا۔ قوم پرست چین (کمیونسٹ انقلاب سے پہلے چیانگ کائی شیک کی قیادت میں) نے ہند چینی کے شمالی حصے پر قبضہ کر لیا اور امریکہ نے اس پر زور ڈالا کہ وہ یہ علاقہ بھی فرانسیسیوں کو واپس کر دے۔ جیسا کہ ہوچی منہ نے ایک امریکی صحافی کو کہا "ظاہری طور پر ہم بالکل تنہا کھڑے ہیں..... ہمیں اپنے آپ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔"

اکتوبر 1945ء اور فروری 1946ء کے دوران ہوچی منہ نے صدر ٹرومین کو آٹھ خط لکھے جس میں اسے "اٹلانٹک چارٹر" میں کیے گئے خود مختاری کے وعدوں کی یاد دہانی کرائی۔ ان میں سے ایک خط ٹرومین اور اقوام متحدہ دونوں کو بھیجا گیا:

"میں عزت مآب کی توجہ محض انسانی بنیادوں پر مندرجہ معاملہ کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ 1944ء کے موسم سرما اور 1945ء کے موسم خزاں میں بیس لاکھ ویت نامی فاقہ زدگی کی وجہ سے مر گئے، جس کی بڑی وجہ فرانسیسیوں کی ویت نامیوں کو فاقہ کشی میں دھکیلنے کی پالیسی ہے، جنہوں نے علاقے سے چاولوں کی تمام پیداوار پر قبضہ کر کے اسے گوداموں میں ڈال دیا جہاں وہ گل سڑ گئے..... 1945ء کے موسم گرما میں تین چوتھائی زیر کاشت رقبہ میں شدید سیلاب آ گئے جس کے بعد شدید قسم کی خشک سالی کا سامنا ہوا۔ جس کے نتیجے میں متوقع فصل

کے چھ حصوں میں سے پانچ حصے ضائع ہو گئے..... میرے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں..... اگر دنیا کی بڑی طاقتیں اور بین الاقوامی امدادی تنظیمیں فوری مدد مہیا نہیں کرتیں تو ہمیں ایک ناگزیر تباہی، بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

ٹرومین نے کوئی جواب نہ دیا۔

اکتوبر 1946ء میں فرانسیسیوں نے شمالی ویت نام کی ایک بندرگاہ ہائی فانگ پر بمباری کر دی اور یوں ویت نام کی حکومت کے لیے "ویت منہ" تحریک اور فرانسیسیوں کے درمیان آٹھ سالہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ چین میں کمیونسٹوں کی فتح اور اگلے سال کوریا کی جنگ کے بعد امریکہ نے فرانسیسیوں کو بہت بڑی مقدار میں فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ 1954ء تک امریکہ 3,00,000 چھوٹے ہتھیار اور مشین گنیں جو کہ ہند چینی میں پوری فرانسیسی فوج کو مسلح کرنے کے لیے کافی تھیں، اور ایک بلین ڈالر دے چکا تھا۔ یہ سب ملا جلا کر امریکہ فرانسیسیوں کے 80 فی صد جنگی اخراجات برداشت کر رہا تھا۔

امریکہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ عوام کو یہ بتایا گیا کہ امریکہ ایشیاء میں کمیونزم کو روکنے میں مدد کر رہا ہے، لیکن اس پر زیادہ عوامی بحث مباحثہ نہیں کیا گیا تھا۔

جون 1952ء میں نیشنل سیکورٹی کونسل کی ایک خفیہ یادداشت میں چین، فلپائن، تائیوان، جاپان، ساؤتھ کوریا کی ساحلوں کے ساتھ امریکہ کے فوجی اڈوں کے سلسلے کی نشاندہی بھی کی گئی تھی:

تمام جنوب مشرقی ایشیا پر کمیونسٹ تسلط ساحلوں سے دور بحر الکاہل کے جزائر پر امریکہ کی پوزیشن دوسروں کی مرہون منت بنا دے گا، اور مشرق بعید میں امریکہ کے بنیادی تحفظ کو خطرے میں ڈال دے گا..... جنوب مشرقی ایشیا خاص طور پر ملایا اور انڈونیشیا قدرتی ربڑ اور ٹین کا دنیا میں ایک بڑا منبع، اور پٹرولیم اور دوسری اہم اشیاء کا پروڈیوسر ہے۔

اس کے علاوہ یہ پہلو بھی پیش نظر تھا کہ جاپان کا جنوب مشرقی ایشیا کے چاولوں پر انحصار کرتا ہے اور اس علاقے میں کمیونزم کے تسلط سے جاپان کو بھی کمیونزم سے دور رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

1953ء میں کانگرس کے ایک مطالعاتی مشن نے رپورٹ کیا! "ہند چینی کا علاقہ چاولوں، ربڑ، کوئلے اور کچے لوہے سے مالا مال ہے، اپنے محل وقوع کے حوالے سے یہ باقی ماندہ جنوب مشرقی ایشیا میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔" اسی سال محکمہ خارجہ کی ایک یادداشت میں کہا گیا: "اگر فرانسیسی حقیقتاً وہاں سے انخلا کا فیصلہ کرتے ہیں تو امریکہ اس علاقے پر قبضے کے لیے سنجیدگی سے غور کرے گا۔"

1954ء میں فرانسیسیوں نے عوامی حمایت کے حصول میں ناکامی پر جو کہ مکمل طور پر ہوچی منہ اور انقلابی تحریک کے ساتھ تھی، ویت نام کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

جنیوا میں ایک بین الاقوامی سبھا کی زیر قیادت فرانسیسیوں اور "ویت منہ" کے درمیان ایک

امن معاہدہ کیا گیا۔ معاہدے کے مطابق یہ طے پایا کہ فرانسیسی عارضی طور پر ویت نام کے جنوبی حصے میں رہیں گے اور شمالی حصہ "ویت منہ" کے کنٹرول میں رہے گا اور دو سال بعد متحدہ ویت نام میں انتخابات کروائے جائیں گے تا کہ ویت نامی اپنی حکومت کا انتخاب کر سکیں۔

امریکہ فوری طور پر اتحاد کو ختم کرنے اور جنوبی ویت نام پر امریکی تسلط قائم کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے سائیگون میں ایک سابقہ ویت نامی عہدے دار "نگو ڈینہ ڈیم" کو حکومت کا سربراہ مقرر کر دیا، جو کہ اس وقت نیو جرسی میں رہ رہا تھا، اور اتحاد کے لیے طے شدہ انتخابات نہ کروانے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جیسا کہ "پینٹا گون پیپرز" میں بھی کہا گیا تھا، جنوبی ویت نام مکمل طور پر امریکہ کی تخلیق تھی۔

ڈیم کی حکومت روز بروز غیر مقبول ہوتی چلی گئی، ڈیم کیتھولک تھا اور ویت نامیوں کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی، ڈیم جاگیرداروں کا گماشتہ تھا اور یہ ملک کسانوں کا تھا۔ اس کی زمینی اصلاحات محض ایک ڈرامہ تھا جبکہ اصل صورت حال جوں کی توں ہی تھی۔ اس نے مقامی طور پر منتخب شدہ علاقائی سرداروں کی جگہ اپنے نامزد کردہ افراد کو مقرر کر دیا۔ ڈیم نے بے شمار ویت نامیوں کو قید کر دیا جو اس کی حکومت پر بدعنوانی اور اصلاحات کی عدم موجودگی کی وجہ سے تنقید کرتے تھے۔

دیہاتی علاقوں میں جہاں "ڈیم" کے کارندے نہیں پہنچ سکتے تھے مخالفت میں تیزی سے اضافہ ہوا، اور 1958ء کے لگ بھگ اس کی حکومت کے خلاف گوریلا کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ "ہنوئی" میں کیمونسٹ حکومت نے جنوب کے عوام کو مدد فراہم کی اور حوصلہ افزائی کی اور جنوب میں لوگوں کو بھیجنا شروع کر دیا، ان میں اکثریت جنوبی باشندوں کی تھی جو جنیوا معاہدے کے بعد گوریلا تحریک کی مدد کے لیے شمال کی جانب چلے گئے تھے۔

1960ء میں جنوب میں "نیشنل لبریشن فرنٹ" تشکیل دیا گیا۔ اس نے حکومت مخالف لوگوں کو متحد کیا، اس کی قوت کا سرچشمہ جنوبی ویت نام کے کسان تھے جو اسے اپنی روزمرہ زندگیوں میں تبدیلی کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔ امریکی حکومت کے ایک تجزیہ کار ڈگلس پائیک نے اپنی کتاب "ویت کانگ" میں جو کہ باغیوں کے انٹرویوز اور پکڑی گئی دستاویزات پر مبنی تھی، اس صورتحال کا حقیقی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جس کا امریکہ کو سامنا تھا۔

جنوبی ویت نام کے 2561 دیہاتوں میں نیشنل لبریشن فرنٹ نے ایک ایسے ملک میں جہاں عوامی تنظیمیں حقیقتاً ناپید تھیں، لاتعداد معاشرتی سیاسی تنظیمیں قائم کیں۔ نیشنل لبریشن فرنٹ کے علاوہ جنوبی ویت نام میں کبھی بھی کوئی عوامی بنیادوں پر سیاسی پارٹی قائم نہیں ہوئی تھی۔

پائیک نے لکھا: "کیمونسٹ جنوبی ویت نام کے دیہاتوں میں بہت اہم سماجی تبدیلی لائے ہیں، انہوں نے یہ کام زیادہ تر ابلاغ کے عمل کے ذریعے انجام دیا ہے۔" یعنی وہ جنگجوؤں کی نسبت بہت بڑے ناظم ہیں۔ "نیشنل لبریشن فرنٹ کے حوالے سے جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کا سماجی انقلاب کو اوّلیت دینا اور جنگ کو ثانوی حیثیت دینا ہے۔ اس وسیع تنظیمی کوشش کا مقصد دیہات کے سماجی ڈھانچے کی تعمیر نو اور دیہاتوں کو، اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی تربیت دینا تھا۔"

پائنک نے 1962ء میں "این ایل ایف" کی ممبر شپ کا تخمینہ 300,000 لگایا تھا۔ "پینٹا گون پیپرز" کے مطابق "صرف ویت کانگ کو دیہاتی علاقوں میں وسیع بنیادوں پر حمایت حاصل تھی اور اثر ورسوخ رکھتی تھی۔"

جب 1961ء کے اوائل میں کینیڈی نے صدارت کا عہد سنبھالا تو اس نے جنوب مشرقی ایشیا میں ٹرومین اور آئزن ہاور کی پالیسیوں کو جاری رکھا۔ "پینٹا گون پیپرز" کے مطابق اس نے تقریباً فوری طور پر ویت نام اور لاؤس میں مختلف فوجی کارروائیوں کے لیے ایک خفیہ منصوبے کی منظوری دی، جس میں شمالی ویت نام میں تخریب کاری کی کارروائیوں اور خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے ایجنٹ بھیجنا بھی شامل تھا۔ اس سے پہلے 1956ء میں وہ صدر ڈیم کی "حیرت انگیز کامیابی کا ذکر کر چکا تھا" اور ڈیم کے ویت نام کے بارے میں کہا تھا "اس کی سیاسی آزادی ایک تخلیقی تحریک کا درجہ رکھتی ہے۔"

1963ء جون میں ایک بدھ راہب نے سائیگون میں ایک چوک میں بیٹھ کر اپنے آپ کو آگ لگالی۔ اس کے بعد مزید بدھ راہبوں نے بھی ڈیم کی حکومت کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے آپ کو زندہ جلا دیا۔ "ڈیم" کی پولیس نے بدھ پگوڈوں اور مندروں پر چھاپے مارے اور تیس راہبوں کو زخمی کر دیا، چار آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور پگوڈوں کو بند کر دیا۔ شہر میں مظاہرے شروع ہو گئے، پولیس نے گولی چلائی اور نو آدمی مارے گئے، پھر قدیم دار الحکومت "ہیو" میں دس ہزار افراد نے احتجاجی مظاہرہ کیا۔

جنیوا معاہدے کے تحت امریکہ کو 685 فوجی مشیر ویت نام بھیجنے کی اجازت تھی، آئزن ہاور نے خفیہ طور پر کئی ہزار فوجی وہاں بھیجے۔ کینیڈی کی زیر قیادت ان کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچ گئی، اور ان میں سے کچھ نے جنگی کارروائیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ جنوبی ویت نام کے بیشتر دیہاتی علاقوں سے ڈیم کا کنٹرول ختم ہوتا جا رہا تھا، جہاں اب این ایل ایف کے منظم کردہ مقامی دیہاتیوں کا کنٹرول تھا۔

ڈیم اب پریشانی کا باعث بن رہا تھا اور ویت نام پر مؤثر کنٹرول میں رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔ کچھ ویت نامی جنرل اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہے تھے۔ سی آئی اے سے قریبی رابطہ رکھتے ہوئے "لوسین کونین" نے امریکی سفیر ہنری کیبٹ لاج سے خفیہ ملاقات کی جو کہ انقلاب کے لیے بہت پر جوش تھا۔ "لاج" نے 25 اکتوبر کو کینیڈی کے نائب "میک جارج بنڈی" سے رابطہ کیا (پینٹا گون

پیپرز): ''میں نے جنرل ''ٹران وان ڈان'' اور کونین کے درمیان ہر ملاقات کی ذاتی طور پر نگرانی کی ہے، جس نے میرے ہر حکم پر صراحت کے ساتھ عمل کیا ہے۔'' کینیڈی کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھا، لیکن ڈیم کو متنبہ کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ حقیقت میں انقلاب سے تھوڑی دیر پہلے، اور جب کہ وہ کونین کے ذریعے سازشیوں سے پورے رابطے میں تھا، لاج نے ہفتے اور اتوار کا دن ڈیم کے ساتھ سمندر کنارے تفریحی رہائش گاہ میں بسر کیا۔ جب یکم نومبر 1963ء میں جنرلوں نے صدارتی محل پر حملہ کر دیا تو ڈیم نے امریکی سفیر لاج کو فون کیا اور مدد طلب کی، لاج نے جواب دیا، میں نے گولیوں کی آواز سنی ہے لیکن میں تمام حقائق سے آگاہ نہیں ہوں۔'' اس نے ڈیم سے کہا کہ اگر وہ اس کے ذاتی تحفظ کے لیے کچھ کر سکا تو اسے فون کرے گا۔

یہ ڈیم کے ساتھ کسی بھی امریکی کی آخری گفتگو تھی۔ وہ محل سے فرار ہو گیا، لیکن اسے اور اس کے بھائی کو سازشیوں نے گرفتار کر لیا، ٹرک میں شہر سے باہر لے جا کر انہیں گولیوں سے اُڑا دیا۔

1963ء کے اوائل میں کینیڈی کے ''انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ'' یو، الیکسس جان سن نے ڈیٹرائٹ کے اکنامک کلب سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''جنوب مشرقی ایشیا میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ صدیوں سے بڑی طاقتیں اس کے گرد منڈلا رہی ہیں؟ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک چاول، ربڑ، ساگوان، مکئی، گرم مصالحے، تیل اور بہت سی دوسری اشیاء مقامی ضرورت سے کہیں زیادہ پیدا کر رہے ہیں۔''

صدر کینیڈی نے ایسی بات کبھی نہیں کی تھی جس سے یہ وضاحت ہوتی کہ ویت نام میں امریکی مداخلت کا مقصد کمیونزم کو روکنا اور آزادی کو فروغ دینا تھا۔

ڈیم کے مارے جانے کے تین دن بعد خود کینیڈی بھی قتل ہو گیا اور نائب صدر لنڈن جانسن نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔

جنرل جس نے ڈیم کی جگہ سنبھالی تھی، نیشنل لبریشن فرنٹ کو دبا نہ سکا، جنرل میکس ویل ٹیلر نے 1964ء کے آخر میں رپورٹ دی: ''ویت کانگ یونٹس نہ صرف سیمرغ جیسی دوبارہ زندہ ہونے کی قوت رکھتی ہیں، بلکہ مورال قائم رکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔

اگست 1964ء کے شروع میں صدر جانسن نے ''خلیج ٹونکن'' میں وقوع پذیر ہونے والے چھوٹے واقعات کو بنیاد بنا کر ویت نام میں بڑے پیانے پر جنگ کا آغاز کر دیا۔ جانسن اور سیکرٹری دفاع رابرٹ میک نمارا نے امریکی عوام کو بتایا کہ شمالی ویت نام کی تارپیڈو کشتیوں نے امریکی ڈسٹرائر (تباہ کن بحری بیڑا) پر حملہ کیا'' جبکہ امریکی جہاز بین الاقوامی سمندر میں معمول کی گشت پر تھے۔'' میک نمارا نے بتایا: ''یو ایس ڈسٹرائر ''میڈاکس'' پر بلا اشتعال حملہ کیا گیا۔''

بعد میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ ''خلیج ٹونکن'' کا واقعہ جھوٹ پر مبنی تھا اور امریکہ کے اعلیٰ ترین

عہدیداروں نے عوام کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔ حقیقت میں سی آئی اے شمالی ویت نام کی ساحلی تنصیبات پر حملہ کرنے کے ایک خفیہ آپریشن میں مصروف تھی، لہٰذا اگر کوئی حملہ ہوا بھی تھا تو یہ بلا اشتعال ہرگز نہ تھا۔ یہ ''معمول کی گشت'' نہیں تھی، کیونکہ ''میڈاکس'' ایک خصوصی الیکٹرانک جاسوسی کے مشن پر تھا۔ اور یہ بین الاقوامی سمندروں میں نہیں تھا، بلکہ ویت نام کی سمندری حدود میں تھا۔ یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ کوئی تارپیڈو نہیں داغے گئے تھے جیسا کہ میک نمارا نے کہا تھا۔ ایک دوسرے ڈسٹرائر پر دو دن کے بعد ایک دوسرا حملہ، جسے جانسن نے ''بین الاقوامی سمندروں میں کھلی جارحیت'' قرار دیا بھی ایک اختراع ہی معلوم ہوتی ہے۔

حادثے کے وقت ''این بی سی'' ٹیلی ویژن پر وزیر خارجہ ''رسک'' سے سوال کیا گیا کہ ایک انتہائی چھوٹا سا ملک ویت نام امریکہ پر کیوں حملہ کرے گا۔ رسک نے جواب دیا ''ان کی منطق بالکل مختلف ہے، لہٰذا اس عظیم نظریاتی خلیج کے پار ایک دوسرے کے ذہن کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔''

''ٹونکن'' کے حملے کے رد عمل میں کانگریس نے ہاؤس میں ایک متفقہ قرارداد پاس کی، جس نے سینیٹ میں صرف دو مخالف ووٹوں کے ساتھ جانسن کو اختیار دے دیا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھتا ہے جنوب مشرقی ایشیا میں فوجی ایکشن لے سکتا ہے۔ کانگریس کی جانب سے کوئی اعلان جنگ نہ کیا گیا جیسا کہ آئین کا تقاضا ہے۔

ویت نام کی جنگ کے دوران کئی ایک افراد نے سپریم کورٹ سے، جسے آئین کا محافظ خیال کیا جاتا ہے، بار بار ویت نام جنگ کو غیر آئینی قرار دینے کے لیے درخواستیں دیں، لیکن سپریم کورٹ نے ہر مرتبہ اس پر غور کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

''ٹونکن'' کے معاملے کے فوراً بعد امریکی جنگی جہازوں نے شمالی ویت نام پر بمباری شروع کر دی، 1965ء کے دوران 200,000 سے زائد امریکی فوجی ویت نام بھیجے گئے اور 1966ء میں مزید 200,000 فوجی بھیجے گئے۔ 1968ء تک وہاں 500,000 سے زائد امریکی فوجی موجود تھے اور یو ایس ایئر فورس اس رفتار سے وہاں بم پھینک رہی تھی جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس بمباری کے نیچے انسانی مصائب اور تکالیف کی ایک بہت چھوٹی سی جھلک بیرونی دنیا تک پہنچ پائی۔ 5 جون 1965ء کو ''نیویارک ٹائمز'' نے سائیگون سے آنے والی ایک رپورٹ شائع کی:

> جیسے ہی کمیونسٹوں نے گوانگ گائی سے پسپائی اختیار کی امریکہ کے بمبار طیاروں نے ان پہاڑیوں پر شدید بمباری کی جن کا وہ رخ کیے ہوئے تھے۔ ان حملوں میں بہت سے ویت نامی (ایک اندازے کے مطابق 500 کے قریب) مارے گئے۔ امریکہ کا موٴقف یہ تھا کہ وہ ویت کانگ سپاہی تھے۔ لیکن نیپام بموں اور لعابی پٹرولیم سے جلنے والے جو مریض علاج کے لیے ویت نام کے ہسپتال میں داخل ہوئے ان میں پانچ میں سے

چار دیہاتی خواتین تھیں۔

6 ستمبر کو سائیگون سے آنے والی ایک اور پریس رپورٹ کے مطابق:

> ایک دوسرے ڈیلٹائی علاقے میں ایک خاتون ہے جس کے دونوں بازو نیپام بم سے جلے ہوئے ہیں، اور اس کے پپوٹے اس قدر جل چکے ہیں کہ وہ آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ جب اسکے سونے کا وقت ہوتا ہے تو اس کے گھر والے اس کے چہرے پر ایک کمبل ڈال دیتے ہیں۔ جس ہوائی حملے میں وہ اپاہج ہوئی اس میں اس کے دو بچے بھی مارے گئے۔ شاید ہی کوئی امریکی اس کی تعریف کرے گا جو اس کی قوم اپنی ہوائی طاقت کے بل بوتے پر جنوبی ویت نام میں کر رہی ہے.... جنوبی ویت نام میں معصوم سویلین ہر روز مر رہے ہیں۔

جنوبی ویت نام کے وسیع علاقوں کو "فری فائر زون" قرار دے دیا گیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ ان علاقوں میں رہنے والے تمام لوگ (سویلین بوڑھے افراد، بچے، خواتین) دشمن تصور کیے جاتے تھے، اور جب دل چاہتا وہاں بم گرانے شروع کر دیے جاتے تھے۔ جن دیہاتوں پر شک گزرتا تھا کہ یہاں ویت کانگ پناہ لیتے ہیں انہیں تباہ برباد کر دیا جاتا تھا۔ ان دیہاتوں میں اس عمر کے افراد کو جو فوجی خدمات دینے کے قابل ہوتے، مار دیا جاتا، گھر جلا دیے جاتے، خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو پناہ گزینوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔

سی آئی اے نے ویت نام میں ایک پروگرام کے تحت جسے "اپریشن فونکس" کا نام دیا گیا جنوبی ویت نام میں کم از کم بیس ہزار سویلین افراد کو، جن پر شک تھا کہ یہ زیرِ زمین کیمونسٹ تحریک کے ممبر ہیں، خفیہ طور پر بغیر کسی مقدمے کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جنگ کے بعد بین الاقوامی ریڈ کراس کے جاری کردہ اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ ویت نامیوں کے قیدی کیمپوں میں جہاں جنگ کے عروج کے زمانے میں 65,000 سے 70,000 قیدی رکھے گئے تھے، جن کو اکثر اوقات مارا پیٹا اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا، امریکی مشیر سب کچھ دیکھتے تھے اور بعض اوقات اس میں حصہ بھی لیتے تھے۔ ریڈ کراس کے مشاہدہ کاروں نے ویت نامی جنگی قیدیوں کے دو بڑے کیمپوں میں، جہاں امریکی مشیر متعین تھے، مسلسل اور منظم تشدد اور ظلم کا مشاہدہ کیا۔

جنگ کے خاتمے تک ویت نام، لاؤس اور کمبوڈیا پر سات ملین ٹن بم گرائے جا چکے تھے جو کہ دوسری جنگ عظیم میں یورپ اور ایشیا پر گرائے جانے والے بموں سے دوگنی مقدار تھی۔ اس کے علاوہ ہوائی جہازوں کے ذریعے زہریلے مواد سپرے کیے گئے جو درختوں سمیت ہر قسم کی نباتات کو تباہ و برباد کر دیتے تھے۔ میساچوسٹس ریاست جتنے رقبے کو اس قسم کے زہریلے مواد سے ڈھانپ دیا گیا، جس کی وجہ سے بے شمار بچے جسمانی نقائص کے ساتھ یعنی معذور پیدا ہوئے۔ "ییل" کے ماہر حیاتیات نے یہی زہر

(2,4,5T) چوہوں پر استعمال کیا اور انہوں نے پیدا ہونے والے چوہوں میں جسمانی نقائص کا مشاہدہ کیا، ان کا کہنا تھا کہ انسانوں میں اس قسم کے اثرات ظاہر نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

16 مارچ 1968ء کو امریکی سپاہیوں کی ایک کمپنی چیانگ نائی صوبے میں ایک چھوٹے سے گاؤں "مائی لائی 4" میں گئی۔ انہوں نے یہاں کے مکینوں کو جن میں بوڑھے، خواتین جنہوں نے اپنے چھوٹے بچے اٹھا رکھے تھے، کو گھیر کر ایک گڑھے میں اترنے کا حکم دیا اور وہاں امریکی فوجیوں نے باقاعدہ طور پر گولیاں چلا کر انہیں مار ڈالا۔ نیویارک ٹائمز نے لیفٹیننٹ "ولیم کیلے" پر بعد میں چلائے گئے ایک مقدمے میں رائفل مین جیمز ڈوری کی شہادت نقل کی:

> لیفٹیننٹ کیلے اور ایک روتے ہوئے رائفل مین "پال ڈی میڈلو" نے، یہ وہی سپاہی تھا جس نے بچوں کو گولیاں مارنے سے پہلے انہیں مٹھائی کھلائی تھی، قیدیوں کو ایک گڑھے میں دھکیلا۔ لوگ ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے، مائیں اپنے بچوں کو بچانے کی کوشش کر رہی تھیں...... ان سب کو جن میں اکثریت خواتین، بچوں اور بوڑھوں کی تھی ایک بڑی قبر میں دفن کر دیا گیا۔

فوج نے جو کچھ ہوا تھا اسے چھپانے کی کوشش کی، لیکن ایک جی آئی "رون ریڈن ہاور" کے خط نے یہ راز افشا کر دیا۔ اس ظالمانہ قتلِ عام کی ایک فوجی فوٹو گرافر "رونالڈ ہیرلے" نے تصاویر لے لی تھیں۔ "سیمور ہرش" جو کہ اس وقت ایک جنگ مخالف خبر رساں ایجنسی "ڈسپیچ نیوز سروس" کے لیے کام کر رہا تھا، نے اس کے بارے میں لکھا، لیکن امریکی پریس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

"مائی لائی" کے قتل عام پر کئی ایک آفیسروں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا، لیکن صرف لیفٹیننٹ "کیلے" کو مجرم قرار دیا گیا۔ اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی، لیکن اس کی سزا میں دو مرتبہ کمی کی گئی، اس نے تین سال قید کاٹی، نکسن نے اسے باقاعدہ جیل کے بجائے گھر میں نظر بندی کا حکم دیا، اور پھر پیرول پر رہا کر دیا گیا۔ ہزاروں امریکی اس کے دفاع کے لیے میدان میں اتر آئے، ان کا خیال تھا کہ اس نے جو کچھ کیا حب الوطنی کے جذبے کے تحت کیا کیونکہ کیمونسٹوں کو کچلنے کے لیے ایسا عمل ضروری تھا، مزید برآں وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسے غیر منصفانہ طور پر علیحدہ کر لیا گیا تھا جبکہ جنگ ایسے واقعات سے بھری ہوئی تھی۔ کرنل "اورن ہینڈرسن" نے جس پر "مائی لائی" قتل عام پر پردہ ڈالنے کا الزام تھا، رپورٹروں کو بتایا:

> "بریگیڈ سائز کی ہر یونٹ کا کسی نہ کسی جگہ پوشیدہ "مائی لائی" موجود ہے۔ حقیقت میں "مائی لائی" محض اپنی تفصیلات میں منفرد تھا۔"

ہرش نے ایک خط کا ذکر کیا ہے جو کہ ایک جی آئی نے اپنے خاندان کو بھیجا تھا، اور ایک مقامی اخبار میں شائع ہوا تھا:

پیاری امی اور ابو!

> آج ہم ایک مشن پر گئے تھے اور میں اپنے آپ کے لیے اپنے دوستوں کے لیے اور اپنے ملک کے لیے بہت "فخر" محسوس کر رہا ہوں، ہم نے ہر نظر آنے والی جھونپڑی کو آگ لگا دی تھی، ہر ایک رو رہا تھا، منتیں کر رہا تھا اور التجائیں کر رہا تھا کہ ہم ان کو جدا نہ کریں اور ان کے خاوندوں، باپوں اور بچوں کو لے کر نہ جائیں۔ خواتین بین کر رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔
>
> اور پھر وہ خوف اور دہشت سے دیکھتے رہے جب کہ ہم ان کے گھروں، ذاتی املاک اور خوراک کو نذر آتش کرتے رہے۔ جی ہاں! ہم نے ان کے تمام چاولوں کو جلا ڈالا اور مویشیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔

سائیگون حکومت کی غیر مقبولیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ 1968ء کے آغاز میں نیشنل لبریشن فرنٹ نے سائیگون اور حکومت کے کنٹرول میں دوسرے شہروں میں ایسی کارروائیاں انجام دیں، جو مقامی آبادی کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھیں۔ "نیشنل لبریشن فرنٹ" ("ٹٹ" کے موقع پر جو کہ ان کے نئے سال کی چھٹی کا دن تھا) جارحانہ حملہ کرتے ہوئے سائیگون کے قلب تک جا پہنچی اور نہ صرف شہر کے ہوائی اڈے کو غیر متحرک کر دیا بلکہ مختصر عرصہ کے لیے امریکی سفارت خانے پر بھی قبضہ کر لیا۔ اگرچہ یہ حملہ پسپا کر دیا گیا، لیکن اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ امریکہ کی تمام تر آتشیں طاقت جو اس نے ویت نام میں جھونک دی تھی، این ایل ایف کے مورال، اس کی عوامی حمایت، اور اس کے پختہ ارادے کو متزلزل نہیں کر سکی تھی۔ اس واقعہ نے امریکی حکومت کو اپنی حکمت عملی پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کر دیا اور امریکی عوام میں مزید شک و شبہات کو جنم دیا۔

اس دوران ویت نام کی سرحد کے اس پار ہمسایہ ملک "لاؤس" میں جہاں "سی آئی اے" کے سائے میں دائیں بازو کی حکومت قائم کی گئی تھی بغاوت سر اٹھانے لگی تھی اور "جار" کے میدانی علاقے میں جو کہ دنیا کے انتہائی خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے شدید بمباری کی جا رہی تھی۔ اس کا حکومت کی جانب سے یا پریس میں کوئی ذکر نہ تھا۔ لیکن ایک امریکی "فریڈ برانف مین" نے جو کہ لاؤس میں رہتا تھا اس داستان کو اپنی کتاب "وائس فرام داپلین آف جار" میں بیان کیا:

> مئی 1964ء سے ستمبر 1969ء تک "جار" کے میدان پر 25,000 فضائی حملے کیے گئے، اور اس پر 75,000 ٹن سے زیادہ بم برسائے گئے۔ زمین پر ہزاروں لوگ مارے گئے اور زخمی ہوئے، لاکھوں لوگ زیر زمین سرنگوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور سطح زمین پر بسنے والا تمام معاشرہ ملیامیٹ کر دیا گیا۔

ستمبر 1973ء میں لاؤس میں مقیم ایک سابقہ حکومتی عہدیدار جیروم ڈوولل" نے نیو یارک ٹائمز

کو لکھا: "جب میں پہلی مرتبہ لاؤس پہنچا تو مجھے اس چھوٹے سے ملک پر کی جانے والی شدید اور ظالمانہ بمباری کی مہم کے بارے میں پریس کے سوالات کا یہ جواب دینے کی ہدایت کی گئی تھی: "لاؤس کی رائل حکومت کی درخواست پر امریکہ غیر مسلح نگران پروازیں کر رہا ہے۔" یہ ایک سفید جھوٹ تھا۔ ہر رپورٹر یہ بات جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔"

1968ء کے اوائل میں ان ظالمانہ جنگی کارروائیوں نے بہت سے امریکیوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ بہت سے دوسرے امریکیوں کے لیے یہ مسئلہ تھا، کہ امریکہ جنگ جیتنے کا اہل نہیں تھا۔ جبکہ اس وقت تک 40,000 امریکی سپاہی مارے جا چکے تھے اور 250,000 زخمی ہو چکے تھے۔ (زخمی ہونے والے اور مارے جانے والے ویت نامیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی)۔

لنڈن جانسن نے اس وحشیانہ جنگ کو شدت دی تھی لیکن اسے ناکامی کا سامنا تھا۔ اس کی مقبولیت بہت کم ہو چکی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا اس کے اور جنگ کے خلاف شدید مظاہرے ہوتے۔ پورے ملک میں ہونے والے عوامی مظاہروں میں ایک ہی نعرہ سنائی دیتا تھا "ایل بی جے، ایل بی جے، تم نے آج کتنے بچوں کو مارا ہے۔" 1968ء کے موسم بہار میں جانسن نے اعلان کیا کہ وہ دوبارہ صدارت کے انتخابات میں حصہ نہیں لے گا، اور یہ کہ پیرس میں ویت نامیوں کے ساتھ امن مذاکرات شروع کیے جائیں گے۔

1968ء کے موسم خزاں میں "رچرڈ نکسن" اس وعدے پر کہ وہ امریکہ کو ویت نام سے نکالے گا صدر منتخب ہو گیا۔ فروری 1972ء میں اس نے وہاں فوجیوں کا انخلا شروع کر دیا اور 150,000 سے کم فوجی وہاں رہ گئے۔ لیکن بمباری معمول کے مطابق جاری رہی۔ نکسن کی پالیسی "ویتنامائزیشن" تھی، یعنی سائیگون کی حکومت ویت نامیوں کی بری فوج کے ساتھ امریکی پیسے اور ہوائی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے جنگ جاری رکھے گی۔ نکسن ویت نام کی جنگ ختم نہیں کر رہا تھا، وہ اس کے انتہائی ناپسندیدہ پہلو کو ختم کر رہا تھا جو کہ ایک دور دراز کے ملک کی زمین پر امریکی فوجیوں کی شمولیت تھی۔

1970ء کی بہار میں نکسن اور وزیر خارجہ ہنری کیسنجر نے ایک لمبی بمباری کے بعد کمبوڈیا پر حملے کا آغاز کر دیا جو کہ حکومت نے عوام پر کبھی بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس حملے نے نہ صرف امریکہ میں عوامی احتجاج کو جنم دیا، بلکہ یہ ایک فوجی ناکامی بھی تھی۔ کانگریس نے ایک قرارداد پاس کی کہ نکسن کانگریس کی منظور کے بغیر امریکی فوجیوں کو جنگ پھیلانے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔

اگلے سال، امریکی فوجیوں کے بغیر، امریکہ نے جنوبی ویت نام کے شہر لاؤس پر حملے کی حمایت کی، یہ بھی ناکام رہا۔ 1971ء میں امریکہ نے لاؤس، کمبوڈیا اور ویت نام پر 8000,000 ٹن بم برسائے۔ اس دوران سائیگون کی فوجی حکومت نے، جس کی قیادت صدر "نیوین وان تھیو" کر رہا تھا جو

کہ سائیگون حکومت کا آخری سربراہ تھا، ہزاروں مخالفین کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔

ویت نام جنگ کے خلاف امریکہ میں مخالفت کے اولین آثار شہری حقوق کی تحریک کی جانب سے ظاہر ہونا شروع ہوئے، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کے ساتھ سیاہ فاموں کے سابقہ تجربے نے انہیں یہ سکھا دیا تھا کہ آزادی کی خاطر لڑنے کے کسی بھی حکومتی دعویٰ پر اعتبار نہ کیا جائے۔ بالکل اسی دن اگست 1964ء کے اوائل میں نکسن قوم کو خلیج ٹونکن کے واقعہ کے بارے میں بتا رہا تھا اور شمالی ویت نام پر بمباری کا اعلان کر رہا تھا، سرگرم عمل سیاہ فام اور سفید فام فلاڈلفیا اور مسیسپی میں اسی موسم گرما میں وہاں مرنے والے شہری حقوق کے تین کارکنوں کی یاد منانے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک مقرر نے بڑی تلخی کے ساتھ ایشیا میں جانسن کے طاقت کے استعمال کا ذکر کیا اور اس کو مسیسپی میں سیاہ فاموں پر ہونے والے تشدد کے مماثل قرار دیا۔

1965ء کے وسط میں مسیسپی کے شہر میک کومب کے نوجوان سیاہ فاموں نے، جنہیں ابھی ابھی علم ہوا تھا کہ ان کا ایک ہم جماعت ویت نام میں مارا گیا ہے، ایک پمفلٹ تقسیم کیا: ''مسیسپی کا کوئی بھی سیاہ فام اس وقت تک ویت نام میں سفید فاموں کی آزادی کے لیے نہیں لڑے گا، جب تک مسیسپی کے تمام نیگروز لوگ آزاد نہیں ہو جاتے۔''

جب وزیر دفاع رابرٹ میک نمارا نے مسیسپی کا دورہ کیا اور ایک نمایاں نسل پرست سینیٹر جان سٹینس کی تعریف کرتے ہوئے اسے ''حقیقی عظمت کا حامل'' انسان قرار دیا تو سیاہ فام اور سفید فام طالب علموں نے ''ویت نام کے جلے ہوئے بچوں کی یاد میں'' پلے کارڈ اٹھا کر ایک احتجاجی جلوس نکالا۔

1966ء کے اوائل میں ''سٹوڈنٹ نان وائلنٹ کوآرڈی نیٹنگ کمیٹی'' نے اعلان کیا کہ ''امریکہ بین الاقوامی قانون کے خلاف ایک جارحانہ پالیسی پر عمل پیرا ہے۔'' اور ویت نام سے واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس موسم گرما میں ایس این سی سی کے چھ ممبران کو اٹلانٹا کے فوجی بھرتی مرکز پر حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور کئی سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔

اس دوران ''ایس این سی سی'' کے ایک سرگرم کارکن ''جیولین بانڈ'' نے جو حال ہی میں جورجیا کے ایوان نمائندگان میں منتخب ہوا تھا، جنگ اور زبردستی فوج میں بھرتی کے خلاف بیان دیا، اور ایوان نے متفقہ رائے دی کہ وہ ایوان میں نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ اس کا بیان ''سلیکو سروس ایکٹ'' کی خلاف ورزی ہے اور ایوان کی بدنامی کا باعث ہے۔ سپریم کورٹ نے ''بانڈ'' کو اس کی سیٹ پر بحال کیا اور کہا کہ ''پہلی ترمیم'' کے مطابق اسے اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کا حق حاصل ہے۔

ایک عظیم قومی کھلاڑی سیاہ فام باکسر اور چمپئن محمد علی نے ویت نام جنگ میں اسے ''سفید فاموں کی جنگ'' قرار دیتے ہوئے شمولیت سے انکار کر دیا۔ باکسنگ حکام نے اس کا چمپئن کا اعزاز ضبط کر

لیا۔ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے نیویارک میں ''ریور سائیڈ چرچ'' میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

کسی نہ کسی طرح یہ پاگل پن لازمی ختم ہونا چاہیے۔ ہمیں اب لازمی رُک جانا چاہیے۔ میں خدا کے بالک، اور مصیبت زدہ غریب ویت نامیوں کے بھائی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ میں ان کے لیے بات کر رہا ہوں جن کی زمینوں کو بنجر کیا جا رہا ہے، جن کے گھروں کو تباہ کیا جا رہا ہے، جن کی تہذیب کو برباد کیا جا رہا ہے۔ میں امریکہ کے ان غریبوں کی بات کر رہا ہوں جو وطن میں اپنی امیدوں کے کچلے جانے اور ویت نام میں موت، او رملک کے اندر بدعنوانیوں کی دہری قیمت چکا رہے ہیں۔ میں دنیا کے شہری کی حیثیت سے اس دنیا کی بات کر رہا ہوں جو ہمارے اختیار کیے گئے راستے پر دہشت زدہ کھڑی ہے، میں ایک امریکی کی حیثیت سے اپنی قوم کے لیڈروں سے بات کر رہا ہوں، اس جنگ کو مسلط کرنے میں پہل ہم نے کی ہے اور اس جنگ کو روکنے میں بھی پہل ہم ہی کو کرنا پڑے گی۔

نوجوان افراد نے زبردستی فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کرنا شروع کر دیا، 1964ء میں ''ہم نہیں مانیں گے'' کے نعرے نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ کچھ لوگ جن کے نام کا اندراج کیا گیا تھا انہوں نے جنگ کے خلاف احتجاج کے طور پر سرعام اپنے بھرتی کے کاغذات جلانے شروع کر دیے۔ اکتوبر 1967ء میں پورے ملک میں منظم طور پر بھرتی کے کارڈز کی واپسی کا عمل شروع ہو گیا، صرف سان فرانسسکو میں بھرتی کے تین سو کارڈز حکومت کو واپس کیے گئے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل پینٹاگون کے سامنے ایک بہت بڑے مظاہرے میں، جمع کیے گئے بھرتی کے کارڈز کی ایک بوری جسٹس ڈیپارٹمنٹ کو پیش کی گئی تھی۔

مئی 1969ء میں اوک لینڈ کے بھرتی مرکز میں، جہاں پورے شمالی کیلیفورنیا سے بھرتی کیے جانے والے افراد رپورٹ کرتے تھے، 4400 افراد میں سے جنہیں بھرتی کے لیے بلایا گیا تھا 2400 افراد وہاں پہنچے ہی نہیں تھے۔ 1970ء کی پہلی سہ ماہی میں پہلی مرتبہ ''سلیکو سروس سسٹم'' اپنا کوٹا پورا کرنے میں ناکام رہا۔

جنگ کے شروع میں ایسے دو مختلف واقعات ہوئے جن سے زیادہ تر امریکی بے خبر رہے۔ 2 نومبر 1965ء کو پینٹاگون کے سامنے سہ پہر کے آخری وقت جب سینکڑوں ملازمین باہر نکل رہے تھے، تین بچوں کے باپ، ایک بتیس سالہ امن پسند شخص نے وزیر دفاع رابرٹ میک نمارا کے تیسری منزل پر واقع دفتر کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے آپ پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا لی اور جنگ کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اسی سال ڈیٹرائٹ میں بھی ایک 80 سالہ خاتون نے ہند چینی میں ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف اپنے آپ کو آگ لگا کر جان دے دی۔

لوگوں کے جذبات میں ایک حیران کن تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ 1965ء کے شروع میں جب

ویت نام پر بمباری شروع ہوئی "بوسٹن کامن" پر بمباری کے خلاف اپنی نفرت کے اظہار کے لیے ایک سو افراد اکٹھے ہوئے۔ 15 اکتوبر 1969ء کو جنگ کے خلاف احتجاج کے طور پر "بوسٹن کامن" پر 100,000 افراد کا اجتماع ہوا۔ اور شاید اس دن پورے ملک کے شہروں اور قصبوں میں بیس لاکھ افراد اکٹھے ہوئے، جہاں اس سے پہلے کبھی بھی جنگ مخالف اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔

1970ء تک واشنگٹن امن ریلیوں میں سینکڑوں ہزار لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ 1971ء میں سول نافرمانی کے لیے بیس ہزار افراد واشنگٹن میں جمع ہوئے، انہوں نے ویت نام میں ابھی تک جاری قتل و غارت کے خلاف اپنی برگشتگی کے اظہار کے لیے واشنگٹن میں ٹریفک جام کرنے کی کوشش کی، ان میں سے چودہ ہزار افراد کو گرفتار کر لیا گیا، جو کہ امریکی تاریخ میں سب سے بڑی عوامی گرفتاریاں تھیں۔

امن فوج (امریکہ کی ایک حکومتی تنظیم جو ترقی پزیر ممالک میں رضا کار بھیجتی ہے) کے سینکڑوں رضا کاروں نے جنگ کے خلاف آواز اٹھائی، چلی میں بانوے رضا کاروں نے امن فوج کے ڈائریکٹر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جنگ کی مذمت میں ایک مراسلہ جاری کیا۔ اس فوج کے آٹھ سو سابقہ ممبران نے جو کچھ ویت نام میں ہو رہا تھا، اس کے خلاف احتجاج کے طور پر ایک بیان جاری کیا۔

شاعر "رابرٹ لوول" کو وائٹ ہاؤس کی ایک تقریب میں مدعو کیا گیا، اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ آرتھر ملر کو بھی مدعو کیا گیا تھا اس نے ٹیلی گرام بھیجی "جب توپیں گرجتی ہیں، فن مر جاتا ہے۔" گلوکارہ "ارتھا کٹ" کو وائٹ ہاؤس کے لان میں دیئے گئے ظہرانے میں مدعو کیا گیا، اور اس نے وہاں صدر کی بیوی کی موجودگی میں جنگ کے خلاف باتیں کر کے تمام لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ایک نوجوان، جسے وائٹ ہاؤس میں انعام وصول کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، نے جنگ پر شدید تنقید کی۔

لندن میں دو نوجوان امریکی گیٹ کو دھکیلتے ہوئے امریکی سفیر کے دیئے گئے شاندار استقبالیے میں زبردستی گھس آئے اور ویت نام میں تمام مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کا جام صحت تجویز کیا۔ انہیں محافظوں نے اٹھا کر باہر نکالا۔ بحرالکاہل میں دو نوجوان امریکی ملاحوں نے ایک اسلحہ بردار جہاز کو اغوا کر لیا اور اسے تھائی لینڈ کے ہوائی اڈوں کے لیے بم اور گولہ بارود پہنچانے سے روک دیا۔ چار دن تک انہوں نے جہاز اور عملے کی کمانڈ کو سنبھالے رکھا یہاں تک کہ یہ کمبوڈیا کے سمندروں میں پہنچ گیا، انہوں نے جاگتے رہنے کے لیے "ایمفی ٹامائن" کی گولیاں استعمال کیں۔

متوسط طبقے اور پیشہ ور افراد نے، جو فعال پذیری سے ناواقف تھے، انہوں نے آواز اٹھانا شروع کر دی۔ مئی 1970ء میں "نیویارک ٹائمز" نے واشنگٹن سے رپورٹ شائع کی: "100 حکومتی وکلاء نے جنگ کے خلاف احتجاج میں شمولیت اختیار کر لی۔" کارپوریشنوں نے غور کرنا شروع کر دیا کہ جنگ ان کے طویل المدتی مفادات کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ "وال سٹریٹ جرنل" نے جنگ کے تسلسل پر تنقید کرنا شروع کر دی۔

جیسے جیسے جنگ عوام میں زیادہ سے زیادہ غیر مقبول ہوتی چلی گئی، حکومت کے حواری جنگ کے بارے میں رضامندی کے دائرے سے باہر آتے چلے گئے۔ سب سے ڈرامائی واقعہ ڈینئیل ایلس برگ کا تھا۔

ایلس برگ ایک ہارورڈ کا تربیت یافتہ کیمونسٹ تھا۔ بحریہ کا ایک سابقہ آفیسر تھا اور وہ "آر اے این ڈی کارپوریشن" میں ملازم تھا، جو امریکی حکومت کے لیے اکثر مخصوص خفیہ تحقیقات کرتی تھی۔ ایلس برگ نے ویت نام کی جنگ کی تاریخ لکھنے میں محکمہ دفاع کی مدد کی تھی۔ پھر اس نے اپنے ایک دوست "آر اے این" کارپوریشن کے سابقہ ملازم انتھونی روسو کی مدد سے انتہائی خفیہ دستاویزات کو عام کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں کی سائیگون میں ملاقات ہوئی تھی اور یہاں وہ جنگ کے مختلف مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بہت متاثر ہوئے تھے اور امریکہ جو کچھ ویت نام کے لوگوں کے ساتھ کر رہا تھا اس پر شدید برہم تھے۔

ایلس برگ اور روسو نے اپنے ایک دوست کی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کئی راتوں تک کام کر کے 7,000 صفحات کی دستاویزات کی نقول تیار کیں۔ پھر ایلس برگ نے بہت سے کانگریس ممبران اور "نیویارک ٹائمز" کو یہ نقول دے دیں۔ جون 1971ء میں ٹائمز نے ان دستاویزات سے انتخابات شائع کرنا شروع کر دیئے جو کہ "پینٹاگون پیپرز" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے قومی سطح پر ایک سنسنی کو جنم دیا۔

نکسن کی انتظامیہ نے ان کی اشاعت کو رکوانے کے لیے سپریم کی مدد حاصل کرنا چاہی، لیکن عدالت نے اسے آزادی پریس میں مداخلت اور غیر آئینی قرار دے دیا، تب حکومت نے ایلس برگ اور روسو پر ایسی دستاویزات جو مخصوص افراد کے لیے تھیں غیر متعلقہ افراد تک پہنچانے کا الزام لگایا، جرم ثابت ہونے پر انہوں نے کئی برس جیل میں بسر کرنے تھے۔ تاہم جج نے جیوری کی بحث و تمحیص کے دوران کیس ملتوی کر دیا کیونکہ اس وقت واٹر گیٹ کے واقعات منظر عام پر آنے پر استغاثہ کا ناجائز سرگرمیوں میں ملوث ہونا ثابت ہو گیا۔

جنگ کے خلاف تحریک جب پروان چڑھنا شروع ہوئی تو اسے ایک عجیب اور نیا حلقہ میسر آ گیا، جو کہ کیتھولک چرچ سے تعلق رکھنے والے پادری اور راہبات تھیں۔ کچھ تو شہری حقوق کی تحریک سے متاثر ہو کر آگے آئے تھے اور دوسرے وہ تھے جنہوں نے لاطینی امریکہ میں امریکہ کی حمایت یافتہ حکومتوں کے تحت عوامی غربت اور ناانصافی کے نظارے دیکھے تھے۔ 1967ء کے موسم خزاں میں فادر فلپ بیری گان (ایک "جوزفی" پادری جو کہ دوسری عالمی جنگ کا سپاہی بھی تھا)، فن کار ٹام لیوکس اور اپنے دوستوں

ڈیوڈ ایبر ہارٹ اور جیمز مینگل کے ساتھ بالٹی مور میری لینڈ کے فوجی بھرتی کے دفتر میں گئے، بھرتی کے ریکارڈ کو خون میں بھگو دیا اور گرفتاری کے انتظار میں وہاں بیٹھ گئے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور دو سے چھ سال تک کی قید کی سزا سنائی گئی۔

اگلی مئی میں فلپ بیری گان نے اپنے بھائی ڈینئل (جو کہ یسوعی پادری تھا جو ویت نام کا دورہ کر چکا تھا اور اپنی آنکھوں سے امریکی بمباری کے اثرات دیکھ چکا تھا) کے ساتھ مل کر ایک اور کارروائی کر دی۔ وہ اور سات دوسرے افراد کیٹنز ویلی، میری لینڈ میں ایک فوجی بھرتی کے دفتر میں گئے، سارا ریکارڈ اٹھایا اور باہر لا کر رپورٹرز اور تماشبین کی موجودگی میں آگ لگا دی۔ ان پر فردِ جرم عائد کی گئی اور قید کی سزا سنائی گئی۔ وہ "کیٹنز ویلی نائن" کے نام سے مشہور ہوئے۔

ڈینئل بیری گان نے کیٹنز ویلی کے واقعے کے بارے میں "میڈی ٹیشن" کو لکھا:

> ہم بچوں کے بجائے کاغذات کو آگ لگانے پر معافی نہیں مانگ سکتے....اے ہمارے خدا دیگر اچھے کام کرنے میں ہماری مدد فرما....وہ وقت گزر چکا ہے جب اچھے لوگ خاموش رہ سکتے تھے، جب تابعداری عام آدمیوں کو، عوام کو درپیش خطرات سے بے نیاز رکھتی تھی، جب غریب لوگ بغیر کسی دفاع کے مر جاتے تھے۔

جب اپیلیں ختم ہو گئیں اور اس کے جیل جانے کے امکانات واضح ہو گئے تو ڈینئل غائب ہو گیا۔ وہ چار ماہ تک زیرِ زمین رہا۔ نظمیں لکھتا رہا، بیانات دیتا رہا، خفیہ انٹرویوز دیتا رہا، فلاڈلفیا کے ایک چرچ میں اچانک ظاہر ہوا، خطبہ دیا اور ایف بی آئی کو چکر دے کر غائب ہو گیا۔ پھر ایک مخبر نے اس کے ایک خط کے ذریعے اس کی رہائش گاہ کا پتہ چلایا اور اسے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔

جنگ کے اثر اور کچھ پادریوں اور ننوں کے جرأتمندانہ اقدامات نے کیتھولک طبقے کی روایتی قدامت پسندی میں دراڑ ڈال دی تھی۔ 1969ء کے "مورٹوریم ڈے" (ویت نام جنگ کے خلاف منایا گیا دن) کے موقع پر بوسٹن کے نزدیک "سیکرڈ ہارٹ" کے نیوٹن کالج کے گیٹ پر، جو کہ ایک سیاسی طور پر خاموش کالج تھا، سرخ رنگ سے ایک مکے کی تصویر بنا دی گئی تھی۔ بوسٹن کالج میں جو کہ ایک کیتھولک ادارہ تھا، اس شام اس کے جمنیزیم میں چھ ہزار افراد کا اجتماع ہوا جنہوں نے جنگ کی شدید مذمت کی۔

طالب علم جنگ کے خلاف احتجاج کے ابتدائی دنوں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ان کو ابھارنے میں زیادہ تر کردار "سٹوڈنٹس فار ڈیموکریٹک سوسائٹی" (ایس ڈی ایس) کا تھا۔ حتیٰ کہ 60 کے عشرے کے آخر میں ہائی سکولوں میں بھی پانچ سو زیرِ زمین اخبارات شائع ہوتی تھیں۔ 1969ء میں براؤن یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر جب ہنری کیسنجر خطاب کے لیے کھڑا ہوا تو گریجوایٹ کرنے والے نوجوانوں کی دو تہائی تعداد نے اس کی جانب اپنی پشتیں کر دیں۔

احتجاج کا عروج اس وقت حاصل ہوا جب 1970ء کے موسم بہار میں صدر نکسن نے کمبوڈیا پر حملے کا حکم دیا۔ 4 مئی کو اوہایو میں کینٹ سٹیٹ یونیورسٹی میں جب طالب علم جنگ کے خلاف مظاہرے کے لیے جمع ہوئے تو نیشنل گارڈ کے آدمیوں نے ہجوم پر گولیاں چلا دیں، چار طالب علم مارے گئے۔ ایک ساری عمر کے لیے مفلوج ہو گیا۔ چار سو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں نے احتجاج کے طور پر ہڑتال کی۔ یہ امریکہ کی تاریخ میں طالب علموں کی سب سے بڑی عمومی ہڑتال تھی۔ 1969ء اور 1970ء کے تعلیمی سال کے دوران ایف بی آئی نے 1785 طالب علم مظاہروں کا اندراج کیا جن میں 313 عمارتوں پر قبضہ بھی شامل تھا۔

کینٹ سٹیٹ کی اموات کے بعد تقسیم اسناد کی تقریبات ایسی تھیں جن کا قوم نے شاید ہی اس سے پہلے تجربہ کیا ہو۔ "یونیورسٹی آف میساچوسٹس" کی 100 ویں تقسیم اسناد تقریب کے بارے میں یہ اخبار میں رپورٹ شائع ہوئی۔ "سیاہ تعلیمی گاؤنوں پر سرخ احتجاجی مکے، سفید امن کی علامات اور نیلی فاختائیں بنائی گئیں تھیں اور تقریباً ہر دوسرے سینئر آدمی نے امن کی اپیل کے اظہار کے طور پر بازوؤں پر پٹیاں باندھی ہوئیں تھیں۔"

آر او ٹی سی (ریزرو آفیسر ٹریننگ پروگرام) کے خلاف طلبا کے مظاہروں کے نتیجے میں چالیس سے زائد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔ ویت نام میں آدھے آفیسروں کی سپلائی کا انحصار "آر او ٹی سی" پر تھا۔ ستمبر 1973ء کو "آر او ٹی سی" لگاتار پچھلے چھ ماہ سے اپنا کوٹا پورا نہیں کر سکا تھا۔

طلبا کے احتجاج کو دی گئی تشہیر سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ جنگ کی مخالفت زیادہ تر متوسط دانشمند طبقے کی جانب سے ہے۔ لیکن مشی گن کے شہر "ڈیربورن" میں، جو کہ ایک آٹوموبائل تیار کرنے والا شہر ہے، کیے گئے ایک پول سروے سے پتا چلتا ہے کہ 1967ء کے آخر میں جب ایک گیلپ سروے میں اس بیان پر کہ "امریکہ کو اگلے سال کے اختتام تک ویت نام سے اپنی تمام افواج نکال لینی چاہئیں۔" رائے طلب کی گئی تو 65 فیصد نے "ہاں" میں جواب دیا۔

سب سے حیران کن مواد ہمیں اس سروے سے ملتا ہے جو یونیورسٹی آف مشی گن نے کیا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پوری ویت نام جنگ کے دوران وہ امریکی جن کی تعلیم صرف گریڈ سکول کے درجہ تک تھی، ان امریکیوں کی نسبت جن کی تعلیم کالج کے درجہ تک تھی، زیادہ شدت کے ساتھ جنگ کے خاتمے کی حمایت کر رہے تھے۔ جون 1966ء میں کالج کے درجہ کی تعلیم رکھنے والوں کی 27 فیصد اور سکول کی سطح تک تعلیم حاصل کرنے والوں کی 41 فیصد تعداد فوری انخلا کی حامی تھی۔ ستمبر 1970ء تک دونوں گروہوں میں جنگ مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہوا، کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کرنے والوں میں 47 فیصد اور سکول

کی سطح تک تعلیم حاصل کرنے والوں میں ان کی تعداد 61 فی صد ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ پورے ملک کی آبادی کے رویوں میں ایک عمومی تبدیلی کا حصہ تھا۔ 1965ء میں 61 فی صد آبادی یہ سمجھتی تھی کہ ویت نام میں امریکی مداخلت غلط نہیں ہے۔ 1971ء تک صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ 61 فی صد خیال کرتے تھے کہ ہماری مداخلت غلط ہے۔ "بروس اینڈ ریو" ہارورڈ کے عوامی رائے کے ایک طالب علم کے مشاہدے کے مطابق جنگ کے مخالف افراد میں زیادہ تر پچاس سال سے اوپر کے افراد، کالے اور خواتین شامل تھیں۔ اس نے اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ جب ویت نام کی جنگ اخبارات میں ایک معمولی مسئلہ تھی، تو 53 فی صد کالج کے تعلیم یافتہ افراد ویت نام میں فوجی بھیجنے پر رضامند تھے۔ لیکن گریڈ سکول تک تعلیم یافتہ طبقہ میں سے صرف 33 فی صد اس بات پر رضامند تھے۔

عام امریکیوں میں آزادانہ فیصلے کی اہلیت کا بہترین مظاہرہ غالباً امریکی "جی آئیز" (رضاکار اور زبردستی فوج میں بھرتی کیے گئے لوگ جن کا تعلق زیادہ تر کم آمدنی والے گروپس سے تھا) میں تیزی سے جنگ مخالف جذبات کے فروغ کی صورت میں دیکھنے میں آیا۔ امریکی تاریخ میں اس سے پہلے بھی فوجیوں کی جنگ سے بے دلی، انقلابی جنگ کے دوران انفرادی فوجی بغاوتوں، میکسیکو جنگ کے دوران بھرتی ہونے سے انکار، پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ میں فوج سے بھاگنے اور اصولی تعرض کے واقعات کا ریکارڈ موجود ہے، لیکن ویت نام کی جنگ نے فوج میں جس پیمانے اور شدت کے ساتھ مخالفت کو جنم دیا اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔

اس کا آغاز انفرادی احتجاج سے ہوا۔ جون 1965ء میں ویسٹ پوائنٹ کے ایک گریجوایٹ "رچرڈ سٹینکی" نے ویت نام میں ایک جہاز پر سوار ہونے سے انکار کر دیا جو اسے ویت نام کے ایک دور دراز گاؤں میں لے کر جا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "ویت نام کی جنگ ایک واحد امریکی کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔" سٹینکی کا کورٹ مارشل کیا گیا اور اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ اگلے برس چھوٹے عہدوں کے تین فوجیوں (ایک سیاہ فام، ایک پیورٹوریکن اور ایک لیتھوانین اطالوی) نے ویت نام کے لیے جہاز پر سوار ہونے سے انکار کر دیا، انہوں نے جنگ کو "غیر اخلاقی، غیر قانونی اور بلا جواز" قرار دیا۔ ان کا کورٹ مارشل ہوا اور قید میں ڈال دیے گئے۔

انفرادی کارروائیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اوک لینڈ میں ایک چھوٹے عہدے کے سیاہ فام فوجی نے ویت نام جانے والے فوجی جہاز پر چڑھنے سے انکار کر دیا، اگرچہ اس کو گیارہ سال قید بامشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک نیوی کی نرس لیفٹیننٹ "سوزن شنل" کا یونیفارم میں ایک امن ریلی میں شرکت اور نیوی کی تنصیبات پر جہاز سے جنگ مخالف اشتہار پھینکنے پر کورٹ مارشل ہوا۔ "نورفوک" ورجینیا میں ایک ملاح نے لڑاکا پائلٹوں کو تربیت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ جنگ کو غیر اخلاقی خیال کرتا تھا۔ واشنگٹن

ڈی سی میں 1968ء کے اوائل میں ایک فوجی لیفٹیننٹ کو گرفتار کیا گیا جو کہ وائٹ ہاؤس کے سامنے پلے کارڈ اٹھا کر مظاہرہ کر رہا تھا جس پر لکھا تھا "120,000 امریکیوں کی اموات کیوں؟" دو سیاہ فام نیوی کے سپاہیوں جارج ڈینٹلو اور ولیم ہاروے کو لمبی قید کی سزا سنائی گئی (ڈینٹلو کو چھ سال اور ہاروے کو دس سال، بعد میں اگرچہ اس میں کمی کر دی گئی)، ان پر نیوی کے دوسرے سیاہ فام سپاہیوں کے ساتھ جنگ مخالف گفتگو کرنے کا الزام تھا۔

جیسے جیسے جنگ آگے بڑھتی گئی مسلح افواج سے بھاگنے کی وارداتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہزاروں لوگ مغربی یورپ (فرانس، سویڈن، ہالینڈ) چلے گئے۔ بہت سے بھگوڑے کینیڈا کا بارڈر پار کر گئے، کچھ کا اندازہ 50,000 تھا اور کچھ 100,000 بتاتے تھے۔ کچھ امریکہ میں ہی رہے۔ کچھ نے فوجی احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے گرجوں میں پناہ لے لی، جہاں وہ اپنے جنگ مخالف دوستوں اور ہمدردوں میں گھرے ہوئے پکڑے جانے اور کورٹ مارشل کا انتظار کرتے رہے۔ بوسٹن یونیورسٹی میں طلباء نے ایک 18 سالہ بھگوڑے کا تحفظ کرتے ہوئے پانچ روز تک دن رات پہرہ دیا۔ پھر اسے وفاقی گماشتوں نے گرفتار کر لیا۔

"جی آئی" کی جنگ مخالف تحریک زیادہ منظم ہو گئی۔ جنوبی کیرولینا میں فورٹ جیکسن کے نزدیک پہلا "جی آئی کافی ہاؤس" قائم کیا گیا، یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں فوجی کافی اور "ڈاونٹس" اور جنگ مخالف لٹریچر حاصل کر سکتے تھے، اور دوسروں کے ساتھ آزادانہ گفتگو کر سکتے تھے۔ اسے "یو ایف او" کہا جاتا تھا۔ یہ کئی سال تک چلتا رہا پھر عدالت نے اسے ناگوار قرار دیتے ہوئے بند کر دیا۔ لیکن پورے ملک میں آدھے درجن کے قریب نئے "جی آئی کافی ہاؤسز" کھل گئے۔ ایک جنگ مخالف "کتابوں کی دکان، میساچوسٹس میں "فورٹ ڈیونز" کے قریب اور ایک دوسری دکان جزیرہ رہوڈ میں نیوی کے اڈے نیو پورٹ میں کھلی۔

اختلاف رائے میدان جنگ تک بھی پہنچ گیا تھا۔ جب اکتوبر 1969ء میں "مورٹوریم ڈے" کے عظیم مظاہرے ہو رہے تھے تو ویت نام میں بعض "جی آئیز" نے اپنی حمایت ظاہر کرنے کے لیے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھیں۔ ایک اخباری فوٹو گرافر نے بتایا کہ "ڈانانگ" کے قریب گشت پر ایک پلاٹون کے آدھے سے زیادہ سپاہیوں نے سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ فرانسیسی اخبار "Le Monde" نے لکھا: "جنگ کے خلاف نفرت کے اظہار کے طور پر اپنی بائیں مٹھی کو بھینچے ہوئے سیاہ فام فوجی ایک عام نظارہ ہے۔

ویت نام سے واپس آنے والے پرانے فوجیوں نے ایک گروپ تشکیل دیا جسے "ویت نام جنگ کے خلاف پرانے فوجی" کا نام دیا گیا۔ دسمبر 1970ء میں ان میں سے سو کے قریب "ڈیٹرائٹ" گئے جہاں انہوں نے عوامی جلسے میں ویت نامیوں پر امریکیوں کے توڑے گئے مظالم کی شہادتیں دیں، جن میں

خود بھی شریک تھے یا دیکھا تھا۔ اپریل 1971ء میں ان میں سے ہزار سے زائد جنگ کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے واشنگٹن ڈی سی گئے۔ ایک ایک کر کے وہ دارالحکومت کے گرد بنائے گئے جنگلے تک گئے اور جنگلے کے اوپر سے اپنے تمغے پھینکے جو انہیں ویت نام جنگ کے دوران دیئے گئے تھے۔ اور جنگ کے بارے میں مختصر بیان دیئے جن میں سے بعض بہت جذباتی تھے۔

1970ء کے موسم سرما میں فوج کے اٹھائیس کمشنڈ آفیسرز نے، جن میں کچھ ویت نام کی جنگ میں شرکت کرنے والے پرانے فوجی بھی شامل تھے، "کنسرنڈ آفیسرز موومنٹ" کی تشکیل کا اعلان کیا، ان کا کہنا تھا کہ وہ 2500 دوسرے آفیسرز کی نمائندگی بھی کر رہے ہیں۔ 1972ء کی کرسمس کے لگ بھگ ہنوئی اور "ہے فونگ" پر شدید بمباری کے دوران پہلی مرتبہ "بی-52" کے پائلٹوں کی سرکشی سامنے آئی جنہوں نے ان مشنوں کے لیے پروازوں سے انکار کر دیا۔

لیکن زیادہ تر جنگ مخالف کارروائیاں عام "جی آئیز" کی جانب سے سامنے آئیں جو کہ کم آمدنی والے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سیاہ فام، مقامی امریکی، سفید فام اور چینی شامل تھے۔

نیویارک کا ایک چینی امریکی "سام چوئے" سترہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوا اسے ویت نام میں باورچی کے طور پر بھیجا گیا، اسے اس کے اپنے ساتھی "جی آئیز" نے بدکلامی کا نشانہ بنایا جو اسے "چنک" اور "گوک" (ویت نامیوں کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاح) کہہ کر بلاتے اور کہتے کہ وہ دشمنوں جیسا نظر آتا ہے۔ ایک دن اس نے بندوق اٹھا کر تنگ کرنے والے افراد پر فائرنگ کر دی۔ "چوئے" کو ملٹری پولیس نے گرفتار کر لیا، اسے مارا پیٹا گیا، کورٹ مارشل کیا گیا اور اسے "فورٹ لیون ورتھ" میں چھ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ "وہ مجھے ہر روز ایک مقررہ وقت پر مارتے پیٹتے.....ایک بات میں تمام چینی بچوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ فوج نے مجھے بیزار کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے اس حد تک بیزار کر دیا ہے کہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

1971ء میں بھگوڑوں کی تعداد 1967ء کی نسبت 47000 سے بڑھ کر 89000 تقریباً دوگنی ہو گئی تھی۔ وہ لوگ جو فوج میں رہے، محاذوں پر لڑتے رہے اور پھر جنگ کے خلاف ہو گئے، ان میں سے ایک "ران کووک" تھا۔ اس کا باپ "لانگ آئی لینڈ" میں سپر مارکیٹ میں کام کرتا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ نیوی میں بھرتی ہوا۔ دو سال بعد انیس سال کی عمر میں، ویت نام میں ایک گولا لگنے سے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کمر سے نیچے مفلوج ہو کر وہ پہیوں والی کرسی پر آ گیا۔ امریکہ میں واپسی پر اس نے فوجی ہسپتال میں داخل پرانے فوجیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک ہوتے دیکھا، جنگ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور کرتے ہوئے اس نے "جنگ کے خلاف پرانے ویت نامی فوجیوں کی تنظیم میں شرکت اختیار کر لی۔ وہ مظاہروں میں جنگ کے خلاف بولنے کے لیے گیا۔

ایک شام "کووک" نے ایکٹر "ڈونلڈ سدرلینڈ" کو پہلی عالمی جنگ کے بعد لکھے گئے "ڈالٹن ٹرمبو" کے ناول "جونی گاٹ ہز گن" سے ایک پیراپڑھتے ہوئے سنا جو کہ ایک سپاہی کے بارے میں تھا جس کے بازو اور ٹانگیں اور چہرہ توپ کا گولہ لگنے سے ختم ہو گئے۔ اس کے دھڑ نے بیرونی دنیا سے بات چیت کرنے کا ایک طریقہ نکالا اور پھر ایک ایسا زبردست پیغام دیا جسے سن کر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ "سدرلینڈ نے پیراپڑھنا شروع کیا اور مجھ پر ایک ایسا احساس طاری ہو گیا جسے میں بھول نہیں سکتا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی چیز اُن سب باتوں کے بارے میں بول رہی ہو جن سے میں ہسپتال میں اپنے علاج کے دوران گزرا تھا۔ مجھ پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی اور مجھے یاد ہے کہ میری آنکھوں آنسو تھے۔"

"کووک" نے جنگ کے خلاف مظاہرے میں حصہ لیا اور اپنی کتاب "بورن آن دا فورتھ آف جولائی" میں اپنی گرفتاری کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"تمہارا نام کیا ہے؟" میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے آفیسر نے پوچھا۔

"ران کووک" میں نے جواب دیا "پیشہ، جنگ کے خلاف پرانا ویت نامی فوجی۔"

"کیا؟" اس نے مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"میں جنگ کے خلاف ویت نام میں لڑنے والا ایک پرانا فوجی ہوں۔"

"میں نے تقریباً چیختے ہوئے جواب دیا۔"

"تمہیں وہاں مر جانا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔ وہ اپنے اسسٹنٹ کی جانب گھوما اور کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکے کو اٹھا کر چھت سے نیچے پھینک دیا جائے۔"

کووک اور دوسرے پرانے فوجی ری پبلکن نیشنل کنونشن 1972ء میں شمولیت کے لیے میامی پہنچے، کنونشن ہال میں گئے اور پہیوں والی کرسی کو دھکیلتے ہوئے راہداریوں میں پہنچے اور جب نکسن نے تقریر شروع کی تو انہوں نے "بمباری بند کرو! جنگ بند کرو!" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ مندوبین نے انہیں غدار قرار دے کر لعن طعن کی اور سیکرٹ سروس کے آدمیوں نے انہیں ہال سے باہر نکال دیا۔

1973ء کے موسم خزاں جب کہ شمالی ویت نام کے فوجی جنوبی ویت نام میں مختلف جگہوں پر مورچہ بند تھے، امریکہ فتح کے کوئی آثار نہ دیکھتے ہوئے اس شرط پر اپنی فوجیں نکالنے پر رضامند ہو گیا کہ انقلابی فوجی جہاں ہیں وہاں رہیں گے۔ جب تک کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ عناصر پر مشتمل نئی حکومت قائم نہیں ہو جاتی۔ لیکن سائیگون حکومت نے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر امریکہ نے "شمالی ویت نام کو سرنگوں کرنے کے لیے آخری پٹائی کا فیصلہ کیا۔ اس نے "بی 52" طیاروں کے حملوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا اور ہنوئی اور "ہے فونگ" کے شہروں میں مکانات اور ہسپتالوں پر شدید بمباری کر کے سویلین افراد کی ایک نامعلوم تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن ان حملوں نے بھی کوئی کام نہ دکھایا۔

بہت سے "بی 52" گرا دیے گئے۔ پوری دنیا میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور ہر ملک میں جنگ کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ کیسنجر واپس پیرس گیا اور تقریباً "ویسے ہی امن معاہدے پر دستخط کر دیے جیسا کہ پہلے طے ہو چکا تھا۔

امریکہ نے اپنی افواج واپس بلا لیں اور سائیگون حکومت کو مدد دینا جاری رکھا۔ لیکن جب 1975ء کے اوائل میں شمالی ویت نام نے جنوبی ویت نام کے بڑے شہروں پر حملے شروع کیے تو حکومت ختم ہوگئی۔ اپریل 1975ء کو شمالی ویت نام کی فوجیں سائیگون میں داخل ہوگئیں۔ امریکی سفارت خانے کا عملہ بہت سے ویت نامیوں کے ساتھ جو کمیونسٹ حکومت سے خائف تھے ملک چھوڑ کر بھاگ گیا اور ویت نام کی لمبی جنگ اختتام کو پہنچی۔ سائیگون کا نام "ہو چی منہ سٹی" رکھ دیا گیا اور ویت نام کے دونوں حصوں کو "ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویت نام" کے نام سے متحد کر دیا گیا۔

روایتی تاریخ میں عام طور پر جنگوں کے اختتام کو لیڈروں کی کاوش (پیرس، برسلز، جنیوا، ورسیلز میں مذاکرات) قرار دیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح جنگ کی ابتداء کو عوامی مطالبے کا ردعمل قرار دیا جاتا ہے۔ ویت نام کی جنگ سے ہمیں واضح شہادت ملتی ہے کہ ایسا صرف تب ہوا جب کمبوڈیا میں مداخلت ختم ہوگئی اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حملے کے خلاف ہونے والے قومی سطح پر احتجاج کے بعد کانگرس نے قرارداد پاس کی کہ امریکی افواج کمبوڈیا میں اس کی منظوری کے بغیر نہیں بھیجی جائیں گی۔

کانگریس نے کانگریس کی منظوری کے بغیر جنگ شروع کرنے کے صدر کے اختیار کو اس وقت تک محدود نہیں کیا جب تک 1973ء کے آخر میں امریکی فوجیوں کو بالآخر ویت نام سے نکال نہیں لیا گیا۔ لیکن یہاں بھی "جنگی اختیارات کی قرارداد" میں یہ چھوٹ رکھی گئی کہ صدر ساٹھ دن کے لیے کانگریس کی منظوری کے بغیر اپنی ذاتی صوابدید پر جنگ شروع کر سکتا ہے۔

انتظامیہ نے امریکی عوام پر یہ تاثر ڈالنے کی کوشش کی کہ جنگ اس کے امن مذاکرات کے فیصلے کی وجہ سے ختم ہوئی ہے، اس لیے ختم نہیں ہوئی کہ امریکہ جنگ ہار رہا تھا اور نہ ہی ملک میں جنگ کے خلاف شدید تحریک کے نتیجے میں ختم ہوئی۔ لیکن پوری جنگ کے دوران حکومت کی اپنی خفیہ یادداشتوں میں ہر مرحلے پر ملک کے اندر اور بیرون ملک "عوامی رائے" سے خوف کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ "پینٹا گون پیپرز" سے ثابت ہوتا ہے۔

1966ء کے اوائل میں اسسٹنٹ سیکرٹری دفاع "جان میک ناؤٹن" کی ایک یادداشت میں عوام میں غذائی قلت پیدا کرنے کے لیے بندوں اور ڈیموں کو تباہ کرنے کا مشورہ دیا گیا، کیونکہ عوام کو براہ راست نشانہ بنانا ملک کے اندر اور بیرون ملک نفرت کی شدید لہر کا سبب بن سکتا تھا۔ اس نے متنبہ کیا:

اکثر امریکی اور دنیا کے بیشتر عوام امریکہ کو جنگ میں ایک حد سے آگے جانے

کی اجازت نہیں دیں گے۔ ایک ایسے مسئلے پر جس کے مختلف پہلوؤں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے، ایک پسماندہ اور چھوٹی سی قوم کو تابع فرمان کرنے کے لیے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا ہر ہفتے 1000 سے زائد جنگ نہ کرنے والے سویلین کو موت کے گھاٹ اتارنا یا شدید زخمی کر دینا کوئی اچھا منظر نہیں ہوگا۔

1968ء کے موسم بہار میں "ٹٹ" (ویت نام میں نئے سال کا آغاز) کے موقع پر نیشنل لبریشن فرنٹ کے اچانک اور خوف ہراس پیدا کر دینے والے جارحانہ حملے کے بعد جنرل ویسٹ مور لینڈ نے صدر نکسن سے پہلے سے موجود 525,000 فوجیوں کے علاوہ مزید 200,000 فوجی بھیجنے کی درخواست کی۔ جانسن نے پینٹاگون میں "ایکشن آفیسرز" کے ایک چھوٹے سے گروپ کو مشورہ دینے کے لیے کہا۔ انہوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ 200,000 فوجی سائیگون کی حکومت کو مضبوط نہیں کر سکیں گے۔ سائیگون کی لیڈر شپ عوام کی حمایت یا وفاداری جیتنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مزید برآں رپورٹ میں کہا گیا کہ مزید فوج بھیجنے کا مطلب "ریزرو" کو متحرک کرنا اور فوج کے بجٹ میں اضافہ کرنا ہوگا۔ امریکی افواج میں اموات کی شرح بڑھ جائے گی، مزید ٹیکس لگانا پڑیں گے اور:

اس خیال کے تحت، کہ ہم مقامی مسائل کو نظر انداز کر رہے ہیں، بڑھتی ہوئی نفرت کے ساتھ یقینی طور پر فوجی بھرتی کے خلاف نافرمانی میں اضافہ ہوگا اور شہروں میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطراب کے نتیجے میں ملک کے اندر ایسا بحران پیدا ہونے کا خطرہ ہے جس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔

"شہروں میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطراب" یقینی طور پر 1967ء میں ہونے والی سیاہ فام "بغاوت" کی طرف اشارہ تھا، اور بیرون ملک جنگ اور ملک کے اندر بڑھتی ہوئی غربت میں تعلق کو، خواہ سیاہ فاموں نے دانستہ طور پر یہ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی یا نہیں، ظاہر کرتی تھی۔

جب نکسن نے صدارت کا عہدہ سنبھالا تو اس نے عوام پر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ احتجاج اس پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ لیکن جب امن کے حامی ایک تنہا شخص نے وائٹ ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کیا تو تقریباً بے قابو ہو گیا۔ اختلاف رائے رکھنے والوں کے خلاف نکسن کی کارروائیوں میں پائے جانے والے اضطراب اور ہیجان (نقب زنیوں کے منصوبے، ٹیلی فون کو ٹیپ کرنا، اور ڈاک کھولنا) قومی لیڈروں کے ذہن میں جنگ کے خلاف تحریک کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔

جنگ کے خلاف تحریک نے امریکی عوام کے ذہنوں پر جو اثرات مرتب کئے اس کی ایک علامت ہمیں اُن جیوریوں میں نظر آتی ہے جو جنگ کے خلاف مظاہرہ کرنے والے ملزموں کو سزا دینے سے تامل سے کام لیتی تھیں، اور مقامی جج بھی ان سے مختلف سلوک روا رکھتے تھے۔

فوجی بھرتی کے دفتر پر حملہ کرنے والا آخری گروہ ''کیمڈن 28'' پادریوں، ننوں اور عام آدمیوں پر مشتمل تھا، جنہوں نے اگست 1971ء میں نیو جرسی میں ''کیمڈن'' کے فوجی بھرتی کے دفتر پر حملہ کیا۔ جیوری نے انہیں تمام الزامات سے بری قرار دیا۔

ویت نام کی جنگ، دوسری عالمی جنگ کے بعد تشکیل پانے والی دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ کی پہلی واضح شکست تھی۔ اسے شکست سے دوچار کرنے والے ویت نام کے انقلابی کسان اور ملک کے اندر جنم لینے والی حیران کن احتجاجی تحریک تھی۔

26 ستمبر 1969ء کو صدر رچرڈ نکسن نے پورے ملک میں بڑھتی ہوئی جنگ مخالف سرگرمیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا ''میں کسی بھی صورت میں اس سے خواہ کچھ بھی ہو متاثر نہیں ہوں گا۔'' لیکن نو سال بعد اپنی ''یادداشتوں'' میں اس نے تسلیم کیا کہ جنگ مخالف تحریک نے اسے جنگ میں شدت لانے سے باز رکھا۔ ''اگرچہ عوامی سطح پر میں نے جنگ مخالف مناقشوں کو نظرانداز کرنا جاری رکھا، تاہم میں جانتا تھا کہ جنگ میں کسی فوجی طاقت کا اضافہ امریکی عوام کی رائے میں سنجیدہ اختلاف کا باعث بن سکتا ہے۔'' یہ عوامی احتجاج کی طاقت کا ایک نادر صدارتی اعتراف تھا۔

دوسرں نقطہ نگاہ سے شاید کچھ زیادہ اہم بات ہو چکی تھی۔ ملک کے اندر بغاوت ویت نام کی جنگ کے مسئلے سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔

بوالعجبیاں

1911ء میں ہیلن کیلر نے کہا تھا ''ہم ووٹ دیتے ہیں، یہ بات کیا اہمیت رکھتی ہے؟'' لگ بھگ اسی دور میں ایما گولڈ مین نے کہا تھا ''جدید دور کی سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ حق رائے دہی کا حصول تمام مسائل کا حل ہے۔'' 1920ء کے بعد خواتین بھی مردوں کی طرح ووٹ دے رہی ہیں، اور ان کی ماتحت حیثیت میں شاذ ہی کوئی فرق آیا ہے۔

تیسرے عشرے کے آخر میں انڈیانا (مڈل ٹاؤن) کے شہر ''میونسی'' میں تعلیم حاصل کرنے والے رابرٹ اور ہیلن لینڈ نے خواتین کو جانچنے میں اچھی شکل وصورت اور لباس کی اہمیت کا ذکر کیا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ جب مرد آپس میں بے تکلفانہ گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو وہ خواتین کا مردوں کی نسبت پاک صاف اور اخلاقی طور پر بہتر مخلوق کے طور ذکر کرتے ہیں لیکن نسبتاً عقل سلیم سے عاری، جذباتی متلون، تعصب کا شکار ہونے والی، آسانی سے مجروح ہونے والی اور حقائق کا سامنا کرنے اور مستحکم سوچ سے عاری ہوتی ہیں۔

یوں نظر آتا ہے خواتین بیوی پن، ماں پن، عورت پن، گھریلو کام، آرائش جمال اور علیحدگی کی قید سے صرف اس وقت رہائی حاصل کر پائیں جب ان کی خدمات کی صنعت میں یا جنگ میں یا سماجی تحریکوں میں شدت سے ضرورت محسوس کی گئی۔ ہر مرتبہ عملی ضرورت انہیں ان کی قید سے نکال کر باہر لائی، ورک پیرول (کام کے لیے عارضی رہائی) پروگرام کی طرح، اور جب ان کی ضرورت ختم ہو گئی تو ان کو دوبارہ واپس وہیں دھکیلنے کی کوشش کی گئی، اور یہی بات تبدیلی کے لیے خواتین کی جدوجہد کا موجب بنی۔

دوسری عالمی جنگ ماضی سے کہیں زیادہ خواتین کو کام کے لیے گھروں سے باہر نکال لائی۔ 1960ء تک سولہ سال سے اوپر کی تمام خواتین کی تعداد کی 36 فی صد (23 ملین خواتین) معاوضوں پر کام کر رہی تھیں۔ لیکن صرف دو فیصد کام کرنے والی خواتین کے بچوں کے لیے نرسری سکول موجود تھے۔ ایک کام کرنے والی خاتون کی اوسط آمدنی مرد کی نسبت ایک تہائی تھی۔ اور تیسرے عشرے سے لے کر اب تک خواتین کے بارے میں عمومی رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

ساٹھ کے عشرے کی شہری حقوق کی تحریک میں اجتماعی ہلچل کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔

خواتین نے حسب معمول اگلی صفوں میں جگہ لی، لیکن ان کی حیثیت جنرل کی نہیں بلکہ معمولی سپاہیوں جیسی تھی۔ ہارلم سے تعلق رکھنے والی ایک پرانی جنگجو ایلا بیکر اب جنوب میں تحریک کو منظم کر رہی تھی، ترتیب کو سمجھتی تھی: ''میں ابتداء ہی سے سمجھتی تھی کہ ایک عورت کی حیثیت سے، ایک عمر رسیدہ عورت کی حیثیت سے پادریوں کے گروپ میں، جو خواتین کو مددگار کے طور پر رکھنے کے عادی ہیں، میرے لیے لیڈر شپ میں آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

تاہم ان ابتدائی خطرناک سالوں کے دوران خواتین نے جنوب میں تحریک کو منظم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا اور ان کی جدوجہد کو تعریفی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر عمر کی خواتین نے مظاہروں میں حصہ لیا اور جیلوں میں گئیں۔ میسیسپی کے قصبے ''رول ویلی'' میں بٹائی پر کھیتی باڑی کرنے والی سز فینی ہیمر ایک ناظمہ اور مقرر کے طور پر افسانوی حیثیت اختیار کر گئی۔ وہ دعائیہ گیت گاتی اور اگلی صفوں میں اپنے مخصوص لنگڑے پن کے ساتھ چلتی (بچپن میں اسے پولیو ہو گیا تھا)۔ عوامی جلسوں میں وہ لوگوں میں ایک جوش اور جذبہ بھر دیتی تھی۔

اسی دور میں متوسط طبقے کی پیشہ ور سفید فام خواتین نے بولنا شروع کیا۔ بیٹی فریڈن کی کتاب "The Feminine Mystique" کا شمار خواتین کی لکھی ہوئی ابتدائی کتابوں میں ہوتا ہے جو پڑھنے والے پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ''وہ کون سا مسئلہ تھا جس کا کوئی نام نہیں ہے؟ وہ کون سے الفاظ تھے جو خواتین اس مسئلے کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے استعمال کرتی تھیں؟ بعض اوقات ایک خاتون کہتی تھی، میں اپنے آپ کو کھوکھلا محسوس کرتی ہوں.....نامکمل، یا وہ کہتی تھی، مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کوئی وجود نہیں ہے۔''

فریڈن نے ایک متوسط طبقے کی گھریلو خاتون کے طور پر اپنے تجربات تحریر کیے تھے، لیکن اس نے جو باتیں کیں وہ خواتین کے اندر ایک احساس کو جگاتی ہیں۔ ''پراسراریت'' جس کی ''فریڈن'' بات کرتی ہے وہ عورت کا ماں کے طور پر، بیوی کے طور پر عکس ہے، جو اپنے خاوند کے لیے اپنے بچوں کے لیے زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے، اور اپنے تمام خواب ان کے لیے قربان کر دیتی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ''عورت کے لیے جیسا کہ مرد کے لیے ہے، ایک ہستی کے طور پر اپنی ذات کو تلاش کرنے، اپنے آپ کو پہچاننے کا واحد راستہ خود اپنا تخلیقی کام ہے۔''

1964ء کے موسم گرما میں میسیسپی کے شہر ''میک کومب'' میں واقع ''فریڈم ہاؤس'' (ایک شہری حقوق کا ہیڈ کوارٹر جہاں لوگ کام کرتے اور اکٹھا رہتے تھے) کی خواتین نے مردوں کے خلاف ہڑتال کر دی جو انہیں کھانا پکانے اور بستر بچھانے کے کام پر لگا کر خود کاروں میں تنظیم سازی کرنے نکل جاتے تھے۔

1969ء میں امریکہ کی مجموعی لیبر فورس کا 40 فی صد خواتین پر مشتمل تھا، لیکن ان کی ایک اچھی خاصی تعداد سیکرٹریز، صفائی کرنے والیوں، ایلیمنٹری سکولوں کی ٹیچروں، سیلز وومنز، ویٹرسوں اور نرسوں پر مشتمل تھی۔ کام کرنے والی خواتین میں سے ہر تیسری خاتون کا خاوند سالانہ 5000 ڈالر سے کم کما رہا تھا۔

جو خواتین ملازمت نہیں کرتی تھیں، وہ گھروں میں بہت سخت کام کرتی تھیں، لیکن اسے کام خیال نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں (یا شاید ہر جدید معاشرے میں جہاں اشیاء اور افراد کو پیسوں کے ذریعے خریدا یا بیچا جاتا ہے) اگر کام کا معاوضہ نہ ملتا ہو تو اسے بیکار سمجھا جاتا ہے۔

وہ خواتین جو خواتین کے لیے مخصوص ملازمتیں (سیکرٹری، استقبالیہ، ٹائپسٹ، سیلز وومن، صفائی کرانے والیاں، نرسنگ) کرتی تھیں انہیں وہ تمام تر ذلت برداشت کرنا پڑتی تھی جس کا ماتحت حیثیت سے مردوں کو سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس پر مستزاد وہ ذلت تھی جو عورت ہونے کے ناطے انہیں سہنا پڑتی تھی، ان کی ذہنی استعداد پر طعنہ زنی، جنسی مذاق اور تشدد، زیادہ کارکردگی کے مطالبے وغیرہ۔

لیکن وقت تبدیل ہو رہا تھا۔ 1967ء کے لگ بھگ مختلف تحریکوں، شہری حقوق، سٹوڈنٹس فار ڈیموکریٹک سوسائٹی، جنگ مخالف گروپس میں شامل خواتین نے اب خواتین کی حیثیت سے اجلاس منعقد کرنا شروع کر دیئے تھے، اور 1968ء کے اوائل میں واشنگٹن میں خواتین کے جنگ مخالف جلسے میں سینکڑوں خواتین مشعلیں اٹھائے جلوس کی صورت میں ''آرلنگٹن نیشنل قبرستان'' پہنچی اور وہاں ''روایتی نسوانیت'' کو دفن کرنے کا مظاہرہ کیا۔

1968ء کے موسم خزاں میں خواتین کا ایک گروپ جو ''ریڈیکل وومن'' کہلاتا تھا، نے قومی سطح پر توجہ حاصل کی جب انہوں نے ''مس امریکہ'' کے انتخاب پر احتجاج کیا، جسے انہوں نے خواتین کے استبداد کا عمل قرار دیا۔ انہوں نے اپنی انگوٹھیاں، کمر بند، بال گھنگریالے کرنے والے کلپ، نقلی پلکیں، وگیں اور دوسری زنانہ اشیاء جنہیں انہوں نے خواتین کا کوڑ کباڑ قرار دیا ''آزادی کے کچرے دان'' میں پھینکا۔ ایک بھیڑ کو ''مس امریکہ'' کا تاج پہنایا۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ لوگوں نے ''آزادیٔ نسواں'' پر بات چیت کرنا شروع کر دی۔

غریب سیاہ فام خواتین نے ''خواتین کے ہمہ گیر مسئلے'' کو اپنے انداز میں بیان کیا۔ 1964ء میں رابرٹ کولز (چلڈرن آف کرائسس) نے حال ہی میں بوسٹن آنے والی جنوب کی ایک سیاہ فام خاتون کا انٹرویو لیا، جس نے اپنی زندگی میں مایوسیوں کی، اور خوشی کے حصول میں مشکلات کی بات کی، ''میرے لیے زندگی کے لمحات صرف وہ ہوتے ہیں جب میرے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے۔''

خواتین کی حیثیت سے اپنے مسائل پر خاص طور پر بات کیے بغیر، غریب علاقوں کی بہت سی خواتین نے وہ کام کیا جو وہ انہوں نے ہمیشہ کیا تھا، یعنی خاموشی سے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو ناانصافیوں کے

خاتمے اور ضروری سہولیات حاصل کرنے کے لیے منظم کیا۔ 60 کے عشرے کے وسط میں اٹلانٹا کے شہر "واٹس سٹی" میں دس ہزار سیاہ فاموں نے ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے ایک اتحاد قائم کیا، انہوں نے ایک فیئر پرائس شاپ، ایک نرسری، ایک میڈیکل کلینک، ہر ماہ فیملی عشائیہ، ایک اخبار اور ایک عائلی مشاورتی سروس کا اجراء کیا۔ منتظمین میں سے ایک خاتون "ہیلن ہاورڈ" نے اس بارے میں بات کرتے بتایا:

> ہم نے یہ کھیل کا میدان حاصل کرنے کے لیے گلی کو بند کر دیا، کسی کو بھی ادھر سے گزرنے نہ دیا۔ ہم نے ٹرالی بس کو یہاں سے گزرنے نہ دیا۔ تمام ہمسائیگی اس میں شامل تھی۔ ریکارڈ پلیئرز لے کر گیتوں کی دھن پر ڈانس کرتے رہے، یہ عمل ایک ہفتہ جاری رکھا۔ ہمیں گرفتار نہیں کیا گیا، ہماری تعداد بہت زیادہ تھی۔ لہٰذا پھر بلدیہ نے کھیل کا یہ میدان بچوں کے لیے دے دیا۔

1970ء میں اٹلانٹا میں رہنے والی ایک لانڈری ورکر چھ بچوں کی ماں "ڈورتھی بولڈن" نے بتایا کہ اس نے 1968ء میں گھریلو کام کرنے والی خواتین کو کیوں "نیشنل ڈومیسٹک ورکرز یونین" میں منظم کرنے کا کام شروع کیا۔ اس نے کہا: "میں سمجھتی ہوں کہ خواتین کی اپنے معاشرے میں بہتری کے لیے کئے جانے والے فیصلوں میں آواز ہونی چاہیے۔"

ٹینس کی خواتین کھلاڑیوں نے اپنے آپ کو منظم کیا۔ ایک خاتون نے "جوکی" بننے کے لیے کیس لڑا، جیت گئی اور پہلی خاتون جوکی بنی۔ خواتین فنکاراؤں نے مجسمہ سازوں کے ایک شو پر جنسی امتیاز کا الزام لگاتے ہوئے "وٹنی میوزیم" کا گھیراؤ کیا۔ خواتین صحافیوں نے "گریڈرن کلب" کا گھیراؤ کیا جس نے خواتین کو خارج کر دیا تھا۔ 1974ء کے آغاز تک 78 اداروں میں "وومن سٹڈیز" کے پروگرام موجود تھے۔ اور خواتین پر تقریباً دو ہزار کورسز پانچ سو سکولوں میں پڑھائے جا رہے تھے۔

خواتین کے رسائل اور اخبارات مقامی اور قومی سطح پر نکلنے شروع ہو گئے اور خواتین کی تاریخ اور تحریکوں پر اتنی زیادہ کتابیں شائع کی گئیں کہ کچھ بک سٹوروں نے ان کے لیے ایک حصہ مختص کر دیا تھا۔ مخصوص ٹیلی ویژن کمرشلز جنہیں خواتین توہین آمیز خیال کرتی تھیں، احتجاج کے بعد بند کر دیے گئے۔

1967ء میں خواتین گروپس کی لابنگ کے بعد صدر جانسن نے وفاق سے تعلق رکھنے والی ملازمتوں میں جنسی امتیاز کے خاتمے کے انتظامی حکم پر دستخط کئے، اور اس کے بعد آنے والے سالوں میں خواتین کے گروپس نے اس کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ "این او ڈبلیو" (1966ء میں تشکیل دی گئی، نیشنل آرگنائزیشن فار وومن) نے امریکی کارپوریشنوں پر جنسی امتیاز کا الزام لگاتے ہوئے ایک ہزار سے زائد مقدمات دائر کئے۔

اسقاط حمل کا حق ایک بڑا معاملہ بن گیا۔ 1970ء سے پہلے ہر سال تقریباً ایک ملین حمل ساقط

کئے جاتے تھے، جن میں سے صرف دس ہزار قانونی ہوتے تھے۔ تقریباً غیر قانونی اسقاط حمل کرانے والی ایک تہائی خواتین کو، جو کہ اکثر غریب طبقے سے تعلق رکھتی تھیں، پیچیدگیاں پیدا ہونے پر ہسپتالوں میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ ان غیر قانونی اسقاط سے کتنے ہزار خواتین موت کے منہ چلی جاتی تھیں، درست تعداد کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن اسقاط حمل کا غیر قانونی ہونا صرف غریب طبقے پر اثر انداز ہوتا تھا، کیونکہ امراء محفوظ حالات میں بچہ پیدا کرنے یا حمل ساقط کرنے کا انتظام کر سکتے تھے۔

1968ء اور 1970ء کے دوران بیس سے زیادہ ریاستوں میں اسقاط حمل کے خلاف قوانین کو ختم کرنے کی عدالتی کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ 1969ء میں کئے جانے والے "حارث پول" میں 64 فی صد افراد نے اسقاط حمل کے فیصلے کو نجی معاملہ قرار دیا۔

آخر کار 1973ء کے اوائل میں سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا کہ ریاست اسقاط حمل پر صرف حمل کے آخری تین ماہ میں پابندی لگا سکتی ہے اور وہ خاتون کی صحت کے حوالے سے دوسرے تین ماہ کے دوران اسقاط حمل کا حکم جاری کر سکتی ہے اور پہلے تین ماہ کے دوران خاتون اور اس کا ڈاکٹر فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

چائلڈ کیئر سنٹرز کے قیام کے لیے بھی دباؤ موجود تھا۔ اور اگرچہ خواتین اس معاملے میں حکومت کی جانب سے کچھ زیادہ مدد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں، امداد باہمی کی بنیادوں پر ہزاروں "چائلڈ کیئر سنٹرز" قائم کئے گئے۔

خواتین نے پہلی مرتبہ آبروریزی کے مسئلے پر کھل کر بولنا شروع کیا۔ ہر سال پچاس ہزار آبروریزی کے واقعات رپورٹ کئے جاتے تھے اور بہت سے واقعات رپورٹ ہی نہیں کئے جاتے تھے۔ خواتین نے ذاتی حفاظت کے کورس کرنا شروع کر دیے۔ جب خواتین آبروریزی کے واقعہ کی رپورٹ درج کراتیں تو جس انداز میں پولیس ان سے سلوک کرتی، سوالات کرتی اور بے حرمتی کرتی اس کے خلاف بھی احتجاج کئے گئے۔

بہت سی خواتین آئینی ترمیم ای آر اے (ایکوَل رائٹس ایمنڈمنٹ) کو زیادہ سے زیادہ ریاستوں میں پاس کروانے کے لیے سرگرم تھیں۔ لیکن یہ بات واضح نظر آ رہی تھی کہ اگر یہ قانون بن بھی جائے تو کافی نہیں ہو گا کیونکہ خواتین نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ تنظیم، عمل اور احتجاج کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ قانون صرف اس صورت میں مددگار ثابت ہوتا تھا اگر اس کی پشت پر عملی دباؤ ڈالا گیا ہوتا۔ کانگریس کی ایک سیاہ فام رکن "شیرلی چس ہوم" نے کہا:

> قانون ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہمیں لازمی خود ہی سب کچھ کرنا ہو گا۔ اس ملک کی خواتین کو لازماً انقلابی بننا ہو گا۔ ہمیں لازماً قدیم، روایتی اور گھسے پٹے کردار کو قبول

کرنے سے انکار کرنا ہوگا.... ہمیں لازماً اپنی نسوانیت کے بارے میں قدیم اور منفی خیالات کو مثبت خیالات اور مثبت عمل میں تبدیل کرنا ہوگا۔

ساٹھ کے عشرے کی تحریکِ نسواں کا سب سے گہرا اثر، اسقاطِ حمل اور ملازمتوں میں برابری کے علاوہ، خواتین میں ''شعور کا بیدار'' ہونا تھا جو کہ عام طور پر پورے ملک میں گھروں کے اندر ہونے والی خواتین کی میٹنگز کا نتیجہ تھا۔ اس کا مطلب معاشرے میں اپنے کردار کا ازسرِنو جائزہ، کمتری کا استرداد، اپنی ذات میں اعتماد، بہناپے کا بندھن، ماں اور بیٹی کا نیا اتحاد تھا۔

پہلی مرتبہ عورت کی جسمانی انفرادیت پر کھل کر بحث کی گئی۔ انتہائی پر اثر کتابوں میں سے ایک کتاب جو ستر کے عشرے کی ابتداء میں منظرِ عام پر آئی وہ ''بوسٹن وومنز ہیلتھ بک کولیکو'' میں گیارہ خواتین نے مل کر مرتب کی تھی جس کا نام "Our Bodies, Ourselve" تھا۔ اس میں خواتین کی بدنی ساخت، جنسیات اور جنسی تعلقات، عورتوں میں ہم جنس پرستی، غذائیت اور صحت، عصمت دری، ذاتی دفاع، جنسی امراض، ضبطِ تولید، اسقاطِ حمل، حمل، زچگی اور سن یاس کے موضوعات پر سیر حاصل عملی معلومات فراہم کی گئی تھیں۔

اپنی تمام تر معلومات، چارٹس، تصاویر اور جنسی پہلوؤں پر کھلم کھلا بحث کے علاوہ جس پر آج تک بات نہیں کی گئی تھی کتاب کی اصل اہمیت اس کا زندگی سے بھرپور اندازِ بیان تھا، جسم کے لطف و انبساط، نئے حاصل شدہ فہم سے لطف اندوزی، نوجوان خواتین، ادھیڑ عمر خواتین، بوڑھی خواتین سے اپنائیت کا نیا اظہار اس کتاب کی اہم خصوصیت تھی۔

اسی دور میں 'اینڈرئینی رچ'' نے ان معاشرتی رویوں پر بحث کی جو خواتین میں انفعالیت اور برداشت پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ سکول کی بچیاں نسل در نسل 'ططل وومن'' پڑھتی آ رہی تھیں، جس میں ''جو'' کو اس کی ماں بتاتی ہے: ''میں اپنی زندگی کے تقریباً ہر گزرے ہوئے دن سے نالاں ہوں، لیکن میں نے اپنے جذبات کو دبا کر رکھنا سیکھ لیا ہے، مجھے اپنے احساسات کو دبا کر رکھنا ابھی مزید سیکھنا ہوگا، چاہے مجھے اس کے لیے مزید چالیس سال درکار ہوں۔''

بچے پیدا کرنے کے لیے دایہ کے مہربان اور حساس ہاتھوں کی جگہ مرد ڈاکٹروں کے اوزار لے رہے تھے۔ ''بے حسی کی ادویات اور نئی ٹیکنالوجی کے تحت بچوں کی پیدائش'' کے دور میں رچ نے کہا بچے کی پیدائش جسمانی اور جذباتی انبساط کا سرچشمہ ہونا چاہیے۔

بہت سی خواتین کے لیے فوری مسئلہ یہ تھا کہ بھوک، مصائب، کمتری اور ذلت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔ ''جونی ٹلمون'' نامی ایک خاتون نے 1972ء میں لکھا:

میں ایک عورت ہوں۔ میں ایک سیاہ فام عورت ہوں۔ میں ایک غریب عورت

ہوں۔ میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہوں۔ میں ویلفیئر پر ہوں۔ میں نے چھ بچوں کی پرورش کی ہے.... میں آرکنساس میں پلی بڑھی ہوں.... وہاں پندرہ سال تک ایک لانڈری میں کام کیا.... وہاں سے کیلیفورنیا آ گئی.... 1963ء میں اتنی بیمار ہو گئی کہ کام نہیں کر سکتی تھی.... میرے دوستوں نے مجھے ویلفیئر پر لانے میں مدد دی۔

ویلفیئر ٹریفک کے حادثے کی طرح ہے۔ یہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، لیکن خاص طور پر خواتین کے ساتھ ایسا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ویلفیئر خواتین کا مسئلہ ہے۔ اس ملک کی بہت سے متوسط طبقے کی خواتین کے لیے ''خواتین کی آزادی'' ایک تشویش کا معاملہ ہے۔ ویلفیئر پر زندگی بسر کرنے والی خواتین کے لیے یہ بقا کا مسئلہ ہے۔

اس نے دوسری ویلفیئر پر گزر بسر کرنے والی ماؤں سے مل کر ''نیشنل ویلفیئر رائٹس آرگنائزیشن'' تشکیل دی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ خواتین کو ان کے گھریلو کام اور بچوں کی پرورش کا معاوضہ ملنا چاہیے: ''کوئی بھی عورت آزاد نہیں ہو سکتی جب تک وہ سیدھی کھڑی نہیں ہو جاتی۔''

خواتین کے مسئلے میں نہ صرف ان کے استبداد کا بلکہ ہر کسی کے استبداد کا حل موجود تھا۔ معاشرے میں خواتین پر کنٹرول کو بڑی مہارت سے مؤثر بنایا گیا تھا۔ یہ براہِ راست ریاست کی جانب سے نہیں تھا۔ بلکہ خاندان کو استعمال کیا گیا تھا، مرد خواتین کو کنٹرول کرتے تھے اور خواتین بچوں کو کنٹرول کرتی تھیں، ہر کوئی ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھا ہوا تھا، جب معاملات درست نہ ہوتے تو ایک دوسرے پر تشدد کرتے تھے۔ اس کے برعکس عمل کیوں نہیں ہو سکتا تھا؟ کیا خواتین اور بچے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہوئے، مرد اور خواتین ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے اپنے مشترکہ استبداد کا سرچشمہ بجائے ایک دوسرے میں تلاش کرنے کے گھروں سے باہر تلاش کر سکتے تھے؟

شاید اس طرح وہ خود اپنے تعلقات کو مضبوط کرتے ہوئے بغاوت کے ہزاروں میدان تلاش کر سکتے تھے۔ خاندان کے اندر، جسے معاشرہ اپنے کنٹرول اور اعتقادات کو نافذ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے، وہ اپنی سوچ اور رویے کو یکسر تبدیل کرتے ہوئے انقلاب کی نئی راہیں متعین کر سکتے تھے۔ اور بجائے ایک دوسرے کی مخالفت کے باہم مل کر وہ معاشرے کو تبدیل کر سکتے تھے۔

یہ بغاوتوں کا دور تھا۔ اگر جیلوں کی سب سے دقیق اور پیچیدہ صورت یعنی ''خاندان'' کے اندر بغاوت ہو سکتی تھی تو ظالمانہ اور حقیقی جیلوں میں بغاوتوں کا اٹھنا زیادہ معقول نظر آتا ہے۔ ساٹھ کے عشرے میں اور ستر کے عشرے کے شروع میں یہ بغاوتیں بہت زیادہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ایک ایسا سیاسی رنگ اور طبقاتی جنگ کی شدت اختیار کر لی تھی جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان بغاوتوں کی انتہا ستمبر 1971ء میں نیویارک کے ''اٹیکا'' میں دیکھنے میں آئی۔

امریکہ میں جیل، ''کوئیکر اصلاح'' کے نتیجے میں جسمانی اعضا کی قطع و برید، پھانسی اور جلاوطنی کی سزاؤں کو ختم کرنے کے لیے، وجود میں آئی تھی۔ جیل کا مقصد تنہائی کے ذریعے پچھتاوا اور پشیمانی پیدا کر کے مجرم کو نجات اور رہائی کی طرف لے جانا تھا، لیکن قیدی پاگل ہو جاتے اور اس تنہائی میں مر جاتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط تک جیلوں میں سخت مشقت لینے کے ساتھ ساتھ ظالمانہ سزائیں مثلاً لوہے کے تنگ ڈبوں میں بند کر کے دھوپ میں رکھ دینے، لوہے کے طوق، اور الگ تھلگ تنہائی میں بند کر دینے وغیرہ کی بھی سزائیں دی جاتی تھیں۔ نیویارک کی اصلاحی جیل کے ایک وارڈن نے اپنے طریقہ کار کو یوں بیان کیا تھا: ''کسی قیدی کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے آپ کو اس کی روح کو کچلنا ہوگا۔'' یہ نقطہ نظر آج بھی اتنا ہی مقبول تھا۔

جیلوں میں بغاوتیں اور ہنگامے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ 1920ء کے عشرے میں ہونے والے ہنگاموں کا سلسلہ کلنٹن نیویارک کی جیل میں ایک بڑے ہنگامے پر ختم ہوا، جس میں چھ سو کے قریب قیدی تھے۔ یہ ہنگامہ تین قیدیوں کی موت کے بعد دب گیا۔ 1950ء اور 1953ء کے درمیان امریکہ کی جیلوں میں پچاس سے زائد ہنگامے ہوئے۔ 1960ء کے اوائل میں جورجیا میں ایک ''ورک گینگ'' میں قیدیوں نے جو کہ پہاڑ کے پتھر توڑ رہے تھے، اپنے اوپر ہونے والے وحشیانہ سلوک کی جانب توجہ دلانے کے لیے انہوں نے ہتھوڑوں سے اپنی ٹانگیں توڑ لیں۔

نومبر 1970ء میں کیلیفورنیا کی ''فولسم'' جیل میں کام بند کرنے کی مہم شروع ہوئی، جو کہ امریکہ کی تاریخ میں سب سے لمبی جیل ہڑتال کی صورت اختیار کر گئی۔ دو ہزار چار سو قیدیوں کی اکثریت ڈرانے دھمکانے کے باوجود انیس دن تک بغیر کھانے پینے کے اپنی کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ ہڑتال کو طاقت اور فریب دہی کے ذریعے ختم کروایا گیا، اور چار قیدیوں کو بیڑیاں ڈال کر ایک وین کے فرش پر ننگا لٹا کر چودہ گھنٹے کی مسافت پر ایک دوسری جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک باغی نے لکھا: ''شعور کی روح بیدار ہو چکی ہے...... بیج بو دیا گیا ہے۔''

امریکہ میں جیلیں ایک لمبے عرصے سے خود اس کے اپنے نظام کی عکاس تھیں، غریب اور امیر کی زندگی میں پایا جانے والا واضح فرق، نسل پرستی، ستم رسیدوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنا، نچلے طبقے کے لیے اپنی آواز اٹھانے کے لیے وسائل کی عدم موجودگی، اصلاحات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ جو کسی خاص تبدیلی کا باعث نہیں بنتا تھا۔ ''دوستووسکی'' نے ایک بار کہا تھا: ''کسی قوم کی شائستگی اور تہذیب کا اندازہ آپ اس کی جیلوں میں جا کر لگا سکتے ہیں۔''

یہ بھی ایک طویل ترین حقیقت تھی، جسے قیدی زیادہ بہتر طور پر جانتے تھے کہ آپ جتنے زیادہ غریب ہیں اتنا ہی زیادہ آپ کا جیل میں پہنچنے کا امکان تھا۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ غریب زیادہ جرم

کرتے تھے۔ حقیقت میں وہ کرتے بھی تھے۔ امراء کو جو وہ حاصل کرنا چاہتے تھا اسے حاصل کرنے کے لیے جرم نہیں کرنا پڑتا تھا، قانون ان کے حق میں تھا۔ اگر امیر آدمی جرم کرتا بھی تھا تو وہ اکثر سزا سے بچ نکلتا تھا، اور اگر اسے سزا ہوتی بھی تھی تو ضمانت پر باہر آ جاتے تھے اور ججوں کی طرف سے بہتر سلوک کے لیے ہوشیار وکیلوں کی خدمات حاصل کر سکتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح سے جیلیں غریب سیاہ فاموں سے بھری ہوئی تھیں۔

1969ء میں 502 افراد پر ٹیکس چوری کا الزام لگایا گیا، انہیں ''سفید پوش جرائم'' کہا جاتا تھا، اس میں عام طور پر وہ لوگ ملوث ہوتے تھے جن کے پاس کافی رقم ہوتی تھی۔ ان ملزمان میں سے صرف 20 فی صد جیل میں پہنچے۔ ٹیکس چوری کی رقم اوسطاً 190,000 ڈالر فی ملزم تھی، جبکہ ان کو ملنے والی اوسطاً سزا سات ماہ تھی۔ اسی سال کے دوران ڈاکہ زنی اور کار چوری (غریبوں کا جرم) کے جرم میں ساٹھ فی صد لوگ جیلوں میں پہنچے۔ کار چوری میں اوسطاً رقم 992 ڈالر اور اوسطاً سزا 18 ماہ تھی۔ ڈاکہ زنی میں اوسطاً 321 ڈالر کے لیے اوسطاً تینتیس ماہ کی سزائیں دی گئیں۔

سزائیں سنانے میں ججوں کو بہت زیادہ صوابدید حاصل تھی۔ اوریگن میں تینتیس افراد پر فوج میں بھرتی کے قانون کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا، 18 افراد کو پروبیشن پر رکھا گیا، جنوبی ٹیکساس میں اسی قانون کی خلاف ورزی کرنے پر 16 افراد میں سے کسی ایک کو بھی پروبیشن پر نہ رکھا گیا، اور جنوبی مسیسپی میں اس قانون کی نافرمانی کرنے والے ہر شخص کو مجرم قرار دیا گیا اور زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی سزا دی گئی۔ ملک کے ایک حصے (نیوانگلینڈ) میں تمام جرائم کے لیے اوسطاً سزا گیارہ ماہ تھی، ایک دوسرے حصے (جنوب) میں یہ 78 ماہ تھی۔ لیکن یہ محض شمال اور جنوب کا معاملہ نہیں تھا۔ نیویارک شہر میں ایک جج نے جس کے سامنے 673 افراد کو عوامی جگہوں پر نشے میں مدہوش ہونے کے جرم میں پیش کیا گیا (تمام کے تمام غریب لوگ تھے، امراء بند دروازوں کے پیچھے نشے سے مدہوش ہوتے تھے) ان میں سے 531 کو بری کر دیا۔ ایک دوسرے جج نے اسی جرم میں 566 افراد میں سے صرف ایک شخص کو بری قرار دیا۔

عدالتوں کے پاس اس قسم کے اختیار کی وجہ سے، غریب، سیاہ فام، ہم جنس پرست، ہپی اور انقلابی ججوں سے ایک جیسے سلوک کی توقع نہیں رکھتے تھے یہ جج عام طور پر تقریباً سب کے سب ہی اعلیٰ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے سفید فام تھے۔

جو بھی جیل کی حالتِ زار بیان کرنے کی کوشش کرتا، ہچکچاتا تھا۔ جیسا چوسٹس کی ''وال پول'' جیل میں سے ایک شخص نے لکھا:

> ہر حق جو ہمیں حاصل ہے اسے ہمارے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سکول جانے، چرچ میں جانے، ملاقاتیوں سے ملنے، لکھنے، فلم دیکھنے کا حق۔ یہ تمام کے تمام سزا کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارا کوئی پروگرام اپنا نہیں ہوتا۔ ہر حق کو

ایک رعایت کے طور پر دیا جاتا ہے۔ جسے کسی وقت بھی واپس لیا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ عدم تحفظ میں نکلتا ہے۔ ایک ایسی محرومی اور شکستگی کا احساس پیدا ہوتا ہے جیسے کسی بھوکے کو کھانے پینے کی اشیاء دور سے دکھائی جائیں۔

اسی جیل کا ایک اور قیدی لکھتا ہے:

میں نے چار سال سے میس ہال میں کھانا نہیں کھایا۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمیں ہر روز صبح کھانے کے لیے قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے اور 100 سے 200 لال بیگ کھانے کی طشتریوں میں سے نکل نکل کر بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ طشتریاں میل سے بھری ہوتی ہیں، کھانا ادھ پکا اور گرد اور کیڑوں سے بھرا ہوتا ہے۔ کئی راتوں کو میں بھوکا سویا ہوں، محض مونگ پھلی کے مکھن اور سینڈوچز پر گزارا کرتا رہا ہوں۔

باہر کی دنیا کے ساتھ رابطہ مشکل ہوتا تھا۔ گارڈز خطوط پھاڑ دیتے تھے اور جو خط ملتے تھے وہ کھلے ہوئے اور پڑھے ہوئے ہوتے تھے۔

خاندانوں کو بھی مصائب کا سامنا ہوتا تھا۔ ایک قیدی نے بتایا ''آخری قید کے دوران میرا چار سال کا بچہ آنکھ بچا کر یارڈ میں چلا گیا اور میرے لیے ایک پھول توڑ کر لے آیا۔ ٹاور میں کھڑے گارڈ نے وارڈن کے دفتر میں فون کیا اور ڈپٹی ریاستی پولیس کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر کوئی بچہ یارڈ میں گیا اور ایک اور پھول توڑا تو تمام ملاقاتیں بند کر دی جائیں گی۔

ساٹھ کے عشرے کے آخر اور ستر کے عشرے کی ابتداء میں ہونے والی جیلوں کی بغاوتیں شروع کی بغاوتوں سے مختلف نوعیت کی تھیں۔ ''کوئین ہاؤس آف ڈیٹینشن'' کے قیدی اپنے آپ کو انقلابی کہتے تھے۔ ملک میں ہونے والے ہنگاموں، سیاہ فام بغاوتوں، نوجوانوں کی ہلچل اور جنگ مخالف تحریکوں نے پورے ملک کی جیلوں میں بند قیدیوں کو واضح طور پر متاثر کیا۔

ان سالوں کے دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات نے قیدیوں کے اُن خیالات کو مزید تقویت دی جو اُن کے ذہنوں میں پہلے ہی کروٹیں لے رہے تھے۔ یعنی جن جرائم کی وہ سزا بھگت رہے تھے، ان سے بڑے جرائم کا ارتکاب وہ حکام کر رہے تھے، جو جیلوں کے نظم و نسق کو سنبھالے ہوئے تھے اور خود امریکہ کی حکومت کر رہی تھی۔ صدر آئین یعنی دھرتی کے سب سے اعلیٰ اور مقدس قانون کو پس پشت ڈال کر لوگوں کو مارنے کے لیے بمبار طیارے بھیجتے ہوئے اور قوم کے نوجوانوں کو مرنے کے لیے بھیجتے ہوئے خود شدید قسم کی قانون شکنی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ ریاست اور مقامی عہدیدار سیاہ فاموں کے شہری حقوق کو پامال کر رہے تھے، جو خلاف قانون عمل تھا، اور اس کے لیے ان کو کوئی سزا نہیں دی جا رہی تھی۔

سیاہ فام تحریک کے بارے میں لٹریچر اور جنگ پر لکھی گئی کتابیں جیلوں میں سرایت کر رہی

تھیں۔ گلی کوچوں میں سیاہ فاموں اور جنگ مخالف مظاہروں نے جو مثالیں قائم کی تھیں وہ لوگوں کے دلوں کو گرما رہی تھیں کہ ایک قانون شکن نظام کا واحد جواب نافرمانی ہی ہو سکتا تھا۔

یہ ایک ایسا نظام تھا جس میں ''بفلو'' نیویارک میں ایک افرویشین بک سٹور چلانے والے باون سالہ سیاہ فام ''مارٹن سوسٹر'' کو ایک مخبر کے ہاتھوں پندرہ ڈالر کی ہیروئین فروخت کرنے کے جرم میں پچیس سے تیس سال کی قید کی سزا سنائی گئی، مخبر بعد میں اپنی شہادت سے منحرف ہو گیا۔ لیکن مخبر کے انحراف کے باوجود ''سوسٹر'' رہائی نہ پا سکا.... امریکہ میں بشمول سپریم کورٹ کے ایسی کوئی عدالت نہ تھی جو اس فیصلے کو منسوخ کر سکتی۔ اس نے آٹھ سال قید میں بسر کیے، اس دوران دس مرتبہ گارڈوں کے ہاتھوں پیٹا گیا، تین سال قید تنہائی میں بسر کیے، اپنی رہائی تک وہ حکام سے اُلجھتا اور ان کی حکم عدولی کرتا رہا۔ اس قسم کی ناانصافی کا جواب محض بغاوت ہی ہو سکتا تھا۔

اگرچہ جیلوں میں ہمیشہ سیاسی مجرم بھی رہے، لوگوں کو انقلابی تحریکوں سے تعلق رکھنے اور جنگ کی مخالفت کرنے کے جرم میں جیلوں میں بھیجا جاتا رہا۔ لیکن اب سیاسی قیدیوں کی ایک نئی قسم سامنے آ رہی تھی، ایسے مرد اور خواتین جو کسی عام جرم میں قید کیے گئے اور جیل میں سیاسی جاگ وتی حاصل کی۔ بعض قیدیوں نے اپنے ذاتی صبر آزما مصائب اور معاشرتی نظام میں تعلق قائم کرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ بجائے انفرادی بغاوت کے اجتماعی عمل کی جانب پلٹ گئے۔ وہ، ایک ایسے ماحول کے درمیان جس کی بربریت ذاتی تحفظ پر ارتکاز کی متقاضی تھی، دوسروں کے حقوق اور تحفظ کے لیے سرگرم ہو گئے۔

جارج جیکسن ان نئے سیاسی قیدیوں میں سے ایک تھا۔ کیلیفورنیا کی ''سولاڈیڈ'' جیل میں 70 ڈالر کی ڈکیتی کے جرم میں غیر معینہ قید کاٹنے والا ''جیکسن'' جو پہلے ہی دس سال قید کاٹ چکا تھا، ایک انقلابی بن گیا۔

اس کی کتاب ''سولاڈیڈ برادرز'' (Soledad Brothers) امریکہ میں سیاہ فام بغاوت پر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں سے ایک تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کیا ہو سکتا تھا: ''میں اس دنیا میں انتہائی قلیل معاوضوں پر گھٹیا ترین کام کرنے کے لیے اور وقت سے پہلے مرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ کوئی بھی شخص جو آج سول سروس کا امتحان پاس کر سکتا ہے کل وہ بغیر کسی سزا یا مواخذے کے خوف کے میری جان لے سکتا ہے۔

اگست 1971ء میں ''سان کوئنٹن'' کی جیل میں اسے ایک گارڈ نے فرار ہونے کی کوشش کے الزام میں پشت پر گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جیکسن کی موت کے فوراً بعد پورے ملک میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ پھوٹ نکلا۔

جیکسن کے قتل کا سب سے زیادہ براہ راست اثر ستمبر 1971ء میں ''اٹیکا'' جیل میں ہوا۔ یہ

بغاوت اگر چہ ایک طویل عرصہ کی رنجیدگی کا نتیجہ تھی لیکن جارج جیکسن کی خبر نے جلتی پر تیل کا کام دکھایا، اور یہ پوری شدت سے بھڑک اٹھی۔ ایٹکا جیل 38 فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی دیوار میں گھری ہوئی تھی جس میں پہریداروں کی چودہ برجیاں بنائی گئی تھیں۔ 54 فیصد قیدی سیاہ فام تھے جبکہ گارڈز تمام کے تمام سفید فام تھے۔ قیدی چودہ سے سولہ گھنٹے اپنی کوٹھڑیوں میں بسر کرتے تھے۔ ان کی ڈاک پڑھنے کے بعد پہنچائی جاتی تھی، مطالعہ کا مواد بہت محدود تھا۔ ان کی ملاقات جالی میں سے کروائی جاتی تھی، ان کی طبی سہولتیں ذلت آمیز تھیں، پیرول پر رہائی غیر منصفانہ تھی ہر جگہ نسل پرستی غالب تھی۔

جب "ایٹکا" کے قیدیوں کو پیرول کے لیے پیش کیا جاتا تھا تو ان کی سماعت کا اوسطاً وقت بشمول فائل پڑھنے اور پیرول بورڈ کے تین ممبران کے غور و خوص کے لیے 5.9 منٹ ہوتا تھا۔ اور پھر بغیر کسی وضاحت کے فیصلہ سنا دیا جاتا تھا۔

"ایٹکا" میں سوشیالوجی کی کلاس، جس میں پڑھانے والے قیدی ہی تھے، تبدیلی کے بارے میں خیالات کے اظہار کا فورم بن گئی۔ پھر منظم احتجاج کی کوششوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا (قیدیوں کی جانب سے چند معقول اور مناسب مطالبات کا ایک اعلامیہ جاری کیا گیا) جو کہ "سان کیوئنٹن" میں جارج جیکسن کے قتل پر ایک احتجاجی دن پر اختتام کو پہنچا، جس کے دوران چند قیدیوں نے دوپہر اور رات کا کھانا کھایا اور بہت سے قیدیوں نے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھیں۔

9 ستمبر 1971ء کو قیدیوں اور گارڈز کے درمیان جھگڑوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، جس کے نتیجے میں قیدیوں نے ایک ناقص طور پر بنائے گئے گیٹ کو توڑ دیا، جیل کے چار صحنوں میں سے ایک پر قبضہ کر لیا اور چالیس گارڈز کو یرغمال بنا لیا۔ پھر چند دن یوں ہی گزر گئے جن کے دوران قیدیوں نے اس صحن میں ایک غیر معمولی کمیونٹی قائم کر لی۔

قیدیوں نے شہری مبصرین کے ایک گروپ کو مدعو کیا، جس میں "نیویارک ٹائمز" کا کالم نگار "ٹام وکر" بھی شامل تھا، جس نے ("مرنے کا ایک وقت" کے عنوان کے تحت) لکھا: "نسلی ہم آہنگی جو قیدیوں کے درمیان پائی جاتی تھی، وہ مکمل طور پر حیران کن تھی۔"

پانچ دن کے بعد ریاست کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ گورنر نیلسن راک فیلر نے جیل پر فوجی حملے کا حکم دے دیا۔ نیشنل گارڈ کے آدمی، جیل کے گارڈز اور مقامی پولیس خودکار رائفلوں، کاربینوں اور چھوٹی مشین گنوں سے لیس، قیدیوں پر، جن کے پاس کوئی آتشیں اسلحہ نہیں تھا، بڑے حملے کے لیے جیل میں داخل ہو گئے۔ اکتیس قیدی مارے گئے۔

جیل حکام نے پریس کو جو پہلا بیان دیا اس کے مطابق قیدیوں نے حملے کے دوران یرغمال بنائے گئے 9 گارڈز کے گلے کاٹ دیے تھے۔ لیکن اس کے فوراً بعد سرکاری پوسٹ مارٹم رپورٹ نے

اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ 9 گارڈز گولیوں کی اس بوچھاڑ میں مارے گئے تھے جن سے باقی ماندہ قیدی ہلاک ہوئے تھے۔

"ایٹکا" حادثے کے بعد گزرنے والے ہفتوں اور مہینوں میں حکام احتیاطی تدابیر کے طور پر قیدیوں میں منظم ہونے کی کوششوں کے خاتمے میں مصروف رہے۔ لیکن قیدیوں نے تبدیلی کا مطالبہ جاری رکھا، قیدیوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ انفرادی غصے اور بغاوت کو تبدیلی کے لیے مشترکہ کوششوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جیل سے باہر بھی ایک نئی بات جنم لے رہی تھی، پورے ملک میں قیدیوں کے حمایتی گروپس تشکیل پانے لگے اور قیدیوں کی حالتِ زار پر لٹریچر تیار کیا جانے لگا۔ جرم و سزا کے موضوع پر مزید تحقیقات کا آغاز ہوا۔ اس بنیاد پر جیلوں کے خاتمے کی تحریک پروان چڑھنے لگی کہ یہ جرم کو روکتی یا ختم نہیں کرتیں بلکہ اس کے فروغ کا باعث بنتی ہیں۔ جیلوں کے متبادل پر بحث اور مذاکرات کا آغاز ہوا، اور فوری اقدامات کے طور پر کمیونٹی ہاؤسز (سوائے ناقابل علاج مجرموں کے) قائم کرنے اور طویل المدتی اقدامات کے طور پر کم از کم معاشی تحفظ کی فراہمی کی تجاویز پیش کی گئیں۔

قیدیوں نے اپنے علاوہ جیل سے باہر ظلم و ستم کا شکار دوسرے افراد اور اپنے دوستوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ "وال پول" جیل میں ویت نام سے امریکہ کی دست کشی کا ایک بیان پوری جیل میں گھمایا گیا جس پر ہر ایک قیدی نے بلا استثناء دستخط کیے، جو کہ چند قیدیوں کا سب کو منظم کرنے کا ایک حیران کن کارنامہ تھا۔ "مسیحی دعائے شکر" کے روز نہ صرف "وال پول" جیل میں بلکہ دوسری جیلوں میں بھی قیدیوں نے یہ کہتے ہوئے "دعوتی کھانا" کھانے سے انکار کر دیا کہ وہ پورے امریکہ میں موجود بھوکے افراد کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

قیدیوں نے عدالتوں میں پیش مقدمات پر بڑی محنت سے کام کیا اور کچھ کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ "ایٹکا" کے معاملے کی تشہیر اور معاشرتی حمایت نے اثرات مرتب کیے تھے۔ اگرچہ "ایٹکا" کے باغیوں پر شدید الزامات عائد کیے گئے اور ان کو دوہری اور تہری عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں، آخرکار الزامات واپس لے لیے گئے۔ لیکن عمومی سطح پر عدالتوں نے جیل کی بند اور زیرِ تسلط دنیا میں دخل اندازی پر اپنی نارضامندی کا اظہار کیا، لہٰذا قیدی جیسا کہ لمبے عرصے سے ہوتا آ رہا تھا، اپنے بل بوتے پر زندگیاں بسر کرتے رہے۔

یہ واضح ہو گیا تھا، جیسا کہ قیدی شروع ہی سے جانتے تھے کہ ان کی حالتِ زار قانون کے ذریعے تبدیل نہیں ہو گی بلکہ اس میں تبدیلی، احتجاج، تنظیم، مزاحمت، اپنی تہذیب اپنا لٹریچر پیدا کرنے اور جیل سے باہر لوگوں کے ساتھ روابط پیدا کرنے سے ہی ممکن ہو گی۔ اب جیلوں سے باہر بہت سے لوگ جیلوں کے بارے میں عملی معلومات رکھتے تھے۔ لاکھوں امریکی شہری حقوق اور جنگ مخالف تحریکوں کے

سب سلاخوں کے پیچھے زندگی بسر کر چکے تھے۔ وہ جیلوں کے نظام سے مکمل آگاہی رکھتے تھے اور جیل کے تجربات کو مشکل ہی سے بھول سکتے تھے۔ اب معاشرے سے قیدیوں کی لمبے عرصے سے علیحدگی کو ختم کرنے اور وہاں حمایت تلاش کرنے کی بنیاد قائم ہو چکی تھی۔ اور ستر کے عشرے کے وسط میں اس عمل کی ابتدا ہو گئی۔

یہ مزاحمتوں کا دور تھا۔ خواتین، جو اپنے گھروں میں قید تھیں، بغاوت کر رہی تھیں۔ نگاہوں سے دور اور سلاخوں کے پیچھے بند قیدی بغاوت کر رہے تھے۔ ابھی سب سے بڑی بوالعجبی کا سامنا کرنا باقی تھا۔

یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انڈینز جو کہ کبھی براعظم کے واحد قابض تھے، اور پھر سفید فام حملہ آوروں کے ہاتھوں اپنے علاقوں سے دھکیل دیئے گئے اور ختم کر دیئے گئے، اب ان کے بارے میں دوبارہ کوئی بات سننے میں نہیں آئے گی۔ 1890ء کے آخری ایام میں، کرسمس کے فوراً بعد انڈینز کا آخری قتل عام "ونڈڈنی کریک" کے نزدیک جنوبی ڈیکوٹا کے علاقے "پائن رج" کے مقام پر ہوا، جب 350 مقامی باشندوں میں سے 200 سے 300 کے درمیان مرد، خواتین اور بچے مر گئے۔ 25 فوجی جو مارے گئے ان میں سے زیادہ تر اپنے ہی تیروں اور گولیوں کا نشانہ بنے تھے کیونکہ انڈینز کے پاس صرف چند بندوقیں تھیں۔

انڈینز قبائل پر حملے کئے گئے، انہیں مغلوب کیا گیا، بھوک اور فاقوں کا نشانہ بنایا گیا، اور انہیں مختلف علاقوں میں، جنہیں "ریزرویشنز" کا نام دیا گیا، محدود رکھ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا، جہاں وہ غربت میں زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ 1887ء میں ایک الاٹمنٹ ایکٹ کے تحت ان "ریزرویشنز" کو انڈینز کی انفرادی ملکیت کے چھوٹے پلاٹوں میں بانٹنے کی کوشش کی گئی، تاکہ ان کو دیگر چھوٹے امریکی کسانوں جیسی حیثیت دے دی جائے، لیکن زیادہ تر زمین سفید فام سٹہ بازوں نے خرید لی اور "ریزرویشنز" اپنی جگہ قائم رہیں۔

پھر "بیورو آف انڈینز افیئرز" کے انچارج اور انڈینز کے دوست "جان کولیئر" کے ساتھ ایک نئے معاہدے کے دوران قبائلی زندگی کی بحالی کی کوشش کی گئی۔ لیکن آنے والے عشروں میں کوئی بنیادی تبدیلیاں نہ آئیں۔ بہت سے انڈینز غربت زدہ "ریزرویشنز" میں ہی رہے۔ نوجوان اکثر انہیں چھوڑ گئے۔ ایک انڈینز "ماہر بشریات" نے کہا "انڈین ریزرویشنز" میرے علم کے مطابق دنیا کا انتہائی مکمل نو آبادیاتی نظام ہے۔"

وقتی طور پر انڈینز کا غائب ہو جانا، گھل مل جانا ناگزیر محسوس ہوتا تھا۔ صدی کے اختتام تک امریکہ کے علاقے میں ایک ملین یا اس سے زائد انڈینز میں سے صرف 300,000 باقی رہ گئے تھے لیکن پھر ان کی تعداد میں دوبارہ اضافہ ہونا شروع ہو گیا، جیسا کہ ایک پودے کو اکھاڑ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ دوبارہ سے زمین میں جڑیں ڈال کر پروان چڑھنا شروع کر دے۔ 1960ء تک انڈینز کی تعداد 800,000 تک پہنچ چکی تھی، آدھے "ریزرویشنز" میں تھے اور آدھے پورے ملک کے شہروں میں پھیل چکے تھے۔

انڈینز کی سوانح عمریوں سے سفید فاموں کی تہذیب کو اپنانے سے انکار کے شواہد ملتے ہیں۔ ایک انڈین لکھتا ہے:

جی ہاں! میں سفید فاموں کے سکول گیا ہوں، میں نے سکول میں کتابیں، اخباریں، بائبل پڑھنا سیکھا۔ وقت کے ساتھ مجھے علم ہوا کہ یہ کافی نہیں تھا۔ مہذب لوگ انسانوں کے لکھے ہوئے صفحات پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ میں "عظیم روح" کی کتاب کی جانب جو کہ اس کی کل تخلیق ہے واپس آ گیا ہوں۔

ایک انڈین سردار "لوتھر سٹینڈنگ بیئر" 1933ء میں اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

یہ درست ہے کہ سفید فام آدمی بہت بڑی تبدیلی لایا ہے، لیکن اس کی تہذیب کے مختلف پھل اگرچہ بہت حسین اور دلکش ہیں، لیکن بیمار کر دینے والے اور ہلاکت خیز ہیں۔ اور اگر لوگوں پر حملہ کر کے انہیں اپاہج بنانا، لوٹ مار کرنا، ان کی راہوں میں مزاحم ہونا ہی تہذیب کا حصہ ہے تو پھر یہ کیسی ترقی ہے؟ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ایک شخص جو اپنی جھونپڑی میں بیٹھا زندگی اور اس مفہوم پر دھیان دے رہا ہے، اور تمام مخلوقات کے رشتوں کو قبول کر رہا ہے اور ان کے ساتھ اتحاد اور ہم آہنگی کو تسلیم کر رہا ہے، اپنے اندر تہذیب کی اصل روح کو سمو رہا ہے۔

1960ء کے عشرے میں جیسے شہری حقوق اور جنگ مخالفت کی تحریکیں پروان چڑھیں، انڈینز پہلے سے ہی مزاحمت کے لیے اپنی توانائیاں مجتمع کر رہے تھے۔ اپنی صورتحال میں تبدیلی لانے کا سوچ رہے تھے اور منظم ہونا شروع ہو رہے تھے۔

انڈینز نے امریکی حکومت سے ایک بہت ہی پریشان کر دینے والے مشکل موضوع پر رابطہ کرنا شروع کیا، جو کہ ماضی میں کئے جانے والے "معاہدات" تھے۔ امریکی حکومت نے انڈینز کے ساتھ چار سو سے زائد معاہدے کئے تھے اور ہر معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ مثال کے طور پر ماضی میں جارج واشنگٹن انتظامیہ نے نیویارک کے "ایروکوئس" کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا: "امریکہ مذکورہ بالا حدود کے اندر تمام زمین 'سینیکا' قوم کی ملکیت تسلیم کرتی ہے....." لیکن ساٹھ کے عشرے کی ابتدا میں صدر کینیڈی کے زیر سایہ امریکہ نے معاہدے کو نظر انداز کر دیا اور اس زمین پر ایک ڈیم تعمیر کیا جس کے نتیجے میں 'سینیکا' "ریزرویشن کا بیشتر علاقہ پانی میں ڈوب گیا۔

ملک کے مختلف حصوں میں مزاحمت پہلے ہی سے تشکیل پا رہی تھی۔ واشنگٹن کی ریاست میں ایک پرانے معاہدے کے تحت انڈینز سے زمین لے لی گئی تھی۔ جبکہ ماہی گیری کے حقوق ان کے پاس رہنے دیئے گئے تھے۔ لیکن جب سفید فام آبادی میں اضافہ ہو گیا تو یہ معاہدہ اپنی مقبولیت کھو بیٹھا اور وہ

ماہی گیری کے علاقے پر اپنا انفرادی تسلط چاہتے تھے۔ جب 1964ء میں عدالتوں نے دریائی علاقے انڈین ماہی گیروں کے لیے بند کر دیے، انڈینز نے عدالتی حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے "نسکوالی" دریا میں مچھلیاں پکڑنا جاری رکھا اور اپنے احتجاج کی تشہیر کی امید میں جیلوں میں گئے۔ ماہی گیری کے جرم میں پکڑے جانے والے کچھ انڈینز ویت نام جنگ کے پرانے فوجی تھے۔ ان میں سے ایک "سِڈ ملز" تھا جو کہ 31 اکتوبر 1968ء کو واشنگٹن میں دریائے "نسکوالی" میں "فرینکس لینڈنگ" پر مچھلیاں پکڑتے ہوئے گرفتار ہوا۔ اس نے بیان دیا: "میں "یا کی ما" اور "چیروکی" انڈین ہوں۔ دو سال اور چار ماہ امریکی فوج میں سپاہی رہا ہوں۔ میں نے ویت نام جنگ میں حصہ لیا اور شدید زخمی ہوا.... میں امریکی فوج میں مزید خدمات یا فرائض انجام دینے کی ذمہ داری سے اب اس وقت انکار کرتا ہوں۔

انڈینز نے نہ صرف مادی مزاحمت کا مظاہرہ کیا بلکہ سفید فام کلچر کے ہتھیار، کتابیں، الفاظ اور اخبارات کا استعمال بھی ترک کیا۔ 1968ء میں "موہاک" قوم کے افراد نے امریکہ اور کینیڈا کے درمیان سینٹ لارنس دریا پر "اکوی زیاسن" سے ایک اخبار "اکوی زیاسن نوٹس" کا آغاز کیا۔ جس کی خبریں، اداریے اور نظمیں سب کی سب سرکشی کے جذبے سے بھری ہوئی تھیں۔ "وائن ڈیلوریا جونیئر" نے لکھا:

> میں اکثر و بیشتر غیر انڈینز کی سوچ سے متاثر ہوا ہوں۔ پچھلے سال میں کلیولینڈ میں تھا اور ایک غیر انڈین سے امریکہ کی تاریخ پر گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس نے کہا کہ انڈینز کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر اسے حقیقتاً بہت افسوس ہے لیکن "بہر حال! قبضہ کرنے کے بعد تم نے اس دھرتی کے ساتھ کیا کیا؟" میں اس کی بات نہ سمجھ سکا لیکن بعد میں جب مجھے علم ہوا کہ کلیولینڈ سے بہنے والا دریائے کویا ہوگا "آتش گیر بن چکا ہے تو مجھے اس کی بات سمجھ آئی۔ اس دریا میں اس قدر آتش گیر آلودہ مادے ڈمپ کیے جا چکے ہیں کہ یہاں کے مقیموں کو موسم گرما میں خاص احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ کہیں ان کو آگ نہ لگ جائے۔ کیا انڈینز کبھی ایک آتش گیر دریا پیدا کرنے کا سوچ سکتے تھے؟

9 نومبر 1969ء ایک ایسا ڈرامائی واقعہ وقوع پذیر ہوا، جس نے انڈینز کے مصائب اور شکایات پر ایسی توجہ مبذول کی جیسی آج تک کبھی نہ ہو سکی تھی۔ اس دن سورج نکلنے سے پہلے سان فرانسسکو خلیج میں واقع "الکیٹراز" جزیرے پر 78 انڈینز اترے اور جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ "الکیٹراز" ایک خالی کی گئی وفاقی جیل تھی۔ اس نفرت انگیز اور خوفناک جگہ کا عرفی نام "دی راک" تھا۔

اس مرتبہ یہ مختلف تھا۔ گروپ کی راہنمائی رچرڈ اوکس "ایک "موہاک انڈین" جو کہ فرانسسکو ریاست کالج میں "انڈین سٹڈیز" پڑھاتا تھا اور "سیک" اور "فوکس" "انڈین" "گریس تھورپ" کے ہاتھوں میں تھی جو کہ ایک مشہور کالج فٹ بال سٹار اور اولمپک میں دوڑوں، جمپوں اور رکاوٹوں والی دوڑوں کے کھلاڑی کی بیٹی تھی۔ مزید انڈینز بھی یہاں پہنچ گئے اور نومبر کے آخر تک ان کی تعداد چھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ "الکیٹراز" میں ساٹھ سے زائد انڈینز قبائل کی نمائندگی کرتے ہوئے انڈینز موجود تھے۔

وہ اپنے آپ کو "تمام قبائل کے انڈینز" کہتے تھے اور انہوں نے ایک اعلان کیا "ہم "دی راک" کے مالک ہیں۔ اس اعلامیے میں انہوں نے "الکیٹراز" کو "شیشے کے منکوں اور سرخ کپڑے" کے عوض خریدنے کی پیش کش کی، یہ وہ قیمت تھی جو انڈینز کو تین سو سال قبل "مین ہیٹن" جزیرے کی ادا کی گئی تھی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اس جزیرے کو ماحولیات کے لیے مقامی امریکی تحقیقات کا مرکز بنائیں گے۔ ہم خلیج کے علاقے کو آبی اور ہوائی آلودگی سے پاک کرنے کے لیے کام کریں گے.... ماہی اور حیوانی زندگی بحال کریں گے۔

آنے والے مہینوں میں حکومت نے "الکیٹراز" جزیرے کے ٹیلی فون، بجلی اور پانی کے کنکشن کاٹ دیے۔ بہت سے انڈینز کو مجبوراً وہاں سے نکلنا پڑا اور باقی ماندہ نے وہیں رہنے پر اصرار کیا۔ ایک سال بعد تک وہ وہیں مقیم تھے اور انہوں نے "دھرتی ماتا پر بسنے والے تمام نسلوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے اپنے بھائیوں اور بہنوں" کے نام ایک پیغام بھیجا:

> ہمارا "الکیٹراز" جزیرے پر آزادی، انصاف اور برابری کے حقیقی نام پر ابھی تک قبضہ جاری ہے کیونکہ آپ دھرتی پر بسنے والے ہمارے بھائیوں اور بہنوں نے ہمارے جائز مقصد میں ہماری مدد کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تشدد محض مزید تشدد کو جنم دیتا ہے اور اس لیے ہم نے الکیٹراز پر اپنا قبضہ پر امن طور پر جاری رکھا ہوا ہے، اور امید رکھتے ہیں کہ امریکہ کی حکومت بھی اس کے مطابق عمل کرے گی۔
>
> ہم تمام قبائل سے تعلق رکھنے والے انڈینز ہیں ہم "دی راک" کے قابض ہیں۔

چھ ماہ بعد وفاقی افواج نے جزیرے پر حملہ کیا اور وہاں رہنے والے انڈینز کو عملی طور پر وہاں سے باہر نکال دیا۔

1960 کے عشرے میں "پی باڈی کول کمپنی" نے نیو میکسیکو میں "ناواجو" سرزمین پر "سطحی کان کنی" کا آغاز کیا، جو کہ اوپر والی مٹی کی بے رحمانہ کھدائی تھی۔ کمپنی نے بعض "ناواجوز" کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی جانب اشارہ کیا۔ یہ ایک ماضی میں کیے گئے انڈینز کے ساتھ معاہدوں میں سے ایک تھا جن کے تحت تمام انڈین زمین پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔

1969ء کے موسم خزاں میں ڈیڑھ سو "ناواجوز" کا ایک اجلاس ہوا، جس میں کہا گیا کہ "سطحی کان کنی" پانی اور ہوا کو آلودہ کرے گی، جانوروں کی چراگاہوں کو تباہ کرے گی اور ان کے کمیاب آبی ذخائر ختم کر دے گی۔ ایک عمر رسیدہ ناواجو خاتون جو کہ جلسے کی منتظمین میں سے ایک تھی نے کہا "پی باڈی کی

ڈیویکل مشینیں ہماری ماں دھرتی کا سینہ کھود رہی ہیں، ہمارے مقدس پہاڑوں کو پامال کر رہی ہیں اور ان کا درد ہمیں محسوس ہو رہا ہے.... میں کئی سالوں سے یہاں رو رہی ہوں اور میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔

''ہوپی'' انڈینز بھی ''پی باڈی'' کی کارروائیوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ انہوں نے صدر نکسن کو احتجاج کے طور پر لکھا: ''آج اس مقدس سرزمین کے تقدس کو جہاں ہوپی آباد ہیں پامال کیا جا رہا ہے۔ وہ ہماری زمین سے کوئلہ اور پانی تلاش کر رہے ہیں تاکہ سفید فام آدمیوں کے شہروں کے لیے مزید توانائی پیدا کر سکیں.... عظیم روح نے ایسا ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے.... عظیم روح نے زمین سے اشیاء نکالنے سے روک رکھا ہے اور زندہ اشیاء کو برباد کرنے سے منع کر رکھا ہے۔''

1970ء کے موسم خزاں میں ایک میگزین ''لارضا'' نے، جو کہ تحریک کے ان سالوں میں شائع ہونے والی بے شمار پبلیکیشنز میں سے ایک تھا، جو ایسی معلومات مہیا کرتی تھیں جن کو معمول کے ذرائع ابلاغ نظر انداز کر دیتے تھے، شمالی کیلیفورنیا کے دریائے ''پٹ'' پر بسنے والے انڈینز کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی۔ ساٹھ پٹ انڈینز نے زمین پر قبضہ کر لیا جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ اُن کی ملکیت ہے۔ جب ''فارسٹ سروسز'' نے انہیں وہاں سے نکل جانے کو کہا تو انہوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا لیکن 150 فوجی مشین گنوں، شاٹ گنوں، رائفلوں، پستولوں، بلوہ توڑ لاٹھیوں، گرزوں، کتوں، زنجیروں اور ہتھکڑیوں سے لیس وہاں پہنچ گئے۔

ایک انڈین ''ڈرائیل ولسن'' نے لکھا: ''بوڑھے افراد خوفزدہ ہو گئے۔ نوجوانوں نے دلیری سے سوال جواب کئے۔ چھوٹے بچے سہمے ہوئے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز تھیں گویا شدید گرمی کے موسم میں کوئی دوڑ لگا کر آیا ہو۔''

فوجیوں نے اپنی بلوہ توڑ لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں اور خون بہنا شروع ہو گیا۔ ولسن نے ایک فوجی سے گرز چھین لیا، جس پر اسے نیچے گرایا گیا، ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں اور جب وہ منہ کے بل زمین پر لیٹا ہوا تھا اسے کئی مرتبہ پیچھے سے سر میں چوٹیں لگائی گئیں۔ ایک چھیاسٹھ سالہ شخص کو مار مار کر بے ہوش کر دیا گیا۔ ایک سفید فام رپورٹر کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کی بیوی کو مارا پیٹا گیا۔ ان سب کو ایک ٹرک میں لاد کر وہاں سے لے جایا گیا اور ان پر فیڈرل آفیسرز پر حملہ کرنے اور درخت کاٹنے کے الزامات میں مقدمات درج کئے گئے، ان پر ناجائز طور پر علاقے میں داخل ہونے کا الزام نہیں لگایا گیا تھا کیونکہ اس سے زمین کی ملکیت کا سوال اٹھ سکتا تھا۔ جب یہ سارا واقعہ ختم ہو گیا، وہ ابھی تک سرکشی پر آمادہ تھے۔

ویت نام کی جنگ میں شامل ہونے والے انڈینز نے رابطے استوار کرنے شروع کئے۔ ''ڈیٹرائٹ'' میں ''ونٹر سولجر انویسٹی گیشنز'' میں جہاں ویت نام کے پرانے فوجیوں نے اپنے اپنے تجربات کی شہادتیں پیش کیں، ''اوکلاہاما'' کے ایک انڈین ''ایوان ہیٹی'' نے بتایا:

اسی قسم کا قتل عام انڈینز کے خلاف 100 سال پہلے کیا گیا تھا۔ اس وقت جراثیمی جنگ کا استعمال کیا گیا۔ انہوں نے انڈینز کے کمبلوں میں چیچک کے جراثیم ڈال دیے تھے.... مجھے ویت نامی باشندوں کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا وہ بالکل ہماری طرح کے تھے.... ہم جو کر رہے ہیں وہ اپنے آپ اور دنیا کو تباہ کرنے کا عمل ہے۔ اگرچہ ''اوکلاہاما'' کنٹری سکول جس میں مَیں پڑھتا تھا 50 فی صد بچے انڈینز تھے، لیکن سکول میں، ٹیلی ویژن پر یا ریڈیو پر انڈین تہذیب کے بارے میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ سکول میں انڈین تاریخ پر کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی تھی حتیٰ کہ لائبریری میں بھی ایسی کوئی کتاب موجود نہیں تھی.... لیکن میں جانتا تھا کہ یہاں کچھ غلط ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی تہذیب اور تمدن کے بارے میں پڑھنا اور سیکھنا شروع کیا....

انڈینز نے ''اپنی تباہی'' (اپنی تہذیب کے خاتمہ) کے بارے میں غور کرنا شروع کیا۔ 1969ء میں ''امریکن انڈین سکالرز'' کے پہلے اجلاس میں، انڈینز نے پورے امریکہ میں سکول کے بچوں کو پڑھائی جانے والی ٹیکسٹ بکس میں سے انڈینز کو نظر انداز کرنے یا ان کی توہین کرنے کے عمل پر سخت خفگی کا اظہار کیا۔ اس سال ''انڈین، ہسٹورین پریس'' کی بنیاد رکھی گئی۔ اس نے ایلیمنٹری اور سیکنڈری سکول میں پڑھائی جانے والی چار سو کتابوں کو پرکھا، اور پتا چلا کہ ان میں سے کوئی بھی انڈینز کی درست اور صحیح تصویر کشی نہیں کرتی۔

دوسرے امریکیوں نے بھی توجہ دینا شروع کی اور اپنے علم پر دوبارہ غور شروع کیا۔ انڈینز کی تاریخ کا ازالہ کرنے کی کوشش میں پہلی فلم جو منظر عام پر آئی اس کا نام ''لٹل بگ مین'' تھا، جو کہ ''تھامس برجر'' کے ناول پر مبنی تھی۔ انڈین تاریخ پر زیادہ سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آنا شروع ہوئیں اور ایک مکمل طور پر نیا ادب وجود میں آ گیا۔ ٹیچرز بھی پرانی گھسی پٹی کتب کے بارے میں بہت حساس ہو چکے تھے، انہوں نے پرانی ٹیکسٹ بکس پھینک دیں اور نیا مواد استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایک ایلیمنٹری سکول کے طالب علم نے اپنی سکول بک کے پبلشر کو لکھا:

محترم ایڈیٹر:

مجھے آپ کی کتاب ''کروز آف کرسٹوفر کولمبس'' بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اس کو اس لیے پسند نہیں کرتا کیونکہ آپ نے انڈینز کے بارے میں کچھ باتیں کہی ہیں جو کہ درست نہیں ہیں.... ایک اور بات جو مجھے پسند نہیں ہے وہ صفحہ 69 پر ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کرسٹوفر کولمبس نے انڈینز کو سپین مدعو کیا تھا، لیکن حقیقت میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ اس نے انہیں اغوا کیا تھا!

آپ کا مخلص

ریمنڈ میرانڈا

1970ء کے ''مسیحی شکرانے کے دن'' اور 1620ء میں میساچوسٹس میں اترنے والے مسیحیوں کی آمد کی یاد میں سالانہ تہوار کے موقع پر حکام نے کچھ نئی بات کا فیصلہ کیا کہ افتتاحی تقریب میں تقریر کے لیے کسی انڈین کو مدعو کیا جائے۔ انہوں نے ایک ''ویمپ ینواگ'' انڈین جس کا نام فرینک جیمز تھا کا انتخاب کیا اور اسے تقریر کرنے کو کہا۔ لیکن جب انہوں نے وہ تقریر دیکھی جو وہ کرنے والا تھا، تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ تقریر نہیں ہوسکتی۔ اس کی تقریر کے ایک حصے میں جو کہ اس موقع پر پولی موتھ میساچوسٹس میں سنی نہ گئی کہا گیا تھا: ''میں ایک ویمپ ینواگ آدمی کی حیثیت سے آپ سے بات کر رہا ہوں..... میں آج ملے جلے جذبات کے ساتھ جہاں کھڑا ہو کر اپنے خیالات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں..... یہاں اترنے والے زائرین کو بمشکل چار دن گزرے ہوں گے کہ انہوں نے میرے آباؤ اجداد کی قبریں کھود کر لوٹ لیں، اور ان کی مکئی، ان کی گندم اور دالیں چرا لیں..... ہمارے جذبے مرنے سے انکاری ہیں..... ہم پورے فخر کے ساتھ ایستادہ کھڑے ہیں۔ اور پیشتر اس کے کہ بہت سے چاند گزر جائیں ہم ان بدسلوکیوں کا ازالہ کرلیں گے جو ہم نے اپنے ساتھ ہونے دی ہیں.....''

مارچ 1973ء میں ایک ایسا واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ 1890ء کے قتل عام کے باوجود شمالی امریکہ کے انڈینز ابھی تک زندہ ہیں۔ قتل عام کے مقام ''پائن رج ریزرویشن'' میں کئی سو ''اوگلالاسیوکس'' اور ان کے ہمدرد انڈین زمین اور انڈین حقوق کے مطالبے کو تقویت دینے کی خاطر ''وُنڈڈنی'' کے گاؤں میں اس پر قبضہ کرنے کے لیے گھس آئے۔

چند گھنٹوں میں دو سو کے قریب ایف بی آئی کے ایجنٹ، وفاقی فوجی، اور ''بیورو آف انڈین آفیسرز'' کی پولیس نے قصبے کو گھیرے میں لے کر اس کی ناکہ بندی کردی۔ ان کے پاس بکتر بند گاڑیاں، خودکار رائفلیں، مشین گنیں، گرنیڈ لانچرز اور گیس شیلز تھے اور انہوں نے جلد ہی فائرنگ شروع کردی۔

محاصرہ شروع ہونے کے بعد خوراک کی سپلائی میں کمی آگئی۔ مشی گن کے انڈینز نے طیارے کے ذریعے خوراک بھیجی جو کہ قصبے کے اندر اترا۔ دوسرے دن ایف بی آئی کے ایجنٹوں نے پائلٹ اور مشی گن سے ایک ڈاکٹر کو گرفتار کرلیا جس نے طیارہ کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ ''نیوادا'' میں گیارہ انڈینز خوراک، کپڑوں اور ادویات کی سپلائی جنوبی ڈیکوٹا لے جانے کے جرم میں گرفتار کیے گئے۔ اپریل کے وسط میں تین اور طیاروں نے بارہ سو پاؤنڈ خوراک پھینکی، لیکن جوں ہی لوگ اس کو اٹھانے کے لیے جمع ہوئے حکومت کا ایک ہیلی کاپٹر آیا اور ان پر اوپر سے فائر کیے جب کہ زمین سے بھی تمام اطراف سے بندوق کے فائر آنے لگے۔ ''فرینک کلیئرواٹر'' مرگیا۔

بندوقوں کی مزید جھڑپیں بھی ہوئیں اور ایک مزید آدمی مارا گیا۔ آخرکار ایک امن معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت دونوں فریق غیر مسلح ہونے پر رضامند ہوگئے۔ محاصرہ ختم ہوگیا اور 120 قابضین کو

گرفتار کرلیا گیا۔

انڈینز نے 71 دن تک مزاحمت جاری رکھی تھی اور محاصرہ شدہ علاقے کے اندر ایک شاندار اشتراک اور بھائی چارہ قائم کیا۔ مشترکہ کچن، ہیلتھ کلینک اور ہسپتال قائم کیا گیا۔ ویت نام کے ایک پرانے ''ناواجو'' سپاہی نے لکھا:

> اس خیال نے ایک بہت زیادہ اطمینان کی فضا پیدا کر رکھی تھی کہ ہمارے پاس کافی بندوقیں موجود ہیں..... لیکن لوگ اس لیے قائم تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا ایک مقصد ہے۔ ویت نام میں ہماری شکست کی وجہ یہی تھی کہ وہاں ہمارے پاس کوئی مقصد نہیں تھا۔ ہم امراء کی جنگ لڑ رہے تھے..... ''وُنڈڈنی'' میں ''مورال'' کے حوالے سے ہماری پوزیشن بہت زیادہ بہتر تھی کیونکہ ہم اب بھی ہنستے اور مسکراتے تھے۔

''وُنڈڈنی'' کے لیے آسٹریلیا، فن لینڈ، جرمنی، اٹلی، جاپان اور انگلینڈ سے حمایت کے پیغامات آئے تھے۔ ایک پیغام انیکا کے کچھ بھائیوں کی جانب سے آیا تھا، جن میں سے دو انڈینز تھے۔ ''تم ہماری دھرتی ماتا اور اس کے فرزندوں کے لیے لڑ رہے ہو۔ ہماری روحیں تمہارے ساتھ لڑ رہی ہیں۔ ''ویلیس بلیک ایلک'' نے جواب دیا: ''چھوٹا سا ''وُنڈڈنی'' ایک عظیم دنیا میں تبدیل ہوگیا ہے۔''

''وُنڈڈنی'' کے بعد اموات، مقدمات اور تحریک کو ختم کرنے کے لیے پولیس اور عدالتوں کے استعمال کے باوجود مقامی امریکیوں کی تحریک جاری رہی۔ ''اکیوی زیاسن نوٹس'' کی اشاعت جاری رہی۔ 1976ء کے موسم خزاں کے اختتام پر اس کی شاعری والے صفحہ پر وقت کی روح کی عکاسی کرتی ہوئی نظمیں شائع ہوتی رہیں۔

''ایلا ایرناتھی'' نے لکھا:

میں اُگتی ہوئی گھاس اور گھاس کاٹنے والی قینچی ہوں،
میں بید مجنوں اور چٹیاں کاٹنے والا ہوں۔

. . . . . .

میں تمہارے ضمیر کے لیے بلائے بے درماں ہوں، مجھے تسلیم کرو

ساٹھ اور ستر کے عشرے صرف خواتین کی تحریک، قیدیوں کی تحریک، انڈین کی تحریک کا دور نہیں۔ یہ زندگی بسر کرنے کے استبدادانہ، مصنوعی اور ماضی میں بے چون و چرا تسلیم کیے گئے طور طریقوں کے خلاف ایک عمومی بغاوت کا دور تھا۔ اس نے ذاتی زندگی کے ہر پہلو، بچے کی پیدائش، بچپن، محبت، جنس، شادی، لباس، موسیقی، آرٹ، کھیلوں، زبان، خوراک، رہائش، مذہب، ادب، موت، سکول، کو متاثر کیا تھا۔

جنسی رویوں میں حیران کن تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ شادی سے پہلے کے جنسی تعلقات

اب کوئی پوشیدہ رکھنے والا معاملہ نہیں رہا تھا۔ مرد اور خواتین بغیر شادی کے بندھن کے اکٹھے رہ رہے تھے اور دوسرے افراد کے ساتھ تعارف کراتے وقت الفاظ تلاش کیے جا رہے تھے "میں تمہیں اپنے/اپنی دوست سے ملانا چاہتا/چاہتی ہوں۔" شادی شدہ جوڑے اپنے تعلقات پر کھل کر بات چیت کرتے تھے، اور "اوپن میرج" پر ایسی کتابیں عام نظر آتی تھی جن میں ایسے معاملات پر کھل کر بحثیں کی گئی تھیں۔ خود لذتی پر کھلے بندوں بلکہ مثبت انداز میں بات چیت ہو رہی تھی۔ ہم جنس پرستی پر اب پردہ نہیں ڈالا جاتا تھا۔ ہم جنس مرد اور ہم جنس خواتین معاشرے کے امتیازی رویوں کے خلاف، شرم اور معاشرتی علیحدگی پر قابو پانے کے لیے منظم ہو رہے تھے۔

ان سب پہلوؤں کی ادب اور ذرائع ابلاغ میں عکاسی ہو رہی تھی۔ مردوں اور خواتین کو جنسی آسودگی کے حصول کے طریقے سکھانے کے لیے نیا لٹریچر وجود میں آ رہا تھا۔ فلموں میں اب عریانی دکھانے پر ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جا رہی تھی۔ ادب اور عام گفتگو میں اب جنسی زبان کا استعمال عام ہو رہا تھا۔ ان سب چیزوں کا تعلق نئے رہائشی انتظامات سے جڑا ہوا تھا۔ خاص طور پر نوجوانوں میں مشترک رہائشی انتظامات فروغ پا رہے تھے۔

ساٹھ کے عشرے کی تہذیبی تبدیلی میں غیر رسمی انداز غالب نظر آتا تھا۔ خواتین کے لیے یہ تاریخی نسوانی تحریک کا تسلسل تھا جس کے تحت رکاوٹ پیدا کرنے والے نسوانی لباس کو رد کیا جا رہا تھا۔ بہت سی خواتین نے انگیا پہننا چھوڑ دی تھیں۔ کمر بند جو کہ چالیس اور پچاس کے عشروں میں تقریباً یونیفارم کی حیثیت رکھتا تھا، بہت کم نظر آتا تھا، نوجوان مرد اور خواتین تقریباً ایک جیسا لباس، جینز اور متروک آرمی یونیفارم پہن رہے تھے۔ مردوں نے نکٹائی باندھنا چھوڑ دیا تھا، ہر عمر کی خواتین اکثر پینٹیں پہنتی تھیں، جو کہ ایمیلا بلومر کو ایک خاموش خراج عقیدت تھا۔

جنگ کے خلاف کیتھولک مزاحمت کیتھولک چرچ کے اندر ایک عمومی بغاوت کا حصہ تھی، جو کہ ایک لمبے عرصہ تک قدامت پسندی، نسل پرستی، وطن پرستی اور جنگ وجدل کا پشت پناہ رہا تھا۔ پادری اور ننیں چرچ سے مستعفی ہو کر جنسی عمل میں مشغول ہو رہے تھے، شادیاں کر رہے تھے اور بچے پیدا کر رہے تھے، بعض صورتوں میں چرچ کو سرکاری طور پر چھوڑے بغیر ہی یہ کام کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ بات درست تھی کہ اب بھی پرانے دور کے احیائے دین کے حامیوں کو بہت مقبولیت حاصل تھی اور "بلی گراہم" کے مقلدین کی تعداد لاکھوں میں تھی، لیکن اہم دھارے کے خلاف تیز و تند چھوٹی لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

بڑی قوتوں (کاروبار، حکومت، مذہب) میں اعتقاد کے فقدان کے نتیجے میں اپنی ذات پر، خواہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر، ایک مضبوط اعتقاد پروان چڑھا۔ تمام میدانوں کے ماہرین کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا، یہ عقیدہ پروان چڑھ رہا تھا کہ لوگ خود تعین کر سکتے ہیں کہ کیا کھانا چاہیے، اپنی زندگیاں

کس طرح بسر کرنا چاہئیں اور کس طرح صحت مند رہا جا سکتا ہے۔ میڈیکل انڈسٹری کے بارے میں شک و شبہات پیدا ہو چکے تھے اور خوراک کو محفوظ کرنے والے کیمیاوی عناصر، بے وقعت غذاؤں اور اشتہار بازی کے خلاف منظم جدوجہد جنم لے چکی تھی۔ اب تمباکو نوشی کی تباہ کاریوں، کینسر، دل کی بیماریوں کے خلاف سائنسی شہادتیں اس قدر مضبوط تھیں کہ حکومت نے ٹیلی ویژن اور اخبارات میں سگرٹوں کی اشتہار بازی پر پابندی عائد کر دی۔

روایتی تعلیم کا از سر نو جائزہ لیا جانے لگا تھا۔ سکول پوری نسلوں کو حب الوطنی، حکام کی فرمانبرداری کا سبق پڑھاتے رہے تھے اور جہالت کو دوام بخشتے رہے تھے۔ حتیٰ کہ دوسری اقوام کے افراد، نسلوں، مقامی امریکیوں اور خواتین کی تذلیل کا سبق دیتے رہے تھے۔ نہ صرف تعلیم کے مندرجات کو چیلنج کیا جا رہا تھا بلکہ اس کے سٹائل، رسم و رواج کی پابندی، بیوروکریسی، حکام کی تابعداری پر اصرار کو بھی چیلنج کیا جا رہا تھا۔ اس نے قدامت پرست تعلیم کے خوفناک قومی نظام میں محض ایک ہلکا سا گڑھا پیدا کیا، لیکن اس کے اثرات پورے ملک میں ٹیچرز کی نئی نسل میں اور نئے لٹریچر میں منعکس ہو رہے تھے۔

امریکہ کی تاریخ میں آج تک چند سالوں کے اندر تبدیلی کے لیے اس قدر تحریکوں کا ارتکاز دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ لیکن نظام نے دو صدیوں کے دوران لوگوں کو قابو رکھنے کے لیے بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور ستر کے عشرے کے وسط میں اس پر عملدرآمد کر دیا گیا تھا۔

ستر کا عشرہ۔۔اعتماد کا فقدان

ستر کے عشرے کی ابتداء میں ''سسٹم'' قابو سے باہر نظر آ رہا تھا، یہ لوگوں کی وفاداریاں قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ 1970ء میں یونیورسٹی آف مشی گن کے ''سروے ریسرچ سنٹر'' کے مطابق عوام کے ہر طبقے میں حکومت پر اعتماد میں بہت کمی آ چکی تھی۔ اور طبقات کے حوالے سے اس میں ایک واضح فرق موجود تھا۔ پیشہ ور افراد میں سے 40 فی صد کا حکومت پر سیاسی اعتماد کم ہو چکا تھا، اور غیر ہنر مند مزدور طبقے میں اعتماد کی کمی 60 فی صد تک پہنچ چکی تھی۔

ویت نام میں مداخلت کے سات سالوں بعد 1971ء میں کیے گئے عوامی رائے کی ایک سروے کے مطابق، دوسرے ممالک کی اس خیال کے تحت مدد کرنے کے لیے کہ ان پر کیمونسٹوں کی پشت پناہی رکھنے والی قوتوں نے حملہ کیا ہوا ہے نارضامندی کا اظہار کیا گیا، خواہ یہ ممالک ہمارے نصف کرہ ارض میں ہی کیوں نہ واقع ہوں۔ جیسا کہ تھائی لینڈ پر کیمونسٹوں کے حملے کی صورت میں محض 12 فی صد سفید فام اور 4 فی صد غیر سفید فام افواج بھیجنے کے حق میں تھے۔

مشی گن یونیورسٹی کے سروے ریسرچ سنٹر نے یہ سوال رکھا تھا ''کیا حکومت اپنے ذاتی مفادات کو پیش نظر رکھنے والے چند بڑے لوگ چلا رہے ہیں؟'' 1964ء میں 26 فی صد کا جواب ''ہاں'' میں تھا، اور 1972ء میں 53 فی صد نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔

پہلے کی نسبت زیادہ رائے دہندگان نے ڈیموکریٹ یا ری پبلکن کے طور پر اپنی شناخت درج کرنے سے انکار کیا۔ 1940ء میں 20 فی صد رائے دہندگان نے اپنے آپ کو ''آزاد'' کہا تھا۔ 1974ء میں 34 فی صد نے اپنے آپ کو ''آزاد'' قرار دیا۔

عدالتیں، جیوریاں اور حتیٰ کہ جج بھی اپنے معمول کے رویوں سے انحراف دکھا رہے تھے۔ جیوریاں انقلابیوں کو بری کر رہی تھیں، ویسٹ کوسٹ میں ایک تسلیم شدہ کیمونسٹ انجیلا ڈیوس کو جیوری نے بری قرار دے دیا۔ ''بلیک پینتھرز'' جن کو حکومت ہر صورت میں تباہ اور ختم کرنا چاہتی تھی، بہت سے مقدمات میں جیوریوں نے بری کر دیے تھے۔ جنوبی میساچوسٹس میں ایک جج نے ایک نوجوان انقلابی

''سام لوجوائے'' کے خلاف مقدمہ مسترد کر دیا۔ جس نے ایک یوٹیلیٹی کمپنی کا پانچ سو فٹ اونچا ٹاور گرا دیا تھا جو کہ ایٹمی پلانٹ کے لیے نصب کیا گیا تھا۔ اگست 1973ء میں واشنگٹن ڈی سی میں سپریم کورٹ کے ایک جج نے چھ افراد کو سزا دینے سے انکار کر دیا جن پر غیر قانونی داخلے کا الزام عائد کیا گیا تھا، جو کہ وائٹ ہاؤس کی سیر کے لیے آنے والے افراد کی قطار میں سے کمبوڈیا پر بمباری کے خلاف احتجاج کے طور پر باہر نکل آئے تھے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے خلاف یہ تمام عوامی غم و غصہ ویت نام جنگ، اس میں 58,000 امریکیوں کی اموات، اس کی اخلاقی ندامت اور اس میں حکومت کے جھوٹوں اور مظالم کے انکشافات کا نتیجہ تھا۔ اور ان سب سے بڑھ کر ''واٹر گیٹ'' سیکنڈلز میں نکسن کی انتظامیہ کی سیاسی تذلیل نے کام دکھایا، جس کے نتیجے میں امریکی تاریخ میں پہلی مرتبہ اگست 1974ء میں رچرڈ نکسن کو اپنی صدارت سے تاریخی استعفیٰ دینا پڑا۔

''واٹر گیٹ'' کی کہانی کا آغاز جون 1972ء میں صدارتی مہم کے دوران اس وقت ہوا جب واشنگٹن ڈی سی میں واقع واٹر گیٹ اپارٹمنٹ کمپلیکس میں ڈیموکریٹک نیشنل کمیٹی کے دفاتر میں ناجائز طور پر گھسنے والے پانچ نقب زنوں کو گرفتار کر لیا گیا، جن کے پاس ٹیلی فون ٹیپ کرنے اور تصاویر اتارنے کا ساز و سامان بھی موجود تھا۔ ان پانچ نقب زنوں میں سے ایک جیمز میک کورڈ جونیئر تھا جو نکسن کی مہم کے لیے کام کر رہا تھا، وہ صدر کے دوبارہ انتخاب کی کمیٹی (CREEP) کا سیکورٹی آفیسر تھا۔ ان پانچ میں سے ایک دوسرے نقب زن کے پاس سے ایک ''ایڈریس بک'' برآمد ہوئی، جس میں ''ای ہاورڈ ہنٹ'' کا نام بھی درج تھا اور ای ہنٹ کا ایڈریس وائٹ ہاؤس لکھا ہوا تھا۔ وہ ''چارلس کول سن'' کا نائب تھا جو کہ صدر نکسن کا مشیر خصوصی تھا۔

میک کورڈ اور ہنٹ دونوں کئی سال تک سی آئی اے کے لیے کام کرتے رہے تھے۔ ہنٹ 1961ء میں کیوبا پر حملے کا انچارج سی آئی اے کا آدمی تھا اور واٹر گیٹ کے باقی تین نقب زن اس حملے میں شریک پرانے فوجی تھے۔ میک کورڈ ''سی آر ای پی'' کے سیکورٹی مین کے طور پر ''سی آر ای پی'' کے چیف ''جان مچل'' اٹارنی جنرل آف امریکہ کے لیے کام کر تا رہا تھا۔

اس طرح نقب زنوں کی پولیس کے ہاتھوں غیر متوقع گرفتاری پر جو کہ ان اعلیٰ سطح کے رابطوں سے بے خبر تھی۔ اور پیشتر اس کے کہ کوئی ان نقب زنوں کے نکسن کی مہماتی کمیٹی کے اہم اہلکاروں، سی آئی اے اور نکسن کے اٹارنی جنرل کے ساتھ تعلقات کی بات کو اخفا میں ڈال سکتا سب باتوں کی عوامی سطح پر تشہیر ہو چکی تھی۔ مچل نے نقب زنی کے ساتھ کسی قسم کے تعلق سے انکار کیا، اور نکسن نے اس واقعہ کے پانچ دن بعد ایک پریس کانفرنس میں کہا: ''وائٹ ہاؤس کا اس مخصوص واقعہ کے ساتھ جو بھی ہے، کوئی تعلق نہیں۔''

اگلے برس جب گرینڈ جیوری نے واٹر گیٹ کے نقب زنوں اور ہاورڈ ہنٹ اور جی گورڈن لڈی پر فرد جرم عائد کر دی تو نکسن انتظامیہ کے چھوٹے آفیسرز نے سزا کے خوف سے سچ اگلنا شروع کر دیا۔ انہوں نے عدالتی سماعت میں، سینیٹ کی تحقیقاتی کمیٹی اور پریس کو معلومات دینا شروع کر دیں۔ انہوں نے نہ صرف "جان مچل" کو ملوث قرار دیا بلکہ نکسن کے اعلیٰ ترین وائٹ ہاؤس اے ڈیز" رابرٹ ہالڈ مین" اور" جان ایرلک مین" کو اور آخر میں خود رچرڈ نکسن کو بھی نہ صرف واٹر گیٹ نقب زنی، بلکہ سیاسی مخالفین اور جنگ کے خلاف سرگرم عناصر کے خلاف غیر قانونی کارروائیوں کے پورے سلسلے میں ملوث قرار دیا۔ نکسن اور اس کے اے ڈیز نے اپنی بریت کے لیے بار بار جھوٹ کا سہارا لیا۔

مختلف شہادتوں کے نتیجے میں مندرجہ ذیل چند حقائق سامنے آئے:

1۔ اٹارنی جنرل جان مچل نے 350,000 ڈالر سے 700,000 ڈالر کا خفیہ فنڈ ڈیموکریٹک پارٹی کے خلاف جعلی خطوط تیار کرانے، پریس میں جھوٹی خبریں شائع کرانے اور مہیاتی فائلیں چرانے کے لیے استعمال کیا۔

2۔ گلف آئل کارپوریشن، آئی ٹی ٹی (انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف)،" امریکن ایر لائن" اور دوسری عظیم امریکی کارپوریشنوں نے نکسن کی صدارتی مہم کے لیے لاکھوں ڈالروں پر مشتمل غیر قانونی عطیات دیئے۔

3۔ ستمبر 1971ء میں "نیویارک ٹائمز" میں انتہائی خفیہ "پینٹاگون پیپرز" کی ڈینئل ایلس برگ کی نقول کی اشاعت کے بعد انتظامیہ نے جس میں ہاورڈ ہنٹ اور گورڈن لڈی خود شامل تھے ایلس برگ کے ریکارڈز کی تلاش میں "ایلس برگز سائیکاٹرسٹ" کے دفتر میں نقب زنی کا منصوبہ تیار کیا اور نقب زنی کی واردات کروائی۔

4۔ "واٹر گیٹ" نقب زنوں کی گرفتاری کے بعد قید کی سزا ملنے کی صورت میں انہیں ایگزیکٹو رعایت دینے کا خفیہ وعدہ کیا، اور انہیں خاموش رکھنے کے لیے ایک ملین ڈالر تک ادا کرنے کا مشورہ دیا۔ حقیقت میں "ایرلک مین" کے حکم پر انہیں 450,000 ڈالر ادا بھی کیے گئے۔

5۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ کچھ مخصوص مواد جو ایف بی آئی کی فائلوں سے غائب ہوا (یہ مواد ان غیر قانونی ٹیلی فون ٹیپس پر مشتمل تھا، جو کہ ہنری کیسنجر کے حکم پر چار صحافیوں اور تیرہ گورنمنٹ آفیسر کے ٹیلی فونوں پر لگائی گئی تھیں) وہ نکسن کے مشیر جان ایرلک مین کے وائٹ ہاؤس کے سیف میں تھا۔

6۔ واٹر گیٹ نقب زنوں میں سے ایک نے سینیٹ کمیٹی کے سامنے اعتراف کیا کہ "ڈینئل ایلس برگ" پر کیے جانے والے جسمانی حملے میں بھی ملوث تھا، جب ایلس برگ

واشنگٹن میں ایک جنگ کے خلاف ریلی سے خطاب کر رہا تھا۔

7۔ ایک گواہ نے سینیٹ کمیٹی کو بتایا کہ صدر نکسن کے پاس وائٹ ہاؤس میں ہونے والی تمام نجی گفتگو اور فون پر کی گئی گفتگو کے ٹیپس موجود ہیں۔ نکسن نے پہلے ٹیپس دینے سے انکار کر دیا اور جب آخرکار اس نے یہ ٹیپس دیئے تو ان میں دست اندازی کی گئی تھی۔ ایک ٹیپ میں سے ساڑھے اٹھارہ منٹ کی گفتگو کو مٹا دیا گیا تھا۔

8۔ اس معاملات کے دوران نکسن کے نائب صدر "سپیرو اگنیو" پر میری لینڈ میں، میری لینڈ کے ٹھیکیداروں سے سیاسی حمایت کے عوض رشوت لینے کا الزام عائد کیا گیا اور اکتوبر 1973ء میں اس نے نائب صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ نکسن نے کانگریس کے ممبر جیرالڈ فورڈ کو اگنیو کی جگہ مقرر کیا۔

9۔ نکسن نے غیر قانونی طور پر (تھوڑی بہت جعل سازی کے ذریعے) اپنی کچھ دستاویزات کی بنا پر 576,000 ڈالر کی ٹیکس کٹوتی حاصل کی۔

10۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ 1969ء اور 1970ء میں امریکہ ایک سال تک کمبوڈیا پر خفیہ اور شدید بمباری میں مصروف رہا، جسے نہ صرف امریکہ کی عوام بلکہ کانگریس سے بھی پوشیدہ رکھا گیا۔

یہ ایک تیز اور اچانک زوال تھا۔ نومبر 1972ء کے صدارتی انتخاب میں نکسن اور اگنیو نے 60 فی صد پاپولر ووٹ حاصل کئے اور سوائے میشی گن کے تمام ریاستوں میں ایک جنگ مخالف امیدوار سینیٹر جارج میک گوورن کو شکست دیتے ہوئے کامیابی حاصل کی۔ جون 1973ء میں گیلپ پول سے یہ بات سامنے آئی کہ رائے دینے والوں میں سے 67 فی صد کے خیال میں نکسن واٹر گیٹ نقب زنی میں ملوث تھا، یا اسے چھپانے کے لیے اس نے جھوٹ بولا تھا۔

1974ء کے شروع میں ہاؤس کمیٹی نے فل ہاؤس میں سے پیش کرنے کے لیے مؤاخذے (Impeachment) کا ایک بل تیار کیا۔ نکسن کے مشیروں نے اسے بتایا کہ یہ ہاؤس میں مطلوبہ اکثریت کے ساتھ پاس ہو جائے گا اور پھر سینیٹ اس کو ہٹانے کے لیے ضروری دو تہائی کی اکثریت سے ووٹ دے دے گی۔ ایک سرکردہ ساہوکار نے کہا "اگر اس وقت نکسن استعفیٰ دیتا ہے تو 90 فی صد وال سٹریٹ خوشی محسوس کرے گی۔" 8 اگست 1974ء کو نکسن نے استعفیٰ دے دیا۔

نکسن کی جگہ لیتے ہوئے جیرالڈ فورڈ نے کہا "ہماری قوم کا طویل بھیانک خواب آج ختم ہو گیا ہے۔" اخبارات خواہ وہ نکسن کے حمایتی رہے تھے یا مخالف، لبرل تھے یا کنزرویٹو، انہوں نے واٹر گیٹ بحران کے پرامن خاتمے پر خوشی کا اظہار کیا۔ "نیویارک ٹائمز" کے کالم نگار "انتھونی لیوکس" نے کہا "سسٹم

کام کررہا ہے۔"

کسی بھی قابل عزت امریکی اخبار نے وہ بات نہ کہی جو"لی مونڈے ڈپلومیٹیک" کے ایڈیٹر "کلاوڈ جیولین" نے ستمبر 1974ء میں کہی: "مسٹر رچرڈ نکسن کے خاتمے نے اس تمام میکانزم اور جھوٹی اقدار کو جوں کا توں قائم رکھا ہے جو واٹر گیٹ سیکنڈل کا باعث بنیں۔" جیولین نے اس پہلو کی جانب اشارہ کیا کہ نکسن کا وزیر خارجہ ہنری کیسنجر اپنے عہدے پر برقرار رہے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نکسن کی خارجہ پالیسی جاری رہے گی۔

جیولین کے یہ لکھنے کے مہینوں بعد یہ انکشاف ہوا کہ ایوان نمائندگان میں ڈیموکریٹ اور ریپبلک کے اعلیٰ لیڈروں نے نکسن کو خفیہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر وہ استعفیٰ دے دے تو وہ اس کے خلاف مجرمانہ کارروائی کی حمایت نہیں کریں گے۔ "نیویارک ٹائمز" کے آرٹیکل میں جس میں نکسن کے استعفیٰ کے لیے وال سٹریٹ کی امید کا ذکر کیا گیا تھا، وال سٹریٹ کے ایک ساہوکار کے حوالے سے لکھا گیا: "ہمیں جو کچھ حاصل ہوگا وہ یہ ہے کہ یہی کھیل نئے کھلاڑیوں سے کھیلنا ہوگا۔"

ہاؤس کمیٹی نے نکسن کے مؤاخذے کے لیے جو الزامات لگائے وہ واضح طور پر نکسن کے بڑی کارپوریشنوں کے ساتھ سازباز پر مشتمل تھے۔ اس میں کمبوڈیا پر بمباری کا کوئی ذکر نہ تھا۔ یہ صرف اُن پہلوؤں پر مرتکز تھے جن کا صرف نکسن سے تعلق تھا، اُن بنیادی پالیسیوں کا ذکر نہیں کیا گیا تھا جو امریکی صدور ملک کے اندر اور باہر جاری رکھے ہوئے تھے۔

نکسن سے چھٹکارا حاصل کرنے اور سسٹم کو بچانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ "تھیوڈور سورنسن" جو کہ صدر کینیڈی کا مشیر رہا تھا، نے واٹر گیٹ سیکنڈل کے وقت لکھا: "ہمارے نفاذ قانون کے نظام میں بگاڑ کی وجوہات جواب سامنے آرہی ہیں ان کا تعلق اداروں سے نہیں ہے بلکہ زیادہ تر شخصی نوعیت کی حامل ہیں۔ اس کے سٹرکچر میں چند تبدیلیوں کی ضرورت ہے، تمام گلے سڑے سیب باہر پھینک دینے چاہیں، لیکن بیرل کو بچا لینا چاہیے۔"

حقیقت میں بیرل بچا لیا گیا تھا۔ نکسن کی خارجہ پالیسی قائم رہی۔ حکومت کے کارپوریٹ مفادات کے ساتھ تعلقات قائم رہے۔ فورڈ کے واشنگٹن میں انتہائی قریبی دوست کارپوریٹ ترغیب کار تھے۔ فورڈ نے سب سے پہلے جو کام کیے ان میں نکسن کو معاف کرنا بھی شامل تھا۔ اس طرح اسے ممکنہ کارروائی سے تحفظ فراہم کرتے ہوئے خطیر پنشن کے ساتھ کیلیفورنیا میں پرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع مہیا کر دیا گیا۔

جب کارپوریٹ تعلقات کے موضوع پر بات پہنچی تو سینیٹ کمیٹی میں ہونے والی سماعت کو ٹیلی ویژن پر دکھانا اچانک روک دیا گیا۔ واٹر گیٹ جیسے انوکھے مکارانہ اقدامات کو مکمل ہوا دی گئی، جبکہ مائی

لائی قتل عام، کمبوڈیا پر خفیہ بمباری، ایف بی آئی اور سی آئی اے کے کام پر سرسری سی توجہ دی گئی۔ سوشلسٹ ورکر پارٹی، بلیک پینتھرز اور دوسرے انقلابی گروپس کے خلاف گھٹیا حربوں کا ذکر صرف اخبارات میں ہی کیا گیا تھا۔ پوری قوم نے واٹر گیٹ اپارٹمنٹ میں مختصری نقب زنی کی مکمل تفصیلات سنیں، لیکن ویت نام میں طویل المدتی نقب زنی کے بارے میں ٹیلی ویژن پر اس قدر تفصیل سے کبھی بات چیت نہ کی گئی۔

امریکی سسٹم میں وائٹ ہاؤس پر کارپوریٹ اثر ورسوخ ایک مستقل حقیقت ہے۔ ان میں سے بہت سی کارپوریشنیں دونوں اطراف میں رقوم دیتی ہیں، تاکہ جو بھی جیت جائے انتظامیہ میں ان کے ہمدرد موجود ہوں۔ کرائسلر کارپوریشن اپنے ایگزیکٹوز کو "اپنی پسند کی پارٹی اور امیدوار کی حمایت" کا حق دیتی ہے اور پھر ان سے چیک جمع کر کے یہ چیک ری پبلکن اور ڈیموکریٹک کی مہم چلانے والی کمیٹیوں کو دے دیتی ہے۔

انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی ہمیشہ سے دونوں اطراف میں رقم دیتی آرہی ہے۔ آئی ٹی ٹی کے ایک سینئر پریذیڈنٹ کے بارے میں اس کے ایک نائب نے بتایا کہ اس نے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے بات چیت کرتے ہوئے کہا: "دونوں اطراف میں مکھن لگا کر رکھو تاکہ جو بھی جیت جائے ہم فائدے میں رہ سکیں۔" اور 1971ء میں آئی ٹی ٹی نے 1.5 بلین ڈالر کی "ہارٹ فورڈ فائر انشورنس کمپنی" پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا، جو کہ کارپوریٹ تاریخ میں سب سے بڑا ادغام تھا۔ محکمہ انصاف کا اینٹی ٹرسٹ ڈویژن، آئی ٹی ٹی پر اینٹی ٹرسٹ ضوابط کی خلاف ورزی پر کارروائی کرنے کے لیے حرکت میں آیا۔ تاہم آئی ٹی ٹی پر کسی قسم کا مقدمہ نہ چلایا گیا اور آئی ٹی ٹی کو ہارٹ فورڈ کے ساتھ ادغام کی اجازت دے دی گئی۔ یہ تمام معاملہ بالائے عدالت خفیہ بندوبست کے ذریعے طے پایا جس میں آئی ٹی ٹی نے ری پبلکن پارٹی کو 400,000 ڈالر ادا کیے۔

صدر خواہ نکسن ہو یا فورڈ یا کوئی ری پبلکن ہو یا ڈیموکریٹ سسٹم ایک ہی انداز میں کام کرتا رہا۔

حتیٰ کہ واٹر گیٹ سیکنڈل میں بڑی مستعدی سے کی گئی تحقیقات میں جو کہ افسر استغاثہ بکار خاص "آرکی بالڈ کوکس" کے زیر نگرانی کی گئیں، جسے بعد میں نکسن نے نکال دیا تھا، کارپوریشنیں آسانی سے دامن بچا کر نکل گئیں۔ "امریکن ایئر لائن" کو، جس نے نکسن کی مہم میں غیر قانونی عطیات کی ادائیگی کو تسلیم کیا، محض 5,000 ڈالر جرمانہ کیا گیا، گڈ ایئر کو 5,000 ڈالر جرمانہ ہوا، 3 ایم کارپوریشن کو 3,000 ڈالر جرمانہ ہوا، 20 اکتوبر 1973ء کی "نیویارک ٹائمز" کی ایک رپورٹ کے مطابق:

> مسٹر کوکس نے ان پر بغیر رضامندی کے عطیات دینے کا الزام عائد کیا جو کہ قانونی طور پر چھوٹا جرم تصور کیا جاتا تھا۔ جب کہ رضامندی سے دیے گئے عطیات سنگین جرم تصور کیا جاتا تھا جس کی سزا 10,000 ڈالر جرمانہ یا دو سال قید تھی۔ جبکہ چھوٹے جرم یعنی بغیر

رضامندی کے دیے گئے عطیات کی سزا 1,000 ڈالر جرمانہ یا ایک سال قید تھی۔

جب عدالت میں سوال کیا گیا کہ کس طرح ان دو ایگزیکٹو پر، جنھوں نے رقوم ادا کرنے کا اعتراف کیا ہے، بلا رضامندی عطیات ادا کرنے کا الزام لگایا جا سکتا ہے تو مسٹر ہیک پرائنڈ (کوکس کے سٹاف) نے جواب دیا: "یہ ایک قانونی سوال ہے، صاف بات ہے کہ یہ میرے لیے بھی پریشانی کا باعث ہے۔"

جیرالڈ کی صدارت میں بھی امریکی پالیسی کے لیے تسلسل کو قائم رکھا گیا۔ اس نے سائیگون حکومت کو امداد دینے کی نکسن پالیسی کو قائم رکھا، جو کہ ابھی تک یہ امید رکھے ہوئے تھا کہ "تھیو" حکومت مستحکم رہے گی۔ لیکن 1975ء کے موسم بہار میں ہر وہ بات جو ویت نام کی امریکی پالیسی کے انقلابی ناقدین کہہ رہے تھے، کہ امریکی فوجیوں کی عدم موجودگی میں سائیگون حکومت کو حاصل عوامی حمایت کا پول کھل جائے گا، درست ثابت ہو گیا۔

1973ء کے امن معاہدے کے تحت جنوب میں رہ جانے والے شمالی ویت نام کے فوجیوں نے حملہ کر کے ایک شہر کے بعد دوسرے شہر پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور 29 اپریل 1979ء کو شمالی ویت نامی سائیگون میں داخل ہو گئے اور ویت نام جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

اسٹیبلشمنٹ کی اکثریت پہلے ہی (باوجود فورڈ اور چند باعزم افراد کے) ویت نام کو ترک کر چکی تھی۔ انہیں اب سمندر پار دوسری فوجی کارروائیوں میں امریکی عوام کی آمادگی کی فکر لاحق تھی۔ ویت نام میں شکست سے پہلے کے مہینوں میں پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ 1975ء کے شروع میں "آئیوا" کے سینیٹر "جان سی کلور" اس بات پر ناخوش تھا کہ امریکی کوریا کے لیے نہیں لڑیں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ ویت نام امریکی عوام کے قومی عزم کو بری طرح متزلزل کر چکا ہے۔

مارچ 1975ء میں ایک کیتھولک تنظیم نے استفسار حمل پر امریکیوں کے رویوں کا سروے کرتے ہوئے چند اور حقائق سے بھی پردہ اٹھایا۔ اس بیان پر کہ "اس ملک کو چلانے والے لوگ (حکومت، سیاسی، مذہبی اور عوامی لیڈر) ہمیں سچ نہیں بتاتے۔" 83 فی صد سے زیادہ لوگ متفق تھے۔

نیویارک ٹائمز کے بین الاقوامی نامہ نگار "سی ایل سلوبرجر" جو کہ حکومت کی سرد جنگ کی خارجہ پالیسی کا بہت بڑا حمایتی تھا نے لکھا: "جس طرح ان دنوں میں ہم نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے اس میں کوئی سنجیدہ غلطی ہے۔" سلوبرجر کے مطابق اصل مسئلہ امریکہ کا طرز عمل نہیں بلکہ اپنے طرز عمل کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا انداز ہے۔

اپریل 1975ء میں ہنری کیسنجر کو مشی گن یونیورسٹی میں جلسہ تقسیم اسناد پر خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا گیا، لیکن کیسنجر کے ویت نام میں کردار پر اسے اس دعوت پر احتجاجی عرضداشتوں کا سامنا کرنا

پڑا۔ جلسہ تقسیم اسناد کے خلاف ایک پروگرام کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا۔ وہ وہاں جانے سے رک گیا۔

انتظامیہ کے لیے یہ ایک برا وقت تھا۔ ویت نام میں شکست ہو گئی تھی (اور اسے امریکہ کی شکست خیال کیا جا رہا تھا) اور اس حوالے سے واشنگٹن پوسٹ کے کالم نگار "ٹائم براؤن" نے کیسنجر کا ایک بیان شائع کیا تھا: "امریکہ کو دنیا میں کسی نہ کسی جگہ کوئی کارروائی ضرور کرنا ہو گی جس سے ثابت ہو سکے کہ وہ اب بھی ایک عالمی طاقت ہے۔"

اگلے ماہ "مایا گویز" کا حادثہ پیش آ گیا۔

"مایا گویز" ایک امریکہ کا مال بردار بحری جہاز تھا جو کہ مئی 1925ء میں ویت نام میں انقلابی افواج کی فتح کے محض تین ہفتے بعد ویت نام سے تھائی لینڈ جا رہا تھا۔ جب یہ کمبوڈیا میں ایک جزیرے کے قریب پہنچا، جہاں انقلابی حکومت نے ابھی اقتدار سنبھالا ہی تھا، کمبوڈین نے جہاز کو روک لیا اور ایک نزدیکی جزیرے کی بندرگاہ پر لے گئے اور سارے عملے کو اتار لیا۔ عملے نے بعد میں بتایا کہ اس کے ساتھ بہت شائستگی کا سلوک کیا گیا۔

صدر فورڈ نے کمبوڈین حکومت کو جہاز اور عملہ چھوڑنے کا پیغام بھیجا، لیکن جب چھتیس گھنٹے گزر گئے اور کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس نے فوجی کارروائی کا آغاز کر دیا امریکہ کے ہوائی جہازوں نے کمبوڈیا کے بحری جہازوں پر بمباری کی، انہوں نے اس کشتی پر بھی گولیاں برسائیں جو عملے کو لے کر کمبوڈیا جا رہی تھی۔

عملے کو پیر کی صبح پکڑا گیا تھا۔ بدھ کی شام کو انہیں آزاد کر دیا گیا، انہیں ماہی گیری کی کشتیوں میں لاد کر بحری جہاز تک پہنچایا گیا۔ اس سہ پہر کو یہ علم ہونے پر کہ عملے کو "تانگ" جزیرے پر سے نکال دیا ہے، فورڈ نے پھر بھی "تانگ" جزیرے پر نیوی کے حملے کا حکم دے دیا۔

نیوی کو غیر متوقع شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور دو سو حملہ آوروں میں سے ایک تہائی فوراً ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ حملہ آور فوج کے گیارہ میں سے پانچ ہیلی کاپٹر اڑا دیے گئے یا ناکارہ بنا دیے گئے۔ 23 امریکی تھائی لینڈ میں ہیلی کاپٹر گرنے سے ہلاک ہو گئے جو کہ کارروائی میں حصہ لینے کے لیے جا رہے تھے، اس بات کو حکومت نے چھپانے کی کوشش کی۔

فورڈ کے حکم سے کی گئی فوجی کارروائی میں اکتالیس امریکی مارے گئے، "مایا گویز" پر اکتالیس افراد تھے۔ بموں اور گولیوں سے حملے میں جلد بازی سے کیوں کام لیا گیا؟ فورڈ نے کمبوڈیا کے بڑے جزیرے پر امریکی ہوائی جہازوں کو بمباری کا حکم کیوں دیا؟ جس میں نامعلوم تعداد میں کمبوڈین مارے گئے جبکہ جہاز اور عملے کو آزاد کر دیا گیا تھا۔

اس کا جواب جلد ہی مل گیا: یہ ضروری تھا کہ دنیا کو دکھایا جائے کہ چھوٹے سے ویت نام سے

شکست کھانے والا عظیم امریکہ اب بھی طاقتور اور پرعزم ہے۔ 16 مئی 1975ء کو "نیویارک ٹائمز" نے لکھا:

انتظامیہ کے آفیسر بشمول وزیر خارجہ ہنری کیسنجر اور وزیر دفاع "جیمز شلسنگر" صدر فورڈ کے عالمی سطح پر اپنی لیڈر شپ قائم رکھنے کے پختہ عزم کو عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے بہت بیتاب تھے۔ انہیں جہاز پر قبضہ کی صورت میں ایک اچھا موقعہ میسر آ گیا جس سے انتظامیہ نے واضح طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

لیکن کیا وجہ تھی کہ "ٹائمز" کے باوقار کالم نگار جیمز ریسٹن نے جو کہ نکسن اور واٹر گیٹ سکینڈل کا شدید نکتہ چین تھا، مایا گویز کارروائی کو خوش انجام اور کامیاب قرار دیا ہے اور "نیویارک ٹائمز" نے جو ویت نام کی جنگ کے شدید ناقدین میں سے تھا اس کارروائی کو "قابل تعریف کارکردگی" گردانا؟

یوں نظر آتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ (ری پبلکنز، ڈیموکریٹس، اخبارات، ٹیلی ویژن) اس خیال پر کہ دنیا میں ہر جگہ امریکی تسلط قائم ہونا چاہیے فورڈ اور کیسنجر کے ساتھ پوری طرح متحد تھی۔

اس موقعے پر کانگریس نے اُسی بھیڑوں کے ریوڑ جیسے روّیے کا مظاہرہ کیا جس کا مظاہرہ وہ ویت نام جنگ کے ابتدائی دنوں میں کر چکی تھی۔ 1973ء میں ویت نام جنگ پر غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کانگریس نے "وار پاور ایکٹ" پاس کیا تھا جس کے تحت صدر کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ کسی بھی فوجی کارروائی سے پہلے وہ کانگریس سے مشورہ کرنے کا پابند ہوگا۔ "مایا گویز" کے معاملے میں فورڈ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس نے اپنے بہت سے ایڈز کو 18 کانگریس ممبران کو فون کے ذریعے اطلاع دینے کو کہا کہ فوجی کارروائی کی جا رہی ہے۔ صرف چند ایک کانگریسی ممبران نے احتجاج کیا۔

یہ استحکام کا ایک پیچیدہ عمل تھا جو سسٹم نے 1975ء میں اختیار کیا۔ اس میں دنیا میں اور ملک کے اندر اپنا اختیار منوانے کے لیے "مایا گویز" جیسی پرانی قسم کی فوجی کارروائیاں شامل تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ناامید اور مایوس عوام کو اطمینان دلانے کی ضرورت بھی تھی کہ سسٹم اپنے آپ پر نکتہ چینی اور اپنی درستی کر رہا ہے۔ اس کا بہترین طریقہ ایسی کھلم کھلا تحقیقات کرنا تھا جس میں مخصوص مجرموں کی نشاندہی ہو جائے لیکن سسٹم کو جوں کا توں چلنے دے۔ واٹر گیٹ نے ایف بی آئی اور سی آئی کے تاثر کو بہت زیادہ مسخ کر دیا تھا جو کہ نقب زنی کی وارداتوں میں اور غیر قانونی فون ٹیپنگ میں نکسن کی مدد کرتے ہوئے ان قوانین کو پامال کر رہے تھے جن کی حفاظت کا انہوں نے حلف اٹھا رکھا تھا۔ 1975ء میں ایوان کے اندر کانگریس کی کمیٹیوں اور سینیٹ نے ایف بی آئی اور سی آئی اے کے بارے میں تحقیقات کا آغاز کیا۔

سی آئی اے کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ خفیہ اطلاعات اکٹھی کرنے کے اپنے مشن سے آگے نکل کر ہر قسم کی خفیہ کارروائیاں انجام دے رہا تھا۔ مثال کے طور پر اس نے 1950ء کے عشرے میں ایک ڈرگ ایل ایس ڈی کے اثرات کا تجربہ کرنے کے لیے معصوم اور بے خبر امریکیوں کو تختہ

مشق بنایا، ایک امریکی سائنسدان نے، جس کو ایک سی آئی اے کے ایجنٹ نے ایل ایس ڈی کی ایک خوراک کھلا دی تھی، نیویارک کے ہوٹل کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اپنی جان گنوا دی تھی۔

سی آئی اے کیوبا کے کاسترو اور دوسرے سربراہان مملکت کے قتل کے منصوبوں میں بھی ملوث رہی تھی۔ اس نے 1971ء میں کیوبا میں افریقن سوائن فیور کے وائرس متعارف کروائے اور بیماری پھیلا کر پانچ لاکھ پالتو سوروؤں کو ہلاک کروا دیا۔ سی آئی اے کے ایک کارکن نے ایک رپورٹر کو بتایا کہ اس نے یہ وائرس کنال زون کے ایک فوجی اڈے سے کاسترو دشمن کیوبنز کو فراہم کیے۔

تحقیقات سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ سی آئی اے نے ایک خفیہ "کمیٹی آف فورٹی" جس کی قیادت ہنری کیسنجر کے پاس تھی کے ساتھ مل کر چلی میں ایک مارکسسٹ "سلواڈور ایلنڈی" کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی جو کہ لاطینی امریکہ میں شاذ ہی ہونے والے آزادانہ انتخابات میں صدر منتخب ہوا تھا۔ آئی ٹی ٹی نے، جس کے کیوبا میں بڑے مفادات وابستہ تھے، اس کارروائی میں مؤثر کردار ادا کیا تھا۔

ایف بی آئی کے بارے میں تحقیقات سے انکشاف ہوا کہ وہ کئی سالوں تک انقلابی گروپس اور بائیں بازو کے گروپس کو ختم کرنے اور انتباہ کرنے کے لیے غیر قانونی کارروائیوں میں مصروف رہا ہے۔ ایف بی آئی نے جعلی خطوط ارسال کیے، غیر قانونی طور پر خطوط کو کھولا، نقب زنیوں میں مصروف رہا (اس نے 1960ء اور 1966ء کے درمیان بانوے نقب زنیوں کو تسلیم کیا) اور بلیک پنتھر لیڈر "فریڈ ہمپٹن" کے کیس میں قتل کی سازش میں بھی شریک نظر آتا تھا۔

تحقیقات سے بہت اہم معلومات حاصل ہوئیں، لیکن انہیں نہ تو پریس میں پوری طرح سامنے آنے دیا گیا، ٹیلی ویژن پر بہت کم پیش کیا گیا اور رپورٹ کی ضخیم کتابوں تک محدود رکھا گیا، جن کے قارئین کی تعداد بہت محدود تھی، اصل مقصد محض یہ ثابت کرنا تھا یا تاثر پیدا کرنا تھا کہ ایک دیانتدار معاشرہ اپنی اصلاح کر رہا ہے۔

خود تحقیقات کا طریقہ کار ایسی سرگرمیوں کی چھان بین کرنے میں حکومتی رضامندی کی حدود کو ظاہر کرتا ہے۔ سینیٹ کی قائم کردہ "چرچ کمیٹی" نے سی آئی اے کے بارے میں اپنی تحقیقی رپورٹ پہلے سی آئی اے کو بھجوائی تاکہ ایجنسی اپنی منشاء کے مطابق اگر چاہے تو اس کے کچھ حصے حذف کر سکے۔

ایوان نمائندگان میں قائم کی گئی "پائیک کمیٹی" نے سی آئی اے یا ایف بی آئی کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ نہیں کیا تھا اور جب اس نے اپنی حتمی رپورٹ جاری کی تو اسی ایوان نے جس نے اسے تحقیقات کے اختیارات دیئے تھے اسے خفیہ رکھنے کی حمایت میں ووٹ دیا۔ جب یہ رپورٹ سی بی ایس کے نیوز کاسٹر "ڈینیل سکور" کے ذریعے نیویارک میں "ویلج وائس" کو پہنچ گئی تو اسے "ٹائمز" دی واشنگٹن پوسٹ" یا دوسری اہم قومی اخبارات میں کبھی شائع نہ کیا گیا۔ "سکور" کو "سی بی ایس" سے نکال دیا گیا۔ یہ

حکومت اور میڈیا کے درمیان "قومی سیکورٹی" کے معاملات میں تعاون کی ایک اور مثال تھی۔

چرچ کمیٹی نے خفیہ طور پر امریکیوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہونے کے لیے "سی آئی اے" کی کارروائیوں کا انکشاف بھی کیا:

"سی آئی اے اب امریکی اکیڈیمکس (یونیورسٹیوں اور کالجوں کے فیکلٹی ممبران، پڑھانے میں مصروف گریجوایٹس طلباء) کو استعمال کر رہی ہے، جو کہ خفیہ مقاصد کے حصول کے لیے تبصرے اور مقالے لکھنے کے علاوہ کتابیں اور دیگر مواد تحریر کرتے ہیں جو بیرون ملک پروپیگنڈا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ "اکیڈیمکس" امریکہ کے سو سے زائد کالجوں، یونیورسٹیوں اور متعلقہ اداروں میں کام کر رہے ہیں۔" کمیٹی کو علم ہوا کہ 1967ء کے اختتام سے پہلے ایک ہزار سے زائد کتابوں کو سی آئی اے نے سپانسر کیا تھا، یا سبسڈیز دی تھیں۔

نکسن کا استعفیٰ، فورڈ کی جانشینی، ایف بی آئی اور سی آئی اے کے بُرے کاموں کا انکشاف، ان تمام کا مقصد امریکی عوام کے بُری طرح مجروح اعتماد کو بحال کرنا تھا۔ تاہم ان تمام تر سخت اقدامات کے باوجود امریکی عوام میں پھر بھی حکومتی، فوجی اور کاروباری لیڈروں کے بارے میں شک و شبہات حتیٰ کہ دشمنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

اس جولائی میں "لاؤ ہیرس" پول نے، جو 1966ء سے 1975ء تک حکومت پر عوامی اعتماد کا جائزہ لے رہا تھا، رپورٹ پیش کی کہ اس عرصہ کے دوران فوج پر اعتماد 62 سے گر کر 29 فی صد، کاروباری افراد پر سے 55 فی صد سے گر کر 18 فی صد، صدر اور کانگریس دونوں پر اعتماد 42 فی صد سے گر کر 13 فی صد رہ گیا ہے۔

عمومی بے اطمینانی کی ایک بڑی وجہ اکثر امریکیوں کی معاشی حالت بھی ہو سکتی تھی۔ 1973ء سے افراط زر اور بے روزگاری میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا تھا۔ 1975ء کے موسم خزاں میں نیویارک ٹائمز کے 1,559 افراد کے سروے اور بارہ شہروں میں ساٹھ خاندانوں کے انٹرویوز سے پتہ چلا کہ لوگوں میں مستقبل کے بارے میں خوش امیدی میں اچھی خاصی کمی آئی ہے، سروے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ بڑی آمدنیوں والے لوگ بھی مستقبل کے بارے میں اتنے پر امید نہیں ہیں جتنے ماضی میں تھے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بے اطمینانی نیچے والے طبقے سے اوپر والے طبقوں میں سرایت کر رہی تھی۔

حکومت کے پیش کردہ اعداد و شمار سے اس کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ بے روزگاری کی شرح جو 1974ء میں 5.6 فی صد تھی 1975ء میں 8.3 فی صد ہو چکی تھی، اور ان لوگوں کی تعداد جو اپنی بے روزگاری کی مراعات ساری کی ساری استعمال کر چکے تھے ان کی تعداد 1974ء میں دو ملین سے بڑھ کر 1974ء میں 403 ملین ہو گئی تھی۔

1976ء کے سال میں جب صدارتی انتخابات قریب آ رہے تھے اسٹیبلشمنٹ میں سسٹم پر عوامی اعتماد کے بارے میں تشویش پائی جاتی تھی۔ "ولیم سائمن" جو کہ نکسن اور فورڈ دونوں کا وزیر خزانہ تھا (اس سے پہلے وہ ایک ساہوکار بینکر تھا جو کہ 2 ملین سالانہ سے زیادہ کما رہا تھا) نے ورجینیا کے شہر "ہاٹ سپرنگ" میں بزنس کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "ویت نام، واٹر گیٹ، طلبا کی بے چینی، تبدیل ہوتے ہوئے اخلاقی ضابطے، بدترین سرد بازاری، اور بے شمار دوسرے شدید تہذیبی صدمات سب نے مل جل کر شکوک و شبہات کی ایک نئی فضا پیدا کر دی ہے...... اس سب نے مل کر عمومی بے اطمینانی، اور پورے معاشرے میں اداراتی بداعتمادی کے بحران میں اضافہ کیا ہے۔" سائمن کئی دفعہ کہہ چکا تھا "امریکیوں کو منافع کے لفظ سے ہی اور منافع کے محرکات سے جو کہ ہماری خوشحالی کو ممکن بناتے ہیں پر بداعتمادی کا سبق پڑھایا گیا ہے، کسی نہ کسی طور پر وہ اس نظام کو، جس نے انسانی مصائب اور مفلوک الحالی میں اضافہ کیا مضحکہ خیز، خود غرضی پر مبنی اور غیر اخلاقی خیال کرتے ہیں۔" سائمن کا کہنا تھا: "ضروری ہے کہ ہم سرمایہ داری نظام کے انسانی پہلو کو متعارف کروانے کی کوشش کریں۔"

جب امریکہ 1976ء میں اپنے "اعلان آزادی" کے دو سو سالہ جشن کی تیاری کر رہا تھا، تو جاپان، امریکہ، اور ویسٹرن یورپ کے دانشوروں اور سیاستدانوں کے ایک گروپ نے "ٹرائی لٹرل کمشن" کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ جس نے ایک رپورٹ شائع کی جس کا عنوان تھا "گورنابلٹی آف ڈیموکریسیز"۔

اس رپورٹ کا وہ حصہ جس کا تعلق امریکہ سے تھا ہارورڈ یونیورسٹی میں سیاسیات کے ایک پروفیسر "سموئیل ہن ٹنگٹن" نے تحریر کیا تھا جو کہ ایک لمبے عرصے تک ویت نام کی جنگ پر وائٹ ہاؤس کا مشیر بھی رہا تھا۔ "ہن ٹنگٹن" نے اپنی رپورٹ میں لکھا: "1960ء کے عشرے میں مارچوں، مظاہروں، احتجاجی تحریکوں، کسی نصب العین کی حامی تنظیموں میں عام شہریوں کی شمولیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اور سیاہ فاموں انڈینز، چیکانوس (میکسیکو کے امریکی)، سفید فام نسل پرست گروپس، طلباء اور خواتین میں ایک بلند درجے کی خود آگاہی پیدا ہو رہی تھی، جو کہ سب کے سب متحرک اور نئے انداز میں منظم ہو رہے تھے......" سفید پوشوں کی یونین ازم میں بھی واضح اضافہ ہوا تھا اور ان سب نے مل کر سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی میں برابری کے حصول کو ایک ہدف کی صورت دے دی تھی۔

"ہن ٹنگٹن" نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ساٹھ کے عشرے میں برابری کے پرزور مطالبات نے وفاقی بجٹ کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔ 1960ء میں امور خارجہ پر بجٹ کا 53.7 فی صد خرچ کیا جا رہا تھا اور سماجی اور معاشرتی اخراجات پر بجٹ کا 22.3 خرچ کیا جا رہا تھا۔ 1974ء میں سماجی اور معاشرتی اخراجات میں 31 فی صد تک اضافہ کر دیا گیا تھا۔ دراصل یہ بات عوامی مزاج میں عکاسی کرتی تھی۔ 1960ء

میں صرف 18 فی صد عوام کا یہ کہنا تھا کہ حکومت دفاع پر بہت زیادہ خرچ کر رہی ہے لیکن 1969ء میں ان کی تعداد 52 فی صد ہو گئی تھی۔

ہن ٹنگٹن نے جو کچھ دیکھا تھا اس پر پریشان تھا:

> 1960ء کے عشرے میں جنم لینے والی جمہوری لہر اقتدار کے موجودہ سرکاری اور نجی نظاموں کے لیے ایک چیلنج تھی۔ یہ چیلنج کسی نہ کسی صورت میں خاندان، تعلیمی اداروں، کاروبار، سرکاری اور نجی ایسوسی ایشنز، سیاست، حکومتی بیوروکریسی اور فوجی ملازمتوں میں واضح طور پر نظر آتا تھا۔ لوگ ان لوگوں کی جن کو وہ ماضی میں عمر، رتبے، حیثیت، مہارت، کردار یا صلاحیتوں میں ارفع خیال کرتے تھے، تابعداری کرنا اب اتنا ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔

اس کے کہنے کے مطابق یہ تمام عناصر "1970ء کے عشرے میں جمہوریت کی حکمرانی کے لیے مسائل پیدا کر رہے تھے۔"

ہن ٹنگٹن نے مزید کہا کہ صدر کو انتخابات جیتنے کے لیے لوگوں کے ایک وسیع اتحاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ "تاہم اپنے انتخاب کے دوسرے دن جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس کی معاشرے اور حکومت میں کلیدی اداروں کے لیڈران کی حمایت حاصل کرنے کی صلاحیت ہے.... اس اتحاد میں کانگرس، ایگزیکٹو برانچ، اور نجی شعبے "اسٹیبلشمنٹ" کے کلیدی افراد کا شامل ہونا ضروری ہے۔" اس نے اس کی مثالیں بھی دیں۔

> ٹرومین نے اپنی انتظامیہ میں غیر وابستہ فوجیوں، ری پبلکن بینکاروں اور وال سٹریٹ کے وکلاء کو شامل کرنے کی طرف خاص دھیان دیا۔ ملک پر حکومت کرنے کے لیے ضروری مدد کے لیے اس نے ملک میں موجود اقتدار کے سرچشموں کو استعمال کیا۔ آئزن ہاور کو کسی حد تک یہ اتحاد ورثے میں ملا اور کسی حد تک یہی اتحاد اس کو اقتدار میں لانے والا بھی تھا.... کینیڈی نے بھی کسی حد تک اس طرح کے اتحاد دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ہن ٹنگٹن کو جس چیز نے پریشان کیا۔ وہ حکومت کی عملداری میں کمی واقع ہونا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ "جمہوریت کو ضرورت سے زیادہ جگہ دی جا رہی تھی۔ اس کا مشورہ یہ تھا کہ "جمہوریت کو قابل قبول حدود کے اندر رکھا جائے۔"

ہن ٹنگٹن یہ تمام باتیں ایک ایسی تنظیم کو رپورٹ کر رہا تھا جو امریکہ کے مستقبل کے لیے بہت اہم تھی۔ "دا ٹرائی لٹرل کمشن" 1973ء کے آغاز میں ڈیوڈ راک فیلر اور "بگ نیو بریزنسکی" نے تشکیل دی تھی۔ راک فیلر "چیس مین ہٹن بنک کا ایک آفیشل اور امریکہ اور دنیا کا ایک طاقتور ساہوکار تھا۔

بریزنسکی، بین الاقوامی تعلقات کا ماہر کولمبیا یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اور محکمہ خارجہ کا مشیر تھا۔

"ٹرائی لٹرل کمشن" ہمہ گیر کمیونزم کی نسبت سہ براعظمی سرمایہ داری کو درپیش زیادہ پیچیدہ خطرات (تیسری دنیا کی انقلابی تحریکیں) سے نمٹنے کے لیے جاپان، مغربی یورپ اور امریکہ کے درمیان زیادہ بڑا اتحاد پیدا کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ تیسری دنیا کی ان انقلابی تحریکوں کے اپنے فکری اور عملی رجحانات تھے۔

"ٹرائی لٹرل کمشن" ایک دوسری صورت حال سے بھی نمٹنا چاہتا تھا، وہ یہ کہ اب کاروباری قومی حدود کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ 1960ء میں امریکہ کے آٹھ بنکوں کی بیرون ملک شاخیں تھیں۔ 1974ء میں ان کی تعداد 129 ہو گئی تھی۔ ان سمندر پار برانچوں کے اثاثے 1960ء میں 3.5 بلین ڈالر تک تھے جو کہ 1974ء میں 155 بلین ہو چکے تھے۔ "ٹرائی لٹرل کمشن" ظاہری طور پر نئی بین الاقوامی معیشت کے لیے مناسب بین الاقوامی رابطے پیدا کرنے کے لیے مدد فراہم کر رہا تھا۔

1976ء صرف صدارتی انتخابات کا سال ہی نہیں تھا بلکہ یہ دوسو سالہ جشن کا تہوار بھی تھا، یعنی "اعلان آزادی" کو دوسو سال گزر چکے تھے۔ اس کو جوش و خروش سے منانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو امریکی حب الوطنی کے جذبے کو بحال کرنے کا ایک ذریعہ خیال کیا جا رہا تھا۔ حکومت اور عوام کو متحد کرنے اور حالیہ ماضی کے احتجاجی مزاج کے خاتمے کے لیے تاریخ سے مدد لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

لیکن اس کے لیے کسی بڑے جوش و جذبے کا اظہار دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا۔ جب "بوسٹن ٹی پارٹی" کی دوسو سالہ سالگرہ منائی جا رہی تھی تو عوام کا ایک بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا، لیکن یہ سرکاری تقریب میں شامل ہونے کے لیے نہیں پہنچا تھا بلکہ یہ اس کے مقابلے میں ایک علیحدہ عوامی تقریب کا حصہ تھا، جہاں "گلف آئل" اور "Exxon" کے لیبلوں والے پیکٹ بوسٹن کی بندرگاہ میں پھینکے گئے جو کہ امریکہ میں کارپوریٹ اقتدار کے خلاف ایک عوامی احتجاج تھا۔

کارٹر، ریگن، بش، دوحزبی اتفاق رائے

بیسویں صدی کے وسط میں "رچرڈ ہافسٹر" جو کہ ایک تاریخ دان ہے نے اپنی کتاب "دی امریکن پولیٹیکل ٹریڈیشن" میں ہمارے اہم قومی لیڈروں جیفرسن اور جیکسن سے ہربرٹ ہوور اور دونوں روز ویلٹوں (ری پبلکن اور ڈیموکریٹ، لبرل اور کنزرویٹو) تک کا جائزہ لیا ہے۔ ہافسٹر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہماری اہم سیاسی پارٹیوں کی بصارت کو جائداد اور کاروباری اداروں نے محدود کر رکھا ہے۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ کلچر کی معاشی خوبیوں کو قبول کیا ہوا ہے۔ یہ کلچر بڑی شدت سے قوم پرستانہ ہے۔"

صدی کے اختتام کی جانب بڑھتے ہوئے، اس کے آخری پچیس سالوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے، ہماری آج بھی بالکل ویسی ہی محدود بصارت ہے، انتہائی غربت کے ساتھ ساتھ بے شمار دولت سمیٹنے کی سرمایہ دارانہ حوصلہ افزائی، جنگ کی قوم پرستانہ پذیرائی، اور جنگ کے لیے تیاری۔ حکومتی اقتدار ری پبلکن سے ڈیموکریٹ اور پھر واپس ڈیموکریٹ اور ری پبلکن کے درمیان جھولتا رہتا ہے، لیکن کوئی پارٹی بھی اس بصیرت سے آگے جانے کی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کر سکی۔

ویت نام کی تباہ کن جنگ کے بعد واٹر گیٹ کے سیکنڈلز سامنے آئے۔ زیادہ تر آبادی ماحولیاتی تباہی کے ساتھ ساتھ شدید معاشی عدم تحفظ کا اور بڑھتے ہوئے تشدد کے کلچر اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے بنیادی مسائل کا حل معاشرتی اور معاشی ڈھانچے میں تبدیل لائے بغیر ممکن نہیں تھا۔ لیکن کسی بھی بڑی پارٹی کا امیدوار ایسی تبدیلیوں کی تجویز پیش نہیں کرتا تھا۔ "امریکی سیاسی روایت" کو سختی سے قائم رکھا گیا تھا۔

اس احساس کے تحت، یا شاید اس کے مبہم سے شعور کے ساتھ ووٹروں کی ایک بڑی تعداد رائے دہی سے دور رہی، یا پھر بغیر کسی جذبے کے بے دلی سے ووٹ ڈالتے رہے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ، خواہ عدم شمولیت کے ذریعے ہی سہی، سیاسی عمل سے اپنی بیگانگی کا اظہار کیا۔ 1960ء میں ووٹ دینے کے اہل افراد میں سے صرف 63 فی صد نے صدارتی انتخاب میں ووٹ ڈالے۔ 1976ء میں یہ تعداد کم ہو کر 53 فی صد ہو گئی۔ سی بی ایس اور نیو یارک ٹائمز کے ایک سروے میں آدھے افراد نے کہا کہ حکومتی آفیسران جیسے

لوگوں کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

انتخابی سیاست پریس اور ٹیلی ویژنوں پر چھائی رہی، اور صدروں، کانگریس کے ممبروں، سپریم کورٹ کے جسٹسوں اور دوسرے حکومتی اہلکاروں کے کاموں اور مصروفیتوں کو یوں بیان کیا جاتا رہا گویا یہ قوم کی تاریخ تشکیل دے رہے ہوں۔ شک وشبہ میں مبتلا عوام کو یہ باور کروایا جاتا رہا کہ یہی سب کچھ ہے اور انہیں اپنی مستقبل کی تمام امیدوں کو واشنگٹن کے سیاستدانوں سے وابستہ رکھنا چاہیے۔

سیاست سے اور سیاست پر دانشمندانہ بحثوں سے مایوس اور بیزار شہریوں نے اپنی توجہ تفریحات، گپ شپ یا اپنی مدد آپ کی ہزاروں سکیموں کی جانب مبذول کر لی تھی (یا ان کی توجہ کا رخ اس جانب موڑ دیا گیا تھا)، جو لوگ یہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے انہوں نے تشدد کا راستہ اپنا لیا، اور اپنے اندر (جیسا کہ غریب سیاہ فاموں کا غریب سیاہ فاموں پر تشدد)، یا دوسری نسلوں میں، تو آباد کاروں میں، غیر ملکیوں ویلفیئر پر گزر بسر کرنے والی ماؤں میں، چھوٹے مجرموں میں (پہنچ سے دور بڑے مجرموں کی جگہ پر) قربانی کے بکرے تلاش کر لیے۔

لیکن شہریوں کا ایک دوسرا طبقہ بھی موجود تھا جو 60 کے عشرے اور 70 کے عشرے کے اوائل کے سالوں میں پائے جانے والے خیالات اور نظریات سے وابستہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا میڈیا میں ذکر نہیں ہوتا تھا اور سیاستدان بھی ان کو نظر انداز کیے ہوئے تھے، اور یہ پورے ملک میں بڑی تندہی سے ہزاروں مقامی گروپس کی صورت میں سرگرم عمل تھے۔ یہ منظم گروپس، ماحولیات کے تحفظ یا خواتین کے حقوق یا حفظان صحت (خاص طور پر "ایڈز" سے بچاؤ) یا بے گھر افراد کے لیے رہائش یا فوجی اخراجات کے خلاف پر اثر مہم چلا رہے تھے۔

ان سرگرمیوں کی نوعیت 60 کے عشرے کی تحریکوں جیسی نہیں تھی جب نسلی افتراق اور جنگ کے خلاف احتجاج کی لہر ایک طاقتور قومی تحریک کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یہ ایک مشکل اور کٹھن جدوجہد تھی۔ یہ ظالم اور بے حس سیاسی لیڈروں کے خلاف امریکی عوام کو متحد اور منظم کرنے کی کوشش تھیں جن کی اکثریت ووٹنگ کی سیاست اور احتجاجی سیاست سے کسی نتیجہ خیز نتائج کی امید نہیں رکھتے تھے۔

ایسا نظر آتا تھا کہ جمی کارٹر کی صدارت کے دوران 1977ء سے 1980ء کے سالوں میں اسٹیبلشمنٹ کے ایک حصے نے حکومت سے مایوس اور بددل افراد کے اعتماد کو بحال کرنے کی کوششیں کی تھی۔ لیکن کارٹر نے بعض مواقعوں پر سیاہ فاموں اور غریب عوام کے ساتھ خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کرنے اور بیرون ملک "انسانی حقوق" کی باتیں کرنے کے باوجود، کارپوریٹ دولت کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے بہت بڑی فوجی مشینری کو برقرار رکھتے ہوئے، اور بیرون ملک دائیں بازو کی قوتوں کے ظلم وستم کی حمایت کرتے ہوئے، اپنے آپ کو امریکہ کی تاریخی سیاسی حدود کے اندر ہی رکھا۔

وہ عوامی پسندیدگی کا حامل تھا، یعنی امریکی معاشرے کے مختلف عناصر جو اپنے آپ کو طاقتور اور دولت مند طبقات میں گھرا ہوا خیال کرتے تھے، اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر چہ وہ ایک کروڑوں پتی مونگ پھلی کا کاشت کار تھا، اپنے آپ کو ایک معمولی امریکی کسان کے طور پر پیش کرتا تھا۔ اگر چہ وہ اپنے دور صدارت کے اختتام تک ویت نام جنگ کا شدید حامی تھا، وہ اپنے آپ کو ان لوگوں کا ہمدرد ظاہر کرتا تھا جو جنگ کے مخالف تھے۔ اور وہ (۶۰) کے عشرے کے نوجوان باغیوں میں بھی فوجی بجٹ میں کمی کرنے کے وعدے کی وجہ سے ہردلعزیز تھا۔

وکلا سے اپنے ایک مشہور خطاب میں کارٹر نے امراء کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے قانون کے استعمال پر شدید برہمی کا اظہار کیا۔ اس نے ایک سیاہ فام خاتون ''پٹریشا ہیرس'' کو ''ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈویلپمنٹ'' کا سیکرٹری اور انسانی حقوق کے ایک سیاہ فام علمبردار ''اینڈریو ینگ'' کو اقوام متحدہ کا ایمبیڈر مقرر کیا۔ اس نے ''ڈومیسٹک یوتھ سروس کارپس'' کی سربراہی کا کام ایک جنگ مخالف سرگرم کارکن ''سام براؤن'' کو سونپا۔

تاہم اس کی انتہائی فیصلہ کن تقرریاں ہارورڈ کے سیاسی دانشور سموئیل ہن ٹنگٹن کی ''ٹرائی لٹرل کمشن'' رپورٹ کی روشنی میں تھیں، جس میں کہا گیا تھا کہ ''خواہ جن بھی طبقات یا گروپس نے صدر کے لیے ووٹ دیئے ہوں، منتخب ہونے کے بعد جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس کی کلیدی اداروں کے سربراہان کی حمایت حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔'' سرد جنگ کا ایک روایتی دانشور ''بریزنسکی'' کارٹر کا نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر مقرر ہوا۔ اس کے وزیر دفاع ''ہیرالڈ براؤن'' نے ''پینٹاگون پیپرز'' کے مطابق ویت نام جنگ کے دوران ان تمام حد بندیوں کے خاتمے کے جواز تلاش کرنا شروع کر دیئے جن کے اندر رہتے ہوئے بمباری کی جا رہی تھی۔

اس کی کابینہ کے دوسرے عہدیداروں کے مضبوط کارپوریٹ تعلقات تھے۔ کارٹر کے انتخاب کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک مالیاتی کالم نگار نے لکھا ''ابھی تک کارٹر کے افعال، بیانات اور خاص طور پر اس کی کابینہ کی تقرریاں، کاروباری طبقے کے لیے بہت زیادہ امید افزا ہیں۔ واشنگٹن کے ایک تجربہ کار نامہ نگار ''ٹام وکر'' نے لکھا: ''ابھی تک کارٹر جو کچھ کر رہا ہے اس کا مقصد وال سٹریٹ کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔''

کارٹر نے ان حکومتوں کے ساتھ جو خود اپنی عوام کو دبا کر رکھے ہوئے تھیں، ایک زیادہ پیچیدہ پالیسی کا آغاز کیا۔ اس نے اقوام متحدہ کے ایمبیسڈر اینڈریو ینگ کو افریقہ کی سیاہ فام قوموں میں امریکہ کے لیے خیر۔سگالی کے جذبات پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ جنوبی افریقہ سیاہ فاموں کے بارے میں اپنی پالیسیوں کو آزادانہ بنائے۔ جنگی حکمت عملی کے تحت جنوبی افریقہ میں ایک

پرامن تصفیہ ضروری تھا، ساؤتھ افریقہ کو ''رڈ اور ٹریکنگ'' سسٹم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور یہ یہاں امریکی کارپوریٹ نے کثیر سرمایہ کاری کر رکھی تھی اور مطلوبہ خام مال کا (خاص طور پر ہیرے) ایک اہم ذریعہ تھا۔ لہٰذا امریکہ کو جنوبی افریقہ میں ایک مستحکم حکومت کی ضرورت تھی جبکہ سیاہ فاموں پر مسلسل جبر و استبداد خانہ جنگی کا موجب بن سکتا تھا۔

کارٹر کے زیر قیادت امریکہ نے پوری دنیا میں ایسی حکومتوں کی مدد جاری رکھی جو اپنے مخالفین کو قید کرنے، تشدد کرنے اور قتل عام جیسے افعال میں معروف تھیں۔ ان میں فلپائن، ایران، نکاراگوا اور انڈونیشیا جیسے ممالک شامل تھے جہاں مشرقی تیمور کے باشندوں کو باقاعدہ ایک نسل کشی کی مہم کے تحت ختم کیا جا رہا تھا۔

کارٹر اپنے آپ کو جنگ مخالف تحریک کے ہمدردوں کے طور پر پیش کرتا تھا، لیکن جب نکسن نے 1973ء کے موسم بہار میں ''ہائی فونگ'' بندرگاہ کے واقعہ سے برہم ہو کر شمالی ویت نام پر بمباری دوبارہ شروع کر دی تو کارٹر نے زور دے کر کہا ''ہم صدر نکسن کو اپنی پوری مدد اور پشت پناہی مہیا کریں گے، خواہ ہم بعض مخصوص فیصلوں سے متفق نہ بھی ہوں۔''

کارٹر منتخب ہو گیا تو اس حقیقت کے باوجود کہ ویت نام کی زمینوں کو امریکی بموں نے تباہ و برباد کیا تھا، اس نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اس بارے میں جب ایک پریس کانفرنس میں سوال کیا گیا، تو کارٹر نے جواب دیا اس کام کے لیے امریکہ پر کوئی مخصوص ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تباہی کا عمل دوطرفہ تھا۔ اگر ہم اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے کہ امریکہ کے بمبار بیڑے اور دو ملین فوج آدھی دنیا کا سفر کاٹ کر یہاں پہنچی، اور آٹھ سال بعد ایک چھوٹی سی قوم کے 10 لاکھ سے زائد افراد کو قتل کر کے اور اس کی زمین کو تباہ و برباد کر کے چلے گئے، یہ بیان حیران کن نظر آتا ہے۔

ویت نام جنگ کے بعد کارٹر کی انتظامیہ نے خوشگوار اور ظاہری طور پر کم جارحانہ خارجہ پالیسیوں پر گامزن ہو کر امریکی عوام کی مایوسی اور بے دلی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اگر ان کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ آزادانہ پالیسیاں اس طور پر تشکیل دی گئی تھیں کہ دنیا میں امریکی فوج کا اثر جوں کا توں رہے اور امریکہ کے کاروباری مفادات پر آنچ نہ آنے پائے۔

مشرقی امریکہ کی ایک چھوٹی سی جمہوریہ پانامہ کے ساتھ پانامہ نہر کے معاہدے پر ازسرنو بات چیت ایک مثال ہے۔ اس نہر سے امریکہ کو ترسیلی اخراجات میں 1.5 بلین سالانہ کی بچت ہوتی تھی اور امریکہ 105 ملین سالانہ ''ٹال ٹیکس'' کے طور پر وصول کرتا تھا جس میں سے پانامہ کو صرف 2.3 ملین ڈالر ادا کرتا تھا اور وہاں اپنے چودہ فوجی اڈے قائم کئے ہوئے تھے۔

1903ء میں امریکہ نے کولمبیا کے خلاف ایک انقلاب کے لیے گٹھ جوڑ کیا اور وسطی امریکہ میں

ایک ہی چھوٹی سی جمہوریہ پانامہ قائم کردی، اور اس پر ایک معاہدہ لاگو کیا جس کے تحت امریکہ کو فوجی اڈے قائم کرنے اور پانامہ نہر کا مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔ کارٹر انتظامیہ نے 1977ء میں پانامہ میں امریکہ دشمن احتجاج کے ردعمل اور اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ پانامہ نہر کی فوجی اہمیت ختم ہو چکی ہے ایک نئے معاہدے کے لیے گفت وشنید کا فیصلہ کیا جس کے مطابق امریکہ وہاں سے اپنے فوجی اڈے بتدریج نکال لے گا۔

کارٹر کی خارجہ پالیسی جیسی بھی پیچیدہ تھی ساٹھ کے عشرے کے آخری حصے اور ستر کے عشرے میں چند بنیادی کام کیے گئے امریکی کارپوریشنیں پوری دنیا میں اس طور پر سرگرم تھیں جس کا اس سے پہلے مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔ ستر کے عشرے کی ابتدا میں بشمول سات سب سے بڑے بنکوں کے تین سو تجارتی ادارے اپنے منافع کا 40 فی صد بیرون ملک سے کمارہے تھے۔ انہیں "ملٹی نیشنلز" کا نام دیا گیا تھا لیکن ان کے 98 فی صد اعلیٰ ترین "ایگزیکٹوز" کا تعلق امریکہ سے تھا۔ ایک گروپ کی حیثیت سے یہ امریکہ اور سوویت یونین کے بعد دنیا کی تیسری سب سے بڑی معیشت تشکیل دیتے تھے۔

ان گلوبل کارپوریشنوں کا غریب ممالک کے ساتھ تعلق لمبے عرصے سے استحصالی رہا تھا جیسا کہ "یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف کامرس" کے اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ میں 1950ء اور 1965ء کے درمیان امریکی کارپوریشنوں نے 8.1 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور 5.5 بلین ڈالر منافع حاصل کیا، اور لاطینی امریکہ میں 3.8 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور 11.2 بلین ڈالر کمائے اور افریقہ میں 5.2 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور 14.3 بلین ڈالر منافع کمایا۔

یہ ایک کلاسیکل سامراجی صورت حال تھی۔ جس میں قدرتی وسائل سے مالا مال علاقوں پر طاقتور اقوام نے زبردستی قبضہ کیا، اور انہوں نے یہ طاقت بھی کمزور ممالک کی لوٹ مار سے حاصل کی تھی۔ امریکی کارپوریشنوں کا ہیروں، کافی، پلاٹینم، پارے، خام ربڑ، اور کوبالٹ کے حصول کے لیے سو فی صد انحصار غریب ممالک پر تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے لیے 98 فی صد مینگانیز اور 90 فی صد کروم اور ایلومینیم باہر سے حاصل کرتی تھیں، اور ان کی 20 سے 40 فی صد درآمدات (پلاٹینم، پارہ، کوبالٹ، کروم، مینگانیز) افریقہ سے آتی تھیں۔

اس کے باوجود امریکہ اپنی دولت کے بارے میں فیاض ہونے کی شہرت رکھتا تھا۔ حقیقت میں وہ قدرتی آفات کی شکار اقوام کی اکثر مدد کرتا رہا تھا، لیکن اس مدد کا انحصار اکثر اوقات سیاسی وفاداریوں پر ہوتا تھا۔ واشنگٹن سے ایک پریس رپورٹ کے مطابق "وزیر خارجہ ہنری کیسنجر نے ان ممالک کی امداد میں کمی کرنے کی پالیسی کا آغاز کیا ہے جو اقوام متحدہ میں امریکہ کی مرضی کے خلاف ووٹ دیتے۔ بعض اوقات ان کٹوتیوں میں خوراک اور انسانی بہبود کے فنڈز بھی شامل ہوتے ہیں۔

زیادہ تر امداد کھلم کھلا فوجی ہوتی تھی، 1975ء امریکہ نے 9.5 بلین ڈالر کا اسلحہ برآمد کیا، کارٹر کی

انتظامیہ نے ظلم واستبداد کرنے والی حکومتوں کو اسلحہ فروخت نہ کرنے کا وعدہ کیا، لیکن جب اس نے اقتدار سنبھال لیا تو اسلحے کی فروخت ویسے ہی بڑے پیمانے پر جاری رہی۔

اور فوج نے قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ لینا جاری رکھا۔ کارٹر کے پہلے بجٹ میں فوج کے لیے 10 بلین ڈالر کا اضافہ کیا گیا۔ اس نے تجویز کیا کہ امریکہ اگلے پانچ سالوں میں اپنی افواج پر ایک ٹریلین ڈالر خرچ کرے گا۔ انتظامیہ نے تھوڑا عرصہ پہلے اعلان کیا تھا کہ محکمہ زراعت سکول کے 1.4 ملین ضرورت مند بچوں کو جو سکولوں میں کھانا کھاتے ہیں، کھانے کے بعد مفت دودھ نہ دیتے ہوئے سالانہ 2.5 بلین ڈالر بچت کرے گا۔

اگر کارٹر کا کام سسٹم پر لوگوں کا اعتماد بحال کرنا تھا، تو یہاں لوگوں کے معاشی مسائل حل کرنے میں اس کی سب سے بڑی ناکامی تھی۔ لوگوں کے معاوضوں میں اضافے کی نسبت خوراک اور دیگر ضروریات زندگی کی قیمتوں میں اضافہ بہت زیادہ تھا۔ آبادی کے بعض کلیدی گروپس (نوجوان لوگوں، خاص طور پر نوجوان سیاہ فام افراد) کے لیے بے روزگاری کی شرح 20 سے 30 فی صد تھی۔

کارٹر نے ان غریب لوگوں کے لیے جن کو اسقاط حمل کی ضرورت تھی وفاقی مدد کی مخالفت کی۔ جب اسے کہا گیا کہ یہ غیر منصفانہ ہوگا، کیونکہ دولت مند خواتین آسانی سے اسقاط حمل کروا سکتی ہیں، اس نے جواب دیا: "ٹھیک ہے، آپ جانتے ہیں زندگی میں کئی چیزیں غیر منصفانہ ہوتی ہیں جن کے دولت مند متحمل ہو سکتے ہیں غریب لوگ نہیں۔"

کارٹر کی "ہردلعزیزی" آئل اور گیس مفادات کے ساتھ اس کے انتظامی تعلقات میں نظر نہیں آتی تھی۔ صارفین کے لیے قدرتی گیس کی قیمتوں کی نگرانی کا خاتمہ کارٹر کے "انرجی پلان" کا حصہ تھا۔ قدرتی گیس پیدا کرنے والا سب سے بڑا ادارہ "ایکسون کارپوریشن" (Exxon Corporation) تھا اور اس کے نجی حصوں کے سب سے بڑے مالک راک فیلر فیملی کے افراد تھے۔

امریکہ میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے بنیادی حقائق کو کارٹر کی پالیسیوں نے گزشتہ حکومتوں کی نسبت خواہ وہ لبرل تھیں یا کنزرویٹو زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ 1977ء میں امریکہ کے 10 فی صد بالائی طبقہ کی آمدنی انتہائی نچلے 10 فی صد طبقہ کی نسبت تیس گنا زیادہ تھی۔ انتہائی بالائی ایک فی صد طبقہ ملک کی 33 فی صد دولت پر قابض تھا۔ امیر ترین 5 فی صد لوگوں کے پاس کارپوریٹ حصص کا 83 فی صد تھا۔

ملک کی سب سے بڑی ایک سو کارپوریشنیں اوسطاً 26.9 فی صد ٹیکس ادا کر رہی تھیں اور بڑی بڑی آئل کمپنیاں ٹیکسوں کی مد میں 5.8 فی صد ادا کر رہی تھیں۔ حقیقت میں 244 افراد جو کہ 200,000 ڈالر سے زیادہ کمارہے تھے کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ کارٹر نے 1978ء میں ٹیکس اصلاحات کی منظوری دی

جو کہ زیادہ تر کارپوریشنوں کے حق میں تھی۔

امریکی اسلحہ بیرون ملک بائیں بازو کے باغیوں کے خلاف لڑنے والی آمرانہ حکومتوں کی مدد کے لیے استعمال کیا جارہا تھا۔ 1980ء کے موسم بہار میں کارٹر نے ایل سلواڈور میں کسان بغاوت کے خلاف لڑنے والی فوجی حکومت کو دینے کے لیے کانگریس سے 5.7 بلین ڈالر ادا کرنے کو کہا۔ فلپائن میں فرڈینیڈ مارکوس حکومت نے 1978ء کے قومی اسمبلی انتخابات کے بعد ہارنے والے ایکس مخالف امیدواروں میں سے دس کو قید کر دیا، بہت سے قیدیوں پر تشدد کیا جارہا تھا، اور بہت سے سویلین مار دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود کارٹر نے مارکوس کو 300 ملین ڈالر کی فوجی امداد دینے کے لیے کانگریس پر زور ڈالا۔

نکاراگوا میں "سموزا" کی آمریت کو کئی عشروں تک قائم رکھنے میں مدد کی۔ حکومت کی بنیادی کمزوریوں اور اس کے خلاف انقلاب کی مقبولیت کا غلط اندازہ لگاتے ہوئے کارٹر انتظامیہ نے 1979ء میں حکومت کے خاتمے تک "سموزا" کی حمایت جاری رکھی۔

1978ء کے آخر میں ایران میں شاہ کی آمریت کے خلاف سالوں سے چلی آنے والی نفرت عوامی مظاہروں کی صورت اختیار کر گئی۔ 8 ستمبر 1978ء کو شاہ کے فوجیوں نے سینکڑوں مظاہرین کو ہلاک کر دیا۔ اگلے دن تہران سے "یو پی آئی" کی رپورٹ کے مطابق کارٹر نے شاہ کی حمایت کی توثیق کی:

> فوجیوں نے کل تیسرے دن بھی شاہ کے خلاف مظاہرین پر براہ راست فائرنگ کی، اور صدر جمی کارٹر نے شاہ محمد رضا پہلوی کو اپنی حمایت کا یقین دلانے کے لیے شاہی محل میں فون کیا، جسے اپنے 37 سالہ اقتدار کے بدترین بحران کا سامنا ہے۔ ایران کے نئے وزیراعظم کی تقریر سے پارلیمنٹ کے نو ممبران یہ نعرے لگاتے ہوئے واک آؤٹ کر گئے کہ اس کے ہاتھ قدامت پسند مسلمانوں اور دوسرے مظاہرین کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات میں خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑا عوامی انقلاب تھا اور شاہ فرار ہو گیا۔ کارٹر انتظامیہ نے بعد میں اسے علاج کے بہانے امریکہ میں پناہ دے دی، اور انقلابیوں کے امریکہ دشمنی کے جذبات عروج پر پہنچ گئے۔ 4 نومبر 1979ء کو تہران میں امریکی ایمبیسی پر باغی طلباء نے قبضہ کر لیا۔ اور انہوں نے سزا کے لیے شاہ کو ایران کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے ایمبیسی کے باون ملازمین کو یرغمال بنا لیا۔

اگلے چودہ ماہ میں جب کہ یرغمالی ابھی تک ایمبیسی کے صحن میں قید تھے یہ مسئلہ امریکہ کے اندر اخبارات میں شہ سرخیوں کی صورت اختیار کر گیا، اور شدید قوم پرستانہ جذبات کو ابھارنے کا باعث بنا۔ سیاستدانوں اور پریس نے شدید جذبات کا اظہار کیا۔ ایک ایرانی امریکی لڑکی کو ہائی سکول کے جلسہ تقسیم اسناد میں تقریر کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا، اسے پروگرام سے خارج کر دیا گیا۔ پورے ملک میں

کاروں اور گاڑیوں پر "ایران پر ایٹم بم پھینکو" کے بڑے بڑے سٹکر نظر آنے لگے۔

شاذ ہی کوئی صحافی "بوسٹن گلوب" کے "ایلین رچ مین" جتنا جرأت مند تھا جس نے باون یرغمالیوں کے زندہ اور صحیح سلامت رہا ہونے پر لکھا: "انسانی حقوق کی اس اور دوسری خلاف ورزیوں پر امریکی ردعمل کے تناسب میں ایک خاص فرق نظر آتا ہے.... ان کی تعداد باون تھی۔ ایک ایسی تعداد جو آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے.... وہ ہماری زبان (امریکی یرغمالی) بولتے تھے۔ پچھلے سال گوئٹے مالا میں 3000 افراد کو مختصر سماعت کے بعد گولیوں سے اڑا دیا گیا، لیکن وہ ہماری زبان نہیں بولتے تھے۔"

یرغمال ابھی تک قید میں تھے جب 1980ء میں کارٹر نے صدارتی انتخابات میں "رونالڈ ریگن" کا مقابلہ کیا۔ یہ واقعہ اور معاشی بدحالی جسے بہت سے لوگ محسوس کر رہے تھے، کارٹر کی شکست کا اصل سبب بنے۔

ریگن کی فتح کے آٹھ سال بعد جارج بش کے انتخاب کا مطلب یہ تھا کہ اسٹیبلشمنٹ کا ایک دوسرا حصہ جو کہ کارٹر صدارت کی معمولی سی آزاد خیالی سے بھی محروم تھا اقتدار میں ہوگا۔ غریبوں کو دی جانے والی امداد در قوم میں کمی کرتے ہوئے، دولت مندوں کے لیے ٹیکس میں چھوٹ دیتے ہوئے، فوجی بجٹ میں اضافہ کرتے ہوئے، وفاقی عدالتی نظام میں کنزرویٹو جج مقرر کرتے ہوئے اور کیریبین میں انقلابی تحریکوں کو عملی طور پر تباہ کرتے ہوئے پالیسیاں زیادہ سخت ہوں گی۔

ریگن اور بش کی صدارت کے بارہ سالوں میں وفاقی عدالتی نظام کو اوسط درجے کی آزاد خیالی کے ساتھ نمایاں طور پر کنزرویٹو ادارے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ 1991ء کے موسم خزاں تک ریگن اور بش نے 837 وفاقی ججوں میں سے آدھے سے زیادہ کی تقرریاں کی تھیں اور سپریم کورٹ کو تبدیل کرنے کے لیے دائیں بازو کے کافی جسٹس مقرر کر دیے تھے۔

ستر کے عشرے میں آزاد خیال جسٹسوں "ولیم برنن" اور تھرگڈ مارشل کی سرکردگی میں عدالت نے سزائے موت کو غیر آئینی قرار دے دیا، اور خواتین کے اسقاط حمل کے حق کی حمایت کی (راؤ بنام ویڈ، کیس میں) اور شہری حقوق کے قانون کی تشریح کرتے ہوئے ماضی کے امتیازات کا ازالہ کرنے کے لیے سیاہ فاموں اور خواتین کو خصوصی توجہ کا حقدار قرار دیا۔

ولیم ربن کوئسٹ جسے پہلی مرتبہ رچرڈ نکسن نے سپریم کورٹ کے لیے نامزد کیا تھا۔ رونالڈ ریگن نے اسے چیف جسٹس بنا دیا۔ ریگن اور بش کے ادوار صدارت میں ربن کوئسٹ کی عدالت نے مسلسل ایسے فیصلے دیے جنہوں نے "راؤ بنام ویڈ" کمزور کر دیا۔ سزائے موت دوبارہ بحال کر دی، زیر حراست افراد کے حقوق میں پولیس اختیارات کے مقابلے میں کمی کر دی۔ وفاقی حکومت کے زیر انتظام چلنے والے فیملی پلاننگ کلینکوں میں خواتین کو اسقاط حمل کے بارے میں معلومات دینے سے روک دیا گیا،

اور کہا کہ غریب لوگوں کو سرکاری سکولوں میں تعلیم کے لیے اخراجات کی ادائیگی کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے (تعلیم بنیادی حق نہیں تھا)۔

جسٹس ولیم برنن اور تھر گڈ مارشل عدالت کے آخری آزاد خیال جسٹس تھے۔ بوڑھے اور بیمار اگرچہ اپنی لڑائی ترک کرنے پر آمادہ نہیں تھے، وہ ریٹائر ہو گئے۔ ایک قدامت پسند سپریم کورٹ پیدا کرنے میں آخری عمل مارشل کی جگہ صدر بش کی نئی نامزدگی تھی۔ اس نے ایک سیاہ فام کنزرویٹو" کلارنس تھامس" کا انتخاب کیا۔ اور ایک سابقہ ساتھی نوجوان سیاہ فام قانون کی پروفیسر "انیتا ہل" کی ڈرامائی شہادت کے باوجود کہ تھامس نے اسے جنسی طور پر ہراساں کیا تھا، سینیٹ نے تھامس کی منظوری دے دی، اور اب سپریم کورٹ اور زیادہ فیصلہ کن طور پر دائیں جانب چلی گئی۔

قدامت پسند وفاقی ججوں اور "نیشنل لیبر ریلیشنز بورڈ" میں کاروباری افراد کے حامی افراد کی تقرری، نے مل کر عدالتی فیصلوں اور بورڈ کی تحقیقات کے ذریعے مزدور تحریک کو مزید کمزور کر دیا جو کہ پہلے ہی صنعت کاری میں زوال کے سبب مشکلات کا شکار تھی۔ ہڑتال کرنے والے کارکنوں کو کوئی قانونی تحفظ حاصل نہ تھا۔ ریگن انتظامیہ کے اولین کاموں میں سے ایک کام ہڑتال کرنے والے تمام کے تمام "ایئر ٹریفک کنٹرولرز" کو ملازمتوں سے برخاست کر دینا تھا۔ یہ مستقبل کے ہڑتالیوں کو ایک تنبیہ اور مزدور تحریک کی کمزوری کی علامت تھی جو کہ تیس اور چالیس کے عشرے میں ایک طاقتور قوت رہی تھی۔

ریگن اور بش کے دور صدارت میں سب سے بڑا فائدہ امریکی کارپوریشنوں کو حاصل ہوا۔ ساٹھ اور ستر کے عشروں میں فضا، سمندروں اور دریاؤں کی زہر آلودگی کے خوف اور کام کی جگہوں پر ناقص سہولیات کی وجہ سے ہر سال ہزاروں افراد کی اموات نے ایک اہم ماحولیاتی تحریک کو جنم دیا۔ نومبر 1968ء میں ورجینیا میں ایک کان میں دھماکے سے اٹھہتر کان کن مارے گئے، کان کنی کے علاقے میں شدید احتجاج کیا گیا، اور کانگریس نے "کول مائن ہیلتھ اینڈ سیفٹی ایکٹ 1969ء" پاس کیا۔ نکسن کے وزیر محنت نے "قوم کے ایک نئے جذبے ماحولیاتی بہتری کے جذبے" کی بات کی۔

اگلے سال مزدور تحریک اور صارف گروپس کی جانب سے شدید مطالبات، اور محنت کشوں کے ووٹ حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع خیال کرتے ہوئے صدر نکسن نے "آکوپیشنل سیفٹی اینڈ ہیلتھ ایکٹ 1970ء" (پیشہ ورانہ تحفظ اور صحت کا ایکٹ) پر دستخط کئے۔ یہ ایک اہم قانون سازی تھی جس نے محفوظ اور صحت مند کام کی جگہ کے بنیادی حق کو استوار کیا۔

جب صدر جمی کارٹر اقتدار میں آیا تو "او ایس ایچ اے" کے پروگرام کی تعریف کرتے ہوئے وہ کاروباری طبقے کو خوش کرنے کا بھی بہت زیادہ مشتاق تھا۔ وہ کارپوریشنوں پر لگائے گئے ضابطے ہٹانے اور انہیں مزید تحفظ فراہم کرنے کا بہت بڑا حامی بن گیا تھا، خواہ یہ مزدوروں اور صارفین کے لیے نقصان دہ

ہی کیوں نہ ہو۔

ریگن اور بش کے زیر سایہ "معیشت" جو کہ کارپوریٹ منافع کے لیے مختصر اصطلاح تھی، کے بارے میں یہ تشویش، کارکنوں اور صارفین کے تمام معاملات پر فائق ہو چکی تھی۔ صدر ریگن نے ماحولیاتی قوانین کے سخت نفاذ کو "رضاکارانہ" فعل میں تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس کی انتظامیہ کے اولین احکام میں سے ان 100,000 حکومتی کتابچوں کو تلف کرنے کا حکم بھی شامل تھا جن میں روئی کے ذرات سے ٹیکسٹائل کے کارکنوں کو پہنچنے والے خطرات کا ذکر کیا گیا تھا۔

جارج بش نے اپنے آپ کو "ماحولیاتی صدر" کے طور پر پیش کیا اور بڑے فخر سے "کلین ایئر ایکٹ 1990ء" پر دستخط کرنے کا ذکر کیا۔ لیکن اس ایکٹ کے پاس ہونے کے دو سال بعد اس کو "ماحولیاتی تحفظ کی ایجنسی" کے نئے ضابطے کے ذریعے کمزور کر دیا گیا، جس میں صنعتکاروں کو خطرناک فضائی آلودگی میں سالانہ 245 ٹن کے اضافے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

دنیا میں ماحولیاتی بحران اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ پوپ جان پال دوئم نے صنعتی اقوام کے دولت مند طبقے کو اس بحران کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ "آج درپیش ماحولیاتی تباہی کے خطرے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی لالچ اور خودغرضی کس قدر تخلیقی چلن کے برعکس ہے۔"

گلوبل وارمنگ سے نپٹنے کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں یورپی کیمونٹی اور جاپان نے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کے لیے ایک مخصوص سطح اور اوقات کار کی تجویز پیش کی، جس میں امریکہ بڑا مجرم تھا۔ لیکن امریکہ نے اس کی مخالفت کی۔

80 کے عشرے کے اختتام تک اس بات کی ٹھوس شہادتیں سامنے آ چکی تھیں کہ توانائی کے قابل تجدید ذرائع (پانی، ہوا، سورج) ایٹمی پلانٹوں کی نسبت، جو کہ خطرناک اور مہنگے ہیں اور ایسے تابکاری فضلات پیدا کرتے ہیں، جن کو محفوظ طریقے سے ٹھکانے نہیں لگایا جا سکتا، زیادہ قابل استعمال توانائی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ریگن اور بش انتظامیہ نے قابل تجدید توانائی کے امکانات پر تحقیقات کے لیے فنڈز میں بہت زیادہ کمی (ریگن کی صدارت میں 90 فی صد) کر دی۔

جون 1992ء میں برازیل میں سو سے زیادہ ممالک نے "ارتھ سمٹ" ماحولیاتی کانفرنس میں شرکت کی۔ اعداد و شمار سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ دنیا کی مسلح افواج ان دو تہائی گیسوں کی ذمہ دار ہیں جنہوں نے اوزون کی تہہ کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ "ارتھ سمٹ" ماحولیاتی تباہی پر افواج کے اثرات کا جائزہ لے گی تو امریکہ کے مندوبین نے اعتراض کیا اور تجویز رد کر دی گئی۔

حقیقت میں بہت بڑی فوجی اسٹیبلشمنٹ کا تحفظ اور آئل کارپوریشنوں کے منافع کی سطحوں کو

قائم رکھنا ریگن بش انتظامیہ کے دو اہم مقاصد نظر آتے تھے۔ رونالڈ ریگن کے صدارت سنبھالنے کے فوراً بعد آئل انڈسٹری کے ایگزیکٹوز نے وائٹ ہاؤس کے رہائشی حصے کی آرائش و تزئین کے لیے 270,000 ڈالر کے عطیات دیئے۔ ایسوسی ایٹ پریس کے مطابق:

محبت اور خدمت گزاری کے یہ جذبات.... اس کے چار ہفتے بعد پیدا ہوئے جب صدر نے تیل کی قیمتوں پر کنٹرول ختم کر دیا، یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس سے انڈسٹری کو دو بلین ڈالر کا فائدہ حاصل ہوا.... "کول آئل اینڈ گیس کمپنی" کے مالک اوکلاہاما کے "جیک ہوجس" نے کہا: "اس ملک کے سب سے بڑے آدمی کو سب سے اعلیٰ جگہ پر رہنا چاہیے۔ مسٹر ریگن نے "انرجی بزنس" کی مدد کی ہے۔"

جب ریگن نے فوج کو مزید مضبوط اور طاقتور بنانے کے لیے اپنی صدارت کے پہلے چار سالوں میں ایک ٹریلین ڈالر سے زیادہ مختص کیے تو اس نے یہ رقم غریبوں کو دی جانے والی مراعات میں کٹوتی کر کے ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ٹیکسوں میں بھی 190 بلین ڈالر کی کٹوتی کی تجویز پیش کی (جس میں سب سے زیادہ فائدہ امراء کو حاصل ہوا)۔ ریگن کا اصرار تھا کہ ٹیکس میں یہ کمی معیشت کو نئی آمدنی پیدا کرنے کے لیے متحرک کرے گی۔ لیکن ڈیپارٹمنٹ آف کامرس کے اعداد و شمار سے یہ بات سامنے آئی کہ کارپوریٹ ٹیکس میں کمی کے دور میں نئی سرمایہ کاری بالکل سامنے نہ آ سکی بلکہ اس میں ایک تیز کمی واقع ہوئی۔

ریگن کی بجٹ میں کٹوتیوں کے انسانی اثرات بہت گہرے مرتب ہوئے۔ مثال کے طور پر 350,000 افراد کو سوشل سیکورٹی کی طرف سے معذوری کی بنیاد پر ملنے والی مراعات ختم کر دی گئیں۔ ویت نام جنگ کے ایک ہیرو "رائے بیناوڈ" جسے ریگن کی جانب سے "کانگریشنل میڈل آف آنر" سے نوازا گیا تھا، کو بتایا گیا کہ اس کے دل، بازوؤں اور ٹانگ میں لگے ہوئے گرنیڈ کے ٹکڑے اسے کام کرنے سے نہیں روکتے، کانگریشنل کمیٹی کے سامنے پیش ہوتے ہوئے اس نے ریگن کی شدید مذمت کی۔

ریگن کی صدارت میں بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔ 1982ء میں تیس ملین لوگ سارا سال یا سال کا کچھ حصہ بے روزگار رہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ 16 ملین سے زائد امریکیوں کو "میڈیکل انشورنس" سے محروم کر دیا گیا جو کہ عام طور پر کام کرنے کے ساتھ مشروط تھی۔ مشی گن میں جہاں بے روزگاری کی شرح سب سے زیادہ تھی، 1981ء میں شیر خوار بچوں کی شرح اموات میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

نئی ضروریات کے تحت ایک ملین سے زائد غریب بچوں کے لیے سکول میں ملنے والا دوپہر کا کھانا ختم کر دیا گیا جن کی روزمرہ کی آدھی غذائیت کا انحصار اس کھانے پر تھا۔ اس طرح قوم کے ایک

چوتھائی بچے (بارہ ملین) غربت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

یہ سارا بوجھ ویلفیئر پر آن پڑا، این ایف ڈی سی (زیر کفالت بچوں والے خاندانوں کی امداد) پروگرام کے ذریعے بچوں والی اکیلی ماں کو ملنے والی مدد، بچوں کی خوراک کے کوپن، تحفظ صحت کے ذریعے غریبوں کی ہیلتھ کیئر وغیرہ۔ اکثر لوگوں کے لیے ویلفیئر پر ہونے کا مطلب 500 ڈالر ماہانہ سے 700 ڈالر ماہانہ تھا (مختلف ریاستوں کے مطابق) جو کہ 900 ڈالر کی مقرر کردہ غربت کی سطح سے بھی نیچے تھا۔ ویلفیئر پر پرورش پانے والے سیاہ فام بچوں کی تعداد سفید فام بچوں کی نسبت چار گنا تھی۔

ریگن انتظامیہ کے ابتدائی دنوں میں اس دلیل کے جواب میں کہ حکومتی امداد کی ضرورت نہیں نجی شعبہ کو غربت کا دھیان رکھنا ہوگا۔ ایک ماں نے مقامی اخبار میں لکھا:

میں "اے ایف ڈی سی" کی امداد پر ہوں، اور میرے دو بچے سکول میں ہیں.... میں 8000 ڈالر سالانہ جیسی کم معاوضے کی ملازمتیں کرتی رہتی ہوں۔ ویلفیئر نے میری رقم میں مزید کمی کر دی ہے۔

کیا یہ ہے وہ عظیم امریکی خواب جس کے لیے میرے والدین اس ملک میں آئے تھے۔ محنت کرو، اچھی تعلیم حاصل کرو، قوانین پر عمل کرو، اور آپ دولت مند بن جائیں گے۔ میں دولت مند نہیں بننا چاہتی، میں محض اپنے بچوں کو کھلانے کے قابل ہونا چاہتی ہوں اور باعزت زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔

ڈیموکریٹس بھی اکثر ویلفیئر پروگراموں کی مذمت کرنے میں ری پبلکنز کا ساتھ دیتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے دولت مند کارپوریشنوں کے ساتھ گہرے روابط تھے۔ قومی سیاست کے ایک ری پبلکن تجزیہ نگار" کیون فلپس نے 1990ء میں لکھا کہ ڈیموکریٹک پارٹی تاریخ کی دوسری سب سے زیادہ پرجوش سرمایہ دارانہ پارٹی ہے۔

اس کے باوجود ویلفیئر پر سیاستدانوں کے مسلسل حملے اس بنیادی سخاوت کے جذبے کو ختم نہ کر سکے جو اکثر امریکی محسوس کرتے تھے۔ نیویارک ٹائمز اور سی بی ایس نیوز کے ایک پول سروے میں جو کہ 1992ء کی ابتداء میں کیا گیا یہ بات سامنے آئی کہ ویلفیئر کے بارے میں عوام کی رائے سوال کے الفاظ کے مطابق تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب لفظ "ویلفیئر" استعمال کیا گیا تو جواب دینے والے 41 فی صد کا کہنا تھا کہ ویلفیئر پر بہت زیادہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب "غریبوں کی مدد" کے بارے میں سوال کیا گیا تو 13 فی صد کا کہنا تھا کہ بہت زیادہ خرچ کیا جا رہا ہے اور 64 فی صد کا خیال تھا کہ بہت کم خرچ کیا جا رہا ہے۔

جب حکومت اپنے ٹیکسوں میں کمی کر کے پہلے سے دولت مند لوگوں کو مزید دولت مند بنا رہی ہو تو اسے ویلفیئر کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ ہر ماہ غرباء کو چیک دینے جیسا واضح فعل نہیں تھا۔ یہ محض ٹیکس

نظام میں فیاضانہ تبدیلیاں تھیں۔

یہ ری پبلکنز نہیں بلکہ ڈیموکریٹس (کینیڈی اور جانسن کی انتظامیہ) تھے، جنہوں نے "ٹیکس اصلاحات" کے بھیس میں دوسری عالمی جنگ کے دور میں 400,000 ڈالر سے زائد آمدنی پر 91 فی صد ٹیکس شرح کو کم کر کے 70 فی صد کیا۔ کارٹر انتظامیہ کے دور میں (اگرچہ اسے اس پر اعتراضات تھے) ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز، امراء کو مزید ٹیکس چھوٹ دینے کے لیے متحد ہو گئے۔

ریگن کی انتظامیہ نے، کانگریس میں ڈیموکریٹس کی مدد سے بہت سے دولت مند افراد کے لیے ٹیکس کی شرح 50 فی صد تک کر دی۔ اور 1986ء میں ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس کے ایک اتحاد نے ایک اور "ٹیکس اصلاح" کا بل پاس کیا اور بلند ترین شرح 28 فی صد کر دی گئی۔ ایک سکول ٹیچر، ایک فیکٹری کارکن اور ارب پتی تمام لوگ 28 فی صد ادا کرتے تھے۔ بتدریج بڑھتی ہوئی آمدنی کے مطابق ٹیکس کا نظریہ جس میں دولت مند افراد دوسروں کی نسبت بلند شرح ادا کرتے تھے اب تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

1978ء سے 1992ء تک پاس کیے گئے تمام ٹیکس بلوں کے نتیجے میں حکومت کی آمدنی میں 70 بلین ڈالر سالانہ کی کمی واقع ہوئی۔ لہٰذا ان تیرہ سالوں کے دوران ملک کے ایک فی صد دولت مند ترین طبقے نے ٹریلین ڈالرز کا فائدہ حاصل کیا۔

صدی کے آخری عشرے میں نہ صرف یہ کہ انکم ٹیکس کو کم سے کم تدریجی بنا دیا گیا بلکہ "سوشل سیکورٹی ٹیکس" زیادہ رجعی کر دیا گیا یعنی غریب اور متوسط طبقے کی تنخواہوں سے زیادہ سے زیادہ کٹوتی شروع کر دی گئی، لیکن جب تنخواہ 50,000 ڈالر سالانہ سے تجاوز کر جاتی تو کوئی مزید کٹوتی نہ کی جاتی تھی۔ ایک شخص جو 500,000 ڈالر سالانہ کما رہا تھا وہ اتنا ہی سوشل سیکورٹی ٹیکس ادا کرتا تھا جتنا کہ 50,000 ڈالر سالانہ کمانے والا کر رہا تھا۔

تنخواہوں پر ان بلند شرح ٹیکسوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام تنخواہ دار طبقہ کے تین چوتھائی افراد سوشل سیکورٹی ٹیکسوں کے ذریعے انکم ٹیکس کی نسبت ہر سال زیادہ ادائیگیاں کر رہے تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی جو کہ محنت کشوں کی پارٹی خیال کی جاتی تھی کے لیے یہ امر بہت خجالت کا باعث تھا کہ تنخواہ دار طبقے پر یہ ٹیکس کی بلند شرح جمی کارٹر کی انتظامیہ کے تحت لاگو کی گئی تھی۔

دو پارٹی نظام میں، اگر دونوں پارٹیاں عوامی رائے کو نظر انداز کر دیں تو ووٹروں کے پاس کوئی دوسری جگہ نہیں ہوتی۔ 1984ء میں جب یہ تمام ٹیکس "اصلاحات" ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز کے ذریعے نافذ ہو چکی تھیں تو "انٹرنل ریونیو سروس" کے ایک عوامی رائے کے سروے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ پول میں حصہ لینے والے 80 فی صد افراد اس بیان سے متفق تھے کہ "ٹیکس کا موجودہ نظام امراء کے مفاد میں ہے اور ایک عام مرد یا خاتون کارکن کے حق میں غیر منصفانہ ہے۔"

ریگن کی دور صدارت کے اختتام تک امیر اور غریب کے درمیان خلا ڈرامائی طور پر بڑھ چکا تھا۔ جب کہ 1980ء میں کارپوریشنوں کے چیف ایگزیکٹو آفیسرز (سی ای اوز) ایک اوسط فیکٹری کارکن کی نسبت چالیس گنا زیادہ تنخواہ لے رہے تھے۔ 1989ء تک ان کا معاوضہ نوے گنا ہو چکا تھا۔

جب کہ نچلے طبقے کا ہر فرد مشکل میں گھرا ہوا تھا، سیاہ فاموں، میکسیکن امریکیوں، خواتین اور نوجوانوں کے لیے یہ مشکل دو چند تھی۔ ریگن اور بش کے دور میں کم ترین آمدنی والے گروپس میں پیدا ہونے والی عمومی غربت نے سیاہ فام طبقے کو سب سے زیادہ متاثر کیا، جن کے پاس شروعات کے لیے وسائل کی کمی تھی، اور ملازمتوں میں نسلی امتیاز کا سامنا تھا۔ شہری حقوق کی تحریک کی کامیابیوں نے افریقی امریکیوں کے لیے کچھ سہولت پیدا کی تھی، لیکن دوسروں کو بہت پیچھے دھکیل دیا تھا۔

80 کے عشرے کے اختتام پر افریقی امریکی خاندانوں کی کم از کم ایک تہائی تعداد غربت کی سرکاری لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہی تھی، اور بے روزگاری کی شرح سفید فاموں کی نسبت ڈیڑھ گنا زیادہ تھی، جبکہ نوجوان سیاہ فام 30 سے 40 فی صد تک کام سے محروم تھے۔ سیاہ فاموں میں زندگی کی شرح سفید فاموں کی نسبت کم از کم 10 سال نیچے تھی۔ ڈیٹرائٹ، واشنگٹن اور بالٹی مور میں سیاہ فاموں بچوں میں شرح اموات جیکا اور کوسٹاریکا سے بھی زیادہ تھی۔

غربت کے ساتھ ساتھ ماں باپ میں علیٰحدگی، گھریلو تشدد، سٹریٹ کرائم اور منشیات کے مصائب بھی شامل تھے۔ واشنگٹن ڈی سی میں قومی حکومت کی سنگ مرمر کی عمارتوں سے پیدل کے فاصلے پر غریب سیاہ فاموں کی ایک گنجان آبادی تھی۔ جہاں 18 سے 35 سال کی عمر کے 42 فی صد سیاہ فام نوجوان یا تو جیل میں تھے یا پھر پروبیشن یا پیرول پر جیل سے باہر تھے۔ سیاہ فاموں میں جرائم کی بلند شرح کو، بجائے غربت کے خاتمے کی اشد ضرورت کے طور پر دیکھنے کے، سیاستدان اسے مزید جیلوں کی تعمیر کی ضرورت کے طور پر دیکھتے تھے۔

1954ء میں براؤن بنام بورڈ آف ایجوکیشن کے مقدمے میں سپریم کورٹ کے فیصلے نے سکولوں میں نسلی علیٰحدگی کے خاتمے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ لیکن غربت نے سیاہ فام بچوں کو ان کی آبادیوں میں ہی مقید رکھا۔ اور پورے ملک میں بہت سے سکول نسلی اور طبقاتی علیٰحدگی کے حامل رہے۔ ستر کے عشرے میں سپریم کورٹ کے فیصلوں نے طے کر دیا تھا کہ غریب علاقوں کے سکولوں اور امیر علاقوں کے سکولوں میں کسی برابری کی ضرورت نہیں ہے (سان انٹونیو انڈیپنڈنٹ سکول ڈسٹرکٹ بنام راڈریگوز)، اور امیر مضافات اور اندرون شہر کے درمیان سکول کے بچوں کی بسیں چلانے کی ضرورت نہیں ہے (ملیکن بنام براڈلے)۔

"فری انٹرپرائز" اور نجی کاروبار میں حکومت کی عدم مداخلت کے معترفین کے نزدیک وہ لوگ غریب تھے جو کام اور پیداوار نہیں کرتے، لہٰذا اپنی غربت کے وہ خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ اس بات

کونظر انداز کر دیتے تھے کہ وہ خواتین جو اپنے بچوں کی خود پرورش کر رہی ہوتی ہیں درحقیقت بہت سخت محنت کر رہی ہوتی ہیں۔ وہ نہیں پوچھتے تھے کہ وہ بچے جو ابھی کام کرنے کے قابل نہیں ہوئے انہیں محض غریب گھرانے میں پیدا ہونے کی بنا پر کیوں (موت کی حد تک) سزا دی جائے۔

80 کے عشرے کے وسط میں واشنگٹن میں ایک اہم سکینڈل سامنے آنا شروع ہوا۔ کارٹر کے دور میں بنکوں کی بچتوں اور قرضوں پر سے حکومتی ضابطوں کا خاتمہ ریگن کے دور میں بھی جاری رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایسی سرمایہ کاری کا آغاز ہوا جس میں خطرے کا احتمال موجود تھا، اس نے بنکوں کے اثاثوں کو خالی کر دیا۔ جبکہ ان کے ذمہ کھاتہ داروں کے اربوں ڈالر واجب الادا تھے، جس کی حکومت نے ضمانت دے رکھی تھی اور جسے اب ٹیکس ادا کرنے والوں کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

دفاعی مقاصد کے لیے خزانے سے بہت بڑی رقوم کے انخلا کو ایک مرتبہ صدر آئزن ہاور نے انسانی ضروریات پر "ڈاکا" قرار دیا تھا۔ لیکن دونوں پارٹیوں نے اس کی منظوری دے رکھی تھی۔ کارٹر نے صدر کی حیثیت سے فوجی بجٹ میں 10 بلین ڈالر کے اضافے کی تجویز دی تھی، یہ ایک ایسی قانون سازی تھی جسے آئزن ہاور نے درست الفاظ میں بیان کیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے عرصہ میں ٹرومین سے ریگن اور بش تک تمام خطیر فوجی بجٹوں کو اکثریت رائے سے ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز دونوں کی منظوری حاصل تھی۔

ایٹمی اور غیر ایٹمی قوتوں پر کھربوں ڈالر خرچ کرنے کا جواز اس خطرے کو بنایا گیا تھا کہ سوویت یونین بھی اپنی فوجی قوتوں میں اضافہ کر رہا ہے، جس کا مقصد مغربی یورپ پر حملہ کرنا ہے۔ 1984ء میں "سی آئی اے" نے تسلیم کیا کہ اس نے سوویت فوجی اخراجات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ ہیری روزٹسکی نے، جو بیس سال تک سی آئی اے کے لیے کام کرتا رہا اور ایک وقت میں سوویت یونین کے خلاف جاسوسی کی کارروائیوں کا سی آئی اے کا ڈائریکٹر بھی رہا، 1980ء کے عشرے میں لکھا: "حکومت میں اپنے تمام سالوں کے دوران کوئی ایسا خفیہ تخمینہ میری نظر سے نہیں گزرا جس سے پتا چلتا ہو کہ سوویت یونین کے لیے مغربی یورپ یا امریکہ پر حملہ کرنا کس طرح سودمند ہو سکتا ہے۔"

تاہم عوام کے ذہن میں اس قسم کا خوف پیدا کرنا اور ضرورت سے زائد انتہائی خطرناک ہتھیار تیار کرنے کے جواز کے لیے فائدہ مند ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر "ٹرائی ڈینٹ" آب دوز، جو کہ ہزاروں ایٹمی میزائل داغنے کے قابل تھی، اس پر ڈیڑھ بلین ڈالر خرچ آیا تھا۔ یہ ڈیڑھ بلین ڈالر ہلاکت خیز بیماریوں کے خلاف پوری دنیا کے بچوں کی پانچ سال تک ویکسی نیشن کے لیے کافی تھے اور پانچ ملین جانیں بچائی جا سکتی تھیں۔

ریگن انتظامیہ کا ایک مقبول ترین فوجی پروگرام "سٹار وار" پروگرام تھا۔ جس پر بلینوں ڈالر خرچ کیے گئے، اس کا مقصد دشمن کے ایٹمی میزائلوں کو آدھے راستے میں روکنے کے لیے خلا میں ایک

دفاعی حصار قائم کرنا تھا۔ لیکن اس ٹیکنالوجی کے پہلے تین ٹیسٹ ناکام ہو گئے۔ پروگرام پر حکومت کی لگائی ہوئی خطیر رقم کو بروئے کار لانے کے لیے ایک چوتھے ٹیسٹ کی تیاریاں کی گئیں اور ایک مزید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن ریگن کے وزیر دفاع "کاسپر وین برگر" نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ٹیسٹ کامیاب رہا تھا جعلی نتائج کی تصدیق کر دی۔

جب 1989ء میں سوویت یونین بکھرنا شروع ہو گیا اور پہلے کی طرح کا کوئی سوویت خطرہ باقی نہ رہا تو فوجی بجٹ میں کسی حد تک کمی کی گئی لیکن اس کے باوجود یہ ایک کثیر بجٹ رہا۔ ایک "نیشنل پریس کلب" سروے سے یہ بات سامنے آئی کہ 59 فی صد امریکی ووٹر اگلے پانچ سالوں کے لیے دفاعی بجٹ میں 50 فی صد کمی چاہتے ہیں، لیکن دونوں پارٹیوں نے اس عوام کو نظر انداز کیے رکھنا جاری رکھا جس کی وہ نمائندگی کرتی تھیں۔

1992ء کے موسم گرما میں دونوں پارٹیوں نے مل کر فوجی بجٹ کو انسانی ضروریات کی جانب منتقل کرنے کے خلاف، اور 120 بلین ڈالر یورپ کے دفاع پر خرچ کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔ جب کہ ہر کوئی جانتا تھا کہ اگر ماضی میں ایسا نہیں ہوا، تو اب وہاں سوویت حملے کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

رچرڈ نکسن نکاراگوا میں انقلاب آنے کے فوراً بعد صدر بنا، جس میں ایک عوامی 'سینڈینیٹا تحریک' نے (جس کا نام 20 کے عشرے کے ایک مقبول انقلابی ہیرو "آگسٹو سینڈینو" کی مناسبت سے رکھا گیا تھا) سموزا کی بدعنوان بادشاہت کا خاتمہ کیا تھا (جسے امریکہ ایک عرصے سے سہارا دیے آ رہا تھا)۔ "سینڈینٹاس" جو مارکسسٹوں، بائیں بازو کے پادریوں، اور چند قوم پرستوں پر مشتمل تھی، نے کسانوں کو مزید زمینیں دینے، تعلیم اور صحت کی سہولتیں غریبوں میں پھیلانے کے کام کا آغاز کر دیا۔

ریگن انتظامیہ نے اس میں کمیونسٹ خطرہ محسوس کرتے ہوئے، اور اس سے بڑھ کر اسے وسطی امریکہ میں حکومتوں پر امریکہ کے لیے تسلط کے خلاف ایک چیلنج سمجھتے ہوئے فوری طور پر سینڈینیٹا حکومت کو گرانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے ایک خفیہ جنگ کا آغاز کر دیا، سی آئی اے نے ایک انقلاب مخالف قوت (کنٹراس کے نام سے) منظم کی، جس میں زیادہ تر افراد سموزا کے تحت سابقہ نفرت زدہ نیشنل گارڈ کے افسران تھے۔

کنٹراس کو کسی قسم کی عوامی حمایت حاصل نہ تھی، لہٰذا اسے ہمسایہ ملک ہنڈراس میں اڈے مہیا کیے گئے جو کہ امریکہ کے زیر تسلط ایک غریب ملک تھا۔ ہنڈراس سے وہ سرحد عبور کر کے نکاراگوا میں داخل ہوتے اور مردوں، خواتین اور بچوں کو ہلاک کرتے ہوئے فارموں اور دیہاتوں پر حملے کرتے اور ظلم و ستم ڈھاتے تھے۔ کنٹراس کے ایک سابقہ کرنل "ایڈگر چمورو" نے عالمی عدالت کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا:

بہت سے سویلین بے دردی سے قتل کر دیے گئے، بہت سے دیگر افراد کو اذیتیں

دی گئیں، ہاتھ پاؤں کاٹے گئے، عزتیں لوٹی گئیں، چھینا جھپٹی کی گئی یا پھر ذلیل وخوار کیا گیا۔
جب میں اس میں شمولیت پر راضی ہوا تو...... میرا خیال تھا یہ نکارا گو کے عوام کی ایک تنظیم ہے۔
لیکن یہ امریکی حکومت کی آلہ کار ثابت ہوئی۔

نکاراگوا میں امریکی کارروائیوں کو خفیہ رکھنے کی ایک وجہ تھی، عوامی رائے کے سروے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ عوام وہاں فوجی مداخلت کے مخالف ہیں۔ 1984ء میں سی آئی اے نے نکاراگوا کی بندرگاہوں پر جہازوں کو تباہ کرنے کے لیے سرنگیں لگانے کے لیے اپنی وابستگی کو خفیہ رکھنے کے لیے لاطینی امریکہ کے ایجنٹوں کو استعمال کیا۔ جب یہ راز افشاء ہو گیا تو وزیر دفاع ''وین برگر'' نے ''اے بی سی'' نیوز میں جھوٹ بولا کہ ''امریکہ نکاراگوا میں بندرگاہوں پر سرنگیں نہیں لگا رہا۔''

اس سال کے آخر میں شاید عوامی رائے کے ردعمل میں یا ویت نام کی یاد سے خوف زدہ ہو کر امریکہ کے لیے ''نکاراگوا میں بلاواسطہ یا بالواسطہ، فوجی یا نیم فوجی کارروائیوں'' کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ ریگن انتظامیہ نے اس قانون کو نظر انداز کرنے اور ''کنٹراس'' کو فنڈز مہیا کرنے کے خفیہ طریقے تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔

1986ء میں بیروت کے ایک میگزین میں ایک کہانی شائع ہوئی جس نے سنسنی پھیلا دی، اس کہانی کے مطابق امریکہ نے ایران (جسے دشمن تصور کیا جاتا تھا) کے پاس ہتھیار فروخت کئے تھے، اور اس کے بدلے میں ایران نے ان یرغمالی امریکیوں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا تھا جنہیں لبنان میں مسلم انتہا پسندوں نے قید کر رکھا تھا، اور یہ کہ ہتھیاروں کی اس فروخت سے حاصل ہونے والا منافع نکاراگوا میں ہتھیاروں کی خریداری کے لیے ''کنٹراس'' کو دیا گیا۔

جب نومبر 1986ء میں ایک پریس کانفرنس میں اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو ریگن نے کئی ایک جھوٹ بولے اور کہا کہ اس کارروائی کا مقصد ایران میں اعتدال پسندوں کے ساتھ گفتگو کو آگے بڑھانا تھا۔ حقیقت میں اس کا مقصد دوطرفہ یعنی یرغمالیوں کو رہا کروا کر اس کا سہرا اپنے سر سجانا اور کنٹراس کو مدد فراہم کرنا تھا۔

اس مشہور ''کنٹرا گیٹ'' سکینڈل کے حوالے سے حکومتی رازداری یا عوامی نگاہوں سے پوشیدہ چند افراد کے ہاتھوں جمہوریت کی دھجیاں بکھیرے جانے کے بارے میں کسی بھی جانب سے کوئی زوردار تنقید سامنے نہ آئی۔ میڈیا نے ''ایک ایسے ملک میں جو اپنی تعلیمی سطح اور معلومات کی ترسیل پر فخر کرتا تھا، عوام کو صرف سطحی قسم کی معلومات فراہم کرنے تک ہی اکتفا کیا۔

ڈیموکریٹک پارٹی کی نکتہ چینی کی حدود کا اندازہ جورجیا کے ایک سرکردہ ڈیموکریٹ سینیٹر ''سام نن'' کے اس بیان سے ہوتا ہے جو کہ اس نے اس وقت دیا جب کہ اس بارے میں تحقیقات جاری تھیں:

''ہم سب کو خارجہ معاملات میں صدر کے اعتبار کو بحال رکھنے میں اس کی مدد کرنی چاہیے۔''

یہ بالکل واضح تھا کہ صدر ریگن اور نائب صدر بش ''ایران کنٹرا'' معاملات میں پوری طرح ملوث تھے لیکن ان کے کارندوں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ انہیں اس سے باہر نکال دیا۔ یہ ایک ''معقول انکار'' کے لیے حکومت کا جانا پہچانا ہتھکنڈا ہے، جس میں بڑے عہدیداروں کو بچانے کے لیے ماتحتوں کو ڈھال بنا لیا جاتا ہے اور وہ ایک معقول طریقے سے ملوث ہونے سے بچ نکلتے ہیں۔

نہ تو ریگن پر اور نہ ہی بش پر کوئی الزام دھرا گیا۔ بلکہ کانگریس کی کمیٹی نے چھوٹے مجرموں کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا اور ان میں سے کئی ایک پر الزامات عائد کر دیے گئے۔ ان میں سے ایک نے (رابرٹ میک فرلین، ریگن کا سابقہ نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر) خودکشی کی کوشش کی۔ ایک دوسرے مجرم کرنل اولیور نارتھ پر کانگرس کے سامنے جھوٹ بولنے کے جرم پر مقدمہ چلایا گیا، جرم ثابت ہو گیا، لیکن بعد میں اپیل کی سماعت کے دوران اسے بھی قانونی تکنیکی بنیادوں پر بری کر دیا گیا۔ ریگن پرامن طور پر ریٹائر ہو گیا اور بش امریکہ کا اگلا صدر منتخب ہو گیا۔

''ایران کنٹرا'' معاملہ ایسی بہت سے مثالوں میں سے محض ایک مثال ہے جس میں امریکہ کی حکومت نے خارجہ پالیسی میں مطلوبہ اہداف حاصل کرنے کے لیے خود اپنے قوانین کی دھجیاں بکھیریں۔

1973ء میں ویت نام جنگ کے خاتمے پر کانگریس نے صدارتی اختیارات کو محدود کرنے کے لیے جن کا ہند چینی میں بے رحمانہ استعمال ہوا تھا۔ ''جنگی اختیارات کا ایکٹ'' پاس کیا، جس کے مطابق:
''صدر ہر ممکنہ صورتحال میں امریکہ کی مسلح افواج کو جنگ یا جارحانہ کارروائیوں پر بھیجنے سے پہلے یا ایسی صورتحال میں بھیجنے سے پہلے جہاں حالات سے واضح طور پر اس کے جنگ یا جارحانہ کارروائیوں میں ملوث ہو جانے کے امکانات نظر آ رہے ہوں، کانگریس سے مشورہ کرنے کا پابند ہو گا۔''

لیکن 1982ء کے موسم خزاں میں صدر ریگن نے ''وار پاورز ایکٹ'' کی شرائط کو ایک مرتبہ پھر نظر انداز کرتے ہوئے امریکی نیوی کو لبنان کی خطرناک صورتحال میں بھیج دیا، جہاں خانہ جنگی شدت اختیار کئے ہوئے تھی۔ اگلے سال نیوی کے ان سپاہیوں میں سے دو سو سپاہی اس وقت مارے گئے جب دہشت گردوں نے بیرکوں میں ایک بم دھماکا کر دیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد اکتوبر 1983ء میں (بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ کام لبنان میں ہونے والی تباہی سے توجہ ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا) ریگن نے ایک چھوٹے سے کیریبین جزیرے ''گریناڈا'' پر حملہ کرنے کے لیے امریکہ کی فوجیں بھیجیں۔ ایک دفعہ پھر کانگریس کو صرف اطلاع دی گئی اس سے مشورہ نہ لیا گیا۔ اس حملے کے لیے امریکی عوام کو جو وجہ بیان کی گئی وہ یہ تھی کہ ''گریناڈا'' میں حالیہ انقلاب کے نتیجے میں امریکی شہریوں (جزیرے پر واقع میڈیکل کالج کے طلباء) کی زندگیاں خطرے میں تھیں، اور امریکہ کو مشرقی

کیریبین ریاستوں کی تنظیم کی جانب سے فوری مداخلت کی درخواست موصول ہوئی تھی۔

خاص طور پر اس مسئلے پر 29 اکتوبر 1983ء کے "نیویارک ٹائمز" میں شائع ہونے والے نامہ نگار "برنارڈ گیورٹز مین" کے مضمون میں ان وجوہات کو بے بنیاد ثابت کر دیا گیا: "یہ رسمی درخواست امریکہ کے کہنے پر کی گئی تھی۔ درخواست کے الفاظ واشنگٹن میں تحریر کر دیے گئے اور کیریبین رہنماؤں تک خصوصی امریکی ایلچیوں کے ذریعے بھجوائے گئے۔"

ایک اعلیٰ امریکی عہدیدار نے "گیورٹز مین" کو بتایا کہ حملے کی اصل وجہ یہ تھی کہ امریکہ کو یہ ثابت کرنا تھا (ویت نام میں شکست کے احساس پر قابو پانے کے لیے) کہ وہ حقیقت میں ایک طاقتور قوم ہے: "جنگی مشقوں اور طاقت کے مظاہروں کا کیا فائدہ اگر آپ انہیں کبھی استعمال نہیں کرتے۔" کیریبین میں امریکی فوجی مداخلت اور سرمایہ دارانہ مہم جوئی کے فروغ کے درمیان ہمیشہ دوسروں کے لیے ایک بے حسی اور جذبات سے عاری پن کا تعلق رہا تھا۔ جہاں تک گریناڈا کا تعلق تھا، حملے کے آٹھ سال بعد (29 اکتوبر 1991ء) "وال سٹریٹ جرنل" میں ایک مضمون میں اسے "ایک بنکوں کا حملہ" قرار دیا گیا اور نشاندہی کی گئی کہ گریناڈا کے دارالحکومت "سینیٹ جارج" میں جس کی آبادی 7500 افراد پر مشتمل تھی 118 سمندر پار بنک تھے یعنی 64 افراد کے لیے ایک بنک تھا۔

امریکہ کے حملوں کا جواز ہمیشہ شہریوں کی حفاظت قرار دیا جاتا رہا، لیکن جب 1980ء میں حکومتی پشت پناہی رکھنے والے "ڈیتھ سکواڈز" نے ایل سلواڈور میں گرجا کی رکن چار خواتین کو مار ڈالا تو کسی قسم کی امریکی مداخلت دیکھنے میں نہ آئی۔ بلکہ اس کے بجائے حکومت کو فوجی امداد اور "ڈیتھ سکواڈز" کی تربیت جاری رکھی گئی۔

ایل سلواڈور میں جہاں 2 فی صد افراد کے پاس ملک کی 60 فی صد زمین تھی امریکہ کا کردار صرف اس بات کو یقینی بنانے تک محدود تھا کہ جو بھی حکومت آئے وہ امریکہ کے کاروباری مفادات کی حمایت کرتی ہو، اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ یہ عوام کی ایک بڑی اکثریت کو کیسے غربت میں دھکیلے رکھتی ہے، عوامی بغاوتیں جو اس کاروباری بندوبست کے لیے خطرہ بن سکیں دبا کر رکھی جائیں۔ جب 1932ء میں عوامی بغاوت نے فوجی حکومت کو خطرے میں ڈال دیا تو امریکہ نے ایک بحری بیڑا اور دو تباہ کن جہاز بھیجے جو وہاں کھڑے رہے اور حکومت نے 30 ہزار باشندوں کا قتل عام کیا۔

فروری 1980ء میں ایل سلواڈور کے کیتھولک آرچ بشپ "آسکر رمیورو" نے صدر کارٹر کو ایک ذاتی خط بھیجا، جس میں اسے ایل سلواڈور کی فوجی امداد بند کرنے کو کہا گیا تھا۔ اس سے تھوڑا عرصہ پہلے نیشنل گارڈ اور نیشنل پولیس نے "میٹروپولیٹن کیتھیڈرل" کے سامنے مظاہرین کے ایک ہجوم پر فائر کھول دیے تھے اور چوبیس افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ لیکن کارٹر انتظامیہ نے مدد جاری رکھی، اگلے ماہ آرچ

بشپ قتل کر دیا گیا۔

بڑی مضبوط اور واضح شہادت موجود تھی کہ قتل کا حکم دائیں بازو کے ایک لیڈر "روبیرٹو ڈی ابیوسن" نے دیا تھا۔ لیکن ابیوسن کو "نکولس گرانزا" کی پشت پناہی حاصل تھی جو کہ نائب وزیر دفاع تھا اور اس وقت سی آئی اے سے 90,000 ڈالر سالانہ حاصل کر رہا تھا۔ اور "ایلیٹ ابرامز" نے، جو کہ ستم ظریفانہ طور پر انسانی حقوق کا وزیر بھی تھا، بیان دیا کہ "ڈی ابیوسن" اس قتل میں ملوث نہیں تھا۔

کانگریس ایل سلواڈور میں ہونے والی ہلاکتوں سے بہت پریشان تھی اور اس نے کہا کہ کسی قسم کی مزید امداد دینے سے قبل صدر اس بات کی تصدیق کرے کہ انسانی حقوق کے بارے میں پیش رفتیں کی جا رہی ہیں۔ ریگن نے اس بات کو سنجیدگی سے نہ لیا، قتل عام ہوتا رہا لیکن فوجی امداد جاری رہی۔ جب کانگریس نے 1983ء میں تصدیق کی ضرورت کو جاری رکھنے کے لیے ایک قانون پاس کیا تو ریگن نے اس کے حق میں ووٹ ڈالا۔

ریگن کے دور صدارت میں پریس خاص طور پر سہا ہوا اور چاپلوس تھا۔ جب جرنلسٹ "ریمنڈ بونز" نے ایل سلواڈور کے مظالم اور ان میں امریکہ کے کردار پر رپورٹیں تیار کرنا جاری رکھا تو "نیویارک ٹائمز" نے اسے کام سے ہٹا دیا۔ اس سے پہلے 1981ء میں بونز "ایل موزوٹ" کے قصبے میں ایک امریکہ کی تربیت یافتہ فوجی بٹالین کے ہاتھوں ایک سو سویلین کے قتل عام کی رپورٹ شائع کروا چکا تھا۔ ریگن انتظامیہ نے اس بیان کا تمسخر اڑایا تھا لیکن 1992ء میں عدالتی ماہرین بشریات کی ایک ٹیم نے قتل عام کی جگہ سے ڈھانچے نکالنے شروع کیے جن میں زیادہ تر بچوں کے ڈھانچے تھے۔ اگلے سال "اقوام متحدہ" کے ایک کمیشن نے "ایل موزوٹ" کے مقام پر قتل عام کی تصدیق کر دی۔

ریگن انتظامیہ جو کہ لاطینی امریکہ میں حکومت کرنے والے فوجی ٹولوں (گوئٹے مالا، ایل سلواڈور، چلی) سے ذرا برابر بھی نالاں نہیں تھی کیونکہ ان کے امریکہ کے ساتھ دوستانہ روابط تھے لیکن اگر کوئی جابرانہ حکومت مخالف جذبات کی حامل ہوتی تو انتظامیہ بہت زیادہ پریشان ہو جاتی تھی، جیسا کہ لیبیا میں معمر قذافی کی حکومت تھی۔ 1986ء میں جب نامعلوم دہشت گردوں نے مغربی برلن میں ایک ریکارڈ روم کو بم سے اڑایا جس میں ایک امریکہ کا فوجی بھی مارا گیا، تو وائٹ ہاؤس نے فوری جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ قذافی گذشتہ سالوں کے دوران دہشت گردی کے بہت سے واقعات کا ذمہ دار ہو سکتا تھا لیکن اس معاملے میں اس پر الزام لگانے کے لیے کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں تھی۔

دارالحکومت ٹریپولی کے شہر پر جہاز بھیجے گئے جن کو قذافی کے گھر کو نشانہ بنانے کی خصوصی ہدایات دی گئی تھیں۔ اس گنجان آباد شہر پر بم گرائے گئے اور غالباً ایک سو کے قریب افراد مارے گئے۔ قذافی زخمی نہ ہوا لیکن اس کی لے پالک بیٹی ماری گئی۔

جارج بش کی صدارت کے شروع کے ایام میں دوسری عالمی جنگ کے بعد سے بین الاقوامی منظر پر ڈرامائی پیش رفتیں شروع ہوئیں۔ 1989ء میں سوویت یونین کی صدارت پر نئے باہمت اور جرأت مند لیڈر میخائیل گورباچوف کی موجودگی میں "محنت کش طبقے کی آمریت" کے خلاف، جو کہ محنت کش طبقے پر آمریت کا روپ دھار چکی تھی، لمبے عرصے سے دبائی گئی بے اطمینانی پورے سوویت بلاک میں پھٹ پڑی۔

سوویت یونین میں اور مشرقی یورپ کے ان ممالک میں جو لمبے عرصے سے سوویت یونین کے تسلط میں تھے عوامی مظاہرے شروع ہو گئے۔ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی دوبارہ متحد ہونے کے لیے رضامند ہو گئے اور مشرقی برلن سے مغربی برلن کو جدا کرنے والی دیوار خوشی سے ناچتے اور نعرے مارتے عوام کی موجودگی میں گرادی گئی۔ چیکوسلاواکیہ میں ایک نئی غیر کیمونسٹ حکومت وجود میں آئی جس کی قیادت ایک سابقہ باغی قیدی اور ڈرامہ نویس "ویکلف ہیبل" کے ہاتھ میں تھی۔ بلغاریہ، ہنگری اور پولینڈ میں آزادی اور جمہوریت کی دعویدار نئی لیڈرشپ سامنے آئی۔ اور حیران کن امر یہ تھا کہ یہ سب کچھ بغیر خانہ جنگی کے شدید عوامی مطالبے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا۔

امریکہ میں ری پبلکن پارٹی کا دعویٰ تھا کہ ریگن کی غیر لچکدار پالیسیوں اور فوجی اخراجات میں اضافے نے سوویت یونین کو ختم کیا ہے لیکن سوویت یونین کے سابقہ سفیر جارج کعنان نے لکھا: "سرد جنگ کی شدت پسندی 80 کے عشرے کے اختتام پر سوویت یونین میں آنے والی عظیم تبدیلی کو تیز کرنے کے بجائے تاخیر میں ڈالے رکھا۔" سرد جنگ کی ان پالیسیوں کی امریکی عوام نے بڑی خوفناک قیمت ادا کی کعنان کے کہنے کے مطابق: "ہم نے چالیس سال تک خطیر اور درحقیقت غیر ضروری فوجی اخراجات برداشت کیے، ہم نے اس کی قیمت اس حد تک ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی صورت میں ادا کی کہ وسیع اور بے کار ایٹمی اسلحہ خانے دنیا کے ماحول کے لیے خطرہ بن چکے ہیں۔"

سوویت یونین کے اچانک انہدام نے امریکہ کی سیاسی لیڈرشپ کو کس قسم کی تیاری کا موقع نہ دیا۔ پوری دنیا میں وسیع ایٹمی اور غیر ایٹمی اسلحہ خانے اور فوجی اڈے قائم کرنے کے لیے امریکی شہریوں سے ٹیکسوں کی صورت میں کئی ٹریلین ڈالر وصول کیے جا چکے تھے، اور اس سب کچھ کے لیے "سوویت خطرے" کا جواز پیش کیا جاتا تھا۔ اب امریکہ کے لیے اپنی خارجہ پالیسی کو از سر نو مرتب کرنے اور تعمیری اور صحت مند منصوبوں کے لیے ہر سال سینکڑوں بلین ڈالر بچانے کا ایک موقع تھا۔

لیکن یہ نہ ہوا۔ "ہم سرد جنگ جیت چکے ہیں" کی خوشی اور مسرت کے ساتھ ایک نئی تشویش نے جنم لیا: "اپنی فوجی اسٹیبلشمنٹ کو قائم رکھنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟" فوجی بجٹ بدستور بہت بڑا رہا۔ چیئرمین جائنٹ چیف آف سٹاف کولن پاول نے کہا: "میں باقی ماندہ دنیا کو بھی خوفزدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب جنگوں کے ذریعے ہرگز نہیں۔"

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ایک عظیم فوجی اسٹیبلشمنٹ کی اب بھی ضرورت ہے بش انتظامیہ نے اپنے چار سالہ دور میں دو جنگیں شروع کیں ایک چھوٹی جنگ پانامہ کے خلاف اور ایک بہت بڑی جنگ عراق کے خلاف شروع کی گئی۔

پانامہ کا ڈکٹیٹر جنرل مینوئل نوریگا ایک بدعنوان، وحشی حکمران تھا، لیکن صدر ریگن اور نائب صدر بش نے اسے نظر انداز کر رکھا تھا کیونکہ نوریگا کئی ایک طریقوں سے سی آئی اے کے ساتھ تعاون کر رہا تھا، تاہم 1987ء میں نوریگا کی افادیت ختم ہوگئی۔ منشیات کے کاروبار میں اس کی سرگرمیاں کھلم کھلا تھیں اور وہ ایک آسان نشانہ بن گیا۔ بش انتظامیہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ بظاہر کاسترو کی حکومت یا سینڈینیسٹاس یا ایل سلواڈور میں انقلابی تحریک کو کچلنے میں ناکامی کے باوجود، امریکہ کیریبین میں اب بھی طاقتور ہے۔

یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ وہ نوریگا پر منشیات کے تاجر کے طور پر مقدمہ چلانا اور امریکہ کے شہریوں کو تحفظ فراہم کرنا چاہتا ہے امریکہ نے پانامہ پر دسمبر 1989ء میں چھبیس ہزار فوجیوں کے ساتھ حملہ کر دیا۔

یہ ایک فوری فتح تھی۔ نوریگا کو گرفتار کر لیا گیا اور مقدمہ کا سامنا کرنے کے لیے فلوریڈا لایا گیا (جہاں اس کا جرم ثابت ہونے کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا) لیکن حملے کے دوران پانامہ شہر کے مضافات پر بمباری کی گئی اور سینکڑوں یا شاید ہزاروں سویلین مارے گئے۔ ایک اندازے کے مطابق چودہ ہزار لوگ بے گھر ہو گئے۔

امریکہ کے ساتھ دوستانہ خاطر تعلق رکھنے والا ایک نیا صدر مقرر کر دیا گیا، لیکن غربت اور بے روزگاری جوں کی توں رہی۔ اور 1992ء میں "نیویارک ٹائمز" نے رپورٹ شائع کی کہ "پانامہ پر حملہ اور نوریگا کی برطرفی غیر قانونی منشیات کی سپلائی کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔"

تاہم امریکہ پانامہ پر اپنا مضبوط اثر و رسوخ قائم رکھنے میں کامیاب رہا، لبرل ڈیموکریٹس (میساچوسٹس کے سینیٹرز جان کیری اور ٹیڈ کینیڈی اور بہت سے دوسرے) نے فوجی کارروائی کے لیے اپنی تائید کا اظہار کیا۔ ڈیموکریٹس فوجی مداخلت کے حمایتیوں کے طور پر اپنے تاریخی کردار سے پوری طرح مخلص تھے، خارجہ پالیسی دو حزبی رہی، وہ اپنے آپ کو ری پبلکن جتنا سخت (یا بے رحم) ظاہر کرنے کے لیے پر عزم نظر آتے تھے۔

لیکن پانامہ کی مہم ویت نام کے بعد امریکی عوام میں بیرون ملک فوجی مداخلت کے خلاف پائی جانے والی نفرت پر قابو پانے کے لیے بہت ہی چھوٹے پیمانے کی تھی، جس کی ریگن اور بش انتظامیہ بڑی شدت سے خواہاں تھیں۔ دو سال بعد عراق کے خلاف خلیج کی جنگ نے یہ موقع مہیا کر دیا۔ صدام حسین کی ظالمانہ آمریت کے تحت عراق نے اگست 1990ء میں تیل کی دولت سے مالا مال اپنے چھوٹے سے ہمسائے ملک کویت پر قبضہ کر لیا۔

اس موقع پر بش کو امریکی ووٹروں میں اپنی مقبولیت بڑھانے کے لیے کسی چیز کی ضرورت تھی۔ "واشنگٹن پوسٹ" نے اکتوبر میں رپورٹ شائع کی: "اس کی اپنی پارٹی میں کچھ مبصرین پریشان ہیں کہ صدر ملک کے اندر اپنی حمایت کو مزید کمزور ہونے سے بچانے کے لیے جنگ شروع کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

31 اکتوبر کو عراق کے خلاف جنگ کا ایک خفیہ فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ اقوام متحدہ نے کویت پر حملے کے ردعمل کے طور پر عراق کے خلاف پابندیاں عائد کر دیں۔ سینیٹ کو پیش کی جانے والی سی آئی کی ایک خفیہ شہادت میں اس بات کی تصدیق کی گئی کہ پابندیوں کی وجہ سے عراق کی درآمدات اور برآمدات میں 90 فی صد کمی ہو چکی ہے۔ لیکن بش جنگ کا تہیہ کر چکا تھا۔ نومبر کے انتخابات میں کانگریس میں ڈیموکریٹس کی کامیابی کے بعد بش نے خلیج میں افواج کی تعداد دوگنا کر کے 500,000 کر دی جو کہ اب واضح طور پر دفاعی فوج کے بجائے جارح فوج بن چکی تھی۔

"نیویارکر" کی نامہ نگار الزبتھ ڈریو کے مطابق، بش کا ایڈی "جان سونونو" لوگوں کو بتا رہا تھا کہ ایک مختصر اور کامیاب جنگ صدر کے لیے بہت بڑا سیاسی اثاثہ ثابت ہوگی اور اس کے دوبارہ انتخابات کی ضمانت ہوگی۔" یہ بات اور مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے ذخائر میں فیصلہ کن حیثیت حاصل کرنے کی امریکہ کی دیرینہ خواہش عراق کے خلاف جنگ شروع کرنے کے فیصلے میں اہم عناصر تھے۔

لیکن یہ محرکات امریکی عوام کے سامنے پیش نہیں کیے گئے تھے بلکہ یہ بتایا گیا تھا کہ امریکہ کویت کو عراقی کنٹرول سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ میڈیا کا بڑا حصہ اسی وجہ پر ارتکاز کیے ہوئے تھا، بغیر یہ سوچے سمجھے کہ دوسرے ممالک پر بھی حملے کیے گئے تھے لیکن امریکہ نے اس قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا (ایران پر عراق، لبنان پر اسرائیل، موزمبیق پر جنوبی افریقہ نے حملے کیے تھے، ان ممالک کی بات کو الگ رہنے دیجیے جن پر امریکہ نے خود حملے کیے تھے مثلاً گریناڈا اور پانامہ)۔

جنگ کا جواز جو بہت زیادہ پرزور نظر آتا تھا وہ یہ تھا کہ عراق ایٹم بم بنا رہا تھا، لیکن اس کی شہادتیں بہت کمزور تھیں۔ فرض کریں اگر عراق ایک سال یا دو سال میں بم بنا بھی لیتا (یہ ایک بہت زیادہ قنوطیانہ اندازہ ہے) تو اس کے پاس اسے کہیں پھینکنے کا نظام ہی موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اسرائیل کے پاس پہلے ہی ایٹمی ہتھیار موجود تھے، اور امریکہ کے پاس شاید یہ تیس ہزار کے قریب ہیں۔ بش انتظامیہ عراق بم کے بارے میں قوم میں ایک مراق پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی جو کہ ابھی تک وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔

بش جنگ پر تلا ہوا نظر آتا تھا۔ حملے کے فوراً بعد کویت سے عراقی انخلا کے لیے بہت سے امکانات موجود تھے جن میں ایک عراقی تجویز بھی شامل تھی جس کے بارے میں "نیوز ڈے" کے نمائندے

"نٹ رائس" نے بھی لکھا تھا۔ لیکن امریکہ کی جانب سے کوئی ردعمل نہ دکھایا گیا۔ جب وزیر خارجہ جیمز بیکر عراقی وزیر خارجہ طارق عزیز سے ملاقات کے لیے جنیوا گیا تو بش کی جانب سے کسی قسم کی گفت و شنید نہ کرنے کا حکم تھا۔

صدام حسین کے خطرے کو کئی ماہ تک بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے باوجود مختلف سروے کے نتائج کے مطابق آدھی سے کم عوام فوجی کارروائی کے حق میں تھی۔

جنوری 1991ء میں بش نے بظاہر حمایت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کانگریس سے اسے جنگ کرنے کا اختیار تفویض کرنے کو کہا۔ کانگریس میں پرزور بحث ہوئی۔ (ایک موقع پر سینیٹ میں ایک تقریر کے دوران گیلری میں موجود مظاہرین نے "تیل کے بدلے کوئی خون نہیں" کے نعروں سے مداخلت کرنے کی کوشش کی، جن کو گارڈز نے باہر نکال دیا) سینیٹ نے صرف چند ووٹوں کی برتری سے فوجی کارروائی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ایوان نے اس قرارداد کی بھاری اکثریت سے مخالفت کی تاہم جب بش نے عراق پر حملے کا حکم دے دیا تو دونوں ایوانوں نے صرف چند ایک اختلافی ووٹوں کے جن میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز دونوں شامل تھے جنگ کی حمایت اور فوج کی حمایت میں ووٹ ڈالے۔

جنوری 1991ء کے وسط میں جب صدام حسین نے کویت خالی کرنے کے الٹی میٹم کو مسترد کر دیا امریکہ نے عراق کے خلاف اپنی فضائی جنگ کا آغاز کر دیا۔ اسے "ڈیزرٹ سٹارم" کا نام دیا گیا۔ حکومت اور میڈیا نے ایک خوفناک فوجی طاقت کی جو تصویر پیش کی تھی عراق اس کے عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ امریکی ایئر فورس کو مکمل فضائی تسلط حاصل تھا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق بمباری کر رہی تھی۔

صرف یہی نہیں بلکہ امریکی آفیشلز کو ہوائی مواصلات پر بھی مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ امریکی عوام کو ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے "سمارٹ بموں" اور پُر اعتماد بیانات کے ذریعے مکمل یقین دلایا گیا تھا کہ لیزر بم پوری درستگی کے ساتھ صرف فوجی اہداف پر گرائے جا رہے ہیں۔ ابلاغ عامہ کے اہم نیٹ ورک ان دعووں کو بغیر کسی اعتراض یا تنقید کے پیش کر رہے تھے۔

"اسمارٹ بموں" پر اس اعتماد نے کہ سویلین آبادیاں مکمل طور پر محفوظ ہیں عوامی رائے کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جو کہ پہلے جنگ کے حق میں برابر برابر تقسیم تھی اب تقریباً 85 فی صد حملے کے حق میں ہو چکی تھی۔ شاید عوامی حمایت جیتنے میں اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ جب امریکی فوج مصروفِ عمل ہو چکی تھی، بہت سے لوگ جو پہلے فوجی کارروائی کی مخالفت کر رہے تھے اب اس پر تنقید کرنا ان فوجیوں کے خلاف بے وفائی خیال کرتے تھے، جو وہاں لڑ رہے تھے۔ پوری قوم میں پیلے فیتے عراق میں فوج کی حمایت کی علامت کے طور پر باندھے جا رہے تھے۔

حقیقت میں عوام کو عراق کے شہروں پر گرائے جانے والے بموں کے "سمارٹ" ہونے کے

بارے میں دھوکا دیا جا رہا تھا۔ "بوسٹن گلوب" کے ایک نامہ نگار نے انٹیلی جنس اور ایئر فورس کے سابقہ آفیسرز سے بات چیت کرنے کے بعد رپورٹ دی کہ غالباً آپریشن "ڈیزرٹ سٹارم" میں گرائے جانے والے 40 فی صد لیزر گائیڈڈ بم اپنے ہدف سے ہٹ کر گرے۔ "رائٹرز" کی رپورٹ کے مطابق عراق پر ہوائی حملوں میں پہلے لیزر گائیڈڈ بم استعمال کیے گئے لیکن چند ہفتوں کے اندر "بی 52" کا استعمال شروع کر دیا گیا جو صرف روایتی بم لے کر جا سکتے ہیں، اس کا مطلب اب زیادہ بلا امتیاز بمباری تھا۔

صدر ریگن کے وزیر بحریہ "جان لیمن" کے تخمینے کے مطابق وہاں ہزاروں سویلین مارے گئے تھے۔ عراق سے "رائٹر" کے ایک مراسلے میں بغداد کے جنوب میں 73 کمروں پر مشتمل ایک ہوٹل کی تباہی کے بارے میں بتایا گیا اور ایک مصری شاہد کے حوالے سے بتایا گیا کہ "انہوں نے فیملیز سے بھرے ہوئے ہوٹل کو نشانہ بنایا اور وہ اسے پھر نشانہ بنانے کے لیے دوبارہ آئے۔"

امریکی رپورٹروں کو جنگ کے مناظر کا قریبی مشاہدہ کرنے سے روکے رکھا گیا، اور ان کے بھیجے گئے مراسلات کو سنسر کیا جاتا تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ویت نام جنگ میں سویلین کی اموات نے کس طرح عوامی رائے کو متاثر کیا تھا، امریکی حکومت اس مرتبہ ایسی کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

فروری کے وسط میں امریکی طیاروں نے ایک ہوائی حملے کے دوران صبح چار بجے بغداد میں ایک پناہ گاہ پر بم برسائے جس میں 400 سے 500 افراد مارے گئے۔ "ایسوسی ایٹڈ پریس" کے ایک نمائندے نے جو ان چند نمائندوں میں سے تھا جنہیں موقع پر جانے کی اجازت دی گئی تھی بتایا: "اکثر لاشیں اس قدر پچکی گئی تھیں کہ ان کی شناخت ممکن نہیں تھی، ان میں کچھ صاف طور پر بچوں کی لاشیں تھیں۔" پینٹاگون نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ ایک فوجی ہدف تھا لیکن موقعے پر موجود اے پی کے رپورٹر نے بتایا کہ "ملبے میں سے کسی قسم کی فوجی موجودگی کی شہادت نہیں ملی۔" موقع کا معائنہ کرنے والے دوسرے رپورٹروں نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔

جنگ کے بعد واشنگٹن کے پندرہ نیوز بیورو چیفس نے ایک مشترکہ بیان میں شکایت کی کہ خلیج جنگ کے دوران پینٹاگون نے "امریکی پریس پر مکمل اپنا کنٹرول رکھا۔" لیکن جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو ٹیلی ویژن کے سرکردہ نیوز مبصرین کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ امریکہ کی حکومت کے لیے کام کر رہے ہوں۔ جب سوویت حکومت نے عراق کو کویت سے باہر نکالتے ہوئے زمینی جنگ شروع کرنے سے قبل گفت و شنید کی کوشش کی تو "سی بی ایس" کے ایک اعلیٰ نامہ نگار "لیسلے سٹاہل" نے دوسرے رپورٹروں سے سوال کیا: "کیا یہ ایک ڈراؤنے خواب کا منظر نامہ نہیں ہے؟ کیا روسی ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کر رہے؟"

جنگ شروع ہونے کے محض چھ ہفتے بعد جنگ کا آخری مرحلہ زمینی حملہ تھا، ہوائی جنگ کی

طرح حقیقتاً اس میں بھی کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ یقینی فتح کے ساتھ اور عراقی فوج کے مکمل فرار کی حالت میں امریکی طیاروں نے پسپا ہوتے ہوئے فوجیوں پر بمباری جاری رکھی جو کویت شہر سے نکلنے والی شاہراہ پر ہجوم کیے ہوئے تھے۔ ایک رپورٹر نے اس منظر کو "ایک شعلے اگلتی جہنم قرار دیا...... ایک دہشت ناک منظر...... ریت پر شرق اور مغرب میں فرار ہونے والوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

جنگ کے انسانی نتائج روح کو ہلا دینے والے تھے جب کہ اس کے اختتام پر یہ حقائق سامنے آئے کہ عراق پر بمباری ہزاروں بچوں کے لیے بھوک، بیماری اور ہلاکت لے کر آئی تھی۔ ہارورڈ کی ایک میڈیکل ٹیم کی مئی کی رپورٹ میں کہا گیا کہ بچوں کی ہلاکت میں تیزی سے اضافہ ہوا، اور سال کے پہلے چار مہینوں کے دوران (جنگ 15 جنوری سے شروع ہو کر 28 فروری کو ختم ہوئی) گزشتہ سال کے اسی عرصے کے مقابلے میں پچپن ہزار زائد بچے موت کا شکار ہوئے۔

بغداد میں بچوں کے ہسپتال کے ڈائریکٹر نے نیویارک ٹائمز کے نمائندے کو بتایا کہ بمباری کی مہم کی پہلی رات کو بجلی منقطع ہو گئی۔ "ماؤں نے انکیوبیٹرز سے اپنے بچے اٹھا لیے ان کے بازوؤں سے وریدی انجکشنوں کی سوئیاں نکال دیں۔ دوسرے بچوں کو آکسیجن ٹینٹوں سے نکال لیا گیا اور وہ بھاگ کر تہہ خانے میں چلی گئیں جہاں سردی سے بچنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ بمباری کے پہلے 12 گھنٹوں کے دوران 40 قبل از وقت پیدا ہونے والے بچے موت کے منہ میں چلے گئے۔

اگر چہ جنگ کے دوران صدام حسین کو امریکی آفیشلز اور پریس نے ایک دوسرے ہٹلر کے طور پر پیش کیا، جنگ بغداد میں داخل ہوئے بغیر صدام حسین کو اقتدار میں چھوڑتے ہوئے اختتام کو پہنچ گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ اسے محض کمزور کرنا چاہتا تھا، ایران کے خلاف ایک توازن کے طور پر رکھنے کے لیے اسے ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خلیج کی جنگ سے پہلے کے سالوں کے درمیان روایتی "طاقت کے توازن" کی حکمت عملی کے حصے کے طور پر مختلف اوقات میں عراق اور ایران کی حمایت کرتے ہوئے دونوں کے آگے ہتھیار بیچے تھے۔

اس لیے جیسے ہی جنگ ختم ہوئی۔ امریکہ نے ان باغیوں کی حمایت نہ کی جو صدام کی حکومت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ "نیویارک ٹائمز" کے مطابق "صدر بش نے عراق کے بکھرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے، بغیر امریکی مداخلت کے صدام حسین کو ملک کے اندر بغاوت کو کچلنے کا موقع دینے کا فیصلہ کیا ہے۔" اس کے نتیجے میں کرد اقلیت جو صدام حسین کے خلاف بغاوت کر رہی تھی بے یار و مددگار رہ گئی۔ اور عراق میں صدام دشمن اکثریت کو بھی پھانسیوں پر جھولنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

جنگ نے امریکہ میں ایک خطرناک عرب دشمن نسل پرستی کو جنم دیا، جس میں عرب امریکیوں کو ذلیل کیا جاتا، زدوکوب کیا جاتا، یا جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دی جاتیں۔ گاڑیوں کے بمپرز پر سٹکرز

دکھائی دینے لگے جن پر لکھا ہوتا ''میں عراقیوں کے لیے بریک نہیں لگاتا''۔ٹولیڈو، اوہایو میں ایک عرب امریکی بزنس مین کو زدوکوب کیا گیا۔

ڈیموکریٹک پارٹی نے بش انتظامیہ کا ساتھ دیا۔ یہ نتائج سے خوش تھی۔ اسے سویلین کی اموات کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں تھیں۔ لیکن اس نے کسی مخالفت کو جنم نہ دیا۔

صدر جارج بش مطمئن تھا۔ جیسے ہی جنگ ختم ہوئی اس نے ایک ریڈیو نشریے میں اعلان کیا:

''ویت نام کے بھوت کو جزیرہ نما عرب کے ریگستان کی ریت میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا۔''

اسٹیبلشمنٹ پریس بھی پوری طرح متفق تھا۔ دو بڑے نیوز میگزینوں ''ٹائمز'' اور نیویارک نے جنگ کی کامیابی پر خوشی مناتے ہوئے خصوصی شمارے شائع کیے۔ اس بات کا خصوصی ذکر کیا گیا کہ صرف چند سو امریکی ہلاک ہوئے تھے۔ انہوں نے عراقی اموات کا کوئی ذکر نہ کیا۔ ''نیویارک ٹائمز'' کے ایک اداریے میں لکھا گیا: ''خلیج فارس کی جنگ میں امریکی فتح...امریکی فوج کو مخصوص بریت سے سرفراز کرتی ہے جس نے اپنی فائری طاقت اور حرکت پذیری کی صلاحیت کو بڑی ہوشیاری سے استعمال کیا ہے اور اس عمل میں ویت نام میں اپنی پرملال مشکلات کی یادداشتوں کو مٹا دیا ہے۔''

برکلے میں ایک سیاہ فام شاعر ''جون جورڈن'' کا نقطۂ نظر مختلف تھا: ''یہ چرس کے نشے کی طرح کا ایک خمار ہے جو زیادہ عرصہ نہیں رہے گا۔''

غیر مشتہر مزاحمت

1990ء کے عشرے کی ابتدا میں ''نیوز ریپبلک'' میگزین کے ایک لکھاری نے ''نیویارک ٹائمز'' میں امریکی دانشوروں میں خطرناک طور پر غیر محب الوطن عناصر کے اثرات کے بارے میں ایک کتاب پر اعتراضی تبصرہ کرتے ہوئے اپنے قارئین کو امریکہ میں ''ایک مستقل مخالفانہ کلچر'' کی موجودگی سے متنبہ کیا تھا۔

یہ بلا کم و کاست ایک درست مشاہدہ تھا۔ واشنگٹن میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز کے سیاسی اتفاق رائے کے باوجود جس نے اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنی جگہ پر مضبوط ہے، قومی فوجی طاقت کو برقرار رکھا گیا ہے، دولت اور اقتدار چند ہاتھوں میں ہے، امریکی اصلاح کی حدود مقرر کر رکھی تھیں، لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ ایسے موجود تھے جو یا تو عملی طور یا پھر خاموشی سے ان کے ساتھ چلنے سے انکاری تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا میڈیا پر شاید ہی تذکرہ ملتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ ''مستقل مخالفانہ کلچر'' تشکیل دے رکھا تھا۔

کارٹر کے دورِ صدارت میں ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف ایک چھوٹی لیکن پرعزم تحریک پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ اس کے بانی امن پسند عیسائیوں کا ایک چھوٹا سا گروپ تھا جو کہ ویت نام جنگ کے خلاف سرگرم رہا تھا (ان میں ایک سابقہ پادری ''فلپ بیری گن اور اس کی بیوی، ایک سابقہ نن الزبتھ میک السٹر بھی شامل تھے)۔ اس گروپ کے ممبران گاہے بگاہے وائٹ ہاؤس اور پینٹاگون میں ممنوعہ علاقوں میں داخل ہوتے ہوئے، جنگی مشینوں کی علامات پر اپنا خون گراتے ہوئے، ایٹمی جنگ کے خلاف ڈرامائی غیر متشدد کارروائیوں کے جرم میں گرفتار ہوتے رہے تھے۔

1980ء میں سرگرم امن پسند افراد کے چھوٹے چھوٹے وفود نے پینٹاگون میں مظاہروں کا ایک سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا، جن میں غیر متشددانہ سول نافرمانیوں کی کارروائیوں میں ایک ہزار سے زائد گرفتار کیے جا چکے تھے۔

اگلے عشرے میں ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف یہ مہم جیل جانے کے لیے تیار مردوں اور خواتین

کی ایک مختصر سی تعداد سے آگے بڑھتے ہوئے ایک قومی مہم کی صورت اختیار کر گئی۔ ایٹمی "ہولوکاسٹ" کے خیال سے خوفزدہ اور ہتھیاروں کی تیاری پر بلین ڈالر خرچ کرنے پر برہم اور نالاں امریکی، جب لوگ بنیادی ضروریاتِ زندگی کو ترس رہے تھے سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

حتیٰ کہ وسطی امریکہ پنسلوانیا کے اُن ارکانِ جیوری نے بھی جنہوں نے احتجاج کرنے والوں کے ایک گروپ (جو "ا پلو شیئر ایٹ" کہلاتا تھا۔ انہوں نے اپنا یہ نام بائیبل کی ایک آیت کی مناسبت سے رکھا تھا جس میں کہا گیا ہے "تلواروں سے ہلوں کے پھل بنا لینے چاہئیں) کو سزا دی تھی، ان کی کارروائیوں کے ساتھ حیران کن ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ جیوری کے ایک رکن "میری این انگرام" نے کہا: "ہم ...... حقیقت میں انہیں کسی بات پر سزا نہیں دینا چاہتے تھے...... یہ لوگ مجرم نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک کے لیے کچھ اچھا کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جج نے کہا کہ ایٹمی قوت مسئلہ نہیں تھا۔"

ریگن کا خطیر فوجی بجٹ ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف قومی تحریک کا باعث بنا تھا۔ 1980ء کے انتخابات میں جن کے نتائج میں وہ صدارت پر فائز ہوا، مغربی میساچوسٹس کے تین اضلاع میں ووٹروں کو اس سوال کا جواب دینے کی بھی اجازت دی گئی کہ کیا وہ اس حق میں ہیں کہ سوویت یونین اور امریکہ باہمی رضامندی کے ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات، تیاری اور پھیلاؤ کو روکنے کی تدبیر کریں، اور ان فنڈز کو ان کے بجائے سویلین استعمال کے لیے مختص کر دیں۔ دو امن گروپس نے اس مہم پر کئی ماہ کام کیا اور تمام تین اضلاع نے اس قرارداد کے حق میں رائے دی (94,000 میں سے 65,000 نے) حتیٰ کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے ریگن کی صدارت کے لیے ووٹ ڈالے تھے۔ اس قسم کے ریفرنڈموں استصوابات رائے نے 1978ء اور 1981ء کے دوران سان فرانسسکو، برکلے، اوک لینڈ، میڈی سن اور ڈیٹرائٹ میں اکثریتی ووٹ حاصل کیے تھے۔

ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف تحریک میں خواتین صفِ اول میں تھیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کی ایک نوجوان ماہر خاتون "رینڈل فورس برگ" نے "کونسل فار اے نیوکلیئر ویپنز فریز" (ایٹمی ہتھیاروں کو منجمد کرنے کی کونسل) تشکیل دی جس کا مقصد محض سوویت یونین اور امریکہ کے باہمی تعاون کے ذریعے نئے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کو منجمد کرنا تھا۔ اس نے تیزی سے پورے ملک میں مقبولیت حاصل کر لی۔ ریگن کے انتخاب کے تھوڑے عرصے کے بعد دو ہزار خواتین واشنگٹن میں جمع ہوئیں اور پینٹاگون کی جانب مارچ کی، ایک دوسرے کے ہاتھ اور شوخ رنگوں کے سکارف کے سروں کو تھام کر انہوں نے پوری عمارت کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ایک سو چالیس خواتین کو پینٹاگون کے داخلی راستے کو بلاک کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

ڈاکٹروں کے ایک چھوٹے سے گروپ نے لوگوں کو ایٹمی جنگ کے طبی نتائج سے آگاہ کرنے

کے پورے ملک میں جلسوں کے انعقاد کا پروگرام شروع کیا۔ وہ "فزیشنز فار سوشل ریسپانسبیلٹی" کے روحِ رواں تھے اور گروپ کی صدر ڈاکٹر "ہیلن کالڈی کوٹ" تحریک کی ایک طاقتور اور شعلہ بیان قومی لیڈر بن گئی۔

ریگن انتظامیہ کے ابتدائی دنوں میں کیتھولک بشپوں کے ایک قومی سطح کے اجلاس میں اکثریت نے ایٹمی ہتھیاروں کے کسی بھی استعمال کی مخالفت کی۔ 1981ء میں ایٹمی جنگ کے مسئلے پر پورے ملک میں 151 کالجوں کے کیمپسوں میں اجلاس ہوئے۔ اور اس ماہ بوسٹن میں مقامی انتخابات کے موقع پر ایک قرارداد جس میں کہا گیا تھا کہ "ایٹمی ہتھیاروں اور بیرونِ ملک مداخلت کے پروگراموں پر خرچ کی جانے والی ہماری ٹیکسوں کی رقم میں کمی کر کے سماجی پروگراموں پر خرچ کی جانے والی وفاقی رقوم میں اضافہ کیا جائے" بوسٹن کے تمام بائیس وارڈوں میں جن میں سفید فام اور سیاہ فاموں کے محنت کشوں کے علاقے بھی شامل تھے اکثریت رائے سے منظور کی گئی۔

12 اکتوبر 1982ء کو سنٹرل پارک نیویارک میں ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا سیاسی مظاہرہ ہوا۔ ہتھیاروں کی دوڑ کے خاتمے کے لیے اپنے پختہ عزم کے اظہار کے لیے تقریباً دس لاکھ کے قریب لوگ جمع ہوئے۔

وہ سائنسدان جو ایٹم بم پر کام کر چکے تھے وہ بھی اس پروان چڑھتی ہوئی تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں کیمسٹری کا پروفیسر "جارج کیسٹیا کواسکی" جس نے پہلے ایٹم بم پر کام کیا تھا اور بعد میں صدر آئزن ہاور کا سائنسی مشیر رہا تھا، تخفیفِ اسلحہ تحریک کا ترجمان بن گیا۔ بیاسی سال کی عمر میں کینسر کی وجہ سے اپنی موت سے قبل اس کا آخری عوامی بیان دسمبر 1982ء میں "بلٹن آف اٹامک سائنٹسٹس" کے ایک اداریے میں شائع ہوا تھا: "آپ سے رخصت ہوتے ہوئے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ چھوٹی چیزوں کو بھول جائیں۔ دنیا کے ایک دھماکے سے پھٹ جانے میں زیادہ وقت نہیں بچا۔ اس کے بجائے تمام ہم خیال لوگوں کو ایک جگہ منظم کرنے پر توجہ دیں امن کے لیے ایک ایسی عوامی تحریک کو جنم دیں، جو اس سے پہلے کبھی وجود میں نہ آئی ہو۔"

1983ء کے موسم بہار تک پورے ملک سے 368 شہری اور کاؤنٹی کونسلوں، 144 ٹاؤن میٹنگز اور 77 ریاستی مجالسِ قانون ساز اور ایوان نمائندگان کی جانب سے ایٹمی انجماد کے پروگرام کی توثیق کی گئی۔ اس وقت کے ایک "ہیرس" پول سروے سے یہ بات سامنے آئی کہ 79 فی صد عوام سوویت یونین کے ساتھ ایٹمی انجماد کے معاہدے کے خواہاں ہیں۔ حتیٰ کہ اناجیل کلیسا کے عیسائیوں (40 ملین افراد جن کو قدامت پسند اور ریگن کے حامی خیال کیا جاتا تھا) میں بھی ایک گیلپ سروے کے مطابق ساٹھ فی صد افراد ایٹمی انجماد کے حق میں تھے۔

سنٹرل پارک کے عظیم عوامی مظاہرے کے ایک سال بعد ملک میں تین ہزار سے زائد جنگ مخالف گروپ موجود تھے۔ اور ایٹمی اسلحہ کے خلاف جذبات کتابوں میں، میگزین مضامین میں، ڈراموں میں، فلموں میں نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ ''جوناتھن شیل'' کی اسلحہ کی دوڑ کے خلاف لکھی گئی ایک جذباتی اور پرجوش کتاب ''دافیٹ آف دی ارتھ'' کا شمار سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں ہوتا تھا۔ اسلحہ کی دوڑ پر کینیڈا میں تیار کی جانے والی ایک ڈاکومنٹری فلم کا ملک میں داخلہ ریگن انتظامیہ نے ممنوع قرار دے دیا، لیکن وفاقی عدالت نے یہ قدغن ختم کر دی۔

تین سال سے بھی کم عرصے میں عوامی رائے میں ایک حیران کن تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ ریگن کے انتخاب کے موقع پر قوم پرستی کے جذبات (جس نے ایران میں یرغمالیوں کے حالیہ بحران اور افغانستان میں روسی حملے کے نتیجے میں فروغ پایا تھا) بہت شدید تھے۔ یونیورسٹی آف شکاگو کے ایک سروے کے مطابق رائے دہی میں حصہ لینے والوں میں سے صرف 12 فی صد نے کہا کہ ہتھیاروں پر بہت زیادہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب 1982 کے موسم بہار میں ایک اور پول سروے کیا گیا تو ان کی تعداد 32 فی صد ہو گئی تھی اور 1983ء کے موسم بہار میں ''نیویارک ٹائمز اور سی بی ایس نیوز'' کے زیر انتظام ایک پول سروے کے مطابق ان کی تعداد میں اضافہ ہو کر 48 فی صد ہو گئی تھی۔

فوج دشمن جذبات نے فوج میں بھرتی کے خلاف مزاحمت کی شکل میں بھی اپنا اظہار کیا۔ جب صدر جمی کارٹر افغانستان پر سوویت یونین کے حملے کے ردعمل میں نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کے اندراج کے لیے کہا تو 800,000 سے زائد افراد نے اپنا اندراج نہ کروایا۔ ایک ماں نے نیویارک ٹائمز کو لکھا:

محترم ایڈیٹر! تیس سال قبل میں شمشان گھاٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ دنیا کی مہیب ترین طاقت اٹل فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے زندگی کے چکر سے نکال دیا جانا چاہیے.... کہ مجھے زندگی دینے کی خوشی سے کبھی آشنا نہیں ہونا چاہیے۔ عظیم بندوقوں اور شدید نفرت کے ساتھ یہ طاقت اپنے آپ کو زندگی کی طاقت کا ہمسر خیال کرتی تھی۔

میں ان عظیم بندوقوں سے بچ کر نکل آئی اور میرے بیٹے کی ہر مسکراہٹ کے ساتھ یہ چھوٹی سے چھوٹی ہوتی چلی گئیں۔ میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی کہ اپنے بیٹے کا خون بندوقوں کی اگلی نسل کو تیل دینے کے لیے پیش کروں۔ میں نے اپنے آپ کو اور اپنے بیٹے کو موت کے چکر سے نکال لیا ہے۔

''ازیلا لیٹز''

پینٹا گون کے ایک سابقہ رپورٹر ''ولیم میچز'' نے نومبر 1981ء میں لکھا کہ ''امریکہ کی نئی ایٹمی سٹرٹیجی پر عدم اطمینان اور بدگمانی کے اظہار کے طور پر یورپ کی سڑکوں اور حال ہی میں امریکی تعلیمی

اداروں میں مظاہروں سے ریگن نہ صرف پریشانی بلکہ گھبراہٹ کا شکار ہو گیا۔'' اس مخالفت کو ڈرا دھمکا کر ختم کرنے کی امید میں ریگن انتظامیہ نے فوج میں بھرتی کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کو سزائیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان میں سے قید کا سامنا کرنے والے ایک شخص ''بنجمن ساسوے'' نے ایل سلواڈور میں امریکہ کی فوجی مداخلت کو بھرتی کے لیے اندراج نہ کرانے کی ایک معقول وجہ کے طور پر پیش کیا۔

1981ء کے اس موسم بہار میں تقسیم اسناد کی تقریبات میں جب ریگن کے وزیر خارجہ ''الیگزینڈر ہیگ'' کو ''عوامی خدمات'' کے اعتراف میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری پیش کی گئی تو دو سو طالب علموں اور تدریسی عملے نے احتجاج کے طور پر سٹیج کی جانب اپنی پشتیں پھیر لیں۔ پریس رپورٹ کے مطابق: ''مسٹر ہیگ کے پندرہ منٹ کے خطاب کے دوران تقریباً ہر وقفے میں ''انسانی ضروریات، نہ کہ فوجی حریص پن''، ''ایل سلواڈور سے نکلو''، ''واشنگٹن کی بندوقیں امریکی ننوں کی قاتل'' کے نعرے لگائے گئے۔

آخری نعرے میں 1980ء میں سلواڈورن فوجیوں کے ہاتھوں ماری جانے والی چار امریکی ننوں کی جانب اشارہ تھا۔ ایل سلواڈور میں ہر سال ان ''ڈیتھ سکواڈز'' کے ہاتھوں ہزاروں آدمی مارے جا رہے تھے جن کی سرپرستی وہاں کی حکومت کر رہی تھی اور امریکہ انہیں اسلحہ مہیا کر رہا تھا، اور اب امریکی عوام نے اس جانب توجہ دینا شروع کر دی تھی۔

عوامی رائے کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ 1982ء کے موسم بہار میں ''نیویارک ٹائمز اور سی بی ایس نیوز'' کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق پول میں حصہ لینے والے افراد میں سے صرف 16 فی صد نے ایل سلواڈور کو فوجی اور معاشی امداد دینے کے ریگن کے پروگرام کی حمایت کی تھی۔

80 کے عشرے کی ابتدا میں امریکی پریس میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی تھی کہ کالج طلبا کی نئی نسل کی سیاسی اپچ محض اپنے کریئر تک ہی محدود ہے۔ لیکن جب جون 1983ء میں ہارورڈ میں تقسیم اسناد کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے میکسیکو کے مصنف ''کارلوس فیونٹس'' نے لاطینی امریکہ میں امریکی مداخلت پر تنقید کی اور کہا'' کیونکہ ہم تمہارے مخلص دوست ہیں، ہم آپ کو لاطینی امریکہ کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دیں گے، جس طرح سوویت یونین وسطی یورپ اور وسطی ایشیا کے معاملات میں مداخلت کرتا ہے'' تو اسے بیس مرتبہ تالیوں کی گونج میں وقفہ لینا پڑا اور جب اس نے تقریر ختم کی تو اسے نمایاں طور پر داد و تحسین کا نذرانہ پیش کیا گیا۔

بوسٹن یونیورسٹی میں خود میں نے بھی اپنے طلبا میں اس قسم کی خود غرضی اور دوسروں سے لاتعلقی نہیں دیکھی تھی جس کا میڈیا 80 کے عشرے کے طلبا کے بارے میں مسلسل پروپیگنڈا کر رہا تھا۔ ایک طالب علم نے اپنے کلاس جرنل میں لکھا: ''میں روکس بری (ایک سیاہ فام متصل علاقہ) میں کام کرتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ حکومت کام نہیں کرتی۔ روکس بری کے لوگوں یا کسی بھی دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے کام

نہیں کرتی۔ یہ لوگوں کے کام پیسوں کے عوض کرتی ہے۔"

تعلیمی اداروں سے باہر، دیہاتی علاقوں میں بھی حکومتی پالیسیوں کی مخالفت موجود تھی لیکن اس کی زیادہ تشہیر نہیں تھی۔ اریزونا کے قصبے ٹیوسان میں ایک ہزار سے زیادہ افراد نے جلوس کی شکل میں مارچ کیا اور پھر اس جلسے میں شرکت کی جو آرچ بشپ "آسکر رومیرو" کی یاد میں اس کے قتل کی برسی کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا، جس نے سلواڈور کے ان ڈیتھ سکواڈ کے خلاف بات کی تھی۔

ساٹھ ہزار سے زیادہ امریکیوں نے "مزاحمت کے معاہدے" پر دستخط کیے جس میں وعدہ لیا گیا تھا کہ اگر ریگن نے نکاراگوا پر حملہ کیا تو وہ کسی نہ کسی قسم کی کارروائی جس میں سول نافرمانی بھی شامل تھی ضرور کریں گے۔ جب صدر نے اس کی حکومت کو اقتدار سے ہٹانے کی کوشش میں اس چھوٹے سے ملک کی ناکہ بندی کر دی، تو پورے ملک میں پرزور مظاہرے ہوئے۔ صرف بوسٹن میں ناکہ بندی کے خلاف احتجاج کے جرم میں 550 افراد کو گرفتار کیا گیا۔

ریگن کی صدارت میں اس کی پالیسیوں کے خلاف جنوبی افریقہ میں سینکڑوں کارروائیاں کی گئیں۔ وہ صریحاً یہ نہیں چاہتا تھا کہ جنوبی افریقہ کی سفید فام حکمران اقلیت کی جگہ انقلابی "افریقن نیشنل کانگریس لے لے جو کہ سیاہ فام اکثریت کی نمائندگی کرتی تھی لیکن عوامی رائے اس قدر شدید تھی کہ کانگریس نے 1986 میں صدر کے ویٹو کو منسوخ کرتے ہوئے جنوبی افریقہ کی حکومت کے خلاف معاشی پابندیوں کا مسودہ پاس کر دیا۔

ریگن کی سوشل سروسز میں کمی کو مقامی سطح پر محسوس کیا گیا اور اس کے خلاف پرغضب ردعمل ہوئے۔ 1981ء کے موسم بہار اور گرما میں مشرقی بوسٹن کے باشندے سڑکوں پر نکل آئے اور پینتالیس راتوں تک انہوں نے آگ، پولیس اور اساتذہ کے لیے فنڈز میں کمی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے رش کے اوقات میں بڑی بڑی شاہراہوں اور سرنگ کو بلاک کیے رکھا۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ "جان ڈوکل" نے کہا: ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے ساٹھ اور ستر کے عشروں کے احتجاج سے سبق لینا شروع کر دیا ہو۔"

"بوسٹن گلوب" کی رپورٹ کے مطابق "مشرقی بوسٹن میں زیادہ تر مظاہرین درمیانی عمر کے متوسط یا محنت کش طبقے سے تھے، جنہوں نے بتایا کہ انہوں نے اس سے پہلے کسی چیز پر بھی احتجاج نہیں کیا تھا۔"

ریگن انتظامیہ نے فنون کی ترقی کے لیے بھی وفاقی فنڈز واپس لے لیے اور مشورہ دیا کہ رقص و موسیقی اور فنون لطیفہ کے لیے نجی ڈونرز سے مدد حاصل کی جائے۔

نیویارک میں تھیٹر سے وابستہ دو سو افراد نے مظاہرہ کیا جس کے دوران وہ ڈرامے پڑھتے رہے، گیت گاتے رہے، پکٹنگ کرتے رہے اور جب پولیس نے انہیں منتشر ہونے کو کہا تو انکار کر دیا۔ اس کے بعد ایک پرتعیش پچاس منزلہ ہوٹل کو راستہ دینے کے لیے براڈوے کے دو تاریخی تھیٹر منہدم کر دیے

گئے، اور تھیٹر کی چند مشہور قومی شخصیات کو گرفتار کر لیا گیا جن میں پروڈیوسر جوزف پاپ، اداکارائیں ٹیمی گرائمز، ایسٹل پارسنز، سیلسٹ ہوم اور اداکار رچرڈ جیئر اور مائیکل موریارٹی شامل تھے۔

بجٹ میں کمی نے پورے ملک میں ہڑتالوں میں تیزی پیدا کر دی، ان میں اکثر ایسے گروپس بھی شامل ہو گئے تھے جو ہڑتالوں کے خوگر نہیں تھے۔ 1982ء کے موسم خزاں میں یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل نے رپورٹ دی: "ملازمتوں سے عارضی فراغت، تنخواہ میں کٹوتیوں، اور کام کی سیکورٹی کے بارے میں غیر یقینی صورتحال سے پریشان اور ناراض سکول ٹیچروں نے پورے ملک میں ہڑتال پر جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ پچھلے ہفتے جزیرہ رھوڈ سے واشنگٹن تک سات ریاستوں میں ٹیچرز کی ہڑتال سے 300,000 سے زیادہ طلبا بے کار بیٹھے ہوئے ہیں۔

ان نئے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے جنوری 1983ء کے پہلے ہفتے میں "بوسٹن گلوب" کے ڈیوڈ نیہان" نے لکھا: ملک کے اندر ایک لاوا پک رہا ہے جو واشنگٹن کے لیے جو اسے نظر انداز کیے ہوئے ہے کوئی اچھا شگون نہیں ہے، عوام خوفزدہ حالت سے نکل کر غیظ و غضب کے مرحلے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ لوگ جس انداز سے اپنی مایوسیوں کا اظہار کر رہے ہیں وہ پورے سول آرڈر کے ڈھانچے کو مشکل میں ڈال سکتا ہے۔" اس نے چند مثالیں بھی دیں۔

پنسلوانیا کے قصبے "ملل واشنگٹن" میں 1983ء کے اوائل میں جب ایک پچاس سال کے کمپیوٹر سائنس ٹیچر کو، جس نے ٹیچروں کی ہڑتال کی سربراہی کی تھی جیل بھیج دیا گیا تو اس کی حمایت میں 2000 طالب علموں نے جیل ہاؤس کے باہر مظاہرہ کیا اور "پٹس برگ پوسٹ گزٹ" نے اسے "1794ء میں وسکی بغاوت کے بعد واشنگٹن کاؤنٹی کا سب سے بڑا اجتماع قرار دیا۔

جب پٹس برگ کے علاقے میں بے روزگار اور دیوالیہ مالک مکان رہن کی رقمیں ادا نہ کر سکے تو ان کی بے دخلی کے احکام جاری کر دیے گئے جس پر ساٹھ متاثرین نے نیلام کے خلاف احتجاج کے طور پر عدالت کا گھیراؤ کیا، اور ایلا گینی کے شیرف یوجین کون نے کارروائی کو روک دیا۔

سپرنگ فیلڈ" کول ریڈو میں ایک 320 ایکڑ کے گندم کے فارم سے بے دخلی کو 200 غصے سے بھرے ہوئے کسانوں نے روک دیا، جن کو آنسو گیس اور میس (آنکھوں اور جلد میں چبھن پیدا کرنے والا کیمیکل) کے ذریعے منتشر کیا گیا۔

جب ریگن اپریل 1983 میں تقریر کرنے کے لیے پٹس برگ پہنچا تو تین ہزار سے زائد افراد نے، جن میں زیادہ تر بے روزگار سٹیل ورکر تھے، اس کے ہوٹل کے باہر بارش میں کھڑے ہو کر اس کے

خلاف مظاہرہ کیا۔ بے روزگار افراد ڈیٹرائٹ، فلنٹ، شکاگو، کلیولینڈ، لاس اینجلز اور واشنگٹن سمیت بیس سے زائد شہروں میں مظاہرے کر رہے تھے۔

عین اسی دوران میامی کے سیاہ فاموں نے پولیس کی سفاکی کے خلاف ہنگامے شروع کر دیے، وہ اپنی عمومی محرومیوں کے خلاف بھی ردعمل دکھا رہے تھے۔ نوجوان افریقن امریکیوں میں بے روزگاری کی شرح 50 فی صد سے بھی تجاوز کر چکی تھی، اور ریگن انتظامیہ کا غربت کا ردعمل محض مزید جیلیں تعمیر کرنے تک محدود تھا۔

ریگن کی پالیسیوں نے واضح طور پر تخفیف اسلحہ اور سماجی بہبود کے دو مسائل کو جوڑ دیا تھا۔ یہ بچوں کے مقابلے میں اسلحہ کا مسئلہ تھا جسے "چلڈرنز ڈیفنس فنڈ" کی سربراہ میرین رائٹ ایڈل مین" نے میساچوسٹس میں 1983 کے موسم گرما میں ملٹن اکیڈیمی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا تھا:

> آپ ایک ایسی قوم اور دنیا میں گریجوایشن کر رہے ہیں، جو سماجی اور معاشی دیوالیہ پن کے کنارے پر ڈگمگا رہی ہے۔ 1980ء سے ہمارا صدر اور کانگریس ہمارے قومی ہل کے پھالوں کو تلواروں میں تبدیل کر رہے ہیں اور غریب طبقے کی قیمت پر امراء کے لیے اچھی خبریں لا رہے ہیں.... جس کا بڑا شکار بچے ہیں۔

ری پبلکن امیدواروں کی مسلسل کامیابی (1980ء میں اور 1984ء میں ریگن اور 1988ء میں جارج بش) کو پریس میں "مکمل اور عظیم فتح اور" انتہائی اکثریت کے ساتھ کامیابی" جیسے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے تھے کہ تقریباً نصف آبادی نے ووٹنگ میں حصہ ہی نہیں لیا تھا اگرچہ وہ ووٹ دینے کے اہل تھے۔ ووٹ دینے کے اہل افراد میں سے 54 فی صد نے ووٹ ڈالے تھے۔ لہٰذا کل اہل ووٹوں میں سے ریگن کے لیے صرف 27 فی صد ووٹ تھے۔ دوسری ٹرم کے لیے سابقہ نائب صدر والٹر مونڈیل کے خلاف مقابلہ کرتے ہوئے ریگن نے 59 فی صد پاپولر ووٹ حاصل کیے، لیکن تقریباً آدھے ووٹروں نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اسے ووٹ دینے کے اہل افراد سے 29 فی صد نے ووٹ ڈالا۔ 1988ء میں نائب صدر جارج بش نے ڈیموکریٹک امیدوار مائیکل ڈوکاکس کے مقابلے میں 54 فی صد ووٹ حاصل کیے جو کہ اہل ووٹروں کا 27 فی صد بنتا ہے۔

عوامی رائے کے لیے کیے گئے سرویز میں جب لوگ مسائل کے بارے میں بات کرتے تو وہ ایسے خیالات کا اظہار کرتے تھے جن کی طرف نہ تو ری پبلکن اور نہ ہی ڈیموکریٹک پارٹیاں توجہ دیتی تھیں۔ مثال کے طور پر 80 اور 90 کے عشروں میں دونوں پارٹیوں نے غربا کے لیے سماجی پروگراموں کو اس بنیاد پر سختی سے محدود رکھا کہ اس کے لیے زیادہ ٹیکسوں کی ضرورت ہوگی، اور عوام زیادہ ٹیکسوں کو پسند

نہیں کرتے۔ یہ یقیناً سچ تھا کہ عمومی سطح پر امریکی ممکنہ حد تک کم سے کم ٹیکس ادا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اُن سے پوچھا گیا کہ کیا وہ مخصوص مقاصد مثلاً صحت اور تعلیم جیسے مقاصد کے لیے زیادہ ٹیکس ادا کرنے کو تیار ہیں تو ان کا جواب "ہاں" میں تھا۔ مثال کے طور پر بوسٹن کے علاقے میں 1990ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق 54 فی صد افراد زیادہ ٹیکس ادا کرنے کو تیار تھے اگر یہ ٹیکس ماحول کو صاف کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

اور جب زیادہ ٹیکس بجائے ایک عمومی سطح کے درجاتی سطح پر نافذ کرنے کی بات کی جاتی تو عوام کا ردعمل بڑا واضح تھا۔ دسمبر 1990ء میں وال سٹریٹ جرنل اور این بی سی نیوز کے ایک مشترکہ پول سے یہ بات سامنے آئی کہ 84 فی صد جواب دہندگان نے کروڑوں پتی افراد پر سرٹیکس (بڑی آمدنیوں پر زیادہ ٹیکس) کی حمایت کی۔ اگرچہ 51 فی صد جواب دہندگان "کیپٹل گین" ٹیکس میں اضافے کے حامی تھے، کسی بھی بڑی سیاسی پارٹی نے اس کی حمایت نہ کی۔

ہیرس اور ہارورڈ سکول آف پبلک ہیلتھ کے ایک 1989ء میں کیے گئے پول سروے سے پتا چلتا ہے امریکیوں کی اکثریت (61 فی صد) نے کینیڈین طرز کے ہیلتھ سسٹم کی حمایت کی، جس میں انشورنش کمپنیوں کو پیچھے رکھتے ہوئے حکومت خود ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کو ادائیگی کرتی ہے، اور ہر ایک کو ہمہ گیر طبی سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ نہ تو ڈیموکریٹک پارٹی اور نہ ہی ری پبلکن پارٹی نے اسے اپنے پروگرام کے طور پر اپنایا، اگرچہ دونوں کا اصرار تھا کہ وہ ہیلتھ کے میدان میں "اصلاح" چاہتے ہیں۔

نیشنل پریس کلب کے لیے گورڈن بلیک کارپوریشن 1992ء کے ایک پول سروے سے پتا چلتا ہے کہ تمام ووٹرز میں سے 59 فی صد پانچ سالوں میں وفاقی اخراجات میں 50 فی صد کمی کے خواہاں تھے۔ بڑی پارٹیوں میں سے کوئی بھی فوجی بجٹ میں بڑی کٹوتیوں پر راضی نہیں تھی۔

حکومت کی جانب سے غریبوں کی مدد کے بارے میں عوام کیا سوچتی تھی اس کا انحصار سوال کرنے کے طریقے پر زیادہ نظر آتا ہے۔ دونوں پارٹیاں اور میڈیا "ویلفیئر" کے بارے میں مسلسل کہتے رہتے تھے کہ یہ کام نہیں کر رہا، اور لفظ "ویلفیئر" مخالفت کی علامت بن گیا۔ جب لوگوں سے پوچھا گیا (نیویارک ٹائمز اور سی بی ایس نیوز کا 1992ء کا سروے) کہ کیا ویلفیئر کے لیے مختص رقم میں اضافہ کرنا چاہیے تو صرف 23 فی صد متفق تھے۔ لیکن جب انہی لوگوں سے پوچھا گیا کہ کیا حکومت کو غریبوں کی مدد کرنی چاہیے تو 62 فی صد لوگوں نے "ہاں" میں جواب دیا۔

یقیناً ایک ایسے نظام کو جمہوری خیال کرنے میں کوئی غلطی موجود تھی جس میں رائے دہندگان کی خواہشات کو بار بار نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ جب تک سیاسی نظام پر دو پارٹیوں کا تسلط قائم تھا ان کو بلاخوف و خطر نظر انداز کیے رکھنا آسان تھا، کیونکہ دونوں کارپوریٹ دولت سے بندھی ہوئی تھیں اور اس بنیادی معاشی

خرابی سے نمٹنے کے قابل نہیں تھیں جن کی جڑیں کسی ایک پارٹی کی صدارت سے زیادہ گہری تھیں۔

یہ معاشی خرابی اس حقیقت کی پیداوار تھی جس کے بارے میں کبھی بھی بات نہیں کی جاتی تھی، کہ امریکہ کا معاشرہ طبقاتی معاشرہ تھا، جس میں آبادی کا ایک فی صد 33 فی صد دولت پر قابض تھا، اور تیس سے چالیس ملین افراد پر مشتمل نچلا طبقہ غربت میں زندگیاں بسر کر رہا تھا۔ ساٹھ کے عشرے کے سماجی پروگراموں نے (تحفظ صحت اور طبی امداد، فوڈ سٹپ وغیرہ وغیرہ) امریکہ میں وسائل کی تاریخی غیر مساویانہ تقسیم کو جوں کا توں قائم رکھنے سے زیادہ کچھ نہ کیا۔

ڈیموکریٹس نے ری پبلکنز کی نسبت غریبوں کی زیادہ مدد کی، لیکن وہ اس معاشی نظام میں کوئی سنجیدہ تبدیلی لانے کے قابل نہیں تھے (حقیقت میں وہ اس بات کے خواہشمند ہی نہیں تھے) جس میں کارپوریٹ منافع کو انسانی ضرورت پر ترجیح دی جاتی۔

انقلابی تبدیلی کے لیے کوئی اہم قومی تحریک موجود نہ تھی، کوئی بھی سوشل ڈیموکریٹک (یا ڈیموکریٹک سوشلسٹ) پارٹی نہیں تھی، جیسا کہ مغربی یورپ کے ممالک، کینیڈا اور نیوزی لینڈ میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن پورے ملک میں برگشتگی کے ہزاروں آثار، احتجاجی مظاہرے اور مقامی کارروائیاں دیکھنے اور سننے میں آ رہی تھیں جن کا مقصد عوام کی شکایات کی جانب توجہ دلانا اور ناانصافیوں کا تدارک تھا۔

مثال کے طور پر واشنگٹن ڈی سی میں ''خطرناک فضلات'' کے لیے سٹیزنز کلیئرنگ ہاؤس نے، جو ایک گھریلو خاتون اور سرگرم سوشل ورکر ''لیوس گبز'' نے ریگن کی صدارت کے ابتدائی دور میں تشکیل دی تھی، رپورٹ دی کہ وہ پورے ملک میں آٹھ ہزار مقامی گروپس کی مدد کر رہا تھا۔

نیو ہیمپشائر کے شہر ''سی بروک'' میں ایک ایٹمی پاور پلانٹ کے خلاف کئی سالوں سے احتجاج کیا جا رہا تھا جسے وہاں کے رہائشی اپنے لیے اور اپنے خاندانوں کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے۔ 1977ء اور 1989ء کے درمیان ان احتجاجوں میں پینتیس ہزار سے زائد افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ آخرکار یہ پلانٹ مالی مسائل اور مخالفت کی وجہ سے بند کرنا پڑ گیا۔

ایٹمی حادثات کے خوف میں 1979ء میں پنسلوانیا میں ''تھری مائل آئی لینڈ'' اور 1986ء میں چرنوبل، سوویت یونین جیسے خاص طور پر خوفناک واقعات نے مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس تمام تر صورتحال نے تیزی سے پروان چڑھتی، نیوکلیئر انڈسٹری پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ 1994ء میں ''ٹینی سی ویلی اتھارٹی'' نے تین ایٹمی پلانٹوں پر تعمیر روک دی۔ جسے ''نیویارک ٹائمز'' نے ''امریکہ میں ریکٹرز کی موجودہ تعمیر کے لیے ایک علامتی موت کا پروانہ قرار دیا۔''

''منی سوٹا'' کے شہر ''میناپولس'' میں ہزاروں افراد سالہا سال سے ''ہنی ویل کارپوریشن'' کے فوجی ٹھیکوں کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے اور 1982ء اور 1988ء کے درمیان آٹھ سو سے زائد افراد کو

گرفتار کیا گیا۔

اس کے علاوہ جب اس قسم کی سول نافرمانیوں میں ملوث افراد کو عدالت میں لایا جاتا تو جیوریوں کی جانب سے انہیں ہمدردانہ حمایت ملتی اور انہیں عام شہریوں کی جانب سے بریت حاصل ہو جاتی تھی جو اس بات کو سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے فنی طور پر قانون کو توڑا بھی ہے تو انہوں نے یہ کام ایک اچھے مقصد کے لیے کیا ہے۔

1989ء میں ورمونٹ کے شہریوں کے ایک گروپ نے (ونوسکی فورٹی فور) ایک امریکی سینیٹر کے دفتر کے باہر ڈیوڑھی کو خالی کرنے سے انکار کر دیا جو کہ ''نکاراگوین کنٹراس'' کو اسلحہ دینے کے لیے اس کے ووٹ پر احتجاج کر رہے تھے، انہیں گرفتار کر لیا گیا لیکن جج نے ان سے ہمدردی کا سلوک کیا اور جیوری نے بری کر دیا۔

اس کے فوراً بعد ایک دوسرے مقدمے میں، کئی ایک افراد پر (جن میں ایک سرگرم کارکن ''ایبی ہوف مین'' اور سابقہ صدر جمی کارٹر کی بیٹی ''ایمی کارٹر'' بھی شامل تھی) یونیورسٹی آف میساچوسٹس میں سی آئی اے کے لیے بھرتی کرنے والے عملے کو داخل ہونے سے روکنے کا الزام تھا۔ انہوں نے گواہوں کے کٹہرے میں سی آئی اے کے ایک سابقہ ایجنٹ کو بلایا، جس نے جیوری کو بتایا کہ سی آئی اے پوری دنیا میں غیر قانونی اور قاتلانہ سرگرمیوں میں مصروف رہی تھی۔ جیوری نے انہیں بری کر دیا۔ کاؤنٹی کے ضلعی اٹارنی نے، جو کہ اس کیس میں استغاثہ تھا، کہا: ''متوسط امریکی نہیں چاہتے کہ ''سی آئی اے'' وہ کچھ کرتا پھرے جو وہ کر رہا ہے۔

جنوب میں جبکہ وہاں کوئی ایسی بڑی تحریک نہیں تھی جس کا تقابل ساٹھ کے عشرے کی شہری حقوق کی تحریک کے ساتھ کیا جا سکے، سینکڑوں مقامی گروپس غریب سفید فام اور سیاہ فام لوگوں کو منظم کرنے میں مصروف تھے۔ شمالی کیرولینا میں ایک مل مزدور، جو کہ صنعتی زہروں سے مر گیا تھا کی بیٹی لینڈا سٹاوٹ'' نے ''پی مونٹ پیس پروجیکٹ'' کے نام سے پانچ سو ٹیکسٹائل کارکنوں، کسانوں، گھریلو ملازمات (جن میں اکثریت کم آمدنی والی سیاہ فام خواتین کی تھی) کو ایک کثیر النسلی نیٹ ورک میں منظم کیا۔

ساٹھ کے عشرے میں ''چیکینو'' (میکسیکو سے تعلق رکھنے والے) کھیت مزدوروں نے جو کہ زیادہ تر کیلیفورنیا اور جنوب مغربی ریاستوں میں رہنے اور کام کرنے کے لیے آئے تھے، کام لینے کے جاگیردارانہ طریقوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ وہ ہڑتال پر چلے گئے اور ''سیزار شاویز'' کی قیادت میں انگوروں کے باغات میں کام روک دیا۔ جلد ہی ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کھیت مزدور منظم ہونا شروع ہو گئے۔

ستر اور اسی کے عشروں میں غربت اور امتیازی سلوک کے خلاف لاطینیوں کی جدوجہد جاری

رہی۔ ریگن کا دورِ صدارت ان پر بہت سخت گزرا، جیسا کہ یہ پورے ملک میں غریب طبقے پر انتہائی گراں تھا۔ 1984ء تک 42 فی صد تک لاطینی بچے اور لاطینی خاندانوں کی ایک چوتھائی تعداد غربت کی لکیر سے نیچے زندگیاں بسر کر رہے تھے۔

اریزونا میں تانبے کے کان کنوں نے جن میں اکثریت میکسکو کے لوگوں کی تھی ''فلپس ڈاج'' کمپنی کے خلاف ہڑتال کر دی جب اس نے 1983ء میں معاوضوں، مراعات اور حفاظتی اقدامات میں کمی کر دی تھی۔ ان پر نیشنل گارڈ کے آدمیوں اور ریاست کی فوج نے آنسو گیس اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے حملے کیا، لیکن وہ تین سال تک ڈٹے رہے حتیٰ کہ حکومتی اور کارپوریٹ طاقت نے مل کر انہیں شکست دے دی۔

بہر حال کچھ کامیابیاں بھی ہوئیں۔ 1985ء میں ''واٹسن ویلی'' کیلیفورنیا میں خوراک ڈبوں میں بند کرنے والی فیکٹریوں کے سات سو کارکن، جن میں اکثریت میکسیکو کی خواتین کی تھی، ہڑتال پر چلے گئے، اور انہوں نے میڈیکل مراعات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1990ء میں ''سان انٹونیو'' میں واقع ''لیوی سٹراس'' کمپنی سے نکالے گئے کارکنوں نے (کیونکہ کمپنی ''کوسٹاریکا'' منتقل ہو رہی تھی) بائیکاٹ کی کال دی اور بھوک ہڑتال کی، اور مراعات حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ 1990ء میں لاس اینجلز میں ڈور کیپروں (دربانوں) نے ہڑتال کی اور پولیس کے حملے کے باوجود اپنی یونین کو تسلیم کروانے، تنخواہوں میں اضافے اور بیماری کی صورت میں مراعات کے مطالبات منوانے میں کامیاب رہے۔

نیو میکسیکو میں لاطینی باشندے زمین اور پانی کے حقوق کے لیے ''رئیل سٹیٹ ڈویلپرز'' کے ساتھ لڑے جو انہیں اس علاقے سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں وہ کئی عشروں سے رہ رہے تھے۔ 1988ء میں ان کا آمنا سامنا ہوا، لوگوں نے اسلحہ جمع کیا، حملے کے خلاف تحفظ کے لیے مورچے بنائے اور جنوب مغرب کے دوسرے لوگوں کی حمایت حاصل کی، آخر کار ایک عدالت نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

جیسے جیسے ملک میں لاطینیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا وہ جلد ہی افریقن امریکیوں کی 12 فی صد تعداد کے برابر پہنچ گئے، اور امریکی کلچر پر واضح اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے۔ ان کی موسیقی، آرٹ اور ڈرامے ملک کے بڑے دھارے کے کلچر کی نسبت شعوری طور پر زیادہ سیاسی اور طنزیہ رنگ لیے ہوئے تھے۔

1984ء میں ''سان ڈیگو اور ٹی جوانا'' میں فنکاروں اور لکھاریوں نے ''بارڈر آرٹس'' ورکشاپ قائم کی اور اس نے نسل پرستی اور ناانصافیوں کے خلاف بہت پرزور انداز میں کام کیا۔ شمالی کیلیفورنیا میں ''ٹیٹرو کیمپیسنو'' اور ''ٹیٹرو ڈی لا ایسپرانزا'' نے سکولوں، گرجوں اور میدانوں کو تھیٹر کے

طور پر استعمال کرتے ہوئے پورے ملک میں محنت کش طبقے کے لیے ڈرامے پیش کیے۔

لاطینی خاص طور پر، امریکہ کے سامراجی کردار سے آگاہ تھے، جو اس نے میکسیکو اور کیریبین میں ادا کیا تھا، اور ان میں سے اکثر نکاراگوا، ایل سلواڈور اور کیوبا کے بارے میں امریکی پالیسی کے شدید عیب جو بن چکے تھے۔ 1970ء میں بش انتظامیہ عراق کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہی تھی تو ''لاس اینجلز'' میں ہزاروں لوگوں نے اسی راستے پر مارچ کی جس پر بیس سال پہلے ویت نام جنگ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مارچ کی تھی۔ جیسا کہ ''الزبتھ مارٹینز'' نے لکھا ہے (چکیچو تاریخ کے 500 سال، تصاویر میں):

> خلیج فارس میں صدر بش کی جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران بہت سے لوگوں کو، بشمول ''رضا'' (لغوی معنی ''نسل'' ایک اصطلاح جو سرگرم لاطینی افراد نے اپنائی) اس کے بارے میں شک و شبہات رکھتے تھے، یا اس کے مخالف تھے۔ ہم نے جنگوں کے بارے میں یہ سبق حاصل کیا تھا کہ جمہوریت کے نام پر شروع کی جانے والی یہ جنگیں صرف امراء اور طاقتور لوگوں کے مفاد میں بدل جاتی تھیں۔ ''رضا'' قتل عام کی اس جنگ کے خلاف ویت نام کی جنگ کی نسبت زیادہ تیزی سے متحرک ہوئے، اگرچہ ہم اسے روک نہ سکے۔

وکیلوں کی نئی نسل نے، جس نے ساٹھ کے عشرے میں تعلیم حاصل کی تھی، قانون کے پیشے میں ایک چھوٹی لیکن سماجی طور پر باشعور اقلیت تشکیل دی۔ وہ عدالتوں میں غریبوں اور بے یار و مددگار افراد کا دفاع کرتے تھے یا طاقتور کارپوریشنوں کے خلاف مقدمات قائم کرتے تھے۔ قانون کی ایک فرم نے اپنی صلاحیتیں اور توانائی مختلف اداروں میں غلط کاریوں اور بدعنوانیوں کے راز افشا کرنے والے ایسے مرد اور خواتین کے دفاع کے لیے استعمال کرنا شروع کیں جن کو اس بنا پر ملازمتوں سے نکال دیا گیا تھا کہ انہوں نے ایسی کارپوریٹ بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا تھا جن میں عوام کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

خواتین تحریک کو، جس نے پوری قوم میں جنسی مساوات کے مسئلے پر ایک شعور کو پیدا کیا تھا، 80 کے عشرے میں سخت ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ 1973ء میں ''رو بنام ویڈ'' کے مقدمے کے فیصلے میں اسقاط حمل کے حقوق کے دفاع میں سپریم کورٹ کے فیصلے نے ایک ''زندگی کی حامی'' تحریک کو جنم دیا جس کے واشنگٹن میں طاقتور حمایتی موجود تھے۔ کانگریس نے ایک قانون پاس کیا جسے بعد میں سپریم کورٹ نے قائم رہنے دیا، اس کے مطابق غریب خواتین کو اسقاط حمل کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے وفاقی طبی امداد بند کر دی گئی۔ لیکن 'نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن'' اور دوسری تنظیمیں اپنی جگہ پر ڈٹی رہیں، 1989ء میں واشنگٹن ریلی میں 300,000 سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ جب 1994ء اور 1995ء میں اسقاط حمل والے کلینکوں پر حملے کیے گئے اور بہت سے حامیوں کو قتل کر دیا گیا، تو یہ لڑائی زیادہ شدید ہوگئی۔

ستر کے عشرے میں جنسیات اور آزادی کے بارے نظریات میں انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ

امریکی ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں کے حقوق کا مسئلہ پیش پیش تھا۔ ہم جنس پرست مردوں کی تحریک کی موجودگی پریڈوں، مظاہروں اور ہم جنس پرستوں کے خلاف امتیاز پر مبنی ریاستی قوانین کے خاتمے کی مہمات کی صورت میں واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ امریکہ اور یورپ میں ہم جنس پرست مردوں کی زندگی کی خفیہ پہلوؤں کے بارے میں پروان چڑھنے والا ادب تھا۔

1994ء میں "مین ہیٹن" میں "سٹون ویل 25" مارچ ہوئی جو کہ ایک ایسے واقعہ کی یاد میں تھی جسے ہم جنس پرست ایک پانسہ پلٹ دینے والا نقطہ خیال کرتے تھے: 25 سال پہلے "گرین رچ" گاؤں میں ہم جنس پرست بڑی دلیری کے ساتھ سٹون ویل بار پر پولیس کے چھاپے کے خلاف لڑے تھے۔ نوے کے عشرے کی ابتداء میں ہم جنس پرست مردوں اور خواتین کے گروپس نے امتیاز برتنے کے خلاف اور ایڈز کی وبا پر زیادہ توجہ دلانے کے لیے، جس کے بارے ان کا خیال تھا کہ قومی حکومت محض سرسری سی توجہ دے رہی تھی، زیادہ کھلم کھلا اور زیادہ پرعزم طریقے سے مہم چلانا شروع کر دی تھی۔

اسی اور نوے کے عشروں میں، صنعت سازی میں کمی، فیکٹریوں کے دوسرے ممالک میں چلے جانے، ریگن انتظامیہ اور "نیشنل لیبر ریلیشنز بورڈ" میں اس کے مقرر کردہ افسران کے عناد کی وجہ سے مزدور تحریک بہت حد تک کمزور پڑ چکی تھی۔ تاہم سفید پوش کارکنوں اور کم آمدنی والے سیاہ فاموں میں تنظیم سازی کا عمل جاری رہا۔ اے ایف ایل اور سی آئی او نے سینکڑوں نئے منتظمین کو لاطینیوں، افریقی امریکیوں اور ایشیائی امریکیوں کے درمیان کام کرنے کے لیے بھیجنا شروع کر دیا۔

نچلے درجے کے کارکنوں نے پرانی اور جمود کی شکار یونینز سے بغاوت شروع کر دی۔ 1991ء میں طاقت ور "ٹیمسٹرز یونین" کی بدنام زمانہ بدعنوان لیڈر شپ کو ووٹ کے ذریعے باہر نکال دیا گیا۔ نئی لیڈر شپ فوری طور پر واشنگٹن میں ایک قوت بن کر ابھری اور دو بڑی پارٹیوں سے باہر آزادانہ سیاسی اتحادوں کے لیے کام کرنے میں پہل اختیار کی۔ لیکن مجموعی طور پر مزدور تحریک بہت حد تک ختم ہو گئی تھی اور اپنی بقا کے لیے کوشاں تھی۔

نوے کے عشرے کے شروع میں کارپوریٹ دولت اور حکومتی تسلط کی غالب قوت کے سامنے مزاحمت کی روح کو چھوٹے پیمانے کی جرأت اور سرکشی کی کارروائیوں کے ذریعے زندہ رکھا گیا تھا۔ "ویسٹ کوسٹ" میں ایک نوجوان سرگرم کارکن جس کا نام "کیتھ میک ہنری" تھا اور سینکڑوں دوسرے کارکنوں کو غریب لوگوں میں بغیر اجازت نامہ کے مفت خوراک تقسیم کرنے کے جرم میں بار بار گرفتار کیا جاتا رہا۔ وہ "بم نہیں خوراک" پروگرام کا حصہ تھے۔ "بم نہیں خوراک" کے گروپس پورے ملک میں کام کر رہے تھے۔

1992ء میں نیو یارک کے ایک گروپ کو جو کہ امریکہ کی تاریخ کے بارے میں روایتی نظریات کے احیاء میں دلچسپی رکھتا تھا، نیو یارک سٹی کونسل کی حمایت سے بجلی کے کھمبوں پر دھات کی تین تختیاں

لگانے کی اجازت دی گئی۔ ان میں سے ایک تختی پر جو کہ مورگن کارپوریٹ کے ہیڈکوارٹر کے سامنے لگائی گئی تھی، جے پی مورگن کو جنگ آزادی کے دوران فوج میں بھرتی سے فراری اختیار کرنے والا کہا گیا تھا۔ حقیقت میں مورگن حیلے بہانے سے فوج میں بھرتی ہونے سے بچ نکلا تھا اور جنگ کے دوران حکومت کے ساتھ کاروباری معاہدے کر کے بے شمار دولت سمیٹی تھی۔ ایک دوسری تختی پر جو کہ سٹاک ایکسچینج کے سامنے لگائی گئی تھی ایک خودکشی کی منظر کشی کی گئی تھی اور نیچے لکھا گیا تھا "بے مہار آزاد مارکیٹ کا فائدہ۔"

ویت نام جنگ اور واٹر گیٹ سکینڈلز کے دوران حکومت کے بارے میں غلط فہمیوں کے ازالے، اور ایف بی آئی اور سی آئی اے کی جمہوریت دشمن سرگرمیوں کے انکشاف کے بعد حکومت سے مستعفی ہونے اور سابقہ ملازمین کی جانب سے کھلم کھلا تنقید کا آغاز ہوا۔

سی آئی اے آفیشلز کی ایک بڑی تعداد نے ایجنسی سے فراغت حاصل کر لی اور اس کی سرگرمیوں پر تنقیدی کتابیں لکھیں۔ "جان شاک ویل" جس نے انگولا میں سی آئی اے کے آپریشن کی قیادت کی تھی، مستعفی ہو گیا، اس نے سی آئی اے کی سرگرمیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ایک کتاب لکھی اور اپنے تجربات کے بارے میں پورے ملک میں لیکچر دیئے۔ ایک تاریخ دان اور سابقہ سی آئی اے سپیشلسٹ ڈیوڈ میک مائیکل نے ان لوگوں کی جانب سے جنہوں نے وسطی امریکہ میں حکومت کی پالیسیوں پر احتجاج کیا تھا، مقدمات میں شہادتیں پیش کیں۔

ایف بی آئی ایجنٹ "جیک ریان" جس نے اکیس سال تک بیورو میں خدمات انجام دی تھیں کو اس وقت ملازمت سے فارغ کر دیا گیا جب اس نے "امن گروپس" کے بارے میں تحقیقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے اس کی پنشن سے محروم کر دیا گیا اور اسے کچھ عرصہ بے گھر لوگوں کی پناہ گاہ میں رہنا پڑا۔

بعض اوقات اسی اور نوے کے عشروں میں ویت نام کی جنگ جو کہ 1975ء میں ختم ہو گئی تھی ان لوگوں کے ذریعے بار بار عوامی توجہ حاصل کرتی رہی، جنہوں نے اپنی سوچوں میں ڈرامائی تبدیلی کی۔ امریکہ کے ایک فوجی "چارلس ہوٹ" نے، جو مائی لائی کے سفاکانہ قتل عام میں شامل تھا، جس میں ویت نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں سینکڑوں عورتوں اور بچوں کو امریکی فوجیوں نے گولیوں سے اڑا دیا تھا، ایک رپورٹر کو بتایا:

> میں اس وقت انیس سال کا تھا، مجھے ہمیشہ وہی کچھ کرنے کا سبق دیا گیا تھا جو بڑے مجھے کرنے کو کہتے۔۔۔ لیکن میں اب اپنے بچوں کو بتاتا ہوں کہ اگر حکومت آپ کو اپنے ملک کی خدمت کرنے کے لیے بلاتی ہے تو مختلف اوقات میں خود اپنے فیصلے کرنا۔۔۔ حکام کو بھول جانا۔۔۔ اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرنا۔ کاش مجھے ویت نام جانے سے پہلے کوئی یہ بات بتا دیتا جو میں نہیں جانتا تھا۔ اب میں نہیں سوچتا کہ جنگ نام کی کوئی چیز دوبارہ ہونی چاہیے۔۔۔۔

کیونکہ یہ انسان کے ذہن کو بگاڑ دیتی ہے۔

یہ ویت نام جنگ کی میراث تھی (امریکیوں کی ایک بڑی اکثریت محسوس کرتی تھی کہ یہ ایک خوفناک حادثہ تھا، ایک جنگ جو کہ کسی صورت میں نہیں لڑی جانی چاہیے تھی) جس نے ریگن اور بش انتظامیہ کو آزار میں مبتلا کر رکھا تھا، جو اَب بھی امریکہ کی طاقت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کی امید لیے ہوئے تھی۔

1985ء میں جب جارج بش نائب صدر تھا سابقہ وزیر دفاع ''جیمز شل سنگر'' نے سینیٹ کی خارجہ تعلقات کی کمیٹی کو متنبہ کیا تھا: ''ویت نام عوامی رویوں میں تبدیلیوں کا ایک سیلاب لے کر آیا ہے.... خارجہ پالیسی کی پشت پر سیاسی اتفاق رائے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے....''

جب بش اقتدار میں آیا تو وہ ویت نام سینڈروم (اسٹیبلشمنٹ کی جنگی خواہشات کے خلاف امریکی عوام کی مزاحمت) پر قابو پانے کے لیے پر عزم تھا۔ لہٰذا اس نے جنوری 1991ء کے وسط میں عراق کے خلاف بہت بڑی قوت کے ساتھ فضائی جنگ شروع کر دی، تاکہ اس سے پہلے کہ جنگ کے خلاف عوامی تحریک کو جنم لینے کا موقع ملے جنگ فوری طور پر اپنے خاتمے کو پہنچ جائے۔

ممکنہ تحریک کے آثار جنگ سے پہلے نظر آ رہے تھے۔ ہالووین (بھوت رات) پر چھ سو طلبا نے مونٹانا کے شہر میسولا میں ''بھاڑ میں جائے، ہم نہیں جائیں گے'' کے نعرے لگاتے ہوئے مارچ کیا۔ لیوئی سینا کے شہر ''شریو پورٹ'' میں ''شریو پورٹ جرنل'' کی پہلے صفحے کی سرخی ''پول سروے میں فوجی کارروائی کی حمایت'' کے باوجود حقیقت یہ تھی کہ پول میں حصہ لینے والے 42 فی صد کے خیال میں امریکہ کو ''طاقت کا استعمال کرنا چاہیے تھا اور 41 فی صد کا کہنا تھا ''انتظار کرنا اور دیکھنا چاہیے۔''

11 نومبر 1990ء کو بوسٹن میں سابقہ فوجیوں کی پریڈ میں ''ویٹیران فار پیس'' نامی ایک گروپ نے ''مزید ویت نام نہیں، انہیں اَب گھر لے کر آؤ'' اور ''تیل اور خون باہم مل نہیں سکتے، امن چاہیے'' کے بینرز اٹھا کر شمولیت اختیار کی۔ ''بوسٹن گلوب'' کی رپورٹ کے مطابق ''احتجاج کرنے والوں کا تحسین آمیز نعروں اور تالیوں سے استقبال کیا گیا اور بعض مقامات پر تماش بینوں نے حمایت کا زبردست مظاہرہ کیا۔''

جیسے ہی بش نے جنگ کی جانب قدم بڑھائے ''بارن آن دا فورتھ آف جولائی'' کے مصنف اور ویت نام کے ایک غالباً مشہور سابقہ فوجی ''رون کووک'' نے ٹیلی ویژن پر تیس سیکنڈ کی تقریر کی۔ اپنی اپیل میں، جسے پورے ملک میں 120 شہروں کے 200 ٹیلی ویژن سٹیشنوں نے نشر کیا، اس نے تمام شہریوں کو باہر نکلنے اور جنگ کے خلاف بولنے کے لیے کہا۔ میری طرح اور کتنے امریکی وہیل چیرز پر واپس لوٹیں گے۔ کیا ابھی تک ہم نے سبق نہیں سیکھا۔''

بمباری شروع ہونے سے دس دن پہلے کولوریڈو کے شہر ''بولڈر'' میں ایک ٹاؤن میٹنگ میں سوال کیا گیا ''کیا آپ بش کی جنگ کی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں؟'' صرف چار افراد نے اپنے ہاتھ

اٹھائے۔ جنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے نیو میکسیکو کے شہر ''سانٹافی'' میں چار ہزار افراد نے چار لین کی ہائی وے کو ایک گھنٹے کے لیے بند کیے رکھا۔ علاقے کے لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ ویت نام کے دور میں ہونے والے تمام مظاہروں سے بڑا مظاہرہ تھا۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے شام کو مشی گن کے شہر ''این آربر'' میں امن کا مطالبہ کرتے ہوئے چھ ہزار افراد نے مارچ کیا۔ جس رات جنگ کا آغاز ہوا سان فرانسسکو میں پانچ ہزار افراد جنگ کی مذمت کرنے کے لیے جمع ہوئے اور ''فیڈرل بلڈنگ'' کے گرد انسانی زنجیر بنائی۔ پولیس نے مظاہرین کے ہاتھوں پر ڈنڈے برساتے ہوئے زنجیر کو توڑا۔ لیکن ''سان فرانسسکو بورڈ آف سپروائزرز'' نے ایک قرارداد کے ذریعے شہر اور کاؤنٹی کو ان لوگوں کے لیے پناہ گاہ قرار دیا جو اخلاقی یا مذہبی بنیادوں پر جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہتے۔''

جب بش نے بمباری شروع کرنے کا حکم دیا اس سے ایک رات پہلے میساچوسٹس کے شہر ''لیکسنگٹن'' میں ایک سات سال کی لڑکی نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ صدر کو خط لکھنا چاہتی ہے۔ اس کی ماں نے مشورہ دیا کہ اب دیر ہو چکی ہے وہ اگلے دن لکھ لے۔ ''نہیں، آج رات ہی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ وہ ابھی لکھنا سیکھ رہی تھی لہٰذا اس نے خط کی املا بولی:

> محترم صدر بش! جس انداز سے تم کردار ادا کر رہے ہو، میں اسے پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ اپنا ذہن بنائیں تو کوئی جنگ نہیں ہوگی، ہمیں امن کے رکھوالے مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر آپ جنگ میں ہوتے تو آپ زخمی ہونا نہیں چاہیں گے۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ میں کسی قسم کی جنگ نہیں ہونے دینا چاہتی۔
>
> آپ کی مخلص، سرینا کیت زن۔

جب جنگ شروع ہوگئی اور واضح طور پر واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا، اور حب الوطنی سے بھرپور ماحول میں یہ حیرانی کی بات نہیں تھی کہ ملک کی ایک بڑی اکثریت نے جنگ کی حمایت کا اعلان کیا۔

تاہم اگرچہ منظم ہونے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا، اور جنگ بہت جلد اختتام کو پہنچ گئی، پھر بھی اس کی مخالفت موجود تھی، یقیناً یہ ایک اقلیت تھی لیکن پر عزم تھی اور پھلنے پھولنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ویت نام میں فوج کی چڑھائی کے پہلے ہفتوں کے مقابلے میں خلیج کی جنگ کے خلاف تحریک ایک غیر معمولی رفتار اور جوش و جذبے سے پروان چڑھی۔

جنگ کے پہلے ہفتے میں جب یہ بات واضح تھی کہ زیادہ تر امریکی بش کی کارروائی کی حمایت کر رہے تھے، ہزاروں لوگ مختلف قصبوں اور شہروں میں جنگ کے خلاف احتجاج کے طور پر سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئے۔ اوہایو کے شہر ایتھنز میں جنگ کے حامیوں کے ساتھ مڈبھیڑ کے بعد ایک سو سے

زائد افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورٹ لینڈ میں پانچ ہزار افراد نے بازوؤں پر سفید پٹیاں باندھ کر یا سفید کاغذ سے بنی ہوئی صلیبیں جن پر سرخ رنگ سے 'کیوں' لکھا ہوا تھا اٹھا کر مارچ کیا۔

جورجیا یونیورسٹی میں ستر طلبا نے جنگ کی مخالفت کی اور جگ رتا منایا، اور جورجیا کی مجلس قانون ساز میں اس کی ایک نمائندہ "سینتھیا میک کنعان" نے عراق میں بمباری کی مذمت کرتے ہوئے ایک تقریر کی، جس کے ردعمل کے طور پر دوسرے نمائندگان اٹھ کر باہر نکل گئے۔ وہ اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ سوچ میں کچھ تبدیلی آئی تھی، جیسا کہ اسی مجلس قانون ساز میں ساٹھ کے عشرے میں ویت نام کی جنگ پر تنقید کرنے کی پاداش میں "جولین بانڈ" کی رکنیت ختم کر دی گئی تھی۔ نیوٹن میساچوسٹس میں ایک جونیئر ہائی سکول کے 350 طالب علم مارچ کرتے ہوئے سٹی ہال پہنچے اور میئر کو خلیج کی جنگ پر اپنی مخالفت کا اعلان کرتے ہوئے ایک یادداشت پیش کی۔

اوکلاہاما کے شہر "اڈا" میں جب "ایسٹ سنٹرل اوکلاہاما سٹیٹ یونیورسٹی" دو "نیشنل گارڈز" یونٹس کو اپنا رہی تھی دو نوجوان خواتین پلے کارڈ اٹھا کر اس کے کنکریٹ کے داخلی گیٹ کے اوپر خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھیں، جن پر لکھا ہوا تھا "امن کا سبق پڑھاؤ.... جنگ کا نہیں" ان میں سے ایک "پیٹریشیا بگز" نے کہا: "میں نہیں سمجھتی کہ ہمیں وہاں ہونا چاہیے تھا، میں یہ خیال نہیں کرتی کہ یہ انصاف اور آزدی کی خاطر ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ معاشی مفاد پر مبنی ہے۔ تیل کی بڑی کارپوریشنوں کا اس بات میں بہت ہاتھ ہے جو کچھ وہاں ہو رہا ہے..... ہم لوگوں کی زندگیوں کو پیسے کی خاطر خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

امریکہ کے ہوائی حملوں کے شروع ہونے کے چار دن بعد 75 ہزار (دارالحکومت پولیس کا تخمینہ) افراد نے واشنگٹن میں مارچ کیا اور جنگ کی مذمت میں وائٹ ہاؤس کے قریب ریلی نکالی۔ جنوبی کیلیفورنیا میں "رون کووک" نے چھ ہزار افراد سے خطاب کیا جو "اب امن" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ارکنساس کے شہر نائٹ ویلی میں فوجی پالیسی کے حمایتی ایک گروپ کی "نارتھ ویسٹ ارکنساس سٹیزنز اگینسٹ وار" (ارکنساس کے شہریوں کی جنگ کے خلاف ایک تنظیم) کے ساتھ جھڑپ ہوئی، جو پرچم میں لپٹا ہوا ایک تابوت اور بینر اٹھا کر مارچ کر رہے تھے جس پر لکھا ہوا تھا "انہیں زندہ واپس لاؤ۔"

ویت نام کے ایک سابقہ اپاہج فوجی "فلپ ایویلو" نے، جو کہ پنسلوانیا میں یارک کالج میں تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کا پروفیسر تھا ایک مقامی اخبار میں لکھا: "جی ہاں! ہمیں اپنے مردوں اور خواتین کی ہتھیاروں کے سائے میں حفاظت کرنی چاہیے۔ لیکن آئیے، گھر لا کر ان کی حفاظت کریں نہ کہ اس بربریت پر مبنی تشدد کی پالیسی کو نظرانداز کرتے ہوئے۔" سالٹ لیک سٹی میں سینکڑوں مظاہرین نے جن میں سے اکثر کے ساتھ بچے بھی تھے جنگ مخالف نعرے لگاتے ہوئے شہر کی اہم سڑکوں پر مارچ کیا۔

ورمونٹ میں، جس نے حال ہی میں کانگریس کے لیے ایک سوشلسٹ "برنی سینڈرز" کو منتخب

کیا تھا، دو ہزار سے زائد مظاہرین نے سٹیٹ ہاؤس میں گورنر کی تقریر میں خلل اندازی کی اور ورمونٹ کے سب سے بڑے شہر "برلنگٹن" میں تین سو مظاہرین نے شہر کے وسطی علاقے میں مارچ کیا اور یک جہتی کے اظہار کے طور پر دکانداروں کو دکانیں بند کرنے کو کہا۔

26 جنوری کو جنگ شروع ہونے کے ۹ دن بعد 150,000 سے زائد افراد نے واشنگٹن ڈی سی میں مارچ کیا اور جنگ کی مذمت کرتے ہوئے مقررین کو سنا، جن میں فلمی ستارے، سوسن سارنڈون" اور "ٹم ربنز" بھی شامل تھے۔ اوک لینڈ، کیلیفورنیا کی ایک خاتون نے تہ کیا ہوا امریکی پرچم بلند کرتے ہوئے کہا' جو کہ اسے اس وقت پیش کیا گیا تھا جب اس کا خاوند ویت نام میں مارا گیا تھا: "ایک کٹھن سفر کے بعد مجھے سمجھ آئی ہے کہ ایک تہ شدہ پرچم میں کوئی عظمت نہیں ہوتی۔"

لیبر یونینز نے ویت نام جنگ کی زیادہ تر حمایت کی تھی، لیکن خلیج میں بمباری شروع ہونے کے بعد "اے ایف ایل" اور "سی آئی او" سے وابستہ گیارہ یونینز نے جن میں کچھ بہت طاقتور یونینز مثلاً سٹیل، آٹو، مواصلات، کیمیکل ورکرز کی یونین بھی شامل تھیں جنگ کے خلاف بیان دیے۔

امریکی ایئر فورس جو کچھ عراق میں کر رہی تھی سیاہ فام آبادی اس کے بارے میں باقی ماندہ ملک کی نسبت بہت کم پرجوش تھی۔ فروری ۱۹۹۱ء کے شروع میں "اے بی سی نیوز" اور "واشنگٹن پوسٹ" کے ایک پول سروے کے مطابق سفید فام آبادی میں جنگ کی حمایت 84 فی صد تھی لیکن افریقن امریکیوں میں صرف 48 فی صد تھی۔

جب جنگ شروع ہوئے ایک ماہ گزر گیا اور عراق مسلسل بمباری کے نتیجے میں تباہ و برباد ہو گیا، تو صدام حسین نے ردعمل جاننے کے لیے ایک تجویز پیش کی کہ اگر امریکہ اپنے حملے روک دے تو عراق کویت سے واپس نکل آئے گا۔ بش نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، اور نیو یارک میں سیاہ فام لیڈروں کی ایک میٹنگ میں اس پر شدید تنقید کی گئی اور جنگ کو "ایک غیر اخلاقی اور غیر دینی انحراف.... اپنی اندرون ملکی ذمہ داریوں سے ایک صریح پہلوتہی" قرار دیا۔

الباما کے شہر "سلیما" میں، جو 26 سال سے پہلے شہری حقوق کے لیے مارچ کرنے والے شہریوں پر پولیس کی خونیں تشدد کا مقام تھا اس "خونیں اتوار" کی یاد منانے کے لیے، ایک جلسے میں مطالبہ کیا گیا کہ "ہمارے فوجیوں کو زندہ واپس لاؤ تا کہ وہ گھر میں ہونے والی بے انصافیوں کے خلاف لڑ سکیں۔"

خلیج فارس میں موجود ایک اکیس سالہ بحریہ کے سپاہی کے والد "ایلکس مولنر" نے صدر بش کو ایک غصے سے بھرا ہوا کھلا خط لکھا جو کہ نیو یارک ٹائمز میں شائع ہوا:

جناب صدر! اس وقت آپ کہاں تھے جب عراق اپنے ہی لوگوں کو زہریلی گیس کے ذریعے ہلاک کر رہا تھا، حالیہ بحران تک کیوں انتظار کیا گیا۔ کیا یہ صدام حسین کے ساتھ

معمول کا کاروبار تھا جو آڑے آرہا تھا، جسے اب آپ "ہٹلر" کے نام سے پکارتے ہیں؟ کیا یہ امریکی "طرز زندگی ہے" جو آپ کہتے ہیں میرا بیٹا دنیا کے 25 سے 30 فی صد تیل کو استعمال کرنے کے امریکیوں کے مسلسل "حق" کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہے؟ میں اپنے بیٹے اور اس کے ہم جولی سپاہیوں کی حمایت کے لیے خلیج فارس میں امریکی فوج کی کسی بھی جارحانہ کارروائی کی مخالفت میں ہر وہ کام کرنے کا جو میں کرسکتا ہوں پختہ ارادہ کیے ہوئے ہوں۔

انفرادی سطح پر بھی بہت سے شہری باوجود دھمکیوں کے اپنے ضمیر کی بات بہت جرأت اور بے باکی سے کرتے رہے۔

"براونزویلی" ٹیکساس کی "پگ مولن" جس کا بیٹا ویت نام میں اپنے ہی فوجیوں کی گولیوں سے ہلاک ہوگیا، باوجود اس دھمکی کے کہ اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی تو اس کے گھر کو جلا دیا جائے گا ماؤں کی ایک بس بھر کر احتجاج کے لیے واشنگٹن پہنچ گئی۔

اداکارہ "مارگوٹ کِڈر" (سپرمین فلموں میں "لوئس لین") اپنے کریئر کے خطرے کے باوجود بڑی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ جنگ کے خلاف بولتی رہی۔

نیوجرسی میں "سیٹن ہال یونیورسٹی" کے ایک باسکٹ بال کے کھلاڑی نے اپنے یونیفارم پر امریکی پرچم لگانے سے انکار کر دیا، اور جب اسے اس بات پر نفرت اور تضحیک کا نشانہ بنایا گیا تو اس نے ٹیم اور یونیورسٹی کو چھوڑ دیا اور اپنے آبائی ملک اٹلی واپس چلا گیا۔

کچھ انتہائی افسوسناک واقعات بھی ہوئے، ویت نام کے ایک سابقہ فوجی نے لاس اینجلز میں اپنے آپ کو آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اور میساچوسٹس کے شہر "ایمہرسٹ" میں ایک نوجوان کارڈ بورڈ کا امن نشان اٹھائے ہوئے ٹاؤن کامن کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا اپنے آپ پر دو گیلن آتش گیر مادہ انڈیلا اور دو دیا سلائیاں جلا کر شعلوں کی لپیٹ میں جل کر مر گیا۔ دو گھنٹوں کے بعد نزدیکی یونیورسٹی کے لڑکے کامن پر موم بتیاں جلانے کے لیے جمع ہوئے اور موت کی جگہ پر امن کے پیغامات رکھے، ایک پیغام یہ تھا: "اس دیوانگی طاری کرنے والی جنگ کو بند کرو۔"

یہاں ویت نام کی جنگ کی طرح فوج کے اندر کسی بڑی جنگ مخالف تحریک کے پروان چڑھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ لیکن یہاں بھی ایسے مرد اور خواتین تھیں جنہوں نے اپنے کمانڈرز کی نافرمانی کی اور جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

جب اگست ۱۹۹۱ء میں امریکہ کے فوجیوں کی پہلی کھیپ سعودی عرب بھیجی جا رہی تھی تو ہوائی میں مقیم نیوی کا ایک بائیس سالہ کارپورل "جیف پیٹرسن" ہوائی اڈے کے رن وے پر بیٹھ گیا اور سعودی عرب جانے والے جہاز میں سوار ہونے سے انکار کر دیا۔

اس نے نیوی سے ڈسچارج کیے جانے کی درخواست کی "میں کسی بھی قوم کے خلاف کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت فوجی طاقت کے استعمال کے خلاف ہوں۔"

شمالی کیرولینا کے "کیمپ لے جیون" میں بحریہ کے چودہ ریزرو فوجیوں نے بھگوڑے قرار دیے جانے کے بعد کورٹ مارشل کے خطرے کے باوجود باضمیر معترض (جو شخص عقیدے یا مذہب کی بنیاد پر جنگ میں شامل ہونے سے انکاری ہو) کی حیثیت عطا کیے جانے کے لیے درخواستیں دیں۔

ایک فزیشن "یولینڈا ہٹ وان" جو کہ "آرمی ریزرو میڈیکل کارپس" میں کیپٹن تین بچوں کی ماں اور "فزیشن فار سوشل ریسپانسی بلٹی" کی ممبر تھی کو دسمبر ۱۹۹۰ء میں جنگ شروع ہونے سے ایک ماہ پہلے ڈیوٹی پر طلب کیا گیا۔ اس نے جواب دیا "میں مشرق وسطیٰ میں جارحانہ فوجی اجتماع میں حصہ لینے سے انکار کرتی ہوں، کیونکہ میں ایک ایسی کارروائی میں شریک ہونے کے احکامات کو تسلیم نہیں کرتی جسے میں غیر اخلاقی، غیر انسانی اور غیر آئینی خیال کرتی ہوں۔" اس کا کورٹ مارشل کیا گیا اور فوج سے فرار کا جرم عائد کرتے ہوئے ڈھائی سال قید کا حکم سنایا گیا۔

ایلیناس کی ایک دوسری فوجی خاتون "سٹیفینی ایٹکنسن" نے ڈیوٹی پر رپورٹ کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ خلیج فارس میں امریکی فوج محض معاشی وجوہات کی بنا پر ہے۔ اسے پہلے گھر میں نظر بند رکھا گیا اور بعد میں اسے نامناسب شرائط پر فوج سے ڈسچارج کر دیا گیا۔

میساچوسٹس کے شہر "فورٹ ڈیونز" میں مقیم ایک فوجی ڈاکٹر "ہارلو بلارڈ" نے سعودی عرب جانے کے حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا: "میں اس جنگ میں شرکت کرنے کی بجائے جیل جانا پسند کروں گا۔" اس کا کہنا تھا: "یہ کسی طور بھی ایک منصفانہ جنگ نہیں ہے۔"

ایک ہزار سے زائد ریزرو فوجیوں نے "باضمیر معترض" ہونے کا اعلان کیا۔ ان میں بحریہ کا ایک ریزرو فوجی "راب کلابرو" بھی شامل تھا اس نے کہا: "میرے باپ نے مجھے کہا کہ وہ میری وجہ سے شرمسار ہے، اس نے چیخ چیخ کر کہا کہ وہ میری وجہ سے پریشان اور مشکل میں ہے۔ لیکن میرا اعتقاد ہے کہ لوگوں کو ہلاک کرنا اخلاقی طور پر غلط ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ضمیر سے مخلص رہ کر میں اپنے ملک کی زیادہ خدمت کرسکتا ہوں بجائے اس کے کہ منافقت سے کام لوں۔"

خلیج کی جنگ کے دوران وہ خبریں پہنچانے کے لیے جو ملک کے بڑے ذرائع ابلاغ پر نہیں دی جاتی تھیں ابلاغ کا ایک نیا نیٹ ورک قائم ہو گیا تھا۔ بہت سے شہروں میں متبادل اخبارات شائع ہونے لگے تھے، ایک سو سے زائد کمیونٹی ریڈیو سٹیشن قائم ہو گئے جو اگرچہ ایک محدود طبقے کی پہنچ میں تھے لیکن خلیج کی جنگ کے دوران جنگ کے تنقیدی تجزیے کا واحد ذریعہ تھے۔

"فتح مند" جنگوں کے بعد تقریباً ہمیشہ ایک سنجیدہ تاثر جنم لیتا ہے، جیسے ہی جنگ کا جوش اور

ولولہ ماند پڑتا ہے تو عوام اس کی قیمت اور حاصل شدہ فوائد کو پرکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ فروری ۱۹۹۱ء میں جنگ کا جنون عروج پر تھا، اس ماہ کے دوران جب رائے دینے والے افراد کو اس پر اٹھنے والے عظیم اخراجات یاد دلائے گئے تو صرف ۱۶ فی صد لوگوں نے کہا کہ جنگ کا عوضانہ بہت بھاری ہے۔ چار ماہ بعد جون میں ان کی تعداد تیس فی صد تھی۔ اس کے بعد کے مہینوں میں جیسے جیسے معاشی حالت بگڑتی چلی گئی قوم میں بش کی حمایت تیزی سے کم ہوتی چلی گئی۔ (اور ۱۹۹۲ء میں جنگ کا طلسم ٹوٹنے کے بعد بش کو شکست کا سامنا کرنا پڑ گیا۔)

۱۹۸۹ء کے بعد جب سوویت بلاک بکھرنا شروع ہوا تو امریکہ میں "امن کے منافع" کی باتیں شروع ہو گئی تھیں اور عوام اسے ایک ایسا موقع خیال کرنے لگے تھے جب فوجی بجٹ اربوں ڈالر کی کٹوتی کر کے انسانی حاجات پر خرچ کیے جا سکیں گے۔ خلیج کی جنگ حکومت کے لیے جو اس قسم کی گفتگو کو بند کرانے کا عزم لیے ہوئے تھی ایک آسان بہانہ بن گیا تھا۔ بش انتظامیہ کے ایک رکن نے کہا "ہم پر صدام کا ایک احسان ہے، اس نے ہمیں "امن منافع" کے جن سے بچا لیا ہے۔"

۱۹۹۲ء میں کولمبس کی مغربی نصف کرہ ارض میں آمد کی پانچ سو سالہ تقریبات کے دوران فوجی فتح کی حدود مکمل کر سامنے آ گئیں۔ پانچ سو سال قبل کولمبس اور اس کے فاتح ساتھیوں نے مقامی ہسپانیولا آبادی کا صفایا کر دیا تھا۔ اس کے بعد اگلی چار صدیوں میں امریکہ حکومت نے، جیسے جیسے براعظم میں پیش قدمی ہوتی گئی، ایک منظم طریقے سے انڈین قبائل کی تباہی کو جاری رکھا۔ لیکن اب ایک ڈرامائی ردعمل دیکھنے میں آ رہا تھا۔

انڈینز (مقامی امریکی باشندے) ساٹھ اور ستر کے عشروں سے ایک نمایاں قوت بن چکے تھے، اور ۱۹۹۲ء میں پانچ سو سالہ تقریبات کی مذمت کرنے میں دوسرے امریکیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ گزشتہ ان تمام سالوں سے جب سے ملک میں "کولمبس ڈے" منایا جا رہا تھا پہلی مرتبہ اس شخص کو عزت و احترام دینے کے خلاف پورے ملک میں احتجاج کیا گیا، جس نے ان مقامی باشندوں کو جنہوں نے اس کا تحائف اور محبت کے ساتھ استقبال کیا تھا، اغوا کیا، بازو اور ٹانگیں کاٹیں، اور قتل کیا۔

۱۹۹۰ء کے موسم گرما میں شمالی اور جنوبی امریکہ کے باشندوں کے پہلے بین الاقوامی اجتماع میں شرکت کے لیے پورے مغربی نصف کرے سے 350 انڈین نمائندگان ایکواڈور کے شہر "کیوٹو" میں جمع ہوئے اور انہوں نے کولمبس کی فتوحات شان و شوکت کے ساتھ پیش کرنے کے خلاف متحرک ہونے کا اعلان کیا۔

اس تحریک نے زور پکڑا، اور امریکہ میں کلیسائی تعاون کے سب سے بڑے ادارے "نیشنل کونسل آف چرچز" نے یہ کہتے ہوئے کہ "جو واقعہ کچھ لوگوں کے لیے آزادی امید اور موقع کے نئے پن کو

پیش کرتا ہے وہ کچھ دوسرے لوگوں کے لیے استبداد، تذلیل اور نسل کشی کا پیامبر تھا۔" اور تمام عیسائیوں سے کولمبس کی پانچ سو سالہ تقریبات میں شرکت نہ کرنے کی درخواست کی۔

کولمبس کی پانچ سو سالہ تقریبات کے مخالف سرگرم افراد کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لیے ۱۹۹۱ء کے اوئل میں ایک اخبار "انڈی جینئس تھاٹ" نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔

ٹیکساس کے شہر "کارپس کرسٹی" میں انڈینز اور چیکانوز شہر میں ہونے والی پانچ سو سالہ تقریبات کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے متحد ہو گئے۔ ایک خاتون "انجلینا مینڈز" نے چیکانوز کی جانب سے بات کرتے ہوئے کہا: "چیکانو قوم شمال میں اپنے انڈین بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرتے ہوئے امریکی حکومت کی اس بدذاتی کی پُرزور مذمت کرتی ہے جس کا اظہار اس نے "ہسپانیوں کی آمد اور خاص طور پر کرسٹوفر کولمبس کی آمد کی یاد تازہ کرنے کے لیے تقریبات کے انعقاد کے ذریعے کیا ہے۔"

کولمبس کا نزاع ایک غیر معمولی تعلیمی اور کلچرل سرگرمیوں کے آغاز کا باعث بنا۔ سان ڈیگو میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کی ایک پروفیسر ڈیبورہ سمال نے لکڑی کے تختوں پر بنی ہوئی دو سو سے زائد پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام کیا جسے ۱۴۹۲ء کا نام دیا گیا۔ اس نے ان خوف اور دہشتوں کو جو کولمبس کی آمد کے ساتھ اس نصف کرہ ارض پر وارد ہوئی تھیں تمثیلی رنگ دینے کے لیے کولمبس کی ڈائری سے لیے گئے الفاظ اور سولہویں صدی کی کندہ تصاویر کے بڑے کیے گئے حصوں کو آمنے سامنے رکھا۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا: "یہ بڑے واضح انداز میں یاد دلاتی ہے کہ نئی دنیا میں مغربی طرز کی تہذیب کی آمد نے ہمارے لیے کوئی خوش کن پیغام نہیں چھوڑا تھا۔"

جب ۱۹۹۱ء میں بش نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے عراق پر حملہ کیا کہ وہ کویت کو عراق کے قبضے سے نجات دلانا چاہتا ہے تو اوریگان میں مقامی امریکیوں کے ایک گروپ نے بش کے نام ایک تند اور طنزیہ کھلا خط تقسیم کیا: "محترم صدر! ہماری چھوٹی سی قوم کو بھی قبضے سے نجات دلانے کے لیے اپنی مدد بھیجیں۔ اس بیرونی طاقت نے ہماری زمینوں پر ہمارے وافر وسائل پر زبردستی قبضہ جما رکھا ہے۔ آپ کے اپنے الفاظ ہیں ایک چھوٹی قوم پر قبضہ کر لینا اور اس کا خاتمہ کر دینا..... ناقابل برداشت ہے۔" آپ کا مخلص ایک امریکی انڈین۔"

"ری تھنکنگ سکولز" پبلیکیشنز نے جو کہ پورے ملک میں سماجی طور پر باشعور سکول ٹیچرز کی نمائندگی کرتی تھی نے سو صفحات پر مشتمل "ری تھنکنگ کولمبس" کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں امریکہ کے مقامی باشندوں اور دوسرے افراد کے مضامین، کولمبس پر بچوں کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ، کولمبس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند افراد کے لیے کتابوں کی ایک فہرست

اور پانچ سو سالہ جشن کے مخالفین کے لیے مزید مواد کے لیے رہنمائی شامل تھی۔ چند ماہ میں اس کتاب کی 200,000 کاپیاں فروخت ہو گئیں۔

پورٹ لینڈ، اوریگان کے ایک ٹیچر "بل بگلو" نے، جس نے "ری تھنکنگ سکول" قائم کرنے میں مدد دی تھی 1992ء میں اپنے معمول کے کام سے ایک سال کی چھٹی لی، پورے ملک کا دورہ کیا، اور دوسرے ٹیچروں کو ورکشاپ کے ذریعے تربیت دی تا کہ وہ کولمبس کے بارے میں وہ حقائق بتانا شروع کر سکیں جو روایتی کتابوں اور سکول کے نصابوں میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔

بگلو کے اپنے طالب علموں میں سے ایک نے لکھا: "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پبلشروں نے چند شان و شوکت سے بھرپور کہانیاں شائع کی ہیں جن کا مقصد ہمیں اپنے ملک کے ساتھ زیادہ محب الوطن بناتا ہے....وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ملک کو عظیم، طاقتور اور ہمیشہ ایک درست ملک خیال کریں۔"

ایک اور "ربیکا" نام کی طالبہ نے لکھا: "ظاہر ہے کہ کتابوں کے مصنفین نے غالباً یہ خیال کیا ہو گا کہ یہ کوئی نقصان دہ بات نہیں ہے....اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ امریکہ کو حقیقت میں کس نے دریافت کیا....لیکن یہ خیال کہ میرے ساتھ اس بارے میں پوری زندگی جھوٹ بولا گیا تھا، مجھے سخت غصہ دلاتا ہے۔"

لاس اینجلز میں ہائی سکول کا ایک طالب علم جس کا نام "بلیک لنڈسے" تھا، سٹی کونسل کے سامنے گیا اور پانچ سو سالہ جشن منانے کے خلاف دلائل دیے۔

پورے ملک میں کولمبس کے خلاف سرگرمیاں جاری تھیں، احتجاجات، انڈین تاریخ کے بارے میں درجنوں کتابیں منظر عام پر آ رہی تھیں، پورے ملک میں بحث مباحثے جاری تھے اور یہ سب کچھ تعلیمی دنیا میں غیر معمولی تبدیلیوں کا باعث بنے۔ کئی نسلوں سے سکول کے بچوں کو کولمبس کے بارے میں رومانوی اور ستائشی کہانیاں سنائی جا رہی تھیں۔ اب پورے ملک میں ہزاروں اساتذہ مختلف کہانیاں سنا رہے تھے۔

اس صورتحال نے قدیم تاریخ کا دفاع کرنے والوں میں غم و غصہ بھر دیا تھا۔ انہوں نے مغربی پھیلاؤ اور سامراجیت پر کئے گئے تنقیدی جائزوں پر ناراضگی کا اظہار کیا، اور اسے مغربی تہذیب پر حملہ قرار دیا۔ "ایلین بلوم" نام کے ایک مفکر نے "دا کلوزنگ آف امریکن مائنڈ" میں ساٹھ کے عشرے کی تحریکوں نے امریکی یونیورسٹیوں کے تعلیمی ماحول میں جو تبدیلیاں پیدا کی تھیں ان پر شدید خدشات اور خوف کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "امریکہ صرف ایک کہانی بیان کرتا ہے، جو کہ آزادی اور مساوات کی جانب ایک مسلسل اور ناگزیر سفر پر مبنی ہے۔"

شہری حقوق کی تحریک میں سیاہ فام لوگوں نے اس دعویٰ پر اختلاف کیا کہ امریکہ "آزادی اور مساوات" کا علمبردار ہے۔ خواتین کی تحریک نے بھی اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اور اب 1992ء میں

مقامی باشندے اپنے آباؤ اجداد کے خلاف مغربی تہذیب کے جرائم کی نشاندہی کر رہے تھے۔ وہ ان انڈینز کے بھائی چارے کے جذبے کا پرچار کر رہے تھے جن سے کولمبس کی ملاقات ہوئی اور جن کو اس نے فتح کیا، وہ ان لاکھوں افراد کی تاریخ بیان کر رہے تھے جو کولمبس سے پہلے یہاں موجود تھے، اور ہارورڈ کے تاریخ دانوں کے اس جھوٹ کا پول کھول رہے تھے جنہوں نے امریکہ کے اجاڑ اور خالی جنگلوں میں مغربی تہذیب کے پھیلنے اور پھولنے کی داستانیں بیان کی تھیں۔

جیسے امریکہ نوے کے عشرے میں داخل ہوا سیاسی نظام کی باگ ڈور، خواہ ڈیموکریٹس ہوں یا ری پبلکنز، دولت مند لوگوں کے ہاتھ میں رہی۔ ابلاغ کے بڑے ذرائع پر بھی کارپوریٹ دولت کا غلبہ تھا۔ اگرچہ اہم سیاستدان اس بارے میں بات نہیں کرتے تھے ملک انتہائی دولت مند اور انتہائی غریب طبقات میں منقسم تھا، جن کے درمیان غیر محفوظ اور خطرات میں گھرے ہوئے متوسط طبقے کی حد فاصل تھی۔

اس کے باوجود یہاں ایک ایسا ناقابل تردید، اگرچہ اس کی زیادہ تشہیر نہیں تھی، ماحول موجود تھا جسے صحافیوں کے مضطرب بڑے دھارے نے "ایک مستقل مخالفانہ کلچر" کا نام دیا تھا، جو ایک زیادہ منصفانہ اور انسانیت دوست معاشرے کے قیام کے امکانات کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکاری تھا۔ اگر امریکہ کے مستقبل کے بارے کوئی امید باقی تھی وہ اس انکار کے وعدے میں ہی پوشیدہ تھی۔

محافظوں کی آمدہ بغاوت

اس باب کا عنوان کوئی پیش گوئی نہیں بلکہ ایک اُمید ہے۔ جس کی میں جلد وضاحت کرنے والا ہوں۔

جہاں تک کتاب کے عنوان کا تعلق ہے۔ اسے ہم مکمل طور پر درست قرار نہیں دے سکتے۔ عوامی تاریخ لکھنا کسی واحد شخص کے بس کی بات نہیں ہے، یہ تاریخ کی مشکل ترین صنف ہے جس پر کوئی واحد شخص سیر حاصل معلومات مہیا نہیں کر سکتا ہے۔ میں نے اس کا یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اس میں حکومتوں کی ستائش نہیں کی گئی اور عوام کی مزاحمتی تحریکوں کو دیانتداری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح یہ کسی حد تک ایک جانبدارانہ بیان بن گیا ہے، یعنی ایک ایسا بیان جس کا جھکاؤ ایک خاص سمت میں ہو۔ لیکن میں اس بات پر پریشان نہیں ہوں، کیونکہ تاریخ کی کتابوں کا وہ کوہ گراں جس کے نیچے ہم سب دبے ہوئے ہیں، اس کا جھکاؤ خطرناک حد تک دوسری جانب ہے، حکومتوں کی بے جا ستائش سے کام لیا گیا ہے اور عوامی تحریکوں کو دانستہ توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یا پھر انہیں سرے سے پردہ اخفا میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہٰذا ہمیں توازن قائم رکھنے کے لیے اس کے دوسرے پہلو کو اجاگر کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ خدشہ ہے کہ ہم انہی کو حقائق جان کر دل و جان سے تسلیم کرتے رہیں گے۔

بانی بابوں اور صدور پر مرکوز تاریخ کی یہ کتابیں ایک عام شہری میں کچھ کر گزرنے کی صلاحیت کو بُری طرح سے کچل دیتی ہیں۔ اور ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ بحران کی مشکل گھڑیوں میں ہم کسی ایسی ہستی کی جانب دیکھیں جو ہمیں اس بحران سے نجات دلا سکے، مثلاً جب ملک انقلاب کے دور سے گزر رہا تھا تو بانی بابے ہماری مدد کو آئے، غلامی کے بحران سے لنکن، کساد بازاری کے بحران سے روز ویلیٹ، ویت نام اور واٹر گیٹ بحران سے کارٹر نے نجات دلائی۔ اور ان کا یہ بگاہے آنے والے بحرانوں کے درمیانی وقفوں میں سب اچھا ہوتا ہے اور اس معمول کی حالت کا جاری رہنا ہمارے لیے کافی ہے۔ یہ ہمیں سبق دیتی ہیں کہ ایک شہری کا سب سے بڑا اعزاز یہی ہے کہ وہ ہر چار سال بعد ووٹنگ بوتھ میں جا کر دو بے ضرر

اور دقیانوسی سوچ کے حامل دو سفید فام اور دولتمند اینگلو سیکسن مردوں میں سے ایک نجات دہندہ کا انتخاب کرے۔ نجات دہندوں کا تصور سیاست کے علاوہ پورے تمدن کا حصہ بن چکا ہے۔ اپنی قوتوں سے دستبردار ہوتے ہوئے، اپنی صلاحیتوں کو حقیر سمجھتے ہوئے اور اپنی خودی کو مٹاتے ہوئے ہم نے ستاروں، لیڈروں، مذہبی راہنماؤں، اور ہر میدان میں ماہرین پر انحصار کرنا سیکھا ہوا ہے۔ لیکن امریکی عوام گاہے بگاہے اس تصور کو مسترد کرتے اور بغاوت کرتے رہے ہیں۔

ابھی تک ان بغاوتوں کو قابو میں رکھا جاتا رہا ہے۔ امریکی نظام دُنیا میں کنٹرول کا اعلیٰ ترین نظام ہے۔ جسے بڑی ہوشیاری سے تشکیل دیا گیا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جو قدرتی وسائل، جوہر قابل اور انسانی قوت سے مالا مال ہو وہاں نظام، دولت کی ایک معقول مقدار لوگوں کی ایک معقول تعداد میں تقسیم کرنے کی سکت رکھتا ہے تاکہ بے اطمینانی کی کیفیت محض ایک اقلیت تک ہی محدود رہے۔ یہ اتنا طاقتور، اتنا بڑا اور اپنے بہت سے شہریوں کے لیے اس قدر خوشگوار ملک ہے کہ یہ ناخوش لوگوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کے لیے اختلاف رائے کی آزادی برداشت کر سکتا ہے۔

کنٹرول کا کوئی ایسا دوسرا نظام نہیں ہے جس میں اس سے زیادہ مواقع، راستے، کام اور عمل کی آزادی، لچک پذیری، منتخب افراد کے لیے صلہ جات اور لاٹریوں میں جیتنے کے امکانات موجود ہوں۔ کوئی بھی ایسا نظام نہیں، جو ووٹنگ سسٹم، کام کی جگہوں، چرچ، خاندان، اسکول، اور میڈیا کے ذریعے اپنے کنٹرول کو پیچیدہ طریقے سے تقسیم کرتے ہوئے عوام پر لاگو کرتا ہو، اور نہ ہی کوئی نظام اصلاحات، لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے عمل اور محب الوطنی کے جذبے کو بروئے کار لاتے ہوئے مخالفت کو کم کرنے میں اس سے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

قوم کی ایک تہائی دولت ایک فی صد افراد کے ہاتھوں میں ہے، باقی ماندہ دولت اس طریقے سے تقسیم کی گئی ہے کہ دوسرے 99 فیصد لوگ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں۔ چھوٹی جائیدادوں کے مالک، بے مالک افراد کے خلاف، سیاہ فام، سفید فاموں کے خلاف، مقامی لوگ نقل مکانی کر کے آنے والے غیر ملکیوں کے خلاف، دانشور اور ہنر مند افراد ان پڑھ اور غیر ہنر مند افراد کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ یہ تمام گروہ ایک دوسرے سے نالاں رہتے ہیں اور اس شدت سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں کہ ایک انتہائی دولتمند ملک میں محض بچے کھچے میں حصہ دار ہونے کی اپنی مشترکہ حیثیت کو مزید سے مزید تاریک بناتے چلے آ رہے ہیں۔

میں دراصل اشرافیہ کے ہاتھوں سے بچ جانے والے ان بچے کھچے وسائل کے لیے آپس میں بدست گریباں اس 99 فیصد عوام کو ایک قوم کے طور پر متحد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ایک ایسی تاریخ لکھ رہا ہوں جو ان کے مشترکہ مفادات کی نمائندگی کرتی ہے۔ میں نے 99 فیصد عوام کے اس اشتراک، اور

ایک فیصد کے ساتھ مفادات کے اس ٹکراؤ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جسے امریکہ کی حکومت اور دولتمند اشرافیہ باہمی گٹھ جوڑ کر کے "بانی بابوں" سے لے کر اب تک عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میڈیسن کو اس اکثریتی حصے کا خوف تھا جس کے بارے میں وہ امید رکھتا تھا کہ "نیا آئین" اسے کنٹرول میں رکھے گا۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے آئین کی تمہید ان الفاظ سے کی تھی "ہم عوام....." جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ نئی حکومت تمام لوگوں کے لیے ہے اور وہ اُمید رکھتے تھے کہ اس خرافات کو حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے گا، اور یہ ملک کے اندر اطمینان اور آسودگی کا باعث ہو گا۔

یہ ناٹک کئی نسلوں تک چلتا رہا اور اس کو سہارا دینے کے لیے خوبصورت لفاظی اور مادی علامات کا سہارا لیا جاتا رہا۔ عوام کو قومی پرچم، حب الوطنی، جمہوریت، قومی مفاد، قومی دفاع، قومی تحفظ جیسی اصطلاحات سے پرچایا جاتا رہا۔ جس طرح مغرب میں پھیلے ہوئے میدانوں میں کسی حد تک مراعات یافتہ سفید فام چاروں طرف سے ڈھکی ہوئی بگھیوں کے حصار میں نکلتے تھے اور اردگرد کے دشمنوں کو گولیوں کا شکار بناتے، جن میں، انڈینز یا سیاہ فام یا غیر ملکی یا دوسرے سفید فام جو اس قدر غریب تھے کہ انہیں اس حصار میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، شامل تھے۔ اور ان قافلوں کے سالار دور سے ایک محفوظ فاصلے پر رہتے ہوئے نظارہ کرتے رہتے، جب جنگ ختم ہو جاتی اور میدان دونوں طرف کی لاشوں سے اٹ جاتے تو وہ آگے بڑھتے اور زمین پر قابض ہو جاتے تھے۔ اور اس کے بعد ایک نئے علاقے میں ایک نئی مہم تیار کر کے بھیج دی جاتی تھی، اور امریکی تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے خوبصورت اور دل آویز نعروں سے کام لیا جاتا رہا۔

اس سکیم نے کبھی بھی پوری طرح سے کام نہ دکھایا۔ نوآبادیاتی دور کے غم و غصے کو قابو میں کرنے کے لیے (جس میں سیاہ فاموں کو غلام بنایا گیا، انڈینز کو نیست و نابود کیا گیا یا علاقہ بدر کیا جاتا رہا) انقلاب اور آئین کی چمکار بے اثر ثابت ہوئی۔ جس کی شہادت ہمیں مزارعین کی سرکشیوں، غلاموں کی بغاوتوں، انسدادِ غلامی اور حقوقِ نسواں کی تحریکوں کے مظاہروں اور ہنگاموں اور خانہ جنگی سے پہلے انڈینز کی گوریلا جنگوں کی صورت میں ملتی ہے۔ خانہ جنگی کے بعد جنوبی اور شمالی اشرافیہ کا ایک نیا اتحاد وجود میں آیا۔ جبکہ جنوب میں غریب اور نچلے طبقے کے سفید فام اور سیاہ فام نسلی بنیادوں پر آپس میں بدست گریباں تھے، اور شمال میں وفاقی کارکنوں اور نئے آنے والے پناہ گزین کارکنوں کے درمیان جھڑپیں جاری تھیں۔ کسان وسیع و عریض علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ جبکہ سرمایہ دارانہ نظام، صنعت کاری اور حکومت میں اپنے قدم مضبوطی سے جما رہا تھا۔ لیکن صنعتی کارکنوں میں ایک بغاوت جنم لے رہی تھی اور کسانوں میں ایک بہت بڑی مخالف تحریک سر اُٹھا رہی تھی۔

صدی کے اختتام پر سیاہ فاموں اور انڈینز کے ساتھ زبردستی کی مصالحت اور انتخابات اور جنگ کے ذریعے سفید فاموں کو معاشرے میں ضم کرنے اور ان کی توجہ کا رخ موڑنے کی کوششوں کے

باوجود، پہلی عالمی جنگ سے پہلے نئے صنعتی دور میں جنم لینے والی سوشلزم کی لہر اور بڑے پیمانے پر مزدور جدوجہد کے سامنے بند نہ باندھا جا سکا۔ نہ تو جنگ اور نہ ہی بیس کے عشرے کی جزوی خوشحالی اور نہ ہی سوشلسٹ تحریک کی ظاہری سرکوبی، تیس کے عشرے میں پیش آنے والے معاشی بحران میں ایک دوسری انقلابی بیداری اور ایک دوسری مزدور بغاوت کو روک سکی۔

دوسری عالمی جنگ نے ایک نئے اتحاد کو جنم دیا، جس کے بعد سرد جنگ کے ماحول میں جنگ کے سالوں کے انقلابی جوش و جذبے کو سرد کرنے کی کوششیں بظاہر کامیاب نظر آ رہی تھیں۔ لیکن پھر اچانک ساٹھ کے عشرے میں سیاہ فام خواتین، مقامی امریکی باشندے (ریڈ انڈینز)، قیدی اور سابقہ فوجی، جن کے بارے میں ایک عرصے سے خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ اب نرم پڑ چکے ہیں اور منظر سے غائب ہو چکے ہیں، حیران کن طور پر دوبارہ سر اُٹھانے لگے، اور ایک نئی انقلابی سیاست جنم لینے لگی اور اس کا عوام میں، جس کی آنکھیں ویت نام کی جنگ اور واٹر گیٹ کی سیاست نے کھول دی تھیں، تیزی سے پھیلنے کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ نکسن کا وائٹ ہاؤس سے نکل جانا، دو سو سالہ جشن کی تقریبات اور کارٹر کی صدارت سب کا مقصد نظام کی بحالی تھا۔ لیکن عوام میں پائی جانے والی بے یقینی اور بیگانگی، جس میں ریگن اور بش کے دور میں مزید اضافہ ہوا تھا، کا حل پُرانے نظام کی بحالی میں نہیں تھا۔ 1992ء میں کلنٹن کا انتخاب بھی جو تبدیلی کا ایک مبہم سا وعدہ لیے ہوئے تھا، ان لوگوں کی توقعات پر پورا نہیں اُتر رہا تھا جو امیدیں باندھے بیٹھے تھا۔

اس قسم کی مسلسل بے چینی میں اسٹیبلشمنٹ (کاروباری افراد، جرنلوں اور سیاستدانوں کا مخدوش اتحاد) کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قومی اتحاد کے اس تاریخی تصنع کو قائم رکھے جس میں حکومت تمام عوام کی نمائندہ تصور کی جاتی ہے اور معاشی بربادی یا جنگ کو افسوس ناک غلطیوں یا المناک حادثات کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے، اور ان کا ازالہ بھی اُسی اتحاد نے کرنا ہوتا ہے جو اس کا موجب ہوتا ہے۔ اور ان کے لیے اس بات کو یقینی بنانا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ ملک کے اندر صرف بہت زیادہ مراعات یافتہ اور قدرے مراعات یافتہ طبقے کا مصنوعی اتحاد ہی واحد اتحاد ہو، اور یہ کہ باقی ماندہ ۹۹ فیصد عوام بے شمار مختلف پہلوؤں سے آپس میں بٹے رہیں اور اپنے غم و غصے کو ایک دوسرے پر نکالتے رہیں۔

بڑی ہوشیاری کے ساتھ غریبوں کی مدد کے لیے متوسط طبقے پر ٹیکس لگاتے ہوئے، غرباء کی تذلیل کے ساتھ ساتھ ان کے لیے نفرت پیدا کی گئی۔ بڑے شاطرانہ طور پر غریب سیاہ فام بچوں کو غریب سفید فاموں کے سکولوں میں داخل کیا گیا اور صرف غریبوں کے سکولوں کا اس کا ہدف بنایا گیا، جبکہ امراء کے سکولوں کو ہاتھ تک نہ لگایا گیا، اور جہاں بچوں کو مفت دودھ کی ضرورت تھی وہاں قوم کی دولت کو انتہائی کفایت کے ساتھ خرچ کیا گیا۔ جبکہ کروڑوں ڈالر کے ہوائی جہاز بردار بحری جہازوں پر بے دریغ رقم خرچ کی گئی۔ بڑی ذہانت کے

ساتھ سیاہ فاموں اور خواتین کے برابری کے مطالبات کو انہیں معمولی سی مخصوص مراعات دیتے ہوئے پورا کیا گیا اور انہیں غیر معقول اور فرسودہ نظام کے تحت کمیاب ملازمتوں کے لیے تمام دوسرے لوگوں کے ساتھ مقابلے میں دھکیل دیا گیا۔ بڑی فراست کے ساتھ اکثریت کے خوف اور غصے کا رخ اس مجرم طبقے کی جانب موڑ دیا گیا جو معاشی ناانصافیوں کے نتیجے میں اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ابھرا جتنا کہ اسے ختم کیا جا سکتا تھا، اور یوں ان کی توجہ قومی وسائل پر ڈالے جانے والے ان بہت بڑے بڑے ڈاکوں سے ہٹادی گئی جو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے بااختیار حکومتی عہدیدار ڈال رہے تھے۔

لیکن طاقت کے تمام تر اختیارات اور سزاؤں تحریصات اور مراعات، بہلاؤوں اور چالبازیوں کے باوجود جو ملک کی پوری تاریخ میں پھیلی ہوئی ہیں اسٹیبلشمنٹ اپنے آپ کو بغاوت سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ ہر مرتبہ ایسا نظر آتا تھا کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئی ہے اور ہر مرتبہ وہ لوگ جن کو یہ سمجھتی تھی کہ بہلاوے میں آچکے ہیں یا سرد پڑ چکے ہیں اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ سیاہ فام جن کو سپریم کورٹ کے فیصلوں اور کانگریس کے پاس کئے گئے قوانین کی مدد سے للو چتو لگانے کی کوششیں کی جاتیں، سرکشی اور بغاوت پر آمادہ نظر آتے، محبت سے رام کی گئی اور نظر انداز کی گئی، ناز نخروں میں پلی اور بدسلوکی کی شکار تمام خواتین بغاوتوں کے علم بلند کرتی رہیں، انڈینز جنہیں مردہ خیال کیا جاتا تھا دوبارہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور سرکشیوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔ محنت کش افراد جنہیں اصلاحات کے نتیجے میں مطمئن خیال کیا جاتا تھا، اور ان کی اپنی یونینوں کے ذریعے حدود میں رکھنے کی کوششیں کی جاتی تھیں، ہڑتالیں کرتے رہے۔ حکومتی دانشور جن سے راز داری کے حلف لیے گئے ہوتے تھے، راز افشاء کرتے رہے۔ پادری سعادت مندی کو ترک کرتے ہوئے بغاوتوں پر اُترتے رہے۔

ان باتوں کو دہرانے کا مقصد لوگوں کو وہ باتیں ذہن نشین کروانا ہے جو اسٹیبلشمنٹ چاہتی ہے کہ لوگ بھول جائیں، یعنی ظاہری طور پر بے بس لوگوں میں مزاحمت کی خوفناک قوت اور ظاہری طور پر مطمئن لوگوں کی جانب سے تبدیلی کے مطالبات کی تاریخ کو منظر عام پر لانا اپنی انسانیت کو منوانے کی طاقتور انسانی قوت محرکہ کی تصدیق کرنا ہے۔ یہ اس بات کو ثابت کرانے کی کوشش ہے کہ انتہائی یاس اور نا اُمیدی میں بھی غیر متوقع کا امکان موجود ہوتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ طبقاتی شعور کا حقیقت سے بڑھ کر تخمینہ لگانا، بغاوت اور اس کی کامیابی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا گمراہ کن ہوگا۔ یہ اس حقیقت کی وضاحت نہیں کرتا کہ دُنیا (نہ صرف امریکہ بلکہ دُنیا میں کسی بھی دوسری جگہ) ابھی تک اشرافیہ کے ہاتھوں میں ہے، یہ کہ عوامی تحریکیں، اگرچہ یہ تکرار کی نہ ختم ہونے والی صلاحیت کی حامل ہوتی ہیں، ابھی تک ناکام بنادی جاتی رہی ہیں، یا ان کا رُخ پھیر دیا جاتا رہا ہے۔ سوشلسٹ انقلابی سوشلزم سے بے وفائی کرتے رہے ہیں، قوم پرست انقلاب ایک نئی آمریت کو

جنم دیتے رہے ہیں۔

لیکن تاریخ کی اکثر کتابوں میں بغاوت کو جان بوجھ کر گھٹا کر بیان کیا گیا ہوتا ہے اور ریاست کاری کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس طرح ریاست کے شہریوں کی بے بسی اور کمزوری کو مزید تقویت دی جاتی ہے۔ جب ہم مزاحمت کاروں کی تحریکوں یا بغاوت کی انفرادی اشکال کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ طبقاتی شعور یا معاشرے میں پائی جانے والی کسی بھی ناانصافی کے بارے میں آگاہی کئی ایک درجوں پر ہوتی ہے، اس کے اظہار کے کئی طریقے ہوتے ہیں، کہیں یہ ہمیں صاف صاف نظر آتی ہے، کہیں اس کا اظہار بہت پیچیدہ صورتوں میں ہوتا ہے اور کبھی یہ براہ راست سامنے آتی ہے، اور کبھی یہ اپنی اشکال بدل کر ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ایسے نظام میں جہاں خوف اور ضوابط کا راج ہو لوگ یہ ظاہر نہیں کرتے کہ وہ کیا کچھ جانتے ہیں اور کس قدر گہرائی سے محسوس کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ عملی طور پر یہ جان جائیں کہ وہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کا اظہار کر سکتے ہیں۔

وہ تاریخ جو عوام کی مزاحمت کی یاد کو زندہ رکھتی ہے، طاقت کی نئی تشریحات پیش کرتی ہے۔ روایتی تشریح کے مطابق وہ فریق جس کے پاس فوجی طاقت، دولت، سرکاری نظریے پر تصرف اور تہذیبی کنٹرول ہو طاقت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر ان معیاروں کو مدنظر رکھا جائے تو عوامی بغاوت کبھی بھی اتنی مضبوط نظر نہیں آتی جو اپنے وجود کو قائم رکھ سکے۔

تاہم باغیوں کی غیر متوقع کامیابیاں خواہ وقتی ہی کیوں نہ ہوں اس طبقے کے عدم تحفظ کو ظاہر کرتی ہیں جنہیں عام طور پر طاقت ور خیال کیا جاتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کروڑ ہا لوگوں، فوجیوں اور پولیس اساتذہ اور مذہبی پیش اماموں، منتظمین اور سماجی کارکنوں، ٹیکنیشنوں اور صنعتی کارکنوں، ڈاکٹروں، وکیلوں نرسوں، نقل وحمل اور مواصلات کے کارکنوں، کوڑا کرکٹ اُٹھانے والوں اور فائرمینوں کی تابع داری اور وفاداری کے بغیر جن کو نظام کو جاری رکھنے کے لیے معمولی معاوضے ادا کئے جاتے ہیں، اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ ان لوگوں (ملازمین اور قدرے مراعات یافتہ طبقہ) کو اشرافیہ کے ساتھ اتحاد میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ یہ نظام کے محافظ اور اعلیٰ طبقے اور نچلے طبقے کے درمیان ایک حد فاصل بن جاتے ہیں۔ اگر یہ فرمانبرداری ترک کر دیں تو سسٹم منہدم ہو جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف اس وقت ہوگا جب یہ ہم سب جو تھوڑے سے مراعات یافتہ اور تھوڑے سے پریشان حال، ہیں یہ سمجھنا شروع کر دیں کہ ہم ایکا جیل میں بغاوت کے محافظوں کی طرح ہیں، جنہیں محض بوقت ضرورت استعمال کرنے کے لیے رکھا گیا ہوتا ہے، یعنی اسٹیبلشمنٹ خواہ جیسی بھی عنایات سے ہمیں نواز رہی ہو، اگر اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے ضروری خیال کرے تو بلا تردد ہمیں بھی قربانی کے بکرے بنانے سے نہیں چوکے گی۔

ہمارے آج کے دور میں بعض مخصوص حقائق ایسے واضح انداز میں ابھر کر سامنے آسکتے ہیں جو نظام سے عمومی وفاداری کے خاتمے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس ایٹمی دور میں ٹیکنالوجی، معاشیات اور جنگ کے حوالے سے جنم لینے والے نئے حالات میں اب نظام کے محافظوں (دانشوروں، گھروں کے مالکان، ٹیکس ادا کرنے والوں، ہنرمند، کارکنوں، پیشہ وروں، اور حکومتی ملازمین) کے لیے اس بات کے امکانات کم سے کم رہ گئے ہیں کہ وہ سیاہ فاموں، غریبوں، مجرموں، سمندر پار دشمنوں پر کیے جانے والے تشدد (جسمانی یا ذہنی) سے لاتعلق رہ سکیں۔ معیشت کی بین الاقوامیت، پناہ گزینوں اور غیر قانونی نقل مکانی کرنے والوں کی نقل وحرکت نے صنعتی ممالک کے عوام کے لیے دُنیا کے غریب ممالک کی بھوک و افلاس اور بیماریوں سے بے خبر رہنا مشکل بنادیا ہے۔

ہم سب تباہ کن ٹیکنالوجی، بے مہار معیشتوں، عالمی زہرآلودگی، بے قابو جنگوں سے پیدا شدہ نئے حالات کے یرغمالی بن چکے ہیں۔ ایٹمی ہتھیار، غیر مرئی تابکاری، معاشی طوائف الملو کی قیدیوں اور محافظوں میں امتیاز نہیں کرتے۔ اس خبر پر کہ امریکی جنگی قیدی ناگاساکی کے قرب و جوار میں ہو سکتے ہیں۔ امریکہ کی اعلیٰ کمانڈ کا ردعمل ہمارے سامنے ہے۔ "سینئر بورڈ کے لیے پہلے سے مقرر کیے گئے اہداف میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔"

محافظوں میں بڑھتے ہوئے عدم اطمینان کی شہادت موجود ہے۔ ہمارے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ کچھ عرصے سے غریب اور نظرانداز کیے گئے لوگ ووٹ نہیں ڈالتے، وہ اس سیاسی نظام سے لاتعلق ہورہے ہیں، جس کے بارے میں وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان کی کوئی پروا نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ اب یہ لاتعلقی اوپر کی جانب ان خاندانوں میں سرایت کررہی ہے، جو غربت کی لکیر سے اوپر زندگیاں بسر کررہے ہیں۔ سفید فام محنت کش ہیں جو نہ تو دولت مند ہیں اور نہ ہی غریب ہیں، لیکن معاشی عدم تحفظ پر ناراض ہیں، اپنے کام سے ناخوش ہیں، اپنی ہمسائیگیوں کے بارے میں پریشان، اور حکومت سے عناد رکھتے ہیں۔ نسل پرستی کے عناصر کے ساتھ طبقاتی شعور کے عناصر، نچلے طبقات کے لیے نفرت کے ساتھ اشرافیہ پر بداعتمادی نے مل کر دائیں یا بائیں کسی بھی جانب سے آنے والے سلجھاؤ کے لیے راستے کھول دیے ہیں۔

بیس کے عشرے میں متوسط طبقات میں اسی قسم کی کشیدگی پائی جاتی تھی، جو مختلف سمتیں اختیار کرسکتی تھی (اس وقت کوکلکس کلین کے لاکھوں ممبران تھے) لیکن تیس کے عشرے میں ایک منظم بائیں بازو کے کام نے ان احساسات کو بڑی حد تک مزدور یونینز، کسان یونینز، اور سوشلسٹ تحریکوں میں متحرک کیا۔ آنے والے سالوں میں ہم متوسط طبقے میں پائی جانے والی بے اطمینانی کو متحرک کرنے کی دوڑ میں شامل ہوسکتے ہیں۔

اس بے اطمینانی کی حقیقت بہت صاف ہے۔ ستر کے عشرے کی ابتدا میں لیے گئے جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ 70 سے 80 فیصد امریکی عوام حکومت، تجارت اور فوج پر عدم اعتماد کا شکار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بداعتمادی سیاہ فاموں، غریبوں اور انقلابیوں کے دائرے سے باہر نکل کر آگے پھیل رہی ہے۔ یہ ہنرمند کارکنوں، سفید پوش محنت کشوں اور پیشہ ور افراد میں سرایت کررہی ہے۔ شاید تاریخ میں پہلی مرتبہ نظام کے بارے میں نچلے طبقات اور متوسط طبقات، قیدیوں اور محافظوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔

معاشرے میں کچھ دوسری علامات بھی نظر آرہی ہیں۔ مثلاً "کثرت سے شراب نوشی"، طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح (تین میں سے ایک شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے اب یہ شرح دو میں سے ایک کی جانب تجاوز کررہی ہے)، منشیات کا استعمال، ضعف اعصاب، اور ذہنی بیماریاں وغیرہ۔ بہت سے لوگ بڑی مایوسی کے عالم میں نامردی، اکلاپے، اکتاہٹ کے احساس، دوسرے لوگوں سے، دُنیا سے اپنے کام سے اور اپنے آپ سے بیزاری کے علاج کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ نئے مذاہب اور اپنی مدد آپ کے گروپس میں شمولیت اختیار کررہے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے گویا ساری قوم اپنی ادھیڑ عمری کے خود تشکیکی اور خود احتسابی کے ایک بحران سے گزر رہی ہو۔

یہ سب کچھ اس وقت ہورہا ہے جب متوسط طبقہ معاشی طور پر زیادہ زیادہ عدم تحفظ کا شکار ہے۔ نظام کو اپنی پوری نامعقولیت کے ساتھ منافع کے لالچ میں، انشورنس کمپنیوں کے لیے سٹیل کی آسمان کو چھوتی بلند وبالا عمارتوں کی تعمیر کی جانب دھکیل دیا گیا ہے جبکہ شہروں کی حالت خستہ ہورہی ہے، تباہی و بربادی پھیلانے والے ہتھیاروں پر کروڑوں ڈالر خرچ کیے جارہے ہیں۔ بچوں کے لیے کھیلوں کے میدانوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہے؛ ان لوگوں کو خطیر رقوم ادا کی جارہی ہیں جو خطرناک یا بے فائدہ اشیاء تیار کررہے ہیں اور فن کاروں، موسیقاروں اور لکھاریوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جو نچلے طبقوں کے لیے ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ اب یہ متوسط طبقات کے لیے ناکام ہونا شروع ہوگیا ہے۔

بے روزگاری کے خطرات جو ہمیشہ سے غریبوں کے گھروں تک محدود تھے۔ اب سفید پوشوں، محنت کشوں اور پیشہ ور افراد کے گھروں میں بھی سر اُٹھانے لگے ہیں۔ کالج کی تعلیم اب بے روزگاری کے خلاف کوئی گارنٹی نہیں رہ گئی، اور وہ نظام جو سکولوں سے نکلنے والے نوجوانوں کو کسی قسم کا مستقبل پیش نہیں کر سکتا۔ شدید خطرے میں گھرا ہوا ہے۔ اگر یہ صرف غریبوں کے بچوں ساتھ ہورہا ہو تو اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے، ان کے لیے جیلیں موجود ہیں۔ اگر یہ متوسط طبقے کے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے، تو معاملات ہاتھ سے نکل سکتے ہیں۔ غریب لوگ چھوٹی ہوتی ہوئی چادر کے مطابق اپنے پاؤں سکیڑ لینے کے عادی ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ رقم کی کمی کا شکار رہتے ہیں، لیکن حالیہ سالوں میں متوسط طبقات کے لوگ بھی بلند قیمتوں اور بڑھتے

ہوئے ٹیکسوں کے دباؤ کو محسوس کرنے لگے ہیں۔

ستر اور اسی کے عشروں میں اور نوے کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں جرائم کی تعداد میں خوفزدہ کر دینے والا ڈرامائی اضافہ دیکھنے میں آیا تھا، اور کسی بھی بڑے شہر میں چلتے ہوئے اس کا تجربہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ دولت اور غربت کا واضح امتزاج، ملکیت کا کلچر اور دیوانہ وار اشتہار بازی واضح دکھائی دیتی تھی۔ ایک شدید معاشی مسابقت پائی جاتی تھی، جس میں ریاست کا قانونی تشدد اور کارپوریشنوں کی قانونی لوٹ مار کے ساتھ غربا کے غیر قانونی جرائم ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ زیادہ تر جرائم چوری پر مبنی تھے۔ امریکہ کی جیلوں میں قیدیوں کی ایک بڑی تعداد غریبوں اور غیر سفید فاموں پر مشتمل تھی جو واجبی سی تعلیم رکھتے تھے۔ ان میں سے نصف اپنی گرفتاری سے قبل کے مہینوں میں بے روزگار تھے۔

سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ توجہ حاصل کرنے والے جرائم نو جوان غرباء کے وہ پر تشدد جرائم رہے ہیں، جنہوں نے بڑے شہروں میں ایک دہشت کی فضا قائم کر دی ہے، جن میں مایوس اور نشے کے عادی نوجوان متوسط طبقے کے افراد پر یا اپنے جیسے ہی غریب ساتھیوں پر حملے کرتے اور لوٹتے ہیں۔ ایک معاشرہ جو دولت اور تعلیم کی بنا پر اس قدر طبقات میں تقسیم ہو چکا ہو۔ اس میں حسد اور طبقاتی نفرت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

ہمارے دور کا ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ آیا متوسط طبقات جو آج تک یہ خیال کرتے تھے کہ اس قسم کے جرائم کا حل مزید جیلیں اور مزید قید کی سزائیں ہیں، جرائم پر قابو پانے میں ناکامی کی بنا پر یہ سوچنا شروع کر سکتے ہیں کہ اس کا نتیجہ محض جرائم اور سزاؤں کے ایک نہ ختم ہونے والے شیطانی چکر کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ شہر میں محنت کش افراد کا جسمانی تحفظ صرف اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب شہر میں ہر کوئی کام کر رہا ہو، اور اس کے لیے قومی ترجیحات کو تبدیل کرنا ہوگا، نظام کو بدلنا ہوگا۔

حالیہ سالوں میں مجرمانہ حملوں کے خوف کے ساتھ ایک دوسرا اس سے بھی بڑا خوف شامل ہو گیا ہے۔ کینسر کی وجہ سے اموات میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا ہے اور طبی محققین اس کی وجہ تلاش کرنے میں بے بس نظر آتے ہیں۔

یہ بات واضح ہو کر سامنے آنے لگی ہے کہ ان اموات کی اہم ترین وجہ فوجی نوعیت کے تجربات اور ہوس اور لالچ کی حتمی خواہشات کی وجہ سے ماحول کی زہر آلودگی ہے۔ پانی جو لوگ پیتے ہیں، ہوا جس میں لوگ سانس لیتے ہیں، ان عمارات میں اُڑنے والے خاکی ذرات جن میں لوگ کام کرتے ہیں، کئی سالوں کے دوران اس نظام کے نتیجے میں زہر آلود ہو چکے ہیں، جو اپنے فروغ اور منافع کے جنون میں انسانوں کے تحفظ اور صحت کو نظر انداز کرتا آ رہا ہے۔ ایک نیا اور ہلاکت خیز تازیانہ "ایڈز" کے وائرس کی شکل

میں ظاہر ہوا ہے جو کہ ہم جنس پرستوں اور منشیات کے عادی افراد میں ایک مخصوص تیزی سے پھیلا ہے۔

نوے کے عشرے کی ابتداء میں سوویت نظام کا غیر حقیقی سوشلزم ناکام ہو چکا تھا۔ اور امریکی نظام قابو سے باہر نظر آ رہا تھا، ایک بے مہار سرمایہ کاری، ایک بے مہار ٹیکنالوجی، ایک بے مہار فوج گردی کے نتیجے میں حکومت ان لوگوں سے دور ہوتی جا رہی تھی جن کی نمائندگی کا وہ دعویٰ کرتی تھی۔ جرائم قابو سے باہر تھے، کینسر اور ایڈز قابو سے باہر تھے، قیمتیں اور ٹیکس اور بے روزگاری قابو سے باہر تھی، شہروں کی خستہ حالی اور خاندانوں کی ٹوٹ پھوٹ قابو سے باہر تھی، اور لوگ اس سب صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

یوں نظر آتا ہے کہ حالیہ سالوں میں حکومت پر عمومی بداعتمادی سچائی کے بڑھتے ہوئے ادراک کا نتیجہ ہے، جیسا کہ ناول "کیچ-22" میں امریکی ایئر فورس کے بمبار طیارے کا پائلٹ "یوسارین" اپنے ایک دوست سے کہتا ہے جس نے اس پر دشمن کی طرفداری اور مدد کرنے کا الزام لگایا ہے: "کوئی بھی شخص جو تمہیں مارنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ دشمن ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس طرف ہے، اور تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے، کیونکہ جب تک تم اسے یاد رکھو گے زندہ رہو گے" ناول میں اس سے اگلا فقرہ یہ ہے "لیکن کلیونگر" یہ بھول گیا تھا اور اب وہ اگلے جہان میں ہے۔"

آیئے قوم کی تاریخ میں پہلی مرتبہ، بنیادی تبدیلی کے لیے عوام کے متحد ہونے کا امکان تصور کرتے ہیں۔ کیا اشرافیہ جیسا کہ کئی دفعہ ہو چکا ہے، عوام کو اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ متحد کرنے کے لیے، اپنے حتمی ہتھکنڈے، بیرون ملک مداخلت، کی جانب رجوع کرے گی؟ اس نے عراق کے ساتھ جنگ کی صورت میں 1991ء میں یہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ عسکری جذبہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا تھا۔

ملک کے اندر شدید معاشی مسائل کو حل کرنے یا ملک کے اندر پائی جانے والی بے اطمینانی کے نکاس کے لیے بیرون ملک کسی قسم کے انتظام میں اسٹیبلشمنٹ کی نااہلی کے نتیجے میں امریکی عوام مزید کسی دفع الوقتی کے کام، مزید قانونی اصطلاحات، تاش کی اُسی گڈی کو دوبارہ پھینٹنے، یا ایک اور "نیو ڈیل" کے بجائے ایک انقلابی تبدیلی کے مطالبہ کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ آیئے چند ثانیوں کے لیے خیال پرستی سے کام لیتے ہیں، تاکہ جب ہم حقیقت پسندی کی جانب دوبارہ لوٹیں تو یہ وہ حقیقت پسندی نہ ہو جو اسٹیبلشمنٹ کے عوامی حوصلہ شکنی کے عمل میں بہت سودمند ثابت ہوتی ہے۔ آیئے ذرا تصور کریں کہ انقلابی تبدیلی ہم سب سے کس چیز کا مطالبہ کرتی ہے۔

معاشرے پر اقتدار کا کنٹرول ان کے ہاتھوں (دیو قامت کارپوریشنوں، فوج اور ان کے شریک کار سیاستدانوں) سے واپس لینا ہوگا، جن کے اقدامات نے قوم کو موجودہ حالت تک پہنچایا ہے۔ ہمیں ملک میں موجود تمام مقامی گروپس کی ایک مربوط کوشش کے ساتھ ملکی معیشت کو کارگردگی اور انصاف دونوں حوالوں سے ازسرِ نو تشکیل دینا ہوگا، اور باہمی تعاون سے وہ اشیا پیدا کرنا ہوں گی جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ ہم میں

سے ہر کسی کو، بشمول ان لوگوں کے جن کو اب تک کام سے باہر رکھا گیا ہے (بچے، بوڑھے افراد اور معذور افراد) کسی نہ کسی قسم کا کام کرنا ہوگا۔ معاشرہ اس بہت زیادہ توانائی کو جواب بیکار پڑی ہے، اس ہنر اور صلاحیتوں کو جواب تک غیر مستعمل پڑی ہیں استعمال میں لاسکتا ہے۔ تمام لوگ معمول کے لیکن ضروری کاموں کے لیے دن میں سے چند گھنٹوں کا حصہ ڈال سکتے ہیں اور ان کے پاس تفریحی، تخلیقی اور اپنے من پسند کاموں کے لیے بہت سا فارغ وقت بھی بچ سکتا ہے، اس طرح وہ اتنا کچھ پیدا کر سکتے ہیں کہ لوگوں میں برابر اور وافر اشیاء تقسیم کی جا سکیں۔ مخصوص بنیادی اشیا، خوراک یا رہائش، طبی سہولیات، تعلیم، نقل و حمل کی سہولیات، اتنی وافر ہو سکتی ہیں کہ یہ زر کے چکر سے نکل کر ہر ایک کو مفت مہیا ہو سکیں۔

وقت کے ساتھ لوگ دوستانہ گروہوں کی صورت میں ایک نئی تبدیل شدہ اور تشدد سے پاک تہذیب کو جنم دے سکتے ہیں، جس میں تمام اقسام کے شخصی اور گروہی اظہار ممکن ہوں۔ پھر مرد اور خواتین، سیاہ فام اور سفید فام اپنے امتیازات کو مثبت خوبیوں کے طور پر، اور نہ کہ غلبے اور تسلط کے جواز کے طور پر، پروان چڑھا سکتے ہیں۔ تب لوگوں کے تعلقات میں، بچوں کی پرورش میں باہمی تعاون اور آزادی کی نئی اقدار وجود میں آسکتی ہیں۔

امریکہ جیسے کنٹرول کے پیچیدہ حالات میں، یہ سب کچھ کرنے کے لیے امریکہ کی تاریخ کی تمام گذشتہ تحریکوں (مزدور بغاوتوں، سیاہ فام بغاوتوں، مقامی امریکیوں، خواتین، نوجوان لوگوں کی تحریکوں) کی توانائی کے ساتھ ناراض متوسط طبقے کی نئی توانائی کو شامل کرنے کی ضرورت ہوگی۔ لوگوں کو اپنے نزدیک ترین ماحول، (کام کی جگہ، خاندان، سکول، کمیونٹی) میں تبدیلی کا آغاز کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ غیر حاضر مقتدرہ کے خلاف جدوجہد کے ایک سلسلے کے ذریعے ان جگہوں کا کنٹرول اُن لوگوں کو سونپا جا سکے جو وہاں رہتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔

اس جدوجہد میں کامیابی کے لیے وہ تمام ہتھکنڈے جو ماضی میں مختلف اوقات میں عوامی تحریکیں استعمال کرتی رہی یعنی ہڑتالیں، بائیکاٹ، اور عمومی ہڑتالیں، سب کو بروئے کار لانا ہوگا۔ دولت کی تقسیم نو، اداروں کی تشکیل نو، باہمی تعلقات میں بہتری کے لیے براہ راست اقدامات اُٹھانا ہوں گے۔ موسیقی، ادب، ڈراموں، تمام فنون، روزمرہ زندگی میں کام اور تفریح کے میدانوں میں شمولیت، عزت و توقیر، اپنے آپ کی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے لوگوں کے اشتراک کا ایک کلچر جنم دینا ہوگا۔

اس میں بہت سی ناکامیوں کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ایسی تحریک پورے ملک کے طول و عرض میں سینکڑوں اور ہزاروں جگہوں پر اپنے پیر جمالے گی تو اس کو دبانا ناممکن ہو جائے گا، کیونکہ وہ تمام محافظ جن پر ایسی تحریکوں کو دبانے کے لیے نظام انحصار کرتا ہے خود باغیوں میں شامل ہوں گے۔ یہ ایک نئی قسم کا انقلاب ہوگا، جو کہ میرے خیال کے مطابق واحد قسم ہوگی جو امریکہ جیسے ملک میں کامیاب ہو

سکتی ہے۔ اس کے لیے بہت زیادہ توانائی، قربانی، عزم صمیم اور صبر و حوصلے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن کیونکہ یہ عمل ایک ہی وقت میں بغیر کسی تاخیر کے شروع ہوگا، اس لیے اس میں ایک فوری تسکین کا عنصر بھی شامل ہوگا، جو کہ ہمیشہ مشترکہ ہدف کے لیے مل جل کر جدوجہد کرنے والے گروہوں کے درمیان استوار محبت کے بندھنوں میں پایا جاتا ہے۔

یہ سب باتیں ہمیں امریکہ کی تاریخ سے دور تصورات کی دُنیا میں لے جاتی ہیں۔ لیکن ہم تاریخ سے پوری طرح باہر نہیں ہوتے، ہمیں اپنے ماضی میں اس قسم کے امکانات کی کم از کم جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ ساٹھ اور ستر کے عشروں میں اسٹیبلشمنٹ ایک جنگ میں قومی اتحاد اور محبّ الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس دوران تہذیبی تبدیلی (جنس، خاندان، نجی تعلقات میں) کا ایک ایسا سیلاب اُمڈ آیا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی سیاسی اور معاشی نظام کے اتنے زیادہ پہلوؤں سے اس قسم کے عدم اعتماد کا اظہار دیکھنے میں آیا تھا۔ تاریخ کے ہر دور میں حتیٰ کے مسابقت اور تشدد کے کلچر کے درمیان بھی، اگرچہ مختصر سے عرصہ کے لیے ہی سہی، لوگ ایک دوسرے کی مدد کے طریقے تلاش کر لیتے رہے ہیں۔

اس وقت ہلچل اور جدوجہد، لیکن ساتھ ہی ایک تحریک اور امنگ، کا میدان واضح طور پر موجود ہے۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ ایسی کوئی تحریک وہ کچھ کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے جو خود نظام کبھی بھی نہیں کر سکا، یعنی بغیر کسی بڑے تشدد کے ایک بڑی تبدیلی آسکتی ہے۔ یہ اس لیے ممکن نظر آرہا ہے، کیونکہ 99 فیصد کا جتنا بڑا حصہ اپنی مشترکہ ضروریات کو محسوس کر رہا ہے اور محافظوں اور قیدیوں کی جتنی بڑی تعداد اپنے مشترکہ مفادات کو پہچان رہی ہے اسٹیبلشمنٹ اتنی ہی زیادہ تنہا اور غیر مؤثر ہو رہی ہے۔ اشرافیہ کے ہتھیار، دولت اور معلومات پر کنٹرول، پُرعزم عوام کے سامنے بے کار ثابت ہوں گے۔ نظام کے ملازمین بوڑھے اور مردہ نظام کو جاری رکھنے کے لیے کام کرنے سے انکار کر دیں گے، اور اپنے وقت اور حلقہ استعداد اور ہر چیز کو جو نظام نے انہیں خاموش رہنے کے عوض عطا کر رکھی ہے، اس نظام کو ادھیڑنے اور نئے نظام کی تخلیق کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیں گے۔

نظام کے قیدی پہلے کی طرح ایسے طریقوں سے جن کی پیش بینی نہیں کی جا سکتی، ایسے اوقات میں جن کی پیش گوئی ممکن نہیں ہوگی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ہمارے دور کی نئی حقیقت اس امکان کی موجودگی ہے کہ محافظ بھی ان قیدیوں کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ ہم کتابوں کے قارئین اور مصنفین زیادہ تر محافظوں میں شامل رہے ہیں۔ اگر ہم اسے سمجھ جاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو زندگی نہ صرف آج کے دن سے ہی زیادہ اطمینان بخش اور آسودہ ہو سکتی ہے، بلکہ ہمارے پوتے اور پڑپوتے ایک مختلف اور شاندار دُنیا دیکھ سکتے ہیں۔

کلنٹن کا دورِ صدارت

1992ء کے صدارتی انتخابات میں ارکنساس کے خوبصورت نوجوان گورنر اور ڈیموکریٹ بل کلنٹن نے جارج بش کو شکست دے دی۔ ملک کے معاشی حالات تباہی کی جانب جا رہے تھے اور کلنٹن نے "تبدیلی" کا وعدہ کیا تھا۔

ان انتخابات میں زیادہ جوش و خروش دیکھنے میں نہیں آیا تھا (45 فیصد لوگ انتخاب سے لاتعلق رہے)، اور جنہوں نے ووٹ ڈالے ان میں سے صرف 43 فیصد نے کلنٹن کو ووٹ دیئے، بش کو 38 فیصد ووٹ ملے اور تقریباً 20 فیصد ووٹروں نے دونوں بڑی پارٹیوں کو چھوڑ کر ٹیکساس کے ایک ارب پتی "راس پیراٹ" کو ووٹ ڈالے جس نے روایتی سیاست کو ترک کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

کلنٹن کو "ڈیموکریٹک لیڈر شپ کونسل" کی حمایت حاصل تھی جو کہ ڈیموکریٹک پارٹی کو مرکز کے نزدیک تر لانا چاہتی تھی۔ اس کا منصوبہ سیاہ فاموں، خواتین اور محنت کشوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مناسب وعدے، لیکن سفید فام قدامت پسند ووٹروں کو متوجہ کرنے کے لیے جرائم کے خلاف سختی اور مضبوط فوج کی ترغیبات پیش کرنا تھا۔

اس کے نتیجے میں کلنٹن نے بہت کم ایسے افراد کو کیبنٹ میں شامل کیا جن سے مزدوروں اور سوشل ویلفیئر پروگراموں کی حمایت کا تاثر ابھرتا تھا۔ لیکن خزانے اور تجارت کے محکموں میں اس کی اہم تقرریاں دولتمند کارپوریٹ وکلا کی تھیں، اور اس کی خارجہ پالیسی کا سٹاف۔ وزیر دفاع، سی آئی اے کا ڈائریکٹر، نیشنل سیکورٹی کا مشیر۔ دو حزبی سرد جنگ کی ٹیم کے روایتی کھلاڑی تھے۔

اپنی انتخابی کامیابی کے فوراً بعد کلنٹن نے کہا "میں امریکی خارجہ پالیسی میں ضروری تسلسل کی یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں۔" حقیقت میں انتخاب کی شام کو اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ سرد جنگ کے خاتمے کے باوجود وہ بش کے فوجی بجٹ میں صرف 3 فیصد کمی کرے گا۔ لیکن صدارت سنبھالنے کے بعد اس نے 262 بلین ڈالر کے فوجی بجٹ کو جوں کا توں برقرار رکھا۔

عملی طور پر کلنٹن ری پبلکن کے نقش قدم پر چل رہا تھا، جس کا خیال تھا کہ امریکہ کو دو علاقائی

جنگوں کے لیے فوری طور پر تیار رہنا چاہیے۔ جبکہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد 8 اپریل 1991ء کو جنرل کولن پاول "ڈیفنس نیوز" کو واضح طور پر بتا چکا تھا کہ اب اس کا کوئی بڑا دشمن سامنے نہیں رہا۔ اب میرے سامنے صرف کاسترو اور کم ال سنگ ہی رہ گئے ہیں۔ اسی طرح 1992ء میں بش کا وزیر دفاع ڈک چینی بھی، جسے بمشکل ہی امن پسند کہا جا سکتا تھا، کہہ چکا تھا کہ اب کوئی واضح خطرہ باقی نہیں رہ گیا اور ہمیں اس کے بارے میں پریشان ہونے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہ گئی۔

بلکہ اپنی صدارت کے دو سال گزارنے کے بعد کلنٹن نے فوج کے لیے رقم میں اضافہ کر دیا۔ واشنگٹن سے نیویارک ٹائمز کے لیے ایک مراسلے میں (یکم دسمبر 1994ء) میں کہا گیا: "ری پبلکن کی اس نکتہ چینی کو ختم کرنے کے لیے کہ فوج کو پورے فنڈز مہیا نہیں کیے جا رہے صدر کلنٹن نے آج "روز گارڈن" تقریب کا انعقاد کیا، جس میں اس نے اعلان کیا کہ اگلے چھ سالوں کے لیے وہ فوجی اخراجات میں 25 بلین ڈالر کے اضافے کے لیے کوشش کرے گا۔"

کلنٹن کو عہدہ سنبھالے محض چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ اس نے سابقہ صدر جارج بش کے کویت کے دورے میں اس کے قتل کے ایک مفروضہ منصوبے کے جواب میں ایئر فورس کو بغداد میں بمباری کے لیے بھیج دیا۔ اس منصوبے کی کوئی ٹھوس شہادت بھی موجود نہیں تھی اور جو کہ کویت کی بدنام حد تک بدعنوان پولیس کے بیان تک ہی محدود تھا۔ کلنٹن نے ملزمان پر کویت میں چلائے جانے والے مقدمے کے نتائج کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ حکومت کے کہنے کے مطابق امریکی ہوائی جہازوں نے عراق کی "انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر" پر بمباری کی تھی، جبکہ یہ بم بغداد کی ایک مضافاتی آبادی پر گرے، جس میں عراق کی ایک مشہور فنکارہ اور اس کے خاوند سمیت چھ افراد مارے گئے۔ بعد میں یہ بات سامنے آئی کہ اس بمباری سے عراق کی انٹیلی جنس صلاحیتوں کو، اگر ان صلاحیتوں کا کوئی وجود تھا، کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکا۔ نیویارک ٹائمز نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: "کلنٹن کا یہ بیان خلیج کی جنگ کے دوران صدر بش اور جنرل نورمن شوارز کوف کے دعوؤں کی یاد دلاتا ہے جو کہ بعد میں جھوٹ ثابت ہوئے۔"

کالم نگار "مولی ایونز" نے لکھا کہ بغداد پر بمباری کے ذریعے دیئے جانے والا "طاقتور پیغام" دہشت گردی کی تعریف پر فٹ بیٹھتا ہے۔ "دہشت گردوں کے بارے میں اہم بات یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے انتقام کے جنون یا توجہ حاصل کرنے کے لیے کسی قسم کے امتیاز کو خاطر میں نہیں لاتے..... جو بات افراد کے لیے درست ہے وہ اقوام کے لیے بھی اتنی ہی درست خیال کی جانی چاہیے۔"

کلنٹن کی خارجہ پالیسی روایتی دو حزبی ترجیحات پر مبنی تھی یعنی مختلف ممالک میں جو بھی حکومتیں اقتدار میں موجود ہوں جب تک وہ امریکہ کے لیے منافع بخش تجارتی بندوبست کو فروغ دیتی رہیں ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے جائیں، خواہ انسانی حقوق کے تحفظ کے حوالے سے ان کا کردار جیسا بھی

ہو۔اسی طرح انڈونیشیا کی مدد جاری رکھی گئی، باوجود اس کے کہ اس نے مشرقی تیمور پر قبضے کے لیے حملے میں وسیع پیمانے پر لوگوں کا قتل عام کیا (اندازاً 700,000 کی آبادی کے اس جزیرے پر 200,000 افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا)۔

کلنٹن انتظامیہ کا انسانی حقوق کے حوالے سے اس قسم کی بے حسی کا مظاہرہ دو مختلف ممالک کے بارے میں دیکھنے میں آیا۔ یہ دونوں ممالک اپنے آپ کو کمیونسٹ خیال کرتے ہیں۔ چین نے 1989ء میں بیجنگ میں احتجاج کرنے والے طلبا کا قتل عام کیا اور باغیوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ کیوبا کی حکومت نے مخالفین کو جیلوں میں ضرور ڈال رکھا تھا لیکن بغاوت کو دبانے کے لیے کمیونسٹ چین اور دنیا کے دوسرے ممالک جیسا خونی ریکارڈ نہیں رکھتا، جن کو امریکی امداد دی جا رہی ہے۔

امریکہ نے اپنے ذاتی تجارتی مفادات کے پیش نظر چین کی معاشی مدد اور مخصوص تجارتی مراعات جاری رکھیں۔ لیکن کلنٹن انتظامیہ نے کیوبا کے محاصرے کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس میں اضافہ کیا، جس کے نتیجے میں اس کے عوام خوراک اور ادویات سے محروم رہے۔

کلنٹن انتظامیہ نے روس کے ساتھ اپنے تعلقات میں اخلاقیات کو حکومتی استحکام پر ترجیح دینے کی پالیسی اپنائی۔ اس نے "بورس یلسن" کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا جبکہ یلسن حکومت نے چیچنیا پر جو کہ علیحدگی چاہتا تھا پر وحشیانہ حملہ کیا اور شدید بمباری کی۔

کلنٹن اور یلسن دونوں نے رچرڈ نکسن کی وفات کے موقع پر ایک ایسے شخص کے لیے تعریف و تحسین کا خراج پیش کیا جس نے ویت نام میں جنگ کو جاری رکھا، اپنے عہدے کے حلف سے انحراف کیا اور مجرمانہ الزامات سے صرف اس لیے بچ گیا کیونکہ اس کے نائب صدر نے اسے معاف کر دیا تھا۔ یلسن نے نکسن کو "دنیا کے عظیم ترین سیاست دانوں میں سے ایک" قرار دیا، اور کلنٹن نے کہا کہ نکسن "اپنے پورے کریئر میں پوری دنیا میں آزادی اور جمہوریت کا زبردست حامی رہا۔"

کلنٹن کی خارجہ معاشی پالیسی قوم کی تاریخ کے عین مطابق تھی۔ جس میں دونوں پارٹیاں ملک کے اندر اور باہر کارپوریٹ مفادات سے کارکنوں کے حقوق کی نسبت زیادہ وابستہ تھیں اور بیرونی ملکی امداد کو انسانیت دوست عمل کے بجائے ایک سیاسی اور معاشی ہتھیار کے طور پر دیکھتی تھیں۔

ورلڈ بینک اور انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ دونوں امریکہ کے زیر تسلط تیسری دنیا کے مقروض ملکوں کے ساتھ بینکاروں والا بے حس اور سخت سلوک روا رکھتے ہیں وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ غریب اقوام اپنے انتہائی محدود وسائل میں سے، اپنے پہلے سے تباہ حال اور غربت میں گھرے ہوئے عوام کی سماجی خدمات میں کٹوتی کر کے امیر ممالک کے قرضے ادا کریں۔

بیرونی معاشی پالیسی میں، مارکیٹ اکانومی اور نجکاری پر زور دیا جاتا تھا۔ اس نے سوویت

بلاک کی سابقہ اقوام کو ان سماجی فوائد کے بغیر جو انہیں اپنی مسلم طور پر نااہل حکومتوں کے دور میں میسر تھے، مبینہ طور پر "آزاد" معیشت میں پناہ لینا پڑی۔

"آزاد تجارت" کلنٹن انتظامیہ کا ایک اہم ہدف بن گیا۔ اس نے میکسیکو کے ساتھ "نارتھ امریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ" کا بل پاس کروانے کے لیے کانگریس میں ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس دونوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں کارپوریٹ سرمائے اور اشیاء کا میکسیکو اور امریکہ کی سرحد کے آر پار آنا جانا بغیر کسی پابندی اور رکاوٹ کے آسان بنا دیا۔

کلنٹن کی خارجہ پالیسی کا ایک متاثر کن عمل "ہیٹی" کے فوجی سربراہ پر ۱۹۹۱ء میں جمہوری طور پر منتخب ہونے والے "جین برٹرینڈ ارسٹائیڈ" کو بطور صدر واپس بلانے کے لیے دباؤ ڈالنا تھا جس کو اس نے ملک سے باہر نکال دیا تھا، اس پر ہیٹی کی عوام بہت خوش ہوئی۔ لیکن اس کو ہیٹی میں بددیانت آمروں کی حمایت کرنے کی امریکی تاریخ کے پس منظر میں شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔

کلنٹن کی ملک کے اندر پالیسیاں، جیسا کہ ڈیموکریٹک امیدواروں کی روایت رہی تھی، پارٹی کے "الیکٹرول" حمایتیوں، سیاہ فاموں، خواتین اور مزدور طبقے کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ تھیں۔ لیکن اس کے ترقیاتی اقدامات بھی، اس کی کنزرویٹوز سے گہرے روابط کی خواہش، کارپوریٹ مفادات کو ٹھیس پہنچنے کے خوف اور بہت بڑے فوجی بجٹ کے پیش نظر بہت حد تک محدود ہی رہے تھے۔

کلنٹن کے معاشی پروگرام میں پہلے نئی ملازمتیں پیدا کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن جلد ہی اس کا رخ خسارے کو کم کرنے کی طرف موڑ دیا گیا (ریگن اور بش کے زیر سایہ قومی قرضہ چار ٹریلین ڈالر تک پہنچ چکا تھا)۔ لیکن اس پر زور دینے کا مطلب یہ تھا کہ، ہمہ گیر تحفظ صحت، تعلیم، بچوں کی نگہداشت، رہائش، ماحولیات، فنون یا ملازمتوں کے پیدا کرنے کے لیے رقوم خرچ کرنے کے کسی بڑے پروگرام پر عملدرآمد نہیں کیا جا سکے گا۔

کلنٹن کے لیے یہ معمولی معمولی سے عمل اس کے عشر عشیر بھی نہیں تھے، جن کی ایک ایسی قوم کے لیے ضرورت تھی، جس کے ایک چوتھائی بچے غربت میں زندگیاں بسر کر رہے تھے، جہاں پر بڑے شہر میں بے گھر لوگ گلیوں میں رہ رہے تھے، جہاں ہوا اور پانی خطرناک حد تک آلودہ ہو رہا تھا، جہاں پینتیس ملین امریکی (ان میں دس ملین بچے بھی شامل تھے) تحفظ صحت کے بغیر زندگیاں بسر کر رہے تھے۔

امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے، جو دنیا کی 5 فیصد آبادی پر مشتمل ہے، لیکن اس کے باوجود پوری دنیا کی پیداوار کا 30 فیصد استعمال کر رہا ہے۔ دولت کا ارتکاز آبادی کے ایک فیصد میں ہے، جو کہ 35 فیصد دولت (اندازاً 5.7 ٹریلین ڈالر) پر قابض ہے۔ اس کے غربت زدہ شہروں میں بچوں کی اموات کی شرح دنیا کے کسی بھی صنعتی ملک کی نسبت زیادہ ہے۔ ایک سال کے اندر، 1988ء میں، چالیس ہزار بچے اپنی پہلی

سالگرہ سے پہلے مر گئے تھے، افریقن امریکی بچوں میں موت کی شرح سفید فاموں کی نسبت دوگنا تھی۔

ابتدائی طور پر مواقعوں کی نامکمل سی برابری پیدا کرنے لیے بھی دولت کی ایک بڑے پیمانے پر تقسیم نو، ملازمتیں پیدا کرنے، صحت، تعلیم اور ماحولیات پر خطیر رقوم خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اخراجات کی ادائیگی کے لیے دو ممکنہ ذرائع موجود تھے، کلنٹن انتظامیہ ان میں سے کسی ایک کو بھی استعمال کرنے کے مائل نہ تھی۔

ایک ذریعہ فوجی بجٹ تھا۔ 1992ء کی صدارتی مہم کے دوران، فوجی اخراجات کے ایک ماہر رینالڈ فوربرگ نے مشورہ دیا تھا "سرد جنگ کے بعد کی دنیا کی ضروریات اور امکانات کے پیش نظر 60 بلین ڈالر کا فوجی بجٹ، امریکی فوج میں کمی کی خارجہ پالیسی کو حقیقت کا روپ دے گا۔" اس طرح سماجی مقاصد کے لیے سالانہ 200 بلین ڈالر کی بچت ہو سکتی تھی۔

لیکن کلنٹن کا دور صدارت بھی، اپنے سے پہلے کی دوسری تمام ری پبلکن اور ڈیموکریٹک صدارتوں کی طرح، جنگ کو قومی پالیسی کے ہتھیار کے طور پر ترک کرنے کا اعلان کرنے کو تیار نہیں تھی۔ فوجی برتری کو قائم رکھنے پر اصرار نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ یہ قوت محض سوویت یونین کا سامنا کرنے کے لیے برقرار نہیں رکھی جا رہی تھی، اور شاید ایسا کبھی بھی نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد معاشی اور سیاسی مفادات کے لیے تیسری دنیا کے ممالک میں مداخلت تھا۔ لہٰذا کسی بھی انسانی ضرورت خواہ وہ کتنی ہی شدید یا اہم کیوں نہ ہو اس کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

سماجی ضروریات پر اخراجات کے لیے دوسرا بڑا ذریعہ انتہائی دولتمند افراد کی دولت تھی۔ ملک کے ایک فیصد امیر ترین افراد گذشتہ بارہ سالوں کے دوران ٹیکسوں میں کمی کے نتیجے میں ٹریلین ڈالرز کا مفاد حاصل کر چکے تھے۔ دولت پر ٹیکس اس کی تلافی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ حقیقتاً ایک تدریجی انکم ٹیکس (دوسری عالمی جنگ کے بعد کے بہت زیادہ آمدنی پر 70 سے 90 فیصد کی انکم ٹیکس کی شرح کی جانب مراجعت) سماجی پروگراموں کے لیے سینکڑوں بلین ڈالر مہیا کر سکتا تھا۔ اس طرح چار سے پانچ سو بلین ڈالر ایک ہمہ گیر نظام صحت، روزگار کے تمام پروگراموں، قابل حصول رہائش، پبلک ٹرانسپورٹ، فنوں کے فروغ، ماحولیات وغیرہ کے لیے مہیا کئے جا سکتے تھے۔

اس قسم کے ایک دلیرانہ پروگرام کے بجائے پہلے سے جاری اس کے متبادل پروگرام جاری رکھے گئے، جن کے تحت غریبوں کی معمولی سی مدد کی جاتی رہی، شہروں کی آبادیوں میں بے تحاشا اضافہ ہونے دیا جاتا رہا، بیروزگاروں اور بے کار لوگوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جاتا رہا جو مایوسی کا شکار ہو کر نشے کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتے رہے اور باقی ماندہ لوگوں کے لیے مادی خطرات کو جنم دیا جاتا رہا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز نے جرائم کے خلاف بل پاس

کرنے، مزید جیلیں تعمیر کرنے، حالات سے مایوس لوگوں کو تیار کرنے کے لیے جن میں بہت سے نوجوان اور بہت سے غریب سفید فام شامل تھے، آپس میں اتحاد قائم کئے رکھا۔ یہ ان امریکیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کیا جاتا رہا جو بڑھتے ہوئے پرتشدد جرائم سے خوف زدہ تھے اور اس طرح 1994ء میں دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت سب سے زیادہ فی کس افراد جیلوں میں بند تھے، جن کی تعداد اندازاً دس لاکھ تک تھی۔

اگر کلنٹن انتظامیہ اور ڈیموکریٹک لیڈرشپ کونسل سوشل پروگراموں سے انحراف کرتے ہوئے، جرائم کے بارے میں سخت رویّے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور مضبوط فوج قائم کرتے ہوئے، اعتدال پسند ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کی امید رکھتی تھی تو وہ ناکام ہو چکی تھی۔ 1994ء کے کانگریس کے انتخابات میں ری پبلکنز نے ڈیموکریٹس کو ایوان اور سینیٹ دونوں میں شکست دیتے ہوئے دونوں ایوانوں میں اچھی خاصی اکثریت حاصل کر لی۔ انہوں نے فوری طور پر "بگ گورنمنٹ" سے نجات کے نام پر، ان سماجی پروگراموں کو ختم کر دیا جو "نیوڈیل" سے لے کر اب تک کے سالوں میں تشکیل دیئے گئے تھے۔

کامیابی حاصل کرنے والے ری پبلکنز نے اپنے پروگراموں کے لیے عوامی "مینڈیٹ" حاصل ہونے کا دعویٰ کیا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اہل ووٹروں کی صرف 37 فیصد تعداد نے ووٹ ڈالے تھے اور ان میں سے نصف میں سے تھوڑے زیادہ ووٹروں نے ری پبلکنز کو ووٹ ڈالے تھے۔ اگر کسی کو "مینڈیٹ" حاصل تھا تو وہ آبادی کا وہ 63 فیصد طبقہ تھا، جو اس سیاسی نظام سے برگشتہ تھا جس پر دو ناپسندیدہ بڑی پارٹیاں مسلط تھیں۔ (1988ء میں کئے گئے ایک سروے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ رائے دہندگان کی دو تہائی تعداد ری پبلکن کے بش اور ڈیموکریٹ ڈوکاکس کے علاوہ دوسرے امیدواروں کو چاہتے تھے۔)

حقیقتاً 80 کے عشرے اور 90 کے عشرے کی ابتدا میں کئے گئے عوامی رائے کے سروے سے یہ بات سامنے آئی کہ امریکی جرأت مند پالیسیوں کی حمایت کرتے ہیں، جو کہ نہ تو ڈیموکریٹس اور نہ ہی ری پبلکنز اپنانے کو تیار تھے۔ ان پول سروے میں 61 فیصد لوگوں نے کینیڈین طرز کے ہیلتھ سسٹم کی حمایت کی اور 84 فیصد نے اربوں پتی لوگوں پر اضافی ٹیکسوں کی حمایت کی۔

جبکہ دونوں پارٹیاں "ویلفیئر" پر نکتہ چینی کر رہی تھیں (جیسا کہ کارپوریشنز اور بینک حکومت سے کافی ویلفیئر حاصل نہیں کر رہے تھے)، دسمبر 1994ء میں نیویارک ٹائمز اور سی بی ایس نیوز کے پول سروے کے مطابق 65 فیصد کا کہنا تھا کہ "ان لوگوں کی دیکھ بھال کرنا، جو اپنی دیکھ بھال خود نہیں کر سکتے حکومت کا فرض ہے۔"

اگر جمہوریت کا مطلب حکومت کا لوگوں کی خواہش کو تسلیم کرنا ہے، تو 1995ء تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ اس پر ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس دونوں میں سے کوئی بھی عمل نہیں کر رہا تھا۔ 1994ء میں لاس اینجلز

ٹائمز" کے ایک سروے کے مطابق "زیادہ سے زیادہ امریکی یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک نئی پارٹی کی حمایت کرنے کو تیار ہیں۔" اس بات کی تصدیق دو سال پہلے "گورڈن بلیک" پول سروے میں بھی کی گئی تھی جس میں رائے دینے والے 54 فیصد لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ "ایک نئی اصلاحی پارٹی" چاہتے ہیں۔

اگر تاریخی تجربہ کوئی سبق سکھاتا ہے تو وہ یہ تھا کہ ایک قومی بحران جیسا کہ 90 کے عشرے کے وسط میں امریکہ میں پایا جاتا تھا، غربت، منشیات، تشدد، جرائم، سیاست سے لاتعلقی، مستقبل کے بارے میں غیر یقینی صورتحال کا بحران، عوام سے اٹھنے والی ایک بہت بڑی سماجی تحریک کے بغیر حل نہیں کیا جا سکے گا۔ قوم کو ایک نئی سمت میں دوڑنے کے لیے ایسی کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے انسداد غلامی کی تحریک، مزدوروں کی تحریک، جنگ مخالف تحریک، ماحولیات کی تحریک جیسے جذبے اور عزم کو یکجا کرنے کی ضرورت ہوگی۔

1992ء میں کسی وقت، ری پبلکن پارٹی نے فنڈز اکٹھا کرنے کے لیے ایک عشائیے کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے افراد اور کارپوریشنوں نے 400,000 ڈالرز ادا کیے تھے۔ صدر بش کے ایک ترجمان، "مارلن فزواٹر" نے رپورٹروں کو بتایا: "جی ہاں! یہ سسٹم تک رسائی خریدنے کا عمل ہے۔" اس سوال کے جواب میں کہ ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتے، اس نے کہا: "انہیں کسی دوسرے طریقے سے رسائی کا مطالبہ کرنا ہوگا۔"

یہ ان امریکیوں کے لیے ایک واضح اشارہ ہے جو حقیقی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ "انہیں اپنے طریقے سے رسائی کا مطالبہ کرنا ہوگا۔"

2000ء کے انتخابات اور دہشت گردی کے خلاف جنگ

جب کلنٹن کا دوسرا صدارتی دور اختتام کو پہنچا (آئین کی بائیسویں ترمیم کے مطابق کوئی شخص بھی دو دورانیوں سے زیادہ صدر نہیں رہ سکتا) تو یہ بات ظاہر تھی کہ ڈیموکریٹک پارٹی کا اگلا صدارتی امیدوار البرٹ گور ہوگا جو کہ وفاداری کے ساتھ کلنٹن کے نائب صدر کی خدمات انجام دے چکا تھا۔ ریپبلکن پارٹی نے اپنا صدارتی امیدوار ٹیکساس کے گورنر جارج ڈبلیو بش جونیئر کو منتخب کیا، جو کہ تیل کے مفادات سے تعلق اور اپنی گورنرشپ کے دوران قیدیوں کی ریکارڈ سزائے اموات کے لیے شہرت رکھتا تھا۔

اگرچہ بش نے اپنی مہم کے دوران الگور پر "طبقاتی تصادم" کی حمایت کا الزام لگایا، تاہم الگور اور اس کے نائب صدر سینیٹر جوزف لیبرمین انتہائی دولت مند افراد کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ نیویارک ٹائمز میں صفحہ اول پر ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا "لیبرمین، بطور سینیٹر کاروبار کا ایک پرجوش حامی" جس میں تفصیلاً بیان کیا گیا تھا کہ وہ "سیلیکون ویلی" کی ہائی ٹیک صنعت کا ایک محبوب ترین انسان ہے اور کونیکٹیکٹ کا عسکری صنعتی کمپلیکس "سی ولف" آبدوز کے لیے 7.5 بلین ڈالر کے معاہدات کے لیے اس کا شکرگزار تھا۔

دونوں صدارتی امیدواروں کو حاصل کارپوریٹ حمایت کے فرق کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ بش کی مہم کے لیے 220 ملین ڈالر جمع ہوئے اور الگور کے لیے 170 بلین ڈالر کی رقم اکٹھی کی گئی۔ نہ تو الگور نے اور نہ ہی بش نے قومی بہبودی صحت، کم قیمت کے رہائشی مکانات اور ماحولیاتی کنٹرول میں کسی بڑی تبدیلی کا کوئی منصوبہ پیش کیا۔ دونوں نے سزائے موت اور جیلوں میں اضافے کی حمایت کی، دونوں نے ایک بڑے فوجی ڈھانچے، زمینی سرنگوں کے استعمال کو جاری رکھنے اور کیوبا اور عراق کے عوام کے خلاف پابندیوں کی حمایت کی۔

ایک تیسری پارٹی کا امیدوار "رالف نیڈر" بھی میدان میں تھا، جس کی قومی شہرت کی وجہ معیشت پر کارپوریٹ کنٹرول کے خلاف کڑی تنقید تھی جو وہ کئی عشروں سے کرتا آ رہا تھا۔ اس کا پروگرام دونوں امیدواروں سے یکسر مختلف تھا، جس میں بہبودی صحت، تعلیم اور ماحولیات پر زور تھا۔ لیکن قومی سطح پر اُسے ٹیلی

ویژن مباحثوں سے باہر رکھا گیا۔ اور بڑے کاروباری اداروں کی حمایت نہ ہونے کے باعث اُسے ان لوگوں سے چھوٹے چھوٹے عطیات کے ذریعے رقم اکٹھا کرنا پڑی جو اس کے پروگرام کی حمایت کرتے تھے۔

دونوں پارٹیوں کے طبقاتی مسئلے پر اتحاد اور کسی بھی تیسری پارٹی کے امیدوار کے خلاف کھڑی کی گئی رکاوٹوں سے یہ بات صاف اور واضح طور پر نظر آ رہی تھی کہ تقریباً ملک کی آدھی آبادی، خاص طور پر کم آمدنی والے افراد، اور وہ لوگ جو کسی بھی بڑی پارٹی کے بارے میں جوش و جذبہ نہیں رکھتے، ووٹ ہی نہیں ڈالیں گے۔

ایک پٹرول فلنگ سٹیشن پر ایک صحافی نے ایک تعمیراتی کمپنی کے مزدور کی بیوی سے بات کی جس نے اسے بتایا "میں نہیں سمجھتی کہ یہ ہمارے جیسے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اگر وہ دو کمروں کے ٹریلر میں رہ رہے ہوتے تو شاید کچھ مختلف بات ہوتی۔" میکڈونلڈ کی ایک منیجر افریقی امریکن خاتون نے، جو 5.15 ڈالر فی گھنٹہ کی کم از کم اجرت سے تھوڑا سا زیادہ کما رہی تھی، بش اور الگور کے بارے میں کہا: "میں تو ان دونوں کے بارے میں سوچتی بھی نہیں، اور میری تمام دوست بھی یہی کہتی ہیں، میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔"

یہ قوم کی تاریخ کے سب سے زیادہ انوکھے انتخابات تھے۔ الگور نے بش کی نسبت سینکڑوں ہزار زیادہ ووٹ حاصل کیے، لیکن آئین کے مطابق جیت کا فیصلہ ہر ریاست کے الیکٹورز (صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرنے والے ادارے کا رکن) نے کرنا تھا۔ الیکٹورل ووٹوں میں فرق اس قدر کم تھا کہ نتیجے کا تعین ریاست فلوریڈا کے الیکٹورز سے ہونا تھا۔ پاپولر ووٹوں اور الیکٹورل ووٹوں میں یہ فرق اس سے پہلے 1876ء اور 1888ء میں دو مرتبہ دیکھنے میں آچکا تھا۔

فلوریڈا میں زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے امیدوار کو ریاست کے تمام الیکٹورز ووٹ ملنے تھے۔ لیکن اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہوگیا کہ فلوریڈا میں بش اور الگور میں سے کس نے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہیں۔ یوں نظر آتا تھا کہ بہت سے ووٹ شمار نہیں کیے گئے، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں سیاہ فام لوگ رہتے تھے، یہ ووٹ تکنیکی بنیادوں پر مسترد کر دیے گئے اور کہا گیا کہ ووٹنگ مشینوں سے لگائے گئے نشانات واضح نہیں ہیں۔

بش کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ اس بات کا فیصلہ کہ کس نے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہیں اور انتخاب جیتا ہے، فلوریڈا کے گورنر نے (جو کہ بش کا بھائی "جب بش" تھا) اور فلوریڈا میں سیکرٹری آف سٹیٹ کیتھرین ہیرث ایک ریپبلکن نے کرنا تھا۔ ووٹوں کی مشتبہ پرچیوں کے دعووں کے پیش نظر ہیرث نے جلدی سے ووٹوں کی جزوی گنتی کی اور بش کی برتری کا اعلان کر دیا۔

فلوریڈا کی سپریم کورٹ، جس میں ڈیموکریٹس کا غلبہ تھا، میں ایک اپیل کے نتیجے میں عدالت

نے ہیرث کو فتح کی تصدیق کرنے سے روک دیا اور دوبارہ گنتی کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔ ہیرث نے دوبارہ گنتی کی ایک ڈیڈ لائن مقرر کردی اور جب کہ ابھی تک ہزاروں متنازعہ ووٹ کی پرچیاں موجود تھیں وہ آگے بڑھی اور تصدیق کردی کہ بش 537 ووٹوں سے جیت گیا ہے۔ یقیناً یہ صدارتی انتخابات کی تاریخ میں قریب ترین فتح تھی۔ الگور نتائج کو چیلنج کرنے کی تیاری کرنے لگا اور جیسا کہ فلوریڈا کی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا تھا دوبارہ گنتی کو جاری رکھنے کا مطالبہ کیا، ریپبلکن پارٹی معاملہ امریکہ کی سپریم کورٹ میں لے گئی۔

سپریم کورٹ نظریاتی خطوط پر تقسیم ہوگئی۔ پانچ کنزرویٹو ججوں (رینکوئسٹ، سکالیا، تھامس، کینیڈی، اوکونر) نے ریاستی اختیارات میں مداخلت نہ کرنے کی معمول کی کنزرویٹو روایت کے باوجود فلوریڈا سپریم کورٹ کے حکم کو کالعدم قرار دے دیا اور ووٹوں کی دوبارہ گنتی منع کردی۔ انہوں نے کہا دوبارہ گنتی "قوانین کے مساوی تحفظ" کے آئینی حق کی خلاف ورزی ہے، کیونکہ فلوریڈا کی مختلف کاؤنٹیوں میں ووٹوں کی پرچیوں کی گنتی کے لیے مختلف معیار ہیں۔

چار لبرل ججوں (سٹیونز، جنسبرگ، بیئر، ساوٹر) کا کہنا تھا کہ عدالت کو فلوریڈا سپرم کورٹ کی ریاستی قوانین کی تشریح میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ بیئر اور ساوٹر نے مزید کہا کہ اگر گنتی میں یکساں معیار موجود نہیں ہے تو اس کا حل فلوریڈا میں یکساں معیار کے مطابق نئے انتخابات کروانا ہے۔

اس حقیقت کا، کہ سپریم کورٹ نے انتخابات پر دوبارہ غور کی اجازت دینے سے انکار کردیا، مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ امیدوار بش کو آئندہ صدر دیکھنا چاہتی تھی۔ جسٹس سٹیونز نے اس کی نشاندہی کسی قدر تلخی کے ساتھ اپنی اقلیتی رپورٹ میں کی "اگرچہ ہم اس سال کے صدارتی امیدوار کے فاتح کو پورے یقین کے ساتھ نہیں جانتے تاہم ہارنے والے کی شناخت مکمل طور پر واضح ہے۔ یہ قوم کا جج پر قانون کی حکمرانی کے ایک غیر جانبدار محافظ کے طور پر اعتماد ہے۔"

بش صدارت سنبھالتے ہی پورے اعتماد سے اپنے کاروبار کی حمایت میں اپنے ایجنڈے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا، گو کہ اسے قوم کی اکثریتی حمایت حاصل ہو۔ اور ڈیموکریٹک پارٹی، اپنے بنیادی فلسفے کے مطابق، جوری پبلکن سے زیادہ مختلف نہیں تھا، اپنی بودی اور کمزوری مخالفت کے ساتھ بش کی خارجہ پالیسی کے ساتھ مکمل طور پر چلنے لگی اور صرف اس کی داخلی پالیسی پر معمولی سے اختلاف کا مظاہرہ کرتی رہی۔

بش کا پروگرام فوری طور پر واضح نظر آنے لگا۔ اس نے دولت مند افراد کے ٹیکسوں میں کمی کے لیے زور ڈالا، سخت ماحولیاتی قوانین کی مخالفت کی جو کہ کاروباری افراد پر مالی بوجھ کا باعث بنتے تھے، اور شہریوں کے ریٹائرمنٹ فنڈز کا انحصار سٹاک مارکیٹ پر کرتے ہوئے سوشل سیکورٹی پروگرام کی نج کاری کا منصوبہ تیار کیا۔ اس نے فوجی بجٹ میں اضافہ کیا اور "سٹار وار" پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے

اقدامات کیے۔ اگرچہ متفقہ سائنسی رائے یہ تھی کہ خلا میں اینٹی بلاسٹک میزائل کام نہیں کر سکتے اور اگر منصوبہ کامیاب بھی ہو جائے تو یہ دنیا میں محض اسلحے کی دوڑ میں مزید تیزی پیدا کرے گا۔

اس کی صدارت کے نو ماہ بعد 11 ستمبر 2001ء میں ایک انتہائی تباہ کن واقعہ نے ان تمام معاملات کو پس پشت ڈال ڈیا۔ تین مختلف طیاروں میں ہائی جیکروں نے تیل سے بھرے ہوئے بڑے جیٹ طیاروں کو نیویارک شہر کے دل میں واقع ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دو جڑواں ٹاورز میں اور واشنگٹن ڈی سی میں پینٹاگون کے ایک پہلو میں دے مارا۔ پورے ملک میں خوفزدہ اور سراسیمہ عوام نے اپنے ٹیلی ویژن سکرینوں پر ٹاورز کو کنکریٹ اور لوہے کی دہکتے ہوئے جہنم میں تبدیل ہو کر زمین بوس ہوتے ہوئے دیکھا۔ جس نے وہاں کام کرنے والے ہزاروں کارکنوں اور مدد کے لیے جانے والے سینکڑوں فائر مینوں اور پولیس کے آدمیوں کو زندہ دفن کر دیا

یہ امریکی دولت اور طاقت کی عظیم الشان علامات پر ایک ایسا خوفناک حملہ تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے اس میں مشرق وسطیٰ کے 19 افراد شامل تھے جن میں سے زیادہ تر کا تعلق سعودی عرب سے تھا۔ وہ ایک ایسی سپر پاور پر، جو اپنے آپ کو ناقابل تسخیر خیال کرتی تھی اور جسے وہ واضح طور پر اپنے دشمن کے طور پر دیکھتے تھے، ایک مہلک ضرب لگانے کے لیے مرنے کے لیے تیار تھے۔

صدر بش نے فوری طور پر "دہشت گردی" کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اعلان کیا کہ ہم دہشت گردوں اور ان ممالک کے درمیان جو دہشت گردوں کو پناہ دیتے ہیں کوئی فرق روا نہیں رکھیں گے۔ کانگریس نے فوری طور پر، اعلان جنگ کیے بغیر جس کا آئین تقاضا کرتا تھا، بش کو فوجی طاقت کے ساتھ آگے بڑھنے کا اختیار سونپنے کے لیے قراردادیں پاس کر دیں۔ یہ قرارداد سینیٹ میں اور ایوان نمائندگان میں متفقہ طور پر منظور کی گئی صرف کیلیفورنیا کے ایک افریقی امریکن بار برا لی نے مخالفت کی۔

اس مفروضے پر کہ اسلامی جنگجو اسامہ بن لادن 11 ستمبر کے حملوں کا ذمہ دار ہے اور یہ کہ وہ افغانستان میں کسی جگہ پر موجود ہے، بش نے افغانستان پر بمباری کا حکم دے دیا۔

بش نے اپنا ہدف اسامہ بن لادن کی گرفتاری اور اس کی جنگجو تنظیم القاعدہ کی تباہی مقرر کیا۔ لیکن افغانستان میں پانچ ماہ کی بمباری کے بعد بش نے کانگریس کے دونوں ایوانوں میں اپنے سرکاری خطاب میں یہ کہتے ہوئے کہ "ہم دہشت گردی کے خلاف جیت رہے ہیں" تسلیم کیا کہ "دس ہزار تربیت یافتہ دہشت گرد اب بھی آزاد گھوم رہے ہیں" اور "درجنوں ممالک دہشت گردوں کو پناہ دے رہے ہیں۔"

بش اور اس کے مشیروں کو بخوبی علم ہونا چاہیے تھا کہ دہشت گردی کو طاقت کے ذریعے شکست نہیں دی جا سکتی، تاریخی شہادتیں آسانی سے دستیاب تھیں۔ برطانیہ، آئرش ری پبلکن آرمی کی دہشت گردی کی کارروائیوں کی فوجی طاقت کے ذریعے بار بار سرکوبی کی کوششیں کر چکا تھا لیکن اسے ہر بار

مزید دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑتا رہا تھا۔ اسرائیل کئی عشروں سے فلسطینیوں کی دہشت گردی کو فوجی حملوں سے ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے نتیجہ مزید فلسطینی بمباری کے علاوہ کچھ نہیں نکلا۔ بل کلنٹن تنزانیہ اور کینیا کے امریکی سفارت خانوں پر حملوں کے بعد افغانستان اور سوڈان پر بمباری کر چکا تھا، لیکن 11 ستمبر کے حادثہ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس نے دہشت گردی کو کوئی لگام نہیں ڈالی تھی۔

علاوہ ازیں مہینوں کی بمباری نے ایک ایسے ملک کو مزید تباہ و برباد کر دیا تھا جو پہلے ہی کئی عشروں کی خانہ جنگی اور تباہی سے گزر چکا تھا۔ پینٹاگون کا دعویٰ تھا کہ وہ صرف "فوجی اہداف" کو نشانہ بنا رہا ہے، اہم انسانی حقوق کی تنظیموں اور امریکی اور یورپی پریس میں شائع ہونے والی رپورٹوں سے یہ واضح ہوتا تھا کہ کم از کم 1000 یا شاید 4000 افغانی سویلین امریکی بمباری کا لقمہ اجل بن چکے تھے۔

ایسا نظر آتا تھا کہ امریکہ نیویارک کے معصوم لوگوں کے خلاف دہشت گردوں کی بربریت کا بدلہ افغانستان میں معصوم لوگوں کو مار کر لے رہا ہے۔ ہر روز نیویارک ٹائمز ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے المناک حادثے کا شکار ہونے والے افراد کی دل ہلا دینے والی تصاویر شائع کر رہا تھا جس میں ان کے کام، ان کی دلچسپیوں، اور ان کے خاندانوں کی داستانیں شائع ہوتی ہیں۔

افغانستان میں امریکی بمباری کے شکار ہونے والے افراد کے بارے میں ایسی معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا، تاہم ہسپتالوں اور دیہاتوں سے امریکی بمباری کے نتائج کے بارے میں کچھ داستانیں ہم تک پہنچتی تھیں۔ "بوسٹن گلوب" کے ایک صحافی نے جلال آباد کے ایک ہسپتال سے رپورٹ بھیجی "ایک بستر پر 10 سالہ نور محمد لیٹا ہوا ہے، جو کہ پٹیوں کا ایک ڈھیر نظر آتا ہے، اس کی آنکھیں اور ہاتھ اس بمباری کے نتیجے میں ضائع ہو چکے ہیں جو کہ اتوار کے دن رات کے کھانے کے وقت اس کے گھر پر کی گئی۔" ہسپتال کے ڈائرکٹر غلو جا شمواری نے بچے کے زخموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "امریکی ضرور یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ اسامہ ہے، اگر یہ اسامہ نہیں ہے تو وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے، "پچھلے ہفتے ہسپتال کے مردہ خانے میں 17 لاشیں وصول کی گئی ہیں۔ یہاں کے عہدیداروں کے اندازے کے مطابق 89 افراد مختلف دیہات میں لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ کل ہسپتال میں ایک خاندان لایا گیا جن کی زندگی میں بم ایک تاریخ ثبت کر گیا تھا، بم نے ان کے باپ فیصل کریم کو مار ڈالا تھا، ایک بستر پر اس کی بیوی مصطفیٰ جاما لیٹی ہوئی تھی جسے سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں، اس کے اردگرد اس کے چھ بچے پٹیوں میں لپٹے پڑے تھے، ان میں سے ایک 8 سالہ زاہد اللہ بے ہوش پڑا تھا۔ امریکی عوام 11 ستمبر کی تباہی کے بعد سے بش کی دہشت گردی کے خلاف جنگ کی پالیسی کے شدید حامی تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی اس بات پر مقابلے پر اتری ہوئی تھی کہ دہشت گردوں کے خلاف سخت ترین زبان کون استعمال کر رہا ہے۔ نیویارک ٹائمز، جس نے انتخابات میں بش کی مخالفت کی

تھی، نے دسمبر 2001 میں اپنے اداریہ میں لکھا: ''مسٹر بش نے اپنے آپ کو جنگ کے دور میں ایک مضبوط لیڈر ثابت کیا ہے، جس نے ایک بحران کے دور میں قوم کو تحفظ کا احساس دیا ہے۔''

لیکن افغانستان میں ہونے والی بمباری سے انسانی تباہی اور ہولناکیوں کا مکمل نقشہ بڑے اخبارات اور ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے ذریعے امریکی عوام تک نہیں پہنچایا جا رہا تھا، جو کہ محض اپنی حب الوطنی کا مظاہرہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

سی این این ٹیلی ویژن کے سربراہ والٹر آئزک سن نے اپنے سٹاف کو ہدایت دے رکھی تھی کہ سویلین اموات کے مناظر کے ساتھ یہ وضاحت بھی جاری کی جائے کہ یہ دہشت گردوں کو پناہ دینے والوں کے خلاف کارروائی کا حصہ ہے۔

ٹیلی ویژن کے ایک اینکر ڈان راور نے اعلان کیا: ''جارج بش صدر ہیں جب بھی وہ کوئی خدمت مجھے سونپنا چاہیں، بس صرف بتا دیں کہ کیا خدمت۔''

امریکہ افغانستان سے معلومات کی ترسیل کو روکنے کے لیے آخری حدود تک پہنچ گیا۔ اس نے مشرق وسطی میں سب سے بڑے ٹیلی ویژن ''الجزیرہ'' کی عمارت پر بمباری کی اور اس سیٹلائٹ آرگنائزیشن کو خرید لیا جو کہ ایسی تصاویر لے رہی تھی جن سے زمین پر بمباری کے نتائج نظر آ سکتے تھے۔

ملک کے بڑے رسائل و جرائد نے، جو عوام میں زیادہ پڑھے جاتے تھے، ایک انتقام کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ ٹائم میگزین میں ایک کالم نگار نے ''طیش اور انتقام کا معاملہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اس نے ''مرتکز بربریت'' کی پالیسی اختیار کرنے کی سفارش کی۔ ٹیلی ویژن کے ایک مقبول تبصرہ نگار ''بل او ریلی'' نے امریکہ کو ''افغان انفراسٹرکچر، ہوائی اڈے، بجلی گھر اور پانی کے وسائل کو مکمل طور پر تباہ و برباد'' کر دینے کا مشورہ دیا۔

گھروں کی کھڑکیوں میں، گاڑیوں پر، دکانوں کی کھڑکیوں میں قومی پرچم کی نمائش ملک کے طول و عرض میں نظر آنے لگی اور دوران جنگ کی وطن پرستی میں شہریوں کے لیے حکومتی پالیسیوں پر تنقید کرنا مشکل ہو گیا۔ کیلیفورنیا میں ایک ریٹائرڈ ٹیلی فون آپریٹر نے، جو کہ ایک ہیلتھ کلب میں کام کر رہا تھا، صدر بش کے بارے ایک تنقیدی جملہ کہہ دیا، ایف بی آئی کے لوگ اس کے پاس آئے اور اس سے سوال جواب کیے۔ ایک نوجوان خاتون کے دروازے پر ایف بی آئی کے دو آدمی آئے اور کہا کہ انہیں اطلاع ملی ہے کہ اس نے اپنی دیوار پر ایک پوسٹر لگا رکھا ہے جس میں صدر پر تنقید کی گئی ہے۔

کانگریس نے ''امریکہ محب الوطنی'' کی دفعہ پاس کی جس کے تحت محکمہ انصاف کو اُن افراد کو جو امریکی شہری نہیں محض شک کی بنا پر بغیر الزامات کے اور آئین میں مہیا کی گئی ضابطے کی کارروائی کے بغیر حراست میں رکھنے کا اختیار مل گیا۔ اس میں کہا گیا کہ وزیر خارجہ کسی بھی گروہ کو ''دہشت گرد'' قرار دے سکتا

ہے اور کوئی بھی شخص جو کسی ایسے گروپ کا ممبر ہوگا یا ایسی تنظیموں کے لیے فنڈز اکٹھے کرے گا اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے اور ملک بدری تک حراست میں رکھا جا سکتا ہے۔

صدر بش نے خبردار کیا کہ عرب امریکیوں کے ساتھ معاندانہ ردعمل نہ دکھایا جائے، لیکن حقیقت میں حکومت نے تقریباً تمام مسلمانوں کو تفتیش کے لیے پکڑنا شروع کر دیا، اور ہزاروں افراد کو بغیر کسی الزام کے جیلوں میں ڈال دیا۔ نیویارک ٹائمز کے کالم نگار انتھونی لیوس نے بتایا کہ: ''ایک شخص کو خفیہ شہادت کی بنا پر گرفتار کیا گیا، ایک وفاقی جج نے رہا کر دیا، کیونکہ اس شخص کے خلاف ایسے کوئی شواہد موجود نہیں تھے جن کی بنا پر اسے قومی تحفظ کے خلاف خطرہ خیال کیا جا سکتا۔ تاہم 11 ستمبر کے بعد محکمہ انصاف نے جج کی تحقیقات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے دوبارہ قید کر دیا اور اسے 23 گھنٹے قید تنہائی میں رکھا جا رہا ہے اور اس کے خاندان کو اس سے ملنے نہیں دیا جا رہا۔''

چند عوامی حلقوں کی جانب سے جنگ پر تنقید کی جا رہی تھی۔ پورے ملک میں امن ریلیاں نکالی گئیں۔ ان ریلیوں میں جو پلے کارڈز اٹھائے ہوتے ان پر ''جنگ نہیں، انصاف'' اور ''ہمارا غم، انتقام کا مطالبہ نہیں کرتا'' کے نعرے درج تھے۔ اری زونا ایک ایسی جگہ ہے جہاں آج تک حکومتی اداروں کے خلاف سرگرمیاں کبھی بھی دیکھنے میں نہیں آئیں، وہاں 600 شہریوں نے ایک اخباری اشتہار پر دستخط کیے جس میں انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اقوام متحدہ اور بین الاقوامی برادری سے مطالبہ کیا کہ ''وسائل کو افغانستان کی تباہی سے ہٹا کر ان رکاوٹوں کو دور کرنے پر صرف کیا جائے جو ضرورت مندوں تک کھانے پینے کی اشیاء کی مناسب مقدار کے پہنچنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔''

وہ لوگ جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون میں جاں بحق ہوئے تھے ان کے خاندانوں کے کچھ افراد نے صدر بش کو اس بات پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ اُسے تشدد کے بدلے تشدد کا استعمال نہیں کرنا چاہیے اور افغانستان کے عوام پر بم برسانے کی جانب نہیں بڑھنا چاہیے۔ ایمبر اینڈرسن نے جس کا خاوند، ایک آرمی پائلٹ پینٹاگون میں مارا گیا تھا، کہا:

''میں نے بہت سے امریکیوں بشمول اپنے قومی لیڈروں کے جذبات سے بھرے اور طیش سے پُر بیانات اور باتیں سنی ہیں، جو کہ شدید قسم کے انتقام اور سزاؤں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان لیڈروں پر میں واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ مجھے اور میرے خاندان کو آپ کے غصے اور طیش بھرے ہوئے الفاظ سے کوئی سکھ نصیب نہیں ہو رہا۔ اگر آپ اس ناقابل فہم بربریت کے جواب میں دوسرے معصوم انسانوں پر ظلم و ستم ڈھانے کا انتخاب کیے ہوئے ہیں، تو آپ میرے خاوند کے لیے انصاف کے نام پر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

11 ستمبر کے حادثہ کا شکار ہونے والے کچھ افراد کے خاندان جنوری 2002ء میں افغانستان

آئے اور ان لوگوں سے ملے جن کے پیارے امریکی بمباری کا شکار بنے تھے۔ انہوں نے عبدل اور شکیلہ امین سے ملاقات کی جن کی پانچ سالہ بیٹی نازلی امریکی بمباری میں ماری گئی تھی۔ ان امریکیوں میں ایک ریٹا لاسر تھی جس کے بھائی کو صدر بش نے ہیرو قرار دیا تھا (جو کہ گرتی ہوئی عمارت کی اوپر والی منزل پر بجائے بھاگنے کے اپنے فالج زدہ دوست کے ساتھ ٹھہرا رہا تھا) اس خاتون نے اپنی باقی ماندہ زندگی امن کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔

بمباری پر تنقید کرنے والوں کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کی جڑیں ان پُر ملال شکایات میں پیوست ہیں جو امریکہ کے خلاف دنیا میں پائی جاتی ہیں، لہٰذا دہشت گردی ختم کرنے کے لیے ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ ان شکایات کی نشاندہی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ سعودی عرب میں، جو کہ مسلمانوں کے انتہائی متبرک مقامات کی جگہ ہے، امریکی فوج کا قیام: عراق کے خلاف دس سال کی پابندیاں جن کے نتیجے میں اقوام متحدہ کے مطابق سینکڑوں اور ہزاروں بچے موت کے منہ میں چلے گئے، فلسطینیوں کی زمین پر اسرائیل کے قبضے کی مسلسل حمایت اور بلین ڈالرز کی فوجی امداد۔

تاہم ان مسائل کا حل امریکہ کی خارجہ پالیسی میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اس قسم کی تبدیلیاں عسکری صنعت کے لیے قابل قبول نہیں ہوں گی جو کہ دونوں پارٹیوں میں گہرا نفوذ رکھتی ہے، کیونکہ ان تبدیلیوں کے لیے پوری دنیا سے امریکی فوج کا انخلا، دوسرے ممالک پر سیاسی اور معاشی تسلط کا خاتمہ، مختصراً دنیا میں امریکہ کو اپنے سپر پاور کے کردار سے دست کش ہونا پڑتا ہے۔

اس قسم کی بنیادی تبدیلیوں کے لیے، ترجیحات میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ فوج پر خرچ ہونے والے سالانہ 300 سے 400 بلین ڈالر کو روک کر اس رقم کو امریکیوں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے خرچ کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) نے تخمینہ پیش کیا تھا کہ امریکی فوجی بجٹ کا ایک معمولی سا حصہ اگر دنیا میں تپ دق کے علاج پر خرچ کر دیا جائے تو لاکھوں افراد کی جان بچائی جا سکتی ہے۔

امریکہ اپنی پالیسیوں میں اس قسم کی واضح تبدیلیاں لانے کے بعد دنیا کی سپر فوجی طاقت نہیں رہ جائے گا، لیکن اپنی دولت کو ضرورت مند انسانوں پر خرچ کرتے ہوئے بلاشبہ دنیا کی ایک سپر انسانی طاقت بن سکتا ہے۔

11 ستمبر 2001ء کے خوفناک واقعات سے تین سال پہلے امریکی ایئر فورس کے ایک سابقہ لیفٹیننٹ کرنل رابرٹ براؤن نے، جو ویت نام میں 101 جنگی پروازوں میں حصہ لے چکا تھا اور پھر کیتھولک بشپ بن گیا، کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں پر دہشت گردوں کی بمباری پر تبصرہ کیا۔ ''نیشنل کیتھولک رپورٹ'' میں ایک مضمون میں اس نے دہشت گردی کی جڑوں کے بارے میں بحث کی:

ہم سے اس لئے نفرت نہیں کی جا رہی کہ ہم جمہوریت پر عمل کرتے ہیں، آزادی کو اہمیت دیتے ہیں یا انسانی حقوق کی آواز بلند کرتے ہیں۔ ہم سے اس لئے نفرت کی جاتی ہے کہ ہماری حکومت تیسری دنیا کے ممالک میں، جن کے وسائل پوری طرح سے بین الاقوامی کارپوریشنیں ہڑپ کر رہی ہیں، ان باتوں سے انکار کر دیتی ہے۔ یہ نفرت کی فصل جو ہم نے بوئی ہے اب دہشت گردی کی صورت میں ہمارا پیچھا کر رہی ہے.... ہمیں اپنے بیٹے اور بیٹیاں عربوں کو مارنے کے لئے بھیجنے کے بجائے، تاکہ ان کی ریتوں کے نیچے تیل پر قبضہ کر سکیں، ان کے لئے انفراسٹرکچر تعمیر کرنے، صاف پانی مہیا کرنے اور بھوک سے مرتے ہوئے بچوں کو خوراک پہنچانے کے لئے بھیجنے چاہئیں۔

مختصراً ہمیں برائی کے بجائے اچھائی کرنی چاہئے۔ کون ہمیں روکنا چاہے گا؟ کون ہم سے نفرت کرے گا؟ کون ہم پر بمباری کرنا چاہے گا؟ یہ وہ سچ ہے جسے امریکی عوام کو سننے کی ضرورت ہے۔

11 ستمبر کے حملوں کے بعد اس قسم کی آوازوں کو زیادہ تر امریکی ذرائع ابلاغ سے باہر رکھا گیا، لیکن یہ ایک پیغمبرانہ آواز ہے اور کم از کم اس بات کا امکان موجود ہے کہ جب تشدد کو تشدد کے ذریعے روکنے کا عمل بے اثر ثابت ہو جائے گا، تو یہ طاقت ور اخلاقی پیغام امریکی عوام میں پھیل سکتا ہے۔ یقیناً اگر تاریخی تجربہ کوئی معنی رکھتا ہے تو امریکہ میں امن اور انصاف کے مستقبل کو حکومت کی خیر سگالی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جمہوریت کا اصول جس کی وضاحت ''اعلان آزادی'' کے الفاظ میں کی گئی ہے واضح کرتا ہے کہ حکومت ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور عوام جو اس کو قائم کرتے ہیں اوّلین حیثیت کے مالک ہیں۔ لہٰذا جمہوریت کے مستقبل کا انحصار عوام پر اور ان کے اس بڑھتے ہوئے شعور پر ہے کہ پوری دنیا کے عوام کے ساتھ اپنا تعلق استوار کرنے کا سب سے عمدہ راستہ کون سا ہے؟

A
PEOPLE'S HISTORY
OF THE
UNITED STATES
1492—PRESENT
HOWARD ZINN
جمہوری
JUMHOORI